3
جلد سوم

# کلیات
# خواجہ احمد عباس

# کلیات خواجہ احمد عباس

(جلد سوم)

افسانے

مرتب

ارتضیٰ کریم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2017
تعداد : 550
قیمت : 295/- روپے
قیمت سیٹ : 1935/- روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1965

**Kulliyat-e-khwaja Ahmad abbas (Vol. III)**
Compiler: Prof.Irteza Karim
ISBN No :978-93-87510-26-5
Set ISBN: 978-81-934243-9-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، ڈی 31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نزد جہانگیر پوری میٹرو اسٹیشن،
دہلی-110033
اس کتاب کی چھپائی میں 80GSM_Natural Color کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

# پیش لفظ

خواجہ احمد عباس اردو کے اہم اور منفرد ادیب رہے ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے اور مضامین بھی۔ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے فلمیں لکھیں، ڈائریکٹ بھی کیں، کئی اسکرپٹ بھی لکھے علاوہ ازیں مضامین، سفرنامے اور سوانح بھی ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصر ادیبوں میں ان کا قد نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ راقم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ کلیات آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی، دوسری اور تیسری جلد خواجہ احمد عباس کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلی اور دوسری جلد میں ان کے افسانوی مجموعے 'ایک لڑکی'، 'پاؤں میں پھول'، 'زعفران کے پھول'، 'میں کون ہوں'، 'کہتے ہیں جس کو عشق'، 'گیہوں اور گلاب'، 'دیا جلے ساری رات'، 'نئی دھرتی نئے آسمان'، 'نیلی ساڑی' اور 'سونے چاندی کے بت' کے افسانے شامل ہیں۔

'سونے چاندی کے بت' خواجہ احمد عباس کا دسواں افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں کل نو کہانیاں دس خاکے اور چھ شخصی مضامین شامل ہیں۔ چنانچہ دوسری جلد میں صرف نو کہانیوں کو ہی

شامل کیا گیا ہے۔ خاکے اور مضامین کو آٹھویں جلد میں شریک کیا گیا ہے۔

تیسری جلد میں خواجہ احمد عباس کی وہ انتالیس کہانیاں شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے
میں شریک نہیں ہیں اور پہلی بار کتابی شکل میں سامنے آ رہی ہیں۔ ان میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو
اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ جیسے اس انتخاب میں ایک کہانی
''اچھن کا عاشق'' بھی شامل ہے۔ جو ہندی میں ''شونیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے حوالے سے یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے
اپنے کئی افسانوں کے عنوان بدل کر ہندی میں بھی شائع کرایا ہے۔ اس ضمن میں ''کولڈ ویو/سرد
لہر'' مایا نگری/پنچھی، پنجرہ اور اڑان، ہاتھ کا میل/بھکارن، اسپرٹ/رلس، چمتکار/معجزہ۔ بعض
کہانیاں مثلاً ''ہاتھ کا میل'' اور ''بھکارن'' متن کے اعتبار سے بھی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کہنا
مشکل ہے کہ متن کی یہ تبدیلی آیا خواجہ احمد عباس نے کی ہے یا اردو سے ہندی ترجمہ کرتے وقت
یہ آزادی مترجم نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانی ''ہاتھ کا میل/بھکارن'' اپنے دو مختلف
متون کے ساتھ یہاں شریک کر لی گئی ہے۔ تاکہ قارئین کو اس کے اختلاف متن کا اندازہ ہو
سکے۔ نیز تحقیق کے طالب علموں کو اس سے کچھ رہنمائی حاصل ہو سکے۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلد ان کے ناولوں پر محیط ہے: چار دل چار راہیں، شیشے کی
دیواریں، بمبئی رات کی بانہوں میں، اندھیرا اجالا، انقلاب، دو بوند پانی، فاصلہ، تین پہیے، ساحل
اور سمندر، چار یار۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ناول ''چار یار'' ماہنامہ بیسویں صدی دہلی میں قسط وار
شائع ہوتا رہا۔ اب اس شکل میں پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور ناول جو ایک
اور پریم کہانی، ساحل اور سمندر، ہیلو مس مالتی جیسے مختلف عنوان سے بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ ناول
بھی پہلی بار اس کلیات میں شامل ہوا ہے۔ ایک جاسوسی ناول جس کی پہلی قسط طبی دنیا دہلی میں شائع
ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کلیات میں شریک ہے۔ اس کی وضاحت بھی مقدمے میں کر دی گئی ہے۔

ساتویں جلد سوانح اور سفرنامے پر مشتمل ہے جس میں مسولینی فاشیت اور جنگِ حبش،
مولانا محمد علی، خروشچیف کیا چاہتا ہے؟ فلمیں کیسے بنتی ہیں؟ جیسی تحریریں شامل ہیں۔ خواجہ احمد

عباس کے چین، جاپان اور دوسرے ممالک کے سفر کی روداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس سفرنامہ کچھ اس اسلوب میں لکھتے ہیں کہ قاری بھی ان کا شریک سفر ہو جاتا ہے۔

آٹھویں جلد میں ان کے ڈرامے 'زبیدہ'، 'اناس' اور 'ایٹم بم' وغیرہ شامل ہیں۔ کئی ڈراموں کی اشاعت اور اسٹیج ہونے کی خبر بھی اس زمانے کے رسائل اور جرائد میں نظر آتی ہے۔ مگر تحقیق کے طالب علم کو اس کی دستیابی میں مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ مثلاً ڈراما 'یہ امرت ہے' یا 'پرچم' تک رسائی نہ ہو سکی۔ ''لال گلاب کی واپسی''، بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور اس شکل میں پہلی بار سامنے آرہا ہے۔ ان ڈراموں کے مضامین بھی متنوع رہے ہیں۔ فلمی دنیا سے لے کر ادبی شخصیات پر انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کو بھی اس کلیات میں شامل کرلیا گیا ہے۔

میں یہاں قومی اردو کونسل کے جملہ ممبران اور اراکین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی سبیل پیدا کی۔ ڈاکٹر شمس اقبال جو قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ہیں۔ انھوں نے بطور خاص اس کلیات بلکہ ضخیم کلیات کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ہر چند کہ میں اس کے لیے راضی نہیں تھا کہ یہ کلیات قومی کونسل سے شائع ہو لیکن ان کا یہ اصرار کہ آپ صرف قومی کونسل کے ڈائریکٹر نہیں ہیں بلکہ آپ کی بنیادی حیثیت اردو کے ایک محقق اور تنقید نگار کی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کلیات کی اشاعت کا سب سے زیادہ حق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی محبت کے طفیل کلیات خواجہ احمد عباس کی یہ آٹھ جلدیں آپ کے مطالعے کے لیے حاضر ہیں۔

اگر اس کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی نشان دہی فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں اسے دور کیا جا سکے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| ○ | پیش لفظ | | iii |
| ○ | اعتذار | | ix |


## وہ کہانیاں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں


| | | | |
|---|---|---|---|
| -1 | تانا بانا | ہفتہ وار 'عوامی دور' نئی دہلی، 26 فروری 1941 | 3 |
| -2 | بوائے | شاہراہ، جنوری-فروری 1954 | 16 |
| -3 | کالی گھٹا | نقوش، خاص نمبر دسمبر 1959 | 27 |
| -4 | کولڈ ویو/سرد لہر | شاعر، بمبئی 1960 | 48 |
| -5 | دنیا کی سب سے خوبصورت عورت | ساقی، کراچی افسانہ نمبر 1961 | 60 |
| -6 | ہاتھ کا میل/ بھکارن | نقوش جولائی 1962 | 70 |
| -7 | بھکارن | | 81 |
| -8 | داروغا اور لڑکی | شمع، نئی دہلی اکتوبر 1967 | 91 |
| -9 | بھوپال کی کیپٹن سلمیٰ | بیسویں صدی، سالنامہ 1987 | 100 |
| -10 | کارٹون | شاعر، افسانہ نمبر | 113 |
| -11 | آؤ تاج محل کو ڈھائیں | | 124 |
| -12 | دیوالی کے تین دیے | | 145 |
| -13 | سلمیٰ اور سمندر | | 156 |
| -14 | پانچ گھڑوں کا تاج محل | | 186 |

| | | |
|---|---|---|
| -15 | دل ہی تو ہے | 198 |
| -16 | مایا نگری/پنچھی پنجرہ اور اُڑان | 214 |
| -17 | ایوا کے دو چہرے | 228 |
| -18 | بمبئی | 242 |
| -19 | آج کے لیلیٰ مجنوں | 268 |
| -20 | واپسی کا ٹکٹ | 287 |
| -21 | سنترے | 308 |
| -22 | ایک تھا راجا | 331 |
| -23 | ہاتھی اور انسان | 341 |
| -24 | پیرس کی ایک شام | 349 |
| -25 | اداس دیواریں | 364 |
| -26 | انٹلکچوئل اور بینگن | 369 |
| -27 | دیوار کے پاس | 376 |
| -28 | مفلس مودی ٹون | 381 |
| -29 | رنگین جستجو | 393 |
| -30 | سہاگ رات | 406 |
| -31 | اسپرش/الس | 420 |
| -32 | چاکلیٹ اور وقت | 443 |
| -33 | بنارس کا ٹھگ | 456 |
| -34 | تین عورتیں اور ایک ریل | 475 |
| -35 | ڈریسنگ گاؤن | 477 |
| -36 | ڈیڈی | 483 |
| -37 | بچپن جوانی اور بڑھاپا | 521 |
| -38 | چار دانوں کی کہانی | 535 |
| -39 | بغیر عنوان کے | 579 |
| -40 | نیا طوفان | 593 |

# اعتذار

خواجہ احمد عباس اپنے موضوعات، اسلوب اور آہنگ کے باوصف اردو کے منفرد فکشن نگار (افسانہ نگار، ناول نویس، ڈراما نگار) ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ ان کے فکشن کے سرمایے کے تجزیے کے لئے اردو فکشن کی تنقید کو نئے محاورے کی ضرورت پیش آئے گی کیوں کہ ان کا ''سرمایۂ فکشن'' اپنے معاصرین کے فکشن سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی۔

خواجہ احمد عباس کو اس بات کا احساس تھا کہ:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلماں ہوں میں

چنانچہ اپنی تخلیقات کے حوالے سے مفتیان اردو ادب یا اپنے نکتہ چینوں کی رائے انہوں نے بار بار نقل کی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

''ادیب اور نقاد کہتے ہیں: خواجہ احمد عباس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ محض صحافی ہے، ادب کی تخلیق اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ فلم والے کہتے ہیں: اس کے فیچر فلم بھی محض ڈاکومنٹری ہوتے ہیں۔ وہ کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے۔

آرٹ کی تخلیق نہیں۔ اور خواجہ احمد عباس خود کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے: مجھے کچھ کہنا ہے...اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں کبھی بلٹز میں ''آخری صفحہ'' (Last Page) اور ''آزاد قلم'' لکھ کر، کبھی دوسرے اخباروں اور رسالوں کے لیے مضمون لکھ کر، کبھی افسانے کی شکل میں، کبھی ناول کی، کبھی ڈاکومنٹری فلم بنا کر، کبھی دوسروں کی فلموں کی کہانی یا ڈائیلاگ لکھ کر، کبھی کبھی خود اپنی فلم ڈائرکٹ کر کے۔

اور جو مجھے کہنا ہے وہ صرف یہی ہے کہ انسان کی اندرونی زندگی، اس کے ذاتی نفسیاتی مسائل اور اس کی بیرونی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک گہرا تعلق اور رشتہ ہے جو کچھ دنیا میں اس کے اپنے ملک اور اس کے سماج میں ہوتا ہے، اس کا اثر اس کے اپنے کردار پر اور اس کے افعال پر پڑتا ہے، جیسے جیسے دنیا، سماج، ملک کا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام بدلتا جاتا ہے اسی طرح انسان بھی بدلتے رہتے ہیں۔''

(خواجہ احمد عباس نمبر، ایوان اردو دہلی، دسمبر 1987ء، ص: 66)

خواجہ احمد عباس کی تحریریں اور تخلیقات، عوامی ادب کا بہترین اور قیمتی اثاثہ ہیں۔ عوامی ادب، ممکن ہے ادب عالیہ کا حصہ کبھی نہ بنے لیکن ادب عالیہ کو حیات بخشنے، اسے اعتبار اور اعتماد بخشنے میں اس کا اساسی کردار ہوتا ہے۔ عوامی ادب نہ ہو تو ادب عالیہ کے سوتے خشک پڑ جائیں گے۔ کمال یہ ہے کہ عوامی ادب اگر لامحدود ہوتا ہے تو ادب عالیہ کے قارئین بہت محدود بلکہ مخصوص ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا اثر بھی سماج کی تبدیلی اور تعمیر میں بہت کم ہوتا ہے۔

میر نے کہا بھی ہے کہ:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

خواجہ احمد عباس بھی عوام سے ہو کر خواص تک اپنی بات پہنچانا چاہتے تھے اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں، جتنا لکھا ہے ان کو پڑھنے کے لئے وقت

درکار ہے۔ پھر یہ لکھنا اگر محض قلم سے لکھنا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، مضامین، تبصرے، کالم، خاکے کے علاوہ سیلولائڈ گویا قلم سے کام نہ بنا، یا مطمئن نہ ہوئے تو "فلم" کا سہارا لیا۔ غالب کو تو صرف غزل ہی سے شکایت تھی ؎

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مگر خواجہ احمد عباس کاغذ اور قلم پر بھی قناعت نہ کر سکے اور سماج کی تنگی دامانی کے علاج کے لئے "اظہار کے مختلف پیرائے" کا سہارا لیا۔ خواجہ احمد عباس کی ادبی فتوحات کے اتنے رنگ ہیں کہ کسی ایک مضمون میں ان تمام پہلوؤں پر اجمالاً تو کیا مفصل گفتگو بھی ممکن نہیں ہے۔ تادمِ تحریر خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی قلمی اور فلمی خدمات کا ایماندارانہ جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے۔ ان پر لکھی جانے والی زیادہ تر کتابیں تشنہ ہیں۔

●

خواجہ احمد عباس جو ایک متوسط طبقے کے ہر نوجوان کی طرح پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے اور خود ان کے والدین کی بھی یہی خواہش اور کوشش تھی۔ لیکن علی گڑھ میں ان کے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیدین کی ایک تقریر نے ان کے نہ صرف زاویۂ نظر کو بدل دیا بلکہ زندگی کا رخ بھی موڑ دیا۔ انھوں نے اسی پل یہ فیصلہ لے لیا کہ انھیں اپنے بھائی جان کی طرح صحافی ہی بننا ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ہی الفاظ ہیں:

> "1925 کا ذکر ہے... کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں، سر محمد اقبال، سر علی امام، ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے، اپنی سیاسی تنظیم علاحدہ نہیں کرنی چاہیے۔" یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی... اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ

دیا.. اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا... اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔"

(غبارِ کارواں، آجکل جولائی 1971)

یہ ایک طویل مضمون کا حصہ ہے جسے میں نے ادھر اُدھر سے حذف کرکے آپ کے سامنے اس لیے رکھا ہے کہ میری بات کو تقویت ملے۔ کوئی چاہے تو تفصیل کے لیے ان کی انگریزی میں موجود سوانح "I am not an island" سے بھی رجوع کرسکتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے زمانہ طالب علمی میں ہی علی گڑھ سے ہی ایک اخبار Aligarh Opinion کے نام سے جاری کیا، جسے آج بھی کسی یونی ورسٹی کے طالب علموں کا پہلا ہفتہ وار اخبار کہا جاسکتا ہے۔ Aligarh Opinion نکالنے کی پاداش میں اس زمانے کے نائب شیخ الجامعہ نے انھیں یونی ورسٹی سے اخراج کی دھمکی بھی دی تھی۔ مگر اقبال کے اس شعر:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے، بہت اونچا، حد پرواز سے

کے مصداق دوران تعلیم ہی انھوں نے 'ہندوستان ٹائمز' اور 'بمبئی کرانیکل' کے لیے نامہ نگار کی خدمات انجام دیں۔ بی اے کے فوراً بعد دہلی کے ایک اخبار 'National Call' کے دفتر میں تین مہینے بحیثیت کارآموز (apprentice) کام کیا۔ خواجہ احمد عباس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

Let me record here that three months period in the 'National Call' really made me into a journalist
(I am not an Island: P 72)

خواجہ احمد عباس بنیادی طور پر ایک صحافی تھے مگر ایک ایسے صحافی جو باکردار تھے، جو کسی کے استحصال یا کسی کو استعمال کرنے کے پیش نظر قلم نہیں اٹھاتے تھے بلکہ حق اور سچائی کی آواز بلند کرنے کے لیے، نہایت بے باک انداز میں اپنی بات کہتے تھے۔ صحافت کے راستے سے ہی وہ فلم کی دنیا میں داخل ہوئے تھے، یعنی پہلے پہل وہ فلم پر تبصرہ لکھتے تھے اور اپنی بے باک رائے کی بنیاد پر ہی انھوں نے 'فلم مبصر' کا ایک معتبر مقام حاصل کرلیا تھا۔ قلم سے فلم تک کا ان کا سفر نہایت دلچسپ رہا ہے۔ وہ خود یہ بات کہتے تھے کہ میں نے اپنا سفر دو نقطے سے شروع کیا تھا اور 'ایک

نقطے' پر مکمل کیا۔ اگرچہ اس میں ان کو مالی اعتبار سے نقصان ہی اٹھانا پڑا، لیکن ان کی تشفی اس امر میں تھی کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوسکے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ صحافت اور فلم میں کچھ وصف قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے یعنی دونوں کا سروکار ہمارا عصری سماج، ہمارا اپنا زمانہ ہوتا ہے، نیز دونوں کی رسائی عام انسان تک ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کی تحریروں کا تعلق اسی لیے عام سماج کے عام آدمی سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد حیات بھی یہی تھا کہ ان کی بات، ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، اس حوالے سے ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔ بلٹز کا آزاد قلم/ رجحان ساز اور عہد ساز کالم کہا جاسکتا ہے۔ 'بلٹز' سے زیادہ قارئین کو اس کے آخری صفحے پر شائع کالم 'آزاد قلم' کا انتظار رہتا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ کہتی ہے کہ کالم نگاری کے حوالے سے یہ سب سے طویل عرصے تک لکھا جانے والا کالم تھا۔ 'بلٹز' میں انھوں نے کم و بیش 40 برسوں تک 'آزاد قلم' لکھا اور انھوں نے بہ وقت تقرری ہی یہ بات انتظامیہ کے پیش نظر رکھ دی تھی کہ وہ اپنے نظر اور نظریے کے اعتبار سے جو کچھ لکھیں گے، اسے بلٹز من و عن شائع کرے گا، کسی طرح کی کتر بیونت نہیں ہوگی، انھوں نے یہ بھی کہا کہ معاوضہ تو کم ہوسکتا ہے مگر میری یہ شرط باقی رہے گی۔ چنانچہ پوری زندگی وہ ملک میں رہے ہوں یا ملک سے باہر۔ بلٹز کے لیے 'آزاد قلم' کا لکھنا، کبھی نہیں بھولے۔ راج نرائن راز جو شاعر بھی تھے اور آجکل کے مدیر بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''جب ہفتہ وار اردو بلٹز جاری ہوا، تو وہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے لکھنے لگے۔ آزاد قلم کا آخری صفحہ بلٹز کے لاسٹ پیج کا ترجمہ نہیں بلکہ جداگانہ کالم ہوا کرتا تھا، ہندی اور اردو میں آزاد قلم کا کالم محض چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ زبان بیشتر سہل ہوا کرتی تھی۔ خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ میں: ''گویا کہ یہ کالم ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں جو اتر پردیش، مدھیہ پردیش، اور راجستھان میں پڑھے اور سمجھے جاتے تھے گویا یہ بھارت کی دھرتی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔''

لاسٹ پیج، صحافت کی تاریخ میں اس اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہ 39 برس تک ایک تواتر سے شائع ہوتا رہا۔ یہ دنیائے صحافت کا سب سے

زیادہ عرصے تک شائع ہونے والا کالم ہے اور شاید یہی بات آزاد قلم کے آخری صفحے کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔''

(خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار، ص 230)

یہاں مجھے صرف ایک اضافہ کرنا ہے کہ شاید نہیں بلکہ یقیناً 'آزاد قلم' اردو صحافت کی تاریخ میں لکھا جانے والا 'طویل العمر' یا طویل مدتی کالم ہے۔

بلٹز کے 'آزاد قلم' کا آج اگر تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو کچھ دلچسپ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ 'آزاد قلم' کا موضوع بالکل آزاد ہوتا تھا۔ خواجہ احمد عباس نہایت آزادانہ طور پر قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی ادبی اور لسانی موضوعات پر بے باکانہ اسلوب میں اظہار خیال کرتے تھے۔ دوسرا اہم پہلو 'آزاد قلم' کا یہ تھا کہ اس کے صفحے کے بائیں ہاتھ کے کونے پر کبھی کسی فلمی ہیرو، ہیروئین یا ادیب کی تصویر ہوتی تھی، اور اس تصویر کے ساتھ کوئی شعر یا کوئی اطلاع ہوتی تھی مثال کے طور پر 'قاضی سلیم' کی تصویر کے ساتھ یہ شعر:

ہر قدم پر لٹا کر متاعِ نظر
میں نے گھر گھر سے آنسو اکٹھے کیے

منفرد شاعر قاضی سلیم جو اب ممبر پارلیامنٹ بھی بن گئے، درج ہے۔''

(بلٹز، 12 جنوری 1980)

پرویز شاہدی کی تصویر کے ذیل میں یہ عبارت درج ہے:

''رقص حیات اور تثلیث حیات کے خالق، جن کی شاعری میں مخدوم اور جاں نثار اختر کی طرح تخلیقی صلاحیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔''

(بلٹز، 10 مئی 1980)

بلٹز کے آزاد قلم کا مطالعہ ہمارے سامنے ہندوستان کے عوامی اور عام مسائل کا پورا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعے اس عہد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ملی اور ادبی صورت حال بھی سامنے آتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے یہاں انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی نیز معلومات عامہ پر ان کی نظر کتنی گہری تھی۔ یہاں بلٹز کے 'آزاد قلم' کے چند

عناوین بطور مشتے نمونہ از خروارے درج کرتا ہوں کہ لفافے سے بھی مضمون تک پہنچا جاسکتا ہے:

''کیا کوئی کلچر اور زبان مرسکتی ہے؟''

(بلٹز 10 مئی 1980)

''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: گاندھی جی کے ساتھی مظہرالحق''

(بلٹز 24 مئی 1980)

''حیدرآباد کا 'شہر اور سپنا' کب بسایا جائے گا؟

کہاں بسایا جائے گا؟

''کیا اسمبلیوں کے چناؤ دوبارہ ہوں گے''

(بلٹز، 31 مئی 1980)

''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

(بلٹز، 27 مارچ 1965)

''روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ!''

(بلٹز، 17 فروری 1965)

سامراج، سوراج، کامراج، رام راج؟

(بلٹز، 21 فروری 1963)

''رہتا ہے دل وطن میں!''

(بلٹز، 8 فروری 1964)

جھوٹا سچ یا سچا جھوٹ

(بلٹز، 11 مارچ 1964)

''نئی سیتا، نئی زلیخا، نئی مریم''

(بلٹز، 14 مارچ 1964)

ایسے کئی مضمون کے عنوان یہاں نقل کیے جاسکتے ہیں۔ مگر آخری عنوان سے لکھے جانے والے کالم کی چند سطریں، آپ ملاحظہ فرمائیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ کیا 1964 کے

ہندوستان اور 2014 کے ہندوستان کی تصویر بدلی ہے؟؟ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

"آج وہ سب باہر نکل آئی تھیں اور بمبئی کی سڑکوں پر کندھے سے کندھا ملا
کر مارچ کر رہی تھیں۔

سیتا، ساوتری، عائشہ، خدیجہ، میری
سلمہ، سونی، جولیٹ، پدمنی
لیلٰی، لیلا، للی
موہنی، محمودہ، مارگریٹ

ملوں میں کام کرنے والی نوگز کی ساڑی پہننے والی مہاراشٹری عورتیں...
دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں، اسٹینوگرافر، ٹائپسٹ گرلز، کلرک، پلاسٹک کے
کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں۔
دواؤں کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں، بیڑی بنانے والیاں،
بسکٹ بنانے والیاں...

ساڑیاں، فراک، شلوار، لمبی چوٹیاں، کٹے ہوئے بال۔ کسی کے ماتھے
پر بندی، کسی کے ہونٹوں پر لپ اسٹک، کسی کے ہاتھوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں، کسی
کی انگلی پر شادی یا منگنی کی انگوٹھی، کسی کی گود میں بچہ، مگر ہر ایک کے ہاتھ میں ایک
انقلابی سرخ پھریرا۔ ہر ایک کے دل میں ایک نئی امنگ، ایک نیا جوش، ہر ایک کی
زبان پر ہندوستان کی کام کرنے والی نئی عورتوں کے نعرے۔
"مہنگائی کا خاتمہ کرو!
کام کرنے والی عورتوں کو برابر کے حقوق دو
چولہا جلانے والی گیس کی قیمت کم کرو، تیل کی کمپنیوں کو عوام کی ملکیت بناؤ،
کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بال گھر Creche بناؤ۔
شادی شدہ کام کرنے والیوں پر سے پابندیاں ہٹاؤ۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کی فکر کیا تھی؟ ان کے

والا نوجوان اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہنا چاہتا ہے۔ وہ دونوں دروازے سے باہر ہوئے ہی تھے کہ وہ میری طرف مڑ کر بولا: 'مجھے آپ سے علیحدگی میں کچھ بات کرنی ہے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ تو ایسے ہی چلا آیا تھا۔ آپ کے گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا مجھے۔'

''کہو بھئی کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی وہ۔ بات یہ ہے۔ دراصل مجھے فلم میں کام کرنے کا شوق ہے''

یہ مکالمہ میں اوسطاً ایک نوجوان کی زبان سے ہر روز سنتا ہوں۔ سو میں نے کہا بڑی خوشی کی بات ہے۔

امریکن بش شرٹ نے کہا: ''تو پھر آپ کی پکچر میں کام مل جائے گا؟''

میں نے کہا: ''نہیں''

''تو پھر اور کہیں سفارش کر دیجیے''

''مثلاً کہاں؟''

''راج کپور کے نام چٹھی دے دیجیے''

''راج کپور تمھیں نہیں لے گا'' میں نے نہایت سنجیدہ منہ بنا کر کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تمھیں دیکھ کر اسے خدشہ ہوگا کہ کہیں تم اس کی جگہ نہ لے لو''

''آپ تو مذاق کر رہے ہیں''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا: ''کہاں سے آئے ہو؟''

''یوپی میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے''

''تعلیم کہاں تک ہے تمہاری؟''

''میٹرک تک''

''پاس یا فیل؟''

تھوڑی دیر بعد جواب ملا 'فیل' اور ایسا محسوس ہوا کہ اس کے بش شرٹ پر بنے ہوئے اُلو آنکھیں چمکا رہے ہیں۔

"تو ایسا کرو گھر واپس جاؤ اور بی۔اے تک پڑھ کر آؤ۔ تب میں تمھارے لیے کوشش کرسکتا ہوں"

"اِس کا مطلب ہے آپ میری مدد نہیں کرنا چاہتے؟"

"تو یہی سمجھو۔ گھر سے بھاگے ہوئے میٹرک فیل نوجوان کو ہیرو بنوانے کا میں نے ٹھیکہ نہیں لیا ہے"۔ میں نے کسی قدر سختی سے کہا حالانکہ یہ مکالمہ بھی میں تقریباً ہر روز بولتا ہوں۔

دفعتاً وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے دلیپ کمار جیسے بالوں کی لٹ اس کے ماتھے پر آ گری۔ ایسا لگا جیسے اس کی چیختے ہوئے رنگوں کی بش شرٹ کے تمام طوطے، مرغے اور اُلو بیک وقت چیخنے لگے ہوں۔

"ٹھیک ہے صاحب" وہ بولا ڈرامائی انداز میں جیسے دوسرے درجے کی فلم کا تیسرے درجے کا سائڈ ہیرو ڈائیلاگ بولتا ہے۔ "اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے مگر کوئی پرواہ نہیں ہمارا بھی خدا ہے صاحب"۔

اس مکالمے کا بھی میں عادی ہوں۔ سو میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ اللہ میاں نے بھی کوئی فلم کمپنی کھول رکھی ہے"۔

"اچھا صاحب تو میں جاتا ہوں۔ اب میں آپ سے تب ہی ملوں گا جب میں ہیرو بن جاؤں گا"۔

اور وہ امریکن بش شرٹ مجھ سے ناراض ہوکر چلی گئی۔ وہ نیلے رنگ کے طوطے اور ہرے رنگ کے مرغے اور گلابی رنگ کے اُلو بھی چلے گئے اور میں کافی دیر تک اس نوجوان کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایسے ایسے سینکڑوں نوجوانوں سے ہر برس میرا واسطہ پڑتا ہے لیکن اس امریکن بش شرٹ والے میں کوئی خاص بات تھی۔ اگرچہ دیر تک سوچنے کے بعد بھی میں یہ طے نہیں کرسکا کہ وہ خاص بات کیا تھی۔

اگلے ہفتے میں مومن پورہ کی اس لائبریری کے افتتاح میں گیا۔ بڑا مجمع تھا مگر کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں۔ دس ہزار کی بستی میں لائبریری کے ممبر صرف چالیس ہی تھے۔ لیکن چار ہزار آدمی افتتاح کے ساتھ ..... وہ سننے آئے تھے۔ تقریریں ہوئیں۔ ہار پہنائے گئے اور پھر غزلوں

اور نظموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں شہر سے دور جوہو رہتا ہوں۔ اس لیے؟ اجازت لے کر مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے ہی اکیلا چل کھڑا ہوا۔ بڑی سڑک پر پہنچنے کے لیے ایک گلی میں سے گزر رہا تھا جو مشکل سے چھ سات فٹ چوڑی ہوگی۔ اب نہ جانے آپ لوگ بمبئی کی سڑکوں اور گلیوں کے بارے میں اس حقیقت سے واقف ہیں کہ نہیں، دن میں یہ سڑکیں اور گلیاں ہوتی ہیں ان پر موٹریں، گھوڑا گاڑیاں نہیں۔ ٹرامیں، موٹر سائیکلیں، اسکوٹر چلتے ہیں۔ مگر رات کو یہی راستے اور ان کے کنارے کے فٹ پاتھ سینکڑوں مل کے بیڈروم بن جاتے ہیں۔ جن پر آپ ہزاروں انسانوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو۔ ان کے کتے اور بلیوں کو سوتے ہوئے پائیں گے۔ یہ جائے عروس البلاد الہند بمبئی کا خاص الخاص طرۂ امتیاز ہے۔ (جن کا آپ کے جیسے چھوڑے ہوئے شہر اور قصبے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتے۔) ہاں تو میں اس گلی میں سے گزرا تو دیکھا کہ یہاں سے وہاں تک بستر ہی بستر پھیلے ہوئے ہیں۔ سفید براق چادروں اور ریشم سے کڑھے ہوئے تکیوں والے بستر۔ میلی اور پھٹی دریوں والے بستر، اور ان پر لوگ سوئے ہیں۔ کچھ تاش کھیل رہے ہیں۔ ایک بیٹھا ہوا، جاپانی توشوکوٹو باجا جسے بلبل ترنگ بھی کہتے ہیں، بجا رہا ہے اور دونوں طرف گندی نالی بہہ رہی ہے، جسے بمبئی کی بھاشا میں 'گٹر' کہتے ہیں۔

لیکن اسے آپ گندی نالی کہیے، گٹر کہیے، عطر کہیے۔ اس بدبو کا ایک بھپکا اصغر علی محمد علی کی دس عطر کی دکانوں پر بھاری ہوتا ہے۔ ہاں تو میں پھونک پھونک کر قدم دھرتا ہوا۔ اس گلی میں گزر رہا تھا کہ میرے پاؤں نے کوئی کپڑا الجھا ہوا محسوس کیا میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ کپڑے کو اٹھا کر میونسپلٹی کی بتی کی پیلی روشنی میں دیکھا تو وہی جانی پہچانی امریکن بش شرٹ تھی مگر اب کے چیختے ہوئے رنگ برنگے طوطے اور مرغے اور الو، دس دن کی مَیل اور دھبوں سے دھیمے پڑ گئے تھے۔ میں نے برابر میں بچھے ہوئے بستر کی طرف دیکھا۔ ایک پھٹی ہوئی میلی چٹائی پر ہاتھ کا تکیہ کیے وہی نوجوان سو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مَیلی بنیان میں سے اس کے دبلے بدن کی ہڈیاں اور پسلیاں الگ الگ نظر آ رہی ہیں اور اس کے پتلون کے کیچڑ سے بھرے ہوئے پانچے ٹخنوں سے اوپر تک اٹھے ہوئے ہیں اور جوتا جو شاید چوری کے ڈر سے سوتے وقت بھی اس کے پیروں میں ہے، اس کے دونوں تلووں میں سوراخ ہو گئے ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی پھٹی ہوئی

جیان میں سے نکلی ہوئی ہڈیاں پسلیاں مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں مگر ایک بار پھر میں یہ طے نہ کر سکا کہ وہ مجھ سے کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے چپکے سے بش شرٹ اس کے سرہانے رکھ دی اور وہاں سے چلا آیا۔

اس کے پندرہ بیس روز بعد مجھے ایک اسٹوڈیو میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا ایک ڈائریکٹر دوست اس دن وہاں ایک MOB SCENE شوٹنگ کر رہا تھا۔ فلمی اصطلاح میں MOB SCENE اس منظر کو کہتے ہیں جس میں ایک بھیڑ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے سینکڑوں ایکسٹرا بھرتی کیے جاتے ہیں۔ پانچ روپے روز پر جس میں سے سوا روپیہ ایکسٹرا سپلائر اپنا کمیشن کاٹ لیتا ہے۔ تو اس دن جو سین لیا جا رہا تھا وہ یہ تھا کہ شاہی محل کے دروازے پر ننگے بھوکوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے اور ملکہ کے بیٹا ہونے کی خوشی میں بھوکوں کو کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ ابھی سین میں وقت تھا۔ ریہرسل کیا جا رہا تھا۔ اس بھیڑ میں سے گزر کر میں اپنے دوست سے ملنے جا رہا تھا کہ ننگے بھوکوں کے اس گروہ میں مجھے ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ مگر اب وہ اس بش شرٹ کے بجائے اسٹوڈیو سے ملی ہوئی ایک میلی دھوتی اور پیوند لگی ہوئی بنڈی پہنے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے شرم کے مارے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ اس لیے میں نے بھی وہاں سب کے سامنے بات کر کے اسے شرمندہ نہیں کیا۔ بعد میں جب ڈائریکٹر سے بات کر رہا تھا اور سین لینے کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا اس کی سفارش کر دوں کہ اس سین میں اسے بولنے کے لیے کوئی مکالمہ دے دیا جائے تاکہ اس کو پونے چار روپے کے بجائے، ساڑھے سات روپے مل جائیں لیکن تب مجھے یاد آیا کہ مجھے تو اس کا نام بھی نہیں معلوم اور اپنے دماغ میں، میں اسے اب بھی امریکن بش شرٹ کے نام سے ہی یاد کر رہا تھا۔

اس واقعہ کو کوئی ہفتہ بھر گزرا ہوگا کہ ایک صبح کو دروازے پر کسی نے بڑے ہی آہستہ سے گھنٹی بجائی جیسے وہ بٹن دباتا ہوا ہچکچا رہا ہو۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا وہی نوجوان کھڑا ہے لیکن حالت پہلے سے بھی بدتر۔ آنکھیں سرخ جیسے رات بھر سویا نہ ہو۔ گال پچکے ہوئے جیسے کئی وقت سے کھانا نہ ملا ہو۔ کپڑے میلے چکٹ۔ کئی دنوں کی داڑھی بڑھی ہوئی۔ میں نے اندر بلا کر کہا 'بیٹھو' مگر وہ بیٹھا نہیں کھڑا رہا اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں کسی اندرونی جلن سے

چمک رہی ہیں۔

ایک بار میرا دل چاہا کہ اس سے پوچھوں، کیوں بھئی اللہ میاں کے اسٹوڈیو میں فلمی ہیرو بن گئے؟

پھر اس حالت میں اس بے چارے کو طعنہ دیتے ہوئے مجھے شرم آئی۔ سو میں نے کہا ''کیوں بھئی اچھے تو ہو؟'' حالانکہ یہ سوال بھی نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ اس کے لیے شاید تکلیف دہ بھی تھا۔

پھر بھی کوشش کر کے وہ مسکرایا اور میرے سوال کے پیچھے جو سوال چھپا ہوا تھا، اس نے اس کا بھی جواب دیا۔

''جی اچھا ہوں اب میرا فلمی بخار اتر گیا ہے''

''بہت اچھی بات ہے اگر تم گھر واپس جانا چاہتے ہو تو میں تمھیں ریل کا کرایہ دے سکتا ہوں''

''جی شکریہ! مگر اس حالت میں گھر جانا نہیں چاہتا۔ نہ میں کسی سے کرائے کی کوئی بھیک مانگنا چاہتا ہوں۔ کوئی اور کام کرنا چاہتا ہوں''

اس کی آواز ایسی تھکی ہوئی بلکہ مردہ تھی کہ میں نے سوچا، نہ جانے غریب کب سے بھوکا ہے سو میں نے کہا 'تم بیٹھو میں تمھارے لیے چائے لاتا ہوں'۔

میرے پیچھے پیچھے اس کی تھکی ہوئی آواز آئی جیسے کوئی اپاہج بڑھیا گھسٹ گھسٹ کر چل رہی ہو۔ جی۔ نہیں۔ آپ۔ تکلیف۔ نہ''۔ اور پھر دھڑام کی آواز ہوئی اور جب میں بھاگ کر برآمدے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ بے ہوش پڑا ہے۔

اس شام کو میں نے اس سے پہلی بار اطمینان سے باتیں کیں۔

''سب سے پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمھارا نام کیا ہے؟''

''جی میرا نام تو محمد طاہر ہے'' اور پھر ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی ''مگر میرے گھر والے سب مجھے تاتا کہتے ہیں''

''تو گویا تم اپنے وقت کے تاتا شاہ ہو''

''جی نہیں یہ وہ تانا شاہ نہیں یہ تانا بانا کا تانا ہے''

''کیا کرتے ہیں تمھارے گھر والے؟''

''تانے بانے کا دھندا۔ مطلب یہ ہے کہ کپڑا بُنتے ہیں۔ میں بھی یہاں آنے سے پہلے اسکول کے وقت کے علاوہ یہی کرتا تھا۔ پر میرے ابا جو ہیں وہ ایسی مہین ساڑی بنتے ہیں کہ کیا آپ کی مشین کی بُنی ململ تن زیب ہوتی ہوگی''

'کس سے سیکھا یہ کام تمھارے ابا نے؟''

''اپنے ابا سے اور انھوں نے اپنے ابا سے۔ اسی طرح سات پیڑھیوں سے ہمارے گھر کے کرگھوں پر مہین ساڑیوں کا تانا بانا ہوتا رہا ہے۔ ہمارے دادا کے دادا محمد بخش بنکر تھے جو شاہ جہاں بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا کے لیے تن زیب کمخواب اور گلبدن بُنا کرتے تھے'' اور میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں خوشی اور فخر کی چمک دیکھی۔

''تو کیا تمھارے خاندان والے پہلے دہلی میں رہتے تھے؟''

''نہیں دراصل ہمارا قصبہ شاہزادی جہاں آرا کا بسایا ہوا ہے۔ ان کی وجہ سے ہی سارے ملک کے بہترین کاریگر اور دستکار وہاں آکر بس گئے تھے۔ ان میں ہی ہمارے لکڑ دادا بھی تھے۔''

''کیا نام ہے تمھارے قصبے کا؟''

''ایک زمانے میں تو اسے جہاں آرا کے نام سے جہاں آباد کہتے تھے۔ اب اسے مئو کہتے ہیں''

''مئو جو اندور کے پاس ہے؟''

''نہیں یہ ہے مئو ناتھ بھنجن جو یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں ہے۔''

''م ون اتھ بھن جن!'' میں نے مشکل سے وہ نام دہرایا ''بڑا عجیب نام ہے'' اور اس کے بعد میں اس قصبے کو بھلا کر اس سے دوسری باتیں کرتا رہا۔

آخر کار میں نے اس سے پوچھا: ''تمھارے ابا اتنے اچھے اور مشہور کاریگر ہیں تو تم وہاں سے بھاگے کیوں؟ اور اب وہاں واپس کیوں نہیں جاتے؟''

اب اس نے بتایا کہ ہاتھ کرگھے کا دھندا مشینوں کے کپڑے کے مقابلے کی وجہ سے مندا ہے۔ ملوں کی بُنی ہوئی ساڑیوں کی قیمتوں سے ان کے ہاتھ کی بُنی ہوئی ساڑیاں مقابلہ نہیں کر

سکتیں۔'' کبھی کبھی تو مہینے بھر میں ابا کو بس دو چار ساڑیوں کا آرڈر بھی مشکل سے ملتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ رک گیا، جیسے سوچ رہا ہو کہوں یا نہ کہوں پھر بولا ابا بہت بڑھے ہو گئے ہیں۔ سٹھیا گئے ہیں ہر وقت تانا بانا کے چکر میں پڑے رہتے ہیں''

''تانا بانا کا چکر؟ وہ کیا ہے؟''

''انھوں نے اپنی ساری زندگی کرگھا چلاتے ہی گزاری ہے نا سو وہ کہتے ہیں یہ دنیا کا دھندا کچھ نہیں ہے۔ بس تانا ہے اور بانا ہے۔ کہیں سکھ کا تانا ہے دکھ کا بانا ہے۔ کہیں محنت کا تانا ہے اور محبت کا بانا ہے اور قسمت کے کرگھے پر تانے اور بانے کے اس ملاپ کا نام زندگی ہے۔ ان کا بس چلے تو ساری دنیا کے ملکوں کی یہ سیاست، یہ سائنس، یہ ترقی ہر چیز کو تانے بانے کا کھیل ثابت کر دیں''

میں نے کہا: تمھارے ابا کچھ غلط نہیں کہتے طاہر میاں۔ میں تو سمجھتا ہوں انھوں نے اپنے اس تانے بانے میں زندگی کے اصل راز کو پالیا ہے۔ سائنس داں اسے منفی اور مثبت اصول کہتے ہیں اور مارکسی فلسفی اسے THESIS اور ANTI THESIS کہتے ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہوگا صاحب میں یہ باتیں نہیں جانتا پر اس تانے بانے کے چکر میں وہ مجھے بھی تو ابھی سے پھنسانا چاہتے ہیں۔ تب ہی تو میں یہاں بھاگ آیا ہوں۔

''یعنی وہ چاہتے ہیں تم ان کے ساتھ مل کر کام کرو؟ اس میں حرج کیا ہے؟ تم نے تھوڑا پڑھا لکھا ہے تو تم ان کے کام کو اور بھی ترقی دے سکتے ہو۔''

''نہیں صاحب، کام کی بات ہی نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں میں ابھی سے شادی کرلوں۔ وہ کہتے ہیں کنوارا انسان بس تانا ہوتا ہے، جب تک اس کے ساتھ بانے کو نہ ملایا جائے، زندگی کی بناوٹ نہیں ہو سکتی۔''

میں نے پوچھا: ''تو پھر انھوں نے تمھارے لیے کوئی بانا چنی؟''

''جی ہاں! اسی سے بھاگ کر تو میں یہاں آیا ہوں۔''

''کون ہے وہ لڑکی؟''

''ہمارے پڑوسی ہیں چاچا رحمت۔ ان کی بیٹی ہے بانو، پر مجھے چھیڑنے کے لیے اسے

سب بانو کی بجائے بانا کہتے ہیں۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا" تانا بانا۔ بانا تانا۔ بھئی خیال تو بڑا اچھا ہے مگر تم اس بیاہ کے کیوں خلاف ہو۔ لڑکی بہت بھیانک ہے کیا؟"

"نہیں نہیں" اس نے جلدی سے کہا۔

"لڑکی تو ٹھیک ہے۔ صورت شکل کی بری نہیں ہے۔ تھوڑی پڑھی لکھی بھی ہے، پر صاحب آپ خود ہی سوچئے گھر میں کھانے کو پورا نہیں پڑتا۔ کرگھے کا کام اتنا مندا ہے میری تعلیم بھی ادھوری ہے۔ کوئی نوکری بھی نہیں۔ ایسی حالت میں اس بے چاری کو بھی مصیبت میں پھنسانا کہاں کی شرافت ہے۔ اسی لیے تو بمبئی آیا تھا کہ شاید کوئی کام مل جائے۔"

جس طرح سے اس نے 'اس بے چاری' کہا اور جو چمک اس کی آنکھوں میں بانو کا نام لینے سے پیدا ہوگئی تھی۔ اس سے میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ میں نے کہا 'سچ سچ بتاؤ تم اس سے محبت کرتے ہو نا؟

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا لیکن موضوع بدلنے کے لیے جلدی سے بولا" ہاں تو پھر آپ خط دیتے ہیں نا کرگھے والوں کی اس کوآپریٹیو کے نام؟"

اس دن کے بعد کافی عرصے تک میری اس سے کوئی ملاقات نہ ہوئی مگر لوگوں کی زبانی مجھے اس کی خبر ملتی تھی۔ کرگھوں کی کوآپریٹیو میں اس نے بڑا جی لگا کر کام کیا۔ اس کے سیکریٹری مجھے ایک بار ملے تو انھوں نے طاہر کے کام کی بڑی تعریف کی اور میرا شکریہ ادا کیا کہ ان کو اتنا اچھا اور کام کا آدمی دیا۔ پھر سنا کہ چھٹی کے وقت میں وہ بمبئی کے کسی آرٹسٹ سے ڈیزائننگ کا کام سیکھ رہا ہے۔

اور اس کے کئی ڈیزائن مومن پورہ کی کرگھا کوآپریٹیو نے چالو بھی کیے اور وہ مارکیٹ میں بہت کامیاب رہے۔

یہ بھی تھا کہ اس نے تھوڑا بہت پیسہ بھی پس انداز کرلیا۔

لیکن وہ گھر واپس نہیں گیا۔ اس میں مجھے نہ جانے کیوں ایک بے چینی؟

پھر ایک دن وہ مجھ سے ملنے آیا۔

سفید کپڑے پہنے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر۔ میں نے دیکھا کہ ٹیکسی کے پیچھے ایک صندوق اور بستر بندھا ہوا ہے۔

کہنے لگا: میں مئو واپس جا رہا ہوں۔ آپ کو خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔ اور جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے۔

میں نے کہا: کیوں بھئی کیا ہوا؟ ایک دم جانے کا فیصلہ کرلیا؟۔

وہ بولا: جی وہ بات یہ ہے کہ چاچا رحمت کا خط آیا ہے.... بانو کے والد کا..... میں نے کسی قدر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

'تو بانو کے والد کا خط آیا ہے؟'

جی ہاں، انھوں نے کسی سے لکھوا کر بھیجا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر تم بھی بانو سے شادی کرنا چاہتے ہو تو جلد یہاں پہنچو ورنہ ہم اس کی نسبت کسی اور سے کر دیں گے۔

اور سو، تم جا رہے ہو؟

جی ہاں، جانا ہی چاہیے۔

تم ٹھیک کہتے ہو طاہر۔ تمھیں جانا ہی چاہیے۔

تو آپ کبھی آیئے نا، مئو ناتھ بھنجن۔

دیکھو موقع ملا تو آؤں گا۔ اگر تمھارے قصبے کا یہ جڑا توڑ نام یاد رہا تو۔

اچھا، تو بہت بہت شکریہ اور خدا حافظ!۔

''خدا حافظ!''

اس کی ٹیکسی روانہ ہوگئی اور میں سڑک پر کھڑا سے دھول کے بادلوں میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ میرے من میں ایک عجیب خوشی اور ایک عجیب ملال کا احساس تھا۔ جیسا ایک افسانہ نگار کو کہانی مکمل کرنے پر ہوتا ہے، مگر ساتھ ہی ہلکا سا خدشہ بھی کہ کہیں میری دخل اندازی سے اس کہانی کا انجام تو غلط نہیں ہو جائے گا۔ بات یہ ہے کہ طاہر کو چاچا رحمت علی کی طرف سے جو خط ملا تھا وہ میرا ہی لکھا ہوا تھا۔

کئی مہینے کے بعد.....

سید سجاد ظہیر صاحب کا خط آیا کہ 'عوامی دور' کے لیے یوپی میں کئی جگہ مشاعروں اور کہانیوں کی رات کا پروگرام بنا ہے۔

میں نے لکھا کہ مجھے معاف کریں۔ کام بہت ہے، بمبئی چھوڑنا ناممکن ہے۔

پھر وہ خود آئے اور میں نے زبانی ان سے عرض کیا کہ مجھے معاف کریں۔ بعض مجبوریاں ایسی ہی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ 'بھئی کم سے کم مئو تو چلو'

'وہاں کسان کانفرنس بھی ہے۔'

میں نے پوچھا 'کون سا مئو؟ اندور کے پاس جو ہے؟'

'نہیں نہیں یہ مئو ناتھ بھنجن ہے اعظم گڑھ کے ضلع میں'

'مئو ناتھ بھنجن' اور میرے کانوں میں طاہر کی آواز آئی۔ 'تو آپ کبھی آیئے نا۔ مئو ناتھ بھنجن۔'

اور سو میں وہاں گیا۔ اپنے افسانے کے انجام کی تلاش میں۔ طاہر مجھے اسٹیشن پر ملا اور سیدھا مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میں نے دیکھا اس کے کرگھے پر نہایت خوب صورت ڈیزائن کی ساڑی بُنی جا رہی ہے سنہری تانا ہے اور روپہلی بانا اور جیسے جیسے بُناوٹ ہوتی جا رہی ہے پھول کھلتے جا رہے ہیں۔

میں اس کے والد سے ملا۔ میں نے ان سے کہا آپ سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے آپ کے تانے بانے کے فلسفے کا ذکر سنا ہے اور میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں۔

اور سفید داڑھی والے بڑے میاں نے کہا 'تم یہاں آئے ہو بمبئی سے مئو ناتھ بھنجن میں۔ یہ بھی قسمت کے کرگھے کا کھیل ہے یہاں کسانوں کی کانفرنس ہو رہی ہے نا۔ سو تانا محنت کا ہے اور بانا'

'محبت کا' میں نے ان کا جملہ پورا کیا۔

اور پھر طاہر نے آواز دی 'بانو آؤ نا۔ ابا نے کہہ دیا ہے کہ ان سے پردہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'

چک ہٹی اور اندر کے کمرے سے بانو داخل ہوئی۔ حیا سے سر ڈھانکے ہوئے، آنکھیں جھکائے

ہوئے۔ اس نے جھک کر آداب کیا۔ میں ان دونوں سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ محبت کے بارے میں۔ ان کے تاریخی وطن کے بارے میں۔ اس قصبے کے بارے میں، جہاں مدتوں سے محنت کش انسان کی دست کاری نے کپڑے کی زمین میں فن کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ اس قصبے کے بارے میں جس کے لوگ آزادی کی جنگ میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ محنت اور محبت کے تانے بانے سے ہمیشہ زندگی کی، حسن کی، آزادی اور ترقی کی بناوٹ ہوتی ہے یہ کرگھا ہمیشہ سے چلتا آیا ہے اور ہمیشہ چلتا رہے گا۔

مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میری زبان سے صرف دو مختصر الفاظ نکلے۔

''تانا۔ بانا۔''

(ہفتہ روزہ ''عوامی دور'' نئی دہلی، 26 فروری 1941)

○

# بوائے

'بوائے!'
'یس سر'
'ڈز فور ٹو'۔
'یس سر'۔
'بوائے'۔
'یس سر'۔
'ون بڑا پیگ وہسکی اینڈ سوڈا'۔
'یس سر'۔
'بوائے!'۔
'یس سر'۔
'چکن الا کیف'۔
'یس سر'۔
'تندوری مرغ'۔

'یس سر'۔

'ٹوماٹو جوس، کولڈ میٹ، رشن سیلیڈ، آئس کریم، کافی'۔

'یس سر'۔

'بوائے!'۔

'یس سر'۔

اشوک کو جواب میں بھی 'بوائے' کی آواز بازگشت ہی سنائی دیتی تھی، اور اس کے باقی ساتھیوں کا بیان تھا کہ وہ سوتے سوتے بھی اکثر 'یس سر' بڑبڑایا کرتا ہے۔

وہ نئی دلی کے 'کیفے پیرس' میں دو برس سے ویٹر کا کام کرتا تھا، تنخواہ صرف بیس روپے مگر 'ٹپ' ملا کر پچاس کی اوسط پڑ جاتی تھی پھر کھانا مفت۔ اس بے کاری اور مہنگائی کے زمانہ میں بے۔ اے پاس لڑکوں کو بھی اتنا کہاں ملتا ہے۔ اور پھر اشوک تو صرف میٹرک ہی پاس تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی وہ سوچا کرتا تھا کہ کالج میں پڑھے گا۔ بڑا سرکاری افسر بنے گا۔ کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرے گا۔ بنگلے میں رہے گا...... مگر زندگی کے سب خواب کب پورے ہوتے ہیں...... اور پھر آج کل بی۔ اے کرنے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ اس کا ایک دوست نرمل جس نے بی۔ اے کیا تھا، ایک دفتر میں چپراسی ہی تو تھا۔ تنخواہ پچاس روپے مہینہ خشک، جس میں سے پانچ روپے کوارٹر کے دیتا تھا۔ کھانے کا خرچ اپنی جیب سے۔ اس کے مقابلے میں اشوک کافی خوش قسمت تھا کہ کھانا مفت۔ رات کو ہوٹل بند ہونے پر وہ کسی میز کے نیچے کوئی میلا میز پوش اوڑھ کر سو جاتا تھا اور مہینے کی پہلی کو بیس پچیس روپے اپنے گھر منی آرڈر کر دیتا تھا۔

'کیفے پیرس' کے کام میں اور بھی کئی فائدے تھے۔ پہننے کو یونی فارم مفت ملتی تھی۔ دھوبی کا دھلا سفید کوٹ، سفید ٹوپی جوتے۔ کیفے کے مالک کو اس بات پر بڑا ناز تھا کہ اس کے ویٹر ہمیشہ اُجلے کپڑوں میں ملبوس نظر آتے تھے، مگر اشوک کو کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سفید کپڑے اس کی انفرادیت اور خودداری کا کفن ہیں۔ ان کو پہنتے ہی اس کی اپنی ہستی مرجاتی ہے۔ اب وہ میٹرک تک پڑھا ہوا بائیس برس کا جوان ایک سمراٹ کا ہم نام اشوک نہیں بلکہ 'کیفے پیرس' کا ایک گمنام بلکہ بے نام ویٹر ہے۔ جس کو صرف بوائے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

'بوائے!'

'بوائے!'

'بوائے!' دن بھر اس کی خودی پر اس نام کے طمانچے پڑتے تھے۔

باریک زنانہ نخریلو آواز میں 'بوائے!'

موٹی مردانہ رعب دار آواز میں 'بوائے!'

حلق میں سے نکلی ہوئی کھنکارتی ہوئی بلغمی آواز میں 'بوائے!'

گاتی ہوئی آواز میں 'بوائے!'

ناچتی ہوئی آواز میں 'بوائے!' 'بوائے!' 'بوائے!' 'بوائے' 'بوائے!'

غراتی ہوئی غصیلی آواز میں 'بوائے!'

شرمیلی لجاتی ہوئی آواز میں 'بوائے!'

اور اس کے پاس ان سب پکاروں کے لیے صرف ایک جواب 'یس سر'

'یس سر'

'یس سر'

'یس سر'

دن بھر میں اشوک بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتا تھا۔اس عرصے میں کچن سے ڈرائنگ روم تک کم سے کم دوسو پھیرے کرنے پڑتے اشوک نے ایک بار حساب لگایا تھا کہ وہ دن بھر میں کم سے کم دس میل چلتا ہے۔وہ بھی ہر بار ایک بھاری ٹرے کو ہاتھ میں اٹھائے بھیڑ سمندر میں سے میزوں کے جزیروں کے گرد گھومتا ہوا۔اور ذرا بھی رفتار دھیمی ہوئی۔ذرا بھی آرڈر کے لانے میں دیر ہوئی کہ 'بوائے' کا طمانچہ پڑا۔

'بوائے!'

''بوائے!'

'بوائے!''

'بوائے! کتنی دیر لگاتے ہوئے تم؟'

'بوائے! آر یو سلیپنگ ؟'

'بوائے! پانی!! ذ جلدی جلدی'

'بوائے! چکن روسٹ اور پیشاوری نان مگر ایک دم جلدی'

'بوائے!! اگر بیر، اینڈ میک اٹ کوئک'۔

'بوائے! چکن سنڈا گوناف اور میشڈ پوٹاٹوز۔ بٹ آئی ایم ان اے ہری'۔

'یس سر'۔

'یس سر'۔

'یس سر'۔

چکن الا کیف۔

مٹن کٹلس۔

تندوری مرغا۔

رشن سیلیڈ۔

ٹوماٹو جوس۔

وہسکی۔ بیر۔ شامپین

نرگسی کوفتے۔

تھری ان ون آئس کریم۔

سٹربیری اینڈ کریم۔

چاکلیٹ سنڈے۔

فروٹ سیلیڈ۔

اشوک تقریباً دو سو مختلف قسم کے کھانوں کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شکل وصورت، رنگ اور بو سے واقف تھا مگر اس کو دو وقت دال روٹی اور بے مزہ گوبھی کی ترکاری ہی ملتی تھی، جب وہ ٹرے میں کوئی مہکتی ہوئی خوشبودار ڈش، رکھ کر لے جاتا تو اس کا کتنا جی چاہتا کہ ایک بار...... صرف ایک بار...... اس نعمت کو خود بھی چکھ لے...... بھنے ہوئے مرغ کی ایک ٹانگ یا آئس کریم کا ایک

چمچہ یا کیک کا ایک ٹکڑا...... مگر اسے معلوم تھا کہ بھولے سے بھی ایسی کوئی حرکت کی تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا مگر جب بچا ہوا کھانا واپس جاتا تو ویٹر اکثر مالک اور منیجر کی نظر بچا کر ان میں سے دو چار لقمے چکھ لیتے تھے...... ایک بار اشوک بھی ایک فروٹ سلیڈ کی آدھی بچی ہوئی پلیٹ دیکھ کر للچا گیا اور جلدی جلدی اس میں سے تین چار خوبانیاں اور سیب کے ٹکڑے اڑا گیا مگر اس کے فوراً بعد ہی جب وہ ایک گاہک کی میز پر سے جھوٹے برتن اٹھانے گیا تو دیکھا کہ وہ فروٹ سلیڈ کھاتا جا رہا ہے اور خوبانیاں کی گٹھلیاں اور سیب کے بیج واپس اسی پلیٹ میں تھوکتا جا رہا ہے اور یہ دیکھ کر اشوک کا جی متلا اٹھا تھا اور اسے غسل خانے میں قے کرنی پڑی تھی۔ اس کے بعد اس کا کبھی جوٹھا کھانا کھانے کو جی نہ چاہتا...... اور سو کھانوں کی نفیس خوشبوئیں اس کے نتھنوں کو گدگداتی رہتیں۔ کھانوں کی رنگین سجاوٹ اس کی آنکھوں کو للچاتی رہتیں اور اس کے پیٹ کی آنتیں سکڑ کر اس بھوک کی یاد دلاتی رہتیں جو بے مزہ گوبھی کی ترکاری سے کبھی نہیں بھرتی...... مگر اشوک اپنا کام کیے جاتا ایک مشین کی طرح جو پہیوں پر چلتی ہو جس کے میکانکی ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے ہو اور جو گراموفون کے ٹوٹے ہوئے رکارڈ کی طرح بار بار ایک ہی جملہ دہراتی ہو......

'یس سر'۔

'یس سر'۔

'یس سر'۔

ریستوراں صبح آٹھ بجے سے لے کر رات کے بارہ بجے تک بھرا رہتا تھا۔ اس عرصے میں صرف لنچ سے پہلے کوئی ایک گھنٹے کے لیے بھیڑ کم ہوتی تھی اور اس وقت سب ویٹر باری باری تھوڑی دیر کے لیے ستا لیتے تھے۔ ایک بار گرمیوں کے دن تھے، ریستوراں ایئر کنڈیشنڈ تھا مگر کچن کے پاس 'پینٹری' میں جہاں ویٹر بیٹھتے تھے بلا کی گرمی تھی۔ اشوک پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس لیے شیشے کے کواڑ میں سے جھانک کر دیکھا۔ جس کونے کی میزیں اس کے سپرد تھیں وہاں کوئی گاہک نہیں تھا۔ سو اس نے سوچا تھوڑی دیر کے لیے کوٹ اتار کر پسینہ سکھا لوں مگر ابھی اس نے کوٹ اتارا ہی تھا کہ ہال میں سے گونجتی ہوئی شیشے کے کواڑوں میں سے چھنتی ہوئی 'بوائے' کی آواز آئی۔

'کیا مصیبت ہے؟'۔ اشوک نے سوچا، اور بددلی سے کوٹ پھر پہننا شروع کیا۔ ابھی بٹن لگا رہا تھا کہ دوبارا اور 'بوائے' کی آواز اس کو جھنجھوڑنے کے لیے وہاں تک پہنچی۔

دروازہ کھول کر وہ ریستوراں میں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک دہاڑتی، چنگھاڑتی ہوئی آواز گونجی 'بوائے'

اس نے قدم تیز کیے۔ مگر اسے پورے ہال کو طے کرنا تھا۔ فرش ڈانس کے لیے چکنا کیا گیا تھا۔ اگر وہ دوڑا تو منہ کے بل گر پڑے گا۔

'بوائے!۔'بوائے!!۔'بوائے!!!'۔

سلک کی بش شرٹ (جس پر شیر اور ہاتھی اور اژدہوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں) پہنے ایک موٹا سا آدمی بے تحاشا چلّا رہا تھا جیسے اُسے دورہ پڑ گیا ہو............

'بوائے!۔'بوائے!!۔'بوائے!!!' اور اشوک کو ایسا لگ رہا تھا، جیسے برابر اس کے منہ پر طمانچے پڑ رہے ہوں۔

یس سر' اس نے عاجزی سے مینو پیش کرتے ہوئے کہا۔

مگر ایک اور طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ 'تم لوگ سوتے رہتے ہو کیا؟ مجھے تمھاری رپورٹ کرنی پڑے گی.........' اور اس شام کو منیجر نے اشوک کو بتایا تھا کہ اس کو پانچ روپے جرمانا کر دیا گیا ہے جو اس کی تنخواہ سے کاٹ لیا جائے گا۔ پھر بھی اس نے کوٹ اُتار کر سُستانے کی ہمت نہیں کی۔

اس کے ہاتھ، پاؤں اور زبان پر 'کیفے پیرس' کے مالک کا قبضہ تھا، مگر اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کا دماغ...... وہ آزاد تھے ــ اشوک وہ حرکتیں دیکھتا جو ایک ویٹر کو نہیں دیکھنی چاہئیں۔ وہ باتیں سنتا جو ایک ویٹر کو نہیں سننا چاہئیں، اور وہ خیالات سوچتا جو ویٹر کو نہیں سوچنے چاہئیں۔

وہ دیکھتا.........کالے بازار والے موٹے سیٹھوں کو سرکاری افسروں کی وہسکی اور شامپین کے بل ادا کرتے ہوئے.........پیشہ ور طوائفوں کو سفید ساڑیاں یا اور کوئی سادہ لباس پہنے گھریلو پوز میں اپنے 'دوستوں' کے ساتھ بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے.........بڑے گھرانوں کی لڑکیوں کو لپ اسٹک اور سرخی پوتے۔ چیختے ہوئے رنگوں کی ساڑیاں یا سلیکس پہنے کالج کے لڑکوں یا فوجی افسروں کے ساتھ شیری پی کر طوائفانہ انداز میں ٹھٹے مارتے ہوئے.........کھدر پوش،

'لیڈروں' کو بھوکی نظروں سے اینگلو انڈین ٹائپسٹ کو گھورتے ہوئے......... پارلیامنٹ کے ممبروں کو ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے وہسکی کا آرڈر دیتے ہوئے......... شارکس اسکن سوٹ پہنے ہوئے ادھیڑ ٹھیکہ داروں کو دبلی، پتلی، سہمی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ ناچتے ہوئے......

وہ سنتا...... پرمٹ اور لائیسنس کے لیے بمبئی کے بیوپاریوں اور سرکاری افسروں کے درمیان رشوت طے کرانے کی باتیں...... نوجوان طالب علموں اور ان کی گرل فرینڈس، کے رومان بھرے شکوے شکایتیں اور عہد و پیمان...... نئی دہلی کی اونچی سوسائٹی کے سارے اسکینڈل...... ادیبوں اور شاعروں کے بحث مباحثے...... اخبار نویسوں اور رپورٹوں کی سیاسی گپ شپ......

اور وہ سوچتا...... یہ شاندار 'کیفے پیرس' اس کی نقلی سنگ مرمر کی دیواریں...... اس کی دیواروں پر بنی ہوئی ادھ ننگی عورتوں کی تصویریں۔ اس کے نقلی مخمل منڈھے ہوئے صوفے...... اس کا ولایتی ناچ کی دھنیں بنانے والا بینڈ...... یہ کھدر پوش وہسکی پینے والے برہم چاری۔ یہ موٹے موٹے ٹھیکے دار...... یہ دبلے پتے مدقوق شاعر اور ادیب اور اخبار نویس...... یہ شامپین کی بوتلیں...... یہ تندوری مرغ...... یہ رشن سیلیڈ اور امریکین کاک ٹیل...... یہ بھوکی آنکھوں یہ چست بلاؤز پہنے ہوئے عورتیں...... یہ آنکھوں میں دعوت نظارہ لیے ہوئے لڑکیاں...... یہ کھانا، یہ پینا، یہ ہنسی، یہ قہقہے، یہ دولت، یہ حسن، یہ شان و شوکت، یہ عیش و آرام، یہ زندگی اس سے اتنے قریب ہونے پر بھی اس سے کتنی دور ہے...... وہ اس سمندر میں ڈوبا ہوا ہے مگر پھر بھی پیاسا ہے...... اور کبھی کبھی جب دن بھر چلتے چلتے اس کے پاؤں شل ہو جاتے اور اس کا سر گھومنے لگتا اور کیفے سگریٹ کے دھوئیں اور وہسکی اور بھنے ہوئے مرغوں اور سینٹ اور پاؤڈر اور پسینے کی بو سے بھر جاتا اور جاڑے کے موسم میں بھی سینکڑوں مردوں اور عورتوں کے گرم گرم سانوں سے ایک عجیب گرمی اور گھٹن پیدا ہو جاتی...... اس وقت اشوک کو ایسا محسوس ہوتا کہ یہ سارا ریستوراں، ایک تندوری مرغا ہے۔ اور وہ خود اس تندوری مرغے کے پیٹ میں گھسا ہوا ہے مگر بھوکا ہے...... اور یہ مرغا تندور کی آگ میں بھونا جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ وہ خود بھی بھنتا جا رہا ہے...... ایک لمحے کے لیے اس کو یہ ڈر لگتا کہ کوئی رال چند رامریکن یا موٹا سندھی ٹھیکے دار اس کی ٹانگ پکڑ کر اس کی ہڈیاں چبانا نہ شروع کردے...... مگر پھر......

بوائے! کوئی گاہک آواز دیتا۔

اشوک اپنے تخیل کے جال سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجاتا۔ مگر اس کے دماغ میں ایک مبہم سا سوالیہ نشان اور اس کے دل میں ایک نامعلوم چبھن رہ جاتی، ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہے؟

اور پھر ایک دن اشوک کو 'کیفے پیرس' چھوڑنا پڑا۔ کیفے تین مہینے کے لیے بند کیا جارہا تھا تا کہ اس کو توڑ پھوڑ کر اس کی سجاوٹ نئے ڈھنگ سے کی جائے۔ چار سال پہلے 'کیفے پیرس' کو لندن کے ایک مشہور ریستوراں کی نقل میں سجایا گیا تھا۔ اب کہا جاتا ہے کہ اسے نئے سرے سے امریکن ڈھنگ پر نیویارک کے ایک ہوٹل کی نقل میں سجایا جائے گا۔

بڑے آدمیوں کی یہ سب باتیں اشوک کی سمجھ کے باہر تھیں۔ وہ تو اتنا جانتا تھا کہ تین مہینے تک وہ بے کار ہے۔ اس لیے وہ اپنی ماں سے ملنے گھر جاسکتا ہے اور یہ کہ اس کی جیب میں دو برس کے بچائے ہوئے ستر روپے ہیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ ٹپ ملے بنا اس رقم میں تین مہینے کیسے گزریں گے۔ اور پھر اس کی نظر کناٹ پلیس کے دوسرے ریستوراں 'مائی لارڈ' کے سائن بورڈ پر پڑی اور اس نے سوچا کیوں نہ وہاں دریافت کرلیا جائے ممکن ہے کسی ویٹر کی جگہ خالی ہو۔

دروازے پر ہی NO VACANCY کا بورڈ لگا تھا اور باوردی چوکیدار نے بھی اس کی تصدیق کردی کہ 'مائی لارڈ' میں کسی ویٹر کی جگہ خالی نہیں ہے۔ وقت کاٹنے کے لیے اشوک شیشے کی دیواروں کے پیچھے لگی ہوئی ان کھڑکیوں کو دیکھنے لگا جن میں راہ گیروں کو لبھانے کے لیے ہر طرح کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ بھنے ہوئے مرغ، ساسج کے ہار، کٹلس کباب، ونیلا آئس کریم کا سفید پہاڑ اور اس کی چوٹی پر لال لال چیری لگی ہوئی۔ ہر قسم کے پھل، ٹماٹر، پہاڑی مرچیں،— ہر چیز اتنی خوبصورتی سے سجائی ہوئی تھیں کہ دیکھنے والے کے منہ میں پانی بھر آئے۔

دفعتاً اشوک کے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی— اتنے دن میں نے 'کیفے پیرس' میں بڑھیا کھانے دوسروں کو کھلائے مگر مجھے خود یہ بھی نہیں معلوم کہ چکن الا کیف اور اسٹرابیری اور کریم کا مزہ کیسا ہوتا ہے۔ ایک بار...... ایک...... کیوں نہ میں بھی یہ چیزیں کھا کر دیکھوں۔

میری جیب میں ستر روپے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ بل دس روپیہ آئے گا مگر یہ تجربہ زندگی بھر یاد تو رہے گا۔

اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی خوش آئند کراہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ 'مائی لارڈ'، ریستوران میں داخل میں ہوگیا۔ ابھی لنچ کی بھیڑ لگی نہیں تھی۔ ہال میں تین چار میزوں پر ہی کچھ لوگ بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔ باقی میزیں ابھی تک خالی تھیں۔ اشوک کو اپنے تجربے سے معلوم تھا کہ اس وقت ویٹر عام طور سے باری باری تھوڑی دیر اپنی ٹانگوں کو آرام دینے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں تاکہ لنچ کے ہنگامے کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔

وہ کھڑکی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سوچا ویٹر کو بلانے سے پہلے 'میز' پر چھپی ہوئی فہرست دیکھ کر آرڈر طے کر لینا چاہیے۔

'پہلے تو میں منگاؤں گا کریم سوپ اس میں سے ہمیشہ بڑی اچھی خوشبو آتی ہے۔ ضرور مزیدار بھی ہوتا ہوگا۔

'پھر چکن سڑاگوناف، نہیں نہیں چکن الا کیف۔ دیکھوں تو آج اس عجیب نام کا مرغا مزے میں کیسا ہوتا ہے۔ سنا ہے یہ کوئی روسی کھانا ہے تو اس کے ساتھ رشن سیلیڈ بھی ہونا چاہیے۔

'اور اس کے بعد، امریکن فروٹ کاک ٹیل یہ بھی اچھا رہا۔ پہلے روسی پھر امریکن......اب ویٹر کو بلانا چاہیے۔'

'بوائے'

وہ چلّایا۔ اور اس کی آواز میں ان تمام ہزاروں، آوازوں کا نچوڑ تھا جو خود اس کو بلانے کے لیے دی گئی تھیں۔

اور جب کوئی ویٹر اس کے پکارنے پر نہیں آیا تو وہ پھر چلّایا۔

'بوائے'

رعب دار غصیلی آواز جیسی وہ اکثر سنتا تھا۔ جب کبھی اسے پہلی پکار پر ٹیبل تک پہنچنے میں دیر ہو جاتی تھی۔

سارا ریستوران اس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ دوسری طرف بیٹھے ہوئے لوگ اِدھر اُدھر

مڑ کر دیکھنے لگے۔

'بوائے۔'!

ایک بوڑھا سفید داڑھی والا بیرا اپنی کمر کے پٹکے کو درست کرتا۔ اس کی طرف لپکا ہوا آرہا تھا۔اشوک کی 'بوائے' کی پکار کا طمانچہ جھرّیاں پڑے ہوئے گال پر پڑا تھا۔

'یس سر!' قریب آکر ہانپتے ہوئے وہ بولا۔'یس سر'

اور اس کی بجھی ہوئی۔ مرجھائی ہوئی، گڑگڑاتی آواز میں ہزاروں، یس سر، یس سر، کا نچوڑ تھا جو اشوک نے کینٹے کے گاہکوں سے سر جھکا کر کہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے اس نے بوڑھے ویٹر کی عاجزی بھری آنکھوں میں دیکھا اور نہ جانے کیوں اُسے ان آنکھوں میں اپنا ہی چہرہ نظر آیا۔

'یس سر؟' بوڑھے نے پھر عاجزی سے دہرایا۔ اور اس 'یس سر میں اشوک کو اپنی ہی آواز کی گونج سنائی دی۔

کیا حکم ہے، صاحب؟' ویٹر پوچھ رہا تھا۔

اور اشوک کے دماغ میں اس کی اپنی زندگی کے دو سال گھوم رہے تھے۔ سنی ہوئی آوازیں گونج رہی تھیں۔

'بوائے!'

'یس سر'

'ڈنر فور ٹو'

'یس سر'

'ون بڑا پیگ وہسکی اینڈ سوڈا'

'یس سر'

'چکن الا کیف'

'یس سر'

'بوائے کتنی دیر لگاتے ہو تم؟'

'بوائے آر یو سلیپنگ؟'

'بوائے پانی لاؤ جلدی جلدی'

تم لوگ سوتے رہتے ہو کیا؟

'مجھے تمھاری رپورٹ کرنی پڑے گی......'

'یس سر! یس سر!! یس سر!!!

'معاف کرنا بڑے میاں' اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور بوڑھے ویٹر کو حیران اور ششدر چھوڑ کر وہ ریستوراں کے سمندر میں خالی میزوں کے جزیروں کے درمیان راستہ بناتا ہوا دروازہ سے باہر نکل گیا۔

مگر جب بوڑھے ویٹر نے میز پر سے مینو کارڈ اٹھایا تو دیکھا وہاں ایک روپیہ 'ٹپ' پڑا ہوا ہے اور اس نے سوچا 'جانے کیسے کیسے لوگ اس ریستوراں میں آتے ہیں......'

O

(شاہراہ، جنوری۔فروری 1954)

# کالی گھٹا

ٹیکسی روانہ ہوئی تو بملا نے سوچا، یہ سین بالکل ایسا ہے جیسا فلموں میں ہوتا ہے۔ سامنے اس کے اپنے مادھو کے چہرے کا کلوز اپ ہے۔ اتنے قریب کہ وہ اس کے ہلکے سانولے گالوں پر خوب اچھی طرح گُٹھی ہوئی داڑھی کی نیلاہٹ کو دیکھ سکتی ہے اس کے ریشمی سفید قمیض اور ریشمی نیلی ٹائی کے نیچے کالر کے گرد پسینے کے نشان کو دیکھ سکتی ہے، اس کے گھنے چمکیلے سیاہ بالوں کے گچھوں کے نشیب و فراز کا معائنہ کر سکتی ہے، اور اکتوبر کی گرمی میں مادھو کے بدن سے پھوٹتی ہوئی اس بو کو بھی سونگھ سکتی ہے جو بیک وقت خوشبو بھی ہے اور بدبو بھی اور جس میں مادھو کے مردانہ جسم کے جوان پسینے کے علاوہ ہیئر ڈریسنگ سیلون میں مفت لگایا ہوا لوشن بھی شامل ہے اور ایک گھٹیا قسم کا فرانسیسی تیز خوشبودار سینٹ بھی ہے اور مادھو کے اس فلمی کلوز اپ کے پیچھے ٹیکسی کی کھڑکی میں سے بمبئی کی سڑکوں اور بازاروں کا پس منظر دوڑتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

پریل کی چالیں۔ جن میں سے ایک میں، وہ اپنے ماں باپ بھائی بہنوں کے ساتھ ایک کھولی میں رہتی ہے اور ان چالوں کے پیچھے دھواں اگلتی ہوئی اونچی اونچی ملوں کی چمنیاں اور ان کے پیچھے نیلے آسمان پر دوڑتے ہوئے بھورے بھورے بادل، سفید بگلوں کی ایک قطار جو غیر معمولی خاموشی سے پرواز کر رہی ہے اور ایک چاندی کی طرح چمکتا ہوا مچھلی کی شکل کا ہوائی

جہاز جو فضا میں معلق معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے کس دیس سے آیا ہے اور کس دیس جانے والا!!
ہے۔ اس کی نظر آسمان سے زمین پر آئی تو دیکھا فٹ پاتھ پر بیگار ٹوکری ڈھونے والے اور فقیر
دھوپ میں پڑے سو رہے ہیں اور کچرے کے ڈرم کے پاس ایک مریل میلی کچیلی بلی کوڑے کے
ڈھیر میں کرید رہی ہے۔ مگر اسی وقت اس نے دیکھا کہ گل مہر کے پیڑوں میں شعلوں کی طرح
لال لال پھول کھلے ہوئے ہیں اور وہی پیڑ جو چند دن پہلے تک سوکھے ویران ٹھنٹھ بنے کھڑے
تھے جن کی سوکھی ٹہنیوں میں ایک ہری پتی تک نہیں تھی آج اپنے پھولوں کے بوجھ سے جھکے
جا رہے ہیں۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ دنیا میں اور اس کے اپنے جیون میں بہار آ گئی ہے۔ بہار
آ گئی کیونکہ مادھو آ گیا ہے۔ اب زندگی کی سب کلفتیں اور محرومیاں دور ہو جائیں گی، اب ہر
طرف پھول کھلیں گے اور ان پر بھنورے منڈلائیں گے، خوش رنگ پرندے چہچہائیں گے اور
ساری فضا میٹھے اور سریلے نغموں سے گونج اٹھے گی۔

مادھو نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بملا کے تن بدن میں ایک جھرجھری سی کوند گئی اور
گو وہ اس سے دور اپنے کونے میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی اور ان کی انگلیوں نے بھی ایک دوسرے کو
نہیں چھوا تھا۔ پھر بھی ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے دفعتاً ایک بجلی کے تار کو چھو لیا ہو اور اس برقی
جھٹکے سے اس کی رگ رگ میں ایک میٹھا میٹھا درد دوڑنے لگا۔

”بٹی بمبئی میں آئے ہوئے اتنے دن ہو گئے تمھیں۔ پھر بھی دیہاتی لڑکیوں کی طرح اتنا
شرماتی ہو؟ سر کو آنچل سے ایسے ڈھانکا ہوا ہے کہ بالکل گھونگھٹ معلوم ہوتا ہے۔“ مادھو نے اس
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بملا نے سوچا اب تمھیں کیسے بتاؤں کہ سر پر آنچل کیوں ڈالا ہوا ہے، ارے ظالم میں جو
کچھ ہوں، جو کچھ میں نے کیا ہے جو کچھ میں سوچتی ہوں، وہ تیرے اور صرف تیرے خیال سے
ہوتا ہے، مگر نہیں اس کے بارے میں کچھ کہنا تو چھچھوراپن ہوگا، بے شرمی ہوگی اور یہ سوچ کر اس
نے آنچل کو ایک انچ اور آگے سرکا لیا اور ایک کھسیانی سی مگر محبت بھری مسکراہٹ مسکرا کر دوسری
طرف کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

اب ان کی ٹیکسی لال باغ سے ہو کر بائکلہ کے علاقے سے گزر رہی تھی۔ اینگلو انڈین اور

کرسچین لڑکیاں، اونچے فراک اور اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے بس اسٹینڈ کے کیو میں کھڑی تھیں۔ مکان کے چھجوں سے پارسی عورتیں اپنے گھروں کا کچرا فٹ پاتھ پر پھینک رہی تھیں۔ پیلیس سنیما پر ''دل دے کے دیکھو'' کے بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ جس میں خوبرو شمی کپور نئی نویلی آشا پاریکھ کے ساتھ ناک سے ناک ملا کر انگریزی ڈانس کر رہا تھا اور بملا نے سوچا اگر یہ زندگی نہ ہوتی ایک فلم ہوتی، اگر میں سوا سو روپے ماہوار پانے والے ٹرام کنڈکٹر بنسی لال کی بیٹی بملا نہ ہوتی بلکہ ایک فلم کی ہیروئین ہوتی اور مادھو، مادھو نہ ہوتا شمی کپور ہوتا، راج کپور ہوتا، دلیپ کمار یا اشوک کمار ہوتا اور کسی اچھے ڈائیلاگ رائٹر نے مجھے یہ سین لکھ کر دیا ہوتا تو آج میں کتنے خوبصورت الفاظ میں اپنے دل کی کیفیت اسے سناتی اور راستے بھر سناتی جاتی اور یہ بھی پرواہ نہ کرتی کہ ٹیکسی ڈرائیور ہماری باتیں سن رہا ہے اور کن انکھیوں سے اپنے سامنے لگے ہوئے شیشے میں دیکھتا جا رہا ہے کہ پیچھے والی سیٹ پر یہ نوجوان لڑکا اور لڑکی کوئی گڑبڑ گھوٹالا تو نہیں کر رہے ہیں، مگر زندگی زندگی ہے اور فلم فلم ہے، وہ بملا ہے مدھو بالا نہیں بن سکتی نہ مادھو دیوانند بن سکتا ہے، ٹیکسی ڈرائیور بھی اصلی ٹیکسی ڈرائیور ہے، فلم کمپنی کا ایکٹر نہیں ہے کہ ہیروئین کو رومانس کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دے اور ٹیکسی کسی اسٹوڈیو میں بیک پروجکشن کے پردے کے سامنے کھڑی نقلی حرکت نہیں کر رہی بلکہ سچ مچ جے۔ جے ہسپتال سے گزر کر بھنڈی بازار کی طرف جا رہی ہے۔

بوری اور فوبیہ (کذا) عورتیں لمبے لمبے کرتے پہنے فٹ پاتھ پر لگی ہوئی دکانوں سے پھل ترکاری خرید رہی تھیں، تین برقعہ پوش لڑکیاں نقابیں الٹے اپنے رنگین آنچلوں اور پاؤڈر اور لپ اسٹک لگے چہروں کی نمائش کرتی ہوئی زور زور سے باتیں کرتی چلی جا رہی تھیں، پٹرول پمپ کے پاس گٹر کے کنارے ایک سفید داڑھی والے بزرگ بیٹھے اطمینان سے پیشاب کر رہے تھے، بملا نے بے اختیار شرما کر منہ پھیرا تو مادھو کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔

''بملا یاد ہے یہ ریکارڈ؟''

ان کی ٹیکسی چوراہے پر ماشاءاللہ ہوٹل کے برابر کھڑی تھی، کیونکہ ٹریفک کانسٹبل نے ہاتھ دکھا کر راستہ روکا ہوا تھا، ہوٹل میں ریڈیو چالو تھا اور ریڈیو پر ایک بہت پرانا ریکارڈ بج رہا تھا۔

''کالی گھٹا چھائی ہو راجا کالی گھٹا چھائی''

''بملا یاد ہے نا یہ ریکارڈ؟'' مادھو نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

اور جواب دینے سے پہلے ایک لمحے کے وقفے میں بملا کے دماغ میں نہ جانے کتنی یادیں ابھر آئیں اور اس کا ذہن وقت اور مکان دونوں کے فاصلوں کو پھلانگتا ہوا دور دور ہو کر اسی لمحے میں لوٹ آیا۔

''اسے کبھی بھول سکتی ہوں کیا؟'' اور اسی دم سپاہی نے اپنا سگنل تبدیل کیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ ٹیکسی آگے روانہ ہوگئی اور بملا کا ذہن ماضی کی طرف چل پڑا..........

جاڑوں کے دن تھے۔ وہ نہا کر آنگن میں بیٹھی اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ دروازے پر کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی، اس کے چھوٹے بھائی بہن اسکول گئے ہوئے تھے، (بملا نے خود اسی سال اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں کا خیال تھا کہ چودہ برس کے بعد لڑکیوں کا اسکول جانا ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور اس لیے اس نے بملا سے کہا تھا کہ پرائیویٹ امتحان کی تیاری کرے) باپ تو جب بھی بمبئی میں کام کرتے تھے، سال میں صرف دس پندرہ دن کو کبھی آتے تھے، ماں اس وقت پڑوسن کے ہاں گئی ہوئی تھی، بملا نے سوچا نہ جانے کون آیا ہے اس سے۔

''کون ہے؟'' اس نے کسی قدر چڑ کر کہا کیونکہ کنگھی بالوں میں الجھ گئی تھی اور زور لگانے سے کتنے ہی بال ٹوٹ کر نکل آئے تھے۔

''میں ہوں مادھو۔ کرایہ دینے آیا ہوں۔''

بملا کے باپ بنسی لال نے عمر بھر کی جمع جوڑ سے یہ ایک چھوٹا سا مکان بنایا تھا جس میں وہ لوگ رہتے تھے۔ بنسی لال خود بمبئی میں ٹرام وے کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہاں جگہ نہ ملنے سے گھر والوں کو جھانسی ہی میں چھوڑا ہوا تھا، ہر مہینے پچاس روپے بیوی کو بھیجتا مگر اس مہنگائی کے زمانے میں چار بچوں کے ساتھ اتنے میں گزارہ کیسے ہوتا۔ سو بملا کی ماں نے گھر کے دو کمرے پانچ پانچ روپے ماہوار میں کرائے پر اٹھا دیے تھے، ایک میں میونسپلٹی کا ایک بوڑھا چپراسی رہتا تھا اور دوسرے میں ایک کالج کا اسٹوڈنٹ، وہ امتحان پاس کر کے گیا تو اس نے اپنا کمرہ اپنے ایک دوست کو دے دیا تھا جو کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور جھانسی میں نیا نیا ہی آیا تھا۔

مگر بملا کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا نام مادھو ہے سو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''آ جاؤ اندر دیکھوں مٹی کے مادھو ہو یا............

اس نے دیکھا کہ سترہ اٹھارہ برس کا ایک گنوار سا چھوکرا سامنے کھڑا ہے۔ پاؤں میں گنوارہ چمرودھے جوتے موٹے کھدر کی دھوتی۔ آدھی آستینوں کی بنڈی، گلے میں کنٹھا اور گھٹے ہوئے سر پر لمبی چوٹی۔

دفعتاً ایک جوان لڑکی کو اس طرح سامنے دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا اور آنکھیں جھکا کر بولا۔

''دیوی جی آپ نے کچھ کہا؟''

اور بملا جو اپنی الہڑ زبان درازی کے لیے محلے بھر میں مشہور تھی بولی۔'' میں کہہ رہی تھی کہ دیکھوں کیا تم سچ مچ مٹی کے مادھو ہو مگر تم تو نکلے تانبے کے۔''

بے اختیار مادھو کا ہاتھ اپنے گھٹے ہوئے سر پر گیا اور گھبراہٹ میں چوٹی میں گرہ باندھتے ہوئے بولا۔'' میرا نام مادھورام ہے، آپ کا نیا کرایہ دار ہوں۔ کرایہ آپ کو دے دوں؟''

''وہاں رکھ دو، کھاٹ پہ، پان کی پٹاری میں۔''

نوٹ کو پٹاری میں رکھ کے جاتے جاتے اس نے ایک بار پھر اس چنچل لڑکی کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''کیا گھور رہے ہو؟ کیا پہلے کبھی لڑکی کو کنگھی کرتے نہیں دیکھا؟''

''دیکھا ہے دیوی جی پر آج تک کبھی اتنے لمبے بال نہیں دیکھے۔''

بملا کے بال سچ مچ بہت لمبے اور گھنے، چمکیلے اور ملائم تھے۔ پڑوسنیں اکثر پوچھتیں۔''بملا کی ماں اپنی بیٹی کے سر میں کون سا تیل ڈالو ہو۔ ہمیں بھی بتا دو۔'' اور بملا کی ماں کہتی۔'' اری بہن وہی کڑوا تیل جو تم ڈالو ہو، پر گوڑے بڑھے ہی جاویں ہیں اور گھنے بھی تو کتنے ہیں۔ میں تو کنگھی چوٹی کرتی کرتی تنگ آ گئی ہوں۔ میں نے تو بملا سے کہہ دیا ہے۔'' بیٹی اب تو بڑی ہو گئی ہے، اپنے بالوں میں خود کنگھی کیا کرو۔''

بملا کو خود اپنے لمبے بالوں پر بڑا گھمنڈ تھا، اسکول میں وہ دوسری لڑکیوں کے بالوں کی لمبائی سے ان کا مقابلہ کرتی رہتی، سب کے سامنے فٹ رول لے کر اپنی چوٹی کو ناپتی اور اپنی

سہیلیوں سے ہنس کر کہتی۔

"ارے نگوڑیو یہ بال میرے قد سے بھی لمبے ہوگئے تو کیا کروں گی۔ پھر تم میں سے ایک کو میری چوٹی سنبھالنے کے لیے میرے پیچھے پیچھے گھومنا ہوگا جیسے کسی ملکہ یا مہارانی کا شاہی لباس سنبھالنے کے لیے داسیاں چلتی ہیں۔"

مگر اس وقت اس گنوار چھوکرے کو چڑانے کے لیے اس نے کہا۔ "میں تو ان نگوڑے بالوں سے تنگ آگئی ہوں۔ جی میں آتا ہے ایک دن قینچی لے کر کھچ سے کاٹ دوں۔"

جیسے یہ خطرناک عمل اسی وقت سچ مچ ہونے والا ہے، مادھو نے گھبرا کر کہا۔ "ہائیں، ہائیں، ایسا نہ کرنا دیوی جی۔"

"اچھا جاؤ معاف کیا، نہیں کروں گی، پر ایک شرط پر، خبردار جو مجھے کبھی دیوی جی کہا، ایسا لگتا ہے جیسے میں سفید بالوں والی بڑھیا ہوں یا مندر میں رکھی ہوئی کالی کی مورتی۔ میرا نام ہے بملا۔"

اگلے مہینے جب مادھو کرایہ دینے آیا تو ماں گھر میں موجود تھی، بملا سے اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ مگر بملا نے دیکھا کہ مادھو کے گھٹے ہوئے سر پر بال اگ آئے ہیں اور چوٹی چھوٹی ہوگئی ہے۔

اس سے اگلے مہینے جب وہ آیا تو ماں مندر گئی ہوئی تھی اور چھوٹے بھائی چھت پر کھیل رہے تھے۔ بملا نے دیکھا کہ مادھو کے سر سے چوٹی غائب ہوگئی ہے اور نئے اگے ہوئے بالوں میں انگریزی ڈھنگ کی حجامت کرائی گئی ہے، دھوتی کے بجائے پائجامہ اور اونچے کالر کا کھدر کا کرتا پاؤں میں نئے چپل۔

"ارے مادھو تمہاری چوٹی کیا ہوئی؟"

"کالج میں لڑکے ہنستے تھے دیو...... میرا مطلب ہے بملا۔" اور پھر جھینپ مٹانے کے لیے جلدی سے بولا۔ "تمہارے بال تو اور بھی لمبے ہوگئے ہوں گے؟"

"ہاں کمبخت بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ ساڑھے تین فٹ ہوگئے ہیں۔"

اور اب ہر مہینے کا یہ معمول ہوگیا کہ جب کبھی ان کو الگ بات کرنے کا موقعہ ملتا تو مادھو بالوں کے بارے میں یہی سوال کرتا اور بملا بھی جواب دینے کے لیے فٹوں اور انچوں کا پورا حساب تیار رکھتی۔ اور اس طرح وقت گزرتا گیا، بملا کے بال بڑھتے گئے اور مادھو اب قمیض

پتلون میں مٹی کے مادھو کے بجائے مسٹر مادھورام دکھائی دینے لگا۔

ایک دن ماں نے بملا سے کہا۔''اری بھوشن کے امتحان میں اب دو ہی مہینے رہ گئے ہیں۔ میں تو تجھے کبھی پڑھتے دیکھتی نہیں، پاس کیسے ہوگی اور پاس نہیں ہوگی تو تیرا بیاہ کیسے ہوگا؟ پرائمری پاس لڑکیوں کو تو آج کل پٹواری بھی نہیں جڑتا۔''

اور بملا نے کہا۔''ماں پڑھوں کیسے کوئی پڑھانے سمجھانے والا بھی تو ہونا چاہیے۔اسکول تم جانے نہیں دیتیں۔اپنے آپ سے پڑھتی ہوں تو کتاب میری سمجھ میں نہیں آتی۔

اتنے میں دروازے پر کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

''کون ہے؟''بملا کی ماں نے اپنی گرجدار آواز میں پکارا۔

''ماں جی، میں ہوں، مادھو کرایہ لایا ہوں۔

عام طور سے بملا کی ماں کرایہ داروں سے بڑی سختی سے پیش آتی تھی۔ایک دن کی بھی دیر ہو جائے تو خوب ڈانٹ پلاتی تھی۔آج مادھو ڈرتا ڈرتا آیا تھا کیونکہ اس بار اسے کرایہ دینے میں پورے سات دن کی دیر ہو گئی تھی۔سو جب اسے اندر آنے کو کہا گیا تو اس نے ماں جی کو نہایت ادب سے نمستے کر کے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔''شما کرنا ماں جی اس مہینے اتنی دیر............''

لیکن بملا کی ماں نے بڑی ملائمت سے کہا۔''کوئی بات نہیں بیٹا۔دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے''اور پانچ کا نوٹ پٹاری میں رکھتے ہوئے بولی۔''کیوں رے مادھو تو کون سے درجے میں پڑھے ہے؟''

''میں ایف۔اے میں ہوں ماں جی۔''

''اچھا، بھلا کیا کیا پڑھے ہے تو کالج میں؟''

مادھو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ماں جی کو آج دفعتاً اس کی تعلیم میں اتنی دلچسپی کیسے ہو گئی ہے۔

''جی انگریزی پڑھتا ہوں، اکنامکس، اتہاس۔''

اردو ہندی؟ ہندی نہیں پڑھتا؟''

''وہ بھی پڑھتا ہوں۔پر اس میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی، میں کالج میں آنے سے پہلے ہی پربھاکر کا امتحان پاس کر چکا ہوں۔''

پربھاکر پاس کر چکا ہے؟ تب تو بیٹا تو بہت ہندی پڑھا ہوا ہے، بھوشن جیسے چھوٹے امتحان کے واسطے تو تو اسکول میں ماسٹر بھی ہوسکتا ہے۔''

''جی ہاں مگر میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں، ابھی نوکری نہیں کرنا چاہتا۔''

''نوکری کی بات نہیں بیٹا، میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔''

اور سو یہ ہوا کہ اگلے دن سے مادھو نے بملا کو ہندی پڑھانا شروع کر دیا۔ پہلے تو جب وہ پڑھانے آتا، بملا کی ماں سارے وقت وہیں بیٹھی رہتی لیکن اس کو دیکھ کر یہ اطمینان ہوگیا کہ مادھو اس کی بیٹی کی طرف نظر بازی نہیں کرتا، جلدی جلدی سبق پڑھا کر چلا جاتا ہے۔ بملا بھی مادھو میں کوئی خاص دلچسپی نہ لیتی اور کبھی ذکر بھی کرتی تو اس انداز میں کہ ماں وہ تمھارا مٹی کا مادھو آج اب تک نہیں آیا۔'' اور ماں کو کہنا پڑتا۔ ''بیٹی ماسٹر کا نام ادب سے لیا کر۔ گرو کا استھان بہت اونچا ہوتا ہے۔''

وقت گزرتا گیا۔ بملا کے قد کے ساتھ اس کے بال بھی اور بڑھتے گئے اور اس کا چنچل مزاج دھیما اور شانت ہوتا گیا۔ مادھو نے اب قمیض کے کالر پر ٹائی لگانی اور بالوں میں ٹیڑھی مانگ نکالنی شروع کردی، بملا امتحان میں بیٹھی اور ڈیڑھ مہینے بعد خط ملا کہ وہ تیسرے درجہ میں پاس ہوگئی، ماں نے خوش ہوکر بانٹنے کے لیے مٹھائی منگائی اور بملا سے کہا۔ ''بیٹی سب سے پہلے مادھو کو مٹھائی کھلا کر آ۔ امتحان میں تو اس بیچارے کی محنت کی وجہ ہی سے پاس ہوئی ہے۔''

بملا آج تک مادھو کے کمرے میں نہیں گئی تھی۔ ہاتھ میں مٹھائی کا دونا لیے سر پر پلّو ڈالے دروازے پر جا کر دھیرے سے کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی: ''کون ہے؟ آجاؤ۔'' اندر گئی تو دیکھا مادھو پلنگ پر پڑا سگریٹ پی رہا ہے، بملا کو دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور سگریٹ کھڑکی میں سے پھینک دی جیسے چھوٹا سا بچہ بیڑی پیتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

''تم سگریٹ پیتے ہو؟'' بملا کو یہ دیکھ کر اتنا تعجب ہوا کہ وہ امتحان کی خبر بتانا اور مٹھائی دینا بھی بھول گئی۔

''ہمیشہ نہیں۔ کبھی کبھی.......... مگر تم یہاں کیسے؟ ماں جی کیا کہیں گی؟''

''ماں جی ہی نے بھیجا ہے یہ مٹھائی دینے کے لیے۔ میں امتحان میں پاس ہوگئی ہوں۔''

''اور میں ۔۔؟'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر رک گیا اور بات بدل کر بولا۔

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے بملا، لاؤ مٹھائی کھلاؤ۔''

یہ لو۔ بملا نے دونا بڑھایا۔

''یوں نہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔''

بملا نے ادھر ادھر دیکھا، وہ لمحہ اور اس کی تمام تفصیلات بملا کی یاد میں ہمیشہ کے لیے منجمد ہو گئیں، دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا، کھڑکی کے باہر نیم کے پیڑ پر کبوتروں کی ایک جوڑی بیٹھی غٹرغوں غٹرغوں کر رہی تھی، پڑوس میں کہیں گراموفون پر کوئی گھسا ہوا ریکارڈ بج رہا تھا اور کتابوں سے لدی ہوئی میز کے گرد ایک چمکیلے نیلے پروں والی شہد کی مکھی بھنبھنا رہی تھی۔

ہاتھ میں پیڑا لیے ہوئے وہ آہستہ آہستہ مادھو کی طرف بڑھی...........قریب ......اور قریب۔ اور قریب یہاں تک کہ اس کے گرم گرم سانس کا لمس اپنے گالوں پر محسوس کرنے لگی، اس نے پیڑا مادھو کے منہ کی طرف بڑھایا اور کہا۔ ''منہ کھولو'' مادھو نے منہ کھولا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بملا نے پیڑا منہ میں رکھا تو مادھو نے اس کی انگلی کاٹ لی، بملا کو دانت کاٹنے سے کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی مگر اسے مادھو کے ہونٹ جلتے ہوئے لگے اور اس نے جلدی سے انگلی کھینچ لی۔ جیسے آگ میں جھلس گئی ہو۔

اور پھر نہ جانے یہ کیسے ہوا کہ وہ آنکھیں بند کر کے مادھو کی آغوش میں گر گئی اور اسے معلوم ہوا کہ دہکتے ہوئے ہونٹوں پر دہکتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے جائیں تو اس لمحے میں انسان زندگی کی تمام اذیتوں اور زندگی کی تمام راحتوں سے آشنا ہو جاتا ہے، دنیا گھومتے، گھومتے رک گئی، میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس کی ٹک ٹک جو وقت کی آواز تھی۔ نہ جانے کس سناٹے میں گم ہو گئی۔ صرف نیم کے پیڑ پر کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتے رہے، شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ ایک لاہوتی موسیقی میں تبدیل ہو گئی اور پڑوس کے گراموفون کی سوئی جو ''کالی گھٹا چھائی ہو راجا کالی گھٹا چھائی'' کا فلمی ریکارڈ بیٹھی ہوئی آواز میں سنا رہی تھی ایک مقام پر پہنچ کر اٹک گئی اور اب صرف دو بولوں کا لامتناہی سلسلہ سنائی دیتا رہا۔ کالی گھٹا۔ کالی گھٹا، کالی گھٹا، کالی گھٹا۔''

اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ گراموفون بند ہو گیا، کبوتروں کی جوڑی پھڑ کر کے ہوا میں اڑ گئی

اور دوپہر کے سناٹے میں ٹائم پیس کی ٹک ٹک دفعتاً ایسی سنائی دی جیسے وقت دماغ پر ہتھوڑے مار مار کر کے اپنی اہمیت کو منوا رہا ہو، بملا تڑپ کر مادھو کی آغوش سے نکل گئی اور اس کے بال جو سویرے نہانے کے بعد اس نے جلدی جلدی جوڑے میں باندھ لیے تھے۔ اب کھل کر اس کے شانوں پر لہرا گئے، اس نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ کمرے میں آئے ہوئے اسے تین منٹ بھی نہ ہوئے تھے مگر اتنے میں دنیا ہی بدل گئی تھی۔

"کالی گھٹا۔" مادھو نے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیا؟ وہ ریکارڈ۔" بملا نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں ریکارڈ نہیں یہ تمھارے بال، یہ بھی تو کالی گھٹا سے کم نہیں۔"

اور بملا نے شرما کر اپنے بالوں کو آنچل میں چھپا لیا اور بولی: "چلو چلو مذاق چھوڑو اور مٹھائی کھاؤ۔"

"بملا تم تو پاس ہو گئیں۔ مگر میں۔ فیل ہو گیا؟"

"تم فیل ہو گئے! مگر کیوں؟ کیسے؟؟ تم تو ہر وقت کتاب پڑھتے رہتے تھے۔"

"پڑھتا تو تھا بملا۔ پر میرا من ان کتابوں میں نہیں لگتا تھا کچھ اور سوچتا رہتا تھا۔"

"کیا سوچتے تھے؟"

"سچ بتا دوں؟ تمھارے اور اپنے بارے میں سوچتا تھا۔"

بملا شرما کر خاموش ہو گئی، مادھو بولتا رہا۔ "بملا اگر مجھے تمھاری طرف سے ذرا بھی آشا ہو تو میں بہت جی لگا کر پڑھوں گا۔ اگلے برس ضرور پاس ہوں گا۔ ہم گھر کے بہت غریب ہیں مگر میں بی۔ اے کر لوں گا تو مجھے ضرور اچھی سی نوکری مل جائے گی۔ پھر تو شاید ماں جی کو انکار نہیں ہوگا؟ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

بملا نے ساڑی کا پلّو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ میں کیا جانوں، جب وقت آئے گا تو ماں جی سے پوچھنا۔ مگر جس انداز میں اس نے یہ کہا اور جس انداز سے اس نے مادھو کی طرف دیکھا۔ اس میں اقرار ہی اقرار تھا اور پھر وہ وہاں سے چلی آئی۔

گھر آئی تو ماں نے کہا۔ "اری کہاں رہ گئی تھی اتنی دیر کر دی۔" مگر اس سے پہلے کہ بملا

کوئی بہانہ بنا سکے۔ ماں نے ایک خط اس کے سامنے کر دیا۔

''ذرا یہ تو پڑھ تیرے بابا کی چٹھی آئی ہے بمبئی سے، میرا تو ڈاکیے کو دیکھ کر ہی دل دھکڑ پکڑ کرنے لگتا ہے۔ ہاں تو کیا لکھا ہے؟''

''ماں بابا نے لکھا کہ مجھے رہنے کو اچھا کمرہ مل گیا ہے۔ کوئی جگہ ہے پریل وہاں۔ سو وہ کہتے ہیں۔ تم لوگ گھر کو کرایہ پر چڑھا کر یہاں آجاؤ۔''

سو بملا اور اس کی ماں اور اس کے بھائی بہن سب بمبئی چلے آئے اور اپنے جھانسی والے تین کمروں ایک برآمدے اور ایک چھوٹے سے آنگن والے مکان کے بجائے 'پریل کی ایک چال کی ایک کھولی میں رہنے لگے۔ یہ کھولی اتنی چھوٹی تھی کہ رات کو بنسی لال اور دونوں لڑکوں کو باہر بالکنی ہی میں سونا پڑتا تھا۔ مگر اس کے لیے بھی چار سو روپے پگڑی کے دینے پڑے تھے اور بیس روپے ماہوار کرایہ۔ تب ہی تو ہزاروں بیچارے ہر رات کو فٹ پاتھ پر سو کر ہی زندگی گزار دیتے تھے، بملا نے ایک دن اپنے باپ سے پوچھا۔ ''بابا ان لوگوں کو اس پتھریلے فٹ پاتھ پر کیسے نیند آتی ہوگی'' اور اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بیٹی نیند کہیں بھی آسکتی ہے۔'' بملا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''بابا کبھی تم بھی فٹ پاتھ پر سوئے ہو؟'' اور اس کا جواب سن کر وہ حیرت میں رہ گئی۔ ''ایک دو دن نہیں بملا مہینوں۔ گیارہ برس پہلے جب میں بمبئی آیا تھا، تو ٹرام کمپنی میں نوکری ملنے سے پہلے بیکاری کے دن فٹ پاتھ پر ہی سو کر گزارے ہیں۔''

کھولی چھوٹی تھی مگر بمبئی شہر بہت بڑا تھا اور جلد ہی بمبئی کی رنگین گہما گہمی میں بملا کھولی کی زندگی کی مشکلات کو بھول گئی، بالکنی ہی میں کھڑے کھڑے وہ گھنٹوں سیر کرتی رہتی، کالی نیلی، لال، پیلی، سفید ہر رنگ اور ہر سائز کی موٹریں ہر وقت دوڑتی رہتیں، دو منزلہ بسیں اور دو منزلہ ٹرامیں مست ہاتھیوں کی طرح جھومتی ہوئی گزرتیں اور لوگوں کا تانتا تو کبھی ٹوٹتا ہی نہیں تھا، رات کے بارہ بجے بھی جب قریب کے مل میں شفٹ بدلتا تو سڑک پر میلا لگ جاتا، سامنے مختلف فلموں کے بڑے بڑے رنگین پوسٹر لگے ہوتے جن پر فلم اسٹاروں کی بڑی بڑی خوبصورت تصویریں ہوتیں، ہر روز ان میں سے کوئی نہ کوئی پوسٹر غائب ہو جاتا اور اس کی جگہ کسی نئے فلم کا پوسٹر آجاتا اور پھر بنسی لال مہینے میں دوبار اپنے گھر والوں کے ساتھ ان ہی میں سے کوئی فلم دیکھنے جاتا۔ اور

پانچ آنے کا ٹکٹ لے کر بملا ایک محل جیسے عالیشان سینما ہال میں بیٹھ کر فلم دیکھتی اور حسن وعشق ناچ اور گانے کی روپہلی دنیا میں کھو جاتی مگر پھر کوئی ہیرو کسی ہیروئن سے کہتا۔ ''تم مجھے بھول جاؤ کملا، ہمارے لیے یہی بہتر ہے، تو بملا سوچتی بھلا یہ کیسے ممکن ہے کوئی کیسے کسی کو بھلا سکتا ہے کیا میں مادھو کو بھلا سکتی ہوں؟ اور مادھو کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگتیں اور اس کے ہونٹ دو جلتے ہوئے ہونٹوں کے خیال سے دہکنے لگتے۔

ان کو بمبئی آئے ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ جھانسی سے ایک رجسٹری لفافہ آیا جس میں پانچ روپے کا نوٹ تھا اور ساتھ میں ایک خط، خط ماں جی کے نام تھا، مگر پڑھ کر سنایا بملا نے، اور دو سطریں پڑھ کر ہی وہ سمجھ گئی کہ مضمون دراصل اسی کے لیے ہے، لکھا تھا، ''ماں جی نمستے، جب سے آپ لوگ گئے ہیں گھر میں سب کرائے دار آپ سب کو بہت یاد کرتے ہیں، پڑوس میں منشی کرامت علی بھی کل یہی کہہ رہے تھے کہ بنسی لال کا پریوار جب سے گیا ہے، اپنی گلی میں رونق ہی نہیں رہی اور ہاں وہ وکیل صاحب جن کو آپ نے مکان کرائے پر دیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ انھوں نے آپ کے کہنے کے مطابق سفیدی کروالی ہے۔ اس کے ساڑھے پانچ روپے پہلے مہینے کے کرائے میں کاٹ لیں گے اور ہاں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ گھر کی صفائی ہو رہی تھی تو سامنے والے کمرے کی الماری میں ایک کالی کنگھی ملی ہے۔ وہ انھوں نے مجھے رکھنے کو دے دی ہے، یہ شاید بملا بی کی ہوگی کیونکہ جو بال اس میں الجھے ہوئے تھے وہ بڑے لمبے لمبے تھے، سو وہ اگر کہیں تو ڈاک سے بھیج دوں۔ نہیں تو جب آپ لوگ ادھر آئیں گے تو لے لیجیے گا۔ باقی سب خیریت ہے، شری بنسی لال جی کو نمستے اور ہاں اس لفافے میں پانچ روپے کا نوٹ بھیج رہا ہوں اس مہینے کا کرایہ، کرپا کر کے اس کی رسید ضرور بھجوا دیں کیونکہ آج کل ڈاک کا نظام کچھ ٹھیک نہیں۔''

خط پڑھ کر بملا کے گالوں پر ایک تمتمائی ہوئی لالی دوڑ گئی۔ ''کتنا ڈھیٹ ہے یہ مادھو، کنگھی کی کہانی کیسی گھڑی ہے حالانکہ یہ کنگھی آتے ہوئے خود بملا نے اسے نشانی کے طور پر دی تھی اور مادھو نے اصرار کیا تھا۔ مجھے کنگھی کے ساتھ اس میں الجھے ہوئے تمھارے سر کے بال بھی چاہئیں، کتنا مکار ہے یہ مادھو، روپے منی آرڈر کرنے کے بجائے رجسٹری سے بھیج کر ان کی رسید کے بہانے جواب منگوانے کا انتظام بھی کرلیا۔ سو ایسا ہی ہوا۔ بنسی لال کام پر جانے لگا تو بیوی نے

چلا کر کہا۔''اجی او، ایک پوسٹ کارڈ لیتے آنا، مادھو کو جواب لکھنا ہے اور روپے جو بچارے نے بھیجے ہیں ان کی رسید بھی بھیجنی ہے، بڑا ہی اچھا چھوکرا ہے، کرائے کے ساتھ خط بھی بھیجا ہے، نہیں تو آج کل آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کون کسی کو پوچھتا ہے۔'' بملا نے سوچا کارڈ پر میں بھی دو چار شبد اپنی طرف سے لکھ دوں گی مگر جب اس کی ماں لکھوانے بیٹھی تو اتنا کچھ بولا کہ دونوں طرف سے کارڈ بھر گیا۔ اور آخر میں وہ اپنی طرف سے صرف اتنا لکھ پائی۔

''بملا تمھیں یاد کرتی ہے۔''

ہفتہ کے دن بنسی لال نے کہا آج سنیما نہیں اپالو بندر کی سیر کو چلیں گے، ٹرام میں بیٹھ کر میوزیم اترے، پہلے تو عجائب گھر دیکھا۔ بملا کو ایسے لگا جیسے اس کی اسکول کی ساری کتابیں زندہ ہوگئی ہوں، ایسی سندر مورتیاں تو جھانسی کے کسی مندر میں بھی نہیں۔ یہ بڑی بڑی تصویریں اور بھس بھرے ہوئے جانور، شیر، چیتے، جنگلی بھینسے شیشوں کے پیچھے نقلی جنگل میں کھڑے بالکل اصلی لگتے تھے، پھر عجائب گھر سے نکل کر وہ سمندر کے کنارے گئے جہاں بڑے بڑے جہاز جناتی کچھوؤں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے۔ گیٹ وے آف انڈیا کے سائے میں بچے کھیل رہے تھے۔ پاس ہی چاٹ بک رہی تھی۔ سب نے دو دو آنے کی چاٹ کھائی۔ پھر بچے دوڑنے بھاگنے لگے۔ بنسی لال نے کہا۔''میں تو تھک گیا۔'' اور بملا کی ماں بولی'' بملا تو شیطانوں کا خیال رکھیو۔ کہیں پانی میں نہ جا گریں۔''

بچے پہلے تو گیٹ وے آف انڈیا میں کھیلتے رہے۔ پھر وہ تاج محل ہوٹل کی طرف دوڑے کہ شیشوں میں سے ہوٹل کی رونق دیکھیں گے اور بملا ان کے پیچھے دوڑی کہ کہیں سڑک پار کرتے ہوئے کسی موٹر کے نیچے نہ آجائیں، ایک شیشے میں سے جھانکا تو اندر ہوٹل میں امیر لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بینڈ بج رہا تھا اور ایک میم کچھ گا رہی تھی لیکن اس کی آواز شیشے کی دیواروں میں قید تھی اور ان کو ایسا لگا جیسے وہ صرف ہونٹ ہلا رہی ہے اور ہاتھوں کے اشارے کر رہی ہے۔ اگلے شیشے میں جھانکا تو دیکھا کہ لمبی گدے دار کرسیوں پر سفید کفن اوڑھے مُردے پڑے ہیں اور سفید کوٹ پہنے ہوئے لوگ لمبے لمبے دھاردار چاقو لیے ان مُردوں کے گلے کاٹ رہے ہیں۔ چھوٹا موہن ڈر کے مارے بہن کو چپک گیا۔''دیدی یہ قصائی ہیں کیا؟'' تب بملا نے غور سے

دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ سفید کوٹوں والے باربر ہیں جو صاحب لوگوں کی داڑھیاں مونڈ رہے ہیں۔ اگلے شیشے میں بے جان میمیں ریشمی فراک پہنے کھڑی تھیں۔ اس سے آگے کے شیشے کے پیچھے میموں کے کٹے ہوئے سر سجے ہوئے تھے، کسی کے سر پر سنہری بال، کسی کے کالے، کسی کے بھورے کسی کے گھونگریالے۔ کسی کے بالکل مردوں کی طرح کٹے ہوئے، کسی کی لمبی چوٹیاں، اور ان کے قریب ہی بالوں کی نقلی چوٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ بملا نے سوچا ان نقلی چوٹیوں کا کیا ہوتا ہوگا اور دل ہی دل میں ان کی لمبائی کا اپنے بالوں کی لمبائی سے مقابلہ کیا اور یہ سوچ کر مسکرا دی کہ بھلا میرے بالوں کی لمبائی کا کون مقابلہ کرسکتا ہے۔

اندر سے ایک کالی میم نکل کر باہر جا رہی تھی، بملا نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔ ''میم صاحب یہ بال یہاں بکتے ہیں کیا؟''

میم بولی۔ ''ہاں ہاں، ادھر ان کا سیل ہوتا ہے۔''

''مگر میم صاحب یہ آتے کہاں سے ہیں کیا مردوں کے بال کاٹ لیتے ہیں؟''

''لولو۔'' میم ہنس کر بولی۔ ''بندہ لوگوں کا بال ادھر آتا ہے۔'' اور پھر جیسے ہی اس کی نظر بملا کی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی لمبی چوٹی پر پڑی اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ''چھوکری تمہارا یہ بال اصلی ہے یا نقلی؟''

''بالکل اصلی ہے میم صاحب۔''

''ویری گڈ ان بالوں کا ہم تم کو بہت دام دے سکتا ہے، ٹو روپیز این انچ۔ تم کو کوئی سو روپیہ مل سکتا ہے۔''

''جی کیا کہا میم صاحب؟ تم چاہتی ہو میں اپنے بال کٹوا دوں۔ نہیں جی مجھے شما کرو۔''

اور پھر بچوں کو گھسیٹتے ہوئے ''چلو چلو یہاں سے بھاگ چلیں کہیں یہ میم صاحب بالوں کے بعد میرا سر بھی نہ کاٹنے لگیں۔''

سو وقت گزرتا گیا۔ ہر مہینے مادھو کا خط آتا رہا اور ماں کی طرف سے بملا جواب لکھتی رہی مگر ایک مہینے مادھو کا خط آیا۔ وہ رجسٹری نہیں تھا، سادے لفافے میں تھا اور جب وہ کھولا گیا تو اس میں پانچ کا نوٹ بھی نہیں تھا، لکھا تھا، ماں جی مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ اس بار وقت پر آپ کو

کرایہ نہیں بھیج پایا امتحان قریب آ گیا ہے۔ اس کے لیے ایک کتاب خریدنی تھی کرائے کے روپیوں سے وہ خرید لی۔ پندرہ دن میں امتحان کی فیس بھرنی ہے۔ لگ بھگ سو روپے چاہئیں مگر میرے پتا جی کی حالت خراب ہے۔ اس برس فصل خراب ہوئی ہے۔ جانوروں کی بیماری میں دو بیل مر گئے۔ اس لیے انھوں نے صاف لکھ دیا ہے میں تو کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے میں بہت پریشان ہوں، سب رشتہ داروں، دوستوں کو مدد کے لیے لکھ رہا ہوں۔ دیکھیے کسی نے وقت پر روپے بھیج دیے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ایک سال اور بیکار ہو جائے گا۔ ایک سال تو پہلے ہی فیل ہو کر کھو چکا ہوں، ایشور سے پرارتھنا کیجیے کہ کوئی بندوبست ہو جائے۔ شری بنسی لال جی کو نمستے۔ بملا سے کہیے گا اگر مجھے یہ گھر چھوڑنا پڑا تو اس کی کنگھی ڈاک سے بھیج دوں گا۔''

بملا نے سوچا سو روپے کہاں سے لاؤں یہ تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ بابا مہینے بھر آٹھ گھنٹے روز ٹرام چلاتے ہیں۔ تب سب کچھ کٹ کٹا کر سو روپے ملتے ہیں۔ اس کے پاس تو کوئی سونے کا زیور بھی نہیں کہ وہ بیچ ڈالے، چاندی کے دو تین گہنے ہیں، ایک ہنسلی ایک چھاگل، ہاتھوں کی چار چوڑیاں، نہ جانے چاندی کا کیا بھاؤ ہے؟ اس نے سوچا۔ اگلے دن ماں کی نظر بچا کر اس نے گہنوں کو اپنی ساڑی کے پلّو میں باندھا اور قریب کے ایک سنار کے ہاں پہنچی۔ اس نے آنک کر سب گہنوں کی اٹھارہ روپے قیمت لگائی مگر ساتھ میں یہ بھی کہا کہ بیچنے والے کو نام پتہ بھی رجسٹر میں لکھوانا پڑے گا، بملا ڈری کہ ماں باپ کو معلوم ہو گیا تو پٹائی ہو جائے گی۔ جلدی سے بولی، میں اپنا نام نہیں لکھوانا چاہتی۔ سنار نے اسے ایسی نظر سے دیکھا جیسے وہ یہ گہنے چرا کر لائی ہو۔'' اچھا ایسا ہے تب تو میں پندرہ روپے سے زیادہ نہیں دے سکتا۔'' مگر پندرہ روپے سے سو روپے کا کام کیسے چلے گا، یہ سوچ کر وہ چلی آئی۔

کئی دن تک وہ اسی سوچ میں رہی کہ مادھو کو سو روپے بھیجوں تو کیسے بھیجوں لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی، رات کی نیند بھی اڑ گئی، صبح ہوتے آنکھ بھی لگتی تو خواب دیکھتی کہ زمین سے لے کر آسماں تک اونچی ایک سیڑھی لگی ہے اور اس کے نیچے مادھو کھڑا کہہ رہا ہے۔ ''بملا یہ ترقی کا زینہ ہے پر سو روپے نہیں دیے بنا اس پر چڑھنے کی اجازت نہیں مل سکتی، کبھی دیکھتی سمندر میں طوفانی لہریں اٹھ رہی ہیں اور ان لہروں میں مادھو غوطے کھا رہا ہے۔ بملا اسے دیکھ کر سمندر میں

کود پڑتی ہے اور غوطے کھانے لگتی ہے، اس وقت مادھو چلا کر کہتا ہے۔ ''بملا جلدی سے سو روپے کا نوٹ ساگر دیوتا کی بھینٹ کر نہیں تو ہم دونوں ڈوب جائیں گے۔'' اور کبھی سپنے میں اسے محسوس ہوتا کہ دو جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہیں اور وہ اذیت بھری مسرت کے اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی ہے کہ دفعتاً کوئی شیطانی ہاتھ مادھو کو اس کی آغوش سے گھسیٹ کر دور ایک چٹان پر پٹخ دیتا ہے۔ اور ایک ڈراؤنی آواز سپنے میں بھی اس کا دل دہلا دیتی ہے ''پہلے سو روپے لاؤ سو روپے۔''

چیخ مار کر اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا اور اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ اری کیا ہوا؟ سپنے میں ڈر گئی تھی کیا؟

اس دن بملا نے ماں سے کہا۔ ''بابا کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے ماں، پھر بھی ہمارا خرچہ پورا نہیں ہوتا، میں بھی کہیں نوکری کر دوں تو کیسا ہو؟'' پہلے تو اس کی ماں کو یہ خیال ہی برا لگا۔'' پاگل ہوئی ہے ری۔ ایسے بد نظر شہر میں چھوکریوں کا کام پر جانا مجھے تو بالکل نہیں پسند، کرسچین چھوکریوں کی بات اور ہے۔'' مگر کچھ سوچ کر یہ بھی کہا۔ ''خیر تیرے بابا آئیں گے تو ان سے کہوں گی، تو جانے اور وہ جانیں۔'' بملا کا خیال تھا بابا کبھی اجازت نہیں دیں گے مگر بنسی لال نے بیوی کی بات سن کر کہا۔ ''ٹھیک تو کہتی ہے بملا اس تنخواہ پر تو میں ان بچوں کو بمبئی میں نہیں پڑھا سکتا۔ بملا کی چھوٹی موٹی نوکری لگ جائے تو بڑا سہارا ہو جائے۔'' اور پھر بملا سے۔ ''بڑے وقت پر یاد آیا، اری تو نے ہندی کا بھوشن پاس کیا ہے نا؟ بس پھر کام بن جائے گا۔ اپنے پڑوسی ہیں نارتن لال جی، وہ کہہ رہے تھے کہ ان کی مل میں جو سوشل ورکر ہے۔ وہ مزدوروں کے لیے ہندی کلاسیں کھولنا چاہتی ہیں۔ انھیں ضرور ہندی ٹیچروں کی ضرورت ہوگی۔''

باہر بورڈ پر لکھا تھا ''مس سیتا دیوی رام چند سوشل ورکر''، مگر بملا اندر جو پہنچی تو دیکھا سفید کرتا پاجامہ پہنے ایک دبلا سا گورا سا لڑکا بیٹھا ہے۔

'جی شما کیجیے میں سیتا دیوی جی سے'' اور یہ کہتے ہوئے وہ الٹے پیروں لوٹنا چاہتی تھی کہ اس ''لڑکے'' نے اشارے سے اسے روکا اور مسکرا کر کہا۔

میں ہی سیتا دیوی ہوں، کہو کیا کام ہے؟''

تب بملا نے دیکھا کہ" لڑکا دراصل اس سے عمر میں کچھ بڑی لڑکی ہے۔ جس کے بال لڑکوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے ہیں اور جو کھدر کا کرتا اور لڑکوں جیسا ڈھیلے پانچوں کا کھدر کا پاجامہ پہنے ہوئے ہے اور نہ جانے کیوں بملا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس سیتا دیوی کے لڑکوں جیسے بال اس سے کچھ کہہ رہے ہیں مگر وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ وہ اس وقت نہ سمجھ سکی۔

اس کے بھوشن کے سرٹیفکیٹ پڑھ کر ہی سیتا دیوی نے بملا کو ہندی ٹیچر کی نوکری دینا منظور کر لی۔ کام صرف چار گھنٹے روز اور تنخواہ صرف پچاس روپیہ ماہوار۔ ہفتے میں ایک دن چھٹی سال میں ایک مہینے چھٹی۔ "اور پیشگی؟ کیا دو مہینے کی تنخواہ پیشگی مل سکے گی؟" سیتا دیوی نے جواب میں کہا۔ "بملا تم بیٹھ جاؤ اور پھر بات کرو۔ تم بمبئی میں بالکل نئی اور سیدھی معلوم ہوتی ہو۔ جانتی ہو کتنی مشکل سے اور کتنے دباؤ ڈال کر میں نے مل مالکوں کو یہ ہندی کلاسیں چلانے پر راضی کیا ہے۔ اگر کہیں ان کو معلوم ہوا کہ ہندی ٹیچر دو مہینے کی تنخواہ اڈوانس مانگ رہی ہے تو سیٹھوں کو دل کا دورہ پڑ جائے گا۔" اور پھر کرسی آگے سرکا کر دھیمے لہجے میں جیسے ایک سہیلی دوسری سہیلی سے بات کرتی ہے۔" مگر تمھیں یہ اڈوانس کیوں چاہیے، گھر میں کوئی بیمار ہے؟ تو میں علاج کا انتظام کر سکتی ہوں۔"

"نہیں نہیں بہن جی گھر میں کوئی بیمار نہیں ہے۔"

"تو تمھارا بیاہ ہے کیا؟ ایسی صورت میں تمھارے پتا کو ایڈوانس دلوایا جا سکتا ہے، ٹرام کمپنی کے سوشل ورکر کے ذریعہ۔"

نہیں نہیں بہن جی بابا کو تو اس بات کا پتہ بھی چل گیا تو برا ہوگا۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔ کل سے کام پر آجاؤں گی۔"

مل سے لوٹتے ہوئے وہ ٹرام میں اوپر جا کر بیٹھ گئی۔ حالانکہ اس کا گھر وہاں سے دور نہیں تھا، مگر اس وقت وہ کہیں الگ بیٹھ کر اس مسئلے پر سوچنا چاہتی تھی، کنڈکٹر نے پوچھا۔" کہاں کا ٹکٹ کاٹوں۔" اس نے کہہ دیا جہاں تک یہ ٹرام جائے گی۔" اور پھر اپنے خیالات میں کھو گئی۔

دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا کہ ٹرام خالی ہے اور نیچے کوئی ٹرام کی آہنی دیواروں کو دھڑ دھڑ پیٹ رہا ہے۔" اے دیوی جی میوزیم آ گیا، اترنا ہے یا واپس جانا ہے۔"

وہ نیچے اتر آئی اور بے خیالی میں اپالو بندر کی طرف چلنے لگی، دو موٹروں کے نیچے آتے آتے بچی۔ جلدی سے فٹ پاتھ پر ہولی اس کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ شیشے کی دیوار کے سامنے کھڑی، اس میں سجے ہوئے میموں کے سروں کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کے سر پر سنہری بال کسی کے سر پر کالے، کسی پر بھورے، کسی کے گھونگھریالے، کسی کے بالکل مردوں کی طرح کٹے ہوئے۔

اور یکا یک اس کی سمجھ میں آگیا کہ سیتا دیوی کے لڑکوں جیسے بال اس سے کیا کہہ رہے تھے۔

.........

ٹیکسی کرافورڈ مارکیٹ سے آگے نکل چکی تھی۔

بملا نے پوچھا۔ ''تم نے امتحان پاس کرلیا اور ہمیں مٹھائی بھیجنا تو کیا، خبر بھی نہ بھیجی، ماتا جی کو تو بہت چنتا تھی کہ نہ جانے مادھو کا کیا ہوا۔ ہمارا گھر جب سے چھوڑا ایک چٹھی بھی نہ بھیجی۔''

''بملا کیا بتاؤں میں کچھ ایسے ہی کاموں میں پھنسا ہوا تھا، چھ مہینے دہلی میں رہا، وہاں سے کانپور گیا، پھر کلکتے مگر اب میں بمبئی آگیا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔''

بی۔اے ہو۔ نوکری تو اچھی ملی ہوگی؟

''نوکری تو اچھی ہے۔ مگر میں نے بی۔اے نہیں کیا، امتحان نہیں دے سکا۔''

''امتحان نہیں دیا! تو وہ فیس.............''

فیس کا بھی عجیب قصہ ہوا' بملا یاد ہے۔ میں نے تمھاری ماں جی کو اس بارے میں خط لکھا تھا؟ اسی طرح اور بھی دس بارہ رشتہ داروں اور دوستوں کو خط لکھے تھے۔ ان میں سے تین تو بمبئی ہی میں تھے مگر کسی نے پھوٹی کوڑی تک نہیں بھیجی اور فیس بھرنے کی آخری تاریخ گزر گئی اگلے دن میں تمھارا گھر چھوڑ کر واپس گاؤں جانے کی سوچ رہا تھا کہ ڈاکیے نے ایک تار کا منی آرڈر لاکر دیا، سو روپے کا مگر اس پر بھیجنے والے کا نہ نام تھا نہ پتہ اور آج تک یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ مہربانی کس کی تھی، مگر ان سو روپوں سے میری قسمت بدل گئی۔

''تو کیا کیا ان روپوں کا تم نے؟''

میں نے امتحان کی فیس دے کر بی۔اے کی ایک بیکار ڈگری لینے کے بجائے ساٹھ روپے کا ایک بڑھیا سوٹ سلوایا اور باقی روپے لے کر دہلی پہنچ گیا۔ وہاں ایک دوست نے اِس کام

میں لگوادیا۔ سوتم دیکھ سکتی ہو کہ میں کتنا کامیاب ہوں۔'' اور یہ کہہ کر اس نے اپنی ریشمی ٹائی کی گرہ کو ٹھیک کیا۔

''کیا ہے تمھارا کام؟''

''میرا کام یہی ہے کہ.................'' مگر اتنے میں ٹیکسی ایک چھ منزلہ عمارت کے نیچے جا کر کھڑی ہوگئی سو مادھو نے کہا: ''ابھی معلوم ہو جائے گا تمھیں۔''

بملا پہلی بار لفٹ میں چڑھ کر چوتھی منزل تک پہنچی، مادھو اسے لے کر بڑی بے تکلفی سے ایک دفتر میں داخل ہوا اور ٹائپسٹ لڑکیوں کے بیچ میں سے ''ہیلو، ہیلو'' کہتا ہوا ایک کمرے میں لے گیا، جو اتنا ٹھنڈا تھا کہ اندر گھستے ہی بملا کو چھینکیں آنے لگیں۔

''لگتا ہے ایئر کنڈیشننگ کی عادت نہیں ہے تمھیں؟ اچھا تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر وہ باہر گیا اور بملا نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا، زمین پر گہرا نیلا قالین اتنا نرم اور دبیز کہ پاؤں دھنسے جاتے تھے، ایک میز کاغذوں اور تصویروں سے لدی ہوئی، تصویریں، سب خوبصورت عورتوں کی، ایک طرف تین ٹانگوں پر لدا ہوا بڑا سا سنیما کا کیمرہ۔ دو تین اور کیمرے، تین بڑے بڑے بلبوں کے لیمپ، جن کی روشنی چندھیانے والی تھی اور ایک چھوٹی تپائی پر لال لال تیل کی بوتلیں، جن کے لیبلوں پر کھلے بالوں والی ایک لڑکی کی تصویر تھی اور تیل کا نام لکھا تھا۔

'کالی گھٹا ہیئر آئل'

سامنے ایک بلیک بورڈ اور اس پر ہندی حروف میں لکھا تھا۔ میرے بال اتنے لمبے صرف اس لیے ہیں کہ میں ہمیشہ کالی گھٹا ہیر آئل استعمال کرتی ہوں۔

وہ ان سب اَن مل اور بے جوڑ چیزوں کا آپس کا تعلق سمجھ نہیں پائی تھی کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک گنجا سا موٹا سا آدمی موٹے موٹے شیشوں کی عینک پہنے داخل ہوا اور انگریزی میں بولا۔

او ہیلو، سو یو آر کرنس گرل فرینڈ؟'' (SO YOU ARE KIRAN'S GIRL FRIEND?)

''جی میں مادھو کے ساتھ آئی ہوں۔''

''مادھو؟ کون مادھو! او تمھارا مطلب ہے اپنا کرن کمار، ویری اسمارٹ بوائے۔''

اور اسی وقت مادھو داخل ہوا ہاتھ میں ایک کنگھا لیے ہوئے۔

"مادھو یہ کیا تم نے اپنا نام بدل لیا ہے کیا؟"

"ہاں بملا مادھو، جیسے بھولے نام سے اس دنیا میں کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ ہاں تو دیکھو تم اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہو۔ تمھارا منہ دوسری طرف ہے۔ کیمرہ صرف تمھارے بالوں پہ ہے، دھیرے دھیرے کیمرہ پیچھے جاتا ہے، اب ہم تمھارے بالوں کی حیرت انگیز لمبائی دکھاتے ہیں، اب تم آہستہ آہستہ کیمرے کی طرف مڑتی ہو، مسکراتی ہو اور کہتی ہو۔

"میرے بال اتنے لمبے صرف اس لیے ہیں کہ میں ہمیشہ کالی گھٹا ہیئر آئل استعمال کرتی ہوں۔"

"مگر مادھو میرے بال تو......"

اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو بزنس ہے، دھندا ہے، کام ہے، کیوں شرما جی ٹھیک کہتا ہوں؟ ہاں تو بملا چند منٹ پوز کرنے کے پورے سو روپے تمھیں ملیں گے۔ یہ فلم پروڈیوس کرنے کے ہزار روپے مجھے ملیں گے اور اس فلم کو بنانے کے ٹھیکے میں پانچ ہزار کا منافع ہوگا شرما جی کو — ہاں تو شرما جی اب آپ ہندوستان کے ہی نہیں، ایشیا کے ہی نہیں، دنیا کے سب سے لمبے بال دیکھیں گے۔"

اور یہ کہہ کر اس نے ڈرامائی انداز میں بملا کے سر سے پلو کھینچ لیا اور بملا نے شرم کے مارے اپنا منہ چھپا لیا۔

مادھو چلّایا۔ "بملا! تم نے یہ کیا کیا؟"

اور شرما نے کہا۔ "کرن۔ یہ سب کیا ہے۔ ہم سے مذاق کرتے ہو۔"

"ہندوستان کے ہی نہیں، ایشیا کے ہی نہیں، دنیا کے سب سے لمبے بال؟ ساڑھے پانچ انچ لمبے۔ اسی پروگرام کے تم ہزار روپے مانگ رہے تھے؟"

"مگر مسٹر شرما................"

"گیٹ آؤٹ اور اب مجھے اپنی صورت کبھی نہ دکھانا اور نہ کسی دوسری ایڈورٹائزنگ کمپنی میں گھسنے کی کوشش کرنا۔ میں تمھاری اس حرکت کی پوری رپورٹ اپنی ایسوسی ایشن کو بھیجنے والا ہوں۔"

ٹیکسی کے بجائے اب وہ ٹرام میں لوٹ رہے تھے۔

بملا نے پوچھا۔ "اب میں تمھیں مادھو کہوں یا مسٹر کرن کمار؟"

''مسٹر کرن کمار مر گیا، مادھو ہی کہو۔''

''مجھے معاف کرنا مادھو، میں نے بال کٹوا کر تمھارا اتنا نقصان کروا دیا۔''

''وہ تو ہوا مگر بملا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ایسا کیا کیوں؟''

''کنگھی کرنے میں بہت وقت جاتا تھا، اب میں روز کام پر جاتی ہوں نا، مل میں مزدوروں کو ہندی پڑھانے، وہی ہندی جو تم نے مجھے پڑھائی تھی۔''

''تو کیا مجھے ایسا کام نہیں مل سکتا؟ چھوٹی سی نوکری بھی مل جائے تو میں تمھارے پتا جی سے بات کروں۔''

''کیوں نہیں، ہمارے یہاں ہی کام کر سکتے ہو۔ اب وہ مل میں باقاعدہ اسکول بنانا چاہتے ہیں۔ تم تو پربھاکر ہو ڈیڑھ سو روپے مل جائیں گے۔ سارے دن پڑھانے کے۔''

''اور تم؟''

''میں چار گھنٹے پڑھاؤں گی۔''

''اور باقی وقت؟''

''باقی وقت تمھارے گھر کی دیکھ بھال کروں گی۔''

''میرا گھر؟''

''نہیں میرا گھر۔''

اور ان دونوں نے چلتی ٹرام میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور نہ جانے کتنی دیر دیکھتے ہی رہے اور اس وقت بملا کو معلوم ہوا کہ نگاہوں کا طویل بوسہ بھی ہونٹوں کے پیار سے کم تکلیف دہ اور کم لذت بخش نہیں ہوتا۔

''چلو چلو ٹرمنس آ گیا ٹرام خالی کرو'' کنڈکٹر کی آواز نے وہ طلسمی لمحہ ختم کر دیا، گھبرا کر دونوں اٹھے، جیسے چور پکڑے گئے ہوں۔ کنڈکٹر کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ —بابا بملا چلائی۔ ''یہ ہیں...............مگر اب وہ مادھو کا نام نہ لے سکی۔

(نقوش، خاص نمبر دسمبر 1959)

○

# کولڈ ویو/سرد لہر

بلدیو سے تھوڑی دور پر بیٹھا ہوا فقیر ٹھٹھرتی ہوئی، کانپتی ہوئی آواز میں بار بار بڑبڑا رہا تھا۔ "بڑی ظالم سردی ہے۔ غریب کو ایک کمبل دلوادو بابا، بھگوان بھلا کرے گا بابا۔" اور کیونکہ وہ اندھا تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ رات بہت جا چکی ہے۔ اب سارے کناٹ پلیس میں ایک راہ گیر بھی نظر نہیں آتا اور جس آہٹ کو سن کر وہ بول پڑا تھا، وہ انسانی قدموں کی نہیں تھی۔ ہوا میں اڑتے ہوئے کاغذوں اور سوکھے پتوں کی آواز تھی۔

ہوا کا جھونکا ایک پرانے اخبار کے ورق اڑا کر لایا اور بلدیو نے لپک کر اسے پکڑ لیا اس امید میں کہ شاید وہ کاغذ اوڑھنے یا بچھانے کے کام آجائے۔ اس نے کسی ناول میں پڑھا تھا کہ سرد ملکوں میں غریب جن کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے وہ قمیض کے نیچے اخبار کے کاغذ اپنے سینے پر لپیٹ لیتے ہیں۔ آج شاید وہ بھی ایسا کرے لیکن جب ردی، اخبار ہاتھ میں آیا تو اس نے دیکھا کہ ہر کالم میں سے کچھ نہ کچھ تراشا ہوا ہے۔ کسی نے بڑی صفائی سے قینچی یا بلیڈ سے خبریں اور اشتہار کاٹ لیے تھے۔ اب تو دونوں ورقوں میں درجنوں کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ بلدیو نے سوچا اس کاغذی چھلنی سے بھلا اس زہریلی ٹھنڈی ہوا کا کیا علاج ہوگا۔ کاغذ کو کھول کر دیکھا تو دو دن پہلے کی تاریخ تھی۔ پہلے صفحہ پر ہی ایک سرخی نظر آئی 'مقامی موسم' نہ جانے کیسے تراشا لینے

والے کی قینچی اس پر نہیں چلی، سرخی کے نیچے لکھا تھا۔

''دہلی۔6 جنوری محکمۂ اطلاعات موسم کی سرکاری خبر ہے کہ اگلے دو دن بعد ہی دہلی اور مضافات میں نہایت سخت 'کولڈ ویو' یعنی سردی کی لہر آنے والی ہے۔ جس کی وجہ شملہ کی پہاڑیوں میں برف باری بتائی جاتی ہے۔ خیال ہے کہ اس برس دہلی میں اتنی سردی ہوگی جتنی پچھلے سو برس میں کبھی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ سے انفلوئنزا اور نمونیہ پھیلنے کا بھی خطرہ ہے......''

بلدیو کو اس سے آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی، اس برس کی دہلی کی سردی پر وہ اس سے بھی زیادہ مفصل اور موثر رپورٹ لکھ سکتا تھا۔ روزانہ ٹمپریچر گرتا ہی چلا جا رہا تھا اور رات کو تو ایسا پالا پڑ رہا تھا کہ صبح سویرے جوہڑوں تالابوں کے پانی کی سطح پر برف کی پتلی سی تہہ جمی ہوئی ملتی تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ خطرناک تھی وہ ہوا جوان دنوں شملہ کی طرف سے آرہی تھی۔ بلدیو نے سوچا مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ ہوا برف کی طرح ٹھنڈی بھی ہو سکتی ہے اور ساتھ ہی میں ریزر بلیڈ کی طرح دھار دار بھی اور پھر کمبخت اتنی چالاک کہ کسی برآمدے کے کونے میں، کسی دیوار کی اوٹ میں، کسی مکان کے زینے میں چھپو، وہ پتہ پوچھتی ہوئی وہیں پہنچ جاتی ہے اور پھر قمیض کے گریبان سے، کالر میں سے، آستینوں میں سے داخل ہو کر کھال اور گوشت میں سے ہوتی ہوئی اندر ہڈیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ بلدیو نے کئی بار سوچا، اس برس کی سردی کولڈ ویو کے بارے میں چند شعر ہی لکھ ڈالے کہ سند رہیں اور بوقت ضرورت (یعنی اس کی وفات کے بعد) کام آئیں، لیکن سردی میں تو لگتا تھا سر اور دماغ میں خون بھی جم جاتا ہے، فکر اور تخیل کے سوتے برف بن جاتے ہیں اور انسان کے خیالات پریشان ہونے کے بجائے منجمد ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

اس نے سوچا اگر سردی کا یہی حال رہا تو تھوڑی دیر میں میری رگوں کا خون جم جائے گا۔ میرا دماغ کام کرنے سے انکار کر دے گا، میری یاد میرا احساس میرا شعور سب سردی سے مفلوج ہو جائیں گے۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے، کچھ بولنا چاہیے اور کچھ نہیں اس اندھے بڈھے فقیر کی طرح بڑبڑاتے ہی رہنا چاہیے۔ بڑی ظالم سردی ہے بابا، ایک کمبل کا سوال ہے بابا، بھگوان بھلا کرے بابا'' مگر نہیں وہ فقیر نہیں ہے۔ ایک شاعر ہے ایک حساس باشعور تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ وہ کوئی اندھا فقیر نہیں ہے کہ ٹھٹھری ہوئی آواز میں بک بک کرتا رہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ میری آواز بھی

ٹھٹھر گئی ہو۔ شاید میری زبان سے بھی الفاظ کانپتے ہوئے نکلیں اور اس نے سوچا کہ نکل کر تو دیکھنا چاہیے سو اس نے کہا۔ "سورداس جی کس سے سوال کر رہے ہو، یہاں تو سارا بازار سنسان پڑا ہے۔"

اس نے کہا کہ اس کے دانت سردی کے مارے کڑکڑا رہے ہیں اور اس کی اپنی آواز بھی فقیر کی آواز سے کم ٹھٹھری ہوئی نہیں ہے اور وہ جو بیچارہ اندھا تھا اور کیونکہ وہ اندھا تھا اس نے یہ نہیں دیکھا کہ بولنے والا فلالین کی پتلون اور ریشمی قمیض پہنے ہوئے پڑھا لکھا نوجوان بابو ہے، وہ سمجھا یہ کوئی آنکھوں والا فقیر میرے اڈے پر آن دھمکا ہے، اب یہاں میری دال نہیں گلتی۔ جو بھی ادھر سے گذرے گا یہ کمبخت پہلے ہی اس سے پیسے جھٹک لے گا۔ سو اپنی لاٹھی اور گدڑی سنبھال کر وہ اٹھا اور کناٹ پلیس کے کمان جیسے برآمدوں میں دور تک اس کی لاٹھی کی کھٹ کھٹ گونجتی ہوئی چلی گئی۔ یہاں تک کہ رات کے سناٹے میں گم ہو گئی۔

دفعتاً سردی کے ساتھ ساتھ بلدیو کو تنہائی کے احساس نے بھی آن دبوچا۔ اس نے سوچا تنہائی بھی ایک قسم کی سردی ہے۔ سردی ایک قسم کی تنہائی ہے۔ جہاں کوئی ساتھی نہ ہو، دوست رشتہ دار نہ ہو، ہم نوالہ و ہم پیالہ نہ ہو، محبوب دلربا نہ ہو، لوگوں کا ہنگامہ اور بھیڑ بھاڑ نہ ہو۔ وہ سناٹا بھی اپنے اندر ایک برفانی کیفیت رکھتا ہے۔ سنا ہے کہ ایک دوزخ ایسی ہوگی جہاں گنہگاروں کو آگ میں جلایا نہیں جائے گا۔ برف کے سلوں پر برہنہ لٹا دیا جائے گا اور اس دوزخ سے بھی زیادہ بھیانک وہ دوزخ ہوگی جہاں ہر گنہگار کو برسوں کے لیے اکیلے کال کوٹھری میں بند کر دیا جائے گا اور بلدیو نے سوچا میں جس دوزخ میں ڈالا گیا ہوں اس میں سردی اور تنہائی دونوں اذیتیں موجود ہیں اور ایک جھٹکے کے ساتھ اکیلے پن کا شدید احساس، ایک برفیلی بجلی کی طرح اس کے تن بدن میں کوند گیا۔

مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا۔ ورنہ اس سردی اور تنہائی سے پاگل ہو جاؤں گا۔ مجھے کچھ بولنا ہی چاہیے۔ سوچنا ہی چاہیے۔ ورنہ دماغ برف کی طرح جم کر ایک دم ٹوٹ جائے گا۔ جیسے پانی پر جمی ہوئی برف بوجھ سے دب کر ٹوٹ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ بھی بھول جاؤں گا کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، کہاں ہوں اور کیوں ہوں۔

میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ میں بلدیو راج شرما ہوں، ذات پات میں اعتقاد نہیں رکھتا

لیکن جنم سے برہمن ہوں۔ میرٹھ کالج کا گریجویٹ ہوں، میرے باپ وکالت سے چار پانچ ہزار ماہوار کماتے ہیں، آزادی سے پہلے رائے بہادر رنبیر راج شرما بی۔ اے، ایل، ایل بی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کہلاتے تھے اور اب صرف پنڈت رنبیر راج شرما کہلاتے ہیں۔ میں اپنے باپ کا بیٹا ہی نہیں خود بھی کچھ ہوں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ خاصا خوبصورت ہوں، اس کے علاوہ میرے پروفیسروں کا بیان ہے کہ میں کافی ذہین بھی ہوں گو میں نے بی اے سیکنڈ ڈویژن میں کیا ہے، مگر اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں کالج کے دوسرے ہنگاموں میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ ڈی بیٹنگ سوسائٹی، ٹینس کلب، ڈرامیٹک کلب، جلسے مشاعرے۔ میں شاعر بھی تو ہوں اور میرا تخلص ہے نرمل مشاعروں میں مجھے جناب نرمل میرٹھی کے نام سے بلایا جاتا ہے اور کوی سمیلنوں میں پنڈت نرمل جی کہلاتا ہوں۔ کہتے ہیں میری غزل اور کویتاؤں میں محبت کا اظہار جس شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور حسن کا بیان جس بیباکی سے کیا جاتا ہے وہ اس کے دور کے کسی نوجوان شاعر یا کوی کے کلام میں نہیں ملتا۔

میں کہاں ہوں؟ اور کیوں ہوں؟۔۔۔ میں اس وقت اپنے پتا کی کوٹھی میں نہیں ہوں جہاں اس وقت میرے بیڈروم کے آتشدان میں آگ جل رہی ہوگی اسپرنگ والے پلنگ پر نرم کمبل اور ریشمی لحاف رکھے ہوں گے، سرہانے میرا چینی سلک کا سلیپنگ سوٹ رکھا ہوگا اور پشمینے کے کشمیری دردوزی کے کام کی ڈریسنگ گاؤن اور الماری میں ملٹن بائرن، کالیداس اور غالب کی کتابوں کے پیچھے چھپی ہوئی برانڈی کی بوتل رکھی ہوگی۔

میں اس وقت رادھا کے کوٹھے پر بھی نہیں ہوں جہاں محفل رقص وسرود گرم ہوگی اور خون کو گرمانے والی شراب کا دور چل رہا ہوگا اور میرے سوا میرٹھ کے سب شوقین مزاج امیر نوجوان بڑھ بڑھ کر داد دے رہے ہوں گے اور رادھا شاید میری ہی لکھی ہوئی کوئی غزل یا میری ہی بتائی ہوئی کوئی ٹھمری گا رہی ہوگی۔ رادھا.......... جس سے مجھے اتنا شدید عشق تھا کہ اس کی فکر میں میں نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ میرے پتا نے مجھے جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی۔ مگر میں نے پروانہیں کی اور جس طرح قمیض پتلون پہنے بیٹھا تھا اسی طرح اٹھ کر چلا آیا اور میری ماں رو رو کر مجھے بلاتی ہی رہی، مگر میرے کانوں میں رادھا کے طلسمی گھنگرو ہی چھنکتے رہے۔ میں نے طے کر

لیا تھا کہ میں ثابت کروں گا کہ شاعر عشق کا صرف بیان ہی نہیں کرتا، عشق کرتا بھی ہے اور اس شدت کے ساتھ کہ اس کے لیے جان ایمان، گھر بار سب کچھ قربان کرسکتا ہے، رومیو جولیٹ، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، چارو دتا اور سنت سینا، یہ سب تو فرضی قصے کہانیاں ہی ہیں لیکن نرمل اور رادھا، رادھا اور نرمل دنیا کو سچ مچ عشق کی آگ میں جل کر دکھادیں گے اور سو میں اسی طرح قمیض اور پتلون پہنے بازاروں میں سے ہوتا ہوا رادھا کے کوٹھے پر پہنچا۔ اس وقت مجھے سردی کا احساس نہیں تھا۔ سہ پہر کی سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی، میری رگوں میں جوانی کا گرم خون دوڑ رہا تھا۔ میرے دل میں عشق کا بخار تھا اور مجھے یقین تھا کیونکہ رادھا نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ بھی میری طرح آتش عشق میں جل رہی ہے۔

وہ آئینے کے سامنے، پاس انگیٹھی رکھے اپنے لمبے گھنے سیاہ بال سکھا رہی تھی، انگیٹھی کے دہکتے ہوئے انگاروں کا گلابی عکس اس کے گورے گورے گالوں کو تمتما رہا تھا۔ میں نے سوچا رادھا کی محبت جس کو نصیب ہو اس کو موسم کی سردی یا زمانے کی سرد مہری کی کیا پروا۔

''آیئے آیئے نرمل جی'' اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا مگر ساتھ ہی اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر جب اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے ان میں بھی محبت کی گرم گرم شراب چھلکتی ہوئی نظر آئی۔

''رادھا میں نے تمھاری خاطر گھر چھوڑ دیا ہے۔ بابو جی نے عاق کرنے کی دھمکی دی ہے، اٹھو چلو میرے ساتھ دہلی جا کر شادی کرلیں گے......''

''اور کھائیں گے کیا؟''

''میں کوئی نوکری کرلوں گا۔ تم چاہو تو ریڈیو پر گا سکتی ہو۔''

''نرمل تم بڑے بھولے ہو۔ تمھیں نہیں معلوم سرکاری ریڈیو پر کوئی طوائف گا نا نہیں گا سکتی۔ جاؤ میری جان اپنے بابو جی سے شما (معافی) مانگ لو۔ کیوں لاکھوں کی جائیداد پر لات مارتے ہو۔''

اس لیے کہ مجھے جائیداد سے زیادہ تم پیاری ہو۔ رادھا میں اسکول میں ٹیچری کروں گا۔ کلرکی کروں گا مگر اب اس گھر میں واپس نہیں جاؤں گا۔ جہاں میں تمھیں بیوی بنا کر نہیں رکھ

سکتا۔''

تو جاؤ بابو جو جی چاہے کرو مگر میں اس لیلیٰ مجنوں کے ناٹک کی ہیروئن بننے کو تیار نہیں ہوں۔'' پھر ایک ایسی آواز میں جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی، تلوار سے بھی زیادہ دھار دار تھی۔ وہ بولی ''اب تم جاؤ بابو مجھے ڈریس کرنا ہے، دھندے کا ٹائم ہوتا ہے۔

جب میں کوٹھے میں سے اترا تو دھوپ ڈھل چکی تھی ٹھنڈی ہوا سامنے والے پارک کے پیڑوں میں سرسرا رہی تھی، مجھے ایک ہلکی سی جھرجھری آئی اور پہلی بار مجھے یاد آیا کہ میں گھر سے بغیر کوٹ یا پل اوور پہنے نکل آیا تھا۔

کل ہی کا تو واقعہ ہے، کل تیس گھنٹے گذرے ہیں۔ اور میں میرٹھ سے صرف پچیس میل دور نئی دہلی میں ہوں مگر اس عرصہ اور اس فاصلے میں میری دنیا ہی بدل گئی ہے۔

کل تک میں ایک رئیس زادہ تھا، ایک بے فکر نوجوان تھا۔ سماج کا ایک مقبول اور معزز فرد تھا، باپ اپنے بیٹوں کے سامنے میری ذہانت اور قابلیت کی داد دیتے تھے۔ ہر ماں اپنی بیٹی کو مجھ سے بیاہنے کے لیے تیار تھی، کالج کی کتنی ہی لڑکیاں مجھ پر جان دیتی تھیں، مجھ سے دو باتیں کرنے کے بہانے تلاش کرتی تھیں — اور آج میں ایک بے کار، بے گھر، آوارہ ہوں جس کی جیب میں نہ پیسہ ہے، نہ بدن پر گرم کپڑا ہے اور جو کناٹ پلیس کے ایک برآمدے کے ستون کی اوٹ میں ٹھنڈے پتھروں کے فرش پر بیٹھا ٹھٹھر رہا ہے۔ دانت کڑکڑا رہے ہیں۔ رگوں میں خون جمتا جا رہا ہے۔ دماغ دھیرے دھیرے مفلوج ہوتا جا رہا ہے...... ہوسکتا ہے یہ میری ضد کا نتیجہ ہو۔ اگر میں واپس جا کر اپنے پتا کے قدموں پر گر جاتا تو وہ ضرور مجھے معاف کر دیتے اور میں اس وقت پشمینے کی ڈریسنگ گاؤن پہنے آتشدان کے پاس بیٹھا برانڈی پیتا ہوتا۔ مگر مجھے آتشدان کی گرمی سے زیادہ محبت کی گرمی کی تلاش ہے، میرے بدن سے کہیں زیادہ میری روح ٹھٹھر رہی ہے کیونکہ میرے بدن پر تو کم سے کم ایک بنیائن اور ایک قمیص ہے۔ لیکن پچھلے تیس گھنٹوں میں میری روح سے تو ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتر چکے ہیں۔ اور اب وہ مادر زاد برہنہ کھڑی زمانے کی برفیلی ہواؤں کے تھپیڑے آ رہی تھی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ میرٹھ میں رہ کر اپنی اور اپنے پتا کی بدنامی کا باعث بنوں، سو میں دہلی

چلا آیا۔ رات اسٹیشن کے تھرڈ کلاس ویٹنگ روم WAITING ROOM میں کاٹی اور پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ غریب اور عوام جب تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں تو ان پر کیا گذرتی ہے۔ فرش پر لوگ ایسے پڑے تھے جیسے میدان جنگ میں لاشیں پڑی ہوں، پاخانے سے بدبو کے بھپکے آرہے تھے۔ ہر سُر کے خراٹے مل کر ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ لیکن ایک گھنٹے تک فراٹے بھرتی ہوئی ریل میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھانے کے بعد اس ویٹنگ روم کی گرمی میرے لیے کتنی خوش آئند تھی۔ ایک پرانا کاغذ فرش پر بچھا کر اس پر لیٹ رہا تھا۔ دن بھر کے ہیجان اور ہنگامے کے بعد نیند تو نہیں آئی مگر یہ سوچ کر میں نے اپنے آپ تسلی دے لی کہ کم سے کم یہاں سردی تو نہیں ہے اور اس وقت مجھے دفعتاً یہ خیال آیا کہ اتنے بڑے ویٹنگ روم میں ایک آتشدان یا انگیٹھی بھی تو نہیں ہے۔ یہ خوشگوار گرمی انسانوں کے اپنے جسموں کی اجتماعی حرارت تھی، جو اس وقت فرد اور جماعت دونوں کو زندگی بخش رہی تھی۔ میں نے سوچا اگر اس ویٹنگ ہال میں اس وقت میں اکیلا ہوتا تو سردی کے مارے ٹھٹھر کر مر جاتا اور صبح سویرے یہاں سے میری لاش نکلتی۔ یہ ڈھائی تین سو آدمی یہ اکھڑ کسان، یہ چھوٹے موٹے بابو خوانچے والے، ریلوے کے نیچے درجہ کے ملازمین، فقیر، سادھو، بھک منگے، ان سب نے مل کر میری جان بچائی۔ مگر اس طرح میں نے بھی تو ان میں سے ہر ایک کو اپنے بدن کی حرارت بخشی ہے اور بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا کہ اس ویٹنگ ہال میں، اس میدان جنگ میں پڑے ہوئے مردوں میں، ان خراٹوں میں، اس زندگی بخش اجتماعی حرارت میں کون سا فلسفیانہ نکتہ چھپا ہوا ہے۔ اتنے میں گھڑیال نے پانچ بجائے اور ریل کا ایک انجن چنگھاڑتا ہوا گذر گیا اور اس سے بھی زیادہ خوفناک آواز میں ریلوے بابو چنگھاڑ رہا تھا— پلو دار، جگا تو ان مردودوں کو، چلنے پھرنے کو بھی جگہ نہیں چھوڑتے جیسے ان کے بابا کا گھر ہے'' میں اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل آیا— باہر سناٹا تھا۔ سردی تھی اور سڑکوں کی روشنیاں ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھیں۔

میں کتنے ہی دوستوں کے گھر گیا۔ سب سے پہلے رام دیال کے ہاں جو میرے ساتھ پڑھتا تھا اور جس کے باپ کی چاندنی چوک میں بہت بڑی کپڑے کی دوکان ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بڑے تپاک سے ملا۔

آؤ یار نرل پہلے ناشتہ ہو جائے پھر پروگرام بناتے ہیں۔ کوئی مارننگ شو ہو جائے، کیوں نرل 'دل دے کے دیکھو' کے بارے میں کیا رائے ہے؟ یار یہ آشا پاریکھ ہے نا ایک دم پٹاخہ نکلی۔ میں تو تین بار فلم دیکھ چکا ہوں، پر آج تمھارے ساتھ پھر دیکھیں گے کیوں؟'' میں نے کہا'' میں گھر چھوڑ آیا ہوں بابو جی سے لڑ کر: وہ کہتے ہیں میں جائیداد سے عاق کردوں گا۔ سو میں تو نوکری کی تلاش میں دہلی آیا ہوں۔

یکا یک اس کا سارا تپاک ہرن ہو گیا۔ بالکل ہی مختلف اور سرد لہجے میں بولا۔ اچھا بھئی کوشش کروں گا۔ تم ایسا کرو پرسوں مجھ سے ملنا آج تو مجھے ذرا کام ہے۔ بابو جی دوکان سے اٹھنے ہی نہیں دیتے۔ جب میں اس کے گھر سے باہر چاندنی چوک نکلا تو دیکھا کہ آسمان پر ابر چھایا ہوا ہے اور میونسپلٹی کے پارک میں پت جھڑ کے سارے پیڑ کھڑے سردی میں لرز رہے ہیں۔ وہاں سے میں سیدھا امجد کے ہاں گیا۔ اس کے والد جوتوں کی تجارت کرتے ہیں، ان کی حویلی بلی ماران میں ہے۔ دالان میں دسترخوان لگا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پراٹھے کباب، ترکاری، گاجر کا حلوا، سوکھا میوہ سجا ہوا ہے۔ چائے دان میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ امجد بھی میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ اس سے میری بے تکلفی بھی خوب ہے۔ سو پہلے تو میں نے خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا اور بعد میں امجد سے کہا: یار ایک پچیس روپے تو قرض دے، آٹھ دس دن میں لوٹا دوں گا۔'' اس نے کہا۔'' ہاں، ہاں .......... مگر ہوا کیا، ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟۔'' اور جب میں نے ساری صورت حال بیان کی تو اس کی آواز بھی ملائی کے برف کی طرح ملائم اور ٹھنڈی ہو گئی۔ بولا:'' پیسوں کی ذرا تنگی ہے نرل آج کل۔ روپے دو روپے چاہیئے تو دے دوں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا، صحن میں سے گذر رہا تھا تو میں نے دیکھا پیڑ سے سارے پتے گر چکے ہیں اور کیاری میں لگے ہوئے گلاب ٹھٹھر کر مرجھا گئے ہیں۔

پرانی دہلی سے نئی دہلی پیدل چلتا ہوا دوپہر کے قریب میں ہربچن کی کوٹھی پر پہنچا۔ ہربچن سنگھ کا باپ گورنمنٹ آف انڈیا میں ڈپٹی سکریٹری ہے، ہربچن سنگھ پڑھتا تو ہے دہلی کالج میں مگر ٹینس ٹورنامنٹ میں میری اس سے بڑی دوستی ہو گئی تھی کیونکہ MENS DOUBLES مینز ڈبلز ہم مل کر ہی جیتے تھے مگر وہ گھر پر نہیں تھا۔ معلوم ہوا جمخانہ فورڈ کلب ٹینس پریکٹس کرنے گیا ہے۔ سو

میں کلب پہنچا تو دیکھا ہربچن ٹینس کے بجائے کارڈ روم میں بیٹھا رمی کی پریکٹس کر رہا ہے۔" ہلو نرمل بوائے۔" وہ چلّایا " آؤ بیٹھو۔ بولو کیا پیو گے" میں نے کہا۔ " تم سے ذرا الگ کچھ بات کرنی ہے۔" وہ راؤنڈ ختم ہونے پر مجھے لے کر باہر آیا۔ کیوں کیا بات ہے۔ میں نے اس سے بھی سارا واقعہ بیان کیا۔ SORRY OLD BOY سوری اولڈ بوائے" وہ بولا۔ پر نوکری یہاں ایک دن میں تھوڑی ہی مل جائے گی۔ سفارشوں کے باوجود مہینوں لگتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں گھر واپس چلے جاؤ میرٹھ کا کرایہ چاہیے تو میں دیتا ہوں۔"

میں نے کہا" تھینک یو ہربچن۔"

"اچھا تو میں چلا میرا پارٹنر انتظار کر رہا ہے۔"

کلب کے باہر نکلا تو دیکھا نہ صرف ابر چھایا ہوا ہے بلکہ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی ہے۔ سامنے سے خالی ٹیکسی گزری تو اس نے مجھے دیکھ کر گاڑی ہلکی کر دی۔

"ٹیکسی بابو جی۔"

"ہاں چاہیے تو۔"

" کہاں جانا ہے۔"

"میرٹھ۔"

"اتنی دور آنے جانے کے پچاس روپے ہوں گے۔"

میں نے کہا:" وہ بھی دے دیتا مگر آج سنیچر اور ہے بینک سویرے بند ہو گئے ہوں گے۔" اور میں آگے بڑھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا" یار گرمی میں تو پاگل ہوتے سنا تھا، سردی کا پاگل آج ہی دیکھا۔"

وہاں سے چلتا ہوا میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج پہنچا، دفتروں کی خاک چھانی دو کانوں کے چکر لگائے مگر ایک بی۔اے پاس تندرست ذہن نوجوان کے لیے کام کہیں نہیں تھا۔ اور اس عرصہ میں دن ڈھلتا گیا۔ سردی بڑھتی گئی۔ ٹمپریچر گرتا گیا۔ روح کے چھلکے اترتے رہے۔ اب آدھی رات گزر چکی ہے کناٹ پلیس میں سناٹا ہے۔ شملہ سے آئی ہوئی برفیلی ہوا سائیں سائیں چل رہی ہے۔ کہتے ہیں کولڈ ویو COLD WAVE آنے والی ہے، شاید آ ہی گئی ہے۔ انفلوئنزہ اور نمونیا کا ڈر ہے۔

مجھے سینے میں ایک درد بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ میں اور میری روح دونوں اس بر فیلے سناٹے میں برہنہ کھڑے ٹھٹھر رہے ہیں۔ مگر روح کو نمونیہ نہیں ہوسکتا............

''بابو۔''

ایک کرخت مگر دھیمی سی آواز نے بلدیو کے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ برآمدے کے دوسرے ستون کی آڑ میں ایک بھکارن بیٹھی سردی کے مارے کانپ رہی ہے۔

''ماچس ہے بابو۔''

بلدیو نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا، سگریٹ تو کب کے ختم ہو چکے تھے مگر ماچس کی ڈبیہ میں اب بھی تین چار سلائیاں باقی تھیں۔ اس نے ڈبیہ اٹھا کر بھکارن کی طرف پھینک دی۔ بھکارن نے ماچس جلائی تو ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ روشنی کے دائرے میں چمک اٹھا۔ کالی بھجنگ نہ جانے کتنے مہینوں کی میل کی پپڑیاں جمی ہوئی، بالوں میں دھول اٹی ہوئی، توبہ توبہ کتنی بدہیئت ہے۔''

بلدیو نے سوچا'' یہاں سے کہیں دور چلنا چاہیے۔''

بیڑی کی ننھی سی آگ نے جیسے اس ٹھٹھری ہوئی بھکارن کے جیون میں ایک جوت جگادی۔ بلدیو نے دیکھا کہ اب وہ کانپ نہیں رہی ہے۔ اطمینان سے کش لے کر دھواں اگلتے ہوئے بولی۔'' باپ رے باپ کیا بھیانک سردی ہے۔ کیوں بیڑی پیو گے بابو؟'' بلدیو نے سوچا انکار کردوں۔ کون گندی بھگارن کے منہ لگے مگر وہ جلدی سے بولی۔ یہ تو ادلی کا بدلہ ہے بابو تمھاری ماچس، میری بیڑی یہ لو۔'' اور یہ کہہ کر اس نے بیڑی کا بنڈل اس کی طرف پھینک دیا اور پھر سرک کر پاس آگئی۔ ماچس جلا کر بولی بیڑی جلاؤ۔ جلتی ہوئی ماچس لے کر اس کے ہاتھ بلدیو کے چہرے کے پاس آئے تو وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ جیسے اسے حیرت ہو رہی ہو کہ یہ میلی مگر ریشمی قمیض والا بھکاریوں کی اس دنیا میں کیسے بھٹک آیا۔ اب بلدیو نے بھی بھکارن کے چہرہ کو قریب سے دیکھا۔ کالی رنگت اور میل کے نیچے اس کے گالوں میں اور اس کی چھوٹی چھوٹی مگر چمکیلی آنکھوں میں دبی ہوئی آگ تھی جو ماچس کی روشنی میں اور بھی بھڑک اٹھی تھی۔ سینے میں جوانی کا خمیر تھا اور اس کے بدن سے ایک عجیب بو کا بھپکا اٹھ رہا تھا۔ جس میں میل، پسینہ، افلاس،

شباب، آرزو، اور دعوت سبھی کا نچوڑ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ ماچس نے جل کر بھکارن کی انگلیوں کو جھلس دیا۔ وہ دونوں پھر اندھیرے میں کھو گئے اور بلدیو نے ایک گرم سانس کے لمس کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ مگر اگلے ہی لمحے میں دیا سلائی پھر جلی اور بلدیو نے بیڑی سلگائی۔

اپنے اپنے ستونوں سے لگے دونوں بیڑی پی رہے تھے۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں ان کی بیڑیوں کی ننھی چنگاریاں ایسے لگتی تھیں جیسے آسمان کے سب ستارے ڈوب گئے ہیں۔ صرف دو ستارے رہ گئے ہیں جو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں— ایک بار کش لینے کے لیے بلدیو نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو دیکھا کہ اس کی انگلیاں کانپ رہی ہیں۔ اپنا ماتھا چھوا تو جلتا ہوا محسوس ہوا۔ بیڑی کا گہرا کش لیا تو سینے میں درد کی ایک ٹیس دوڑ گئی۔ نمونیہ؟ اس خیال سے ہی اس کا بدن کانپ اٹھا۔

''بابو!''

''ہوں۔''

''تمھیں، بہت سردی لگ رہی ہے نا؟''

''نہیں تو.....''

مگر اسی لمحے نہ جانے کہاں سے برفیلی ہوا کا ایک جھونکا اس کو ڈھونڈھتا ہوا وہاں پہنچا اور اس کے گریبان سے ہو کر اس کے سینے میں ایک برفیلا خنجر بھونک گیا۔

''بابو تم تو سردی سے کانپ رہے ہو۔''

''نہیں، کوئی بات نہیں۔''

مگر یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور دانت کٹ کٹ بج رہے تھے۔''

''بابو یہ سردی بڑی جالم (ظالم) ہے نمونیہ ہو جائے گا۔''

''ہونے دو''

اب سردی کی رو اس کی رگوں میں سے ہوتی ہوئی اس کے سینے میں سانس کو گھونٹ رہی تھی اس کا شعور ایک عجیب مایوسی اور بے چارگی کے احساس میں ڈوبتا جا رہا تھا، اس کی آواز بھی مشکل

سے نکلی۔

''اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔''

''میرے پاس آ ؤ بابو۔''

مشکل سے آنکھیں کھول کر اس نے دھند لکے میں بھکارن کی طرف دیکھا جو پھٹی ہوئی ساڑی پر ایک بوسیدہ گدڑی لپیٹے ہوئے تھی۔

''تمھارے پاس بھی تو کمبل نہیں ہے۔''

''کمبل نہیں ہے، پر میں تو ہوں بابو''

بخار اور سینے کی گھٹن — اس وقت وہ کسی اشارے کو سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ مگر اس وقت ہوا کا ایک اور زہریلا برفیلا جھونکا آیا اور بلدیو کے شعور میں ایک عجیب شور سا برپا ہوگیا۔

کولڈ ویو —— کولڈ ویو —— کولڈ ویو

ہٹو بچو سردی کی لہر آ رہی ہے، انفلوئنزہ اور نمونیہ کا ڈر ہے، نمونیہ، موت۔

کولڈ ویو —— کولڈ ویو —— کولڈ ویو

اور اسی شور میں ایک دوسرا شور سینکڑوں انسانوں کے خراٹوں کا شور، مگر اس شور میں سردی نہیں، زہر نہیں ہے، دارو ہے، سینے کی گھٹن نہیں ہے زندگی بخش سانس کا لمس ہے۔

اور بلدیو کو ایسا محسوس ہوا کہ نرمی اور گرمی اور محبت اور شفقت کے ایک طلسمی لحاف کے اندر سماتا جا رہا ہے اور اب اس کی زندگی کو کسی کولڈ ویو کا خطرہ نہیں ہے۔

(شاعر، بمبئی 1960)

○

# دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت

**اینگلو انڈین لڑکے** نے (جو دروازے سے لگا ہوا اپنے بستر پر بیٹھا تھا) اخبار میں ایک تصویر دکھاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا، 'اک مین آئی اونا چھو۔ بو بے گرل جو ورلڈ بیوٹی کونٹسٹ میں سیکنڈ آئی ہے' اور اس کے ساتھی نے جو دیوار کا سہارا لیے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور ریل کی رفتار کے ساتھ ہلکے ہلکے جھکولے کھا رہا تھا۔ اخبار لے کر تصویر کو غور سے دیکھا اور پھر بیوٹی کوئین کے مُنہ پر دھوئیں کی پچکاری چھوڑتے ہوئے کہا، 'وہاٹ مین، ایسا ایسا چھوکری ہم نے بائیکلہ کے ریلوے انسٹی ٹیوٹ کی ڈانس نائٹ میں بہت دیکھا ہے'۔

اور پھر دونوں اپنی جاننے والی لڑکیوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اسٹیلا ڈی سوزا جس کا 'باڈی' مارلین مانرو جیسا ہے اور لوسی، جو راک اینڈ رول کی ماہر ہے اور جوزی جو ذرا موٹی ہے مگر بڑی 'سپورٹ' ہے اور ہر وقت ہنستی رہتی ہے......

اور میں، جو، ان سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑکی اور موٹے لالہ جی کے بیچ میں پھنسا بیٹھا تھا اور اس لیے اُن کی باتیں سننے پر مجبور تھا۔ سوچ رہا تھا کہ حُسن کے مقابلے میں جو لوگ جج مقرر ہوتے ہیں اُن کو تو اپنا فیصلہ سُنانے میں بڑی دقت ہوتی ہوگی۔ آخر حُسن کو کس معیار سے جانچا اور ناپا اور تولا جا سکتا ہے۔ کیا ہر وہ لڑکی حسین ہے جس کی کمر بیس انچ، سینہ چالیس انچ اور

کو لہے بیالیس انچ ہوں؟ یہ فیصلہ کون کرسکتا ہے کہ مصری حسینہ کی کالی آنکھیں زیادہ خوبصورت ہیں یا آئس لینڈی حسینہ کی نیلی آنکھیں۔ بیل جیسے دیدے زیادہ خوبصورت قرار دیئے جاتے ہیں یا مستی بھری نیم باز منگولین آنکھیں؟ سیاہ زلفوں اور سُنہری بالوں میں کسے ترجیح دی جاتی ہے؟ رنگت کون سی پسند کی جاتی ہے؟ پھیکے شلجم جیسی سفید یا پکے ہوئے گیہوں کی طرح گندمی۔ سانولی سلونی یا آبنوس کی طرح سیاہ۔ دراز قد یونانی مجسمے جیسی امریکن لڑکی زیادہ دلفریب ہے یا گڑیا کی طرح ننھی منی جاپانی لڑکی؟ ڈنیا کی سب سے خوبصورت عورت کون ہے، کہاں ہے، کیوں ہے؟

ریل کے سفر میں میرا دماغ ٹرین کی رفتار کے ساتھ ہی دوڑتا ہے اور تھرڈ کلاس کے ڈبے میں جب پیر پھیلانے کی جگہ نہ ہو تو ایسے ہی اٹل اور فلسفیانہ مسئلوں پر غور وفکر کر کے وقت کاٹتا ہوں۔ کچھ سوال تو اخبار کے صفحوں میں سے مجھے جھانکتے ہیں اور کچھ سوال میرے اندر سے خمیر کی طرح اُٹھتے ہیں۔ میں کون ہوں، کیا ہوں، اور کیوں ہوں؟ ہماری منزل کیا ہے۔ دنیا گیند کی طرح گول ہے یا چوکور اور سپاٹ؟۔ ڈنیا کدھر جارہی ہے؟ اپنا دیش کدھر جارہا ہے؟ چلتی ہوئی ریل کی کھڑکی میں سے دیکھو تو یہی لگتا ہے کہ ہم تو ساکن ہیں اور دیش پیچھے کی طرف بھاگا جارہا ہے۔ شاید ساری ڈنیا ہی اُلٹے پیروں چل رہی ہے، مگر دوسرے طریقے سے سوچا جائے تو آگے دیکھ کر یہ بھی محسوس ہوتا کہ بنجر اور شوریلی زمین سے پرے جو اُفق نظر آتا ہے وہ ہمارا مستقبل ہے، اُس کی طرف ہم ساٹھ میل (یا کم سے کم پچاس میل) کی رفتار سے بھاگے جارہے ہیں اور ہمارے دلوں کی دھڑکن ریل کے پہیّوں کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہے۔

ہاں تو ایسے ہی ابدی سوالوں پر میں غور وفکر کر رہا تھا کہ یکا یک ڈنیا کی سب سے خوبصورت عورت وہیں اس تھرڈ کلاس کے ڈبے میں دوسرے کنارے پر بیٹھی نظر آگئی۔ اس کو دیکھ کر ایک پل کے لیے تو میرے دل کی دھڑکن بند ہوگئی۔ میں نے سوچا آنکھیں مل کر دیکھوں کہ یہ گوشت پوست کا مجسمہ ہے یا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ مگر اس گھمسان کی بھیڑ میں بھلا یہ کہاں ممکن تھا۔ بایاں ہاتھ کھڑکی کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ پر لالہ جی بیٹھے ہیں۔ ان کے برابر میں اُن کی للائن تھیں جو ڈیڑھ فٹ لمبے گھونگھٹ میں بھی نظریں جھکائے بیٹھی تھیں۔ ان کے

برابر میں لالہ جی کا بڑا بچہ ہندی کا 'چندا ماما' پڑھ رہا تھا۔ پھر لالہ جی کا چھوٹا بچہ جو اپنے بڑے بھائی کے ہاتھ سے پرچہ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر لالہ جی کی منجھلی لڑکی جو اپنی بولنے والی گڑیا کو کبھی لٹاتی تھی کبھی اُٹھاتی تھی مگر ریل کی دھڑ دھڑاہٹ میں اُس کی آواز ہی نہیں سُنائی دیتی تھی۔ اس کے برابر میں دوسری طرف کی کھڑکی سے لگی ایک موٹی اور کالی کرسچین میم صاحب بیٹھی تھیں جو بار بار لالہ جی کی بچی کو ڈانٹ رہی تھیں۔ 'اے بابا تم ناٹی نا ئیں بنو۔ سیدھے کا ما فک بیٹھو۔' ہمارے سامنے کی سیٹ پر ایک پیوند لگی ہوئی شیروانی پہنے چگی داڑھی والے منشی جی تھے اور ان کی کالے بُرقعے میں لپٹی ہوئی اہلیہ تھیں اور ان کے سات عدد بچے، جن میں سے سب سے چھوٹے کو منشی جی کی بیوی بُرقعے کے اندر دودھ پلا رہی تھیں اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آٹھواں بچہ ان کے پیٹ میں موجود ہو۔

اور ان کے پیچھے کی سیٹ پر ایک طرف تو کھڑکی سے لگے ہوئے ایک جٹا دھاری سادھو مہاراج آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی ہوا میں اُن کے سر اور داڑھی کے لمبے لمبے بال اُڑ رہے تھے۔ ان کے برابر میں ایک بڑے باقاعدہ کپڑے پہنے ہوئے نوجوان تھا۔ بالکل تازہ استری کی ہوئی پتلون۔ کلپ لگا ہوا کالر۔ نقلی ریشم کی دھاری دار ٹائی، کوٹ کے کالر پر پلاسٹک کا ایک پھول لگا ہوا۔ تیل سے چمکتے ہوئے بالوں میں بڑی احتیاط سے مانگ نکالی ہوئی، یا تو نوکری کے لیے کہیں انٹرویو کو جا رہا تھا یا بَر دکھاوا۔ اس کے برابر میں تین ادھیڑ عمر کے آدمی اس بھیڑ بھاڑ میں بھی بڑے انہماک سے تاش کھیل رہے تھے اور ان کے بعد میں ایک کھلتی ہوئی رنگت اور لمبے قد کا نوجوان تھا، جو اب سیٹ کے نیچے سے ناشتہ دان نکال کر اُسے دے رہا تھا جو شاید اُس کی محبوبہ تھی یا بیوی تھی، اور وہی تھی دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت۔ اس کے بعد اس درجے میں کچھ نہیں تھا۔ صرف کھڑکی تھی اور کھڑکی میں سے بھاگتی ہوئی دُنیا کا طلسمی نظارہ تھا اور میں نے دیکھا کہ آموں کے پیڑوں کے نیچے مور ناچ رہے تھے اور بجلی کے تاروں پر طوطے بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کو پیار بھری ٹھونگیں مار رہے ہیں اور آسمان پر بھورے کالے بادل چھائے ہوئے ہیں اور کالے بادلوں کو چیر کر سورج کی کرنوں نے روشنی کا ایک جال بُن دیا ہے۔

وہ ناشتہ دان کے پیالے الگ الگ کر رہی تھی اور میں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ تھی بھی دیکھنے کی چیز ایسی خوبصورت عورت میں نے دُنیا میں نہیں دیکھی تھی۔ نہ بمبئی کی فلم ایکٹریسوں میں، نہ دلّی کے ہوٹلوں اور کلبوں میں آنے والی سوسائٹی لیڈیز میں۔ نہ بنگال کے اسٹیج پر نہ راجستھان کے رجواڑوں کے رنگ محل میں۔ لیکن میں یہ نہ طے کر سکا کہ اس حسین ہستی کے وہ کون سے اجزاء ہیں جو اُسے دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت قرار دیتے ہیں۔ اس کی رنگت گوری نہیں، گیہواں نہ تھی، لیکن اس کے گالوں پر ایک دلکش سُرخی تھی جو روژ یا پاؤڈر سے نہیں پیدا ہو سکتی بلکہ یہ سُرخی نہیں ایک عجیب آنچ تھی جیسے انگیٹھی میں جلتے ہوئے انگاروں کا عکس رُخساروں پر پڑ رہا ہو۔ ہر بار جب وہ گھنی بھاری پلکیں اُٹھا کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھتی تھی اُس کی بادام جیسی گہری کالی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے ایک عجیب ادھ کھلے ہونٹ جو لپ اسٹک سے بے نیاز تھے، زندگی کی سب سے راحت بخش اور سب سے تکلیف دہ لذت سے آشنا ہیں۔ اس کے لمبے گھنے سیاہ چکنے بال چوٹی میں گندھے ہوئے تھے۔ اس کی کلائیوں اور بازوؤں پر کوئی زیور نہیں تھا، صرف جوانی کا گداز تھا۔ ساڑی میں اُس کے مہندی لگے پاؤں جو جھانک رہے تھے وہ نازک اور چھوٹے چھوٹے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ نازک پاؤں اور اس سے زیادہ سڈول ٹخنے میں نے دیکھے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت آنکھیں میں نے دیکھی ہیں۔ پھر بھی مجموعی طور پر اس گمنام لڑکی سے زیادہ خوبصورت چہرہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ آخر اس کے بے پناہ حُسن کا راز کیا تھا؟

اور اب وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ پُوریاں اور بھاجی اور آچار، وہ بڑے پیار سے نکالتی جا رہی تھی اور وہ بڑے پیار سے کھاتا جا رہا تھا، اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صبح سویرے اس نے یہ پُوریاں بڑے پیار سے تلی ہوں گی اور بڑے پیار سے یہ بھاجی پکائی ہو گی اور پھر مٹی کی اچاری میں سے اچار نکال کر ناشتہ دان میں رکھا ہو گا۔ اس لیے کہ آج وہ دونوں اکٹھے سفر کے لیے روانہ ہو رہے تھے اور شاید یہ ان دونوں کا پہلا اکٹھا سفر ہو گا۔ جس پیار بھری نظروں سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔

یہ شادی ضرور انھوں نے اپنی پسند سے کی ہو گی۔ ماں باپ کی کرائی ہوئی شادیوں میں ایسا

پیار کب ہوتا ہے؟ تو پھر یہ دونوں ہنی مون پر جا رہے ہوں گے۔ لڑکے نے نہ جانے کتنے مہینوں کی کفایت شعاری سے روپیہ بچایا ہوگا اور اب وہ اپنی محبوبہ کو، اپنی بیوی کو بمبئی کی سیر کرانے لے جا رہا ہے۔ وہاں کسی چھوٹے ہوٹل میں ٹھہریں گے اور پہلی بار بجلی کی ریل میں بیٹھ کر جو ہو جائیں گے اور وہاں وہ ساڑی کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر ٹخنوں ٹخنوں سمندر کے پانی میں کھڑی ہو کر سورج کو ڈوبتے دیکھے گی اور لہریں سرسراتی ہوئی اس کے پیروں کو گدگدائیں گی اور وہ اپنے تن بدن میں ایک عجیب جھرجھری محسوس کرے گی جیسے پیار کے پہلے بوسے کے لمس میں ہوتی ہے، اور اتنے میں وہ ایک ناریل ہاتھ میں لیے ہنستا ہوا آئے گا اور وہ دونوں ایک ہی ناریل کو باری باری منہ لگا کر پئیں گے اور اس ناریل کے پانی کی مٹھاس میں انھیں، ایک دوسرے کے ہونٹوں کے مٹھاس کا مزا آئے گا اور پھر وہ ناریل کو گیند کی طرح دور سمندر میں پھینک دے گا مگر لہریں ناریل کو پھر ان کے قدموں میں لا کر ڈال دیں گی اور پھر وہ اپنی پوری طاقت لگا کر ناریل کو پھینکے گی اور اس بار ناریل قریب ہی سمندر میں گرے گا اور پھر دونوں بے اختیار اور بے وجہ ہنس پڑیں گے اور ہنستے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ساحل پر گھومنے والے سب مڑ کر ان دونوں کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگیں گے اور کوئی کہے گا۔ 'دیکھو دیکھو۔ دنیا کی سب سے خوبصورت عورت' اور کوئی کہے گا۔ 'مگر اس کے ساتھ جو ہے اس کو بھی تو دیکھو دنیا کا سب سے خوش قسمت مرد۔'

مگر ابھی تک وہ جوہو کے ساحل پر نہیں پہنچے تھے۔ ریل کے ایک تھرڈ کلاس کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور اب میں نے دیکھا کہ دنیا کا سب سے خوش قسمت مرد نوالہ بنا کر اپنی بیوی کو کھلا رہا ہے اور وہ اس طرح شرما کر پیار بھری نظروں سے اپنے پتی کی طرف دیکھ رہی ہے کہ اُس کا چہرہ ایک عجیب اور دلفریب سُرخی سے تمتما اُٹھا ہے اور اس کی آنکھوں میں پیاری دھیمی دھیمی آگ چمک اٹھی ہے، اور اب میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ دنیا کی سب سے خوبصورت عورت کیوں ہے۔ اُس کے حُسن کا راز ہے محبت۔ اسی محبت ہی کا خمار اُس کی آنکھوں میں ہے۔ اسی محبت کی آنچ اُس کے گالوں پر ہے۔ اسی محبت کے خمیر نے اس کی جوانی میں وہ گداز پیدا کیا ہے جو اس کے انگ انگ میں اُبھر رہا ہے۔

میرے قریب کھڑا ہوا اینگلو انڈین لڑکا کہہ رہا ہے 'لُک مین۔ یہ فوٹو دیکھو، مِس یو۔ایس۔اے جو بیوٹی کمپیٹیشن میں فرسٹ آئی ہے۔موسٹ بیوٹی فل گرل ان دَہول بلڈی ورلڈ۔مَین ،آئی ووڈ گیو مائی رائٹ ہینڈ جسٹ ٹو ہَیو۔ون لُک ایٹ ہر۔'

MOST BEAUTIFUL GIRL IN THE WHOLE BLODY WORLD.
MAN I WOULD GIVE MY RIGHT HAND JUST TO HAVE ONE
LOOK AT HER

اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں چلّا کر ان سے کہوں 'یوفولز YOU FOOLS دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت تو خود یہیں اسی کھچا کھچ بھرے ریل کے درجے میں تم سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھی ہے اور تم ساری دُنیا میں اس کی تلاش کر رہے ہو۔ مگر اسی وقت ریل کی رفتار کم ہونی شروع ہوگئی۔ پٹریاں بدلنے کی دھڑ دھڑاہٹ ہوئی اور گاڑی جھانسی کے اسٹیشن پر رُک گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ جو دُنیا کا سب سے خوش قسمت نوجوان ہے پلیٹ فارم پر اُتر رہا ہے اور اسی سے بات کرنے کے لیے میں بھی اُتر پڑا۔

وہ کھڑا اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا شاید پانی والے کی تلاش میں۔ میں نے اُس کے قریب جا کر کہا' کہیے ہنی مون پر جا رہے ہیں آپ؟'

پلیٹ فارم پر اتنی بھیڑ تھی اور خوانچے والوں، گڑیاں بیچنے والوں اور حمالوں کی اتنی چیخ پکار تھی کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔ اُس نے میری طرف مُڑ کر پوچھا:'جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا'۔

اب میں نے چلّا کر کہا:' کہیے ہنی مون پر جا رہے ہیں آپ لوگ؟'

جی؟ اس نے حیرت سے جواب دیا۔

'آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟ ہماری شادی کو تو چھ برس ہونے کو آئے ہیں'۔ اور پھر وہ میری حیرت کو دیکھ کر مُسکرا پڑا۔

'ہم تو چار برس کی بچّی کو اُس کی دادی کے پاس چھوڑ کر آئے ہیں'۔ اور پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا' شما کیجیے گا میں ذرا دہی بڑے والے کو دیکھ لوں۔ اس کو پکوڑے بہت پسند ہیں'۔

یہ کہہ کر وہ بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ گارڈ نے سیٹی دی، جھنڈی ہلائی، مسافر اپنے اپنے درجوں کی

طرف دوڑے، میں بھی اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ سامنے والی سیٹ کی طرف دیکھا تو دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت کو پریشان نظروں سے پلیٹ فارم کی طرف دیکھتے پایا مگر اس پریشانی میں بھی ایک حُسن تھا، یہ محبت کی پریشانی تھی نا، گاڑی حرکت کرنے لگی اور وہ بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے ابھی اُتر پڑے گی لیکن پھر وہ رُک گئی اور چہرے کی حسین پریشانی ایک حسین مُسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی اور تب میں نے دیکھا کہ چلتی گاڑی میں وہ چڑھ آیا ہے، اُس کے ہاتھوں میں دہی بڑوں کا دونا ہے اور اُس کی آنکھوں میں محبت بھی ہے اور فتح مندی کا احساس بھی ہے۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ ’دیکھو تمھارے لیے دہی بڑے لے آیا نا۔ دُنیا کی کون سی چیز ہے جو میں تمھارے لیے نہیں لا سکتا۔ ایک بار تم کہو تو‘‘۔

ہر سال جب کہیں حُسن کا مقابلہ ہوتا ہے تو اخباروں میں لمبے لمبے مضمون چھپتے ہیں۔ مس امریکہ کہتی ہے کہ میں اپنے حُسن کو سنتروں کا رس پی کر برقرار رکھتی ہوں۔ مس برطانیہ کہتی ہے کہ میں روز سویرے اُٹھ کر پورج (یعنی دلیہ) کھاتی ہوں۔ مس فرانس انگور اور انگوری شراب کو پسند کرتی ہے۔ مس جرمنی اپنے جسم کو دُبلا اور سڈول رکھنے کے لیے بن چھنے آٹے کی ڈبل روٹی اور بن ملائی کا دودھ پیتی ہے۔ لیکن اگر مجھ سے پُوچھا جائے کہ دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت کیا کھاتی ہے تو میں ’’یہی کہوں گا کہ وہ سب سے زیادہ دہی بڑوں کو پسند کرتی ہے۔ خصوصاً اگر اُس کا شوہر پلیٹ فارم پر بھاگ دوڑ کر کے چلتی ریل میں دہی بڑوں کا دونا لے کر آیا ہوا اور اُسے خود اپنے ہاتھ سے دہی بڑے کھلانے پر اصرار کر رہا ہو۔

غرض ریل چلتی رہی اور اسٹیشن گزرتے رہے۔ شام سے رات ہوگئی اور رات کا کھانا کھا کر وہ اپنے شوہر کے کندھے پر سر رکھ کر سو گئی۔ کتنا بھروسہ تھا اس نیند میں، کتنا پیار تھا اس کندھے میں۔ کتنا حسن تھا اس سوتے ہوئے چہرے میں جو نیند میں بھی شاید کوئی یہ حسین خواب دیکھ کر مُسکرا رہا تھا۔ دیر تک تو میں ان دونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ شادی کے چھ برس بعد بھی کتنی شگفتہ محبت ہے ان دونوں کی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ بمبئی پہنچ کر میں ان دونوں سے ضرور ملوں گا۔ ان سے میل ملاقات بڑھا کر معلوم کروں گا کہ ان کی اس حسین محبت کا راز آخر کیا ہے۔ یہی سوچتا ہوا میں بھی کھڑکی کی سلاخوں پر سر رکھ کر سو گیا۔ حالانکہ میرے دائیں کان کو لالہ جی کے

خر اٹے گدگدا رہے تھے، اور بائیں کان میں ریل کے پہیوں کی دھڑ دھڑاہٹ گونج رہی تھی اور پیٹھ کے پیچھے اینگلو انڈین نوجوان کوئی انگریزی دُھن گنگنا رہا تھا۔

ڈارلنگ ڈارلنگ کلیمنٹائن
آئی ایم ڈریمنگ آف یو
(پیاری پیاری کلیمنٹائن
میں تیرے ہی خواب دیکھ رہا ہوں)

مگر میں نے خواب میں دیکھا کہ دُنیا بھر کی اور ہر زمانے کی حسین عورتیں مقابلۂ حُسن کے لیے جمع ہیں۔ مصر کی کیلوپٹرا ہے، ایران کی شیریں ہے، عرب کی لیلیٰ ہے، ہندوستان کی پدمنی ہے، فرانس کی جوز فائن ہے، انگلستان کی لیڈی گوڈیوا ہے جو اپنے حسین جسم کی برہنگی کو صرف اپنے لمبے کھلے بالوں سے چھپائے گھوڑے پر سوار ہے۔ اٹلی سے دانتے کی محبوبہ بیٹرس ہے۔ کالی گوری، گندمی رنگت کی، بھورے بالوں والیاں، کالے بالوں والیاں، شہزادیاں۔ طوائفیں، شاعروں اور مصوّروں کی اصلی اور تخیلی محبوبائیں اور سب کے چاہنے والے ان عشاق اور مدّاح چلّا رہے ہیں۔

'کیلوپٹرا کو ووٹ دیجیے'
'آپ کے ووٹ کی حقدار شیریں اور صرف شیریں ہے'
'پدمنی جیسا حُسن نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا'۔

'آئیے آئیے۔ لیڈی گوڈیوا کے برہنہ حُسن کا مشاہدہ کیجیے' اور یہ سب آوازیں سُن کر میں بھی چلّا پڑا۔ 'یہ سب بکواس ہے۔ آئیے میرے ساتھ آئیے۔ دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت میں دکھاتا ہوں۔ وہ اس وقت ایک تھرڈ کلاس کے کھچا کھچ بھرے ڈبّے میں اپنے شوہر کے کندھے پر سر رکھے سو رہی ہے......'

پھر میری آنکھ کھُل گئی اور میں نے دیکھا کہ دن نکل آیا ہے اور گاڑی اگت پوری کے اسٹیشن پر کھڑی ہے اور دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت اور دُنیا کا سب سے خوش قسمت نوجوان دونوں وہاں نہیں ہیں۔

'ارے کہاں گئے وہ دونوں؟' میں نے سامنے کی خالی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لالہ اور منشی جی سے پوچھا۔

'اے حضت (حضرت) میری آنکھ بھی ابھی کھلی ہے' منشی جی نے کھنکار کر رات کا کھایا ہوا پان تھوکتے ہوئے کہا۔ 'کیوں جی تم نے تو نہیں دیکھا؟' اور برقعے میں لپٹی ہوئی اُن کی بیوی نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

'کون جانے کون سے اسٹیشن پر اُتر گئے ہیں' لالہ جی نے ایک ڈکار لیتے ہوئے کہا۔ اور اپنی للائن کو جو گھونگھٹ نکالے اُونگھ رہی تھی ٹہوکا دے کر بولے۔ 'ارے اب اُٹھو بھی بمبئی آنے والا ہے'۔ اور پھر منشی جی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ 'آپ کو اُن لوگوں سے کچھ کام تھا کیا؟ دیکھ لیجیے اسی اسٹیشن پر نہ اُترے ہوں کہیں'

میں لپک کر اُٹھا اور گاڑی سے نیچے اُتر آیا اور میں نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر سامنے ہی وہ بیٹھی ہے۔ دنیا کی سب سے خوبصورت عورت۔

نہیں یہ وہ نہیں ہے۔ اُس کی رنگت تو پکے گیہوں کی طرح سُنہری تھی اور یہ تو ایسی کالی ہے جیسے کالا توا۔

مگر ہے یہ بھی دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت۔ اس کی مُسکراہٹ میں بھی وہی دلکش انداز ہے۔ اس کے ادھ کھلے ہونٹ بھی اسی طرح بھرپُور محبت سے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی چمک ہے۔ اس کی گود میں ایک بچہ ہے جسے وہ اپنی چکنی خوبصورت چھاتی سے دودھ پلا رہی ہے اور اس کی نظریں مُسکرا مُسکرا کر ایک لمبے لمبے بالوں والے کالے رنگ کے نوجوان کو دیکھ رہی ہیں جو اُس کے پاس بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ ان کے چاروں طرف ایسے اور کتنے ہی ریل کی سڑک بنانے والے مزدور، ان کی بیویاں اور بچے بیٹھے ہیں اور ان کا گھریلو سامان بکھرا پڑا ہے۔ ٹین کے کنستر اور اور بوریاں اور گھڑے اور ان کے کام کرنے کے اوزار بھی پڑے ہیں۔ کدالیں، پھاوڑے اور پتھر ڈھونے کی ٹوکریاں، اور ان سب کے بیچ میں وہ بیٹھے ہیں۔ دنیا کی سب سے خوبصورت عورت اور دنیا کا سب سے خوش قسمت نوجوان۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے ہیں، مسکرا رہے ہیں۔ ان کے دانت صبح کی

سُنہری دھوپ میں چمک رہے ہیں اوران کی آنکھیں ناچ رہی ہیں اوران کے گرد محبت کی کرنوں کا ایک ہالہ ہے جوصرف میری نگاہیں دیکھ سکتی ہیں اوران کے سورج میں تپے ہوئے محنت سے گھٹے ہوئے، پیار سے تمتماتے ہوئے، سڈول جوان جسموں میں وہ حُسن کو دیکھ رہا ہے جو کسی ڈرائنگ روم میں کسی فلم اسٹوڈیو میں کسی ہوٹل میں اور ریستوران میں نظر نہیں آتا۔

'کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟' میں نے پوچھا۔ ایک اجنبی سی آواز سن کر وہ شرما گئی مگر نوجوان بیڑی پھینکتے ہوئے بولا۔ آندھرا سے۔'

'کتنے دن ہوئے تمھارے بیاہ کو؟'

'اِدھر جنگل میں سڑک بناتا ہے بابو۔ دن بھر پتھر کوٹتا ہے لگن کرنے کی پھرست (فرصت) کدھر ہے۔ پھر گھر جائے گا تب پنڈت کو بلا کر سادی (شادی) بنائے گا کیوں؟' اور یہ کہہ کر بلا کسی جھجک کے اس نے اس کی طرف دیکھا جو اس کی بیوی تھی اور نہیں بھی تھی۔

انجن نے سیٹی دی اور میں اپنے ڈبّے کی طرف بھاگا۔ چلتی گاڑی میں سے میں نے دیکھا کہ وہ کالا لنگڑا جوان اپنے بچّے کو ہوا میں اُچھال رہا ہے اور بچہ ہنس رہا ہے اور بچّے کی ماں ان دونوں کو پیار اور فخر بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہی۔

پھر گاڑی کی پٹری مڑ گئی اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور اب باوجود بھیڑ کے ہمارا درجہ سنسان تھا۔ صرف لالہ جی تھے اور ان کی للائن تھیں اور منشی جی اور ان کی بُرقعہ میں لپٹی ہوئی بیوی اور انکے بچے ـــ اور ـــ

اور ایک اینگلو انڈین نوجوان بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ 'آج شام اسٹیلا کو پکچر لے جاؤں گا۔ اسٹیلا کو جانتے ہونا؟ اوبوائے موسٹ بیوٹی فل گرل ان دی ورلڈ۔'

(ساقی، کراچی (افسانہ نمبر) 1961)

○

طرح پر پھیلائے ہوئے۔ کوئی اتنی لمبی چوڑی جیسے پورا مکان چار پہیوں پر چلا جا رہا ہو۔ کوئی اتنی مختصر اور پتلی جیسے مچھلی ٹریفک کی لہروں میں ڈولتی ہوئی چلی جارہی ہو۔

اور میں (جو ایک کمپنی میں کام کرتا ہوں جہاں موٹروں کی خرید و فروخت کا دھندا ہوتا ہے) ان کو دیکھ کر دل ہی دل میں حساب لگاتا رہتا ہوں۔ یہ فیئٹ ہے بارہ ہزار کی آتی ہے۔ یہ ہندوستان ایمبیسڈر ہے چودہ ہزار کی، یہ جرمنی کی بنی ہوئی مرسی ڈیز ہے جو صرف کسی غیر ملکی سفارت خانے سے سیکنڈ ہینڈ خریدی جاسکتی ہے۔ قیمت کوئی تیس چالیس ہزار۔ یہ اسی ہزار کی بڑی شیورلیٹ امپالا ہے جو صرف چھوٹے فلم اسٹار اور بڑے سرمایہ دار ہی خرید سکتے ہیں۔

اور اسی طرح میں وہاں سے گزرنے والی لڑکیوں کے بارے میں بھی دل ہی دل میں حساب لگاتا رہتا ہوں۔ یہ جینز پہنے ہوئے کٹے بالوں والی لڑکی جو اپنے کتے کو ٹہلا رہی ہے۔ کسی امریکن تیل کمپنی کے افسر سے بیاہی جائے گی۔ جس کی تنخواہ کم سے کم تین ہزار روپے ماہوار ہوگی۔ یہ کتابیں بغل میں دبائے، آنکھوں پر چشمہ لگائے، سترہ روپے والی وائیل کی ساڑی اور چپل پہنے ہوئے جو پیلی سی دبلی سی لڑکی آرہی ہے۔ یہ کسی شاعر یا ادیب سے عشق کر کے اس سے شادی کرے گی اور پھر عمر بھر پچھتائے گی۔ یہ پتلی کمری کی شلوار اور فراک کی طرح چست قمیض پہنے، لپ اسٹک کا چلتا پھرتا اشتہار بنی جو آرہی ہے یہ یا تو فلم سٹار بنے گی یا کسی بہت بڑے بزنس مین کے سب سے چھوٹے اور نکھٹو بیٹے سے شادی کرے گی۔

اس دن میں اسی طرح میرین ڈرائیو پر گزرنے والی موٹروں اور لڑکیوں کا مول تول کر رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز آئی جس نے میرے موڈ کا بالکل ستیاناس کر دیا۔

''بابو جی۔ ڈیڑھ روپیہ دلوا دو بابو جی۔ بھگوان تمھارا بھلا کرے گا۔''

میں نے سوال کرنے والی کی طرف اپنی پرکھنے والی نظروں سے دیکھا۔ بیس بائیس سال کی سانولی سی چھوکری جس کا بدن میلی اور پھٹی چولی میں سے اپنی جوانی کا اعلان کر رہا تھا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر لپ اسٹک کے بجائے پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے ننگے پیروں پر دھول اٹی ہوئی تھی۔

'بھکارن!' میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ 'آوارہ بھکارن!'

مجھے دنیا میں کسی سے نفرت ہے تو بھکاریوں سے۔ یہ لوگ ہمارے دیش کے ماتھے کا کلنک ہیں۔ نکمے کام چور کہیں کے۔ شریف آدمیوں کی رحم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پیسہ پیسہ مانگ کے ہزاروں روپے جمع کرتے ہیں۔ جان بوجھ کے اپنے ہاتھ پاؤں توڑتے ہیں تاکہ بھیک مانگنے کا بہانہ مل جائے۔ سڑک کے کنارے بیٹھ کر اپنے کوڑھ اور زخموں کی نمائش کرتے ہیں۔ غیر ملکوں سے آنے والے ٹورسٹوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر ہمارے ملک کو بدنام کرتے ہیں۔ مجھے ان بھکاریوں سے نہ صرف گھن آتی ہے بلکہ مجھے ان سے سخت نفرت ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں ان سب کو گولی سے اڑا دوں۔

بھکاریوں سے زیادہ مجھے کسی سے نفرت ہے تو وہ بھکارنیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ کام چور نکمی اور بے شرم ہی نہیں بدکار اور بے حیا ہوتی ہیں۔ کس بے حیائی سے شریف آدمیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پیسہ مانگتی ہیں۔ کوئی کرائے کے بچے کو گود میں اٹھائے دودھ کے لیے پیسے مانگتی پھر رہی ہے، کوئی بے سہارا شرنارتھی ہونے کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔ کوئی بھیک مانگنے کے بہانے بیچ بازار میں اپنے جسم کا سودا کرتی گھوم رہی ہے۔

اس لیے میری زندگی کا اصول ہے کہ میں بھکاری ہو یا بھکارن کسی کو بھیک نہیں دیتا۔ پیریشین ڈیری کے ویٹر کو چونی بے شک ٹپ دے دوں، پالش والے چھوکرے کو دو نئے پیسے بخشش کر دوں یا پان والے کو پندرہ نئے پیسے کے پان کے لیے چونی دے دوں مگر کسی بھکاری کو ایک پیسہ دینا بھی پاپ سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے مگر میں ہر وقت اور ہر جگہ ہاتھ دھونا پسند نہیں کرتا۔

جب اس بھکارن نے نہ اکنی نہ چونی پورے ڈیڑھ روپے کا سوال کیا تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے دل میں سوچا اب ان بھکاریوں نے بھی اپنی قیمت بڑھا دی ہے۔

سو میں نے سختی سے جواب دیا: ''ڈیڑھ روپیہ چاہیئے! ۔ ڈیڑھ روپیہ ہی کیوں، دو روپے کیوں نہیں؟''

اس نے جواب دیا مگر دوسری بھکارنوں کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں بلکہ نظریں جھکا کر۔ ''بابا کے لیے دوا لے جانی ہے بابو۔''

میں نے سوچا یہ بھکارن تو سدھی سدھائی ایکٹریس ہے۔ واہ واہ کیا ایکٹنگ کی ہے اور ڈائیلاگ بھی اچھا یاد کیا ہے۔ بابا کے لیے دوا لے جانی ہے! بھلا اب کون شریف اور رحم دل آدمی انکار کرسکتا ہے۔ دو چار گھنٹے میں نہ جانے کتنے ہی ڈیڑھ ڈیڑھ روپے جمع ہو جائیں گے۔ دیکھنے میں بھی تو بری نہیں ہے۔ کتنے ہی شوقین مزاج تو اس سے ڈیڑھ منٹ بات کرنے کا ہی ڈیڑھ روپیہ دے دیں گے اور کون جانتا ہے رات ہوتے ہوتے کوئی من چلا اسے ٹیکسی میں بٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے جائے اور صبح ہوتے ہوتے ڈیڑھ روپے کے بجائے پندرہ بیس کا انتظام ہو جائے۔ مگر اس بھکارن کو یہ نہیں معلوم کہ میں ان بیوقوفوں میں سے نہیں ہوں جو طوائفوں یا بھکارنوں سے بیماریاں خریدتے پھرتے ہیں۔ پینتیس برس کی عمر میں بھی غیر شادی شدہ ہوں مگر میں تو ان آوارہ گندی اور زہریلی ناگنوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ دن بھر دفتر میں کام کرتا ہوں۔ رات گئے تک میرین ڈرائیو پر سیر کرتا ہوں۔ گھر جا کر کھانا کھاتا ہوں۔ پھر پلنگ پر لیٹ کر لائبریری سے لایا ہوا کوئی چٹ پٹا ناول پڑھتا ہوں یا کباڑی کے ہاں سے چونّی میں خریدا ہوا کوئی رسالہ اٹھاتا ہوں اور اس کی تصویریں دیکھتا دیکھتا سو جاتا ہوں۔ بھلا ہو ان چکنے کاغذ والے بدیشی رسالوں کا کیسی کیسی خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں چھاپتے ہیں اور وہ بھی تقریباً ننگی۔ رنگین تصویروں میں ان کے گورے گورے گلابی گلابی جسم بالکل ایسے لگتے ہیں جیسے پھل والے کی دوکان پر سیبوں، سنتروں، ناشپاتیوں اور اناروں کے ڈھیر لگے ہوں تازہ رس بھرے، جن کو دیکھ کر ہی منہ میں پانی بھر آئے اور بن کھائے بھوکا پیٹ بھر جائے۔

سو میں نے اسے دھتکار دیا۔ "جا جا اپنا راستہ لے۔ یہ ڈھونگ کسی اور کو دکھانا، میں دس برس سے بمبئی میں رہتا ہوں۔ ایسے ایسے ڈرامے بہت دیکھے ہیں۔"

اس نے ایک پل کے لیے اپنی بڑی بڑی آنکھوں پر سے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا، اس کے موٹے موٹے پپڑیوں جمے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے اور پھر کہے بغیر بند ہو گئے۔ پھر وہ وہاں سے قریب ہی روشنی کے کھمبے کے سہارے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے کیوں میں وہیں بیٹھا رہا اور کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد مجھے اس لڑکی کے ڈھونگی ہونے کا آخری ثبوت بھی مل جائے گا۔

ابھی وہ وہاں جا کر کھڑی ہوئی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی وہاں آیا، میں اتنی دور سے سڑک کی روشنی میں اس آدمی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے تیل سے چپڑے ہوئے بال اس کے گلے میں بندھا ہوا رومال۔ اس کے کان پر رکھی ہوئی بیڑی اور اس کے چلنے کا انداز ہر چیز چلاّ چلاّ کر اس کے پیشے کا اعلان کر رہی تھی۔

وہ اسے چپکے چپکے کچھ سمجھا رہا تھا جو میں سن نہیں سکتا تھا مگر وہ کیا کہہ رہا تھا اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ وہ جواب میں صرف سر ہلا کر نہیں کہہ رہی تھی۔ دلال نے بات کرتے کرتے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا لیکن وہ فوراً ہٹ کر دور کھڑی ہوگئی جہاں دلال کا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکے اور اب وہ چلاّ کر بول پڑا۔ ''بڑے نخرے کرتی ہے۔ بچ کے جائے گی کہاں۔'' اور اس نے دو تین موٹی موٹی گالیاں دیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل میں نہ اپنی بہن کی عزت ہے نہ اپنی ماں کی محبت۔

اور اب وہ بھکارن بوکھلائی ہوئی سی ادھر اُدھر پھر رہی تھی۔ کبھی اس کے آگے ہاتھ پھیلاتی کبھی اس کے سامنے۔

ایک موٹے بوڑھے آدمی نے جو ابھی ابھی ایک موٹی تازی موٹر میں سے اپنی توند سنبھالتا ہوا اترا تھا اسے شاید پانچ نئے پیسے کا سکہ دیا اور وہ گڑگڑاتی ہی رہی۔ ڈیڑھ روپیہ چاہیے سیٹھ جی۔ بس ڈیڑھ روپیہ۔ عمر بھر آپ کی جان مال کو دعا دوں گی۔ بھگوان آپ کو لاکھوں کروڑوں دے سیٹھ جی۔''

مگر سیٹھ جی اپنی توند سنبھالتے ہوئے سمندر کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ جہاں دور کالے اندھیرے ٹھہرے ہوئے پانی میں چوپاٹی کی روشنیاں ڈوبی ہوئی تھیں۔

پھر اس نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے سامنے ہاتھ پھیلایا جو ریشمی ساڑی پہنے گلے میں موتیوں کا ہار ڈالے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ ایک لڑکی سلیکس پہنے ہوئے تھی اور دوسری گھٹنوں تک اونچا فراک۔ ان کے اونچی ایڑی کے سینڈل فٹ پاتھ کے پتھروں پر کھٹاک کھٹاک بول رہے تھے۔ بھکارن دور تک ان کے پیچھے ڈیڑھ روپے کا رونا روتی چلتی رہی لیکن اُن تینوں نے ایک بار بھی نہ اس کی طرف مڑ کر دیکھا نہ اس کی بات کا کوئی جواب دیا اور میں نے

سوچا ان بھکاریوں کا یہی علاج ہے کہ ان کا نوٹس ہی نہیں لیا جائے جیسے ان کی ہستی ہی نہیں ہے۔

اور اب وہ ایک نوجوان جوڑے کے سامنے اپنا رونا رو رہی تھی۔ یہ دونوں ابھی ابھی پیریشین ڈیری سے نکلے تھے۔ نکڑ کی دوکان سے لڑکے نے ایک بڑھیا سگریٹ کا ڈبہ خریدا تھا اور اب سمندر کے کنارے میرے قریب ہی کھڑا ہوا اسی میں سے پہلا سگریٹ سلگا رہا تھا اور لڑکی اپنے بیگ میں سے چھوٹا سا گول آئینہ نکال کر سڑک کی روشنی میں اپنا میک اپ درست کر رہی تھی اور ان دونوں میں سے یوڈی کولون، فرانسیسی سینٹ، بڑھیا کافی، مہوے کے پان، خوشحالی اور محبت کی ملی جلی خوشبو کا بھپکا اٹھ رہا تھا کہ اس بھکارن کے پسینے، میل اور غریبی کی بدبو نے اُن کو گھیر لیا۔ لڑکی نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بھکارن کی طرف ڈالی، صرف ''انہہ'' کہا اپنے ساتھی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر چل کھڑی ہوئی اور بھکارن کھڑی رہ گئی۔

میں نے دل ہی دل میں اُسے کوسا کتنے خوبصورت رومانٹک موڈ میں تھے وہ دونوں پر یکی لیکن اس کمبخت نے اپنا منحوس چہرہ دکھا کر ان کا سب مزا کرکرا کر دیا۔ نکمی، کام چور، آوارہ، چھنال کہیں کی۔ اور اب وہ چھنال آخر کار اس دلال کے ساتھ جا رہی تھی اور میں ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ کیوں؟

اس لیے کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایسے بھکاریوں اور بھکارنوں کے ڈھول کا پول کھول کر سماج کو اُن کے ہتھکنڈوں سے بچاؤں گا، اخباروں میں مضمون نہیں تو کم سے کم ایڈیٹروں کے نام خط لکھوں گا اور ساری دنیا کو بتاؤں گا کہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اپنے باپ کی دوا کے لیے ڈیڑھ روپیہ مانگنے والی بھولی بھالی بھکارن اصل میں ایک گندی اور گھٹیا طوائف کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بڑے پوسٹ آفس کے پیچھے ایک اندھیری گلی میں دلال اسے ایک ہوٹل میں لے گیا اور میں سامنے والی فٹ پاتھ پر پیڑ کی آڑ میں کھڑا انتظار کرتا رہا۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ نکلی۔ دلال نے اسے ایک نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ پانچ روپے اب کوئی پھکر (فکر) نہیں ہے جب ضرورت ہوا کرے سیدھی میرے پاس آجایا کرو۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دلال بیڑی سلگاتا وہیں کھڑا رہ گیا اور وہ بوری بندر اسٹیشن کی طرف چل دی۔ اس نے وڈالا کا ٹکٹ خریدا تھرڈ کلاس کا۔ میں نے بھی وڈالا کا ٹکٹ خریدا فرسٹ

کلاس کا۔ اس ڈرامے کا آخری سین لکھنے کے لیے مجھے اس کے گھر جا کر اس کے باپ سے ملنا ہی پڑے گا اگر چہ مجھے یقین تھا کہ اس کا نہ کوئی باپ ہے نہ کبھی تھا۔

وڈالا کے اسٹیشن سے نکل کر وہ ریل کی پٹریوں کے پار ایک جھونپڑی کے پاس رکی۔ دھیرے سے کسی کو پکارا۔ بھیکو۔ ارے بھیکو۔''

'' کیا ہے!'' اندر سے ایک نیند بھری آواز سنائی دی اور اندھیرے میں ایک دھندلا سا سایہ جھونپڑی کے دروازے میں ابھر آیا۔

'' تین نوٹانک دے دے۔''

''ڈیڑھ روپیہ ہے!''

'' یہ لے مگر جلدی کر۔''

وہ دیشی شراب کی بوتل لے کر دوسرے کنارے کی طرف چل پڑی۔ میں سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میرے من میں غصہ اور نفرت کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ کمبخت نہ صرف طوائف نکلی بلکہ شرابی بھی۔ اس تین نوٹانک ٹھرّے کے لیے یہ کمبخت ہر شام کو اپنی عزت آبرو بیچتی ہے، بھیک مانگنے کا ڈھونگ رچا کر گاہک تلاش کرتی ہے۔ پھر اس پاپ کی کمائی سے زہر کی یہ بوتل خریدتی ہے اور اس دھندے میں نہ جانے کتنے شریف آدمیوں میں اپنے گندے جسم کی بیماریاں تقسیم کرتی ہوگی۔ یہ ایک بے شرم بھکارن ہی نہیں ہے یہ ایک بدچلن عورت ہی نہیں، یہ عورت کے روپ میں ایک زہریلی ناگن ہے۔ یہ انسان کی شکل میں شیطان ہے جو انسان کو گناہ اور گندگی کے راستے پر لے جاتی ہے۔ یہ وہ خوبصورت بلا ہے، یہ وہ خوبصورت ناگن ہے، یہ وہ خطرناک دھوکا ہے جس سے ہر شریف آدمی کو بچانا میرا فرض ہے۔

وہ ایک نہایت ہی بوسیدہ جھونپڑی کے پاس جا کر رک گئی۔ جھونپڑی کی چٹائی کے سوراخوں میں سے چراغ کی روشنی جھلک رہی تھی۔ جیسے ہی وہ رکی میں بھی ٹھٹک کر رک گیا۔ میرا جوتا ایک پتھر سے ٹکرایا اور اس کی آہٹ سنتے ہی وہ چونک پڑی۔ پلٹ کر دیکھا تو میں اس کے سامنے ہی تھا۔

'' تم کون ہو؟'' وہ سہم کر دھیرے سے بولی، جیسے اسے ڈر ہو کہ آواز اونچی کی تو بستی بھر کے

لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ ''کون ہو تم؟ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟''

''اتنی جلدی بھول گئیں؟'' میں نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ ''تم نے پہلے مجھ سے ہی تو ڈیڑھ روپیہ مانگا تھا اور اب تو تمھیں ڈیڑھ روپے کے بجائے پانچ روپے مل چکے ہیں۔''

اندھیرے میں بھی ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا چہرہ غصے اور شرم سے تمتما اٹھا ہو۔ بڑے ہی کڑوے انداز میں بولی۔ ''تم نے تو انکار کر دیا تھا، بابو۔ اب یہاں کیوں آئے ہو؟''

''یہ دیکھنے کہ وہ کون سا ڈاکٹر ہے جس نے تمھارے بابا کے لیے یہ زہر کی بوتل لانے کے لیے کہا ہے۔''

وہ بولی: ''بابا بہت بیمار ہے، بابو۔ اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ دارو اسے نہ دوں تو درد کے مارے رات رات بھر چلاتا ہے۔''

''جھوٹی کہیں کی!'' میں نے سوچا مگر اسے جھٹلانے کے لیے کہا: ''بیمار ہے تو اسپتال کیوں نہیں لے جاتی۔ اس زہر کے بجائے وہاں کوئی دوا دیتے اسے۔''

''اسپتال لے گئی تھی، بابو۔ پر وہ کہتے ہیں کہ اس روگ کا اب کوئی علاج ہی نہیں ہے۔''

''کیا بیمار ہے تمھارا بابا؟''

''کوئی بہت بھیانک بیماری ہے، بابو.........انتڑیوں کی کینسر کہیں ہیں۔ ولایت میں بھی اس کی کوئی دوا نہیں ہے۔''

اور مجھے وہ سب جھوٹ یاد آرہے تھے جو عمر بھر میں بھکاریوں سے سنتا آرہا ہوں۔ سرکار میرے ننھے ننھے بچے تین دن سے بھوکے ہیں۔ سیٹھ صاحب میرا سامان ریلوے اسٹیشن پر چوری ہو گیا ہے۔ واپسی کے کرائے کے لیے دس روپے مل جائیں تو بڑی کرپا ہوگی۔ حضور میرے باپ کی لاش سویرے سے پڑی ہے کریا کرم کے لیے بیس روپے چاہئیں۔ جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ اور اب یہ بھکارن میرے سامنے کھڑی جھوٹ بول رہی ہے کہ اس کا باپ کینسر سے مر رہا ہے۔ جھوٹ ہی تو ان بھکاریوں کا سرمایہ ہے۔

اس نے شاید میرے شبہوں کو بھانپ لیا۔ بولی۔ ''بابو یقین نہیں آتا تو اندر چل کر دیکھ لو۔''

بے اختیار میرا ہاتھ بش شرٹ کی جیب پر گیا جس میں (اسی دن تو تنخواہ ملی تھی) تین سو سو

روپے کے نوٹوں کی کڑکڑاہٹ میرے سینے کو گدگدا رہی تھی۔ خالی جھونپڑی میں اس نوجوان بھکارن کے ساتھ جانے کا نتیجہ کیا ہوگا، میں سمجھ گیا، ایسے ایسے کتنے ہی واقعات میں نے جاسوسی ناولوں میں ہی نہیں روزانہ اخباروں میں بھی پڑھے ہیں۔ کم سے کم بلیک میل اور زیادہ سے زیادہ میرا خون۔ ایک بار تو میں کانپ ہی اٹھا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ میں خواہ مخواہ خدائی فوجدار بن کر اس ویران بستی میں کیوں چلا آیا مگر میں نے اپنا خوف ظاہر نہیں ہونے دیا۔ زور سے بولا مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تمھارا باپ اندر ہے تو اس کو آواز دو۔ پھر میں چلتا ہوں تمھارے ساتھ مگر میں جانتا ہوں کہ اندر کوئی نہیں ہے۔''

''بابا!'' وہ چلاّ پڑی مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

''بابا!'' وہ پھر چلاّئی اور سناٹے میں اس کی اپنی آواز ہی گونج کر لوٹ آئی۔

''بابا!! بابا! جواب کیوں نہیں دیتے؟''

میں نے اس کا جواب دیا'' اس لیے کہ تمھارے بابا ہیں ہی نہیں۔ بس اب یہ ڈھونگ رہنے دو۔ تمھارے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ اب جاؤ اور یہ تین نوٹ ٹانک زہر پی کر سو جاؤ۔''

وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی جھونپڑی کے اندر گئی اور میں اندھیرے میں واپسی کے لیے راستہ تلاش کرنے لگا۔ ابھی میں چند قدم ہی گیا ہوں گا کہ ایک دل دہلانے والی چیخ سنائی دی اور میں بنا کچھ سوچے سمجھے احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر جھونپڑی کی طرف دوڑ پڑا۔

وہ جھونپڑی کے دروازے میں کھڑی تھی۔ کالے پتھر کی مورتی کی طرح۔ اندر کے چراغ کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں اس کے پریشان بالوں نے اس کے چہرے کے گرد ایک روشن ہالا سا بنا رکھا تھا۔

بابو آپ ٹھیک کہتے تھے بابا نہیں ہیں......

اندر کی ایک جھلنگی کھاٹ پر ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ مردہ پڑا تھا۔ آنکھیں اب تک کھلی ہوئی تھیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک ہاتھ جو شاید درد کو دبانے کے لیے پیٹ پر رکھا تھا وہیں اکڑ کر رہ گیا تھا۔ دوسرا ہاتھ پھیلا ہوا تھا اور اس کی اینٹھی ہوئی انگلیاں اس کونے کی طرف اشارہ کر رہی تھیں جہاں کئی خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔

میرے منہ سے آواز نکلی جو میرے کانوں کو میری اپنی آواز نہ معلوم ہوئی۔ ''تمھیں اور پیسوں کی ضرورت ہوگی شاید۔............ یہ لو۔'' آپ سے آپ میرا ہاتھ اٹھا مگر اس جیب میں نہیں گیا جہاں تین سو کے نوٹ میرے سینے کو گرما رہے تھے دوسری جیب میں گیا جہاں کچھ ریزگاری پڑی تھی۔

اس نے میری ہتھیلی پر پڑے ہوئے سکوں کو اپنی بڑی بڑی آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا، دل ہی دل میں شاید انھیں گنا اور پھر اس کی گردن کے اشارے نے خاموشی سے نہیں کہہ کر بہت کچھ کہہ دیا اور میں وہاں سے چلا آیا۔

گھر آ کر کپڑے اتار رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ اب تک میری مٹھی بند ہے۔ مٹھی کھولی تو میں نے دیکھا کہ میری ہتھیلی پر دو اٹھنیاں ایک چونی اور پچیس نئے پیسے پڑے ہیں۔ پورا ڈیڑھ روپیہ۔ میں نے جلدی سے ان سکوں کو ایسے جھٹک دیا جیسے سانپ نے کاٹ لیا ہو اور دیر تک اپنی خالی ہتھیلی کو دیکھتا رہا۔ جہاں ایک پیلا سا سرخی مائل داغ لگا ہوا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر سونگھا تو اس میں سے ایسی بو آئی جیسے خون کی۔

واش بیسن پر جا کر میں نے لکس سوپ سے ہاتھ دھوئے مگر داغ نہ گیا۔ پھر کاربالک صابن سے دھوئے پھر بھی وہ داغ نہ مٹا۔ پھر جھانویں سے رگڑا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا اور اس دن سے آج تک ہر روز کئی بار صابن سے ہاتھ دھوتا ہوں، جھانویں سے رگڑتا ہوں تولیے سے پونچھتا ہوں مگر وہ پیلا سا سرخی مائل داغ جس میں سے خون کی بو آتی ہے آج تک میری ہتھیلی پر اسی طرح موجود ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں شاید یہ کوئی نئی قسم کی کوڑھ ہے لیکن میں جانتا ہوں یہ ہاتھ کا میل ہے۔

(نقوش جولائی 1962)

O

# بھکارن

کتنے برسوں سے میری ہر شام کا متعین پروگرام یہ ہے کہ میں ٹھیک چھ بجے پرشین ڈیری پہنچ جاتا ہوں۔ بیٹھنے کے لیے میں ہمیشہ کوئی ایسا کونا ڈھونڈتا ہوں، جہاں سمندر کی ٹھنڈی ہوا اور میرن ڈرائیو پر ٹہلتی ہوئی حسین لڑکیوں کے نظاروں سے پرمسرت ہوسکوں، تاکہ اس کی آڑ میں دوسرے میزوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کا درشن کرسکوں۔ کبھی کبھار میں کوئی سرخیوں والی چٹ پٹی خبر ہوئی تو پڑھ لیتا ہوں۔

ساڑھے چھ بجے تک میں دھیرے دھیرے اور مزے لے لے کر کافی پیتا ہوں۔ پھر بڑی رعب دار آواز میں بوائے کا نعرہ لگا کر ویٹر سے بل لانے کو کہتا ہوں۔ جب ویٹر آتا ہے تو میں اس کی ٹرے سے بل اٹھاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ پرشین ڈیری میں کافی کی قیمت 12 آنے ہی ہے۔ روز روز اس کے بھاؤ میں کمی بڑھوتری نہیں ہوتی، پھر بھی میں عینک لگا کر بل کو غور سے پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد میں روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر اس شان سے بل کے ساتھ ٹرے میں پھینکتا ہوں، جیسے وہ سو روپے کا نوٹ ہو۔ اس کے میں ویٹر کی واپسی کا انتظار کرتا ہوں۔ جب وہ بل پر پیڈ کی مہر لگوا کر واپس لاتا ہے تو میں ٹرے میں سے بل اٹھا لیتا ہوں اور وہ علی بابا کا گدھا۔ وہ مجھے سیلوٹ مار کر 'سلام لاب' کہتا ہے اور میں کبوتر کی طرح اپنا سینہ تانے باہر سڑک پر

آجاتا ہوں۔

اب میں بہاری پان والے کے پاس پہنچتا ہوں اور اسے اپنا 'اسپیشل مگھئی' پان لگانے کا آرڈر دیتا ہوں۔ جتنی دیر میں وہ پان لگاتا ہے، اتنی دیر میں میں پالش والے چھوکرے سے جوتا پالش کرواتا ہوں۔ اسے 10 پیسے کی بجائے دو آنے یعنی 12 پیسے دیتا ہوں۔ اتنے میں پان کا بیڑا تیار ہوجاتا ہے۔ مگھئی پان منہ میں ڈالتے ہی آئس کریم کی طرح گھل جاتا ہے اور کیوڑے کی خوشبو سے میرا دماغ مہک اٹھتا ہے۔ میں بڑی لاپرواہی سے پان کی تھالی میں چونی پھینکتا ہوں۔ پیتل پر چاندی کی چوٹ سے جو دھیمی سی جھنکار پیدا ہوتی ہے، وہ میرے کانوں میں ایسے گونجتی ہے، جیسے وہ دنیا کا سب سے مدھر سنگیت ہو۔

اب میں میرن ڈرائیو پر سیر کرنے کے لیے نکل پڑتا ہوں۔ اس وقت سامنے سمندر کے ڈوبتا ہوا سورج ایسا لگتا ہے، جیسے ایک سونے کی اشرفی نیلے مخمل کے بوٹے میں رکھی جارہی ہو۔ آپ کو شاید اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میرا مزاج بڑا شاعرانہ ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں جتنی بھی اپمائیں مجھے سوجھتی ہیں، وہ سبھی سونے چاندی اور روپے سے متعلق ہوتی ہیں، شاید اس لیے کہ میں پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتا ہوں۔

ہاں تو، اس وقت ڈوبتے سورج کا نظارہ دیکھتا ہوں۔ مانا کہ قدرت بہت حسین ہے، لیکن انسان کی زندگی میں اور بھی تو کتنی حسین چیزیں ہیں۔ مثلاً، یہ رنگ برنگی موٹریں، جن کا نہ ختم ہونے والا کارواں میرن ڈرائیو سے پوری شام گذرتا رہتا ہے۔ کالی کاریں، لال، ہری، نیلی، پیلی، موٹریں، کوئی مچھلی کی طرح کول سڈول، کوئی اتنی لمبی چوڑی جیسے پورا مکان کا مکان پہیوں پر چلا جارہا ہو۔ کوئی اتنی چھوٹی اور پتلی جیسے مچھلی ٹریفک کی لہروں میں ڈولتی ہوئی جارہی ہو۔

میں ایک ایسی کمپنی میں کام کرتا ہوں، جہاں موٹروں کو ہی خریدنے بیچنے کا دھندا ہوتا ہے۔ ان موٹروں کو دیکھ کر دل ہی دل میں ان کی قیمت کا حساب لگاتا رہتا ہوں۔ یہ فیئٹ ہے، 12 ہزار کی، یہ ہندوستانی امبیسڈر ہے 14 ہزار کی، یہ جرمنی کی بنی ہوئی مرسڈیز ہے، جو صرف ودیشی دوتاواسوں سے پرانی خریدی جاسکتی ہے۔ اس کی قیمت لگ بھگ 40-30 ہزار روپے ہوگی۔ یہ 80 ہزار کی شیورلیٹ امپالا ہے، جو صرف چھوٹے فلم اسٹار اور بڑے پونجی پتی ہی خرید سکتے ہیں۔

اس طرح میں وہاں سے گذرنے والی لڑکیوں کے بارے میں دل میں حساب لگاتا رہتا ہوں۔ وہ جینس پہنے ہوئے کٹے بالوں والی لڑکی، جو اپنے کتے کو ٹہلا رہی ہے، کسی امریکن تیل کمپنی کے افسر سے بیاہی جائے گی، جس کی تنخواہ کم سے کم تین ہزار ہر مہینے ہوگی۔ کتابیں بغل میں دبائے، آنکھوں پر چشمہ لگائے 17 روپے والی وائل کی ساڑی اور چپل پہنے ہوئے، جو پتلی سی دبلی سی لڑکی آ رہی ہے، وہ کسی شاعر یا ادیب سے عشق کر کے اس سے شادی کرے گی، اور پھر عمر بھر پچھتائے گی۔ یہ تنگی مہری کی شلوار اور فراک کی طرح چست قمیض پہنے لپ اسٹک کا چلتا پھرتا اشتہار بنی جو لڑکی آ رہی ہے، یہ یا تو فلم اسٹار یا کسی بہت بڑے بزنس مین کے چھوٹے اور نکھٹو بیٹے سے شادی کرے گی۔

اس دن بھی میں اسی طرح میرن ڈرائیو پر گذرنے والی گاڑیوں اور لڑکیوں کا میل جول کر ہی رہا تھا کہ میرے کان میں ایک آواز آئی، 'بابو جی! ڈیڑھ روپیہ دے دو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔'

میں نے سوال کرنے والی کی طرف اپنی پرکھنے والی نظروں سے دیکھا۔ 20-22 سال کی سانولی سی چھوکری، جس کا جسم میلی اور پھٹی چولی میں سے اپنی جوانی کے درشن کرا رہا تھا، اس کے موٹے موٹے ہاتھوں پر لپ اسٹک کی بجائے پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے ننگے پیروں پر دھول اٹی ہوئی تھی۔

'بھکارن!' میں نے دل ہی دل میں کہا، 'آوارا بھکارن۔'

مجھے دنیا میں کسی سے نفرت ہے تو بھکاریوں سے۔ یہ لوگ ہمارے ملک کے ماتھے پر کلنک ہیں۔ نکمے کام چور کہیں کے۔ شریف آدمیوں کی رحم دلی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پیسہ پیسہ مانگ کر ہزاروں روپے جمع کرتے ہیں۔ جان بوجھ کر اپنے ہاتھ پاؤں توڑتے ہیں، تاکہ بھیک مانگنے کا بہانہ مل جائے۔ سڑکوں کے کنارے بیٹھ کر اپنے کوڑھ اور زخموں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ غیرملکی سیاحوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر ہمارے ملک کو بدنام کرتے ہیں۔ مجھے ان بھکاریوں سے نہ صرف گھن آتی ہے، بلکہ مجھے ان سے سخت نفرت ہے۔ اگر میرا چلے تو میں ان سب کو گولی سے اڑا دوں۔

بھکاریوں سے زیادہ مجھے کسی سے نفرت ہے تو وہ بھکارنیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ کام چور، نکمی اور بے شرم ہی نہیں، بدچلن اور بے حیا بھی ہوتی ہیں۔ شریف آدمیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پیسے مانگتی ہیں۔ کوئی کرائے کا بچہ گود میں اٹھائے دودھ کے پیسے مانگتی پھر رہی ہے، کوئی بے سہارا پناہ گزیں ہونے کا ڈھونگ رچا رہی ہے اور کوئی بھیک مانگنے کے بہانے بیچ بازار میں اپنے جسم کا سودا کرتی گھوم رہی ہے۔

اس لیے میری زندگی کا اصول ہے کہ میں بھکاری ہو یا بھکارن، کسی کو بھیک نہیں دیتا۔ پشین ڈیری کے ویٹر کو چونی ٹپ دے دوں، پالش والے چھوکرے کو دو نئے پیسے بخشش دے دوں یا پان والے کو ۱۲ نئے پیسے کے پان کے لیے چار آنے دے دوں، مگر کسی بھکارن کو ایک پیسہ دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے، مگر میں ہر وقت اور ہر جگہ ہاتھ دھونا پسند نہیں کرتا۔

جب اس بھکارن نے نہ اکنی، نہ چونی بلکہ پورے ڈیڑھ روپے کا سوال کیا، تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے دل میں سوچا، 'اب ان بھکاریوں نے بھی اپنی قیمت بڑھا دی ہے۔ اس لیے میں نے سختی سے جواب دیا، ڈیڑھ روپیہ چاہیے۔ ڈیڑھ ہی روپیہ کیوں، دو روپیہ کیوں نہیں؟'

اس نے جواب دیا، مگر دوسری بھکارنوں کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں، بلکہ نظریں جھکا کر بابا کے لیے دارو لے جانی ہے بابا!'

میں نے سوچا، 'یہ بھکارن تو سیدھی سادھی ایکٹرس ہے۔ واہ! واہ! کیا لے جانا ہے۔ بھلا اب کون شریف اور رحم دل آدمی انکار کر سکتا ہے۔ دو چار گھنٹے میں نہ جانے کتنے ہی ڈیڑھ روپے جمع ہو جائیں گے۔ دیکھنے میں بھی بری نہیں ہے۔ کتنے ہی شوقین مزاج تو اس سے ڈیڑھ منٹ بات کرنے کا ہی ڈیڑھ روپیہ دے دیں گے، کوئی منچلا تو رات ہوتے ہی اسے ٹیکسی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے اور صبح ہوتے ہوتے ڈیڑھ روپے کی بجائے 15-20 روپیہ کا انتظام ہو جائے۔ مگر اس بھکارن کو یہ نہیں معلوم کہ میں ان بیوقوفوں میں سے نہیں ہوں، جو ویشیاؤں یا بھکارنوں سے بیماریاں خریدتے پھرتے ہیں۔

35 سال کی عمر میں بھی میں غیر شادی شدہ ہوں، مگر میں ان آوارا، گندی و زہریلی ناگنوں

کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ دن بھر آفس میں کام کرتا ہوں، رات گئے تک میرن ڈرائیو پر سے گزرتا ہوں، گھر جا کر کھانا کھاتا ہوں، پھر پلنگ پر لیٹ کر لائبریری سے کوئی چھچھلا ناول پڑھتا ہوں یا کباڑی کے پاس سے چونی میں خریدی ہوئی کسی رسالہ کی تصویریں دیکھتا دیکھتا سو جاتا ہوں۔ بھلا ہو، چکنے کاغذوں والی ودیشی پتر کاؤں کا۔ کیسی کیسی خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں چھاپتے ہیں اور لگ بھگ ننگی رنگین تصویروں میں ان کے گورے گورے گلابی جسم بالکل ایسے لگتے ہیں، جیسے پھل والے کی دکان پر سیب، سنترے، ناشپاتیوں اور اناروں کے ڈھیر لگے ہوں، تازہ رس بھرے، جن کو دیکھ کر ہی منہ میں پانی بھر آئے اور بن کھائے بھوکا پیٹ بھر جائے۔ اس لیے میں نے اسے دھتکار دیا، جا جا اپنا راستہ لے۔ یہ ڈھونگ کسی اور کو دکھانا۔ میں دس سالوں سے ممبئی میں رہتا ہوں۔ ایسے ڈرامے بہت دیکھے ہیں۔'

اس نے ایک پل کے لیے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے موٹے موٹے پپڑیاں جمے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے اور پھر کچھ کہے بنا بند ہو گئے۔ پھر وہ وہاں سے قریب ہی روشنی کے کھمبے کے سہارے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے کیوں میں وہیں بیٹھا رہا اور کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد اس لڑکی کے ڈھونگی ہونے کا آخری ثبوت بھی مل جائے گا۔

ابھی وہ وہاں جا کر کھڑی ہی ہوئی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی پہنچا۔ میں اتنی دور سے سڑک کی روشنی میں اس آدمی کا چہرہ نہیں دیکھ پایا۔ لیکن اس کے تیل سے چپڑے ہوئے بال، اس کے گلے میں بندھا رومال، اس کے کان پر رکھی ہوئی بیڑی اور اس کے چلنے کا انداز ہر چیز چلا چلا کر اس کے پیشے کا اعلان کر رہی تھی۔

وہ اسے چپکے چپکے کچھ سمجھا رہا تھا جو میں نہیں سن سکا تھا، مگر وہ کیوں یہ کر رہا تھا، اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ وہ جواب میں صرف سر ہلا کر نہیں کر رہی تھی۔ دلال نے بات کرتے کرتے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، لیکن وہ فوراً ہٹ کر دور کھڑی ہو گئی تا کہ دلال کا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکے۔ تب وہ چلا کر بول پڑا، بڑے نخرے کرتی ہے۔ بچ کر جائے گی کہاں؟' اور اس نے دو تین موٹی موٹی گالیاں دیں، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل میں نہ اپنی بہن کی عزت ہے، نہ

اپنی بیٹی کی محبت۔ اس کی گالیوں کی بوچھار سے بھکارن بوکھلائی ہوئی تھی۔ دلال وہاں سے ہٹ کر کچھ دوری پر جا کھڑا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک موٹا بوڑھا آدمی اپنی توند سنبھالتا ہوں ایک موٹر سے اترا۔ اس نے بھکارن کو شاید پانچ پیسے کا سکہ دیا اور وہ گڑگڑاتی ہی رہی، ڈیڑھ روپیہ چاہیے سیٹھ جی! بس ڈیڑھ روپیہ۔ عمر بھر آپ کو جان مال کی دعا دوں گی۔ بھگوان آپ کو لاکھوں کروڑوں دے گا سیٹھ جی۔ مگر سیٹھ جی اپنی توند سنبھالتے ہوئے سمندر کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ جہاں دور اندھیرے اور ٹھہرے ہوئے پانی میں چوپاٹی کی روشنیاں ڈوبی ہوئی تھیں۔

پھر اس نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا، جو ریشمی ساڑی پہنے، گلے میں موتیوں کا ہار ڈالے، اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ ایک لڑکی سلیکس پہنے ہوئے تھی اور دوسری گھٹنوں تک اونچا فراک، ان کے اونچی ایڑی کے سینڈل فٹ پاتھ کے پتھروں پر کھٹاک کھٹاک بول رہے تھے۔ بھکارن دور تک ان کے پیچھے ڈیڑھ روپے کا رونا روتی چلتی رہی۔ لیکن ان تینوں نے ایک بار بھی اس کی طرف مڑ کر نہ دیکھا، نہ اس کی بات کا کوئی جواب دیا۔ میں نے سوچا ان بھکاریوں کا شاید یہی علاج ہے کہ ان کا نوٹس ہی نہ لیا جائے، جیسے ان کی کوئی ہستی ہی نہ ہو۔

اب وہ ایک نوجوان جوڑے کے سامنے اپنا رونا رو رہی تھی۔ یہ دونوں ابھی ابھی پرشین ڈیری سے نکلے تھے۔ نکڑ کی دوکان سے لڑکے نے ایک بڑھیا سگریٹ کا ڈبہ خریدا تھا۔ اب وہ سمندر کے کنارے میرے نزدیک کھڑا، اس میں سے پہلا سگریٹ نکال کر سلگا رہا تھا۔ لڑکی اپنے بیگ میں سے چھوٹا سا گول آئینہ نکال کر سڑک کی روشنی میں اپنا میک اپ ٹھیک کر رہی تھی۔ ان دونوں میں سے یوڈیکلون، فرانسیسی سینٹ، بڑھیا فراکی، مہوے کے پان، خوشحالی اور محبت کی ملی جلی خوشبو کا بھبھکا اٹھ رہا تھا کہ اس بھکارن کے پسینے، میل اور غریبی کی گندھ نے ان کو گھیر لیا۔ لڑکی نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بھکارن کی طرف ڈالی۔ اونہہ کہا اور اپنے ساتھی کو بغل میں ہاتھ ڈال کر چل پڑی۔ بھکارن کھڑی رہ گئی۔

میں نے دل ہی دل میں اس بھکارن کو کوسا۔ دونوں پریمی کتنے خوبصورت رومانٹک موڈ میں تھے، لیکن اس کمبخت نے اپنا منحوس چہرہ دکھا کر ان کا مزا کرکرا کر دیا۔ نکمی، کام چور، آوارا،

چھنال، کہیں کی اور اب وہی چھنال آخر کار کچھ دوری پر کھڑی دلال کے پاس جا پہنچی تھی۔ دلال کے کچھ کہنے کے بعد اس ساتھ جا رہی تھی اور میں ان کا پیچھا کر رہا تھا، کیوں؟'

اس لیے کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایسے بھکاریوں اور بھکارنوں کے ڈھول کا پول کھول کر سماج کو ان کے ہتھکنڈوں سے بچاؤں گا، اخباروں میں مضمون نہیں تو ایڈیٹر کے نام خط لکھوں گا اور ساری دنیا کو بتاؤں گا کہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اپنے باپ کی دارو کے لیے ڈیڑھ روپے مانگنے والی بھولی بھالی بھکارن اصل میں گندی اور گھٹیا سی ویشیا کے سوا کچھ نہیں ہے۔

بڑے ڈاک گھر کے پیچھے ایک اندھیری گلی میں دلال اسے ایک ہوٹل میں لے آیا اور میں سامنے والے فٹ پاتھ پر پیڑ کی آڑ میں کھڑا انتظار کرتا رہا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ نکلی۔ دلال نے اسے ایک نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا، 'یہ لے، پانچ روپیہ۔ اب کوئی فکر مت کرنا۔ جب ضرورت ہوا کرے، سیدھی میرے پاس آجایا کر۔'

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دلال بیڑی سلگاتا وہیں کھڑا رہا اور بھکارن بوری بندر اسٹیشن کی طرف چل دی۔ اس نے وڈالا کا ٹکٹ لیا، لیکن فرسٹ کلاس کا۔ اس ڈرامے کا آخری سین لکھنے کے لیے مجھے اس کے گھر جا کر اس کے باپ سے ملنا ہی پڑے گا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اس کا نہ کوئی باپ ہے، نہ کبھی تھا۔

وڈالا کے اسٹیشن سے نکل کر وہ ریل کی پٹریوں کے پار ایک جھونپڑی کے پاس رکی۔ دھیرے سے کسی کو پکارا بھیکو۔ ارے بھیکو۔

'کیا ہے؟' اندر سے ایک نیند بھری آواز سنائی دی اور اندھیرے میں ایک دھندلا سا سایہ جھونپڑی کے دروازے میں ابھر آیا۔

'تین ٹینوٹانک دے دے۔'

'ڈیڑھ روپیہ۔'

'یہ لے، مگر جلدی کر۔'

وہ دیشی شراب کی بوتل لے کر دوسرے کنارے کی طرف چل دی۔ میں سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میرے دل میں غصہ اور نفرت کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ کمبخت! نہ

صرف طوائف نکلی، بلکہ شرابی بھی، اس ٹیونا ٹنک کے لیے یہ بے حیا ہر شام اپنی عزت بیچتی ہے۔ بھیک مانگنے کا ڈھونگ رچ کر گاہک تلاش کرتی ہے۔ پھر اس پاپ کی کمائی سے زہر کی یہ بوتل خریدتی ہے۔ اس دھندے میں یہ نہ جانے کتنے شریف آدمیوں میں اپنے گندے جسم کی بیماریاں بانٹتی پھرتی ہے۔ یہ ایک بے شرم بھکارن ہی نہیں، ایک بدچلن عورت بھی ہے۔ یہ عورت کی شکل میں ایک زہریلی ناگن ہے۔ یہ انسان کی شکل میں شیطان ہے، جو انسان کو گناہ اور گندگی کے راستے پر لے جاتی ہے۔ یہ وہ خوبصورت بلا ہے، یہ تو منموہنی ناگن ہے، یہ وہ خطرناک دھوکا ہے جس سے ہر شریف آدمی کو بچانا میرا فرض ہے۔

وہ ایک بہت ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے پاس جا کر رک گئی۔ جھونپڑی کی چٹائی کے سراخوں میں سے چراغ کی روشنی جھلک رہی تھی۔ جیسی ہی وہ رکی، میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ میرا جوتا ایک پتھر سے ٹکرایا۔ اس کی آہٹ سنتے ہی وہ چونک پڑی۔ پلٹ کر دیکھا تو میں اس کے سامنے تھا۔

'تم کون ہو؟' وہ سہم کر دھیرے سے بولی، جیسے اسے ڈر ہو کہ آواز اونچی کی تو بستی کے لوگ اکٹھے ہو جائیں گے، کون ہو تم؟ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟'

'اتنی جلدی بھول گئی، میں نے بھی دھیرے سے جواب دیا، تم نے پہلے مجھ سے ہی تو ڈیڑھ روپیہ مانگا تھا اور اب تو تمھیں ڈیڑھ روپے کی بجائے پانچ روپے مل چکے ہیں۔'

اندھیرے میں بھی ایسا محسوس ہوا، جیسے اس کا چہرا غصے اور شرم سے تمتما اٹھا ہو۔ بڑے کڑوے انداز میں وہ بولی، تم نے تو انکار کر دیا تھا بابو۔ اب یہاں کیوں آئے ہو؟'

'یہ دیکھنے کہ وہ کون سا ڈاکٹر ہے جس نے تمھارے بابا کے لیے یہ زہر کی بوتل لانے کے لیے کہا ہے۔'

وہ بولی، 'بابا بہت بیمار ہیں بابو! اسے بڑے تکلیف ہوتی ہے یہ دارو نہ دوں تو درد کے مارے رات بھر چلاتا ہے۔'

جھوٹی کہیں کی۔ میں نے سوچا۔ اس لیے اسے جھٹلانے کے لیے کہا، بیمار ہے تو اسپتال کیوں نہیں لے جاتی؟ اس زہر کی بجائے وہاں کوئی دوا ملتی اسے۔'

'اسپتال لے گئی تھی، پر وہ کہتے ہیں، اس روگ کا کوئی علاج نہیں ہے۔'

'کیا بیماری ہے تمھاری بابا کو؟'

'بہت بھیانک بیماری ہے بابو! انتڑیوں کا کینسر ہے۔ ولایت میں بھی اس کی کوئی دوا نہیں ہے۔'

اور مجھے وہ سب جھوٹ یاد آرہے تھے، جو عمر بھر میں بھکاریوں سے سنتا آرہا ہوں۔ سرکار میرے ننھے ننھے بچے تین دن سے بھوکے ہیں، سیٹھ صاحب! میرا سامان ریلوے اسٹیشن سے چوری ہو گیا ہے، واپسی کے لیے 20 روپیہ چاہیے۔

جھوٹ! جھوٹ!! جھوٹ!!! اور اب یہ بھکارن بھی میرے سامنے جھوٹ بول رہی ہے کہ اس کا باپ کینسر سے مر رہا ہے۔ جھوٹ ہی تو ان بھکاریوں کی پونجی ہے۔

اس نے شاید میرے شک کو بھانپ لیا۔ بابو۔ یقین نہیں آتا تو اندر چل کر دیکھ لو۔'

اچانک میرا ہاتھ شرٹ کی جیب میں گیا۔ اسی دن تنخواہ ملی تھی۔ تین سو روپے کے نوٹوں کی کرکراہٹ میرے سینے کو گدگدا رہی تھی۔ خالی جھونپڑی میں اس نوجوان بھکارن کے ساتھ جانے کا انجام کیا ہوگا میں سمجھ گیا۔ میں نے ایسے کتنے ہی واقعات جاسوسی ناولوں میں ہی نہیں، روزانہ کے اخباروں میں بھی پڑھے ہیں۔ کم سے کم بلیک میل اور زیادہ سے زیادہ میرا خون۔ ایک بار تو میں کانپ ہی اٹھا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ بیکار ہی خدائی فوجدار بن کر اس ویران بستی میں چلا آیا؟ مگر میں نے اپنا خوف ظاہر نہیں ہونے دیا اور زور سے بولا، مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تمھارا باپ اندر ہے تو تمھارے ساتھ...... مگر میں جانتا ہوں کہ اندر کوئی نہیں ہے۔'

'بابا' وہ چلا پڑی، لیکن اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

'بابا' وہ پھر چلائی اور سناٹے میں اس کی اپنی آواز ہی گونج کر لوٹ آئی۔

'بابا جواب کیوں نہیں دیتے؟'

میں نے جواب دیا، اس لیے کہ تمھارے بابا ہیں ہی نہیں۔ بس، اب یہ ڈھونگ رہنے دو۔ تمھارے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ اب جاؤ اور وہ ٹینو ٹانک زہر پی کر سو جاؤ۔

وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی جھونپڑی کے اندر چلی گئی اور میں اندھیرے میں واپسی کے لیے راستہ تلاش کرنے لگا۔ ابھی میں کچھ ہی قدم گیا ہوں گا کہ ایک دل دہلا دینے والی چیخ سنائی دی۔ میں

بنا کچھ سوچے سمجھے جھونپڑی کی طرف دوڑ پڑا۔

وہ جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی تھی، کالے پتھر کی طرح۔ پتھر کو مورتی کی طرح اندر کے چراغ کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں اس کے پریشان بالوں نے اس کے چہرے کے گرد ایک روشنی کا ہالہ بنا رکھا تھا۔

بابو! آپ ٹھیک کہتے ہیں، بابا نہیں ہیں۔'

اندر ایک جھلنگی کھاٹ پر ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک ہاتھ، جو شاید درد کو دبانے کے لیے پیٹ پر تھا، وہیں اکڑ کر رہ گیا تھا۔ دوسرا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ اس کی اینٹھی ہوئی انگلیاں اس کونے کی طرف اشارہ کر رہی تھیں، جہاں خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔

میرے منہ سے جو آواز نکلی، میرے کانوں کی اپنی آواز معلوم ہوئی، تمھیں پیسوں کی ضرورت ہوگی شاید، یہ لو۔' خود میرا ہاتھ اٹھا، مگر اس جیب میں نہیں گیا، جہاں سو سو کے تین نوٹ میری جیب کو گرما رہے تھے۔ ہاتھ دوسری جیب میں گیا، جہاں کچھ ریزگاری پڑی تھی۔

اس نے میری ہتھیلی پر پڑے ہوئے سکوں کو بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا، شاید دل ہی دل میں انھیں گنا اور پھر اس کی گردن کے اشارے نے خاموشی سی نہیں کہہ کر بہت کچھ کہہ دیا۔

میں چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔

گھر آکر کپڑے اتار رہا تھا کہ میں نے دیکھا، جب اپنی مٹھی کھولی تو اس میں دو اٹھنیاں، ایک چونی اور پچیس پیسے پڑے تھے۔ پورا ڈیڑھ روپیہ۔ میں نے جلدی سے ان سکوں کو ایسے جھٹک دیا، جیسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ میں دیر تک اپنی خالی ہتھیلی کو دیکھتا رہا، جہاں ایک پیلا سا سرخ داغ لگا ہوا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر اسے سونگھا تو اس میں ایسی بو آئی، جیسے خون کی ہو۔

O

# داروغا اور لڑکی

لڑکی جوان تھی، خوب صورت تھی، طرحدار تھی لیکن پریشان حال تھی۔ آدھی رات کے وقت وہ پولیس والوں کو سرحد کے قریب آوارہ گھومتی ہوئی ملی تھی، ان کو شبہ تھا کہ وہ بدچلن ہے یا ممکن ہے پاکستانی جاسوس ہو۔ اس لیے وہ اسے پکڑ کر تھانے میں لے آئے۔

داروغا صاحب مجرموں سے اقبال جرم کرانے میں مشہور تھے۔ بڑے بڑے خونی اور ڈاکو ان سے پناہ مانگتے تھے۔ لڑکی کو ان کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا تو پہلے تو انھوں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر دل میں سوچا 'چھوکری بری نہیں'۔ خضاب سے سیاہ کی ہوئی مونچھوں پر تاؤ دے کر مسکراتے ہوئے بولے 'بیٹھ جاؤ'

لڑکی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کرسی پر اس سے پہلے بڑے نامی گرامی چور، ڈاکو، خونی لٹیرے بیٹھے تھے۔ داروغا صاحب نے اس کے خوبصورت چہرے کو گھورتے ہوئے سوچا، ایسی حسین مجرم تو میرے تھانے میں آج تک کبھی پیش نہیں ہوئی۔ اس سے سوال جواب کیے جائیں تو کیسے؟'
پھر انھوں نے اپنے کانسٹبلوں سے کہا 'تم باہر جاؤ'

ایک حوالدار بولا 'صاحب، کہیے تو اس کی جامہ تلاشی لے لی جائے شاید کوئی ہتھیار چھپا رکھا ہو کہیں!' اور 'کہیں' کا لفظ اس نے ایک ایسے خاص انداز سے آنکھیں میچ کر اور ہونٹ کاٹ

کر کہا کہ لڑکی شرما گئی اور اس نے اپنا سینہ اوڑھنی کے پلّو سے ڈھانپ لیا۔

'نہیں نہیں، رہنے دو'۔ داروغا صاحب نے جلدی سے کہا۔ حوالدار اور سپاہی کن انکھیوں سے داروغا صاحب کو دیکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔

اب داروغا صاحب نے اطمینان سے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ چوڑی دار پاجامے اور چست قمیض میں اس کا بدن کسا کسا تھا۔ اوڑھنی کا آنچل جو اس نے شرم سے سر پر لیا تھا۔ اس میں سے جھلکتا ہوا گورا گورا چہرہ بھی جوان تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں ایسی لگتی تھیں جیسے انھوں نے صدیوں کا دکھ اور درد اپنی پلکوں میں سمیٹ رکھا ہو۔

داروغا صاحب نے سوچا 'شکل سے تو بڑی بھولی بھالی لگتی ہے مگر ان کے تجربہ کار، جہاں دیدہ دماغ نے انھیں یاد دلایا 'بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جاسوس بھی'۔ سو انھوں نے کھنکار کر اپنے چہرے پر افسرانہ شان پیدا کرتے ہوئے کرخت لہجے میں سوال جواب کرنے شروع کیے۔ 'نام؟'

لڑکی یہ سوال سن کر چونک سی گئی، جیسے کسی نے اس سے کوئی بہت بڑا راز افشا کرنے کے لیے کہا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں جھکا لیں جیسے اقبال جرم سے گھبرا رہی ہو۔

داروغا صاحب نے مجرموں کا رجسٹر کھولا، پھر قلم کو دوات میں ڈبو کر اپنے سوال کو دہرایا: 'تمھارا نام؟'

اب لڑکی نے دھیرے دھیرے اپنی بوڑھی نظریں اٹھائیں، جن میں صدیوں کے دکھ درد کے ساتھ ایک نئے زخم کا احساس بھی تھا۔ کچھ دیر تک وہ داروغا کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کے جوان ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ بولی: 'مجھ سے میرا نام نہ پوچھو'۔

داروغا صاحب کو اس جواب کی امید نہ تھی۔ انھوں نے کسی قدر تعجب سے پوچھا 'کیوں؟ کیوں نہ پوچھوں؟'

لڑکی نے داروغا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

جب بھی آتا ہے مرا نام تیرے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

یہ جواب سن کر داروغا صاحب بالکل ریشہ خطمی ہو گئے۔ انھیں اس کی قطعی امید نہ تھی کہ لڑکی اتنی جلدی اتنی بے تکلف ہو جائے گی۔ چنانچہ انھوں نے بھی اپنے چہرے پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا 'اجی نہیں، ہم تو نام پوچھ کر رہیں گے'۔

لڑکی نے شرم سے گردن جھکا کر جواب دیا۔

شرم سے نام تک نہیں لیتے
اب ہمارا خطاب ہے کوئی

اب تو داروغا صاحب اور بھی بے باک ہو گئے۔ لڑکی کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولے: 'نام تو تمھیں بتانا ہی پڑے گا'۔

لڑکی کی بجھی ہوئی آنکھوں میں بجلیاں سی چمک اٹھیں جیسے راکھ کو کریدنے سے اس کی تہہ میں سے چنگاریاں جھانکنے لگیں۔ داروغا صاحب کا ہاتھ جھٹک کر اس نے غصّے سے جواب دیا۔

ہمارا نام اگر یہ نہیں تو وہ ہوگا
ہمارے نام سے کیا کام، مدعا کہیے

داروغا صاحب کا بڑھتا ہوا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ کئی بار کھنکار کر کھسیاہٹ دور کرنے کی کوشش کر کے انھوں نے اپنے قلم کو روشنائی میں ڈبویا اور رجسٹر میں لکھا: 'نام کے گمنام'۔ پھر انھوں نے ایک غیر جذباتی افسر شاہی انداز میں پوچھا:

'باپ کا نام؟'

'معلوم نہیں۔ کوئی کہتا ہے بادشاہ کی اولاد ہوں۔ کوئی کہتا ہے کسی صوفی سنت کی۔ کوئی کہتا ہے کسی فوجی سپاہی کی'۔

'تمھاری ماں کیا کہتی ہے؟' داروغا صاحب نے ماں کے لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

'میری ماں کہتی ہے کہ میں محبت کے رشتے سے پیدا ہوئی ہوں۔ اس نے اِتنوں سے محبت کی ہے اور اتنوں نے اس سے محبت کی ہے کہ باپ کا نام بتانا مشکل ہے'۔

داروغا کو تعجب تھا کہ وہ اتنی بے حیائی کی باتیں کر رہی ہے اور اس کی پلک تک نہیں جھپکی برابر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیے جا رہی ہے۔ انھوں نے رجسٹر میں لکھ دیا 'باپ کا

نام نہیں بتاتی۔ ضرور حرام کی اولاد ہے'۔ پھر انھوں نے پوچھا: 'ماں کا نام؟'

لڑکی نے جواب دیا 'برج بائی'۔

یہ نام رجسٹر میں درج کر کے داروغا نے اس کے آگے لکھ دیا 'کوئی طوائف ہوگی'۔ ان کا اگلا سوال تھا 'کہاں کی رہنے والی ہو؟'

لڑکی نے آنکھوں سے آگ برساتے ہوئے جواب دیا 'آپ ہی بتایئے نا میں کہاں کی رہنے والی ہوں؟ اگر میں ہوں تو کہیں نہ کہیں کی رہنے والی تو ہوں گی'۔

داروغا صاحب کو اب لڑکی سے باتیں کرنے میں پھر لطف آنے لگا تھا۔ انھوں نے سوچا، کم بخت ہے بدتمیز، مگر کیا انداز معشوقانہ ہے۔ بولے 'مجھے تو تم دلّی کی رہنے والی نظر آتی ہو'۔

'دلّی میں میرے چاہنے والوں کی کمی نہیں۔ اب بھی وہاں چلی جاؤں تو ہزاروں کی بھیڑ لگ جاتی ہے لیکن مجھے وہاں سے نکالا مل چکا ہے، میں نے لاکھ کہا کہ میں جس کی سفارشی چٹھی کہو لا سکتی ہوں۔ ڈاکٹر تاراچند سے میرا پرانا رشتہ تھا شنکر صاحب مجھے اپنے ہاں رکھنے کو تیار تھے۔ گوپی ناتھ امن کے ہاں میں رہ سکتی تھی۔ جگن ناتھ آزاد اور پرکاش پنڈت مجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار تھے لیکن دلّی کے داروغا نے جو بالکل آپ جیسا تھا، میری ایک نہ سنی اور مجھے نکال کر ہی دم لیا۔ دلّی میں اب میرا کہاں ٹھکانا؟'

داروغا نے یہ سب غیر معروف نام مشتبہ لوگوں کی فہرست میں لکھ لیے۔ پھر بولے 'ضرور تم نے کوئی حرکت ہی ایسی کی ہوگی۔ پھر تم یوپی کیوں نہیں چلی گئیں؟'

'جاتی کیا، میرا گھر یوپی میں بھی تھا۔ الہ آباد اور لکھنؤ پر تو میرا خاص حق تھا۔ سرتیج بہادر سپرو اور پنڈت موتی لال کی گود کی کھیلی ہوئی ہوں۔ جواہر لال نہرو میرے بچپن کے دوست تھے۔ پریم چند تو بڑے پاکباز تھے، بڑا معصوم سا خاموش سا پریم تھا ان کو مجھ سے۔ آنند نرائن ملاّ سے میرے پرانے تعلقات ہیں۔ رام لال میرے بڑے چہیتے ہیں اور فراق صاحب کو تو مجھ سے ایسا لگاؤ تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر مجھے گھر میں رکھنے کو تیار تھے مگر وہاں کے داروغا نے آوارہ گردی اور بدچلنی کے الزام میں میرا چالان کر دیا اور اتر پردیش سے نکل جانے کو کہا لیکن مجھے ایک خوشی ہے۔ مجھے گھر سے نکال کر جس کو گرہستی سونپی گئی وہ میری ماں جائی بہن ہے، جس

سے میں اب بھی پیار کرتی ہوں، چاہے وہ مجھے سوکن سمجھ کر پہچاننے سے بھی انکار کردے'۔

داروغا نے کہا' بہار تو یو پی کے پڑوس میں ہی ہے، وہاں گھر بنا لیتیں'۔

'گئی۔ بہار بھی گئی' لڑکی نے جواب دیا، اس کے انداز میں بڑی تلخی تھی۔ وہاں بھی میرے چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی، ایک بیچ میل کپڑے والے نے تو مجھے بلایا بھی۔ کہنے لگا، تم کو گھر مکان، عزت سب دوں گا۔ پہلی بیوی نہیں تو دوسری بیوی بنا کر رکھوں گا۔ نکاح نامے پر دستخط ہوں گے، قاضی الوقت کے کہ اس کو پانچ پارٹیوں نے مقرر کیا ہے، تینتیس نکتے والا متحدہ پروگرام چلانے کے لیے مگر بھلا ہو ایک مہاشے کا۔ ان کو عین وقت پر ہندو کوڈ بل یاد آیا اور انھوں نے اعلان کیا کہ ہندو صرف ایک شادی کر سکتا ہے۔ دوسری شادی غیر قانونی ہوگی۔ سو مہاشے جی کی مہربانی سے میں بہار سے بھی نکالی جارہی ہوں اگر آخری وقت میں لال کپڑے والے نے مجھے بچایا نہیں'۔

'آندھرا کیوں نہیں گئیں؟' داروغا نے طنز بھرے لہجے میں کہا' حیدرآباد کا کوئی نواب گھر میں ڈال لیتا'۔

لڑکی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا' ایک زمانہ تھا، حیدرآباد میں بھی میرا گھر بنجارہ ہل پر تھا۔ نظام حیدرآباد اور ان کے وزیر اعظم مہاراجا کشن پرشاد دونوں کی نظر عنایت مجھ پر تھی۔ میں سچ مچ راج کرتی تھی مگر وہاں خود مجھ سے بھول ہوئی۔ نوابوں اور رئیسوں کے محلوں کے عیش و عشرت میں پڑ کر میں عوام کی زندگی اور ان کے تقاضوں سے بے خبر اور بے تعلق رہی۔ سو جب نظام کی نظامیت اور جاگیرداروں کی جاگیرداری ختم ہوئی تو ساتھ ہی مجھے بھی بیگم کے درجے سے ہٹا کر معمولی لونڈی کا درجہ دے دیا گیا۔ شاید میرے غرور کی یہی سزا تھی'۔

'تو پھر پنجاب چلی جاتیں'۔ داروغا نے آنکھ مار کے کہا' وہاں کے جیالے جوانوں میں تو تمھاری جیسی طرح دار لڑکی کی بڑی مانگ ہوتی'۔

'میں بھی یہی سمجھتی تھی'۔ لڑکی نے کہا اور اس کے چہرے پر خوشگوار یادوں کی مسکراہٹ کھل اٹھی۔ جیسے کوئی دوشیزہ اپنی زندگی کے پہلے بوسے کو یاد کررہی ہو۔ پھر بولی' پنجاب والے ہیں بھی بڑے مہمان نواز۔ میری بڑی خاطریں ہوئیں۔ ادیب، شاعر، پروفیسر، ایڈیٹر، جس کو دیکھو میرا

ہی دیوانہ تھا، مگر وہاں بھی وہی ہوا۔ دو نئی چہیتیاں پیدا ہو گئیں۔ میں تو ان دو سوکنوں کے ساتھ بھی بنا پا قائم کر کے عزت اور آرام سے رہ سکتی تھی، مگر میرے پنجابی پریمی نے مجھ سے کہا 'تم غضب کی حسین ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں اب بھی تمھیں ہی چاہتا ہوں، یقین نہ ہو تو دیکھ لو میری محبت کے اعلان اخباروں میں چھپے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر اشتہاروں کی شکل میں لگے ہوئے ہیں لیکن کیا کروں ماں باپ کا حکم ماننا بھی ضروری ہے۔ ذات برادری سے ڈر لگتا ہے۔ کل بہنوں کی شادی بھی کرنی ہے، اس لیے میں تمہیں باقاعدہ بیاہ کر کے قانونی بیوی تو بنا نہیں سکتا مگر ویسے محبت میں تم سے کرتا رہوں گا..... سو مجھے پنجاب بھی چھوڑنا پڑا اور میرے ساتھ میرے کئی پنجابی پریمیوں نے بھی اپنا وطن چھوڑ دیا۔ کہنے لگے 'جہاں کہیں بھی تم جاؤ گی، ہم وہیں چلیں گے۔ ہمارا تمھارا زندگی بھر کا ناطہ ہے' سو میں ان کے ساتھ بمبئی چلی آئی۔ یہاں کی فلمی دنیا میں مجھے ہاتھوں ہاتھوں لیا گیا۔ مارواڑی سیٹھ، گجراتی بیوپاری، پارسی بزنس مین، سندھی فائینانسر، پنجابی اور بنگالی اور مہاراشٹرین ڈائریکٹر سب مجھ پر عاشق ہو گئے۔ ساحر، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، مجروح، ملک راج آنند، راجندر کشن اور آغا جانی کشمیری نے مجھے فلمی مکالمے ادا کرنے سکھائے۔ فلمی گیت مجھ سے گوائے اور پھر میرا بناؤ سنگھار کر کے مجھے فلم کی ہیروئین بنا دیا۔ میری شہرت ہندوستان کے کونے کونے میں ہو گئی۔ مدراس اور تری وندرم اور کلکتہ اور دو جے واڑہ میں 'چشم بددور' میرے حسن کے چرچے ہونے لگے اور لوگ میرے نام کی قسمیں کھانے لگے۔ روپے کی ریل پیل ہو گئی۔ وہاں میں خوش حال ضرور تھی، مگر خوش نہیں تھی۔ ہزاروں لاکھوں کی دل داری سے میری کیا تسکین ہوتی؟ مجھے تو گھر بسانے کی آرزو تھی۔ داروغا صاحب، مجھے روپیہ نہیں چاہیے، نام نہیں چاہیے، شہرت نہیں چاہیے، مجھے عزت کی زندگی چاہیے۔ مجھے دردر کی ٹھوکریں کھانا منظور نہیں ہے.....' باوجود ضبط کے لڑکی رو پڑی۔

داروغا نے ٹیلی فون اٹھا کر ایک نمبر ملایا اور بڑے ادب اور قاعدے سے اپنے افسر سے بات کرنے لگے 'یس سر۔ نو سر۔ مشتبہ حالات میں ایک لڑکی پکڑی گئی ہے..... جی ہاں، اسے بارڈر کے قریب سے ہی پکڑا ہے۔ یس سر۔ یہی شبہ مجھے ہے..... نام تو بڑے بڑے لوگوں کے لیتی ہے۔ جیسا اکثر ایسے لوگ کرتے ہیں۔ یس سر۔'' انھوں نے چونگا اٹھا کر رکھ دیا۔ کچھ سوچ کر

داروغا نے اپنا قلم واپس رکھ دیا، رجسٹر بند کر دیا، اپنی پیٹی کستے ہوئے کھڑے ہو گئے اور کہا 'اب سب معاملہ صاف ہو گیا'۔

لڑکی آنسو پی کر بولی 'تو اب میں جا سکتی ہوں؟'

'ہاں' داروغا نے کہا 'تم جا سکتی ہو'۔

داروغا کے بولنے کے انداز میں ایک مشتبہ طنز تھا جس سے گھبرا کر لڑکی نے پوچھا: 'مگر کہاں؟ میں نے بتایا کہ میں اپنے وطن میں شرنارتھی ہوں۔ میرا گھر ہر جگہ ہے اور کہیں نہیں ہے، جاؤں تو کہاں جاؤں؟'

داروغا نے دانت پیس کر کہا 'جہاں سے آئی ہو'۔

'جہاں سے آئی ہوں؟' لڑکی نے بھولے پن سے دہرایا۔

'دکن والے کہتے ہیں میرا جنم دکن میں ہوا تھا مگر......'

'دکھن میں نہیں تم اتر میں جاؤ گی'۔

'اُتر میں؟'

'ہاں اور کیا؟ پاکستان اتر ہی میں تو ہے'۔

'پاکستان؟ پاکستان سے میرا کیا تعلق ہے؟'

'بہت گہرا۔ اور بہت سیدھا سادھا۔ تم پاکستانی جاسوس ہو!'

'میں اور پاکستانی؟ میں اور پاکستانی جاسوس؟' لڑکی کی حیرت غصّے میں تبدیل ہوتی گئی 'نہیں، میں ہندوستانی ہوں مجھے تم؟ ہندوستانی!

تم میرا حق مجھ سے چھین سکتے ہو، مجھے بے گھر بنا سکتے ہو، مگر تم مجھے غدار کی گالی نہیں دے سکتے'۔

'سپاہیو!' داروغا کی آواز گونجی 'اس لڑکی کو اٹھا کر لے جاؤ اور سرحد پر جا کر اسے پاکستانی سپاہیوں کے حوالے کر دو۔ کہنا تمھارا مال تمھیں لوٹا رہے ہیں، اسے حفاظت سے سنبھال کر رکھیں، اب کے ادھر آئی تو اس کی زبان کاٹ لی جائے گی'۔

سپاہی اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے اور لڑکی پیچھے دیوار

کی طرف ہٹ رہی تھی۔

'نہیں، نہیں۔ میں جاسوس نہیں ہوں'۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بڑھتی جارہی تھی، جیسے ہرن کو شکاری کتوں نے گھیر لیا ہو۔ وہ جانتی تھی اس کی موت قریب آپہنچی ہے، مگر پھر بھی وہ بولے جارہی تھی 'میں جاسوس نہیں ہوں، میں ہندوستانی قوم پرست ہوں۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' میں نے ہی لکھا تھا۔ یقین نہیں آتا تو میرے کیریکٹر سرٹیفکیٹ پڑھ لو۔ دیکھو یہ مہاتما گاندھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس پر پنڈت جواہر لال کے دستخط ہیں۔ یہ شاستری جی کی چھٹی ہے'۔ اس کے کرتے کے اندر سے خطوں کا ایک پلندہ نکل آیا تھا۔ 'یہ دیکھو شہید بھگت سنگھ کا خط۔ انقلاب میری گودی میں کھیلا ہے۔ رام پرشاد بسمل نے پھانسی کے تختے پر میرا ہی ترانا گایا تھا'۔

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی، کیونکہ ایک سپاہی کے ہاتھ نے اس کا منہ بند کردیا تھا۔ چاروں سپاہیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں پکڑے اور اُسے اٹھا کر باہر لے گئے۔

داروغا نے اپنی خضاب سے کالی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا 'آوارہ چھنال کہیں کی! ہمارے نیتاؤں اور شہیدوں کو بدنام کرتی ہے!''

سرحد کے ادھر دو ہندوستانی فوجی کھڑے پہرا دے رہے تھے اور اُدھر دو پاکستانی فوجی۔ داروغا کے سپاہی لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور منہ بند کر کے لائے تھے۔ عین بارڈر کے کنارے لڑکی کو کھڑا کر کے انھوں نے پاکستانیوں سے کہا 'لو یہ اپنا مال! تمھارا جاسوس تمھیں لوٹا رہے ہیں'۔

پاکستانی فوجیوں نے لڑکی کی طرف دیکھا، مگر ان کے چہرے پر پہچان کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے۔ لڑکی نے بھی دیکھ لیا کہ ان دونوں میں سے ایک بھی اس کا پریمی نہیں ہے۔ ایک سندھی تھا اک بلوچی۔

اور اسی وقت ہندوستانی بارک کی طرف سے ایک ریڈیو کا پروگرام سُنائی دیا۔ لڑکی نے کہا: 'سنو یہ میری آواز ہے'۔

ریڈیو پر ساحر کا گیت بج رہا تھا۔ 'وہ صبح کبھی تو آئے گی'۔

اور اسی لمحے میں لڑکی کو ایک ہندوستانی فوجی نے پہچان لیا مگر وہ ڈیوٹی پر تھا، بول نہیں سکتا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے لڑکی سے اپنی ہمدردی اور مجبوری کا اظہار کیا۔

لڑکی نے فوجی کی طرف دیکھ کر نظروں سے کہا: 'جوان تم ہی مجھے بچا سکتے ہو، ورنہ یہ لوگ مجھے ہندوستان سے نکال دیں گے'۔

جوان ڈیوٹی پر تھا، بول نہیں سکتا تھا، ایک سیاسی قیدی سے ہمدردی کا اظہار نہیں کر سکتا تھا، بغیر حکم کے اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا، مگر اس کی آنکھیں بے اختیار اس بجلی کے سوئچ پر گئیں جو اس کے برابر ہی میں لگا ہوا تھا۔

داروغا کے سپاہیوں نے آخری بار کہا: 'پاکستانیو، لیتے ہوا اپنے جاسوس کو کہ اسے دھکے مار کر تمھاری سرحد میں پھینک دیں'

ابھی وہ لڑکی کو دھکا دے نہیں پائے تھے کہ ایک دم اندھیرا ہو گیا۔ داروغا کے سپاہیوں نے اندھیرے میں ٹٹولا تو لڑکی غائب تھی مگر کہیں قریب سے ہی لڑکی کی آواز آ رہی تھی 'تم نے مجھے وطن ہی میں شرنارتھی بنا دیا۔ ہر گھر جو میرا تھا مجھ سے چھین لیا، مگر اب میں نے ہندوستانی عوام کے دل میں گھر کر لیا ہے اور اس گھر سے تم میری بے دخلی نہیں کرا سکتے'۔

اُس اندھیری رات میں ہندوستانی بارڈر پیٹرول نے ایک سائے کو حرکت کرتے دیکھا تو بندوق تان کے للکارا! HALT WHO GOES THERE (ہوشیار، کون جاتا ہے؟)

جواب میں ایک لڑکی کی آواز آئی: 'اُردو'۔

اور رات کے سناٹے نے اس آواز کو آوازِ بازگشت بنا دیا۔

'اُردو۔ اُردو۔ اُردو'

(ماہنامہ شمع، نئی دہلی اکتوبر 1967)

○

# بھوپال کی کیپٹن سلمیٰ

فلک نما پیلس ہوٹل بھوپال کا بہترین ہوٹل ہے۔ ساتھ میں کھانے کا بھی بہترین انتظام ہے مغلئی کھانا تو ملتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ چینی اور انگریزی کھانے کا بھی انتظام ہے۔ دہاں میں اپنے میزبانوں کے ساتھ لنچ کھانے گیا تو کھڑکی میں سے مشہور بھوپال تال کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ کھڑکی کے باہر تال تھا۔ اٹھارہ کیلو میٹر لمبا چوڑا، چھوٹا سا سمندر نظر آتا تھا سوائے اس کے کہ ساحل پر ریت نہیں تھی۔

مگر آسمان پر برساتی بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے تال میں زیادہ پانی کی امید کی جاسکتی تھی۔ میں نے اسی صبح کاربائیڈ فیکٹری کے منحوس نظارے کیے تھے۔ وہ پتھر کی مورتی بھی دیکھی تھی جو جھونپڑیوں کے بیچ ایک کھڑی ہوئی ماں کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ جس کی گود میں ایک مرا ہوا بچہ تھا۔ ایک اور ذرا بڑا بچہ اس کی ساڑی کے آنچل سے لپٹا ہوا یا لٹکا ہوا ہے۔

پتھر میں احساسات کی جھلک بڑی مشکل سے آتی ہے۔ مگر ان مورتی کاروں نے ماں کے احساسات کو پتھر میں ڈھال دیا ہے۔ دونوں کا دھیان اس مردہ بچے کی طرف ہے۔ زندہ بچے کو بھروسہ ہے کہ ساڑی کے نیچے سے اس کا مردہ بھائی اٹھ بیٹھے گا۔ زندہ ہو جائے گا۔ ماں بھی شاید اسی امید میں ہے کہ اس کی گود کا بچہ انگڑائی لے کر سیدھا ہو جائے گا۔

پتھر کی مورتی خوبصورت اور نازک نہیں ہے۔ مندر کی مورتیوں کی طرح تراشی ہوئی اور بے جان ہے جیسے تمام دنیا کی ماؤں اور ان کی ممتا کو نچوڑ کر یہ مورتی بنائی گئی ہے۔ چھاتیاں بڑی بڑی اور دودھ سے بھری ہوئی ہیں مگر یہ دودھ کس کام کا؟ اس میں کاربائیڈ کا زہر بھرا ہوا ہے۔ جو زہر ماں کی آنکھوں میں ہے۔ بچے کی نس نس میں ہے۔ وہ یہ زہریلا دودھ پی کر ہی تو بے جان ہو گیا تھا۔

کیپٹن سلمٰی کو پہلی نظر میں میں نے پہچان لیا تھا۔ جس نے اسے ایک نظر دیکھا تھا اس کو پتھر کی مورتی دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دونوں کو ایک ہی پتھر سے تراشا گیا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں سارے جہاں کا درد سمٹا ہوا تھا۔ دونوں کی چھاتیوں میں ساری دنیا کی ماؤں کا دودھ اتر آیا تھا۔ وہ بچہ تھا جو سب مردہ بچوں کی علامت تھا۔

یہ پتھر کا مجسمہ ایسا نازک اور سبک نہیں تھا جیسے مندروں میں رادھا کے، سیتا کے، لکشمی کے اور سرسوتی کے مجسمے ہوتے ہیں۔ بیشک اپنے بچے کی موت پر فریاد کر رہی تھی مگر فریاد کے ساتھ، غصے کے ساتھ ایک چیلنج بھی تھا۔ ایک للکار تھی۔ ایک نعرہ اس فیکٹری کے امریکن مالکوں کے خلاف جس کے کروڑوں روپے منافع کمانے میں اس کے معصوم بچے اور ہزاروں کی جانیں گئی تھیں اور یہ موت بنا تکلیف خاموش نہیں تھی۔ کھانس کھانس کے جان دی تھی سب نے۔ سوائے اس کے ننھے بچے نے جسے صرف ایک ہچکی آئی تھی اور وہ ختم ہو گیا تھا۔ زہر کا اثر اتنا شدید تھا اس پر کہ ایک منٹ میں کام تمام ہو گیا۔

میں نے اس دن اپنے کیمرے سے تصویریں کھینچی تھیں۔ پوری روشن مورتی کی، کئی زاویوں سے۔ اس کے سر کی جو اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گود کے مرے ہوئے بچے کی، پیچھے چلتے ہوئے ماں کی ساڑی کا نچلا پلو پکڑے ہوئے بچے کی۔ غرض یہ ریکارڈ تھا میرے کیمرے میں۔ اس وقت جب میں فلک نما پیلس ہوٹل میں داخل ہوا اور ایک عورت نے میرا استقبال کیا۔

''آئی ایم کیپٹن سلمٰی سر!'' اس عورت نے اپنا تعارف کرایا تھا۔

''کیپٹن سلمٰی؟'' میں نے تعجب سے کہا تھا۔ پہلی بار میں نے ایک عورت کو اپنا تعارف کراتے ہوئے ''کیپٹن'' کہتے ہوئے سنا تھا۔

یہ نہیں کہ میں اُسے ایک آرمی کیپٹن سمجھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہوٹلوں میں بھی کیپٹن ہوتے ہیں۔ ہوٹل یا ریستوراں کے اسٹاف کے انچارج، مگر وہ سب مرد ہوتے ہیں۔ ایک عورت کو اپنے آپ کو "کیپٹن" کہتے ہوئے میں نے پہلی بار سنا تھا۔

میں نے ڈائننگ روم میں جا کر میز پر اپنا کیمرہ رکھ دیا۔ "کیپٹن"، سلمٰی نے وہ کیمرہ ہلکے سے اٹھا کر ایک دوسری میز پر رکھ دیا۔

میں نے کہا "میں اس کیمرے کو اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ اس میں کچھ اہم تصویریں ہیں۔"

اس نے موقع غنیمت جان کر سوال کیا "کیا بھارت بھون کی تصویریں ہیں؟"

"نہیں اس سے کہیں زیادہ اہم اور خطرناک تصویریں ہیں"

"اہم اور خطرناک تصویریں؟" اس نے میرے ہی الفاظ کو دوہرایا۔

"جی ہاں، اہم اور خطرناک؟ اس میں ایک عورت کی تصویر ہے۔"

"کیا کوئی بھوپالی حسینہ مل گئی تھی؟" اس نے (جو خود ایک بھوپالی حسینہ تھی) پوچھا۔

"ہاں، اسے بھوپالی حسینہ بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"اس لیے کہ وہ ایک پتھر کی مورتی ہے جو کار بائیڈ فیکٹری کے سامنے کھڑی ہے اور کھڑی رہے گی۔ جب تک اس کے مطالبات پورے نہیں ہوں گے۔

"اچھا تو آپ اس حسینہ کی بات کر رہے ہیں۔" اس نے کسی قدر لاپروائی سے کہا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

مجھے ناولسٹ اور کہانی کار کی حیثیت سے وہ دلچسپ لگی۔ اگر چہ حسین نہ لگی۔ اگر وہ برا نہ مانے تو میں کہوں گا کہ جتنی جاندار عورتیں میں نے دیکھی ہیں ان میں سے وہی اس مورتی سے میل کھاتی تھی۔

"آپ کیا کھائیں گے؟"

"کچھ نہیں؟" میں نے جواب دیا "اس مجسمہ کو دیکھنے اور ان جھونپڑیوں کو دیکھنے کے بعد تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"تو آپ چکن سوپ لے لیجیے گا۔"

اچھا خیال ہے۔ مگر اس میں بو نہیں ہونی چاہیے۔

''بو کیسی؟ چکن کی خوشبو تو ہوگی ہی۔''

''وہ چلے گی۔ میرا مطلب اس بو سے تھا جو میرے کمرے میں سے آرہی ہے۔ جب سے میں نے تصویریں کھینچی ہیں۔''

وہ بو نہیں ہوگی۔ اس نے یقین دلایا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

پانچ منٹ بعد ہاتھوں میں چکن سوپ کا باؤل لیے آرہی تھی۔ ''سوپ سونگھ لیجیے۔'' اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ میں نے پہلا چمچ لینے سے پہلے اس کو سونگھا۔ بو نہیں تھی۔ چکن کی بو بھی نہیں تھی۔

وہ مایوس ہو کر چلی گئی۔

میں نے چکن سوپ پی لیا۔ پھر بل پر دستخط کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دروازے پر ایک چٹ لکھی ملی۔ پنسل سے لکھا تھا۔ ''اگر آپ گیس ٹریجڈی کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو وہ تفصیلات DETAILS دے سکتی ہوں جو اب تک کسی جرنلسٹ کو نہیں ملی ہیں۔ میری ڈیوٹی چار بجے سے آٹھ بجے تک OFF رہتی ہے۔ کیپٹن سلمٰی۔''

میں نے سوچا چلو ان کی رام کہانی بھی سن لیں۔ دلچسپ ہی رہے گی۔

ٹھیک چار بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ دھیمی دبی دبی سی۔ میں نے سوچا 'کیپٹن سلمٰی اب گھبرا رہی ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے جو لڑکی کھڑی تھی وہ 'کیپٹن سلمٰی' نہیں تھی مگر اس کی شکل جانی پہچانی سی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس عورت کو آج ہی کہیں دیکھا ہے مگر آج تو دو عورتیں میں نے دیکھی تھیں۔ ایک تو وہ مورتی تھی اور ایک 'کیپٹن سلمٰی' اگر یہ 'کیپٹن سلمٰی' نہیں ہے تو یہ مورتی والی عورت ہی ہوگی۔

اس کا بدن ایک اول جلول پوشاک میں لپٹا ہوا تھا۔ یہ ویسی ہی ڈھیلی ڈھالی ساڑی تھی جو وہ مورتی پہنے ہوئے ہے۔ گود میں ویسے ہی ایک مردہ بچہ؟ اے خدا! میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ تم تو ریشمی شلوار قمیض پہنے ہوئے کیپٹن سلمٰی تھیں۔ تم بالکل......''

''مورتی والی ساڑی پہنے ہوئے ہوں۔ بچہ بھی گود میں ہے......''

"یہی وہ بچہ ہے جو اس وقت تمھاری گود میں تھا؟"

"کیا آپ مجھے قبر چور سمجھتے ہیں، جو ایک مردہ بچہ اکھاڑ کر لا رہی ہے۔ آپ کو IMPRESS کرنے کے لیے؟" اس نے جواب دیا۔ "یہ تو ایک گڑیا ہے جو بھارت بھون کی نائک منڈلی سے میں نے ضرور چرائی ہے۔"

'اندر آ جاؤ، میں نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ "ورنہ لوگ سمجھیں گے میں تمھیں اندر آنے کے لیے پٹا رہا ہوں۔"

اندر کمرے میں آ کر وہ آرام سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ گڑیا (مردہ بچہ) اس نے برابر میں رکھ لیا۔

"پوچھیے کیا پوچھنا ہے؟"

"تم اس رات بھی یہی بچہ گود میں لے کر بھاگ رہی تھیں؟"

"نہیں! بھاگ نہیں رہی تھی۔ میں اس رات کو ڈاکٹر وکاجی کے میٹرنٹی ہوم میں تھی۔ میرا بچہ اسی رات پیدا ہوا تھا۔ جب میرا شوہر میرے پاس تھا۔"

"تم شادی شدہ ہو؟"

"تھی۔ جب تک یہ نحوست بھوپال پر نازل نہیں ہوئی تھی۔"

"کیا کرتی تھیں تم اُس وقت؟"

"کچھ نہیں کرتی تھی۔ بیکار رہتی تھی۔ اپنے شوہر کے لیے کھانا پکاتی تھی۔"

"اور تمھارا شوہر کیا کرتا تھا؟"

"وہ انجینئر تھا۔ کاربائیڈ فیکٹری میں۔ جہاں وہ امریکہ میں بھرتی ہوا تھا۔ وہ لوگ بہت خوش ہوئے تھے یہ جان کر کہ وہ بھوپال میں اپنی فیکٹری قائم کرنے جا رہے ہیں اور بھوپال کا ہی ایک لڑکا وہاں کیمیکل انجینئرنگ پڑھ رہا ہے اور اس وقت ان کی امریکہ کی فیکٹری میں پریکٹیکل ٹریننگ حاصل کرنے آیا ہے۔ میرا شوہر بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ ہزاروں میں ایک۔ آخر وقت تک امریکن لڑکیاں اس کو خط لکھا کرتی تھیں اور شادی کی خواہش مند تھیں۔ ایک تو ہماری شادی کے بعد بھی اس کے ساتھ مسلمان ہو کر دوسری بیوی بن کر رہنے کو تیار تھی۔"

''کیا آپ مسلمان ہیں؟''

''جی ہاں! خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے۔''

''بدقسمتی سے کیوں؟''

''کیونکہ اگر میں ہندو ہوتی تو شوہر کی موت کے بعد 'ستی' ہو جاتی۔''

''بڑی بھول کرتیں۔''

''کیوں؟''

'اس لیے کہ آپ کی زندگی اچھے کاموں کے لیے ہے۔ آپ ہوٹل میں کام کرتی ہیں۔ بھوپال کی ٹریجڈی سے متاثر مسافروں کو چکن سوپ پلاتی ہیں جن سے ان کی جان بچ جاتی ہے۔ اگر انھیں فلک نما اسپیشل مرغ مسلم شاہی پلاؤ والا کھانا کھانا پڑتا تو ان کے ہارٹ ہی فیل ہو جاتے۔'

'معاف کیجیے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کا ہارٹ فیل ہونے والا ہے۔'

'ورنہ آپ سوپ مجھے نہ دیتیں۔'

'جی ہاں! میرا مطلب ہے' جی نہیں، اور پھر وہ ہنس پڑی۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس کو میں نے ہنستے دیکھا تھا۔ پہلی بار اور آخری بار۔

'تو اپنے شوہر کے بارے میں بتایے۔ کیا گزری؟'

'اس کا نام تھا' عالم خان' امریکہ سے جب آیا تو وہ فیکٹری میں انجینئر ہو گیا۔ دو نمبر کا انجینئر تھا وہ۔ رات دن فیکٹری کے کام میں لگا رہتا تھا۔ ایک چھٹی کے دن ہماری ملاقات بھارت بھون کے اوپن ایئر تھیٹر میں ہو گئی۔ ناٹک تھا A MIDSUMMER NIGHT'S DREAM ہم قریب قریب کی پتھر کی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں ایک سیٹ خالی تھی۔ اس نے مجھے اکیلی پا کر پوچھا۔ آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے قریب والی سیٹ پر آ جاؤں۔ میں نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پھر میں نے ایک انٹرول میں اس سے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں؟''

''جواب ملا جھک مارتا ہوں۔''

''میں نے پوچھا'' وہ کیا ہوتا ہے؟''

''کاربائیڈ فیکٹری میں انجینئر ہونا اور POISON GASS بنانا۔ یہ جھک مارنا نہیں تو کیا

ہے۔ اگر ایک دن کہیں سے یہ گیس نکل گئی تو سارے شہر کو خالی کر دے گی۔''

''اتنا خطرناک کام کیوں کرتے ہیں آپ؟''

''روٹی کمانے کے لیے۔''

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

''حمیدیہ کالج میں پڑھتی ہوں۔ یہ بھی ایک قسم کا جھک مارنا ہی ہے۔''

''جھک مارنا کیوں ہے؟''

''بابر نے کون سے سنہ میں پانی پت کی جنگ جیتی؟'' اشوک نے اپنی کب لاٹھ بنائی؟'' کب اس کو قائم کیا۔ اور اس پر کیا لکھا۔ انگریزوں کا دور کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا؟ اور ایسی ہی بکواس جو ہسٹری میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ سب جھک مارنا نہیں تو کیا ہے؟ ایم۔ اے میں پہنچ گئی ہوں اور چکن سوپ بنانا بھی نہیں آتا۔ مجھے تو کھچڑی بنانی بھی نہیں آتی۔

کھچڑی پر یاد آیا دادی لتاں کی کہانی یاد ہے؟ ایک تھا چڑا ایک تھی چڑیا۔ چڑیا لایا چاول کا دانہ، چڑیا لائی دال کا دانہ۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی اور خوب مزے سے کھائی۔ بائی دی وے میرا مطلب ہے کہ آپ کا خیال شادی کے بارے میں کیا ہے؟ کیا یہ بھی بکواس ہے؟ یا چڑے چڑیا کی کہانی؟

شادی تو چڑے چڑیا کی کہانی ہے۔ مگر میں چونچ مارنے والی چڑیا ہوں۔ یہ یاد رکھنے والی بات ہے۔

اتنے میں ناٹک پھر شروع ہو گیا اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ جب یہ شیکسپیئر کا رومانس چل رہا تھا تو نجانے کیسے عالم کے ہاتھ جو نرم نہیں، انجینئر کے کھردرے ہاتھ تھے، میرے ہاتھوں میں آ گئے۔ ان ہاتھوں والے کو کوئی 'چڑا' نہیں کہہ سکتا تھا مگر مجھے ان سے کھیلنا پسند آیا۔

''کیوں، کھیل پسند آیا؟'' ناٹک ختم ہوتے ہی عالم نے پوچھا۔

''کون سا کھیل؟'' میں گھبراہٹ میں بھول گئی تھی کہ ناٹک کا ذکر تھا کہ ہاتھوں کے کھیل کا، جو واقعی دلچسپ تھا۔

''بہت مزہ آیا۔'' میں نے ایک جملہ کہا جو دونوں کھیلوں پر برابر ٹھیک لگتا تھا۔

''سو اگلے ہفتے ہماری شادی ہوگئی۔ میرے والد صاحب جو نواب صاحب کے مصاحب اور شکاری تھے۔ وہ تو ریاست کے مرج MERGE ہونے کے چند مہینے بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ امّاں ابھی زندہ تھیں مگر رات دن روزہ نماز میں مشغول رہتی تھیں۔ وہ یہ سوچ کر کہ ان کا ہونے والا داماد امریکہ کا پڑھا ہوا انجینئر ہے اور امریکن فیکٹری میں ہی بائیس سو روپے ماہوار کماتا ہے، خوش ہوئیں۔

شادی کے تیسرے دن ہی میں نے عالم سے پوچھا: ''ہمیں اپنی فیکٹری نہیں دکھائیں گے؟''

''فیکٹری بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے؟''

''کیوں نہیں؟ میں تو ہمیشہ سے فیکٹری دیکھنا چاہتی تھی۔ فیکٹری میں بڑی بڑی مشینیں ہوں گی۔ بہت سے انجینئر اور ان سے بھی زیادہ مزدور ہوں گے۔ کیا تمھارے یہاں عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ میں ان سب کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

میں اپنی ضد سے فیکٹری دیکھنے گئی۔ مزدوروں میں مرد بہت تھے مگر عورتیں بہت کم کام کرتی نظر آئیں۔ صرف دو اور وہ بھی کلرکی کے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے گھوم گھام کر فیکٹری دیکھی۔ گیس بھرے گولوں میں مجھے دلچسپی لگی۔ ایک گولے میں سے بڑی سخت بدبو آ رہی تھی۔ میں نے ساڑی کے پلّو سے ناک بند کر لی اور پھر فیکٹری اور ان گولوں کی بدبو کو بھول گئی لیکن یہ میری اور میرے شہر کی بدقسمتی تھی۔

اگلے مہینے میں حاملہ بن گئی۔

''حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہمارا خوش قسمتی کا دن تھا۔ جب تم ہماری فیکٹری دیکھنے آئی تھیں۔''

''تمھاری فیکٹری زندہ باد!'' میرے منہ سے نکلا۔ معلوم نہیں کہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اس فیکٹری کو زندہ باد کہا تھا۔''

دسمبر کے آخری ہفتے میں لیڈی ڈاکٹر نے سلمٰی کو تاریخ دی تھی اور اس سے ہفتہ بھر پہلے ہی اس کو داخل کر لیا گیا کیونکہ اسے دو تین شکایتوں کی وجہ سے کچھ الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ عالم بھی اپنی بیوی کی طرف سے پریشان تھا۔ جیسے جیسے دن قریب آ رہے تھے وہ زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔ ادھر

فیکٹری میں بھی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایک گیس کے بڑے گولے میں چھید ہو گیا تھا اور اس میں سے گیس رس رہی تھی۔ اس کو بند کرنے میں ایک مزدور کی جان گئی جسے ایک عام حادثہ قرار دیا گیا۔ اگلی رات کو ابھی عالم اسپتال نہیں آیا تھا، فیکٹری میں ہی تھا کہ بھگدڑ مچی۔ مزدوروں اور دوسرے کام کرنے والوں کی بھاگ دوڑ کو اس نے روکنا چاہا۔ سب مل کر چلاّئے۔

"عالم صاحب! گیس کا تو اب فوارہ بن کر نکل رہا ہے۔ آپ بھی بھاگئے۔ مگر عالم اس وقت انجینئر انچارج تھا۔ ڈوبتے ہوئے جہاز کا کپتان تھا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔"

جب سب مزدور بھاگ گئے اور اپنی جھونپڑیوں میں گھس گئے تب ہوا جھونپڑیوں کی طرف چلی رہی تھیں۔ جب عالم نے کسی نہ کسی طرح اوپر بڑھ کر رستی ہوئی گیس کا رِسنا بند کیا۔ اس کے گلے میں بھی خراش ہو رہی تھی اور نیند کی جھپکی بھی اس کو آ رہی تھی۔ پھر بھی اس کو اپنے آپ پر قابو رکھنا ہی تھا۔ کم سے کم اسپتال جانے میں 'کار میں' اس وقت دس منٹ لگیں گے۔ کار بھی بڑی بھاری امریکن کار تھی جو امریکہ سے عالم اپنے ساتھ لایا تھا۔ اب اس وقت وہ بھی سردی میں جمی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے اسٹارٹ ہو پائی۔ تب جا کر اپنے اوپر قابو پا کر کار کو دھیرے دھیرے چلاتے ہوئے عالم نے گیئر کو بدلا اور سنسان سڑک پر تیز کیا۔

اسپتال پہنچنے پر عالم بیوی کے کمرے کی طرف گیا۔ کمرے کو خالی دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر دوسرے پل ہی ایک نرس نے بتایا کہ آپریشن روم میں ہے کیونکہ ڈاکٹر نے بڑے آپریشن کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ کا بہت انتظار کیا۔ ابھی ابھی مجھے فیکٹری میں فون کرنے کو کہا تھا مگر آپ شاید وہاں سے نکل چکے تھے۔

یہ سن کر عالم آپریشن روم کی طرف چلا۔ راستے میں ایک دوسری نرس آتی ہوئی ملی جو ہاتھ میں تولیے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پکڑے ہوئی تھی۔

"آپ کو دیکھنے ہی جا رہی تھی۔" نرس نے کہا۔

مگر عالم نے چیخ کر کہا: "کیسی ہے میری بیوی؟"

"ہمت رکھیے۔ وہ بے ہوش ہے۔ مگر ابھی چند منٹ میں ہوش میں آ جائے گی۔"

"تو یہ کیا ہے؟"

آپ کا بچہ ہے۔'' یہ کہہ کر نرس نے تولیہ تھمایا تو عالم کو چکر آ گیا۔ وہ نیا پیدا ہوا بچہ ضرور تھا مگر اس کا نہیں تھا۔ یہ تو کسی شیطان کا بچہ لگتا تھا۔ نہ آنکھ، نہ کان، نہ چہرہ، نہ ناک۔ صرف ایک گوشت کا لوتھڑا ہی تھا۔'' تو یہ ہے ہمارا بچہ؟'' اسی وقت اسے نو مہینے پہلے کی، فیکٹری دیکھنے کی سلمٰی کی ضد یاد آ گئی۔ یہ زہر وہاں سے آیا تھا۔ عالم انجینئر تھا۔ وہ گیس کے نتائج سے واقف تھا مگر اس کی بیوی پر یہ اثر ہوگا اس زہریلی گیس کا، یہ خیال اس کو آتا تھا کہ اسے ایک چکر آ گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو اسی میٹرنٹی اسپتال میں برابر کے پلنگ پر اپنے شوہر کو سویا ہوا پایا۔

''یہ کیا ہوا عالم؟'' میں نے نیم بے ہوشی میں کہا۔

اس وقت تک عالم بے ہوش تھا۔ ایک بار اس کو کھانسی آئی تو آنکھ کھولی۔

''عالم یہ کیا غضب ہوا؟ یہ کس بات کی سزا دی ہے ہمیں خدا نے؟''

''ضد کرنے کی سزا ہے یہ۔ اس دن جب تم نے ضد کی تھی میری فیکٹری دیکھنے کی۔ مجھے تمھاری ضد کو پورا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ معمولی فیکٹری نہ تھی وہاں زہریلی گیس بن رہی تھی۔ وہاں تمھیں کسی حالت میں نہیں لے جانا چاہیے تھا۔''

''کیا یہ بچہ اسی سے ایسا پیدا ہوا ہے؟''

''ہاں اور کیا؟''

''اس کے کچھ دن بعد عالم بے چارے کا انتقال ہو گیا۔ وہ پہلا شہید تھا اس فیکٹری کا۔ گیس اس نے بہت سونگھی تھی۔ اس کے پھیپھڑوں میں اور جگر میں گیس ہی گیس بھری تھی۔ اس وقت سارے شہر کے ڈاکٹر عام لوگوں کی دیکھ بھال کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ کوشش بھی کی کہ اسے بڑے اسپتال میں لے جائیں مگر اس نے انکار کر دیا۔ اب مجھے وہاں لے جانا بیکار ہے۔ اب میں نہیں بچوں گا۔ میری یہی سزا ہے۔ مجھے اچھی نوکری چاہیے تھی نا؟ امریکیوں نے اچھی تنخواہ دی مجھے۔ ان کی دور بین نظر اس کارخانے پر امریکہ سے لگی ہوئی تھی۔ آج اس کو معلوم ہو گیا جو وہ چاہتے تھے۔

زہریلی گیس جو وہ گولوں میں بھر کر تمام دنیا میں پھیلا چکے ہیں تو اس کی بات کوئی نہیں مانے گا۔ اس سازش میں شریک ہونے کا میں بھی گنہگار ہوں۔ میں بھی مجرم ہوں...... میں بھی مجرم......

'بس اس کی آخری آواز یہی تھی۔'

'وہ مر گیا اور اس کے ساتھ میں بھی مر گئی۔'

'اب میں ایک انجینئر کی بیوہ نہیں تھی۔'

'پھر میں بھی اسی غریبوں کی جھونپڑی میں جا کر رہی۔'

'وہاں وہ مورتی کار آئے جو ایک مورتی بنانا چاہتے تھے۔ جب ایک ماڈل کی ضرورت پڑی تو میں نے اپنی خدمت پیش کر دی۔'

'اس نے کہا: ''آپ کا کوئی بچہ تو نہیں ہے گود میں لینے کے لیے؟

'میں نے کہا ایک بچہ تھا لیکن وہ اس گیس کا شکار ہو گیا۔'

''انھوں نے ایک موم کی گڑیا میری گود میں دے دی۔ میں نے کہا کہ اس کی آنکھیں پھوڑ دیجیے۔ اس کے کانوں میں روئی گھسا دیجیے۔ پھر میں اسے اپنا ہی بچہ سمجھوں گی۔''

''مورتی کاروں نے مان لیا۔ چار دن تک میں وہاں کھڑی رہی اور اپنے بچے کے بارے میں سوچتی رہی۔ بچے کے باپ کے بارے میں۔ ہائے میرا انجینئر کب آئے گا؟''

جب ماڈلنگ کا کام ختم ہو گیا اور میری مورت، میرا جسم، اور میرے احساسات بھی اس مورتی میں ڈھل گئے تب میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب میرے لیے کتنے دن باقی ہیں؟

''آپ اگر اپنا علاج ٹھیک سے کرائیں گی تو اپنی پوری عمر جی سکتی ہیں۔''

''میں پوری عمر جینا نہیں چاہتی۔ اسپتال میں ایڑیاں رگڑ کر۔''

''تب تو مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال مگر آپ جوان ہیں، شکل و صورت بھی اچھی ہیں۔ آپ کیوں جینا نہیں چاہتیں؟''

اس لیے کہ میں بھی مجرم ہوں۔ ایک برس کے لیے میں کوئی نوکری کر لوں گی۔

''میں اسپتال سے چلی آئی، اپنی ایم۔ اے کی ڈگری لے کر۔ میں نے اس ہوٹل میں کیپٹن کی نوکری کر لی۔ اس عرصے میں جب کبھی کوئی ہمدرد ملتا ہے اسے میں یہ کہانی سنا دیتی ہوں۔ یہی میری زندگی تھی ایک سال تک۔ آج ایک سال پورا ہو گیا ہے۔ اب میں اجازت چاہتی ہوں۔''

وہ چلی گئی اور میں اس کے بارے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ کیسے اسے زندگی میں پھر سے دلچسپی دلاؤں؟

اسی رات کو میں 'بھارت بھون' میں ایک ناٹک دیکھنے گیا۔ ناٹک کیا تھا ''بھوپال گیس ٹریجڈی'' کی سچی کہانی تھی جو تال کے کنارے اسٹیج کی جارہی تھی۔ ''بانجھ گھاٹی'' نام تھا ناٹک کا۔ صرف 33 مرد و عورت اداکاروں نے مل کر بھوپال کے ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کی ٹریجڈی کا نقشہ کھینچ دیا تھا۔

شروع میں انھوں نے دکھایا کہ دس بارہ عورتیں ایک سہیلی کو جلوس کی شکل میں ''زچہ بچہ روم'' سے لا رہی ہیں۔ سب خوش ہیں اور ناچتی گاتی آرہی ہیں کیونکہ عورت کی گود میں ایک ہنستا کھیلتا بچہ ہے۔

اور ٹریجڈی کے آخر میں ایک اور جلوس آتا ہے۔ وہی دس پندرہ عورتیں ہیں مگر آج ان کے گانے میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ بستی میں آکر وہ حاملہ عورت اپنی گود کا بچہ ایک بوڑھے آدمی کو دیتی ہے۔ وہ دھیان سے دیکھتا ہے۔ یہ بچہ نہیں ہے۔ ایک بغیر کان، ناک، آنکھ، بے صورت، بے شکل، گوشت کا لوتھڑا ہے۔ وہ داڑھی والا بوڑھا آدمی، بچّے کو ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھاتا ہے اور اپنے مضبوط کھردرے ہاتھوں سے بے جان لوتھڑے میں سے اس کی جان نکال لیتا ہے۔

اگلے ہی پل ناٹک کی روشنیوں کے جادو سے وہ دس پندرہ عورتیں ہزاروں عورتیں بن جاتی ہیں اور انھیں میں مجھے سلمیٰ کھڑی نظر آتی ہے۔ اس کی گود میں بھی ایک بے جان لوتھڑا ہے۔

مگر سلمیٰ کی آنکھیں چمک رہی ہیں جیسے ایک نوجوان لڑکی کی آنکھیں اپنے محبوب کو دیکھ کر چمک اٹھتی ہیں۔

''اور پھر ایک آواز آئی: ''عالم میری جان، میں آرہی ہوں۔'' یا صرف میرے کانوں نے آواز سنی اور کسی نے سنی ہو یا نہ سنی ہو۔

پھر اچانک روشنیاں بجھ گئیں اور سناٹا چھا گیا۔ صرف تال کی سرسراتی لہروں کی نازک مار جو کنارے پر پڑ رہی تھی۔

پھر جب ستاروں کی روشنی میں بھارت بھون کے ایکٹروں نے ایک عورت گری ہوئی

دیکھی تو میں بھی ان کے ساتھ وہاں دیکھنے پہنچا تو دیکھا کہ سلمیٰ وہاں بے جان پڑی ہے جہاں ابھی کچھ لمحہ پہلے کھڑی تھی۔

اس نے مشکل سے آنکھیں کھولیں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا: ''خدا حافظ! عباس صاحب۔ میری کہانی لکھنا نہ بھولیے گا۔ یہ میری کہانی نہیں ہے۔ یہ بھوپال کی ٹریجڈی ہے۔ یہ عالم کی کہانی ہے اور اس کی فیکٹری کی جہاں وہ کام کرتا تھا۔ یہ وہی فیکٹری ہے جس نے اس کی جان لی ہے۔''

یہ کہا اور اس کو ہلکی سی کھانسی آئی۔ اس کی آنکھیں اور وہ خاموش ہوگئی۔ ہمیشہ کے لیے خاموش۔

مگر میرے کانوں میں اس کے وہ الفاظ ابھی تک گونج رہے تھے:

''میرا نام ہے، کیپٹن سلمیٰ! آپ چکن سوپ ہی پیجئے۔''

(بیسویں صدی، سالنامہ 1987)

O

# کارٹون

بمبئی میں اگر کسی نے یہ پانچ مقام نہیں دیکھے تو اس نے کچھ نہیں دیکھا۔

(1) گیٹ وے آف انڈیا GATE WAY OF INDIA یا باب الہند۔ جو دراصل دروازہ نہیں ہے۔ صرف ایک محراب ہے اور اگر دروازہ ہے بھی تو اس میں کواڑ نہیں ہیں جو بند کیے جاسکیں۔ اسی کھلے دروازے سے بدیشی حکمراں ہندوستان میں وارد ہوتے رہے اور جب تک یہ دروازہ کھلا ہے آزادی کے بعد بھی وارد ہوتے رہیں گے۔

(2) مالا بار ہل جو مالا بار میں نہیں ہے بمبئی شہر میں ہے اور جو دو ڈھائی سوفٹ سے زیادہ بلند نہیں ہے مگر جس کی چوٹی پر بارہ مہینے برف ملتی ہے۔ ملائی کی برف یعنی آئس کریم جو ناز کیفے میں بیٹھ کر کھائی جاتی ہے۔

(3) ٹاور آف سائلنس TOWER OF SILENCE یعنی مینار سکوت'' جو دراصل نہ مینار ہے نہ گنبد بلکہ مالا بار ہل کے ایک سرسبز گوشے میں درختوں سے چھپا ہوا پارسیوں کا قبرستان ہے۔ جہاں لاشوں کو گدھوں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(4) شیئر بازار اور اسٹاک ایکس چینج STOCK EXCHANGE ، جہاں سرمایہ دار گدھ زندہ انسانوں کی بوٹیاں نوچتے ہیں، جہاں منٹوں میں کروڑوں کا لین دین ہوتا ہے، جہاں

ٹیلیفون پر آپ دس لاکھ گٹھریاں روئی کی خرید سکتے ہیں یا پندرہ لاکھ من گیہوں بیچ سکتے ہیں۔ جہاں اگلے سال اگنے والی فصلیں ابھی سے بیچی اور خریدی جاتی ہیں اور بڑی توند والے مارواڑی اور پارسی اور گجراتی اور سندھی تاجر اور دلال اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھے بیٹھے کروڑوں کسانوں کے خون پسینے کا سودا کرتے ہیں۔

(5) کرکٹ کلب آف انڈیا۔ جسے عرف عام میں سی سی آئی C.C.I کہتے ہیں۔

میری کہانی کا تعلق اسی کرکٹ کلب سے ہے۔ اس لیے اس کی چند خصوصیات کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ ضروری ہے۔

کرکٹ کلب میں روز کئی قسم کے کھیل کھیلے جاتے ہیں...... مگر کرکٹ کبھی نہیں کھیلا جاتا۔ ہاں ہر شام کو یہاں برج اور رمی کے کئی سو کھلاڑی جمے رہتے ہیں، ہر مہینے لاکھوں کی ہار جیت ہوتی ہے۔ اس کلب کا جتنا تعلق کرکٹ سے ہے، اتنا ہی انڈیا یعنی بھارت یعنی ہندوستان سے ہے، کھانے کو انگریزی کھانا ملتا ہے۔ پینے کو اب (شراب بندی کے کارن) وہسکی و شامپین تو نہیں مگر جھوٹی تسکین اور تسلی کے لیے فروٹ کاک ٹیل اور جنجر بیئر ملتی ہیں، انگریزی بینڈ کی انگریزی دھنوں پر انگریزی بال روم ڈانسنگ ہوتی ہے۔ بالوں والے مرد شارک اسکن کے سوٹ اور کٹے بالوں والی عورتیں سلیکس پہنے گھومتی ہیں۔ لپ اسٹک سے رنگے ہوئے ہونٹ اور روژ سے سرخ کیے ہوئے گال نظر آتے ہیں۔

کرکٹ کلب میں سب کچھ ہوتا ہے۔
تاش، بلیرڈ، مقامی اسکینڈلز پر گفتگو۔
رومان۔ (ہلکی پھلکی فلرٹیشن سے لے کر سنگین معاشقوں تک)
ریس کے دن گھوڑوں پر بیٹنگ۔ کاروباری بات چیت۔ ٹی پارٹیاں۔
رھمبا اور والینٹز...... غرض سوائے کرکٹ کے سب کچھ ہوتا ہے۔

اس کرکٹ کلب کے سامنے والے پھاٹک کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نوجوان بھکارن رہتی ہے کئی مہینے سے۔ اس کا نام کوئی نہیں جانتا مگر کرکٹ کلب کے سب ممبر اسے پہچانتے ہیں۔ وہ کبھی کسی سے بھیک نہیں مانگتی مگر پھر بھی آنے جانے والے اکنی دونی اس کی طرف پھینک دیتے ہیں۔

یہ بھکارن کہاں سے آئی ہے کسی کو نہیں معلوم۔ رنگ آبنوسی حد تک کالا ہے۔ اس لیے خیال کیا جاسکتا ہے کہ جنوبی ہند کی رہنے والی ہے۔ زبان جو بولتی ہے وہ نہ ہندوستانی ہے نہ مرہٹی نہ گجراتی۔ گو اس میں ہر زبان کے دو چار لفظ موجود ہیں۔ یہاں تک کہ 'تھینکو ساب'، 'تھینکو مِڈم'، 'گٹ نیٹ' جیسے الفاظ ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے بھی بول لیتی ہے۔

جس دن پہلی بار یہ بھکارن کرکٹ کلب کے سامنے والے فٹ پاتھ پر دیکھی گئی اسی دن ''کوکی'' کملانی پہلی بار کلب آئی تھی۔

بظاہر ''کوکی'' کملانی اور اس بھکارن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اگرچہ کہنے والے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آسمان اور زمین بھی تو غیر متعلق نہیں ہیں۔

'کوکی' کملانی کا اصل نام کملا ہے مگر اس کے چچازاد بھائی 'ٹوٹو' TOTO ٹکم داس نے (جو تاریخی اعتبار سے کملا کا پہلا عاشق تھا) امریکہ سے واپسی پر اس کا نام 'کوکی' تجویز کیا تھا اس لیے کہ (بقول ٹوٹو) ''کوکی'' امریکہ میں بسکٹ کو کہتے ہیں جو کملا کی طرح میٹھا بھی ہوتا ہے اور خستہ بھی اور جس کو دیکھتے ہی اس کو کھانے کے لیے دانت کچکچا اٹھتے ہیں، سو اس دن سے بمبئی کی سوسائٹی میں کملا 'کوکی' کہلائی جانے لگی۔

ہاں تو جس دن 'کوکی' پہلی بار کرکٹ کلب میں آئی تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ صرف اس لیے نہیں کہ 'کوکی' خوبصورت ہے، جوان ہے، اس کی بڑی بڑی آنکھیں ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ کوکی پہلی لڑکی تھی جس نے کلب میں ننگی پیٹھ کی BACK LESS چولی پہن کر آنے کی جرأت کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ بمبئی کے ساحل پر کئی سو یا شاید کئی ہزار برس سے مچھلی پکڑنے والی عورتیں ایسی چولیاں پہنتی چلی آرہی ہیں مگر وہ کوئی سوسائٹی لیڈیز تھوڑا ہی ہیں اور نہ ان کے فیشن EVE's WEEKLY میں شائع ہوتے ہیں۔ اس لیے جب ڈانس کے دوران میں بظاہر لاپروائی سے 'کوکی' کا پلو اس کے شانے سے ڈھلک گیا تو کئی سو آنکھوں نے دیکھا...... کہ اس کی سڈول خوبصورت گوری اور چکنی جلد والی پیٹھ ننگی ہے۔ کئی مَردوں کے منہ سے بے اختیار سیٹیاں بج گئیں اور عورتوں نے 'بے شرم کہیں کی' کہہ کر اپنے اپنے مَردوں کی طرف گھور کر دیکھا اور دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ کل وہ بھی گلیمر ٹیلرس کے ہاں اس ''مچھلی مار'' چولی کا آرڈر دے دیں گی۔

اور گنجے گوپال نے (جو اپنے دوستوں میں 'کرکٹ کلب کا فلاسفر' کہلاتا ہے اور اپنے دشمنوں میں کرکٹ کلب کا مسخرا) کہا کہ "انسان ترقی ضرور کرتا ہے، مگر ایک دائرے میں، چنانچہ آج اگر مچھلی والیوں کی ننگی پیٹھ والی چولی کا فیشن چل پڑا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کل ہم لوگ ڈریس سوٹ اور ہونولولو بش شرٹس اتار کر لنگوٹی کیوں نہ باندھنے لگیں اور یوں ہم سب مرد عورت ناگا سادھوؤں کی تقلید میں مادرزاد ننگے ہو کر NUEDIST CU LTURE اختیار کر لیں۔"

ہاں تو پہلے دن 'کوکی' کرکٹ کلب آئی تھی اپنے چچا زاد بھائی 'ٹوٹو' کے ساتھ، مگر جب وہ رات کے گیارہ بجے رخصت ہوئی تو امریکن آئیل کمپنی والے 'موبی' گپتا کے ساتھ، جس سے اس کی ملاقات اسی شام کو ہوئی تھی، مگر جس نے ابھی سے اسے 'کوکی ڈارلنگ' کہنا شروع کر دیا تھا۔

'موبی' کی کار، کلب کے باہر والے فٹ پاتھ کے قریب کھڑی تھی۔ اس لیے وہ 'کوکی' کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے باہر نکلا تو انھوں نے دیکھا کہ وہ بھکارن پیڑ کے نیچے کھڑی، کسی ڈرائیور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے اور ڈرائیور کا ہاتھ اس کی کمر کے گرد ہے اور بے شرمی کے اس کھلے مظاہرے پر 'کوکی' کوئی تنقید کرنے والی ہی تھی کہ بھکارن نے بظاہر لاپروائی سے اپنے شانے کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا اور اس کی میلی پھٹی ہوئی ساڑی کا پلّو گر گیا اور اس کی ننگی پیٹھ کی چکیلی کالی جلد سڑک کی روشنی میں چمک اٹھی۔

اور 'موبی' کے شانے سے شانہ ملا کر موٹر میں بیٹھتے ہوئے 'کوکی' نے بھکارن کی طرف ایک حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے کہا 'بے شرم کہیں کی۔' ایک ECTABLE LOCALITY میں ایسی آوارہ عورتوں کو کون آنے دیتا ہے؟"

اگر 'کوکی' کی مچھلی مار چولی کی نقل میں کلب میں آنے والی ہر عورت کی پیٹھ ننگی ہو گئی تو کلب والیوں کی تقلید میں 'کوکی' نے بھی اگلے دن ہی تاج کے ہیر ڈریسر HAIR DRESSER کے ہاں جا کر پچاس روپے میں اپنے لمبے سیاہ بال کٹوا کر 'پرم' کروا لیے۔

اسی شام کو جب وہ کلب پہنچی تو 'موبی' نے اس کے کٹے ہوئے بالوں کو دیکھ کر کہا 'تھینک گاڈ تم نے اس دقیانوسی جوڑے اور وینی سے چھٹکارا پا لیا' اور 'کوکی' جو اس دن تاج کے ہیر ڈریسر کے ہاں 'پرم' کروانے میں پورے تین گھنٹے خرچ کر کے آئی تھی بولی۔ بات یہ ہے موبی ڈارلنگ

کہ لمبے بالوں کی کنگھی چوٹی میں وقت بہت ضائع ہوتا تھا۔'

اور سنجے گوپال نے ( جو اپنے دوستوں میں 'کرکٹ کلب کا فلاسفر' کہلاتا ہے اور جس کے دشمن اسے کرکٹ کلب کا مسخرا کہتے ہیں ) کہا تم بھی ٹھیک کہتی ہو کوکی۔ مگر کنگھی چوٹی سے جواب وقت بچے گا اس کو کیسے کاٹو گی؟ میری تجویز یہ ہے کہ میڈم پومپاڈور سے ہر روز اپنے بالوں کو ایک نئے اسٹائل میں سیٹ کرالیا کرو، اس بے چاری کی آمدنی ہو جائے گی اور تمھارا وقت کٹ جائے گا۔

اس شام کو جب 'کوکی'، 'موبی' کے دوست ''لولو'' LULU لا لکا کا، کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی تو باہر فٹ پاتھ پر وہ بھکارن اپنے لمبے بال کھولے ان میں ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی کر رہی تھی اور اس میں سے چن چن کر جوئیں مار رہی تھی۔ اتنے میں رامو حجام اپنا بیگ ہاتھ میں لیے ادھر سے گذرا اور بھکارن کے لمبے لمبے بال دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بولا: ''کیوں ری۔ دو روپے دوں گا، ان بالوں کے۔ بول منجور (منظور) ہے؟'' بھکارن نے منہ موڑ کر کہا ''تو ادھر لا دو روپے اور کاٹ لے جتنے جی چاہے۔'' اور جب روپے دے کر رامو حجام نے اپنی قینچی چلانی شروع کی تو وہ بولی'' مگر یہ تو بتا اس جوؤں کے جتھے کا کرے گا کیا؟'' رامو نے قینچی چلاتے ہوئے جواب دیا۔ اری تو نہیں جانتی آج سب فلم اسٹاروں نے اپنے بال تو کٹوا دئے ہیں، مگر جب ستی ساوتری یا نور جہاں، انارکلی کا پارٹ ملتا ہے تو پھر بازار سے ایسے بال خرید کر نقلی چوٹی لگاتی ہیں۔

اور اس رات کو جب 'ٹوٹو' اور 'لولو' اور فلم اسٹار رام کمار اور احمد بھائی ملس والا احمد بھائی پیر بھائی کے جھرمٹ میں 'کوکی' کلب سے باہر نکلی اور رام کمار کی لمبی چوڑی بیوک میں بیٹھنے لگی تو احمد بھائی نے کہا: RAM YOU ARE ALWAYS LUCKY 'لولو لا لکا کا نے سگریٹ کیس 'کوکی' کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ایک سگریٹ تو اور پی لو۔ مگر سگریٹ جلاتے ہوئے نہ جانے کیوں 'کوکی' کی نظر ادھر پڑ گئی جہاں بال کٹی بھکارن فٹ پاتھ پر کئی ڈرائیوروں اور بیروں کے ساتھ بیٹھی، ٹھٹھے مار مار کر بیڑی پی رہی تھی اور 'کوکی' کو ایسا لگا جیسے وہ اس کا منہ چڑا رہی ہو۔ اس نے 555 کا پورا کا پورا سگریٹ سڑک پر پھینک کر رام کمار سے کہا: COME ON RAM DARLING LET's GO

اور بھکارن نے سڑک پر سے وہی سگریٹ اٹھا کر ایک لمبا کش لیتے ہوئے انگڑائی لی اور

رگھیا ڈرائیور کے بازؤوں میں ہلکے سے چٹکی لیتے ہوئے کہا "اپن کو اب نیند آوے ہے" سب اس کا مطلب سمجھ گئے اور ہنستے ہوئے اپنے اپنے ٹھکانے چل دیے اور رگھیا (جس کا صاحب شہر سے باہر گیا ہوا تھا) بھکارن کو موٹر میں بٹھا کر سیر کرانے لے گیا اور جب ورلی پوائنٹ پر سمندر کے کنارے رگھیا نے موٹر ٹھہرائی تو انھوں نے دیکھا کہ تھوڑی دور پر ایک لمبی چوڑی بیوک بھی کھڑی ہے۔

دن گزرتے گئے۔ 'کوکی' نے رام کمار کی فلمی باتوں سے اکتا کر ایک ریس کورس کے بکی BOOKIE سے دوستی کر لی۔ جو ریس کے دن اسے دس کے سو دو سو روپے بنانے والی ٹپ TIP دیتا تھا۔ اور جب رگھیا کا صاحب واپس آ گیا تو بھکارن نے بھی رگھیا کو دھتا بتائی اور محمد بخش خانساماں سے دوستی کر لی۔ جو روز رات کو اپنے مالک کی آنکھ بچا کر اچھے اچھے کھانے لے آتا تھا۔

کلب کے اندر اگر 'کوکی' کے پروانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی تو کلب کے باہر کے فٹ پاتھ پر بھکارن کے عاشقوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ بیرے، خانساماں، ڈرائیور سب ہی اس کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ کلب کے اندر اگر 'کوکی' چار آنے پوائنٹ کی رمی کھیلتی تھی تو بھکارن اپنے دوستوں کے ساتھ گھنٹوں تاش کھیلتی رہتی تھی۔ جب سے بھکارن نے کلب کے سامنے والے فٹ پاتھ کو اپنا گھر بنایا تھا اس کی ہیئت کذائی میں تبدیلی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی رنگت تو ویسی ہی کالی تھی، مگر چہرے کی کالونچ پر وہ اُس پاؤڈر کی تہہ جمائے رکھتی تھی، جس کا ڈبہ کالو بیرے نے اسے اپنی مالکن کی ڈریسنگ ٹیبل سے چرا کے لا کر دیا تھا۔ لپ اسٹک اور روژ کی جگہ وہ لال اینٹ کا ٹکڑا گھس کر اس کی سرخی گالوں اور ہونٹوں پر تھوپ لیتی تھی۔

کلب کے احاطے میں لال پھولوں کا ایک پیڑ تھا، جس کی ایک شاخ دیوار کے اوپر سے باہر لٹکی ہوئی تھی۔ اس میں سے ایک پھول وہ روز توڑ کر اپنے کٹے ہوئے بالوں میں لگا لیتی تھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی مگر اس کے بدن میں جوانی کا خمیر تھا اور کلب میں آنے جانے والی عورتوں کو دیکھ کر اسے بناؤ سنگھار کے سب گُر معلوم ہو گئے تھے۔ بیڑی وہ اس شان سے پیتی تھی کہ کیا کوئی سوسائٹی لیڈی اپنے سونے کے سگریٹ ہولڈر میں لگے ہوئے 555 کو پیتی ہوگی۔

اکتیس دسمبر کی رات کو کلب میں فینسی ڈریس ڈانس تھا۔ 'کوکی' اس رات کو مغل شہزادیوں کے لباس میں انارکلی بن کر جانے والی تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کے کٹے ہوئے بالوں کو لمبی مغلیہ

چوٹی کی شکل کیسے دی جائے۔ سو وہ تاج کے ہیر ڈریسر HAIR DRESSER جیک کے پاس گئی اور اس سے مشورہ کیا۔ جیک نے کہا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ بالوں کے سلسلے میں ان کے یہاں ہر قسم کا انتظام ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اندر کے کمرے میں گیا اور اپنے اسسٹنٹ سے کہا 'رامو بار بردس روپے میں جو بال دے گیا تھا وہ ہیں یا بک گئے'' معلوم ہوا کہ وہ بال ابھی تک نہیں بکے۔ کالے چمکیلے بالوں کی ایک موٹی لٹ لے کر (جو یوڈی کولون کی خوشبو مہک رہی تھی) جیک باہر آیا اور کوکی سے کہا۔ WELL MADAM HERE YOU ARE آپ کے بالوں سے ایک دم میچ کرے گا۔ ایک دم وہی رنگ ہے۔'

'کوکی' نے بھکارن کے نرم سیاہ بالوں کی لٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔'' تھینک یو جیک۔ YOU ARE A DARLING اور جیک نے سو روپے کا بل لکھتے ہوئے کہا۔ 'کوکی' YOU ARE WELCOME

اور اس رات کو جب 'کوکی' انارکلی کے لباس میں کلب پہنچی تو کتنے ہی مردوں کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ 'زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے۔' کسی نے کہا 'کوکی ڈارلنگ تم تو سچ مچ مغل شاہزادی معلوم ہوتی ہو' کسی نے کہا فلستان والوں کو بینا رائے کے بجائے 'کوکی' کو انارکلی بنانا چاہیے تھا اور ایک لمبے تگڑے سانولے نوجوان نے (جو مغل شہزادے کے بھیس میں آیا تھا) کہا۔''اگر تم انارکلی ہو تو میں پرنس سلیم ہوں۔ ویسے میرا نام بہادر سنگھ ہے۔ مگر سب مجھے کوکو COCO کہتے ہیں، اپنی رنگت بھی کوکو جیسی ہے نا۔''

''تو آپ ہیں پرنس بہادر سنگھ آف راج نگر؟'' کوکی نے خوشی اور حیرت سے پوچھا۔

''اور تم ہو کوکی کوئین آف دی کرکٹ کلب؟'' پرنس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور کوکی کی نرم ہتھیلی نے اس گرمجوشی میں ایک خاموش پیغام، کو محسوس کیا۔ ایک پیغام ایک اشارہ، ایک دعوت اور اس کے بعد پرنس بہادر سنگھ نے کہا 'SHALL WE DANCE' ANARKALI اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی کوکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ڈانس فلور کی طرف لے گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر بھکارن کی محفل لگی ہوئی تھی۔ آج اس کے چاہنے والوں میں بھی ایک نئے پروانے کا اضافہ ہوا تھا راجا پہلوان۔ جو نہ کسی ریاست کا راجا تھا اور نہ پہلوانی کرتا تھا بلکہ

مداری تھا اور چوپائی پر ریچھ اور بندر کا تماشہ کر کے پیٹ پالتا تھا۔ مگر تھا بڑا اچھا کلا اور پھر مداریوں کی طرح چرب زبان۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے بھکارن کے اور سب شیدائیوں کو پیچھے ہٹا دیا تھا۔

"کیوں ری تیرا نام کیا ہے؟" راجا پہلوان نے پوچھا۔

بھکارن نے بیڑی کے دھوئیں کا حلقہ بناتے ہوئے کہا: 'میرا کوئی نام نہیں راجا بھکارن کا بھی بھلا کوئی نام ہوتا ہے؟' اور پھر راجا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر" جس کا جو جی چاہتا ہے اسی نام سے پکارتا ہے۔"

اور راجا نے کہا: "تو آج سے میں تجھے رانی کہہ کر بلایا کروں گا۔ سمجھی؟ راجا۔ رانی۔"

اندر کلب میں ڈانس زوروں پر چل رہا تھا، بینڈ والے کتنی ہی انگریزی دھنیں بجا چکے تھے۔ سب عورتوں اور مردوں کی رشک بھری نظریں کوکو اور کوکی کے جوڑے پر تھیں۔ جو برابر ایک دوسرے کے ساتھ ہی ناچ رہے تھے، بینڈ والوں کے پاس ایک نئی دھن کی فرمائش پہنچی اور ران کے ساز ایک ساتھ تھرا اٹھے۔ رمبا کی ٹیون تھی۔ شروع ہوتے ہی ناچنے والوں کے کولھے تھرکنے لگے۔

کسی نے فلمی دھن کو پہچان کر گانا شروع کر دیا۔" آنا میری جان، میری جان۔ سنڈے کے سنڈے۔ آنا میری جان۔"

دوسری آوازوں نے مل کر کورس بنایا لے پر تالیاں بجنے لگیں۔ بینڈ اور زور سے بجنے لگا۔ لے تیز ہوتی گئی۔ کولھے اور سینے اتنی ہی تیزی سے تھرکنے لگے۔

"آنا میری جان۔ میری جان سنڈے کے سنڈے....."

کلب گھر کی سب کھڑکیاں کھلی تھیں۔ سنگیت کی لہریں کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے ہوتی ہوئی چاردیواری کو پھلانگتی ہوئی فٹ پاتھ پر پھیل گئیں۔ وہاں بھی یہ دھن جانی پہچانی تھی۔ آپ سے آپ لے پر تالیاں بجنے لگیں۔ گیت کے الفاظ گنگنائے جانے لگے۔" آنا میری جان۔ میری جان۔ سنڈے کے سنڈے....."

راجا نے بھکارن کی طرف آنکھ مار کر گنگنانا شروع کیا۔

آ نا میری جان، میری جان سنڈے کے سنڈے..........

اور فٹ پاتھ والوں کی آوازیں بھی کورس میں شامل ہوگئیں۔

ڈرائیور، کلینر، بیرے، خانساماں، ہوٹلوں کے ویٹر، میونسپلٹی کے بھنگی، بیکار بھکاری، سب مل کر گا رہے تھے۔ آ نا میری جان، میری جان...... اور سب کی نگاہیں تھیں بھکارن پر......

اور اندر کلب میں ایک کے بعد ایک مختلف آوازیں کورس میں شامل ہوتی گئیں' آ نا میری جان...... میری جان سنڈے کے سنڈے۔ آ نا میری جان......' لکھ پتی، بیوپاری، سرکاری افسر، فلم اسٹار، ڈاکٹر، بیرسٹر، فوج کے افسر سب مل کر گا رہے تھے۔'' آ نا میری جان، میری جان سنڈے کے سنڈے......'' اور سب کی نگاہیں تھیں کوکی پر۔

'' ناچو، رانی، ناچو'' راجا نے بھکارن کو گدگداتے ہوئے کہا۔ اور سب کے اصرار پر وہ بیڑی پھینک کر کھڑی ہوگئی اور کلب کے بینڈ کی دھن پر اس کے کولھوں نے بھی اسی طرح تھرکنا شروع کردیا۔ جیسے کوکی کے کولھے ڈانس فلور پر تھرک رہے تھے۔

'' شاباش رانی شاباش'' سب تالیاں بجا بجا کر داد دینے لگے۔

'' آ نا میری جان، میری جان......''

کلب کے اندر اور باہر ایک ہی دھن تھی۔ ایک ہی لے ایک ہی آہنگ تھرکتے ہوئے کولھوں میں، للکتی ہوئی آنکھوں میں، ابھرے اور ابھارے ہوئے سینوں میں وہی ہوس تھی...... کلب کے بینڈ کی دھن پر بھکارن ناچ رہی تھی، فٹ پاتھ والوں کی تالیوں کی لے پر لکھ پتی اور سوسائٹی لیڈیز ناچ رہی تھیں اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس دھن پر ناچ رہے ہیں اور کیوں اور ان کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم انھیں کدھر لے جا رہے ہیں...... اندر اور باہر اس وقت بس ایک ہی دھن تھی، ایک ہی خواہش، ایک ہی حیوانی بھوک، ایک ہی جنسی تپش......

'' آ نا میری جان......

'' میری جان......

'' میری جان......

'' میری جان......

''میری جان......

''سنڈے کے سنڈے......

''سنڈے کے سنڈے......

''آنا میری جان......

''آنا......

''آنا......

''آنا میری جان......

''میری جان......

''میری......

''میری......

''جان......

''جان......

''میری میری میری میری میری میری میری میری

''جان جان جان جان جان جان جان جان جان

''آنا آنا آنا آنا آنا آنا آنا آنا آنا آنا آنا آنا

''آنا میری جان......

''میری جان آنا......

''آنا سنڈے کے سنڈے......

''سنڈے میری جان......

''جان آنا میری سنڈے......

''سنڈے سنڈے سنڈے سنڈے سنڈے سنڈے......''

نئے سال کے بارہ بجے اور اس خوشی میں کلب کی روشنیاں بجھا دی گئیں مگر بینڈ بجتا رہا......

''میری جان۔ میری جان۔ میری جان۔ میری جان

فٹ پاتھ پر راجا نے بھکارن کو پیڑ کے سائے میں گلے لگاتے ہوئے کہا'' کیوں میری جان رانی بنا منظور ہے؟''

اور اندر کلب کے اندھیرے میں کوکی نے جواب دیا۔''یس۔ڈارلنگ۔یس۔''

اور جب کلب کی بتیاں دوبارہ روشن ہوئیں تو سب نے دیکھا کہ کوکو اور کوکی دونوں غائب ہیں۔

چندروز بعد لاؤنج میں بیٹھے ہوئے کلب کے چند ممبر خوش گپیاں کر رہے تھے۔

ایک نے کہا''یار جب سے وہ کوکو ہماری کوکی کو لے کر بھاگا ہے کلب میں رونق نہیں رہی۔''

دوسرے نے کہا''اور تو اور وہ نمکین سی بھکارن جو سامنے کے فٹ پاتھ پر رہتی تھی وہ بھی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔

تیسرے نے کہا:''تم بھی کمال کرتے ہو۔کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ذکر ہو رہا تھا، اپنی کوکی کا جو کوئین آف کرکٹ کلب تھی اور تم ذکر لے بیٹھے اس گندی آوارہ بھکارن کا بھلا کوکی کا اس بھارن سے کیا تعلق؟''

اور گنجے گوپال نے (جو اپنے دوستوں میں ''کرکٹ کلب کا فلاسفر'' کہلاتا ہے اور اپنے دشمنوں میں 'کرکٹ کلب کا مسخرا) کہا:''دونوں میں بڑا گہرا تعلق ہے۔اگر ہماری کوکی کوئین آف کرکٹ کلب تھی تو وہ بھکارن اسی کی تصویر تھی۔''

وہ بد ہیئت بھکارن..........اور تم اسے کوکی کی تصویر کہتے ہو؟''

'اچھا بھائی' گنجے گوپال نے اٹھتے ہوئے کہا''تصویر نہ سہی مگر وہ کوئین آف کرکٹ کلب کا کارٹون ضرور تھی۔

O

# آؤ تاج محل کو ڈھائیں

لڑکی نے کہا مجو!

لڑکے نے کہا ممو!

مجو! ہوسکتا ہے اس کا نام شمشیر سنگھ ہو، شجاعت علی خان ہو، شمیندر کمار ہو یا سہراب باٹلی والا ہو مگر اس وقت وہ صرف مجو تھا۔

ممتی! ہوسکتا ہے اس کا نام مریم زمانی ہو۔ مایا ہو۔ امرت کور ہو۔ یا میری ڈی سوزا ہو مگر اس وقت وہ صرف ممتی تھی۔

لڑکی نے کہا: کچھ کہو، مجو۔

لڑکے نے کہا: سنو، ممتی!

پھر وہ خاموش ہو گیا اور چاندنی میں نہائی ہوئی فضا خاموشی کے ساز پر ایک بڑی پرانی دھن سناتی رہی۔

لڑکی نے کہا: سنا تم نے؟ پتھر گا رہے ہیں۔

لڑکے نے کہا: ''ش ش ش غور سے سنو یہ لے جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔''

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد لڑکی نے کہا: ''یہ لے تو ایسی لگتی ہے جیسے پہلے کبھی کہیں سنی ہو۔''

اور لڑکے نے کہا جنم دن سے لے کر آج تک ہر روز ہر وقت ہم اس لَے کو سنتے آئے ہیں اور مرتے دم تک سنتے رہیں گے۔

کچھ دیر تک لڑکی خاموشی سے اس لَے کو سنتی رہی پھر بولی یہ لَے پرانی ہے پھر بھی نئی کیوں لگتی ہے؟

لڑکے نے کہا: اس لیے کہ ہم اسے سن کر بھی نہیں سنتے۔ سنتے بھی ہیں تو پہچانتے نہیں۔ یہ لَے نہیں ہے ممتی، یہ ہمارے دل کی دھڑکن ہے۔

اور پھر دونوں خاموش ہو گئے اور ان دونوں کے دل ایک لَے ہو کر دھڑکتے رہے اور پتھر گاتے رہے۔ چاندنی گنگناتی رہی۔ وقت چلتے چلتے رک گیا۔ وقت سو گیا، ساری کائنات سو گئی، صرف محبت جاگتی رہی اور تالاب کے پانی کی تہہ میں محبت کی سفید پرچھائیں جھلملاتی رہی، مسکراتی رہی۔

لڑکی نے ایک گہری سانس بھری اور کہا: کاش ہماری محبت کا یہ لمحہ منجمد ہو کر امر ہو جائے۔

لڑکے نے کہا: ہو سکتا ہے۔ وہ دیکھو۔ تین سو برس کے بعد بھی کسی کی محبت کا لرزتا ہوا آنسو وقت کے سانولے گال پر آج بھی موتی کی طرح چمک رہا ہے۔

لڑکی نے کہا: وہ تو تاج محل ہے۔ اس کو تو ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر کروڑوں روپے صرف کر کے، لاکھوں معماروں اور مزدور لگا کر بیس برس میں بنایا تھا۔

لڑکے نے کہا روپے سے عمارت بن سکتی ہے۔ روپے سے حسن کی تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ شہنشاہ محل بنوا سکتا ہے تاج محل نہیں۔ تاج محبت کے آنسوؤں سے بنتا ہے۔

لڑکی نے سہم کر دھیرے سے پوچھا: پھر؟

لڑکے نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا آؤ ہم بھی تاج محل بنائیں۔

وقت رکا ہوا تھا۔ چاندنی گنگنا رہی تھی۔ پتھر گا رہے تھے۔ تالاب کے پانی میں محبت کی سفید پرچھائیں اتر رہی تھی، مسکرا رہی تھی۔

مُجّو، ممتی کی محبت میں کھویا ہوا تھا۔ وہ تھا اور نہیں تھا۔

ممتی، مُجّو کی محبت میں کھوئی تھی۔ وہ تھی اور نہیں تھی۔

اور پھر وہ طلسمی لمحہ ایک بلوری جام کی طرح ٹوٹ گیا۔ پتھر خاموش ہو گئے، چاندنی کالے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئی۔ ہوا کے ایک تند جھونکے سے تالاب کا پانی لرز اٹھا اور اس کی نورانی پرچھائیں کالے گہرے پانی میں ڈوب گئی۔

ممتی نے گھبرا کر پوچھا یہ کیسی بھیانک آواز ہے شجو؟

شجو نے غور سے سنتے ہوئے جواب دیا، سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے پھر وہ خاموش ہو گیا، جیسے وہ اس منحوس آواز کو پہچانتے ہوئے بھی اسے نہ پہچانتا ہو۔ وہ آواز تھی ایک فولادی کدال کی۔ کدال جس کی چوٹ سنگ مرمر پر پڑ رہی تھی۔ کوئی تاج محل کو ڈھا رہا تھا۔

(2)

ایک آواز نے نعرہ لگایا "تاج محل کو......"

ہزاروں آوازوں کے کورس نے نعرہ پورا کیا "......ڈھائیں گے"

ایک آواز نے للکارا "ڈھائیں گے ہم....."

ہزاروں کی آواز نے ایک ساتھ جواب دیا "تاج محل کو"

پھر کئی منٹ جوشیلی، غصے اور نفرت سے بھری ہوئی آوازوں کا کورس گاتا رہا۔

"تاج محل کو ڈھائیں گے"

"ڈھائیں گے ہم تاج محل کو"

جماعت فدایانِ ملت برائے انہدام تاج محل کا پہلا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ پنڈال کے اوپر سبز جھنڈے لہرا رہے تھے اور پنڈال کے اندر پنکھوں کی ہوا میں مہندی سے رنگی ہوئی اوڑھنیاں لہرا رہی تھیں۔

مولانا مولوی، الحاج فخر القوم فدائی الایمان، ملک التجار، جناب عالی شان رئیس اعظم تاجر چرم و کرسی نشین قدیم دربار دولت انگلشیہ اپنا خطبۂ صدارت پڑھ رہے تھے جو چار سو بیس روپے دے کر انھوں نے کان پور کے الخباثت اخبار کے ایڈیٹر سے لکھوایا تھا۔

عالی شان خان دراصل نہ مولانا تھے، نہ مولوی۔ پیدائشی پٹھان بھی نہیں تھے۔ آزادی سے

ایک سال پہلے انگریزی سرکار نے اپنی جنگی خدمات کے عوض خان صاحب کا خطاب ضرور دیا تھا کیونکہ انھوں نے فوج کو دولاکھ جوتے سپلائی کیے تھے۔ جوتوں کے تلوں میں گتا تھا۔ اس لیے خان صاحب کو جو تمغہ ملا تھا اس کے سونے میں تانبے کی ملاوٹ تھی۔ ہاں تو عالیشان خان کان پور میں چمڑے کے بیوپاری تھے۔ ان کی داڑھی بھی نقلی تھی جو وہ بوقتِ ضرورت شرعی لگا لیا کرتے تھے اور حج انھوں نے صرف ایک بار لندن معظمہ کا کیا تھا۔ جب وہاں چمڑے کے بیوپاری کی عالمی کانفرنس ہوئی تھی۔ لیکن اس جلسے کی صدارت کے لیے ان سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں تھا۔ انھیں ہمیشہ تاج محل سے چڑھ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میرا بس چلے تو وہاں ایک بوچڑ خانہ کھول دوں۔ باغ میں سرو شمشاد کے پیڑوں کی چھاؤں میں مویشی بندھے رہیں۔ سنگ مرمر کے تالابوں میں گائے بیل پانی پئیں اور گنبد کے نیچے روضے میں قصائی مویشیوں کو حلال کریں اور کیونکہ ایسا ہونا ممکن نہیں تھا تو انھوں نے ''جماعت فدایانِ ملّت برائے انہدامِ تاج محل'' کا سرپرست ہونا منظور کیا تھا اور اس تحریک کے لیے بڑھ چڑھ کر چندہ دیا تھا اور اسی چندے کے زور پر وہ جماعت کے صدر چنے گئے تھے۔

''حاضرین''! عالی شان خان نے اپنا خطبۂ صدارت جاری رکھتے ہوئے للکار کر کہا ''تاج محل کو مسمار کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ ہمارا سیاسی نصب العین ہے۔ یہ سنگ مرمر کا بھوت خانہ ہماری تاریخ کے زرّیں صفحوں پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ جب تک یہ قائم ہے ہماری تہذیب، ہمارے مذہب، ہماری سیاست سب پر کافروں کی سنسکرتی کا سایہ پڑتا رہے گا۔

''اس سلسلے میں میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس تاج محل کے پجاری محبت کے نام پر آپ کو بہکائیں گے۔ حسن وعشق کے فرضی افسانوں سے آپ کو بہلائیں گے۔ محبت!''

اور انھوں نے ''محبت'' کے لفظ کو اپنی زبان سے اتنی نفرت کے ساتھ تھوکا جیسے وہ زہر کا قطرہ ہو۔

''محبت!'' ایک بار پھر نفرت سے انھوں نے اس لفظ کو دوہرایا، کیونکہ اس وقت وہ اپنی چوتھی بیوی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

عالی شان خان کی تین بیویاں پہلے سے موجود تھیں۔

ایک بیوی وہ تھی جس سے ان کے ماں باپ نے تیس برس پہلے ان کی شادی کی تھی۔ وہ بے چاری اب بوڑھی ہو چکی تھی اور عالیشان محل کے شاگرد پیشے میں جہاں دوسرے نوکر رہتے تھے، ایک کوٹھری میں اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہی تھی۔

دوسری بیوی وہ تھی جو کبھی آگرے کے بازارِ حسن کی زینت تھی اور جس سے پندرہ برس ہوئے، اس کی ماں کو پانچ ہزار روپے دے کر عالی شان خان نے نکاح پڑھوالیا تھا۔ اس کی جوانی بھی اب ڈھل چکی تھی مگر وہ زبان کی بڑی تیز طرار تھی اور شادی کے فوراً بعد ہی اس نے کافی جائیداد اپنے نام لکھوالی تھی۔ عالی شان اتنی آسانی سے اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے تھے، اس لیے انھوں نے اسے اپنی نینی تال کی کوٹھی میں رکھ چھوڑا تھا، جہاں وہ کبھی کبھی گرمیاں گزارنے کے لیے اس کے پاس چلے جاتے تھے۔

تیسری بیوی سے شادی کے لیے عالی شان خان کو پانچ برس ہو چکے تھے مگر وہ اس سے سب سے زیادہ ڈرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ ان سے کہیں زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ بی۔ اے، بی۔ ٹی کر کے عالی شان مسلم گرلز اسکول میں ہیڈ مسٹرس تھی۔ جب خان صاحب نے اپنے اسکول کا معائنہ کرتے ہوئے اس کو دیکھا تھا اور دیکھتے ہی انھوں نے طے کر لیا تھا کہ اگر تمھیں لیڈری کرنی ہے تو ایک ایسی بیوی بھی ہونی چاہیے جو ان کے ساتھ جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کر سکے اور جب وہ کسی منسٹر کو ڈنر دیں تو معزز مہمان سے سیاسی اور سماجی مسائل پر بات چیت کر سکے۔

ہیڈ مسٹرس بے چاری پہلے ہی بیوہ تھی۔ زیادہ خوب صورت بھی نہیں تھی۔ اس نے عالی شان خان کا پیغام خوشی سے قبول کر کے نکاح پڑھوالیا تھا۔ اپنے شوہر کی سیاسی زندگی میں بھی اس نے کافی ہاتھ بٹایا تھا۔ چھوٹی موٹی تقریریں بھی وہ لکھ دیتی تھی لیکن اس کے لکھنے پڑھنے کا شوق اس کے شوہر کو پریشان کیے رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مسز عالی شان نمبر تین (3) کو افسانہ نگاری کی بیماری تھی۔ افسانے بھی وہ خالص رومانی لکھتی تھیں اور جب بھی ان کہانیوں میں خان صاحب، ہیرو کے گھنگر و والے چمکیلے سیاہ بالوں اور چوڑے چکلے سینے کا ذکر پڑھتے تو ان کی نیند اڑ جاتی اور ان کو یقین ہو جاتا کہ ان کی تعلیم یافتہ بیوی کے افسانوں کا ہیرو اس کا گنجا شوہر نہیں ہے بلکہ کوئی

خیالی نو جوان ہے اور پھر وہ سوچ کر پریشان ہو جاتے کہ شاید وہ نو جوان خیالی نہ ہو اصلی ہی ہو۔

اور سو عالی شان خان کو چوتھی بیوی کی تلاش کرنی پڑی بلکہ کوئی خاص تلاش بھی کرنی نہ پڑی۔ پکے ہوئے آم کی طرح وہ ان کی آرزو کی جھولی میں آ گری۔

ہوا یہ کہ عالی شان خان کے جوتوں کے کارخانے میں ایک بوڑھا کلرک رحمان کام کرتا تھا جسے سب رحمان چاچا کہتے تھے۔ عالی شان خان رحمان چاچا کا بڑا خیال رکھتا تھا، کیوں جب کبھی مزدوروں کی یونین مزدوری بڑھانے کا سوال کرتی اور اپنی مانگوں کو منوانے کے لیے اسٹرائیک کی دھمکی دیتی تو رحمان چاچا جیسے پڑھے لکھے مسلمان ملازم دوسرے مسلمان مزدوروں کو یونین کے خطرناک پروپیگنڈے سے محفوظ رکھتے اور انھیں یاد دلاتے کہ یہ ایک مسلمان مالک کا کارخانہ ہے۔ اسی وقت الخباثت اخبار میں یہ مضمون نکلنے شروع ہو جاتے کہ ہندو کارخانوں کے مالک کس طرح مسلمان مزدوروں کے ساتھ ظلم کرتے ہیں اور کس طرح ہندو سرمایہ دار مسلمان کارخانوں کو بند کروانے کے لیے یونین والوں کے ذریعہ اسٹرائیک کرواتے ہیں۔ اسی موضوع پر مسلمان مزدوروں میں جلسے ہوتے، میلاد شریف کی محفلیں ہوتیں دو تین ملّا وعظ دینے کے لیے بلائے جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمان مزدور اپنے مفاد کو مالک کے مفاد پر قربان کر کے اسٹرائیک کو ناکامیاب کر دیتے اور عالی شان خاں کے منافع میں کمی نہ ہونے پاتی اور اس خدمت کے انعام میں رحمان چاچا کی تنخواہ دس روپے بڑھا دی جاتی۔

ہاں تو ایک دن رحمان چاچا پریشان صورت بنائے مالک کے دفتر میں داخل ہوا اور رونی آواز میں کہنے لگا: ''خان صاحب تین سو روپے پیشگی مل جائیں تو بڑی مہربانی ہو''۔

عالی شان خاں نے کہا: ''کیوں رحمان چاچا کیا مشکل آن پڑی کہ اتنا بہت روپیہ ایڈوانس چاہیے''۔

اس پر رحمان رونے لگا اور سسکیاں لے کر بولا: ''خاں صاحب کیا بتاؤں عزت کا سوال ہے۔''

ارے بھائی ''تمھاری عزت میری عزت ہے۔ کہو تو کیا ہوا''

تب رحمان نے بتایا کہ اس کی ایک لڑکی ہے نام اس کا مریم زمانی ہے لیکن سب اسے ممتی کہتے ہیں۔ اسکول کے نویں درجے میں پڑھتی ہے۔ ان کے پڑوس میں ایک پنجابی شرنارتھیوں کا خاندان رہتا ہے جن کا ایک لڑکا ہے جس کا نام شمبند رکمار بھلّہ ہے لیکن اسے سب قمو قمو کہتے ہیں۔ اتنا کہہ کر رحمان چاچا کی آواز تھرّا گئی اور ہونٹ کانپنے لگے ''بس آگے کیا کہوں سرکار شریف

آدمی کے لیے تو مرنے کا مقام ہے"

عالی شان خاں گرج کر بولے: "تو کیا اس کافر کے بچے نے تمھاری لڑکی کو چھیڑا؟"

تب رحمان چاچا نے بتایا کہ انھوں نے مریم کی نسبت اس کے ماموں زاد بھائی سے کی تھی لیکن اس بے حیا لڑکی نے وہاں شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا اور جب اس کی بیاہتا بڑی بہن نے وجہ پوچھی تو بولی "میں شادی کروں گی تو تھو سے کروں گی نہیں تو زہر کھا کے جان دے دوں گی۔"

عالی شان خاں کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا "اب لوگوں کی یہ ہمت ہو گئی کہ اپنے ناپاک ہاتھ ہماری ناموس پر ڈالنے لگے "چشم فلک نے آج تک دیکھی نہیں جن کی جھلک" پھر انھوں نے پوچھا "تو پھر اب کیا ارادہ ہے رحمان چاچا؟"

"ارادہ کیا ہے سرکار، مسلمان کے ہر مرض کا تو ایک ہی علاج ہے پاکستان۔ اپنی اور اس کمبخت دونوں کی پرمٹ نکلوائی ہے۔ سوچتا ہوں اسے پاکستان لے جاؤں اور وہاں کسی جگہ اس کا بیاہ کر دوں۔ اب یہاں اتنی بدنامی ہو گئی ہے کہ کوئی شریف گھرانہ اسے قبول نہیں کرے گا۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر عالی شان خاں بولے۔ کرے گا کیوں نہیں۔ ملّت کی عزت آبرو کا سوال ہے۔ تمھاری لڑکی کی عمر کیا ہے؟

اٹھارہ برس۔ رحمان چاچا نے جواب دیا۔

تب عالی شان خاں کرسی پر سے اٹھ کر رحمان کے پاس آئے اور بولے: اگر تم چاہو تو تمھارے عزت کی خاطر میں خود تمھاری بیٹی سے شادی کر سکتا ہوں۔

اور سومتی کی شادی زبردستی عالی شان خان کے ساتھ کر دی گئی۔ ان کا چار بیویوں کا کوٹا پورا ہو گیا۔ ممتی خوب صورت تھی، جوان تھی۔ اس کو دیکھتے ہی خان صاحب کے بڑھاپے کی خزاں میں ایک بار پھر بہار آ گئی۔ وہ گنجے سر کے رہے سہے بالوں اور مونچھوں میں خضاب کا استعمال زیادہ اہتمام کے ساتھ کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی نئی نویلی بیوی کے لیے ریشمی ساڑیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اس کو سونے اور جواہرات سے لاد دیا لیکن پھر بھی وہ اس کے من کو نہ جیت سکے۔ وہ بظاہر ان کا ادب لحاظ کرتی تھی۔ ان کا ہر حکم مانتی تھی۔ لیکن عالی شان خان کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان کی بیوی نہیں ہے۔ ایک چلتی پھرتی گڑیا ہے جسے وہ بازار سے خرید کر لائے ہیں۔ جس میں نہ کوئی

جان ہے نہ احساس۔

عالی شان خان نے سوچا یہ آج کل کی لڑکیاں عشقیہ ناول اور رومانی فلموں کے ماحول میں پلی بڑھی ہیں۔ رات دن ریڈیو سیلون پر 'پیار کیا تو ڈرنا کیا' اور تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے، کے ریکارڈ سنتی ہیں۔ ان کو رام کرنے کے لیے کوئی دوسرے طریقے اختیار کرنے پڑیں گے سو اس دن سے وہ ممتی کے سامنے آتے تو ٹھنڈی سانس بھر کے عشقیہ اشعار پڑھتے۔ اس کو رومانی فلمیں دکھانے لے جاتے اور جب گھر واپس آتے تو اپنے چہرے پر دیوداسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ ایک دن انھوں نے ممتی کا نرم چھوٹا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر رکھا اور بولے: ممتی میری جان، کب تک روٹھی رہوگی۔ میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔

'محبت' وہ چلائی۔ اور یہ لفظ اس زور سے بیڈ روم میں گونجا کہ عالی شان کے گال تمتما اٹھے۔ جیسے کسی نے انھیں ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کیا ہو۔

'خبردار۔ وہ دیوانہ وار چلائی۔ خبردار جو کبھی یہ لفظ زبان سے نکالا۔ نہیں تو میں اپنی جان دے دوں گی۔

چمڑے کے سوداگر۔ تم نے چار عورتوں کے جسم خریدے ہیں جیسے تم کھال کھنچوانے کے لیے مُردہ گائے بیل خریدتے ہو۔ تم محبت کے معنی کیا جانو؟

اور اس دن سے یہ ایک لفظ 'محبت' عالی شان خان کے دماغ میں زہر کے ایک قطرہ کی طرح گردش کر رہا تھا اور وہاں ہزاروں کے مجمع کے سامنے جب انھوں نے اسے تھوکا تو انھیں ایسا محسوس ہوا، واقعی انھوں نے اس زہر کو اپنے خون میں سے نکال پھینکا ہو۔

'محبت!' وہ ایک بار پھر غصے اور نفرت سے چلائے۔

'محبت!' یہ وہی زہر ہے جس نے ہماری عزت، ہماری آبرو، ہماری ناموس کا خون پہلے بھی کیا ہے اور آج بھی کیا جا رہا ہے۔ کیا میں سناؤں آپ کو اس محبت کے کارنامے جس کی سنگین نشانی یہ منحوس تاج محل آج بھی کھڑا ہماری شاہی روایات کا منہ چڑا رہا ہے؟ وہ روایات چنگیز و بابر کی روایات ہیں۔ چنگیز و بابر جو اپنی فوجوں کو لے کر ملک فتح کرتے تھے، عشق و محبت میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے لیکن ان کے پوتے اکبر نے اپنے خاندان کی فاتحانہ روایات کو ٹھکرا کر اپنے

ماتھے پر ہندوانی ٹیکے کی شکل میں محبت کا کلنک لگا لیا۔

اکبر نے محبت کی کس سے؟ ایک کافر زادی راجپوت شہزادی جودھابائی سے۔ اور اس دن سے خاندان مغلیہ کے شاہی خون کی پاکیزگی ختم ہوگئی۔ اس خون کی ملاوٹ کا نتیجہ ظاہر ہوا جہانگیر کی شکل میں۔ جہانگیر نے پہلے محبت کی، محل کی ایک لونڈی انارکلی سے اور پھر محبت کی نور جہاں سے اور محبت کا نتیجہ تھا شاہ جہاں۔ شاہ جہاں جس نے جنگِ دکن میں بھی ممتاز محل کا ریشمی آنچل نہ چھوڑا۔ ذرا خیال فرمایئے! ایک شہنشاہ ابن شہنشاہ جس کی رگوں میں فاتحوں اور غازیوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ وہ صرف ایک عورت کے عشق میں اتنا دیوانہ ہوگیا کہ اس کی موت پر ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ اپنے فرائض سلطنت کو بھلا دیا۔ بجائے فتح ہندوستان کی تکمیل کے، اپنی محبوبہ کا مقبرہ بنوانے میں مصروف ہوگیا اور اس مقبرے پر، محبت کے اس مرمریں ڈھونگ پر، کروڑوں روپیہ صرف کر دیا، جس سے غازیوں کے درجنوں لشکروں کی اسلحہ بندی کی جاسکتی تھی، جس سے سارے ہندوستان کی ہی نہیں، ساری دنیا کی تسخیر کے جنگی منصوبے بنائے جاسکتے تھے۔ اکبر کی طرح اس نے بھی اپنے خاندان کی روایات کو، خالص اسلامی شہنشاہیت کے مستقبل کو قربان کر دیا صرف محبت کی خاطر۔ میں کہتا ہوں لعنت ہو ایسی محبت پر"۔

بھرے پنڈال سے نفرت بھری آوازیں آئیں 'عشق و محبت مردہ باد۔ عشق و محبت مردہ باد'

اور پھر نعرے بلند ہوئے، تاج محل کو ڈھائیں گے۔ ڈھائیں گے ہم تاج محل کو۔

عالی شان خان نے اپنا خطبۂ صدارت ختم کیا تو ان کا منہ لال ہو رہا تھا۔ کنپٹی کی رگیں دھڑک رہی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ ان کی تیسری بیوی نے اپنے ریشمی رومال سے شوہر کی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "ڈارلنگ یو آر ونڈر فل"

اور اب مؤرخ الملت پروفیسر اچکانی تقریر کر رہے تھے۔ حضرات میں فخر الملت جناب عالی شان خاں کی طرح فصیح و بلیغ تقریر کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ میں تو کتاب کا کیڑا ہوں۔ ایک تاریخ داں ہوں، جس نے تیس برس فن تعمیر پر تاریخی تحقیق کی ہے اور اس حیثیت سے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تاج محل مرمریں مقبرہ نہیں ہے، ایک بدنما دھبہ ہے، ہمارے اسلاف کے دامن پر، جس کی غیر اسلامی تعمیری خصوصیات ہمارے تمدن اور ہماری تاریخ کا منہ چڑا رہی ہیں۔

"ممکن ہے آپ میں سے بعض حضرات کو یہ سن کر تعجب ہو۔ کیونکہ جاہل عوام میں یہی سمجھا جاتا

ہے کہ روضۂ تاج محل اسلامی تمدن اور اسلامی طرز تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اسی طرح شیروانی کو بھی غلطی سے اسلامی لباس سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ ہندوؤں کے انگر کھے کی دوسری شکل ہے۔اسی طرح میں یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ مغلوں کا فنِ تعمیر عموماً اور تاج محل کا فن تعمیر خصوصاً خالص اسلامی نہیں ہے۔ایسے گنبد، ایسے کلس، ایسی محرابیں اور ایسے مینار آپ کسی اور اسلامی ملک میں نہیں پائیں گے۔تاج محل کے گنبدوں پر مندروں اور شوالوں کے کلسوں کی چھاپ ہے۔جنھیں مغل محرابیں کہا جاتا ہے، وہ راجپوت فنِ تعمیر کے امتزاج سے بنائی گئی ہیں اور کوئی تعجب بھی نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اس عمارت کو بنانے والوں میں عیسیٰ آفندی، امانت خاں شیرازی اور اسماعیل خاں کے ساتھ موہن لال، منوہر سنگھ اور منو لال بھی شامل تھے۔کہا جاتا ہے کہ تاج محل ہندو اور مسلم تمدن اور آرٹ کے اتحاد کا مکمل نمونہ ہے اور اسی لیے ہم اسے ڈھانا چاہتے ہیں، کیونکہ جس وقت تک تاج محل قائم ہے، اس کی مثال دے کر متحدہ قومیت کا ڈھول پیٹا جائے گا۔مت بھولیے کہ ابھی تو صرف پاکستان بنا ہے۔ابھی ہمیں کتنے پاکستان اور بنانے ہیں اس لیے اگر آپ اسلامی تہذیب وتمدن کو قومی تہذیب کے زہر سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ کا ایک ہی نصب العین ایک ہی مطالبہ ایک ہی نعرہ ہوسکتا ہے۔

اور ہزاروں مزدوروں کی آوازوں کے کورس نے جواب دیا: ''آؤ تاج محل کو ڈھائیں!''

(3)

''تاج محل کو ڈھائیں گے۔نشٹ کریں گے تاج محل کو!''

نعرے وہی تھے مگر جگہ دوسری تھی۔اس پنڈال کے اوپر بھگوے جھنڈے لہرا رہے تھے اور پنڈال کے اندر داڑھیوں کے بجائے چوٹیاں لہرا رہی تھیں مگر گرما گرمی وہی تھی۔غصے اور نفرت کا سمندر ویسے ہی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

اکھل بھارتیہ تاج محل توڑ پھوڑ منڈل سنگھ مہا سبھا کا پرتھم وارشک سمیلن ہو رہا تھا۔

پہلے ویدوں کا پاٹھ کیا گیا۔چونسٹھ پنڈتوں نے جو چار دھام سے بلائے گئے تھے ہَون کیا۔جس میں اکتالیس من گھی، اکیاون من صندل کی لکڑی اور اکسٹھ من ہر قسم کا اناج جلایا گیا۔

اس کے بعد 'بھگوان گوڈسے' کی مورتی کو سونے کے سنگھاسن پر براجمان کرکے اس کی

آرتی اتاری گئی۔

تب دھرم پالک راشٹریہ سنچالک شری شری شریمان سیٹھ دھنی رام سونا چاندی والا نے اپنا ایڈریس پڑھنا شروع کیا۔

سیٹھ دھنی رام ستائیس بلڈنگوں، سات ملوں، پانچ اخباروں، دو شراب کے کارخانوں اور ایک عدد توند کے مالک تھے۔ یہ توند ان کی دولت اور پوزیشن کی ایک زندہ نشانی تھی۔ جیسے جیسے وہ اپنا ایڈریس پڑھتے جاتے تھے، ان کی آواز کے ہر اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ان کی توند میں سمندر کی لہروں کی طرح جوار بھاٹا آرہا تھا۔

یہ ایک ایڈریس کاشی کے ایک مہاودوان پنڈت دھرم داس مہاراج کا لکھا ہوا تھا اور گو سیٹھ دھنی رام نے گھر پر دوبار اس کو پڑھنے کا ریہرسل کیا تھا پھر بھی وہ اب تک سب شبدوں کا مطلب نہ سمجھ پائے تھے اور اب بھی اٹک اٹک کر اور ہجے کرکے پڑھ رہے تھے۔

"دیویو، ماتاؤ، بھگنوں، پتریوں، بندھو، بھارت ورش نواسیو۔ جے ہو، جے ہو، جے ہو۔ میں جو کیول ایک سادھارن بیوپاری ہوں، ایک دھرم سیوک ہونے کے ناطے آپ کو یہ چیتاونی دینے آیا ہوں کہ سَمے آ گیا ہے، جب ہم بھارتیوں کو یہ نشچے کرنا پڑے گا کہ ہم بھارت ورش کو ہندو استھان، ہندو سنسکرتی اور ہندو داتاؤں کا مہان کیندر بنانا چاہتے ہیں یا اپنی ساری پرانی پرم پرا کو دھرم کی جوالا میں بھسم کر دینا چاہتے ہیں، وہ جوالا جسے ہمارے اردو بھگت اور مسلمان دوست پردھان منتری سیکولرزم کہتے ہیں۔

آج ہم سنسار کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہ پوتر دیدوں کا دیش ہے۔ رشیوں، منیوں، ستی ساوتریوں کا دیش ہے۔ یہ وہ مہان بھومی ہے، جس میں گنگا میا بہتی ہے۔ اس بھومی پر ملیچھوں، مسلموں، کٹوؤں کی سنسکرتی، ان کی بھاشا، ان کی سبھیتا کے لیے کوئی استھان نہیں ہے۔ ان کا پاکستان بن چکا ہے۔ اب ہمیں بھارت ورش کو ہندو جاتی کا پاکستان بنانا ہے۔ اب یہاں نہ اردو بھاشا چلے گی، نہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی رہے گی۔ ہم اس کا نام بدل کر کوشل مہا ودھالیہ بنا دیں گے۔ اب نہ مسجدیں، مقبرے رہیں گے اور نہ یہ تاج محل رہے گا، جو ہم آگرہ نواسیوں کی چھاتی پر کھڑا مونگ دَل رہا ہے۔

''ہمارے دیش کے ذر بھاگیہ سے ہندو جاتی میں بھی ایسے مورکھ دیکھی ملیں گے جو اس تاج محل کو پریم کی امر نشانی کہتے ہیں، جو سمراٹ شاہ جہاں اور اس کی رانی ممتاز محل کے پریم کی سوگندھ کھاتے ہیں، پر یہ ان کی بھول ہے شاہ جہاں اور ممتاز کا پریم.....''

ممتاز کا پریم!

سیٹھ دھنی رام کی آواز، ان کا بھاشن سناتی رہی لیکن ان کے دماغ کے گراموفون کی سوئی ان شبدوں پر اٹک گئی۔

ممتاز کا پریم!

ممتاز کا پریم!

ممتاز....

ممتاز....

ممتاز....

پریم.....

پریم.....

اور اب ان کے دماغ میں یاد کی ننی ننی چاندی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

نہیں، یہ یاد کی گھنٹیاں نہیں تھیں۔ یہ ممتاز کی پازیب کے گھنگرو تھے۔

ممتاز سیو کے بازار میں اپنے کوٹھے پر ناچ رہی تھی اور ایک نوجوان دھنی رام مسند پر گاؤ تکیوں کے سہارے لگا محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس رات اس نے ممتاز سے کہا تھا: ''ممتی میں تیرے بنا نہیں جی سکتا''

اور ممتی نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا: 'مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹئے۔ آپ کوٹھی میں رہنے والے میں کوٹھے پر بیٹھنے والی۔'

تب دھنی رام نے کہا تھا: 'ممتی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔ کیا تو یہ ناچ گانا چھوڑ کر ساتھ چلے گی؟'

..................

ممتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا تھا: ''میں آپ کی

داسی ہوں آپ کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔''

اور سو ممتاز شدہ ہوکر مایادیوی بن گئی تھی۔

لیکن جس دن اس کا بیاہ ہونے والا تھا۔ دھنی رام کے باپ سیٹھ مول چند کو بیٹے کے خطرناک ارادے کا پتہ چل گیا اور انھوں نے ممتی کے کوٹھے پر جا کر اس کے سامنے دس ہزار کے نوٹ ڈال دیے اور کہا ''یہ لے لے اور میرا بیٹا مجھے لوٹا دے''

ممتی نے سیٹھ کے چرن چھوتے ہوئے کہا ''سیٹھ جی اپنا روپیہ اپنے پاس رکھیے مجھے آپ کی دولت نہیں چاہیے۔ آپ کے بیٹے کا پیار چاہیے۔''

تب سیٹھ جی نے اپنی ٹوپی ممتی کے قدموں میں رکھ دی اور کہا ''میں تجھ سے اپنے بیٹے کی بھیک مانگنے آیا ہوں وہ ہمارا اکلوتا لڑکا ہے اگر اس نے یہ شادی کی تو اس کی ماں اپنی جان دے دے گی۔ برادری میں ہماری ناک کٹ جائے گی۔''

تب بھی ممتی نہیں مانی تھی اور پھر سیٹھ جی نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا تھا ''ممتی تو جانتی ہے کہ دھنی کی دو بہنیں بھی ہیں۔ لکشمی اور ساوتری۔ اگر دھنی نے تجھ سے بیاہ کیا تو ہماری جاٹ برادری میں کوئی اس کی بہنوں کو سویکار نہیں کرے گا۔ کیا تو چاہتی ہے تیری سہاگ کی خاطر دونوں نردوش بچیاں عمر بھر کنواری بیٹھی رہیں؟''

یہ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ کتنی ہی دیر کی سوچ بچار کے بعد ممتی نے کہا: 'سیٹھ جی یہ پاپ میں اپنے سر نہیں لوں گی۔ آپ کا بیٹا آپ کو واپس مل جائے گا۔'

اس رات کو جب دھنی ممتی کو اس کے کوٹھے پر ہمیشہ کے لیے لے جانے کو پہنچا تو وہاں گھنگرو کھنک رہے تھے، محفل جمی ہوئی تھی اور ممتی مجرا کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

'ممتی' اس نے دوسرے کمرے میں بلا کر کہا 'یہ کیا ہو رہا ہے؟'

ممتی نے جواب دیا 'مجرا ہو رہا ہے جو اس کوٹھے پر ہمیشہ رات کو ہوتا ہے۔'

'مگر میں تو تمھیں لے جانے آیا ہوں ممتی'

'میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اب میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'

'مگر کیوں؟'

'یوں ہی! چاہو تو یہ سمجھو کہ آوارگی میری گھٹی میں پڑی ہے۔'

یہ سن کر دھنی رام کی نظروں میں دنیا گھوم گئی اور کچھ دیر دم بخود رہنے کے بعد اس نے کہا:

''تم ٹھیک کہتی ہو جب تمھارے خون ہی میں پاپ ہے تو تم کیسے بدل سکتی ہو ممتاز بیگم؟''

''ممتاز بیگم!'' اس نے دانت پیس کر ممتی کو چڑانے کے لیے کہا۔

مگر ممتی نے جواب دیا: ''اب میں ممتاز بیگم نہیں ہوں مایا ہوں اور مایا ہی رہوں گی۔''

دھنی رام اس جملے کا مطلب سمجھے بغیر چلا آیا تھا اور جب میڑھیوں سے اتر رہا تھا تو اس کے کانوں پر گھنگروؤں کی کھنک کی چوٹ پڑ رہی تھی۔

اس نے سوچا تھا ''ہے نا آخر بے وفا طوائف اور وہ بھی مسلمان!''

مگر محفل میں جتنے تماش بین بیٹھے تھے وہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ ممتی ناچ رہی ہے اس کے ہونٹوں پر گیت ہے مگر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

بائیس برس کے بعد آج بھی اس کے کانوں میں گھونگروؤں کی کھنک گونج رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا اس بے وفا کا خیال میرے دل سے کیوں نہیں جاتا۔ اپنی پتنی کے ہوتے ہوئے اس کے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے پاپ ہے اور یہ سوچ کر وہ پرائشچت کرنے کے لیے کسی دھرم کرم کے کام میں کئی ہزار دان کر دیتا۔

اس کی صرف ایک ہی بیٹی تھی۔ جس کا نام اس نے مایا رکھا تھا اور پیار سے اسے ممتی کہتا تھا اور کبھی کبھی وہ سوچتا میں نے اپنی پھول سی بچی کا نام اس کم بخت کے نام پر کیوں رکھا ہے؟ پھر وہ دل کو تسلی دیتا کہ اس ممتی کا نام تو ممتاز بیگم تھا۔ مایا تو وہ اسے بنانا چاہتا تھا مگر وہ نہ بن سکی تھی۔

اور پھر ایک دن دھنی رام نے اپنے پرچے 'آگرہ سماچار' میں ایک مختصر خبر پڑھی کہ ایک طوائف مایا بائی مرتے ہوئے ایک لاکھ کی جائیداد اور زیور ایک اناتھ آشرم کے نام کر گئی ہے۔ اس نے اپنے من کو سمجھایا تھا کہ یہ کوئی اور ہوگی اس کا نام تو ممتاز بیگم تھا۔ مگر اتنے برسوں کے بعد اس کے کانوں میں ممتی کی آواز گونج رہی تھی ''اب میں ممتاز بیگم نہیں ہوں، مایا ہوں اور مایا ہی رہوں گی۔' اگرچہ اس کا مطلب وہ تب بھی نہیں سمجھا تھا اور اب بھی نہیں سمجھ سکا اور پھر وہ ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہو کر آگرے کی طوائف کے بارے میں بھول گیا۔ اس کی بیٹی مایا جو لکھنؤ یونی ورسٹی

میں پڑھتی تھی۔ ایک اسٹوڈنٹس اسٹرائیک کے سلسلے میں پکڑی گئی۔ دھنی رام فوراً ہوائی جہاز سے لکھنؤ پہونچا اور بیٹی کو ضمانت پر رہا کرا کے اپنے دفتر میں لایا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بیٹی کو ایسی زوردار ڈانٹ پلائے کہ وہ یہ سب سیاسی بکواس چھوڑ کر گھر واپس آجائے اور ماتا پتا کی مرضی اور مشورے سے کسی شریف اور امیر خاندان میں شادی کر لے۔ بھلا سیٹھ دھنی رام کی بیٹی کو کون نا کر سکتا ہے۔

اور سو اس نے بات شروع کرتے ہوئے بیٹی سے پوچھا 'ممتی یہ لوگ جو کہتے ہیں تو سوشلسٹ، کیمونسٹ ہوگئی ہے یہ سب جھوٹ ہے نا؟'

'بالکل جھوٹ ہے' ممتی نے جواب دیا 'بھلا آپ جیسے پونجی پتی کی بیٹی کو ان پارٹیوں والے کب ممبر بناتے ہیں۔ آپ ہی سوچئے اگلے مہینے جب آپ کے شوگر ملس میں، جب مزدور ہڑتال کریں گے تو مجھ پر کون اعتبار کرے گا؟'

'اگلے مہینہ میرے شوگر ملس میں ہڑتال ہونے والی ہے؟' دھنی رام نے گھبرا کر پوچھا:

'تجھے کس نے بتایا؟'

'شجو نے'

'شجو کون؟'

'آپ نہیں جانتے اسے؟ شوگر ملس ورکرس یونین کا سکریٹری شجاعت علی خاں'

'میں اس بدمعاش کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن ممتی تو اسے کیسے جانتی ہے؟'

'وہ بی اے میں میرا کلاس فیلو تھا پتاجی۔ میں اس سے اکنامکس پڑھا کرتی تھی'

اور پھر وہ نظریں جھکا کر بولی 'میں شجو کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں'

دھنی رام کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

'بہت اچھی طرح جانتی ہوں، اس سے تیرا کیا مطلب ہے؟'

'مطلب یہ ہے پتاجی کہ اگلے مہینے ہم بیاہ کرنے والے ہیں'

اس لمحے دھنی رام کی دنیا الٹ پلٹ گئی۔ اس کے کانوں میں ایک عجیب سا شور گونج اٹھا۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے، گھونگھروؤں کی جھنکار۔

ایک ممتی کی آواز جو کہہ رہی تھی، میں ممتا نہیں۔ مایا ہوں۔ مایا ہوں۔

ایک ممتی کی آواز جو کہہ رہی تھی، میں مایا نہیں۔ ممتاز ہوں۔

اور پھر اس کے دماغ میں ساری دنیا کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ مندروں کی گھنٹیاں، ملوں کے سائرن، فائر انجن کا گھڑیال اور ٹیلی فون کی گھنٹیاں۔

'ہیلو'! اس نے ریسور اٹھا کر پوچھا' کون بول رہا ہے؟'

دوسری طرف سے آواز آئی'' کون دھنی رام! ارے بھائی میں ہوں عالی شان خاں''

'کہو خان صاحب کیا خبر ہے؟' اس نے بڑی بے دلی سے پوچھا۔

'' خبر بڑی خطرناک ہے دھنی۔ یہ مزدور یونین والے تمھاری شوگر ملس میں بڑی گڑبڑی کرنے والے ہیں۔ وہ شجاعت ہے نا اس کے تین گُر گے ہیں مراری لال ہربچن سنگھ اور پیٹر ڈی سوزا۔ خدا کا شکر ہے، میرے مومنوں نے تو انھیں نکال باہر کیا مگر وہ اب تمھارے کارخانوں میں کام کر رہے ہیں ہوشیار رہنا۔''

'' خاں صاحب کل کہیں ملو۔ مجھے تم سے بہت ضروری مشورہ کرنا ہے۔ کچھ کھانے پینے کا پروگرام بھی ہو جائے۔ میری برودی سے بڑھیا شراب کی بوتلیں آئی ہیں۔''

'' سوری دھنی! کل میں ایک کانفرنس کی صدارت کرنے آگرے جا رہا ہوں۔ مذہبی معاملہ ہے، اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔''

دھنی رام نے فون رکھا ہی تھا کہ اس کا سکریٹری داخل ہوا۔

'سیٹھ صاحب' اس نے چیک بک سامنے رکھتے ہوئے کہا' تاج محل توڑ پھوڑ منڈل سنگھ مہا سبھا والے آئے ہیں، کہتے ہیں آگرے میں کانفرنس ہے۔''

مایا نے حیرت سے پوچھا'' تاج محل توڑ پھوڑ منڈل؟ مگر وہ تاج محل کی توڑ پھوڑ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ وہ تو پیار کی نشانی ہے؟''

اور سیٹھ دھنی رام نے ایک لاکھ کی رقم لکھ کر چیک پر دستخط کرتے ہوئے کہا'' پیار کی نشانی ہے اسی لیے اسے نشٹ کر دیا جائے گا۔''

(4)

ممتی نے پوچھا:'' یہ کون لوگ ہیں؟ کیا یہ بھی تاج محل کو ڈھانے آئے ہیں؟''

شجو نے کہا: "نہیں ممی یہ تو ہمارے جیسے ہی لگتے ہیں۔ سنو یہ کیا کہہ رہے ہیں"
ممی نے کہا: "مگر یہ تو غیر ملکی ٹورسٹ ہیں، ان کی زبان ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں؟"
شجو نے کہا: "محبت کی زبان ایک ہی ہے غور سے سنو۔"

ایک ہٹا کٹا نوجوان، جس کے سر کے پیلے بال چاندنی میں سونے کی طرح لگ رہے تھے اپنی دوست سے کہہ رہا تھا، زویا یہ دیکھ کر تمھیں کیا یاد آ رہا ہے؟"

اور وہ بولی: "ایوان۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ وولگا کے کنارے ہمارے فارم کے گیہوں کے کھیتوں میں فصل تیار کھڑی ہے۔ میں اور تم دونوں فصل کاٹنے والی ہارویسٹر کمبائن چلا رہے ہیں اور تم میری طرف دیکھ رہے ہو اور میں تمھاری آنکھوں میں جھانک رہی ہوں اور دریا پر کوئی وولگا کے کشتی بانوں کا گیت گا رہا ہے اور نیلے آسمان میں قاضوں کی ایک ڈار قائیں قائیں کرتی ہوئی اڑ رہی ہے اور تمھیں اپنے پاس دیکھ کر میرا دل اتنے زور سے دھڑک رہا ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ ٹریکٹر کی آواز کے باوجود سب لوگ میرے دل کی دھڑکن کو سن لیں گے۔"

اور ان سے تھوڑی دور پر ایک اور جوڑا سنگ مرمر کے تالاب میں اپنا عکس دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔
لڑکی کہہ رہی ہے۔ جون
اور لڑکا کہہ رہا ہے میری مائی ڈارلنگ
لڑکی پوچھتی ہے کیوں جون کیسا لگتا ہے؟

لڑکا کہتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے سٹیمز کی لہریں چاندنی میں چمک رہی ہیں اور ہماری لمبی پتلی کشتی، آپ سے آپ دھیرے دھیرے بہتی چلی جا رہی ہے اور دور کنارے پر کسی کالج میں پیانو پر کوئی بیٹ ہوون کی دھن بجا رہا ہے اور تمھارا سر میری گود میں ہے اور میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کیوں، میری کیا تم سچ سچ میری ہو؟ اور تم کہہ رہی ہو ہاں جون، تمھاری ہوں۔ صرف تمھاری ہوں ہمیشہ کے لیے تمھاری ہوں......

مگر ان سب سے دور دو لمبے چوڑے آدمی جو ناک میں سے بولتے تھے، باغ کے ایک کونے میں کھڑے تاج محل کو ایسی نظر سے دیکھ رہے تھے جیسے سُنار کسی کے گلے میں سونے کا ہار دیکھ کر

دل ہی دل میں اس کی قیمت آنکنے لگتا ہے کہ اگر اتنے روپے میں مل جائے تو برا نہیں ہے۔

ایک کہہ رہا تھا اوہ کاش ذرا خیال تو کرو اگر اسے اٹھا کر ہم ہڈسن دریا کے کنارے کھڑا کر دیں تو کتنا منافع ہو سکتا ہے؟

دوسرے نے کہا: کم سے کم پانچ ڈالر ٹکٹ لگا سکتے ہیں۔ صرف اسے دیکھنے کے لیے ہر روز بیس پچیس ہزار ڈالر کی آمدنی تو ان کے ٹکٹوں ہی سے ہو سکتی ہے۔

پہلے نے کہا: باغ میں تالابوں کے کنارے اور پیڑوں کے نیچے کرسیاں میزیں لگا کر اوپن میز کیفے بنایا جا سکتا ہے۔ ایک کافی کی پیالی کے لے دو ڈالر چارج کر سکتے ہیں۔

دوسرے نے کہا: ارے یہ تو کچھ بھی نہیں گنبد کے نیچے جو ماربل کا ہال ہے، وہاں نائٹ کلب بنایا جا سکتا ہے۔ ذرا خیال کرو ایسے رومانٹک ایشائی ماحول میں جب اسٹرپ ٹیز ڈانس ہوگا تو کتنی بھیڑ ہوگی؟ اگر داخلے کا ٹکٹ سو ڈالر بھی رکھا جائے تو کم ہے۔

پہلے نے کہا یہ واقعی ملین ڈالر آئیڈیا ہے۔

دوسرے نے ٹھنڈی سانس بھری لیکن یہ کمبخت ہندوستانی اسے ہمارے ہاتھ کیوں بیچنے لگے؟

پہلے نے کہا: 'اتنے مایوس نہ ہو، مجھے تو لگتا ہے مفت اٹھا کے دیں گے۔'

دوسرے نے تعجب سے پوچھا: 'کیا کہہ رہے ہو۔ میں اس کے لیے دس لاکھ ڈالر دینے کو تیار ہوں۔ تب بھی سودا مہنگا نہیں، بھلا مفت کیوں دینے لگے؟'

پہلے نے کہا: ''تو ایک منٹ خاموش رہو اور سنو''

خاموشی میں انھوں نے بھی وہ آواز سنی جو ممتی اور شجو نے سنی تھی۔ سنگ مرمر پر فولادی کدال پڑنے کی آواز بلکہ دو آوازیں، ایک مقبرے کے شمالی کنارے سے آرہی تھیں اور دوسری جنوبی کونے سے۔ تاج محل کو دو طرف سے ڈھایا جا رہا تھا۔

دوسرے نے کہا: ''یہ تو بہت اچھا ہے، یہ لوگ خود ہی اسے ڈھا رہے ہیں۔ یہ سیدھے سادھے ہندوستانی اتنی بڑی پتھر کی عمارت کو معمولی کدالوں سے ڈھانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ڈائنامیٹ اور بلڈوزر چاہئیں''

اس کے ساتھی نے اسے اطمینان دلایا: 'یہ پتھر کی عمارت نہیں ہے۔ چاندنی میں نہایا ہوا

ایک خیالی مجسمہ ہے۔ اتحاد کا ایک سپنا ہے جو یہ ہندوستانی اپنی تاریخ کے ہر دور میں دیکھتے رہے ہیں۔ یہ خواب گوتم بدھ نے بھی دیکھا تھا اور اشوکا نے بھی۔ اکبر نے بھی دیکھا تھا اور شاہجہاں نے بھی۔ گاندھی نے بھی دیکھا تھا اور ابوالکلام آزاد نے بھی اور اب بھی ہندوستان وہی خواب دیکھ رہا ہے۔ اس سپنے کو توڑنے کے لیے یہ کدال ہی کافی ہیں۔ سپنا محبت کا ہے اور یہ کدالیں فولاد کی نہیں نفرت کی بنی ہوئی ہیں۔''

**(5)**

اور اب سنگ مرمر پر فولاد کی پے در پے چوٹ پڑنے کی جھنکار گونج رہی تھی۔

'سنو ممتی' تھو نے اپنی محبوبہ سے کہا: 'ان منحوس کدالوں کی ہر چوٹ کچھ کہہ رہی ہے۔ ہماری محبت کو سزائے موت سنا رہی ہے۔'

رات کا سناٹا نفرت بھری آوازوں سے گونج رہا تھا۔

نواکھالی۔ نواکھالی۔ راولپنڈی۔ راولپنڈی۔ گجرانوالہ۔ لدھیانہ۔ لدھیانہ۔ گجرانوالہ۔ لاہور۔ امرتسر۔ امرتسر۔ لاہور۔ کان پور۔ بھرتپور۔ بھرتپور۔ کان پور۔ پٹیالہ۔ پانی پت۔ پانی پت۔ سونی پت۔ یہ دلی ہے۔ یہ کراچی۔ یہ کراچی۔ یہ دلی ہے۔ یہ علی گڑھ۔ یہ میرٹھ ہے۔ یہ میرٹھ ہے۔ یہ چندوسی ہے۔ یہ چندوسی۔ یہ آگرہ۔ یہ آگرہ ہے۔ یہ آگرہ ہے۔

پھر دونوں طرف سے، شمال سے اور جنوب سے، نعرے گونجے ''تاج محل کو ڈھائیں گے، ڈھائیں گے ہم تاج محل کو'' اور پھر دو اور سائے۔

ایک نے کہا: میں طغریٰ نویس امانت خان شیرازی ہوں۔ قرآن شریف کی جو آیتیں تاج محل کی محرابوں کے گرد کندہ کی گئی ہیں، وہ میرے قلم کی لکھی ہوئی ہیں۔

اور دوسرے نے کہا: اور میں ملتان کا چھوٹے لال ہوں امانت خاں شیرازی کے ہاتھ کی ہوئی آیتوں کو سنگ مرمر پر پچی کاری سے میں نے امر نے کیا ہے۔ جو کلس چمکتے ہیں وہ میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہیں۔

دو اور سائے

ایک نے کہا: میں اسماعیل آفندی ہوں، جن گنبدوں کو تم شہید کرنا چاہتے ہو، وہ میں نے

بنائے تھے۔

اور دوسرے نے کہا: اور میں دہلی کا جمنا داس ہوں ان گنبدوں پر۔

بھیڑ میں سے ایک آواز آئی: جادوگر تم نے تاج محل کو کہاں چھپایا ہے؟ بتاؤ ورنہ ہم تمھیں مار ڈالیں گے۔

اور اب وہ چھ سائے ایک دوسرے میں گھل کر دو حسین اور عظیم الشان سائے بن گئے۔ جن کے قدم پر زمین پر تھے اور سر آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک لڑکا تھا، ایک لڑکی۔

لڑکے نے کہا: تم ظالموں کی کدالوں سے بچانے کے لیے تاج محل کو ہم نے اپنے دل میں چھالیا ہے۔

اور لڑکی نے کہا: جس پیار بھرے دل میں جھانک کر دیکھو گے وہاں تم ایک تاج محل بنا پاؤ گے۔

لڑکے نے کہا: دور کیوں تلاش کرتے، خود اپنے دل میں جھانک کر دیکھو، بے وقوفو!

اور ہر ایک نے جب اپنے من کے اندھیرے میں جھانکا تو وہاں تاج محل کو جھلملاتا ہوا پایا۔

ہوا میں اٹھی ہوئی کدالیں جھک گئیں۔ چاندنی کی گود میں تاج محل پھر بھر آیا۔ مگر وہ دو سائے اس کی حفاظت کے لیے سامنے کھڑے رہے۔

کسی نے سہمی ہوئی سی آواز میں پوچھا: تم دونوں کون ہو

لڑکے نے کہا: میں وہ ہوں جس نے تاج محل بنایا ہے۔

اور ہزاروں کدالیں ایک ساتھ ہوا میں بلند ہو گئیں۔

لیکن وہ تمام کدالیں سبز رنگ کی کدالیں۔ اور بھگوے رنگ کی کدالیں اٹھی کی اٹھی رہ گئیں کیونکہ اس لمحے میں نفرت کے مجاہدوں اور کرودھ کے............نے دیکھا کہ ان کی نظروں کے سامنے تاج محل چاندنی میں پگھلتا جا رہا ہے۔ جیسے وہ سنگ مرمر کا بنا ہوا مقبرہ نہ ہو، موم کا بنا ہوا ایک مجسمہ ہو جو نفرت کی آنچ میں پگھل رہا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ گنبد، وہ مینار، وہ محرابیں، وہ جالیاں، وہ تالاب، وہ سرو شمشاد کی قطاریں سب کچھ چاندنی میں تحلیل ہو گیا۔ پھر چاندنی نے بھی منہ موڑ لیا اور کالے بادلوں میں چھپ گئی۔ یہ اب تاج محل نہیں تھا صرف رات تھی۔ اندھیرا تھا سناٹا تھا۔ ہوا کی سائیں سائیں تھی اور دور دریا کے پار گیدڑ بول رہے تھے۔

"یہ سب ان کافروں کا سحر ہے، کوطلسم ہے۔ نفرت کا ایک مجاہد چلایا۔"
یہ سب ان ملیچھوں کا کیا ہوا کوئی جادو ہے' کرودھ کا ایک سورما' للکارا۔
'چلو مجاہدو قدم بڑھاؤ۔'
چلو سورماؤ آگے بڑھو۔

تاج محل تحت الثریٰ میں چھپ جائے گا تو ہم اسے کھود ڈالیں گے۔ تاج محل کو پاتال میں بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور اسے نشٹ کر کے رہیں گے۔

دونوں طرف سے حملہ آور آگے بڑھ ہی رہے تھے۔ ان کے راستے میں دو سائے کھڑے ہو گئے۔ صرف دو سائے۔ لیکن وہ پہاڑ کی طرح اٹل تھے۔

تم کون ہو؟ کسی نے انھیں لکارا۔

ایک نے جواب دیا: میں عیسیٰ آفندی ہوں! جس تاج محل کو تم برباد کرنا چاہتے ہو۔ اس کا نقشہ میں نے ہی تیار کیا تھا۔

دوسرا بولا: اور میں قنوج کا موہن لال ہوں، جس تاج محل کو تم نشٹ کرنا چاہتے ہو۔ اس کی دیواروں پر جتنے نقش و نگار ہیں، وہ سب میرے بنائے ہوئے ہیں۔

اور پھر دو سائے اور آئے۔
اور لڑکی نے کہا: میں وہ ہوں جس کے لیے تاج محل بنایا گیا تھا۔
پھر سوال کیا گیا: مگر تمھارا نام کیا ہے؟
میرا نام لڑکے نے مسکرا کر کہا: میرا نام خجو ہے۔
میرا نام لڑکی نے نظریں جھکا کر کہا: ممتی ہے۔
پھر وہ دونوں سائے تاج محل میں سما گئے اور دنیا کو سوچتا ہوا چھوڑ گئے۔
یہ خجو اور ممتی — کون تھے؟
شمبھو ناتھ کمار بھلّہ اور مریم زمانی؟ شجاعت علی خاں اور مایا —؟
شاہجہاں اور ممتاز محل

○

# دیوالی کے تین دیے

## پہلا دیا

دیوالی کا یہ دیا کوئی معمولی دیا نہیں تھا۔ دیے کی شکل کا بہت بڑا بجلی کا لیمپ تھا۔ جو سیٹھ لکشمی داس کے محل نما گھر کے سامنے کے برآمدے میں لگا ہوا تھا۔ بیچ میں یہ دیوں کا سمراٹ دیا تھا اور جیسے سورج کے اردگرد اَن گنت ستارے ہیں۔ اسی طرح اس ایک دیے کے چاروں طرف بلکہ اوپر نیچے بھی ہزاروں بلب بجلی کے تاروں میں ایسے جگمگا رہے تھے جیسے مالن ہاروں میں چنبیلی کے سفید پھولوں کو گوندھتی ہے۔

برآمدے کے ہر محراب میں ان بجلی کے دیوں کے ہار پڑے ہوئے تھے۔ چھت کے کنگروں کے ساتھ ساتھ ستاروں سے بھی زیادہ جگمگاتے ہوئے قمقموں کی جھالریں جھول رہی تھیں۔ سنگِ مرمر کے ہر ستون پر بجلی کی تار کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور اس میں پکے ہوئے انگوروں کی طرح لال، ہرے نیلے پیلے بلب لگے ہوئے تھے۔ سارے گھر میں کچھ نہیں تو دس ہزار بجلی کے یہ دیے شام سے ہی دیوالی کا اعلان کر رہے تھے۔ دیوی لکشمی کا انتظار کر رہے تھے۔

مگر ان سب میں سب سے زیادہ نمایاں وہ ایک ہی دیا تھا۔ دیوں کا سمراٹ جو اپنی روشنی سے شام کے دھندلکے کو دوپہر کی طرح روشن کیے ہوئے تھا۔ یہ دیا سیٹھ لکشمی داس امریکہ سے

لائے تھے۔ جب وہ وہاں اپنی کمپنی کے لیے بجلی کا سامان خریدنے گئے تھے — دراصل یہ دِیوں کا سمراٹ انھیں ذاتی کمیشن کے طور پر بھینٹ کیا گیا تھا۔ مال سپلائی والی امریکن الیکٹرک کمپنی کی طرف سے۔ اور اس کو دیکھتے ہی سیٹھ لکشمی داس نے سوچ لیا تھا کہ اب کے بار دیوالی پر یہ امریکین دیا ہی دیوی لکشمی کا سواگت کرے گا۔ اور آج شام ہی سے یہ دیا اپنی بھڑکیلی امریکن شان سے جل رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف دس ہزار اور روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سیٹھ لکشمی داس کا کہنا تھا کہ سب تہواروں میں دیوالی ہی سب سے اہم اور برتر تہوار ہے۔ دیوالی کی رات کو جہاں اس کا سواگت کرنے کو روشنیاں ہوتی ہیں وہاں دیوی لکشمی آتی ہے۔ سو وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ ہر دوسرے سیٹھ اور بیوپاری کے گھر سے زیادہ روشنیاں لکشمی محل میں ہونی چاہئیں۔ ان کو یقین تھا کہ جتنی روشنیاں زیادہ ہوں گی اتنی ہی زیادہ لکشمی دیوی کی مہربانی بھی ہوگی اور شاید تھا بھی یہ سچ۔ بیس بائیس برس پہلے جب ان کی چھوٹی کپڑے کی دوکان تھی تب ان کے گھر میں کڑوے تیل کے سو دیے جلا کرتے تھے۔ پھر جنگ ہوئی اور ان کو فوجی کمبل سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مل گیا تو ان کے نئے گھر میں ایک ہزار دیے جگمگانے لگے۔ پھر جب آزادی آئی اور سیٹھ لکشمی داس کو ایک بہت بڑے ڈیم بنانے کے لیے مزدور سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مل گیا تو دیوالی کی رات کو ان کے بنگلے پر پانچ ہزار بجلی کے بلب جگمگا اٹھے اور اس سال جب کہ انھوں نے ایک امریکن کمپنی کے ساتھ مل کر کئی کروڑ روپے کا کارخانہ قائم کر لیا تھا جس میں انھیں لاکھوں روپے مہینے کی آمدنی کی اُمید تھی، اگر انکم ٹیکس افسر کوئی گڑبڑ نہ کرے۔

اس مرتبہ تو انھوں نے اپنے لکشمی محل میں ایسی روشنی کی تھی کہ ایک بار تو دیوی لکشمی کی آنکھیں بھی چکاچوند ہو جائیں۔ اتنی بہت روشنیاں اور خصوصاً امریکن دیوں کے سمراٹ کو دیکھ کر دیوی خوش ہو گئی تو کون جانتا ہے اگلی دیوالی تک سیٹھ جی پانچ چھ اور کارخانے اور دو چار بینک خریدنے کے قابل ہو جائیں۔

ہاں تو دیوالی کی رات تھی اور سیٹھ صاحب الیکٹریک انجینئر کو ہدایت دے رہے تھے کہ بجلی کے کنکشن اور فیوز وغیرہ کا خاص خیال رکھے کیونکہ کسی کی بھول سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی بجلی فیل ہو کر اندھیرا ہو گیا تو خطرہ ہے کہ دیوی لکشمی ناخوش ہو کر اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نہ چلی

جائے۔ اس لیے الیکٹریک انجینئر نے ایک جنریٹر بھی لگایا ہوا تھا تاکہ پاور کے کرنٹ میں کوئی گڑبڑ ہو تو جنریٹر سے بنائی ہوئی بجلی کام آئے۔

یکایک سیٹھ صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے محل بھر میں لگے ہوئے سارے بجلی کے قمقموں کی روشنی اور تیز ہو گئی ہو— 'دیوی لکشمی آ گئی' انھوں نے خوش ہو کر کہا۔ مگر انجینئر نے سمجھایا کہ کرنٹ کے گھٹنے بڑھنے سے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ روشنی زیادہ یا کم ہو جاتی ہے۔

'تو پھر تمھاری ڈیوٹی یہ ہے کہ دیکھتے رہو کہ روشنی زیادہ ہوتی رہے۔ ایک پل کے لیے بھی کم نہ ہو۔'

یہ کہہ کر سیٹھ صاحب برآمدے کی سنگِ مرمر کی سیڑھیاں اُتر کر باغ کی طرف آ رہے تھے۔ جہاں ہر پیڑ کی شاخوں میں جگمگاتے ہوئے 'پھل' جھول رہے تھے کہ انھوں نے ایک عورت کو سڑک پر کھڑا دیکھا۔

عورت گاؤں سے آئی لگتی تھی۔ اس کے بدن پر میلا گھاگرا تھا۔ جس کا رنگ کبھی لال رہا ہوگا۔ اسی رنگ کی چولی تھی اور سر پر اوڑھنی تھی۔ وہ بھی موٹے لال کھدّر کی مگر چھپی ہوئی۔ اپنے سر پر وہ میلے کچیلے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی ایک گٹھری اٹھائے ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے نہ صرف میلے تھے بلکہ پھٹے پُرانے پیوند بھی لگے تھے۔

'کوئی غریب بھکارن ہوگی' سیٹھ لکشمی داس نے دل میں سوچا۔

'کیوں مائی کیا چاہیے؟' انھوں نے سیڑھیاں اُترتے پوچھا اور قریب جانے پر انھوں نے دیکھا کہ عورت غریب سہی مگر جوان ہے اور رنگت سانولی ہونے پر بھی خوبصورت ہے۔

'ایک رات کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیے، سیٹھ جی بڑی دور سے آئی ہوں۔'

'نا بابا معاف کرو' وہ جلدی سے بولے۔ من ہی من ہی انھوں نے سوچ لیا تھا کہ ایک انجانی غریب جوان عورت کو رات بھر کے لیے گھر میں رکھنے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے راتوں رات گھر میں روپیہ پیسہ یا زیور سونا چُرا کر بھاگ جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اُسے بلیک میل کر کے روپیہ وصول کرے۔ سیٹھ جی کا لڑکا جوان تھا۔ وہ کہیں اس انجانی عورت کے چکّر میں نہ آ جائے۔

پھر بھی انھوں نے سوچا دیوالی کی رات ہے۔ کسی بھکارن کو دھتکارنا بھی نہیں چاہیے۔

'بھوکی ہو تو کھانا کھلوائے دیتا ہوں۔لڈو، پوری جو جی چاہے کھاؤ۔'

'میں بھکارن نہیں ہوں سیٹھ جی۔'

اس نے اپنے سر پر دھری ہوئی گٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔'میرے پاس کھانے کو بہت کچھ ہے۔مکئی کی روٹی ہے، چنے کا ساگ، گاؤں کا اصلی گھی ہے۔ دہی ہے، دودھ ہے۔آپ کے سارے گھر کو پیٹ بھر کے کھلا سکتی ہوں۔ مجھے تو رات بھر ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیے۔'

اس کی حاضر جوابی سے سیٹھ جی اور گھبرا گئے۔انھوں نے سوچا ایک معمولی گاؤں کی عورت کی ہمت نہیں ہوسکتی کہ یوں سوال جواب کرے۔کہیں یہ عورت انکم ٹیکس والوں کی سی آئی ڈی تو نہیں ہے؟

'نا بابا معاف کرو، ہمارے گھر میں جگہ نہیں ہے۔کوئی دوسرا گھر دیکھو۔'

'تو پھر دوسرا ہی گھر دیکھنا پڑے گا سیٹھ جی۔'یہ کہا اور وہ عورت اپنی گٹھری سنبھالتی ہوئی چلی گئی۔

سیٹھ جی مڑ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے واپس برآمدے میں جا رہے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس امریکن دیے کی روشنی کچھ پیلی پڑتی جا رہی ہے۔'یہ پاور ہاؤس کا کرنٹ پھر نیچے جا رہا ہے۔'اور پھر چلا کر کہا۔'انجینئر جنریٹر تیار رکھو۔ دیے بجھنے نہ پائیں۔ الیکٹریک انجینئر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا:

سیٹھ جی کرنٹ بالکل ٹھیک آ رہا ہے۔ویسے جنریٹر بھی تیار ہے۔آپ بالکل نہ گھبرائیے۔

'گھبراؤں کیسے نہیں؟' سیٹھ جی کا دل نہ جانے کیوں ایک عجیب بے چینی سے دھڑک رہا تھا۔جانتے نہیں دیوالی کی رات ہے؟ایک پل کو بھی اندھیرا ہو گیا اور وہی دیوی کے آنے کا سے ہوا اور دیوی روٹھ کر کہیں اور چلی گئی۔۔۔تو۔۔۔تو۔۔۔؟

دوسرا دیا:

انکم ٹیکس افسر لکشمی کانت تیل کی بوتل لے کر اپنے فلیٹ کی بالکنی میں نکلا تو اس نے دیکھا کہ سامنے سیٹھ لکشمی داس کا محل بجلی کی روشنیوں سے جگمگا رہا ہے۔

'ہاں کیوں نہ ہو!' اس نے سوچا کروڑوں روپیہ بلیک کا جو موجود رکھا ہے۔دس ہزار کیا دس

لاکھ بجلی کے بلب لگا سکتا ہے۔''

پھر اس نے دیکھا کہ اس نے اپنی بالکنی کی منڈیر پر جو سو دیے اس نے سجا رکھے ہیں، ان میں سے ایک دیے کی لَو دھیمی ہوئی جا رہی ہے۔ اس نے گھبرا کر سوچا 'کہیں دیا بجھ نہ جائے، شگون ہی بُرا نہ ہو جائے!' اور جلدی سے اس نے بوتل تیل دیے میں اُلٹ دیا۔ دیا سلائی سے لَو بھی اوپر کی تو اُسے ایسا لگا کہ نہ صرف اس دیے کی بلکہ سو کا سو دیوں کی روشنی ایک دم سے تیز ہوگئی۔

دھنیہ ہو، دیوی اُس نے دیوار پر لکشمی کی تصویر کے آگے پرنام کرتے ہوئے کہا 'اِس برس تو تمھاری بڑی کرپا رہی ہے'۔

پھر اس نے کرسی پر آرام سے بیٹھ کر اپنا جاسوسی ناول اٹھایا جو ختم کے قریب تھا اور جس کا ہیرو اس وقت ڈاکوؤں کی سنہری ٹولی کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو رسوئی میں سے اس کی بیوی چلائی 'ـــ اجی اوـــ ذرا دیکھنا تو کون ہے؟'

'منگو سے کہو نا، دیکھے کون ہے' اس نے ناول سے نظر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

'منگو کو میں نے بازار بھیجا ہے، مٹھائی لانے' رسوئی سے آواز آئی۔

'تو گنگا کو بھیجو!' گنگا ان کے یہاں برتن مانجھنے پر ملازم تھی اور صبح شام کام کرنے آتی تھی۔

'گنگا مُردار تو آج چھٹی منا رہی ہے۔ کہتی تھی، بائی ہماری بھی آج دیوالی ہے۔ آج ہم کام نہیں کریں گا۔ سو میں نے بھی چڑیل کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔

گھنٹی ایک بار پھر بجی۔

'اچھا، اب تم ہی اٹھ جاؤ ناـــ ضرور سیٹھ جی کے ہاں سے مٹھائی آئی ہوگی'۔

'کیا صرف مٹھائی ہی آئی ہے یا کچھ اور؟' اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

مگر جب اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا، سیٹھ جی کا ملازم نہیں ہے۔ ایک عورت کھڑی ہے۔ عورت صورت سے گنوار لگتی تھی۔ کپڑے بھی پھٹے پرانے تھے۔ سر پر ایک میلے سے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی ایک گٹھری تھی مگر تھی جوان اور خوبصورت، لکشمی کانت نے دل ہی دل میں سوچا۔ جوانی اور خوبصورتی پر بھی انکم ٹیکس لگنا چاہیے۔

مگر اونچی آواز سے اس نے پوچھا 'کیوں، کیا چاہیے؟'

بابو جی! بڑی دور سے آئی ہوں۔ گھر لوٹنے کا سے نہیں رہا۔ ایک رات کو ٹھہرنے کا ٹھکانہ مل جائے تو بڑی کرپا ہوگی۔ میں کہیں کونے میں پڑ رہوں گی۔'

لکشمی کانت نے ایک بار پھر اس عورت کی جوانی کا جائزہ لیا پھر مڑکر کن انکھیوں سے رسوئی کی طرف دیکھا جہاں اس کی بیوی بیٹھی پوریاں تل رہی تھی۔ لاجو موٹی تھی۔ اس کے منہ پر چیچک کے نشان تھے مگر وہ جہیز میں دس ہزار نقد لائی تھی۔ اس کے سب رشتہ داروں نے مبارک باد دے کر کہا تھا۔ لکشمی کانت سچ مچ تیرے گھر میں تو لکشمی آئی ہے۔

لکشمی کانت نے اپنی بیوی کو دیکھا اور اس کے ہاتھ میں پوریاں بیلنے کے لیے جو لکڑی کا بیلن تھا اور پھر ہلکی سی ٹھنڈی سی سانس لے کر اس انجانی عورت کی طرف مخاطب ہوا:

'آئی کہاں سے ہو؟'

'بڑی دور سے آئی ہوں بابو جی، مگر اس وقت تو سیٹھ لکشمی داس کے ہاں سے آئی ہوں'۔

'کیوں سیٹھ جی نے تمھیں نکال دیا......؟'

'ہاں بابو جی، یہی سمجھو نکال ہی دیا'۔

'اور وہاں سے تم سیدھی یہاں چلی آئیں'۔

'ہاں بابو جی!'

لکشمی کانت نے کتنے ہی جاسوسی ناول پڑھے تھے اور اسے معلوم تھا کہ اگر کوئی سرمایہ دار کسی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا ہتھیار کوئی ایسی عورت بھی ہو سکتی ہے۔

'تو سیٹھ جی نے مجھے یہ دیوالی کی بھینٹ بھیجی ہے؟' اس نے دانت بھینچ کر کہا۔

'اس گٹھری میں کیا ہے؟'

'اس میں مکئی کی روٹی ہے بابو جی، چنے کا ساگ ہے اور گاؤں کا اصلی گھی ہے اور دودھ ہے۔ دہی ہے۔'

'بس بس رہنے دو'۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب بکواس ہے۔ جاسوسی ناولوں کے مطابق اس گٹھری میں زیور ہوگا۔ نشان لگے ہوئے نوٹ ہوں گے۔ رات کو یہ گٹھری اس گھر میں چھوڑ کر یہ عورت چمپت ہو جائے گی اور جب سیٹھ اس کو پکڑوانے کی دھمکی دے گا تو بغیر کچھ لیے دیے اس

کے انکم ٹیکس کے رٹرن پاس کرنے ہوں گے۔

'جاؤ دوسرا گھر دیکھو'اس نے عورت کی جوانی کا آخری بار جائزہ لینے کے بعد ایک اور ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر دیا۔

'کون تھا؟' لاجو رسوئی سے چلّائی۔

'کوئی نہیں—'

'کوئی نہیں تھا تو اتنی دیر کس سے باتیں کر رہے تھے'۔

'میرا دماغ مت کھاؤ۔ کوئی بھکارن تھی'۔

بھکارن تھی تب ہی اتنی دیر تک میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے، میں تمھیں خوب......

ایک بار پھر گھنٹی بجی

دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

'جاؤ لگتا ہے پھر تمھاری بھکارن آئی ہے'۔ بیوی نے حکم دیا۔

لکشمی کانت نے دروازہ کھولا تو سفید وردی پہنے ایک ڈرائیور ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا سنہری ڈبہ لیے کھڑا تھا۔

'سیٹھ لکشمی داس نے دیوالی کی مٹھائی بھیجی ہے'۔

لکشمی کانت ڈبہ لے کر اندر آیا تو لاجو نے جلدی سے ڈبہ لے لیا اور ڈرائیور سے چلّا کر بولی' اچھا بھائی سیٹھ جی سے ہمارا نمستے کہنا اور دیوالی کی مبارک باد'۔

دروازہ بند کر کے لکشمی کانت کمرے میں داخل ہی ہو رہا تھا کہ بیوی نے پھر ڈانٹا۔' ارے یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جلدی سے دیوں میں تیل ڈالو۔ ان کی روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔

## تیسرا دیا:

دیا صرف ایک تھا جو جھونپڑی کے سامنے ٹمٹما رہا تھا۔ دیے میں تیل بھی بہت کم تھا۔

اندر کھاٹ پر لکھو پڑا تھا۔ اس کا نام کبھی لکشمی چند ہوتا تھا۔ جب وہ اپنے گاؤں سے چل کر شہر آیا تھا مگر مل میں اور جھونپڑیوں کی بستی میں اسے لکھو ہی لکھو کہتے تھے۔ غریب مزدور کو اور

خصوصاً جب وہ بے کار ہو اور بیمار بھی ہو، بھلا کون لکشمی چند کہہ سکتا تھا۔

اس کی بیوی گنگا ایک کونے میں بنے ہوئے چولہے پر بھات پکا رہی تھی اور سوچتی جا رہی تھی کہ بچوں کو بھات کے ساتھ ساتھ کھانے کو کیا دوں۔ بارہ آنے گھر میں تھے۔ اس کی وہ لکھو کی دوا لے آئی تھی۔ مالکن نے کھڑے کھڑے نکال دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس نے دیوالی کی چھٹی مانگی تھی۔ پندرہ دن کی پگار باقی تھی وہ بھی نہیں دی تھی۔ کہہ دیا تھا 'دیوالی کے بعد آنا، آج کے دن ہم لکشمی کو گھر سے باہر نہیں نکالتے' اتنے میں اس کے دونوں بچے باہر سے بھاگتے ہوئے آئے۔ بڑا سات برس کا تھا لکشمن، اور چھوٹی چار برس کی تھی مینا۔

لکشمن بولا 'ماں، ماں سیٹھ جی کے محل میں اتنے دیے جل رہے ہیں کہ لگتا ہے رات نہیں دن ہے اور ایک دیا تو اتنا بڑا ہے کہ سب اسے دیوں کا سمراٹ بولتے ہیں'۔

اور مینا نے ٹھنک کر کہا 'ماں بھوک لگی ہے'۔

مگر لکشمن نے اسے ڈانٹ دیا۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ میں کہتا ہوں ماں، ہمارے ہاں۔ ایک ہی دیا کیوں جل رہا ہے؟ اس لیے بیٹا کہ ہم غریب ہیں۔ تیل کے پیسے نہیں کہ اور دیے جلا سکیں۔

اور کھانستے ہوئے لکھو نے کھاٹ پر سے آواز دی 'اری تو پھر یہ دیا بھی بجھا دے۔ اس جھونپڑی میں اندھیرا ہی ٹھیک ہے'۔

'ہائے رام' گنگا جلدی سے بولی — دیوالی کی رات کو دیا بجھا دوں؟ اندھیرے میں دیوی لکشمی نہیں آئے گی'۔

لکھو اتنی زور سے چلایا کہ پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ مگر کھانستے کھانستے بھی وہ بولتا گیا۔ 'دیوی سیٹھ لکشمی داس کے محل میں جائے گی۔ لکشمی چند کے گھر نہیں آئے گی — نہ بجھا چراغ — تھوڑی دیر میں تیل ختم ہو جائے گا تو آپ سے آپ ہی بجھ جائے گا'۔

لکشمن جو کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا چلایا — 'بابا۔ بابا۔ دیکھو ہمارے دیے کی لو آپ سے آپ اونچی ہوتی جا رہی ہے'۔

'پاگل ہوا ہے' لکھو اسے ڈانٹ ہی رہا تھا کہ یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گیا کہ باہر رکھے ہوئے دیے کی روشنی اب جھونپڑی میں بھی پھیلتی جا رہی ہے۔

دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔

گنگا نے دروازہ کھولا تو دیے کی روشنی میں دیکھا، ایک عورت کھڑی ہے۔

'کیا ہے بہن؟'

'ایک رات کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیے۔ بڑی دور سے آئی ہوں'۔

'تو اندر آؤ نا'۔

وہ عورت دروازہ میں سے اندر آئی تو اس کے ساتھ ہی چراغ کی روشنی بھی اندر آ گئی۔

لکھو نے کہا۔'ہمارے پاس تو بس یہی جھونپڑی ہے۔ ہوگی تو تکلیف، مگر اتنی رات گئے اور کہاں جاؤ گی۔ کھاٹ بھی ایک ہی ہے مگر میں اپنا بستر ادھر زمین پر کرلوں گا۔'

عورت زمین پر بڑے آرام سے پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی تھی۔'نہیں بھائی، تم بیمار ہو۔ تم کھاٹ پر سوؤ۔ میں تو دھرتی ہی سے نکلی ہوں۔ دھرتی ہی سے مجھے سکھ آرام ملتا ہے۔'

گنگا نے کہا:' لگتا ہے شہر میں پہلی بار آئی ہو۔ کہو دیوالی کی روشنیاں دیکھیں؟'

'ہاں'۔ عورت نے تھکی ہوئی سی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا'دیوالی کی روشنیاں بھی دیکھیں، دیوالی کا اندھیرا بھی دیکھا۔'

گنگا اس کا مطلب نہ سمجھی۔ لکھو بھی کھاٹ پر پڑا سوچتا رہا۔ یہ عورت تو کوئی بڑی ہی انوکھی باتیں کرتی ہے اور اس نے دفعتاً محسوس کیا کہ جیسے اس کی چھاتی پر سے کھانسی کا بوجھ آپ سے آپ اتر گیا ہو۔ وہ جو سات دن سے کھاٹ پر پڑا تھا، بے سہارا اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا' گنگا آج تو مجھے بھی بھوک لگی ہے نکال کھانا مہمان کے لیے بھی'۔

گنگا نے ہانڈی چولہے پر سے اتارتے ہوئے شرمندہ ہو کر کہا' بھات تو ہے مگر ساتھ کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ نہ جانے تم سوکھا بھات کھا بھی سکو گی بہن؟'

'تم میری فکر نہ کرو' عورت نے اپنی گٹھری سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

'میرے پاس سب کچھ ہے۔ دراصل یہ میں تمھارے لیے ہی لائی تھی'۔

'ہمارے لیے؟ پر تم تو ہمیں جانتی ہی نہیں تھیں'۔

'میں تمھیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں بہن۔ لکھو بھائی کو بھی، لکشمن اور بینا کو بھی'۔

یہ کہہ کر اس نے گٹھری کھولی تو کھانے کی خوشبو سونگھ کر بچے اس کے پاس آ گئے۔

'اس میں کیا ہے؟' لکھو نے کھاٹ سے اتر کر چولہے کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

عورت نے ایک ایک چیز نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

'یہ ہیں مکئی کی روٹیاں مکھن لگی ہوئی۔ یہ ہے چنے کا ساگ، یہ ہے گاؤں کا اصلی گھی، یہ ہے دیوالی کی مٹھائی۔ اصلی کھوئے کے پیڑے۔ یہ ہے دہی، اور اس لٹیا میں بچوں کے لیے گائے کا دودھ ہے۔ شہر کی طرح پانی ملا نہیں ہے'۔

اور یہ سن کر سب ہنس پڑے۔ مگر اتنا بہت کھانا دیکھ کر لکھو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ روٹی کا لقمہ بناتے ہوئے بولا 'یہ سب ہو تو پھر آدمی کو اور کیا چاہیے؟'۔

وہ کھانا کھاتے جا رہے تھے اور اس انجانی عورت کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے جا رہے تھے جو نہ جانے کہاں سے ان کے لیے یہ ساری نعمتیں لے کر آ گئی تھی۔

کھا کھا کر وہ سب آرام سے بیٹھے۔ تب گنگا نے کہا 'بہن آج تمھاری بدولت ہماری دیوالی ہو گئی'۔

اور لکھو ہنس کر بولا 'نہیں تو دیوالہ ہی دیوالہ تھا۔ تمھارا شکریہ کیسے ادا کریں بہن۔ ہمیں تو تمھاری پوجا کرنی چاہیے'۔

اور عورت نے کہا 'شکریہ تو مجھے تمھارا ادا کرنا چاہیے۔ میں اس سارے شہر میں پھری مگر کسی نے مجھے رات بھر کے لیے آسرا نہیں دیا۔ سوائے تمھارے سب محلوں کے، سب بنگلوں کے دروازے بند تھے۔ میرے لیے کھلا تھا تو صرف تمھاری جھونپڑی کا دروازہ۔ اب میں ہر برس تمھارے ہاں آیا کروں گی دیوالی پر'۔

گنگا نے کہا 'بہن تم کل سویرے چلی جاؤ گی تو ہم تمھیں یاد کیسے کریں گے؟ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تم کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو؟'

اور اس کا جواب سن کر وہ سب بڑی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ اس عورت نے کہا 'میں یہیں تم لوگوں کے پاس رہتی ہوں — میں ان کھیتوں کے پاس رہتی ہوں جہاں لکھو بھیا کے بابا اناج اگایا کرتے تھے اور میں اس کارخانے میں بھی رہتی ہوں، جہاں لکھو بھیا مشینوں سے کپڑا بنتے

ہیں۔ جہاں کہیں انسان اپنی محنت سے اپنی ضروریات پیدا کرتا ہے، میں وہیں رہتی ہوں اور دیوالی کی رات کو میں ہر اس گھر میں پہنچ جاتی ہوں۔ جہاں ایک چراغ میں بھی مجھے انسانیت اور سچی محبت جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے'۔

تھوڑی دیر جھونپڑی میں سناٹا رہا۔ اب اس اکلوتے ننھے سے دیے کی روشنی اتنی تیز ہوگئی تھی کہ جھونپڑی کا کونا کونا جگمگا اٹھا تھا اور دور سیٹھ لکشمی داس کے محل میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ شاید کرنٹ اور جنریٹر دونوں فیل ہو گئے تھے اور بابو لکشمی کانت کی بالکنی کے سارے دیے بھی تیل ختم ہو کر بجھ گئے تھے۔

دیوی! گنگا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا 'تمھارا نام کیا ہے؟'

اور اس عورت نے مسکرا کر جواب دیا 'لکشمی'۔

O

# سلمٰی اور سمندر

'سلمٰی'

'ہوں'

'خوش ہو۔۔۔؟'

'ہوں'

'کتنی خوش ہو؟'

اتنی خوش ہوں...... اتنی خوش ہوں...... کہ بتا نہیں سکتی۔

اور بڑی بڑی کالی آنکھیں جو کاجل کی غیر ضروری لکیروں کے بغیر بھی بہت خوبصورت تھیں، آہستہ آہستہ پلکوں کے پردے میں چھپتی گئیں۔ جیسے غلافی پپوٹے اتنی محبت، اتنی مسرت کا بوجھ نہ سنبھال پاتے ہوں۔

'ایشائی آنکھیں' جن کے بارے میں ایک نوجوان انگریز شاعر نے ایک 'سانیٹ' لکھا تھا۔ جہاندیدہ آنکھیں جنھوں نے لندن کا ویسٹ منسٹر اور روم کا بینٹ ہال اور پیرس میں سونالی زا اور قاہرہ کے اہرام مصر اور نیویارک کے فلک بوس اسکائی اسکریپر دیکھے تھے مگر جن میں محبت کی میٹھی آگ آج پہلی بار بھڑکی تھی۔

انور نے جھک کر اپنی بیوی کی بند آنکھوں کو چوم لیا۔

سلمیٰ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی بڑے ہی خوبصورت اور میٹھے اور سُریلے احساس کی نرم نرم لہریں اس کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی ہستی کو اس احساس کے سُپرد کر رہی ہے۔ وہ نرم نرم لہریں اس پر سے گزر رہی ہیں۔ وہ ان میں ڈوب رہی ہے۔ وہ ان میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔

نرم نرم لہریں اس کے تخیل کے کسی کونے میں' جہاں شعور اور لاشعور کی سرحدیں ملتی ہیں ایک عجیب سی موسیقی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ جیسے شہد کی مکھیاں بھیرویں کا الاپ گنگنا رہی ہوں— نہیں یہ شہد کی مکھیاں نہیں۔ یہ بھڑیں، لاکھوں بھڑوں کی اُفق تک پھیلی ہوئی لہر اور ان کے ڈنکوں کے میٹھے زہر میں وہ ڈوب رہی ہے اور ڈوب جانا چاہتی ہے۔ مر رہی ہے اور مر جانا چاہتی ہے۔

اور پھر ایک مدھم شور، ماضی کے افق سے سرسراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ سمندر کی اُٹھتی ہوئی لہروں کا شور، نرم نرم ریت پر متواتر پانی کی محبت بھری مار کو شور۔ مگر دیر تک محبت کے سمندر میں ڈوبی ہوئی عورت یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ شور ان کے مکاں کے باہر ہے یا خود اس کے من کے اندر ہے۔ شاید یہ میرے براگیختہ دماغ کا واہمہ ہے۔ اس نے سوچا۔ شاید میرے عمر بھر کے خوف اور خدشے اس عمیق مسرّت کے لمحے میں مجھے ڈرانے دھمکانے کے لیے یہ شور کر رہے ہیں۔ میں آج ان کی آواز سنوں گی۔ میں ان سے نہیں ڈروں گی، نہیں ڈروں گی، نہیں ڈروں گی۔۔۔

اس کے دل کی دھڑکن کی لے تیز ہو رہی تھی— نہیں سنوں گی، نہیں ڈروں گی، نہیں سنوں گی، نہیں ڈروں گی، مگر سمندر کی طوفانی لہروں کی لے بھی اتنی ہی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ لہریں نرم ریت ہی پر نہیں پھیل رہی تھیں۔ اب وہ چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب وہ لہریں خود ان کے مکان کی دیواروں پر دستک دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں سمندر— اس کا پرانا دشمن— جو کب سے اس کی جان کے درپے تھا، اس کمرے میں آن پہنچے گا اور سلمیٰ کو، اس کے شوہر اور ان کے مسرّت بھرے اس لمحے کو بہا کر لے جائے گا اور ان کا گلا گھونٹ کر اپنی ہیبت ناک کالی گہرائی میں ہمیشہ کے لیے سلا دے گا۔

محبت اور مسرت کے لمحے کی گہرائی سے سلمیٰ کی چیخ نیم اندھیرے کمرے میں گونجی اور پھر

لہروں کے شور میں کھو گئی۔

'سلمٰی! میری جان! کیا ہوا؟ ڈر گئیں۔۔۔؟'

انور نے سرہانے رکھے ہوئے لیپ کا بٹن دبا کر روشنی کی اور اس نے دیکھا کہ سلمٰی کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ اس کی پیشانی پسینے سے چمک رہی ہے اور اس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے ہیں اور اس نے ان تھرتھراتے ہوئے نرم اور نازک چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ ایسے لگے جیسے وہ سہمے ہوئے کبوتر کے بچوں نے باز سے ڈر کر ماں کے پروں میں پناہ لے لی ہو......

(انور نے سوچا کتنے ملائم، کتنے نازک ہیں سلمٰی کے ہاتھ، ان ہاتھوں نے کبھی ترکاری نہیں چھیلی، کبھی مسالہ نہیں پیسا، کبھی بانوں کے پلنگ نہیں بُنے، کبھی برتن نہیں مانجھے، کبھی کپڑے نہیں دھوئے ان ہاتھوں نے تو پارکر اور شیفر قلم سے فلسفے کے لیکچر نوٹ ہی لکھے ہیں۔ یہ بات صرف پیانو کے پردوں پر ہی پڑے ہیں۔ ان کی انگلیاں کبھی ستار کی مضراب سے زخمی نہیں ہوئیں)

(اور سلمٰی نے سوچا انور اتنا بڑا ڈاکٹر ہے لیکن اس کے ہاتھ تو ایسے مضبوط اور کھر دُرے ہیں، جیسے کسی لوہار کے ہوں، کسی کان کن یا سڑک کوٹنے والے کے۔ اگر، جب ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے اندھیرے میں انور سے ہاتھ ملایا ہوتا اور اس کے حساس چہرے کی نرم مسکراہٹ نہ دیکھی ہوتی، اس کی ہمدردی میں رچی ہوئی آواز نہ سنی ہوتی۔ اس کے سلجھے ہوئے دماغ کی تلوار جیسی کاٹ کا زخم نہ کھایا ہوتا تو وہ کبھی ایسے غیر شاعرانہ ہاتھوں میں اپنی زندگی اور محبت نہ سونپتی! مگر کتنی پُر یقین محبت تھی ان سخت ہاتھوں کی گرمی میں۔ کتنی پُر سکون عافیت، کتنا پُر خلوص انداز اور عہد)

ٹھنڈے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ٹھہر گئی۔ دھڑ دھڑ کرتے ہوئے دل کی لے پُر سکون ہوتی گئی اور انور کی آواز سلمٰی کو ایسی لگی جیسے زخم پر کوئی پھاہا رکھ دے (کیوں نہ ہو۔ اس نے سوچا۔ میرا شوہر ڈاکٹر جو ہے)

'کیا ہوا؟ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا کیا؟'

'خواب نہیں۔ سمندر۔'

'سمندر؟'

'ہاں۔ سمندر مجھے اچھا نہیں لگتا۔'

لہروں کے شور سے ڈر گئیں؟ تم سچ مچ بچی ہو!'

(سلمیٰ نے سوچا انور میری جان، میرے پیارے شوہر۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تب ہی تو میں نے نہ جانے کتنے رئیسوں، لکھ پتیوں، کرنیلوں، ادیبوں اور شاعروں کو چھوڑ کر تم سے شادی کی ہے۔ مگر خدا کے لیے مجھے 'بچی' نہ کہا کرو۔ مجھے اس لفظ سے چڑ ہے۔ میں بچی نہیں ہوں۔ میری عمر تیس برس ہے۔ میں نے کیمبرج سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ میں اکیلی ساری دُنیا گھوم چکی ہوں۔ میں نے بین الاقوامی شہرت کے عظیم ترین فلسفیوں کی کانفرنس میں شرکت کی ہے۔ میری تقریر سن کر ایک جرمن فلسفی نے مجھ سے کہا تھا کہ "تم ایشیائی نوجوانوں کے دماغ کتنے سنجیدہ پُرسکون اور سلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ تمھارے مقابلے میں ہمارے نوجوان فلسفی تو ضدی بچے لگتے ہیں۔ میں دنیا کے بڑے بڑے دانشوروں، ادیبوں، فلسفیوں اور آرٹسٹوں سے مل چکی ہوں۔ اور ان میں سے ہر ایک سے اس کی ہی دماغی سطح پر بات چیت کی ہے۔ اور تم مجھے 'بچی' کہتے ہو اور جس طرح تم مجھے 'بچی' کہتے ہو۔ اس میں مجھے مذاق کا نہیں رحم اور ہمدردی کا جذبہ معلوم ہوتا ہے بلکہ ہلکی سی حقارت کا شبہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے تمہاری رائے میں میں کم فہم ہوں۔ ناتجربہ کار ہوں۔۔۔ ضدی ہوں)

مکان کے باہر اور خود سلمیٰ کے من کے اندر لہروں کا شور بڑھتا ہی رہا۔

'انور! مجھ سے ایک وعدہ کرو۔'

'جو تم کہو۔۔۔'

'وعدہ کرو کہ یہ مکان چھوڑ دو گے۔ سمندر کے اتنے قریب میں نہیں رہ سکتی۔'

'میری جان! تو دوسرا مکان تلاش کریں گے۔ لیکن سمندر سے تمھیں اتنی نفرت کیوں ہے؟'

'مجھے سمندر سے ڈر لگتا ہے۔'

'مگر کیوں؟'

'یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس مجھے سمندر کے خیال ہی سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔'

'بڑی ہی عجیب بات ہے۔'

مکان کے باہر اور اس کے من کے اندر سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ سلمیٰ کا منہ چڑا رہی تھیں۔ 'تم ہم سے بچنے کے لیے اپنے شوہر کی آغوشِ محبت میں چھپ جانا چاہتی تھیں نا۔ مگر ہم نے تمھیں وہاں بھی ڈھونڈھ نکالا۔ تم ہم سے نہیں بچ سکتیں۔ نہیں بچ سکتیں۔ نہیں بچ سکتیں۔ ہم تمھارے شوہر کو بھی تم سے چھین لیں گے۔ ہم تم دونوں کی محبت کا گلا گھونٹ دیں گے۔ سمندر کی طاقت بے پناہ ہے۔'

(اور انور سوچ رہا تھا 'سلمیٰ بہت حسین ہے۔ بہت ذہین ہے۔ بہت اچھی ہے۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت جو میں نے آج تک کسی سے نہیں کی لیکن کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہ سکیں گے؟ مجھے سمندر کے قریب رہنا اتنا پسند ہے اور اسے سمندر کی آواز سے بھی ڈر لگتا ہے۔ لاڈ پیار میں پلی ہوئی امیر لڑکیوں کو زیادہ ہی ڈر لگتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ وہ سر عظیم اللہ کی بیٹی ہے جو ہائی کورٹ کے جج تھے اور جنھوں نے لاکھوں روپے بیرسٹری سے کمائے تھے۔ جنھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو انگریز نرسیں رکھ کر پالا تھا اور بچپن ہی سے اُسے انگلستان کے اسکولوں میں اور پھر کیمبرج یونی ورسٹی میں تعلیم دلوائی تھی۔ سلمیٰ میں سب اچھائیاں ہیں وہ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے لیکن اس کا خاندانی ماحول مجھ سے کتنا مختلف ہے۔ وہ سنگِ مرمر کے فرش اور سنگِ سیاہ کے ستونوں والی محل نما عظیم منزل میں پیدا ہوئی اور میں پیدا ہوا راجا صاحب کرم پور تعلقہ دار کے ہاتھی کے اصطبل میں۔ وہ بچپن میں کھیلی انگریز کمشنر صاحب کے بچوں کے ساتھ اور میں کھیلا راجا صاحب کے سائیسوں، پالکی برداروں اور کہاروں کے بچوں کے ساتھ اور اپنا بچپن یاد کر کے وہ آپ سے آپ مسکرایا)

'کیوں کیا سوچ کر مسکرا رہے ہو؟' سلمیٰ نے انور کے بازو پر سر رکھتے ہوئے نظر اٹھا کر پوچھا۔ ''میں سمندر سے ڈرتی ہوں، اسی لیے تم مجھے بے وقوف اور ڈرپوک سمجھتے ہو نا؟ شاید تم مجھے پاگل بھی سمجھتے ہو؟ شاید تم سوچتے ہو کہ ایک دن اس پگلی کے دماغ کا آپریشن کرنا پڑے گا۔'

'نہیں میری جان!'

اس نے سلمیٰ کے گھنگھریالے کٹے ہوئے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

'میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا'

اور وہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بدستور رہی۔

(وہ سوچ رہا تھا) ''میں بھی تم سے کم تھوڑا ہی ہوں۔ تم نے بچپن میں مسوری اور نینی تال میں گھوڑے کی سواری کی ہے تو میں نے ہاتھی کی سواری کی ہے۔۔ جب تمھارے بابا ولایت میں بیرسٹری پڑھنے کے لیے گئے ہوئے تھے ان دنوں میرے بابا راجا صاحب کے مہاوت تھے۔ ان کی ہتھنی لکشمی اور اس کے بچے راجا کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ راجا اور میری ایک ہی عمر تھی۔ جب میں گڈلیاں چلتا تھا اس وقت سے میں اصطبل میں اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو میرے بابا مہاوت رمضان علی اپنی پیلی پگڑی باندھ کر لکشمی کو راجا صاحب کی سواری کے لیے تیار کرتے۔ سنہری جھول پہناتے، چاندی لگا ہودہ کستے، تو میں بھی کود کر راجا پر سوار ہو جاتا اور بالکل جیسے بابا لکشمی کو لوہے کے انکش سے گود کر چلاتے، میں بھی ایک نیم کی ٹہنی کو توڑ کر راجا کے ماتھے میں چبھوتا اور کہتا 'چل رے ہاتھی کے بچے، چل چل چل'۔ پھر کسی دکھ بھری یاد نے اس کی مسکراہٹ کو اس کے چہرے سے سمیٹ لیا اور انور کی سانولی مگر شفاف پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں۔

(سلمیٰ نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں اپنے شوہر کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں اور برابر سوچ رہی تھی۔ اپنے خیالات میں کھو کر نہ جانے یہ کہاں چلے جاتے ہیں۔ مجھ سے دُور، بہت دُور، شاید اپنے ماضی میں۔ جس کے بارے میں وہ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں تمھیں سب کچھ بتانا چاہتا ہوں مگر میں ماضی سے ڈرتی ہوں اپنے ماضی سے بھی اور ان کے ماضی سے بھی۔ اس پُر اسرار تہہ خانے کے دروازے بند ہی رہیں تو بہتر ہے۔ ایک بار کھل گئے تو نہ جانے ماضی کی کیسی کیسی یادوں کے جن اور بھوت آزاد ہو کر ہماری خوشی اور محبت کو تہ و بالا کر دیں۔ نہیں، انور پیارے! میں تمھارے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتی۔ مگر پھر اس عورت نے جو کیمبرج کی پڑھی ہوئی یونانی فلسفہ کی ماہر کے لاشعور میں چھپی بیٹھی تھی۔ اس کے کان میں پھُس پھُسایا 'ہو سکتا ہے کہ یہ کسی اور عورت کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ شاید کوئی ڈاکٹرنی جو ان کے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہو۔ شاید کوئی اسپتال کی نرس یہ نرسیں بھی تو بعض بڑی حسین ہوتی ہیں اور پھر انھوں نے تو ایڈنبرا میں بھی پڑھا ہے۔ وہاں ضرور کسی بھورے بالوں والی

انگریز یا اسکاٹ لڑکی سے معاشقہ کیا ہوگا۔ اس وقت انھیں اس کی یاد تو نہیں آ رہی ہے؟')

(انور سوچ رہا تھا کہ زندگی کے واقعات کا تسلسل بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ آج سے پچیس برس پہلے اگر اس دن لکشمی نے مست ہو کر راجا صاحب کے بڑے لڑکے راجندر کا رخ نہ کیا ہوتا، جو فیل خانے کے باہر کرکٹ کھیل رہا تھا۔ اگر انور کے بابا رمضان علی مہاوت نے راجندر کی جان بچانے کے لیے اپنی جان نہ دی ہوتی، اگر راجا صاحب نے یتیم انور سے یہ نہ پوچھا ہوتا! کیوں بیٹا تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اور اگر نو برس کے بچے نے نہ جانے کیسے یہ نہ کہا ہوتا کہ راجا صاحب میں تو پڑھنا چاہتا ہوں، تو آج وہ کسی سرکس میں ہاتھیوں کو دیکھ بھال کرتا ہوتا یا کسی اصطبل میں کسی سیٹھ کے ریس کے گھوڑوں کی مالش کرتا ہوتا اور اس کی ایک تھکی ہوئی مرجھائے ہوئے جسم کی بیوی ہوتی اور آدھے درجن بچے ہوتے اور حسین سلمیٰ کا سَر آج کسی اور ہی کی آغوش میں ہوتا مگر راجا صاحب نے مرتے ہوئے مہاوت سے اپنا وعدہ پورا کیا تھا اور انور اسکول سے کالج، کالج سے میڈیکل کالج اور میڈیکل کالج سے ایڈنبرا یونیورسٹی اور لندن کے اسپتالوں تک ہو آیا تھا اب اس کا شمار ملک کے بہترین نوجوان سَرجنوں میں ہوتا تھا مگر لوگ سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر انور علی کے دماغ کا کوئی اسکرو ڈھیلا ہے کہ ہزاروں روپے کی پریکٹس کرنے کی بجائے سرکاری اسپتال میں سات سو روپے ماہوار جنرل وارڈ میں پڑے ہوئے مریضوں کے مُفت آپریشن کرتا ہے۔)

(اور ایک دن اس اسپتال میں اس کے پاس سلمیٰ آئی تھی اپنڈکس کا آپریشن کرانے اور اس نے کہا تھا میں تو اس آپریشن کے لیے ویئنا یا جنیوا یا لندن جانے والی تھی مگر گورنمنٹ ایکسچینج نہیں دیتی۔ آپ کی بڑی تعریف سنی ہے کہ آپ اپنڈکس کا آپریشن کرتے ہیں تو چوتھے دن مریض خود چل کر گھر چلے جاتے ہیں تو جس نرسنگ ہوم میں آپ کہیں، میں داخلہ لے لوں اور ڈاکٹر انور علی نے اسے بتایا تھا کہ اگر مجھ سے آپ کو آپریشن کرانا ہے تو آپ کو اسی گورنمنٹ اسپتال کے جنرل وارڈ میں داخلہ لینا ہوگا اور سر عظیم اللہ مرحوم کی نفاست پسند اور نازک مزاج بیٹی جنرل وارڈ کے خیال ہی سے کانپ اٹھی تھی اور اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ میں مر بھی جاؤں گی لیکن ان گندی مزدورنوں اور بھنگیوں کے ساتھ جنرل وارڈ میں نہیں رہوں گی۔ پھر بھی

ڈاکٹر انور علی سے معائنہ کروانے میں کوئی ہرج نہیں اور جب معائنے کے دوران میں انور کی سخت کھردری ڈاکٹری انگلیوں نے سلمٰی کے پیٹ کو چھوا تھا تو ان کے درد آشنا لمس میں ایسی عجیب ٹھنڈک، ایسی عجیب تسکین اور شفا تھی کہ سلمٰی نے فیصلہ کرلیا کہ اب آپریشن کراؤں گی تو اسی ڈاکٹر سے۔

اور سو وہ آپریشن کی میز پر لیٹی تھی اور کلوروفارم کے اثر سے بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر انور علی کی آنکھیں سرجن کی سفید نقاب میں سے مسکرا رہی ہیں اور یہ دیکھ کر اس نے اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور پھر کلوروفام کے بادل اس کے شعور پر چھا گئے تھے مگر ان بادلوں میں بھی وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کو گھور رہی تھیں۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ جنرل وارڈ میں انہی دوسری مریض عورتوں کے درمیان پڑی تھی اور اس کے برابر والے بیڈ کے چاروں طرف پہیوں والی سفید پردے دار دیواروں کو کھڑا کیا جارہا تھا۔ کیونکہ ایک بڑھیا بھکارن جو کسی کی موٹر کے نیچے آگئی تھی، چل بسی تھی اور دوسری طرف ایک نوجوان مزدورنی جس کے شوہر نے جوش رقابت میں اس کی ناک کاٹ لی تھی، اس شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اسے تسلی دیتی رہی تھی۔۔۔ اور تین دن تک اس ماحول میں وہ پڑی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ ڈاکٹر انور علی اسے دیکھنے آئے گا مگر دوسرے جونیئر ڈاکٹر آتے رہے اور وہ نہیں آیا کیونکہ سنا تھا کہ وہ کئی بڑے نازک دل کے آپریشن کررہا ہے۔ پھر چوتھے دن وہ آیا تھا اور اس نے سلمٰی کو ڈانٹ کر کہا تھا' یہ کیا، پلنگ پر کیوں لیٹی ہو۔ اٹھو اور وارڈ کے اس کونے تک چل کر جاؤ۔ سلمٰی نے کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب! میں کیسے چل سکتی ہوں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میری ٹانگوں میں دم ہی نہیں ہے۔ چلنا تو کیا۔ مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جائے گا اور ڈاکٹر نے کہا تھا یہ سب بکواس ہے۔ چلو اٹھو اور اس کے بولنے کے انداز میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سلمٰی سچ مچ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے وارڈ کے کنارے تک چلی گئی اور وہاں سے بلا سہارے واپس بھی آگئی تھی لیکن جیسے ہی وہ ڈاکٹر کے قریب آئی اس کو اپنی ٹانگوں میں دفعتاً لڑکھڑاہٹ اور کمزوری محسوس ہوئی اور وہ چکرا کر گرنے ہی والی تھی کہ انور نے اسے سنبھال لیا اور سلمٰی کو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی میں اسے سہارا دینے والے ہاتھ یہی ہیں۔ دو ہفتے بعد ان کی شادی ہوگئی تھی اور انور بیوی کو اپنے چھوٹے سے نئے مکان میں لے آیا تھا جو اس نے کئی ہزار روپے قرض لے کر بالکل سمندر کے

کنارے خریدا تھا مگر اس وقت اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سمندر کی قربت سلمٰی کے لیے اتنی بڑی سوہان روح ثابت ہوگی۔)

'مگر کیوں؟' اس نے پوچھا سلمٰی سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔

'کیوں کیا؟'

'سمندر سے تم کیوں ڈرتی ہو؟'

اور اسی وقت ان کے گھر کے باہر سمند کے کنارے بنے ہوئے پتھروں کے بندھ سے ایک لہر اتنے زور سے آکر ٹکرائی کہ سلمٰی اچھل پڑی۔

'میں نے کہا نا کہ کوئی خاص وجہ نہیں ہے — بس ڈر لگتا ہے۔'

'کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔ کیا تم نے کبھی کسی سائیکاٹرسٹ سے بات کی ہے۔'

'ہاں جب میں کیمبرج میں پڑھتی تھی۔ ایک نوجوان انگریز سائیکاٹرسٹ جارج رسل نے میرا نفسیاتی معائنہ کیا تھا۔'

اور اس کی کیا رائے تھے؟

'اس کا کہنا تھا کہ لاشعور کی دنیا میں سمند سمبل (علامت) ہے جنسی فعل کی اور اس کا خیال تھا کہ ضرورت سے زیادہ شریفانہ ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے میں اس قدرتی فعل سے خائف ہوں اور اس لیے سمندر سے ڈرتی ہوں۔''

'اور کیا یہ سچ تھا؟'

'نہیں وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ خود مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا۔'

'کیوں؟'

'وہ بہت خوبصورت تھا۔ سنہری گھونگھریالے بال تھے اس کے۔ باتیں بھی بڑی اچھی کرتا تھا۔ مگر —'

'مگر —؟'

'مگر شراب اور سگریٹ بہت پیتا تھا۔ اس کے دانت پیلے اور گندے تھے اور اس کے منھ سے پائیریا کی بو آتی تھی۔'

'اور کسی سے شادی کیوں نہیں کی؟'

'کوئی پسند نہیں آیا۔ کسی سے محبت کرسکتی تھی لیکن اس کی عزت نہیں کرسکتی تھی۔ کسی کی عزت کرسکتی تھی مگر محبت نہیں کرسکتی تھی۔ جب مجھے ایسا آدمی مل گیا جس سے میں محبت بھی کرسکتی ہوں اور اس کی عزت بھی کرسکتی ہوں تو اس سے شادی کرلی۔ بس اتنی حقیقت ہے میری نفسیاتی الجھنوں کی—'

'لیکن سمندر سے ڈر—یہ بھی ایک نفسیاتی الجھن ہے۔'

'ہوگی— مگر اب مہربانی کر کے سمندر کا ذکر مت کرو۔ کوئی اور بات کرو۔'

'تو سنو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں سلمیٰ۔ اگر میں ڈاکٹر نہیں شاعر ہوتا، تو خوبصورت الفاظ میں تمھیں بتاتا، کہ میں تمھیں کتنا چاہتا ہوں۔'

'اور ہماری محبت میں کبھی کوئی حائل نہیں ہوگا—؟'' سلمیٰ نے پوچھا۔ اور اس کے ذہن میں وہ لمحے تھے، جب انور نہ جانے کن خیالات میں کھو جاتا تھا۔

''نہیں میری جان۔ دنیا میں کوئی ہماری محبت میں حائل نہیں ہوسکتا۔''

اور اسی وقت گڑگڑاتی، پھنکارتی، چنگھاڑتی ایک لہر آئی اور اتنے زور سے بندھ سے ٹکرائی کہ سارا مکان ہل گیا اور چھینٹے ان کی کھڑکیوں تک پر پڑے۔

سلمیٰ کا چہرہ ایک بار پھر پیلا پڑ گیا۔

انور—مجھے ڈر لگ رہا ہے—اس نے شوہر کی آغوش میں بچوں کی طرح منہ چھپاتے ہوئے کہا—انور نے اپنے سینے پر گرم گرم آنسوؤں کو محسوس کیا۔ سلمیٰ رو رہی تھی۔

'میری پیاری۔ میری جان۔' وہ کہے جا رہا تھا لیکن اس کا ڈاکٹری دماغ اس عجیب وغریب خوف کی تشخیص کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باہر سمندر غرار ہا تھا، چنگھاڑ رہا تھا، دہاڑ رہا تھا، ایک بپھرے ہوئے دیو کی مانند۔
اندر سلمیٰ خوف سے کانپ رہی تھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ایک سہمی ہوئی بچی کی طرح۔

دیو غراتا رہا۔ چنگھاڑتا رہا، دہاڑتا رہا۔

بچی کانپتی رہی، روتی رہی، سسکیاں بھرتی رہی۔

یہاں تک کہ سمندر تھک کر ساحل سے لوٹ گیا۔

یہاں تک کہ بچی روتے روتے سوگئی مگر سوتے سوتے بھی وہ سسکیاں بھرتی رہی۔ شاید خواب میں بھی وہ ڈر رہی تھی۔

(تشخیص)

بچی جہاز کی ڈیک پر کٹہرے کے سہارے کھڑی لہروں کو گن رہی تھی جو جہاز سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔

'ایک، دو، تین، چار، پانچ۔'

ایک لہر کے بعد دوسری۔۔ ہر لہر پانی ہی کی بنی ہوئی تھی لیکن ہر لہر ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ کوئی اونچی، کوئی نیچی، کوئی مچھلی کی طرح سڈول، کسی کا اونٹ کی طرح کوہان نکلا ہوا، کوئی رینگتی ہوئی آتی تھی، کوئی دوڑتی ہوئی، کوئی جھاگوں سے بنا لیس کا سفید دوپٹہ اوڑھے۔ کوئی مس میری کی طرح نیلا فراک پہنے تھی تو کسی پر سورج کی روشنی سے ستارے جگمگا رہے تھے جیسے اماں کے کامدانی کے دوپٹے پر۔

'چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ۔'

بچی سوچ رہی تھی کہ اتنی بہت سی لہروں کو اللہ میاں کون سے اصطبل میں رکھتے ہوں گے۔ ہمارے گھر میں تو تین گھوڑے ہیں۔ ایک فٹن میں جوتا جاتا ہے اور دو جو سواری میں آتے ہیں اور ان کے لیے تین ہی اصطبل الگ الگ بنے ہوئے ہیں تو پھر جتنی لہریں یہ سمندر میں کودتی پھاندتی پھر رہی ہیں ان کے لیے بھی اتنے ہی اصطبل چاہئیں اور پھر جیسے ہر گھوڑے کو کھانے کے لیے دانہ چاہیے، گھاس چاہیے، پینے کو پانی چاہیے۔ تو ان لہروں کو کھانا پینا کون دیتا ہے۔ پینے کو پانی تو سمندر میں بہت ہے مگر یہ لہریں کھاتی کیا ہیں؟ ابھی بچی اس اہم مسئلے پر غور کر ہی رہی تھی کہ مس میری اپنا نیلا فراک پہنے اپنی موٹی موٹی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں مارتی آ گئیں۔ بچی نے ان کے قدموں کی آہٹ سن کر مڑ کر دیکھا کہ سمندر کی ہوا مس میری کے نیلے فراک کو اڑا اڑا کر ان کے موٹے موٹے چربی چڑھے گھٹنوں سے اوپر لے جا رہی ہے اور ان کے کھچڑی جیسے بال ہوا میں

اڑ رہے ہیں۔

'مس صاحب۔' بچی نے اپنی انگریزی گورنس سے کہا۔

'یس سلمیٰ۔'

'مس صاحب۔ سمندر میں اتنا بہت پانی کہاں سے آتا ہے؟'

'یہ سب واٹر ندی اور دریا میں سے آتا ہے مائی چائلڈ۔' مس میری نے جواب دیا اور جغرافیہ کی کتاب میں سے سمندر اور دریاؤں والا باب زبانی دہرایا۔

'تو پھر اگر ہم سمندر میں چلتے چلے جائیں، تو دریا آجائے گا؟'

'یس۔'

'وہی دریا جو ہمارے گھر کے پاس سے بہتا ہے۔'

'یس۔ وہ بھی آجائے گا۔'

'مس صاحب۔ ایک بات پوچھنی ہے۔'

'پوچھو، مائی چائلڈ۔'

'یہ اتنی ساری لہریں جو ہیں، سمندر میں یہ کھاتی کیا ہیں؟'

مس میری جنھوں نے اس سوال کا جواب کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا۔ سوچ میں پڑ گئیں لیکن ایک موٹا لال منہ کا مسافر جو دن بھر ڈیک چیئر پر لیٹا ہوا موٹا سگار پیتا رہتا تھا، ایک خوفناک قہقہہ مار کر بولا۔

'ویل ویل بے بی۔ اَم تم کو بتاتا ہے۔ یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا ہے۔ تم ریلنگ سے ہٹ کر کھڑا رہو، نہیں تو لہر تم کو بھی کھا جائے گا۔'

اور یہ سن کر بچی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی اور مس میری نے لال منہ والے کو ڈانٹ کر کہا۔

'مسٹر ولیم۔ دیٹ از ویری بیڈ۔ آپ ایک بے بی کو ڈرانا مانگتا۔ ویری بیڈ۔ کم آن ڈارلنگ۔'

اور وہ بچی کو کیبن میں لے گئی اور اس کو تصویروں والی کتاب دی کہ یہاں بیٹھ کر تصویریں دیکھو۔

'مس صاحب۔'

'لیس مائی ڈیر۔'

'یہ جہاز گھر کب پہنچے گا؟'

'یہ جہاز گھر نہیں جائے گا بے بی۔ یہ تو ساؤتھ ہیمٹن جائے گا۔ وہاں سے ہم لوگ ریل سے لندن جائیں گے۔'

'لندن کیوں جائیں گے؟'

'اس لیے کہ تمھارے ڈیڈی چاہتے ہیں، تم ادھر فرسٹ کلاس انگلش اسکول میں ایجوکیشن حاصل کرو۔ ادھر سب انگریز بے بی لوگ ہوگا۔'

'مگر میں تو جُھنیا کے ساتھ پڑھنا چاہتی ہوں مس صاحب۔'

'جُھنیا — وہ سائیس کا چھوکری — چھی چھی چھی — ڈیٹ ڈرٹی لٹل گرل۔ تمھارا جیسا ہائی کلاس بے بی ایک سائیس کا گندا چھوکری کے ساتھ کس مافک (طرح) پڑھ سکتا ہے۔ تمھارا ڈیڈی نہیں چاہتا کہ تم ایسا بچہ لوگ کے ساتھ کھیلے۔ اسی واسطے تم کو ہماری ساتھ انگلینڈ پڑھنے کو بھیجتا۔'

'تو پھر جُھنیا کو بھی لے چلو مس صاحب۔'

'ہم بولا بے بی کو وہ ڈرٹی چھوکری ہے۔ ایک دم گندا۔'

'تو ادھر لندن میں ہم اسے نہلائیں گے مس صاحب۔ باتھ ٹب ہوگا نہ اُدھر —'

'ایسا چھوکری کا ڈرٹ باتھ ٹب میں نہیں دھو سکتا۔'

'تو پھر میں لندن نہیں جاتی۔ میں تو گھر جاؤں گی۔ جُھنیا کے ساتھ کھیلوں گی۔'

'گھر ادھر سے چار ہزار میل ہے بے بی۔'

'مگر کدھر ہے؟'

'ادھر، جہاز کے پیچھے، سمندر کے پار۔'

اور جب دوپہر کے کھانے کے بعد مس مُیری سو گئیں تو بچّی دبے پاؤں کیبن سے نکلی اور ڈیک کے پچھلی طرف ریلنگ سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ ایک ہاتھ میں اس کے ایک گڑیا تھی اور دوسرے ہاتھ میں دو کیلے۔ وہ جانتی تھی کہ جُھنیا کو کیلے بہت پسند ہیں۔

'ہاہاہا۔'اس نے سوچا۔'سو یہ ہے گھر جانے کی سڑک۔'

جہاز کے پیچھے جہاں پانی کٹ رہا تھا سفید جھاگوں کی ایک لمبی سڑک بنتی جا رہی تھی۔ جو دور تک چلی گئی تھی۔ حد نظر تک۔ بنّی کے گھر تک۔

بنّی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لال منہ والا انگریز اپنی کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو رہا تھا اور اس کا سگار منہ میں لگا ہوا سلگ رہا تھا اور اس کی راکھ اس کے سفید سوٹ پر گرتی جا رہی تھی اور کئی مسافر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

جہاز کے نیچے اس کے پیٹ میں سے انجنوں کی دھڑ دھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جہاز چلا جا رہا تھا۔ ساؤتھ ہیمپٹن کی طرف لندن کی طرف، اس اسکول کی طرف جہاں مُنیا نہیں ہوں گی۔

مُنیا!— اپنی سہیلی کا خیال آتے ہی بنّی مسکرا دی۔

مُنیا جو کالی تھی مگر جس کے چھوٹے چھوٹے دانت ایسے چمکتے تھے جیسے سچے موتی۔ مُنیا جس کا شلوکہ اور لہنگا ہمیشہ گندا اور پھٹا ہوا ہوتا تھا، جس کی آنکھوں میں ہمیشہ چیپڑ لگے رہتے تھے اور جس کے چہرے اور ٹانگوں پر ہمیشہ گرد کی تہ جمی رہتی تھی مگر جو ہمیشہ ہنستی رہتی تھی، کھیلتی کودتی اور شور مچاتی رہتی تھی اور جب اس کا باپ گھوڑوں کو نہلاتا یا ان کی مالش کرتا تو وہ ضد کر کے گھوڑے پر بیٹھ جاتی تھی اور کہتی تھی 'چل میلے گھولے چل چل چل۔'

دو برس ہوئے بنّی کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ جب ڈیڑھ مہینے کے بعد اس کا بخار ٹوٹا تو اتنی کمزور ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے ہدایت کی ابھی مہینے بھر تک چلے پھرے نہیں، پلنگ پر لیٹی رہے اور سو کتنے ہی دن تک وہ لیٹے لیٹے چھت میں لگے ہوئے بجلی کے پنکھے کے پروں کو گنتی رہتی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، بیس، اٹھائیس، بیالیس .... تین سو دس.... آٹھ سو بارہ— اور اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ پنکھے کے پروں کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ نہ جانے کہاں سے ایک کے بعد ایک پنکھے کے پر ہوا میں سے نکلتے ہی آتے تھے۔ مگر پھر وہ اس کھیل سے اُکتا گئی اور دیواروں پر دوڑتی ہوئی چھپکلیوں کی دوڑ بھاگ میں دلچسپی لینے لگی۔ یہ چھپکلیاں بالکل سرکس کے مداریوں کی طرح تھیں۔ دیوار پر سیدھی اُوپر چڑھ جاتی تھیں مگر تھیں بہت گندی۔ کیڑے مکوڑے، مکھی مچھر

کھاتی رہتی تھیں۔ جس کو دیکھ کر بجّی کا جی متلانے لگتا اور سو آخر کار اس نے سوچا کہ میں اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر باغ ہی کی سیر کرلوں۔

باغ میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اور تتلیاں ہوا میں اُڑ رہی تھیں اور دُور لان پر اُن کا بُوڑھا مالی گلاب کی کیاریوں میں فوارے سے پانی دے رہا تھا اور نیم کے پیڑ پر لال لال چونچ والے طوطے بیٹھے تھے اور دور آم کے پیڑوں میں ایک کوئل کوکو کر رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اِن سب چیزوں سے بجّی کا جی اُکتا گیا۔ کیونکہ وہ چاہتی تھی کسی سے بات کرنا اور بات کرنے کی اُسے ڈاکٹر بینرجی کی طرف سے سخت ممانعت تھی۔ اسی لیے تو اس کے ڈیڈی نے مِس مُیری کو ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی کو بجّی کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ دی جائے اور چونکہ بجّی خود بہت باتونی تھی اور مِس مُیری سے ہر وقت اوٹ پٹانگ سوال کرتی رہتی تھی اور ڈیڈی سے سوال کرتی تھی کہ مجھے کوئی پریوں کی کہانی سنایئے۔ اس لیے ڈاکٹر اور ڈیڈی دونوں کے حکم سے اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند رکھا جاتا تھا اور صرف دوا اور کھانے کے اوقات پر مِس مُیری چند منٹ کے لیے اندر جاتی تھیں۔

اور سو جب اس نے باغ میں اپنی ہم عمر بجّی کو دوڑتے بھاگتے دیکھا تو سلمٰی بے اختیار چلا پڑی۔

'اے۔اے۔ اِدھر آ۔'

'سلام چھوٹی بی بی۔'

'تم مجھے جانتی ہو؟'

'جرور (ضرور) جانتی ہوں۔ یہ فراک جو میں پہنے ہوں یہ تمھارا ہی تو ہے چھوٹی بی بی۔'

اور سلمٰی نے پہچان لیا کہ میل اور پیوندوں کے نیچے جو نیلی دھاریوں کا فراک ہے وہ واقعی کبھی اس کا ہی تھا۔

'تمھارا نام کیا ہے؟'

'مُنیا'

'اور میرا نام سلمٰی۔'

'نہیں۔ تمھارا نام ہے چھوٹی بی بی۔'

'تمھیں کس نے بتایا؟'

'بابا نے۔'

'تمھارے بابا کیا کرتے ہیں؟'

'آپ کے گھوڑوں کو دانہ کھلاتے ہیں' اُن کو نہلاتے ہیں' اُن کی مالش کرتے ہیں۔'

'تم تو سائیس رام دین کی بیٹی ہو؟'

'ہاں—'

'تم اسکول پڑھنے نہیں جاتیں؟'

'نہیں۔'

'کیوں؟'

'بابا کہتے ہیں سائیسوں کے بچے اسکول نہیں جاتے۔'

'پھر تم دن بھر کیا کرتی ہو؟'

'کھیلتی ہوں اور بابا کہیں تو گھوڑوں کو پانی پلا دیتی ہوں۔'

'اور جب تمھیں بخار آتا ہے تب کیا کرتی ہو؟'

'جب بکھار آتا ہے تو میں کھوب (خوب) دھوپ میں بھاگتی ہوں۔ پسینہ آ کے بکھار آپ سے آپ بھاگ جاتا ہے۔ پر چھوٹی بی بی تم کیوں کمرے میں بند رہتی ہو؟'

'ڈکٹر اور ڈیڈی کا حکم نہیں ہے باہر نکلنے کا۔'

'ڈاکٹر بہت بُرا آدمی ہے چھوٹی بی بی۔'

'کیوں؟'

'وہ سوئی لگاتا ہے۔ ایک میرے سوئی لگائی تھی تو تین دن تک بانہہ سوجی رہی تھی۔'

اور سو اُن کی دوستی ہو گئی۔ میلے پیوند لگے فراک پہننے والی سائیس کی بیٹی جُھنیا اور نائیلون کا نائٹ گاؤن پہننے والی سَر عظیم اللہ کی بیٹی سلمیٰ سہیلیاں بن گئیں۔

روز جُھنیا سلمیٰ کے لیے باغ میں سے چُرا کر پھول' کچی کیریاں اور کچے پکے امرود لاتی اور اُن

کے بدلے میں سلمیٰ اُسے اپنے بالوں میں لگانے کے لیے ریشمی ربن اور رنگین تصویروں والی کتابیں اور بولنے والی گڑیاں دیتی اور گھنٹوں گھومتی پھرتی ہے۔ کوئی اسے نہیں روکتا۔ دس دس دن نہاتی نہیں' کوئی اُسے زبردستی ٹب میں بٹھا کر صابن مَل مَل کر زبردستی نہیں نہلاتا۔ جو اس کا جی چاہتا ہے کھاتی ہے' جب جی چاہتا ہے درختوں پر چڑھ جاتی ہے۔ اُسے دنیا کے بارے میں بھی تو کتنا کچھ معلوم ہے۔ وہ جانتی ہے کہ گھوڑی کی نال کیسے لگائے جاتے ہیں اور پَن چکّی پر آٹا کیسے پیسا جاتا ہے اور نوٹنکی میں لال پری کیسے ناچتی ہے اور کالا دیو کیسے دہاڑتا ہوا آتا ہے اور اُسے اُٹھا کر لے جاتا ہے اور مالی کا بیٹا کلوا جس کا پچھلے برس ہی بیاہ ہوا تھا' کیسے ٹھرّا پی کر پہلے اپنی بہو کو مارتا ہے اور پھر پیار کرتا ہے اور اور— جُھنیا جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی' یہ سب باتیں سلمیٰ کو سُناتی رہتی اور سلمیٰ کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ایک سُنسان ٹاپو میں قید ہے' زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف زندگی کا سمندر پھیلا ہوا ہے اور اس سمندر میں جُھنیا مزے سے چھینٹے اُڑا رہی ہے' تیر رہی ہے— ڈبکیاں لگا رہی ہے۔

ایک دن جُھنیا دیر کر کے آئی تو سلمیٰ نے پوچھا ''اری تو کہاں رہی؟ میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔'

'چھوٹی بی بی۔ میں ذرا (ذرا) اصطبل میں گئی تھی۔ آپ کی گھوڑی ہے نا چنبیلی' اُس کے بچّہ ہونے والا ہے۔'

بچّہ کیسے ہوتا ہے؟

یہی تو میں دیکھنے گئی تھی چھوٹی بی بی۔

پھر دیکھا نہیں؟

'میں بھی چلوں تیرے ساتھ؟ دیکھوں گھوڑی کا بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟'

'اور جو کسی نے دیکھ لیا تو بڑے صاحب مجھے ہنٹر لگائیں گے۔'

'نہیں نہیں۔ ابّا تو کورٹ گئے ہوئے ہیں اور مِس مُیری اپنے کمرے میں پڑی سو رہی ہیں۔'

سو وہ کھڑکی سے کود گئی اور اس کا نائیلون کا نائٹ گاؤن کانٹوں میں الجھ کر کئی جگہ سے پھٹ

گیا اور اس کا ٹخنہ چھل گیا۔ مگر اس کا دل ایک نامعلوم مسرت اور ایک عجیب خوف سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے وہ دونوں باغ کی کیاریوں میں سے نہیں بلکہ گھنے اندھیرے جنگل میں سے ہو کر پریوں کے دیس کی طرف جا رہے ہوں۔ بالکل جیسے مس میری کی کہانیوں کی شہزادیاں جاتی تھیں اور پھر وہ دونوں اصطبل کے بالکل سامنے تھیں اور اندر سے چنبیلی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی بلکہ ایک بار تو وہ اتنے درد بھرے انداز میں ہنہنائی کہ سلمیٰ ڈری کہ شاید اس کی پیاری گھوڑی سچ مچ مر رہی ہے مگر فوراً ہی اُسے جُھنیا کے بابا کا کہنا یاد آیا کہ مر مر کے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اصطبل کا دروازہ کھلتے ہی زندگی کا سب سے بڑا اور خوفناک راز اس پر آشکار ہو جائے گا اور اس کا دل اور بھی زوروں سے دھڑکنے لگا۔

لیکن اصطبل کا دروازہ نہیں کُھلا۔ اس وقت نہیں کُھلا۔ زندگی بھر نہیں کُھلا۔ پیچھے سے اس کو بیوک کار کا ہارن سُنائی دیا اور جب سلمیٰ اور جُھنیا نے گھبرا کے مڑ کے دیکھا تو سر عظیم اللہ موٹر سے اُتر کر اُن کی طرف آ رہے تھے۔ بدن پر کچہری والا کالا کالا کوٹ اور دھاریوں والی پتلون۔ سر پر سفید ہیٹ اور سلمیٰ نے دیکھا کہ اس کے ڈیڈی کی مونچھیں جو ولایتی گوند سے نوکیلی بنائی جاتی تھیں اور ہمیشہ نہ صرف چڑھی بلکہ اکڑی رہتی تھیں۔ اس وقت غصّے سے ہل رہی ہیں جیسے شکار کو دیکھ کر اُن کے شکاری کُتے شیرو کی دُم ہلنے لگتی ہے۔

سلمیٰ کو پھر اس کے کمرے میں قید کر دیا گیا۔ جُھنیا کے بابا کو کہہ دیا گیا کہ اُس کی چھوکری نے پھر کبھی چھوٹی بی بی سے بات کی تو اُس کی ہنٹر سے خبر لی جائے گی۔

اگلے ہفتہ ہی سلمیٰ کو مسوری پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا اور ایک برس بعد مس میری کی تجویز پر اُن کے ساتھ اسے انگلستان بھیج دیا گیا اور جب اُن کی بیوک کار احاطے سے باہر سڑک پر آئی تو سلمیٰ نے دیکھا کہ جُھنیا پیچھے دوڑتی ہوئی آ رہی ہے۔ سلمیٰ چلّائی 'ڈیڈی۔ ڈیڈی۔ میں جھنیا سے مل لوں۔' مگر سر عظیم اللہ نے ڈرائیور کو کار نہ روکنے دی اور جُھنیا موٹر کے پہیوں سے اڑی ہوئی دھول کے بادلوں میں کھو گئی اور اس کے بعد صرف سڑک ہی سڑک رہ گئی۔ جو ہر لمحے کھلنے والے جیبی فیتے کی طرح لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی۔

اور اب یہ سڑک جہاز کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور ہر لمحہ سلمیٰ اور جُھنیا کے درمیان کا فاصلہ

لمبا کرتا جارہا تھا۔

مگر بچی نے سوچا یہ سڑک یہاں سے ہمارے گھر تک جاتی ہے۔ اگر میں یہاں سے اس سڑک پر چلنا شروع کروں اور چلتی رہوں، چلتی رہوں، اس وقت سے لے کر شام تک اور شام سے لے کر صبح تک چلتی ہی رہوں، راستے میں ایک بار بھی نہ رکوں، تو ابھی اصطبل کے پچھواڑے مُرغی خانے میں مرغے اذان دے رہے ہوں گے کہ میں گھر پہنچ جاؤں گی اور پیچھے سے جا کے سوتی ہوئی جُھنیا کی آنکھیں بند کرلوں گی اور کہوں گی 'جُھنیا۔ بول تو سہی میں کون ہوں۔' اور جب وہ میری آواز پہچان کر میرے پیچھے بھاگے گی تو میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوں گی اور سارے باغ میں اسے دوڑاؤں گی اور اس کے ہاتھ نہ آؤں گی۔ مگر اس وقت تو ڈیڈی وہاں اپنا بھورے رنگ کا ڈریسنگ گاؤن پہنے ٹہل رہے ہوں گے تو پھر کیا ہوا۔ میں ان سے کہہ دوں گی۔ 'ڈیڈی۔ میں لندن وندن نہیں جاؤں گی۔ میں تو یہاں رہوں گی اور جھنیا کے ساتھ کھیلوں گی اور اس کے اصطبل میں جا کر دیکھوں گی کہ ہماری چنبیلی کے بچے کیسے ہوتا ہے۔'

جہاز کے پیچھے پانی پر سفید جھاگوں کی سڑک سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ سلمیٰ کو ایسا لگا جیسے سڑک مسکرا کر اسے بلا رہی ہے۔ جیسے سڑک کہہ رہی ہے۔ 'چل سلمیٰ۔ میں تجھے جھنیا سے ملا دوں۔' اور سو بچی نے اس سڑک کی طرف قدم بڑھا ہی دیا۔

مگر وہ سڑک نہیں تھی۔

وہ ایک کنواں تھا۔ اندھیرا اور ٹھنڈا۔ اور دم گھونٹنے والا اندھا کنواں۔

وہ نیچے جا رہی تھی اور اس کے کان میں ایک لال منہ والے انگریز کی آواز گونج رہی تھی۔ 'یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا ہے۔'

اور اب وہ خوفناک لہریں جو ہاتھی کی طرح سونڈ تھیں اور اونٹ کی طرح اونچی تھیں اور شیر کی طرح دہاڑتی تھیں اور کہانیوں والے اژدہوں کی طرح پھنکارتی تھیں۔ بچی کے چاروں طرف شیطانوں کی طرح ناچ رہی تھیں۔ چلا چلا کر کہہ رہی تھیں۔

'ہم تمھیں کھا جائیں گے' ہم تمھیں کھا جائیں گے۔'

اور نہ جانے کہاں سے ان کے اصطبل کا دروازہ بہتا ہوا وہاں آ گیا اور جب بچی نے وہ

دروازہ کھولا تو دیکھا کہ چنبیلی گھاس پر لیٹی ہوئی زور زور سے سانس لے رہی ہے اور اس کا پیٹ کسی نے کاٹ ڈالا ہے اور پیٹ میں سے اور بھی بھیانک سمندری لہریں باہر نکل رہی ہیں اور پھر ایک سمندر، اور دوسرا سمندر اور تیسرا سمندر سب ایک ہو گئے اور سب مل کر بجّی کا گلا گھونٹنے لگے اور اس کے دماغ پر اندھیرا چھانے لگا۔ مگر اس اندھیرے میں گم ہوتے ہوتے اس نے محسوس کیا کہ دو مضبوط ہاتھوں نے اسے پکڑ لیا ہے اور اب وہ کنویں میں نیچے کی طرف نہیں جا رہی، کسی زینے پر چڑھتی ہوئی اوپر کی طرف جا رہی ہے۔

جب کئی گھنٹے کے بعد بجّی کو ہوش آیا اور لہروں کے جہاز سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی، تو اس نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور دہشت زدہ آواز میں چلائی:

'مِس صاحب! مجھے سمندر سے بچاؤ'

'ارے بھئی یہ مِس صاحب کون ہیں، جنھیں آواز دے رہی ہو؟'

سلمیٰ نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ دھوپ کمرے میں پھیل چکی ہے اور انور اپنی پیار بھری نگاہوں سے اسے چوم رہا ہے۔

'پیاری بجّی! خواب میں پھر ڈر گئیں!'

'نہیں۔' اس نے شوہر کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ 'تم میرے پاس رہو گے تو میں کسی چیز سے نہیں ڈروں گی۔'

'سمندر سے بھی نہیں؟'

'نہیں!'

مگر نہ جانے کیوں انور کو محسوس ہوا کہ اس 'نہیں' میں یقین اور قطعیت کی کسی قدر کمی ہے۔

## علاج

سمندر میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لہروں میں کشتی ڈول رہی تھی اور کشتی کے ایک سرے پر انور بیٹھا تھا اور دوسرے پر سلمیٰ۔

(سلمٰی سوچ رہی تھی۔ کہتے ہیں ایسے بھی سچے عاشق ہوتے ہیں جو محبت کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔ چلو جی انور میاں، آج تمھاری خاطر ہم بھی جان دیئے دیتے ہیں۔)

(اور انور سوچ رہا تھا۔ بڈھا ڈاکٹر باسو، ہے تو بڑا عقلمند آدمی اور نفسیات کا مانا ہوا استاد۔ مگر بڑے میاں نے کہیں مجھے الٹا سبق تو نہیں پڑھا دیا۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔)

سمندر میں لہریں اٹھ رہی تھیں اور ہر اٹھتی لہر کے ساتھ سلمٰی کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتی تھی تو اس کا تخیل اسے سمندر کی اندھیری گہرائی میں لے جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا اور جب ڈر کے مارے وہ آنکھیں کھول دیتی تو دیکھتی کہ ایک لہر کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری لہر منہ پھاڑے اس کو نگلنے کے لیے چلی آ رہی ہے۔

(ہائے اللہ۔ اس نے سوچا۔ میں نے کمزوری کے کس لمحے میں اس کشتی میں بیٹھنا منظور کر لیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں پہلے ہی کہہ دیتی، کہ جاؤ بھائی تم ناؤ پر جا کر مچھیرن کا بچہ جنواؤ۔ اس کا آپریشن کرو، جو چاہے کرو۔ تم کہو گے تو جہنم میں چلی جاؤں گی مگر اس کشتی میں نہیں بیٹھوں گی۔ سمندر کمبخت میں بھی تو طوفان آ رہا ہے۔ ہائے اللہ؟ تو کیا میں اللہ کو مانتی ہوں؟ کون جانتا ہے، شاید مانتی ہی ہوں۔ کیمبرج میں پڑھا ہوا فلسفہ تو کہتا ہے، اللہ صرف ایک واہمہ ہے، مگر یہاں سمندر کی ان خونخوار لہروں میں تو مجھے ہر طرف خدا کا قہر ہی قہر نظر آ رہا ہے۔ نہ جانے کون کون سے گناہ میرے نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے ہیں، جن کی سزا میں مجھے اس سمندری قبر میں آج دفن کیا جائے گا مگر کیا منکر نکیر سمندر کی تہہ میں پڑے ہوئے مُردوں سے بھی سوال و جواب کرتے ہیں؟)

(اور انور سوچ رہا تھا) کمال ہے کہ سلمٰی سوئزر لینڈ کی برف ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی خطرناک ڈھلوانوں پر اسکیٹنگ کر آئی ہے۔ درجنوں بار ہوائی جہاز میں سفر کر چکی ہے۔ خود ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلاتی ہے لیکن ایک کشتی میں دو میل کے سمندری سفر سے اس کی رنگت پیلی پڑ گئی ہے۔ سمندر کی یہ ہیبت تو اس کے شعور میں چھپی بیٹھی ہے، نہ جانے کتنے برسوں سے۔ کیا اس ہیبت کو کوئی بھی وہاں سے نکال سکتا ہے؟ شاید محبت نکال سکتی ہے۔ آج بے چاری میری خاطر اس کشتی میں بیٹھ ہی گئی نا۔ بڑا ظلم کیا ہے میں نے اس کے ساتھ۔

اس دن سویرے جب وہ سو کر اٹھے تھے تو انور کو یقین نہیں تھا کہ سلمٰی اس کے ساتھ آنے کو تیار ہو جائے گی۔

ناشتے کی میز پر سلمٰی نے حسبِ معمول پہلا سوال یہی کیا تھا 'ڈرالنگ! وہ فلیٹ ہمیں کب تک مل جائے گا؟'

اور حسبِ معمول انور نے جواب دیا تھا 'بہت جلد۔ شاید اگلے مہینے ہی ہم شفٹ کر جائیں۔ شاید......

'یہ شاید کیوں؟'

اس لیے کہ شاید اس عرصے میں تمھارے دل سے سمندر کی ہیبت نکل جائے اور تم سمندر سے ڈرنا چھوڑ دو۔'

'کون کہتا ہے میں سمندر سے ڈرتی ہوں؟'

'تو پھر یہ گھر کیوں چھوڑنا چاہتی ہو؟'

'بس مجھے سمندر پسند نہیں ہے'

یہ انور کے لیے ایک حیرت کی بات تھی۔ رات کو وہ سمندر سے ڈرتی تھی لیکن دن کے اجالے میں وہ اس خوف کا اقرار کرنے کو تیار نہیں تھی۔

'بس مجھے سمندر پسند نہیں'

وہ کہے جا رہی تھی۔

'مجھے سمندر میں کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تمھارا سمندر بور کرتا ہے۔'

اس کی آواز اونچی ہوتی گئی تھی۔ اس میں ہسٹریا کی کیفیت آتی گئی تھی اور انور نے دیکھا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک ایسے خوف کی چمک ہے جیسے دن دہاڑے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔

دھیرے دھیرے چمچ چلاتے ہوئے انور نے کہا۔

'سلمٰی تم نے وہ پکچر دیکھی تھی؟'

'کون سی پکچر؟'

'کیا نام تھا اس کا؟ ہاں۔ اب یاد آیا۔ لیو ہر ٹو ہیون۔ LEAVE HER TO HEAVEN'

'ہاں دیکھی تھی۔ مگر اس وقت اس کی یاد کیسے آئی؟'

'اس میں بھی تو سمندر کا ایک سین ہے۔ ایک شکّی مزاج بیوی ہے جو دوسری لڑکی کو کشتی میں بیٹھا کر سمندر میں لے جاتی ہے۔'

'ہاں۔ شاید کوئی سین تھا تو ایسا۔ اچھی طرح یاد نہیں۔'

اور بیچ سمندر میں جا کر بڑی اطمینان سے کہتی ہے کہ کشتی کے تختوں میں اس نے ایک سوراخ کر رکھا ہے، جس میں سے پانی بھرتا جا رہا ہے اور اب تھوڑی دیر میں دونوں ڈوب جائیں گے۔'

'کیا بھیانک کہانی یاد آئی ہے تمھیں؟ بھلا یہ بھی کوئی موقعہ ہے ایسی کہانی سنانے کا؟'

'اس سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں کشتی میں ہیں۔ کشتی سمندر میں ہے اور کون جانتا ہے تھوڑی دیر میں سمندر ہماری کشتی میں ہو۔'

'بھئی مجھے ڈراؤ مت۔ خدا کے لیے کوئی اور بات کرو۔ تمھارا سمندر مجھے بور کرتا ہے۔'

'تو سمندر تمھیں بور کرتا ہے؟' انور نے چپوؤں کو پورے زور سے چلاتے ہوئے دانت پیس کر پوچھا اور اپنی آواز میں سے اس نے محبت کے شائبہ کو بھی نکال پھینکا۔

'ہاں ہاں۔ بور کرتا ہے۔' سلمیٰ چلائی اور اسی وقت ایک لہر کا طمانچہ اس زور سے پڑا کہ وہ سر سے پیر تک شرابور ہو گئی۔

'جیسے میں بور کرتا ہوں؟'

اور انور کی آواز کا طمانچہ سمندر کی لہر سے بھی بہت زیادہ خوفناک تھا۔

'انور ڈارلنگ! تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ تم کیسے سوچ سکتے ہو۔ میں...... میں...... تم...... سے محبت......'

'تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی۔ نہ مجھ سے، نہ جھنیا سے۔'

جھنیا۔!

دفعتاً سلمیٰ کے لاشعور کی تہ میں ہزاروں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ماضی کے پر اسرار دروازے آپ سے آپ کھلنے لگے۔

وہ چلائی۔

'جھنیا کے بارے میں تم کیسے جانتے ہو؟'

'ایسے کہ تم ہمیشہ خواب میں چلاتی رہتی ہو۔ جھنیا مجھے معاف کردو۔ جھنیا میں مجبور تھی۔ جھنیا میں تم تک نہیں آسکتی۔ بیچ میں سمندر ہے اور مجھے سمندر سے ڈر لگتا ہے۔ تقریباً ہر رات کو تم سوتے سوتے یہ بڑبڑاتی ہو لیکن سلمٰی جوڈرتے ہیں، وہ محبت نہیں کرسکتے۔ نہ اپنی بچپن کی سہیلی سے نہ اپنے شوہر سے۔'

'انور تمھیں کیا ہوگیا؟ یہ کیسی باتیں کرر ہے ہو۔۔۔؟ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟'

'جانتی ہو میں کون ہوں؟'

'تم میرے شوہر ہو۔ تم ایک مشہور ڈاکٹر ہو......'

'مگر جانتی ہو، میرا باپ کون تھا؟ میں کہاں پیدا ہوا تھا؟ کس خاندان میں؟'

'میں نہیں جانتی اور نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔ میں تمھیں جانتی ہوں انور......اور میں کچھ جاننا نہیں چاہتی۔ مجھے ماضی کے دروازے کھولنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'

'اس لیے کہ تم ماضی سے ڈرتی ہو......جیسے تم سمندر سے ڈرتی ہو، جیسے تم زندگی سے ڈرتی ہو، جیسے تم محنت اور مفلسی سے ڈرتی ہو، جیسے تم سچائی سے ڈرتی ہو۔'

'یہ جھوٹ ہے۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔'

'تو سنو۔ میرا باپ تمھارے باپ سر عظیم اللہ کے دوست راجا جسپال سنگھ تعلقدار کے فیل خانے میں مہاوت تھا۔ میں اسی فیل خانے میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے سائیسوں اور بھنگیوں کے بچوں کے ساتھ پرورش پائی ہے اور یہ ڈاکٹری، یہ تعلیم، یہ نام، یہ عزت مجھے بخششیں ملی ہیں اپنے باپ کی جان کے عوض۔ اس لیے کہ وہ راجا صاحب کا نمک حلال ملازم تھا اور اس نے مالک کی اولاد کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دے دی۔'

'یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ تم سے شادی کی ہے، تمھارے خاندان سے نہیں۔'

'اسی لیے سنا رہا ہوں کہ جو سچائی سے ڈرتا ہے، وہ مجھ سے کیا کسی سے بھی محبت نہیں کرسکتا۔ اور اسی لیے آج میں تمھیں یہاں......'

سلمیٰ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ کیونکہ اسی دم اس نے دیکھا کہ کشتی آدھی سے زیادہ پانی سے بھر چکی ہے۔

'انور—!'

وہ چلائی

یہ کیا؟— کیا تم مجھے یوں مارنے کے لیے یہاں لائے تھے؟'

انور نے اطمینان سے چپو سمندر میں پھینک دیے۔

'تمھیں تیرنا تو آتا ہوگا ڈارلنگ!'

'آتا ہے— مگر تالاب میں— سمندر میں نہیں۔'

'اسے بھی ایک لمبا چوڑا تالاب ہی سمجھو— صرف گہرائی ذرا زیادہ ہے۔ دو چار ہاتھی ڈباؤ پانی ہوگا۔ وہ سامنے والی چٹانیں زیادہ دور نہیں ہیں۔'

اور اب سلمیٰ کی ہیبت زیادہ نگاہوں نے دیکھا کہ کشتی تین چوتھائی پانی سے بھر چکی ہے اور کسی دم میں ڈوبنے ہی والی ہے۔

'ٹاٹا ڈارلنگ!'

اور یہ کہہ کر انور نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور ٹاپو کے کنارے کی چٹانوں کی طرف تیر کر جانے لگا اور پھر ایک اونچی سی لہر آئی اور وہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔

بچّی لہروں کو گن رہی تھی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ کوئی اونچی، کوئی موٹی کوئی پتلی۔ کوئی رینگتی ہوئی آ رہی تھی۔ کوئی دوڑتی ہوئی، کوئی چنگھاڑتی ہوئی اور کوئی دہاڑتی ہوئی اور پھر ان سب لہروں کی ایک نانی اماں آئی اور اس کے ساتھ سمندر سچ مچ کشتی میں آ گیا اور بیس برس کے بعد بچّی آج پھر بھوکی لہروں کے بھیانک جبڑوں میں جا پڑی۔

دور کہیں سے ایک آواز گونجی۔

'یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا۔'

'چھوٹا بے بی!

نمکین پانی چکھتے ہوئے بچّی اندھیرے کنوئیں کی تہہ کی طرف جا رہی تھی کہ اس کے شعور

میں کوئی چیز یکا یک بیدار ہوگئی۔ جیسے سویا ہوا شیر جاگ اٹھتا ہے، غرّاتا ہوا۔

تو یہ لہریں چھوٹے چھوٹے بے بی کھاتی ہیں مگر میں چھوٹا بے بی نہیں ہوں۔ بندر کی طرح لال منہ والے صاحب، کان کھول کر سن لو۔ میں چھوٹا بے بی نہیں ہوں۔'

اور اسی وقت اس کے دونوں ہاتھوں نے اس لال منہ والے صاحب کو اس زور سے دھکا دیا کہ نیچے جانے کی بجائے وہ اوپر کی طرف اٹھنے لگی۔

پھر اس کے شعور میں قریب ہی سے ایک جانی پہچانی پیار بھری آواز نے چڑایا۔

'تم سچ مچ بچی ہو، بچی ہو۔ بچی ہو۔'

'میں بچی نہیں ہوں'

سمندر کی تہ سے اوپر اٹھتے ہوئے اس کا دل دھڑکتا ہوا چلایا۔

'میں بچی نہیں ہوں۔ میری عمر تیس برس ہے۔ میں نے کیمبرج سے فلسفے میں ڈگری لی ہے— میں نے ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ میں نے ماضی اور مستقبل، ہر دروازے اور تہذیب وتمدّن کے ہر دریچے میں جھانک کر دیکھا ہے۔'

مگر ایک آواز جو انور کی سی آواز تھی، اسے چڑائے جا رہی تھی—

مگر تم نے اپنے اصطبل کے دروازے میں سے جھانک کر نہیں دیکھا کہ گھوڑی کے بچّہ کیسے ہوتا ہے؟'

'وہ سب بھی مجھے معلوم ہے۔ جانتے ہو میرا شوہر کتنا بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس نے مجھے زندگی کے سب بھید بتا دیئے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اس ٹاپو پر ایک مچھیرن کا بچّہ جنوانے جا رہا ہے۔ یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے، پھر بھی وہ جا رہا ہے کیونکہ اس وقت اسپتال میں کوئی دوسرا ڈاکٹر موجود نہیں ہے— میرا شوہر بہت بڑا آدمی—'

نہیں۔ نہیں۔ میرا شوہر بہت برا آدمی ہے۔ وہ تو مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ہاں اور کیا۔ مگر میں اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہوں۔'

اور یہ سوچ کر اس نے اتنے زور سے ہاتھ پاؤں مارے کے سمندر کی سطح سے باہر نکل

آئی— سامنے ہی ٹاپو کی چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔

سامنے سے ایک لہر آئی اور اتنے زور سے اس سے ٹکرائی کہ ایک لمحے کے لیے سلمٰی چکرا گئی۔ مگر اگلے لمحے ہی وہ سوچ رہی تھی۔

'وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ مہاوت کا بیٹا ہے تو ہوا کرے۔ میرے باپ سر عظیم اللہ بھی تو بھی معمولی وکیل تھے اور ان کے باپ سلیم اللہ اودھ کے لیفٹنٹ گورنر کے منشی تھے اور ان کے باپ نعیم اللہ واجد علی شاہ کا حقہ بھرا کرتے تھے، تو اس میں شیخی کی بات کون سی ہے؟'

اور اس بار جو ایک لہر جبڑا کھولے اس کی طرف بڑھی تو اس نے عین وقت پر ڈبکی لگا دی اور لہر اس کے اوپر سے گزر گئی۔

'ہونہہ!' اس نے سوچا 'یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی لوگ کو کھانا مانگتا ہے۔ اب انگریز کے بچے۔ اپنے بابالوگ کو ڈرا۔ چلا ہے مجھے ڈرانے!'

اور اگلی لہر جو مس میری کی طرح سوٹی تازی تھی، جھومتی جھامتی اس کی طرف آئی تو اسے ایسا لگا، جیسے کوئی اس سے کہہ رہا ہو۔

'ادھر کہاں جارہی ہو، بے بی۔ تمھارے ڈیڈی چاہتے ہیں تم ادھر لندن میں فرسٹ کلاس انگلش اسکول میں ایجوکیشن حاصل کرو۔'

'مگر سلمٰی اس لہر کے جبڑوں میں سے یہ سوچتی ہوئی صاف نکل گئی—

'ٹاٹا مس صاحب۔ مگر میں تو اب گھر جاؤں گی، اور جھنیا کے ساتھ کھیلوں گی۔'

اور پھر ایک اور لہر آئی۔ اس کیمبرج والے سائیکاٹرسٹ جارج رُسل کی طرح دھیمی چال چلتی ہوتی۔

'سلمٰی ڈارلنگ! یو آرر یپر سڈ۔ دیٹ از وہاٹ یو آر!' YOU ARE THAT IS WHAT YOU ARE! تم قدرت کی گنہ گار ہو کیونکہ تم جنسی، اختلاط سے ڈرتی ہو۔'

اس لہر کے اوپر سے تو وہ ایسی آسانی سے گزر گئی جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

'جاؤ جاؤ جیورجی بوائے۔ پہلے اپنے دانتوں کے پائیریا کا علاج کروا کے آؤ۔ پھر ذرا انور سے میرے سائیکو اینالی سس کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنا۔'

اور پھر لہروں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور وہ ٹاپو کے ساحل پر پایاب پانی میں کھڑی ہوئی اپنے بھیگے ہوئے، تھکے ہوئے، چوٹ کھائے ہوئے بدن میں ایک نئی طاقت ایک نئی تازگی محسوس کر رہی تھی۔ سامنے سرسبز ٹاپو تھا۔ ناریل کے کمان کی طرح بل کھاتے ہوئے پیڑ تھے۔ ساحل پر مچھیروں کے جال سوکھ رہے تھے اور دور چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

'دنیا کتنی خوبصورت ہے' اس نے سوچا۔ آج سے پہلے تو مجھے کبھی اتنی خوبصورت نہ لگی تھی۔'

پھر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سمندر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس پر لہریں دوڑ بھاگ کر رہی تھیں جیسے باپ کے سینے پر بچے کھیلتے ہیں۔ کیا یہی وہ سمندر ہے جس سے وہ کبھی ڈرتی تھی! مگر اسے اس کی کوئی وجہ یاد نہ آئی۔

زمین خوبصورت تھی۔ آسمان اور آسمان پر بکھرے ہوئے بادل خوبصورت تھے، نیلا سمندر خوبصورت تھا۔ حسن کے اس پھیلاؤ میں بس ایک ہی کمی تھی۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔

'انور ــــ!'

'ہائے اس ظالم نے مجھے ڈبونے کی کوشش میں کہیں خود تو جان نہیں دے دی؟

اور اسی دم سامنے سے آتی ہوئی ایک لہر ٹوٹی اور اس میں سے ایک گھنے سیاہ بالوں والا سر نکلا اور دو چوڑے چکلے شانے نکلے اور ایک لمبا تڑنگا جسم نکلا۔

'ہائے اللہ! یہ سمندر کتنا اچھا ہے کہ اس میں سے آج میرے انور نے جنم لیا ہے!'

'انور ڈارلنگ!'

اور وہ بھاگ کر اس سے چمٹ گئی۔

'تو تم میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے؟ اور میں سمجھی تم مجھے ڈوبنے کے لیے چھوڑ کر چل دیے۔'

'ارے، تم تو رو رہی ہو ــــ؟'

'خوشی کے مارے۔'

'تم سچ مچ بچی ہو۔'

'اب تم مجھے جو چاہے کہو۔ میں بچی کہلانے سے نہیں چڑتی۔'

'کیوں؟'

'اس لیے کہ اب میں بچی نہیں رہی۔ آج میں جوان ہوگئی ہوں۔ اچھا ہی ہوا وہ کشتی ڈوب گئی'۔

'اسے تو ڈوبنا ہی تھا۔ پورے ڈیڑھ سو روپے دیے ہیں'۔

'تو تم نے جان بوجھ کر یہ سارا ڈھونگ رچایا تھا؟'

'سمندر سے تمھاری دوستی جو کرانی تھی؟'

'اور جو میں سچ مچ ڈوب جاتی؟'

'جس پانی میں تم ڈوبنے والی تھیں وہ صرف چار فٹ گہرا ہے اور تمھارا قد ساڑھے پانچ فٹ ہے'۔

تم بڑے فراڈ ہو'۔

'بڑا فراڈ تو فرائیڈ ہے'۔

'اور یہ مچھیرن کی زچگی کا بہانہ؟ یہ سب بھی فرضی تھا؟ تمھارا تو ڈاکٹری بیگ بھی ڈوب گیا'۔

'وہ تو خالی تھا۔ اصل بیگ لے کر میرا اسسٹنٹ پہلے ہی یہاں آچکا ہے'۔

مچھیرن کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آرہی تھی۔ جیسے وہ مر رہی ہو۔

سلمٰی باہر کھڑی دروازے کی ریخ میں سے جھانک رہی تھی اور خوف سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

'سلمٰی اندر آجاؤ'۔

اور پھر انور نے مراٹھی میں مچھیرن سے کچھ کہا۔

بیس برس سے جس دروازے کے باہر وہ بچی کھڑی تھی، اسے کھول کر آج وہ اس کے اندر چلی گئی۔

مچھیرن پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب سے گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ مگر سلمٰی کو دیکھ کر اپنی تکلیف کے باوجود وہ مسکرادی اور اندھیرے جھونپڑے میں اس کے دانت ایسے چمکے جیسے سمندر کی تہ میں سیپ۔ مچھیرن نے مراٹھی میں کچھ کہا۔

انور نے ترجمہ کیا۔

وہ کہہ رہی ہے— 'بہن! بھگوان کرے یہ دن ہمیں بھی جلدی نصیب ہو'۔

اور مچھیرن پھر اپنے حیات آفرین کرب میں مبتلا ہوگئی۔ پسینہ، خون اور پھر جیسے مداری ٹوپی میں سے خرگوش نکالتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں گوشت کا ایک لوتھڑا۔ مگر بے جان— کوئی حرکت نہیں، کوئی آواز نہیں۔ ماں کی آنکھیں بھی بند۔ شاید وہ بھی مر گئی اور پھر ڈاکٹر نے اس گوشت کے لوتھڑے کو زور سے ایک تھپڑ مارا اور جھونپڑے میں ایک ننھی سی آواز نے اپنی زندگی کا اعلان کیا۔ مری ہوئی ماں کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ خوشی سے چمک اٹھیں— ڈاکٹر سے اس ننھے سے زندہ پتلے کو لے کر اس نے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

سلمٰی نے اپنے گال پر گرم گرم آنسوؤں کو محسوس کیا۔

'مر مر کے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے'۔ وہ آنسوؤں کو پیتے ہوئے بولی 'جھنیا کے بابو جی کہیں تھے'۔

'از ھے بابا؟' مچھیرن نے مرہٹی میں سوال کیا۔

وہ پوچھتی ہے کہ اس کے بابا کا کیا ذکر ہے' انور نے ترجمہ کیا۔

اور اب سلمٰی نے زمین پر بیٹھتے ہوئے مچھیرن کا سیاہ مگر چکنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا—

'بہن! تمھارا نام کیا ہے؟'

'از ھانام؟' اس نے دہرایا اور سلمٰی نے دوستی محبت اور تشکر کی ایک گرم اور نرم لہر کو اس کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں دوڑتے ہوئے محسوس کیا اور اسے ایسے لگا جیسے اپنے بچپن سے اس کا بیس برس پہلے کا ٹوٹا ہوا رشتہ آج پھر سے قائم ہوگیا ہے۔

پھر مچھیرن بولی 'از ھانام— جھنیا—'

O

# پانچ گھڑوں کا تاج محل

لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں کیوں کہ میں نے پانچ روپیوں میں پانچ گھڑوں کا تاج محل بنایا تھا لیکن شاہجہاں کو کوئی پاگل نہیں کہتا، جس نے لاکھوں کے خرچ اور ہزاروں غلاموں کی محنت سے سنگ مرمر کا تاج محل بنایا تھا جس کو سب لوگ دور دور سے دیکھنے آئے ہیں۔ متھرا کے رفائنری پر بڑے اعتراض اٹھائے جاتے ہیں کہ اس کی زہریلی ہوا میں اڑتے کوئلے کے ذرّے سفید سنگ مرمر سے بنے ہوئے تاج محل کو نقصان پہنچائیں گے۔ کوئی اس کو پاگل نہیں کہتا۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک شہنشاہ کی محبت کی نشانی ہے، لیکن میرا تاج محل بھی تو ایک غریب انسان کی محبت کی نشانی ہی تھا اور جہاں تک محبت کرنے کا سوال ہے (اور ان کی نشانیوں کو اور ان کی قیمت کو سمجھنے کا سوال ہے) ایک شہنشاہ بھی ایک انسان ہوتا ہے تب ہی تو وہ پیار کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ شاہجہاں کی محبت تو مشہور ہے مگر میری محبت کی کہانی کوئی نہیں جانتا، اس لیے بغیر بتائے آپ کے بھی سمجھ میں نہیں آئے گی کی ان پانچ گھڑوں کے تاج محل سے ہمیں اتنا پیار کیوں تھا۔

میں بہار کے ایک گاؤں میں ایک موچی پریوار میں پیدا ہوا تھا، موچی اچھوت ہوتے ہیں، کم سے کم کہلاتے تو ہیں ہی۔ سنا ہے مہاتما گاندھی نے ہم سب کو ہریجن بنا دیا تھا یعنی بھگوان کی اولاد! مگر کیوں کہ بھگوان نے ہماری حالت سدھارنے کی کوئی کوشش نہیں کی، نہ ہی کسی

انسان نے۔اس لیے ہم موچی کے موچی ہی رہے! ہمیں گاؤں کے پکّے کنویں سے پانی بھرنے کا حق ابھی بھی نہیں ملا۔

سو، میں جو موچی کا بیٹا تھا، میں نے اپنے باپ سے موچی کا کام ہی سیکھا یعنی جوتے بنانا، چمڑے اور کھالوں کی پہچان اور اس کا کاروبار! تب ہی تو ہم انوکھے لوگ اچھوت تھے، جب کوئی اونچی ذات والے کا کوئی بیل یا جانور مر جاتا تو ہمیں ہی اس کی لاش اٹھانے کے لیے بلایا جاتا، تب ہی تو میرے دماغ میں اکثر یہ سوال اٹھتے تھے کی آخر بھگوان نے یہ کیسی دنیا بنائی ہے؟ دنیا میں جو لوگ کپڑے گندے کرتے ہیں، وہ تو اونچی جاتی کے لوگ کہلاتے ہیں، لیکن جو دھوبی ان کپڑوں کو دھو کر استری کر کے اجلا بناتے ہیں وہ دھوبی نیچی ذات اور اچھوت کہلاتے ہیں جو جوتے پہنتے ہیں وہ اونچی ذات کا کہلاتا ہے، لیکن ان جوتوں کو بنانے والا موچی کہلاتا ہے اور ان کی ذات کو نیچے درجے کا کہا جاتا ہے اور جو پاخانہ کرتے ہیں وہ شریف اور اونچی ذات والے کہلاتے ہیں اور جو اس گندگی کو دور کرتے ہیں وہ بیچارے چمار اور بھنگی یعنی نیچی ذات والے کہلاتے ہیں!

میں نے سوچا تھا کہ تھوڑا اور بڑا ہو جاؤں تو والد صاحب سے یہ سوال کروں گا، کیونکہ میری جانکاری میں ان سے زیادہ عقل مند کوئی نہیں تھا، مگر ملیریا بخار نے پہلے میرے باپ کی جان لی پھر میری ماں بھی اسی بخار میں مر گئی۔

مجھے ہی پتا کی دوکان پر بیٹھنا پڑا اور جو بھی انھوں نے سکھایا تھا اس کو ہی کام میں لا کر اپنا کاروبار چلانے لگا۔ تھوڑی ہی دنوں میں میرے دوکان کی ساکھ ہو گئی اور لوگ دور دور سے میرے پاس آنے لگے۔

ایک دن ہمارے ہی گاؤں کے موچی برادری کا مکھیا چودھری گھسیٹا رام میرے پاس آیا۔ بیٹا میں نے تو اس کام سے چھٹکارا حاصل کر لیا، بڈھا جو ہو گیا ہوں، سو اب جوتا نہیں بنا سکتا، کیا تو میرے لیے ایک جوڑا جوتیوں کو بنا سکتا ہے؟

کیوں چودھری تم سے میں انکار کر کے پاپی کیوں بنوں؟ بس تم اپنا پیر اس کاغذ پر رکھ دو، باقی میں سب دیکھ لوں گا۔ چودھری ننگے پاؤں دوکان پر آیا تھا اصل میں ہمارے گاؤں میں جو

موچی تھے وہ جوتا ضرور بناتے تھے، مگر ان میں سے اکثر ننگے پاؤں ہی پھرتے چودھری بولا، جوتا مجھے اپنے لیے نہیں بنوانا ہے، میری چھوکری ہے اس کے لیے ایک جوتی بنوانی ہے، اس کے پیر کا ناپ لینا ہے تو میرے گھر آنا ہوگا،

میں نے کہا اچھا چودھری جی دوکان بند کر کے شام کو آپ کے گھر آ جاؤں گا۔ شام ہوتے میں نے دوکان بند کی اس میں تالا لگایا اور چودھری کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچا تو چودھری میری راہ دیکھ رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے زور سے آواز دی، اری لکشمی چل ادھر آ تیرے لیے نئی جوتیاں بنوانی ہے۔ اس کے لیے اپنے دوست سوکھارام کے بیٹے بھوکھا کو بلایا ہے۔ لکشمی باہر آئی تو میں اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

برس پندرہ کا یا کہ سولہ کا سن
تھی سپنوں کی راتیں، مرادوں کے دن

محبت کیا ہووے ہے؟ یہ تو مجھے پتہ نہیں تھا لیکن اگر اس کو پریم محبت کہتے ہیں تو پہلی نظر میں ہی مجھے لکشمی سے محبت ہوگئی۔ اس کی کاجل لگی ہوئی آنکھوں میں مستی ہی مستی تھی، کٹورا جیسی کالی آنکھیں جیسے جنگلی ہرنی کی ہوتی ہے، اس میں کاجل کی لکیر غضب ڈھا رہی تھی۔

تب وہ بولی ٹکر ٹکر کیا دیکھے ہے؟ جوتی بنائے گا نا میری؟ تب جا کر مجھے ہوش آیا میں نے کہا جوتی بناؤں گا تب ہی تو آیا ہوں۔ پیر رکھ اس کاغذ پر تاکہ میں تیرے پیر کا نقشہ تیار کرلوں۔

اس نے جھٹ سے اپنا داہنا پاؤں میرے اخبار کے کاغذ پر رکھ دیا، کتنا سڈول پاؤں تھا، جی چاہتا تھا اسے دیکھتا ہی رہوں، پھر میرے دل نے کہا: چودھری جی کو پتہ چل گیا تو تیری جوتی سے خبر لے گا، سو میں نے اپنی پنسل سے پیر کے چاروں طرف ایک لکیر کھینچ دی، پھر اس کے پیر کو میرا ہاتھ لگا تو اس نے ہٹایا نہیں، شاید اسے بھی میرے ہاتھ کا چھونا اچھا لگا ہو۔ شادی کے بعد اس نے بتایا تھا کہ اس کے دل میں اسی دن سے ڈھکور پکور شروع ہوگئی تھی۔

سو میں دونوں پیروں کی تصویر بنا کر اپنے جھونپڑی میں آ گیا۔ سارے چمڑوں میں سب سے پہلے لال اور چکنا چمڑا چن کر جوتی بنانے بیٹھ گیا، رات بھر بناتا رہا کچھ سوچ کر میں نے اس کی جوتیوں میں جتنی خوبصورتی ہو سکتی تھی بھر دی۔ لال سبز ریشم کے پھدنے لگائے بلکہ بعد میں

کچھ سوچ کر میں نے اپنی جنت سدھاری ماں کے صندوقچے میں سے چاندی کے جھمکے نکالے اور ایک ایک جھمکا ایک ایک جوتی پر ٹانک دیا۔ اتنی دیر میں جتنے گاؤں کے لوگ اپنی جوتیاں گٹھوانے یا مرمت کروانے آئے ان کو میں نے چھدن کی دکان دکھا دی۔ میں نے کہا یہ گانٹھ گونٹھ اس سے کروالو، ہوشیار لونڈا ہے، میں یہ جوتیاں بنا رہا ہوں۔ جب تک یہ کام ختم نہ ہو جائے میں دوسرا کام ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔

کس لونڈیا کی جوتیاں بنا رہا ہے؟ برادری کے ایک لڑکے نے پوچھا۔

پاس کھڑے دوسرے لڑکے نے کہا، ارے یہ تو کسی راج کماری کی جوتیاں بنا رہا ہے، چاندی کے گھنگھرو بھی لگے ہیں۔

میں نے کہا ابے تو کیا جانے؟ ایک راج کماری کی جوتیاں ہی تو بنا رہا ہوں، اور کیا تیرے جیسے چمار موچی کی بیوی ایسی جوتیاں پہنے گی؟ دوپہر جل رہی تھی جب جوتیاں کو ایک صاف کپڑے میں لپیٹ کر بغل میں دبایا اور چودھری کے گھر کا راستہ لیا، چودھری کے گھر پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ بس ایک اکیلی لکشمی تھی وہ مجھے دیکھتے ہی بولی، پھر کیوں آ گیا؟ کیا پھر میرے پاؤں میں اپنے پنسل سے گدگدی کرے گا؟ میں نے کہا جوتیاں بنا لایا ہوں تیری۔

وہ حیران رہ گئی۔ بولی، سچ اتنی جلدی! ٹھیک بھی بنائی ہے کہ جلدی میں گھسڑ پھسڑ کر کے جوتیوں کی راند مار دی ہے۔

دیکھ کر تو ہی بتا کیسی بنائی ہے جوتیاں؟ کہتے ہوئے میں نے جوتیوں پر سے کپڑا اٹھایا تو دیکھتے ہی حیران رہ گئی، جوتیاں تو بہت خوبصورت ہیں پر پتہ نہیں میرے پاؤں میں آئے گی بھی یا نہیں؟

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ میں نے کہا پہن کر دیکھ لے۔ اس نے ان جوتیوں کو پہنا تو ایسا لگا جیسے اس کے پیر کے لیے ہی بنائی گئی ہے، یہ تو بالکل ٹھیک آتی ہے میں تو سمجھی تھی کہیں ادھر ادھر سے اٹھا کر لایا ہے۔

اتنے میں چودھری بھی لاٹھی پٹکتا ہوا آ گیا۔ بولا کیوں رے بھوکھا رام اتنی جلدی جوتیاں بنا لایا؟

میں نے کہا، میں نے تو کوئی خاص جلدی نہیں کی بس اتنی ہی دیر لگتی ہے جوتیاں بنانے

میں۔ دیکھ لو ٹھیک ہے نہ؟

اب چودھری نے ادھر نظر کی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، ارے یہ تو بڑی مہنگی ہوگی۔ چاندی کی گھنگرو لگی ہے اس میں، چمڑا بھی بہت بڑھیا لگایا ہے تو نے۔

وہ تو لگایا ہی ہے، رہی گھنگھرو کی بات تو یہ میرے ماں کے تھے گھر میں بیکار پڑے تھے۔ میں نے سوچا ان جوتیوں پر ہی ٹانک دوں۔

اتار جوتیاں لکشمی، چودھری نے حکم دیا، یہ تیرے جہیز میں کام آئے گا۔ مگر بھائی بھوکا رام ہم اتنے پیسے تو نہیں دے سکتے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سیدھی سادی جوتیاں بنائے گا۔

میں نے کہا: کاکا مول تول کی بات کون کر رہا ہے۔ میں تو یہ جوتیاں بھینٹ لایا ہوں۔ میرے بابا آج زندہ ہوتے تو تم سے قیمت تھوڑا ہی لیتے۔ میں ان کا ہی بیٹا ہوں۔'

'جیتا رہ بیٹا آج کل کون پرانی دوستی کو یاد رکھتا ہے؟' اور پھر لکشمی کی طرف مڑ کر کہا، 'ارے ان جوتیوں کو حفاظت سے اپنے صندوق میں رکھ دے۔ تیرے جہیز میں دوں گا۔'

لکشمی خوشی خوشی جوتیوں کو لے کر اندر گئی۔ تب چودھری بولا، 'جہیز تو تیار ہوگیا۔ ایک جوتیوں کی کسر تھی، وہ تو نے آج پوری کر دی، مگر چھوکرا نہیں ملتا گاؤں میں، یہاں کے جتنے اچھے چھوکرے تھے، سب بمبئی، کلکتہ چلے گئے ہیں، وہاں کی سڑکوں پر جھاڑو دیتے ہیں۔'

میں نے کہا، 'پھر بھی، گاؤں میں تلاش کرو تو ایک آدھ چھوکرا مل ہی جائے گا۔'

'کہاں ملتا ہے؟ ایک بھی نام تو بتا!'

'ایک تو بھوکا رام ہی ہے!'

'کیا!......بھوکا......رام......بھوکا......یعنی......تو......تیار ہے لکشمی سے بیاہ کرنے کو؟'

'ہاں کاکا!' میں نے کہا۔

سو اگلے مہینے ہمارا بیاہ ہوگیا۔ رات کو چودھری نے بہت بڑی دعوت دی۔ سب نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ پھر تاڑی پی۔ پھر خوب گانا بجانا ہوا۔ میں نے بھی ایک فلمی گانا خوب لہک لہک کر گایا۔

میں تو دہلی سے دلہن لایا رے او بابو جی!

سو اسی رات لکشمی اپنی لال اوڑھنی، لال لہنگا، لال چولی اور میری بنائی ہوئی لال جوتیاں پہن کر میرے گھر آ گئی۔ جھونپڑے میں جیسے چاند نا سا ہو گیا۔

میں نے کواڑ بند کر کے اسے خوب چوما چاٹا تو کہنے لگی، 'اجی تم تو بہت بے شرم ہو! کوئی اپنی بیوی کے ساتھ ایسا کام کرتا ہے؟'

'تو کیا جانے لکشمی، تو تو کل کی بچی ہے۔ بیاہ کر کے تو مرد عورت اس سے بھی زیادہ بے شرمی کرے ہیں!'

'کیا کرے ہیں؟'

'ایک دوسرے کو کھا جاویں ہیں!' میں نے کہا۔

'ہائے رام!' اس نے کہا، 'کیوں کھا جاوے ہیں؟ تو نے برادری کی روٹی میں کھانا نہیں کھایا کیا؟'

'میں اس کھانے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔' میں نے جواب دیا، 'میں تو جنم کا بھوکا ہوں۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ تیرا بھوکا ہوں!

'ہاں، میرے بھوکے تو ہو ہی' اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے کہا، پہلے اپنی چنری اتار اور ادھر سرہانے رکھ دے پھر کھانے کا کھیل کھیلیں گے۔

وہ بالکل بچی تھی، کچھ معلوم ہی نہ تھا بیاہ ہونے پر کیا ہووے ہے؟ میں رات بھر اسے سکھاتا رہا پڑھاتا رہا، اس کو کھاتا رہا وہ مجھے کھاتی رہی۔

اس دن سے میری دکان بہت چلنے لگی، لکشمی جو گھر آ گئی تھی۔ اس کی تاک جھانک میں سب گبرو جوان میری دکان جس کے پیچھے ہی میرا گھر تھا، جہاں لکشمی چولہا چکی کرتی تھی کے چکر لگانے لگے، جو کلکتہ اور بمبئی سے آتے وہ بھی کہتے کہ بھوکھا رام بڑا خوش قسمت ہے کہ ایسی خوبصورت بیوی ملی، بمبئی میں ہوتی تو فلم اسٹار ہو جاتی، تو میں کہتا کہ فلم اسٹار بنے تیری جورو! میری لکشمی کو نظر نہ لگا۔ مگر کسی نہ کسی کی نظر لگ گئی اسے۔ گاؤں میں ایسا سوکھا پڑا کہ آس پاس کے سبھی کنویں اور تال تلیاں سوکھ گئے۔

سورج دیوتا جس کو سب ان داتا کہتے ہیں۔ وہی ہمارا دشمن بن گیا، دن بھر ایسے کڑا کے کی دھوپ رہنے لگی کہ سڑک پر ایک مٹھی مکئی بکھیر دو تو دانے بھون جائیں! ایک ایک کر کے جتنے کسان تھے اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر کا راستہ ناپنے لگے، پہلے تو جو کھاتے پیتے گھر تھے وہ خالی ہوئے۔ پھر ریل میں بھر بھر کے چلے گئے، اسٹیشن ہمارے گاؤں سے دو تین کوس دور تھا۔ رات کو انجن کی سیٹی سنائی دیتی تھی، ایک رات انجن کی سیٹی بجی تو لکشمی مجھ سے لپٹ گئی کہنے لگی نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگے ہے؟ میں نے کہا جب تک میں زندہ ہوں تجھے ڈر کا ہے کا؟

اگلے دن جب میں ہریمن اڑی میں چودھری کے گھر گیا تو وہاں ان کو چار پائی پر مردہ پڑا پایا۔ کمال کر دیا بڈھے نے مرتے مر گیا پر کسی سے پانی تک نہیں مانگا!

تیسرے دن میں نے بھی لکشمی سے کہا۔ چل لکشمی ہم بھی بمبئی چلیں! وہاں کوئی نہ کوئی کام تو مل ہی جائے گا اور کچھ نہیں تو ہم سڑک پر جھاڑو ہی دے دیا کریں گے! ہم ریل میں بیٹھ کر بمبئی آگئے، راستے میں جب بابو نے ٹکٹ مانگا تو میں نے کہا ٹکٹ کا ہے سے خریدتے بابو ہم تو سوکھے کے مارے ہیں، بہار میں ایسا سوکھا پڑا ہے کہ کسی نے نہ دیکھا نہ سنا، اس نے رحم کھا کر ٹکٹ کے پیسے نہیں مانگے۔

سو ہم بمبئی آگئے۔ دس برس ہو گئے ہمیں بمبئی آئے ہوئے لیکن آج تک وہ پہلا دن یاد ہے مجھے۔

اسٹیشن سے نکلا تو دیکھا کہ ہمارے جیسے سینکڑوں بے گھر آدمی سڑکوں پر پڑے ہیں۔ ہم نے ایک آدمی سے پوچھا بابو جی یہاں سڑکوں پر جھاڑو دینے کا کام ملے گا؟ وہ کہنے لگا بھائی میں خود سڑکوں پر جھاڑو دینے کا کام کرتا تھا مگر اب وہاں بھی کام نہیں رہا۔ پھر کسی سے سنا کہ اسٹیشن کے پاس ہی بہار سے آئے ہوئے کسانوں کی بستی بسی ہے۔

ہم جلدی جلدی اپنی گٹھریاں اٹھائے وہاں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ بہار والوں نے اپنی جھونپڑیاں ضرور بنائی ہیں لیکن سب اونچی ذات کے لوگ ہیں، انھوں نے کہا کہ تم کس ذات سے ہو ہم نے کہا سرکار ہم ہریجن ہیں، میں ہوں بھوکھا رام چمار! وہاں بھی جوتیاں بنایا کرتا تھا۔ یہاں بھی جوتیاں بناؤں گا تو انھوں نے سڑک کے تلے جہاں گندے پانی کی نالی بہتی تھی، جسے

بمبئی کی زبان میں گٹر کہتے ہیں، ادھر اشارہ کیا، ہریجن یہاں رہتے ہیں۔

سو ہم وہاں آ گئے۔ ایک پیڑ کے نیچے دو چار گز زمین تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہی ہمارا بسیرا ہوگا، سو وہ جگہ میں نے ہتھیا لی۔ اس کے پاس کے ہریجنوں سے بات چیت کر کے پتہ چلا کہ یہاں اتنے ہریجن آ گئے ہیں کہ سڑکوں پر جھاڑو دینے والے بھنگیوں میں بھی بھرتی ہونا مشکل ہے۔ بمبئی میں بہار والا ہی حال تھا۔ کھانے کا، رہنے کے لیے مکان کا، مگر پانی کی کمی نہیں تھی۔ جہاں دیکھو موٹا پانی کا نلکا جس میں لوگوں نے سوراخ کر رکھے تھے، سو پانی کا فوارہ ایسے نکلتا تھا کہ میں نے جو پہلے دن دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ دوسرے دن خیال آیا کی اس فوارہ میں آدمی بھی تو نہا سکتے ہیں۔ سو میں اور لکشمی وہاں جا کر خوب نہائے۔ کپڑے بھی دھوئے نہا دھو کر صاف ہوئے تب پیڑ کے نیچے لیٹے اور وہاں ایک بابو سے کہہ کر ایک لکڑی کے پھٹے پر ہندی میں لکھوا دیا۔ 'بہاری موچی' اس کو کیل سے ٹھوک کر پیڑ کے تنے پر ٹانگ دیا۔ لکشمی نے کہا اس پر کیا لکھا ہے، میں نے کہا، اس پر لکھا ہے، بہاری موچی تا کہ جو لوگ جوتا بنوانا چاہیں وہ جوتا بنوالیں یا کم سے کم گٹھوا ہی لیں۔ اس پر لکشمی بولی جو پڑھ نہیں سکتے، ان کا کیا ہوگا وہ تو سمجھیں گے یونہی کیڑے مکوڑے بنا رکھے ہیں۔ اس کے نیچے ایک نشان دے دو۔ تو ہی بتا، کیا نشانی بنائیں۔

اس نے اپنی گٹھری کے کپڑوں کے نیچے سے وہی اپنے بیاہ کی لال لال جوتیاں نکالیں۔ چاندی کے جھمکے اب بھی ان میں ٹکے ہوئے تھے۔ یہ جوتیاں لٹکا دے تا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اگر ایسی خوبصورت جوتیاں بنوانی ہو تو، بہاری موچی سے بات چیت کر لیں۔

سو وہ پھٹہ لٹکا رہا اور اس کے نیچے وہ خوبصورت لال لال جوتیاں لٹکی رہیں۔ ہر راہ چلتا ان کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتا۔

''بہاری موچی''

''جی سرکار''

''ہمارے لیے بھی ایسی جوتیاں بناؤ گے''

''جیسا حکم ہو سرکار''

''کیا لو گے''

میں نے چمڑے کے ٹکڑے اور اوزاروں کی دوکان سجا رکھی تھی میں نے کہا،
چمڑا مہنگا ہو گیا ہے سرکار تین روپے کا تو چمڑا ہی لگے گا ایک روپیہ مجھے بنوائی کا دینا ہوگا۔
وہ کہنے لگا کل ملا کر چار روپے ہوئے۔'
میں نے کہا جی سرکار
تم بدھو ہو وہ بولا
اگر زیادہ ہو تو سرکار ساڑھے تین دے دینا

وہ کہنے لگا زیادہ نہیں ہے۔ ایسی جوتیاں بازار میں بیس پچیس روپے کی ملتی ہیں۔ کم سے کم دس روپے تو تمھیں بھی ملنے ہی چاہیے۔ یہ لو پانچ روپے رکھ لو۔ باقی پانچ روپے جوتیاں تیار ہو جائیں گی تبھی ملیں گے۔

سو میری دکان چل نکلی۔ دھوپ سے بچنے کے لیے میں نے دو لکڑیاں زمین میں گاڑ کر ان پر لکشمی کی ایک پرانی ساڑی تان دی پھر کنڈی پر سے ایک پلاسٹک کا ٹکڑا ہاتھ آ گیا اس کو اوپر ڈال دیا۔ اس گھر میں ہم نے آٹھ برس گزارے۔ وہی آدمی آتا اور مجھ سے دس دس روپے میں جوتیاں بنوا کر لے جاتا۔ سنا ہے، وہ جوتیاں گرانٹ روڈ پر بیس بیس روپے میں بیچتا تھا۔ بیچتا ہوگا، اس کی قسمت۔ مگر مجھے اپنی محنت کے پیسے مل جاتے تھے اور کام بھی چل جاتا تھا۔ کسی کے جوتے کا تلا چڑھا دیتا تھا۔ کسی کے جوتے پر پالش کرنی ہوتی، اس کا سامان بھی میں نے خرید کر اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ ایک گٹھری اپنے سر کے نیچے رکھتا، ایک گٹھری لکشمی کے سر کے نیچے اور رات کو کالی چادر اوڑھ کر ہم ایک دوسرے سے بچوں کی طرح لپٹ کر وہیں سو جاتے۔

سات برساتیں آئیں اور ہم نے وہیں اس پلاسٹک کے کپڑے کی چھت کے نیچے گذار دیں، مگر جب آٹھویں برسات آئی تو سمندر سے ایک طوفانی ہوا چلی، جو اپنے ساتھ ہمارے کپڑے کی چھت کو اڑا لے گئی۔

رات بھر بارش ہوتی رہی اور ہم ایک دوسرے سے لپٹے پڑے رہے۔ صبح ہوئی تو لکشمی کا بدن مجھے جلتا ہوا محسوس ہوا۔ 'تجھے تو بخار ہے لکشمی!' میں نے کہا۔
'ایسے ہی بارش میں بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔'

دو پہر تک وہ اتنی نڈھال ہوگئی کہ بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ گٹھری سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔ میں نے جو ہاتھ لگا کر دیکھا تو بدن پھنک رہا تھا۔ میں اسے اسپتال کے ایک خیراتی وارڈ میں لے گیا۔

ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہی کہا، 'اسے تو نمونیہ ہوگیا ہے۔ اسپتال میں داخل کرنا ہوگا۔'

میں نے پوچھا، 'دیکھ بھال کرنے کو اس کے پاس کون رہے گا؟'

اس نے کہا، 'دیکھ بھال کرنے کو نرسیں ہیں۔ تم چاہو تو تم بھی رہ سکتے ہو، کیونکہ کیس کافی سیریس ہے۔ اس وقت اس کو ایک سو چھ ڈگری کا بخار ہے۔'

رات کو وہ بہکتی رہی۔ کبھی اپنے بابا کو آواز دیتی، کبھی اپنی سہیلیوں کو! کبھی سمجھتی تھی کہ یہ اس کی شادی کی رات ہے۔ ایک بار کہنے لگی، 'تم مجھے کھا تو نہیں جاؤ گے؟' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ تو میں مذاق کر رہا تھا، مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہنے لگی، 'تم مرد بڑے بے شرم ہوتے ہو۔'

صبح ہوتے ہوتے وہ اتنی کمزور ہوگئی کہ بے ہوشی سی طاری ہوگئی اس پر۔ ڈاکٹر جب چکر لگانے کے لیے آیا تو میں نے اس سے کہا، 'ڈاکٹر صاحب، بھگوان کے لیے میری لکشمی کو بچا لیجیے۔'

وہ کہنے لگا، 'تمھاری بیوی کمزور ہے۔ وٹامن کی بڑی کمی ہے اس کے جسم میں۔ طاقت ہے ہی نہیں اس کے بدن میں بخار کا مقابلہ کرنے کی۔

''پھر کیا ہوگا؟''

''ایک انجکشن لگانا ہوگا تمھیں۔ کوئی آٹھ دس روپے کا ہوگا۔''

میں نے کہا، میرے پاس پیسے ہیں، میں اپنے لکشمی کو بچانے کیلیے کچھ بھی خرچ کر دوں گا۔''

ڈاکٹر کی پرچی لے کر میں بھاگتا ہوا بازار گیا دوکان میں سب دوائی تھی، مگر یہ انجکشن نہیں تھے۔ ایک دوسری دوکان پر میں نے پرچی دی، اس نے انجکشن کا ڈبہ نکالا۔ پوچھا کتنے چاہیے؟''

''جتنے لکھے ہیں اس میں'' میں نے کہا۔

اس میں تو چھ لکھے ہیں۔ بارہ روپے لگیں گے۔ مگر یہ انجکشن بیماری کی آخری حالت میں دی جاتی ہے، اس لیے چاہو تو ایک دو ہی لے جاؤ۔''

میں نے بارہ روپے اس کے ہاتھ میں دیے، اور انجکشن کا ڈبہ لے کر اسپتال کی طرف بھاگا۔ سیڑھیاں چڑھتے برآمدے میں سے بھاگتے بھاگتے میری سانس پھول گئی۔ جب وارڈ میں پہنچا تو ایک نرس لکشمی کو چادر اڑھا رہی تھی۔

"اس کا منہ مت ڈھکو اسے گھٹن ہوتی ہے۔ وہ کبھی کمبل چادر سے سر نہیں ڈھانکتی۔ میں نے کہا۔

بوڑھی نرس نے، ہمدردی سے کہا صبر کرو بیٹا، بیچاری مر چکی ہے۔

میرے ہاتھوں سے انجکشن کا ڈبہ گر پڑا۔ ایک انجکشن کی شیشی گر کر ٹوٹ گئی اور اس میں دوا بہہ کر ایک سوالیہ نشان بناتی ہوئی پتھر پر پھیل گئی۔

اگر اسپتال میں انجکشن ہوتا تو وہ بچ سکتی تھی؟

میں نے یہ سوال ڈاکٹر سے پوچھا مگر اس نے جواب دیا یہ تو بھگوان ہی جانتے ہیں؟

اگلی صبح شمشان سے جب میں لکشمی کی راکھ لایا تو اسے حفاظت سے ایک چھوٹی گھڑیا میں رکھ دیا۔ اس کے اوپر اس کی وہ جھمکے لگی لال لال جوتیاں بھی رکھ دیں۔ اگلے دن پڑوسیوں نے سمجھا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں، کیوں کہ میرے پاس جو روپے تھے ان سے پانچ روپے کے میں نے پانچ گھڑے خریدے۔ ان کو پیڑ کے نیچے سجایا۔ اس طرح کہ چار گھڑے تو چار کونوں میں رکھے اور ان کے بیچ میں جو جگہ تھی اس کے بیچ میں پانچواں رکھ دیا۔ پانچویں گھڑے کے اوپر گھڑیا رکھ دی، جس میں لکشمی کی راکھ تھی۔ پھر میں نے ایک روپے کا چونا خرید کر لایا۔ اس کو پانی میں گھول کر میں نے پانچوں گھڑوں پر سفید رنگ کا لیپ کر دیا بالکل تاج محل کی طرح جگمگ کرنے لگا۔

دو برس تک میں اس تاج محل کی حفاظت کرتا رہا۔ اس بیچ میں میونسپلٹی کے افسر آئے پولس والے آئے۔ بلڈوزر مشین لے کر آئے۔

سب نے اس تاج محل کو مٹانے کی کوشش کی۔ انھوں نے آس پاس کی سب جھونپڑیوں کو توڑ ڈالا۔ وہ کہنے لگے کہ جھونپڑے شہر کی خوبصورتی کو بدصورتی میں بدل دیتے ہیں۔ فلاں فلاں قانون کے مطابق یہ جھونپڑی غیر قانونی سمجھے گئے ہیں۔ میں نے کہا تو جھونپڑے توڑ ڈالیے مگر یہ تاج محل، میں آپ کو نہیں توڑنے دوں گا۔ اس کی حفاظت کے لیے میں اپنی جان دے دوں گا۔

ایک آدمی نے اشارے سے کہا یہ بیچارہ تو پاگل ہے۔ سو اس دن انھوں نے تاج محل چھوڑ دیا۔

اس رات جب میں سو رہا تھا تو سپنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک بم تاج محل پر گرا جس نے محبت کے اس انوکھے اور انمول یادگار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ ایک دم میری آنکھ کھل گئی۔ میں یہ دیکھ کر دھک رہ گیا کہ تاج محل کے پانچوں گھڑے ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں مگر شکر ہے کی گھڑیا سلامت تھی۔ میں نے وہ گھڑیا اٹھائی اور وہاں سے چلا گیا۔

سپاہی پاگل کی اس حرکت پر ہنسنے لگے مگر میں پاگل نہیں ہوں، پاگل وہ ہیں۔ اس لیے میں پھر گھڑے والے کی دوکان پر گیا۔ پھر پانچ گھڑے وہاں سے خریدے۔ پھر ایک روپے کا چونا خریدا پھر پانی میں ملا کر سفیدی کو ان گھڑوں پر لیپا اور رات کے اندھیرے میں اپنا تاج محل پھر بنایا۔

صبح کی سورج کی کرنیں جب اس پر پڑی تو میرا بنایا ہوا تاج محل ایسا لگا جیسے وہ واقعی محبت کی ایک امر نشانی ہو۔ کیا اس کو بھی آپ توڑ ڈالیں گے سرکار؟

O

# دل ہی تو ہے

آپریشن تھیٹر کی سفید دیواروں میں تین افراد قید تھے۔

ایک آدمی تھا۔

ایک جج تھا۔

ایک ڈاکٹر تھا۔

ایک آدمی تھا بے سکت، بے ہوش۔ تقریباً بے جان آدمی آپریشن ٹیبل پر پڑا تھا۔ اس کے دل میں ایک سوراخ تھا۔ اس کے سوراخ میں پستول کی ایک گولی تھی۔ تھوڑی دیر ہی میں اس کے دل کی حرکت ہمیشہ کے لیے بند ہونے والی تھی۔

جج نے کہا اور اس کی دھیمی آواز بھی اس آپریشن تھیٹر میں ایسی گونجی جیسے وہ عدالت میں فیصلہ سنا رہا ہو۔ 'ڈاکٹر اس آدمی کی جان بچانا بہت ضروری ہے۔ یہ مرنے نہ پائے'۔

ڈاکٹر نے کہا۔ 'جج صاحب میں خدا نہیں ہوں لیکن بخدا ہم اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے'۔

جج نے کہا۔ 'تمھیں ناممکن کو بھی ممکن بنانا ہے'۔

ڈاکٹر نے کہا: تب تو ایک ہی صورت ہے اسے بچانے کی لیکن آپ جانتے ہیں وہ آپریشن

کتنا خطرناک ہے۔' میں جانتا ہوں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ قانون کی خاطر، انصاف کی خاطر تم وہ خطرناک آپریشن کر ڈالو۔'

'اگر ہم کامیاب ہو گئے تو...... ڈاکٹر نے کہا۔ یہ سائنس کی بہت شاندار فتح ہوگی۔'

'سائنس کی ہی نہیں۔' جج نے جواب دیا۔ 'یہ قانون کی بہت بڑی جیت ہوگی تب ہی تو اس بے چارے کی سلامتی میں مجھے اتنی دلچسپی ہے۔'

بے ہوش تو وہ پہلے بھی تھا پھر بھی بے ہوشی کی گیس سنگھائی گئی تو آدمی کا سوتا ہوا لاشعور زندگی اور موت کے درمیان جھولا جھولنے لگا۔ وہ زندہ تھا لیکن اس کے بدن میں زندگی نہیں تھی۔ وہ مر چکا تھا مگر مکمل طور سے نہیں۔ ذرا سی کسر باقی تھی۔

بے ہوشی کی گیس سنگھائی جا رہی تھی۔ رگوں میں سوئی لگا کر خون چڑھایا جا رہا تھا۔ ایک دوسری سوئی کے ذریعے گلوکوز دیا جا رہا تھا تاکہ آپریشن کے دوران اس کے دل کی حرکت جواب نہ دے جائے۔ ڈاکٹر کی تمام جان، تمام طاقت، تمام قابلیت اب اس کی اُنگلیوں میں آ گئی تھی جو نشتر لے کر، آدمی کی پسلیوں کے پنجرے کو توڑ کر، اُس کے سینے کی کھال چیرتی ہوئی اب دل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جس کی حرکت اب اتنی سست ہو گئی تھی کہ لگتا تھا اس میں اب جان ہی نہیں ہے۔ بے ہوشی کے بادلوں میں سے آدمی کا لاشعور دو آوازیں سن سکتا تھا۔ کہیں دور کتے بھونک رہے تھے اور ایک آواز تحکمانہ لہجے میں کہے جا رہی تھی۔

'...... پھانسی دی جائے یہاں تک کہ اس کا دم نکل جائے اور یہ مر جائے......'

'...... پھانسی دی جائے — پھانسی دی جائے......'

...... یہاں تک کہ اس کا دم نکل جائے — دم نکل جائے —'

'مر جائے — مر جائے — مر جائے —'

☆

سزائے موت کا فیصلہ سناتے ہوئے جج کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ کوئی جذباتی لغزش نہیں تھی '...... پھانسی دی جائے یہاں تک کہ اس کا دم نکل جائے اور یہ مر جائے......'

آدمی کو اپنے گلے کے گرد پھانسی کی رسّی تنگ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تو بے خیالی سے اس نے قمیض کے کالر کے اوپر کے بٹن کو کھول دیا۔ اس کی نگاہیں جج کے چہرے پر ہمدردی یا افسوس کے آثار تلاش کر رہی تھیں۔ (آخر وہ ایک انسانی جسم کو ختم کیے جانے کا حکم دے رہا تھا۔ صرف قلم کی ایک جنبش سے!) مگر وہاں ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔ جج کے چہرے پر مسکراہٹ تو نہیں تھی مگر کوئی غم، کوئی افسوس، کوئی فکر بھی نہیں تھی۔ اگر چہرے پر کوئی جذبہ تھا تو وہ اطمینان اور فراغت کا تھا، ہفتوں کی قانونی رسہ کشی کے بعد جو استغاثہ اور صفائی کے وکیلوں اور ان کے گواہوں کے درمیان ہوئی تھی، آخر کار یہ مقدمہ بھی اپنے انجام تک پہنچ گیا تھا۔ ایک مصوّر کو اپنا شاہکار مکمل کرنے کے بعد شاید ایسا ہی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

آدمی کو دفعتاً محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے آ رہے ہیں لیکن اپنی قوت ارادی سے ان کو پی گیا۔ نہیں (اس نے سوچا) میں اس جج کے سامنے اپنی کمزوری کا اظہار ہرگز نہیں کروں گا۔ کاش اس جج کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں اس کی نگاہ میں، اس کے انداز میں ذرا سا بھی رحم، تھوڑی سی بھی ہمدردی ہوتی، ایک انسان کے لیے، اُس کی ان مجبوریوں کے لیے جو کبھی کبھی اس کے ہاتھوں سے قتل کراتی ہیں! پھر وہ اس کو سزائے موت کا حکم بھی سناتا تو آدمی کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ وہ سمجھ جاتا کہ جج بھی مجبور ہے۔ انصاف کے ہاتھوں، قانون کے ہاتھوں تعزیرات ہند کے ہاتھوں۔ پھر وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے دیتا — چاہے دیکھنے والے اُسے کتنا ہی بزدل سمجھتے۔ مگر اُن آنسوؤں میں اُس کے دل میں جو زہر بھرا ہوا تھا وہ باہر نکل جاتا۔ اُس کی روح پاک اور صاف ہو جاتی اور پھر وہ اسے پھانسی بھی دے دیتے تو اس کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ پھر وہ خوشی سے موت کو گلے لگا لیتا۔ اس وقت ایک ہی خواہش، ایک ہی آرزو، ایک ہی خیال، ایک سلگتا ہوا سوالیہ نشان بن کر آدمی کے دل اور دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ کیا وہ جج انسان نہیں تھا؟ کیا وہ صرف قانون کی ایک مشین تھا جس میں انسانی ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں تھا؟ آدمی کو سزائے موت دینا اس کا قانون مگر رحم دینا اس کا قانونی فرض تھا۔ مگر کیا رحم اور ہمدردی کا ایک اشارہ اس کا انسانی فرض نہیں تھا؟ اُس کے قلم کی ایک جنبش نے ایک آدمی کی زندگی کو ختم کرنے کا حکم سنا دیا تھا اور اُس کی آواز میں، اس کی آنکھوں میں، ذرا سے افسوس کی جھلک نہیں آئی تھی......

ایک آدمی نے بھی دو انسانوں کو سزائے موت دی تھی...... دو انسان جن سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ایک اُس کی بیوی تھی اور دوسرا اس کا دوست تھا۔عدالت کی زبان میں وہ ڈبل خونی تھا۔مگر جب اس نے اپنے دوست پر اپنی فوجی سنگین سے وار کیا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے من میں اندھیرے میں بیٹھا ہوا کوئی شیطان اسے قتل پر مجبور کر رہا تھا۔وہ اس کی بیوی کا عاشق تھا مگر وہ اس کا دوست تھا اور سو وہ اسے تکلیف پہنچا کر مارنا نہیں چاہتا تھا۔پیچھے سے آ کر اس نے چپکے سے وار کیا تھا۔کمر کی تیسری پسلی کے نیچے جہاں دل ہوتا ہے وہاں سنگین کا بس ایک وار—اور اس کا دوست وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔بغیر یہ جانے ہوئے کہ اس کی دفعتاً موت کا ذمے دار کون ہے؟ سنگین سے دشمن پر کہاں اور کیسے وار کرنا چاہیے۔یہ اس کو فوج میں سکھایا گیا تھا۔اس نے دس کو—اپنے جیسے دس آدمیوں کو—اسی طرح وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا تھا جس کا ثبوت وہ میڈل تھا جو اس کو انعام میں ملا تھا۔اس کا دوست گیارہواں تھا۔وہ دشمن تھے۔یہ دوست تھا مگر سنگین دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کرتی۔سنگین جان لے سکتی ہے مگر خود بے جان ہوتی ہے۔بے جان، بے روح، بے عقل۔ اور سپاہی جو سنگین چلاتا ہے وہ بھی ٹھنڈے فولاد کی طرح بے روح، بے عقل ہوتا ہے۔کیا وہ دس واقعی اس کے دشمن تھے؟ اس کو تو ان کے نام بھی نہیں معلوم تھے۔اس سے پہلے اس نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔وہ کس کے بیٹے تھے، کس کے بھائی تھے، کس کے شوہر تھے، کس کے دوست تھے۔اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔اس کو صرف بتایا گیا تھا کہ وہ اس کے دشمن ہیں۔اس کو حکم دیا گیا تھا کہ ان کو مارنا اس کا فرض ہے۔اور سو اس نے ان کو مار دیا تھا۔جنگ سے واپس آنے پر اس کو بتایا گیا تھا کہ اس کا دوست دراصل اس کا دشمن ہے۔اس کے من کے اندھیرے میں جو شیطان بیٹھا ہوا تھا اس نے حکم دیا تھا کہ اسے مار دیا جائے اور اس نے سنگین اس کی پسلیوں میں اتار دی تھی۔شاید دس دشمنوں کے بعد یہ پہلے دوست کا خون نہیں تھا، شاید گیارہویں دوست کا خون تھا جو اس کے ہاتھوں ہوا تھا۔

مگر پھر بھی اس کو اتنی تسلی تھی کہ اس کا دوست بغیر کوئی تکلیف محسوس کیے اس دنیا سے گزر گیا تھا۔اس نے فوجی سنگین کو اس کی کمر سے جب کھینچ کر نکالا تھا تو بدن ٹھنڈا ہو چکا تھا مگر زخم

سے گرم گرم خون کا ایک فوارہ نکلا تھا جس کے چھینٹے اس کے کوٹ کی آستین پر گرے تھے۔ ثبوت کے طور پر سنگین کے ساتھ یہ کوٹ بھی مقدمے کے دوران پیش کیا گیا تھا۔ اور سرکاری وکیل نے ڈرامائی انداز میں اس کوٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

'مائی لارڈ۔ جب چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا' اور وہ یہ سوچ کر مسکرا دیا تھا کہ وکیل صاحب کو یہ نہیں معلوم کہ اس آستین پر تو دس اور انسانوں کا خون بھی پکار رہا ہے مگر وہ خون نہ وکیل صاحب کو نظر آئے گا نہ کوئی عدالت اُس لہو کی پکار سننے کے لیے تیار ہے۔

اور اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو تھے جب وہ قتل کے ارادے سے اپنی فلیٹ کے اس کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں اس کی بیوی سو رہی تھی۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ روشنیاں بجھی ہوئی تھیں مگر کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے پردوں کو سرسراتی ہوئی ہوا کے ساتھ چاندنی بھی دبے پاؤں اندر آ گئی تھی۔ اس مدھم روشنی میں وہ اتنی خوبصورت، اتنی معصوم، اتنی بھولی بھالی لگ رہی تھی کہ اس کی ہمت نہ پڑی کہ سنگین کو میان سے باہر نکالے۔ پہلے اس کا خونی ارادہ تھا جس ہتھیار سے اس کے عاشق کا خون کیا ہے، اسی سے اپنی بیوی کا گلا کاٹ ڈالے گا مگر اب وہ اس خیال سے ہی کانپ اٹھا۔ جس سے اس نے محبت کی تھی وہ اس کا خون بہتا نہ دیکھ سکے گا۔ یہ کام اس کو اپنے ہاتھوں سے لینا ہوگا۔ اس کی ٹریننگ بھی اس کو فوج میں دی گئی تھی۔ کمانڈو اسکول میں کراٹے انسٹرکٹر نے اس کو سکھایا تھا کہ گلے کی کون سی رگ کو دبانے سے دشمن کو ہمیشہ کے لیے خاموش کیا جا سکتا ہے۔ وہ سبق اس کو آج بھی یاد تھا اور اس کی بیوی نیند سے بیدار ہوئے بغیر ہی مر گئی اور جو مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی وہ برقرار رہی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا جن ہاتھوں نے بارہ خون کیے تھے۔ مگر اب اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی بیوی کے دامن سے بے وفائی کا داغ ہمیشہ کے لیے دھل گیا ہے۔ اب وہ پھر معصوم ہے— اور اس کی ہے۔ ہمیشہ کے لیے اس کی! اس نے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔ کتنے ٹھنڈے تھے وہ ہونٹ! اس نے اس کے ننھے ننھے گورے گورے پاؤں کا بوسہ لیا۔ جو اس وقت بے جان سنگ مرمر کے تراشے ہوئے تھے! پھر وہ اس کے پلنگ کے پائنتی بیٹھ گیا اور وہ آنسو جو اب تک اس کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے وہ بہہ نکلے اور اسے ایسا لگا کہ وہ رو رہا ہے۔ نہ صرف اپنی بیوی کے لیے، نہ صرف اپنے دوست

کے لیے بلکہ ان گمنام انجان دس آدمیوں کے لیے بھی جو سب اس کے ہاتھوں ہلاک ہوتے تھے۔ وہ اس وقت سسکیاں لے کر روئے جارہا تھا۔ جب صبح کے اجالے میں پولیس نے اس کو دو خون کرنے کے جرم میں گرفتار کیا اور جب اسے فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی تو وہ بڑبڑایا۔ 'بس دو خون؟ میں نے تو بارہ خون کیے ہیں'۔ اور پولیس افسر سمجھے خون اس کے سر پر چڑھ گیا ہے یا وہ جان بوجھ کر دیوانوں جیسی باتیں کررہا ہے۔

'مجرم!' جج اس سے مخاطب تھا مگر اس سے آنکھیں چرا کر دیکھ رہا تھا وکیل صفائی کی طرف۔ اس سے پہلے کہ تمھیں سزائے موت دی جائے، تمھیں کچھ کہنا ہے؟'

اور اسی لمحے میں آدمی کے دماغ نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کیا کہے گا—اور کیا کرے گا۔ وہ آہستہ سے اپنی جگہ کھڑا ہوگیا 'جی جناب' اس نے کہا اور جج کی طرف آنکھیں گڑا کر دیکھتا رہا مگر وہ اب بھی کسی دوسری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

'بزدل کہیں کا!' آدمی نے سوچا 'جس کو سزائے موت دی ہے اس سے نظریں ملاتے ہوئے گھبراتا ہے!'

جج نے مجرم کی طرف دیکھے بغیر اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا 'ہاں تو کیا کہنا ہے تمھیں؟ کوئی آخری خواہش؟'

'جناب والا۔ مرنے سے پہلے میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں جہاں— میری بیوی کو— جہاں میری بیوی کی لاش پائی گئی تھی'۔

'منظور کیا جائے'۔ جج نے عدالت کے کلرک کو اشارہ کرتے ہوئے کہا 'اگر جیل کے قانون اس کی اجازت دیتے ہیں— اور پھر قیدی کی طرف سے نظر بچا کر اس کے وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا 'اور کچھ کہنا ہے؟'

'جی نہیں، جناب والا۔ بہت بہت شکریہ، جناب والا'۔

جج تو کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ سو اس نے تو نہیں دیکھا مگر عدالت میں جتنے اور لوگ حاضر تھے انھوں نے دیکھا کہ مجرم کو جب لے جایا گیا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ لوگ بھی جو اب تک اس سے کچھ نہ کچھ ہمدردی رکھتے تھے اب ان کو بھی یقین ہوگیا کہ

جو آدمی دو بھیانک خون کر کے بھی مسکرا سکتا ہے، اس کو تو واقعی سزائے موت ہی ملنی چاہیے۔

آدمی کی آخری خواہش اس کی امید سے بھی پہلے ہی پوری ہو گئی۔ جیل کے قوانین کی رو سے وہ ایک بار پھانسی کی کوٹھری میں بند ہو گیا تو اس کو صرف ایک بار وہاں سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ آخری بار! اس لیے اگر اسے آخری بار اپنے گھر جانے کی اجازت ملی تھی تو عدالت سے سیدھا وہیں لے جانا ہوگا۔

'بس دس منٹ دے سکتے ہیں'۔ پولس کے دو سپاہیوں میں سے بڑے والے نے کہا۔ جب وہ لوگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے فلیٹ پر پہنچے جو تیسری منزل پر تھی۔

آدمی نے بڑی عاجزی سے کہا۔ 'آپ اجازت دیں تو میں اس کمرے میں دس منٹ اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ مرنے والی کی یادوں کے ساتھ! آپ دروازے پر پہرہ دے سکتے ہیں'۔

بڑے والے کانسٹبل نے کمرے کے اندر جا کر دیکھا، باہر جانے کے لیے دوسرا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ صرف ایک کھڑکی تھی۔ سڑک سے پچاس فٹ اونچی۔

'اچھا ٹھیک ہے'۔ اس نے کہا 'مگر کوئی گڑبڑ نہ ہو ورنہ یہ دیکھ لو۔' اور اس نے اپنی پیٹی میں لگے ہوئے پستول کی طرف اشارہ کیا۔

آدمی نے اندر سے دروازہ بند کر لیا مگر کانسٹبلوں کو اطمینان ہو گیا جب چٹخنی لگانے کی کوئی آواز نہیں آئی۔

'عجیب آدمی ہے یہ بھی'۔ چھوٹے والے کانسٹبل نے اپنے ساتھی سے کہا 'پہلے تو اپنی بیوی کو قتل کیا اور اب اسی کمرے میں اس کو یاد کر رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس کی بیوی کا بھوت اس کا ٹینٹوا دبا رہا ہوگا'۔

بڑے والے کانسٹبل نے اپنا تجربہ بگھارتے ہوئے کہا 'تم کیا جانو۔ یہ سب خونی پاگل تو ہوتے ہی ہیں۔ ان کے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ یہ بے چارہ تو فوج میں تھا۔ سنا ہے کہ گورنمنٹ نے میڈل بھی دیا ہے۔ دس دشمن مارے تھے اس نے۔ چھاپہ ماروں کے دستے میں تھا یہ'۔

چھاپہ مار! کمانڈوز! فقط اس کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ اس کے دماغ میں ایک شبہ بجلی کی طرح کوندا 'چھاپہ ماروں کو تو اونچے مقاموں سے کودنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔'

دوسرے لمحے ہی وہ دونوں کمرے کے اندر تھے مگر وہ کمرہ خالی تھا۔ کھڑکی کے پٹ ہوا سے ہل رہے تھے۔ جب انھوں نے نیچے دیکھا تو وہ سڑک کی دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ اتنے میں چٹی سے پستول ہاتھ میں آیا وہ بھیڑ میں کھو گیا تھا۔

مگر کودنے سے پہلے آدمی اپنے جوتے اتار کر چھوڑ گیا تھا۔ 'فکر نہ کرؤ۔ بڑے والے کانسٹبل نے کہا۔ 'میرے کتے ان جوتوں کی بو سے اسے کھوج نکالیں گے!'

☆

اس نے سنا تھا کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ میلوں تک دوڑنے کے بعد جنگل میں رات ہوگئی، اور آدمی تھک ہار کر پیڑوں کے ایک جھنڈ تلے سو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر سویا تھا کہ کتوں کے بھونکنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اس نے اس آواز کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ جھیل کے کنارے مینڈک ٹر رار ہے تھے۔ دلدل میں جھینگر آواز کر رہے تھے، گھاس میں مچھر بھن بھن کر کے اس کو کاٹ رہے تھے۔۔۔ اور دور کسی گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے۔ کتے تو رات کو بھونکتے ہی ہیں مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کو محسوس ہوا جیسے کتوں کے بھونکنے کی آواز تیزی سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے کتے اس کی طرف دوڑتے ہوئے آرہے ہوں۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کو احساس ہوا کہ یہ پولس کے شکاری کتے ہیں جو اس کی بو کا پیچھا کرتے ہوئے اس کا شکار کرنے دوڑے ہوئے آرہے ہیں۔ اب تو ان کی آوازیں خطرناک حد تک قریب آرہی تھیں۔ دفعتاً اس کی سب حسیں بیدار ہوگئیں اور وہ اٹھ بیٹھا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ چاند کمبخت کو بھی آج رات ہی نکلنا تھا۔ شاید گیارہویں رات تھی اور آسمان پر بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اگر وہ پیڑوں کے سائے سے نکل کر بھاگا تو میلوں سے کتے اسے دیکھ لیں گے اور اگر نہیں بھاگا تو بو سونگھتے سونگھتے وہیں پہنچ جائیں گے اور منٹوں میں اس کا تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ دونوں حالتیں خطرناک تھیں مگر بھاگنے میں بچاؤ کی ایک صورت ہو سکتی تھی۔ اگر وہ سامنے والی جھیل تک پہنچ گیا اور تیر کر اس کو پار کر گیا تو شکاری کتوں سے اس کا پیچھا چھوٹ سکتا تھا۔

اس کے تمام احساس، اس کے گھٹے ہوئے بدن کی تمام طاقت، اس کی تمام قوت ارادی سمٹ کر اس وقت اس کی بھاگتی ہوئی ٹانگوں میں آ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا اسی وقت کے لیے فوج کے کمانڈو اسکول میں اس کو چھاپہ ماروں کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے مڑ کر چاند کی روشنی میں دیکھا کہ شکاری کتے دو ہیں اور انھوں نے اپنے ساتھ کے پولیس کانسٹبلوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اس وقت وہ چھلانگیں بھرتے ہوئے اس کی طرف آ رہے ہیں۔ ایک کے مقابلے میں دو۔ مگر وہ کتے تھے اور وہ آدمی تھا۔ وہ بے عقل جانور تھے اور اس کے پاس دماغ تھا اور اس دماغ کو وہ سب چالیں اور گھاتیں یاد تھیں جو ایسے موقع کے لیے اس کو سکھائی گئی تھیں اور سو اس نے ان کو بھی کا ناچ نچایا۔ سیدھا دوڑنے کی بجائے کبھی ادھر گیا کبھی ادھر گیا۔ پیڑوں کے گرد گھوم کر، ٹیلوں پر سے گھوم کر، کھیتوں میں سے، کاشت کاروں کے جھونپڑوں کے آنگن میں سے ہو کر۔ اس کو معلوم تھا کہ شکاری کتے ایک آدمی کا پیچھا نہیں کرتے۔ وہ تو ایک خاص بو کو سونگھتے سونگھتے اپنے شکار تک پہنچ جاتے ہیں اور اس لیے وہ ہر اس جگہ جانے کے لیے مجبور تھے جہاں اس کے بھاگتے ہوئے چک پھیریاں کھاتے ہوئے قدم ایک پل کے لیے بھی گئے تھے۔

چھاپہ ماروں کو دشمن کی فوج اور پولیس کے شکاری کتوں سے بھی سابقہ پڑ سکتا ہے اور اس لیے کمانڈو اسکول میں اس نے یہ بھی سیکھا تھا کہ ایسی حالت کیا کرنا چاہیے۔ بھاگتے بھاگتے اس نے ان سب ہدایات کو یاد کیا جو ایسے وقت کے لیے ان کو دی گئی تھی۔ پل بھر کے لیے رکے بغیر اس نے قمیض اتاری اور اس کو گولا بنا کر دور ایک طرف پھینکا اور پھر پسینے میں شرابور بنیان کو دوسری طرف چٹانوں میں گرایا۔ کچھ دیر کے لیے تو شکاری کتے قمیض اور بنیان کے درمیان گڑبڑا گئے۔ غصہ انھوں نے کپڑوں پر نکالا۔ سونگھتے سونگھتے ان کو اپنے بھیانک دانتوں اور پنجوں سے تار تار کر ڈالا۔ اب وہ ان سے کوئی سو گز آگے تھا اور سامنے ہی جھیل کا پانی چاندنی میں چمک رہا تھا۔ یہی اس کی نجات کا ایک راستہ تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ شکاری کتے پانی میں شکار کی بو نہیں سونگھ سکتے۔

نوکیلے پتھروں پر سے ننگے پیر بھاگتے ہوئے اس کے تلوے لہولہان ہو گئے تھے۔ اس کے اپنے پیروں کے نیچے خون نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی رک نہیں سکتا تھا۔ کتوں نے پھر اس کی بو سونگھ لی تھی اور اب وہ تیزی سے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ اس

وقت اس ہرن کے مانند تھا جس کی ٹانگ میں گولی لگی ہو اور وہ شکاری کتوں سے بچنے کے لیے لنگڑاتا ہوا بھاگتا جا رہا ہو، بھاگتا جا رہا ہو کیونکہ رکنے میں اس کی موت ہے۔

اور اب جھیل کا پانی اس سے چند قدم ہی رہ گیا تھا۔ زمین جو یہاں تک پتھریلی تھی، اب نرم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے گھاس کی نرمی جو اس کے زخمی پیروں کو ایسی لگی جیسے کسی نے اس کے تلوؤں کے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھ دیا ہو۔ پھر پھسلواں کیچڑ۔ ہوشیاری سے قدم رکھنا چاہیے ورنہ پھسل کر گر گیا تو کتے اس کا تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ مگر اب اس کے پیر ایک دلدل میں پھنس گئے تھے جو ہر لحظہ اس کو دھیرے دھیرے نیچے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ دلدل سے پاؤں باہر نکال ہی نہیں سکتا تھا۔ اب وہ کتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کاش اس وقت اس کی سنگین اس کے پاس ہوتی تو وہ ان کتے کے بچوں سے نپٹ لیتا۔ مگر اب تو اس کی دونوں ٹانگیں بھی بیکار ہو گئی تھیں۔ گھٹنوں تک دلدل میں پھنسی ہوئی تھیں۔ اب تو اس کے صرف دو ہاتھ تھے اور دو خونی کتے تھے جو اپنے خوفناک دانت نکالے اس پر حملہ کر رہے تھے!

کہتے ہیں بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں۔ مگر ان دونوں کتوں نے شاید مثل نہیں سنی تھی۔ وہ خوفناک آواز میں بھونک بھی رہے تھے اور پنجوں اور دانتوں سے اس کو کاٹ بھی رہے تھے اور اس کے پاس ان کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف دو ہاتھ تھے۔ مگر کمانڈو اسکول میں اس کو یہ بھی سکھایا گیا تھا کہ دشمن کے شکاری کتوں کو بغیر گولی چلائے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے— بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کی حفاظت کرتے ہوئے اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ سارجنٹ نے ایسے موقع کے لیے کیا بتایا تھا۔ 'یاد رکھو کہ شکاری کتا شیر سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس کو اپنے قریب نہ آنے دو۔ ٹھوکر سے کام لو۔ تمھارے فوجی جوتوں میں اسی لیے نیچے موٹی موٹی کیلیں لگی ہوئی ہیں۔ وقت پڑے تو ان جوتوں کی مار سے ہتھیار کا کام لو۔' مگر اس وقت ان کو ٹھوکر کیسے مارے؟ اس کے تو ننگے پیر بھی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ اس کی ٹانگوں کو اپنے اندر کرتی جا رہی تھی۔

اس کے پاس تو اس وقت دو ہاتھ تھے جن سے وہ اپنے چہرے کی حفاظت کر رہا تھا۔ جہاں چھلانگیں لگا لگا کر وہ دونوں شیطان اس کی آنکھیں نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت صرف

مدافعت سے کام نہیں چلے گا۔ زہریلے پنجوں اور خونی دانتوں کی مار سے دونوں ہاتھ لہولہان ہو چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے ہاتھوں کی کھال اتر جائے گی اور خون بہہ کر ان کی ساری طاقت نکل جائے گی۔ اس سے پہلے ہی اسے ان ہاتھوں سے کچھ اور کام لینا ہے۔ اس نے ایک کتے پر ساری توجہ مبذول کر دی اور اگلی بار وہ اس کی طرف اچھلا تو اس کے ہاتھوں نے کراٹے' کے ایک پینترے سے اس کا گلا پکڑ لیا اور زور سے دبایا— دوسرا کتا اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے اس پر حملہ کر رہا تھا— اس کی ننگی پیٹھ اور اس کا سینہ لہولہان ہو گئے مگر اس نے کتے کا گلا نہ چھوڑا۔ دبائے ہی چلا گیا جب تک کہ دشمن بے جان نہ ہو گیا۔

اور اب صرف ایک دشمن باقی رہ گیا تھا۔ پہلا کتا زمین پر پڑا تھا اور دلدل اس کی لاش کو بھی اپنے اندر جذب کرتی جا رہی تھی۔ اپنے ساتھی کا انجام دیکھ کر کتے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اب اس کی شکاری حس میں ایک زہر بھری نفرت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

یہ لڑائی ایک آدمی اور ایک جانور کی نہیں تھی۔ دو جانوروں کا خونی مقابلہ تھا۔ آدمی بھی اس وقت ایک کتا ہی ہو گیا تھا۔ اگر کتا اسے کاٹ سکتا تھا تو اس کے دانت بھی مضبوط اور نوکیلے تھے— اس کے ہاتھ کتے کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہے تھے، اس کے دانت کتے کی گردن کو کاٹ رہے تھے۔ جیسے وہ کتے کا خون پی جائے گا۔ اگر کتا خوفناک طریقے سے بھونک رہا تھا تو اس وقت آدمی بھی چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا، گالیاں دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ کتے کی طرح ہی بھونک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ خونم خون ہو گئے تھے۔ اس کے منہ سے تھوک کے ساتھ خون بہہ رہا تھا— اس کا اپنا خون اور ساتھ میں کتے کا خون— مگر اس وقت یا اس کی جان تھی یا کتے کی اور کتا اگر حیوان تھا تو وہ بھی حیوان تھا— مگر ساتھ میں وہ انسان بھی تھا اور سو حیوانی طاقت کے ساتھ انسانی دماغ بھی شامل تھا۔ ایک دفعہ چار ٹانگ کے دشمن کی گردن اس کے ہاتھوں میں آ گئی تو اس کے انگوٹھے نے ٹٹول کر وہ رگ ڈھونڈ نکالی جس کو دبانے سے نرخرہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کتا بے جان ہو کر گر پڑا۔ کتا 'کراٹے' نہیں جانتا تھا۔

اب وہ دونوں ختم ہو چکے تھے مگر اس کی اپنی جان اب بھی خطرے میں تھی اور اس دشمن کے مقابلے میں نہ 'کراٹے' کام آ سکتے تھے نہ 'جیو جستو' یہ دشمن وہ دلدل تھی جس نے اس کے پیروں

میں زنجیر ڈال دی تھی۔ اس نے اب تک اس کا خیال نہیں کیا تھا مگر وہ کمر تک دلدل میں دھنس چکا تھا۔ ایک کتے کی تلاش تو آدھی سے زیادہ دلدل کی قبر میں اتر چکی تھی۔ دوسرے کے مردے کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا اور (اس نے ایک جھرجھری لے کر سوچا) میری قبر بھی ان دونوں کے ساتھ ہی بنے گی۔

موت کا خوف جو عدالت میں جج کا فیصلہ سن کر بھی ان کی آنکھوں میں نہیں جھلکا تھا، اس وقت اس کے سارے شعور پر چھا گیا۔ اس نے انتہائی مایوسی سے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید بچنے کی کوئی صورت دکھائی دے جائے — تو سامنے پولیس کا کانسٹبل کھڑا نظر آیا۔ موٹا، بھدّا، چاند کی روشنی میں چہرے پر نفرت اور غصہ۔ پاس آیا تو اس کا گلا بھی دبا دوں گا۔ آدمی نے سوچا مگر پاس آئے گا کیوں۔ اس کے ہاتھ میں تو پستول ہے۔

اسی پستول سے اس کی طرف نشانہ لگاتے ہوئے وہ دانت بھینچ کر بولا 'تو نے میرے پیارے کالو اور لالو کو مار ڈالا۔ کم بخت۔ انھیں اپنے بیٹوں کی طرح پالا تھا میں نے۔ ابھی تجھے بھی ان کے پاس پہنچاتا ہوں۔ ہاتھ اوپر کر۔'

اور جب آدمی نے ہاتھوں کو سر کے اوپر اٹھایا تو کانسٹبل بولا۔ 'یہ ٹھیک ہے۔ گولی سیدھی دل کے پار ہوگی۔' پستول نے اپنی نالی میں سے آگ کا شعلہ اگلا، ایک تڑاخہ ہوا — اور اس کے بعد آدمی کو نہ کوئی تکلیف محسوس ہوئی نہ کہیں درد ہوا۔ صرف ایک میٹھی سی ٹیس کلیجے میں اٹھی، اور اسے ایسا لگا جیسے وہ نیند کے گہرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

خواب میں اس نے ایک نوجوان کو دیکھا اور پھر پہچانا کہ یہ نوجوان وہ خود ہے اور ایک چھوٹی سی خوبصورت سی لڑکی ہے۔ جو ہنستی ہوئی بھاگ رہی ہے اور وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور اس کے ہاتھوں میں اس کا اپنا دل ہے اور اس دل کو وہ اس لڑکی کی نذر کرنا چاہتا ہے۔ 'دل دینا چاہتے ہو۔' لڑکی نے کہا اور اب اس نے دیکھا کہ یہ لڑکی اس کی بیوی ہے جو پھر زندہ ہوگئی ہے۔ 'دل دینا چاہتے ہو تو لاؤ۔' اور اس نے اپنا دل اس لڑکی کو دے دیا۔ ذرا سنبھال کر۔ میرا دل بڑا نازک ہے۔' ابھی اس نے کہا ہی تھا کہ لڑکی نے دل کو زمین پر دے مارا اور جو کانچ کا بنا ہوا تھا، ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور کانچ کا ایک تیز ٹکڑا اڑ کر اس کو چبھ گیا عین اس جگہ جہاں کبھی اس کا دل

تھااور بڑی سخت تکلیف محسوس ہوئی مگر یہ تکلیف اصلی تھوڑا ہی تھی۔ یہ تو خواب کی تکلیف تھی۔

اور پھر بے ہوشی کی صدیاں گزر گئیں اور وہ درد کی لہروں میں ڈولتا رہا، ڈولتا رہا اور اسے یہ یاد بھی نہ رہا کہ یہ سمندر ہے جس کی تہہ میں وہ ڈوبتا جا رہا ہے۔ یا وہ دلدل ہے جو اس کی ٹانگ گھسیٹ کر قبرستان میں اتارنا چاہتی ہے اور پھر اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی اس نوجوان سے کہہ رہی ہے۔ جو وہ خود تھا۔ 'مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھارا دل توڑ دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا اتنا نازک ہے۔ لو میں تمھیں ایک نیا دل دیتی ہوں۔ یہ تمھارے سینے میں فٹ آئے گا۔ تمھارے بہترین دوست کا دل ہے'۔ اور اس نے وہ دل لے لیا اور اپنے سینے میں جو جگہ خالی تھی وہاں رکھ لیا مگر جگہ تنگ تھی، دل بڑا تھا، بڑی مشکل سے ادھر ادھر سے دبا کر اس کو جگہ پر لگایا مگر تکلیف اتنی ہوئی کہ اس نے سوچا میں مر جاؤں گا۔

بے ہوشی کے سمندر میں بڑی دور سے تیرتی ہوئی جج کی آواز آئی 'شاباش، ڈاکٹر، تم نے آپریشن نہیں کیا ایک چمتکار کیا ہے'۔

اور پھر اس کے بازو میں ایک سوئی چبھی اور پھر وہ بے ہوشی کے اندھیرے میں سمندر میں ڈوب گیا۔

جب درد اور بے ہوشی کی صدیاں گزر یں اور اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ہر طرف سفیدی ہی سفیدی پھیلی ہوئی ہے۔ سفید دیواریں، سفید دروازے، سفید کھڑکیوں میں سفید پردے لگے ہوتے ہیں، فرشتوں کی طرح سفید فراک پہنے ہوئی نرسیں اور سفید کپڑے پہنے ہوئے سفید داڑھی والا ڈاکٹر جو اس وقت اسے خدا نظر آ رہا تھا۔

جب ڈاکٹر نے دیکھا کہ آدمی کو ہوش آ گیا ہے تو وہ چلتا ہوا اس کے پلنگ کے پاس آیا اور مسکرا کر کہا 'شکریہ میرے دوست۔ اگر تمھاری قوت ارادی زندگی کا دامن چھوڑ دیتی تو آپریشن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا'۔

آدمی کمزوری کے مارے زیادہ بول نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی وہ ہلکے سے بڑبڑایا 'آپریشن کر کے میرے دل میں سے گولیاں نکال دیں آپ نے؟'

ڈاکٹر کے سنجیدہ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھر آئی 'نہیں، میرے دوست ہم نے

تمھارے گولیوں سے چھلنی دل کو نکال کر اس کی جگہ ایک نیا دل لگا دیا ہے یہ پہلا ایسا آپریشن ہمارے ملک میں ہوا ہے۔'

☆

ایک اور ہفتہ گزر گیا۔اب آدمی تکیوں کے سہارے پلنگ پر بیٹھ کر اخبار نویسوں کے سوالوں کا جواب دے سکتا تھا۔

'کیسا محسوس کرتے ہیں آپ؟' ایک نے پوچھا۔

'اچھا ہوں' آدمی نے جواب دیا۔'مگر کمزوری محسوس کرتا ہوں۔'

'کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں یہ پہلا آپریشن ہے جس میں ایک دل دوسرے کے سینے میں کامیابی سے لگایا گیا ہے؟'

'جانتا ہوں۔یہ سوچ کر ہی میرے سر میں چکر آجاتا ہے۔'

'کیا آپ جانتے ہیں کہ حکومت نے آپ کے آپریشن پر لاکھوں روپے خرچ کیے ہیں؟'

'جی ہاں۔یہ بھی جانتا ہوں اور میں حکومت کا شکر گزار ہوں کہ میری جان بچانے کے لیے انھوں نے اتنا خرچ کیا۔ان کے ڈاکٹروں نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔'

'آپ کو اپنا پرانا دل پسند تھا یا یہ نیا دل پسند ہے؟'

'مجھے یہ نیا دل پسند ہے۔پرانے دل میں بہت سی برائیاں آگئی تھیں۔'

'مثلاً'۔

'مثلاً نفرت، تشدد پسندی، شبہ، وہم، نئے دل کے ساتھ میں نئی زندگی شروع کر سکتا ہوں۔'

ڈاکٹر نے اشارہ کیا کہ کافی وقت ہو گیا ہے اور اخبار نویس اٹھ کھڑے ہوئے۔مگر جانے سے پہلے ایک جرنلسٹ نے پوچھا 'بس ایک آخری سوال، اسپتال سے نکلنے کے بعد آپ کا کیا پروگرام ہے؟'

'زندہ رہنا۔بس یہی میری زندگی کا پروگرام ہے اور اب میں اس پروگرام کو پورا کر سکتا ہوں۔'

☆

تین مہینے کے بعد آدمی کو اسپتال سے چھٹی دے دی گئی۔

'اب تم گھر واپس جا سکتے ہو' ڈاکٹر نے کہا' خدا حافظ اور گڈ لک'۔

ایک بڑی آرام دہ، گدّے دار موٹر میں بٹھا کر آدمی کو ایک نئی انجانی بلڈنگ میں لایا گیا۔ یہاں بھی ایک ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر نے آدمی کے دل کو ٹھوک بجا کر دیکھا۔ بلڈ پریشر کا آلہ لگا کر دیکھا۔ سینے میں 'اسٹیتھو اسکوپ' لگا کر دیکھا۔ 'سانس اندر سانس باہر' کرایا۔ امتحان کے لیے اس کی انگلی میں پن چبھا کر خون نکالا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پھر اعلان کیا کہ آدمی کا دل اور دماغ دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔

'قیدی اپنی سزا بھگتنے کے لیے پوری طرح سے قابل ہے'۔ اس نے ان وارڈروں سے کہا جو آدمی کے ساتھ آئے تھے اور ٹھنڈی سانس لے کر باہر چلا گیا۔

قیدی! دفعتاً آدمی کو احساس ہوا کہ وہ ابھی تک حکومت کا قیدی ہے۔ اس کا مانگا ہوا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

قیدی کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ ایک پادری کہیں سے نمودار ہو گیا اور جلوس چل پڑا۔ یہ سب اس کو کہاں لے جا رہے تھے؟ اور کیوں؟

جیل کے وارڈ۔

آدمی۔

وہ دونوں کانسٹبل جن کو دھوکا دے کر وہ بھاگا تھا۔ چھوٹا والا خاموش اور مغموم تھا۔ بڑا والا مسکرا کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اسی کی پستول کی گولیوں نے قیدی کے دل کو چھلنی کیا تھا۔

جیلر

ڈاکٹر

اور سب سے پیچھے وہی جج جس نے اس کو سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔

اور سو یہ سب جلوس کی شکل میں آدمی کو پھانسی کے تختے تک لائے۔

جلّاد ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آدمی کے سر اور چہرے پر کالا غلاف چڑھا دیا۔ آدمی نے اپنی گردن کے گرد پھانسی کا پھندہ تنگ ہوتا محسوس کیا۔ اس کے دماغ میں موت کا ڈر اتنا نہیں تھا، جتنی ایک عجیب بے چینی تھی۔ ایک مبہم سا سوال تھا— وہ کیا سوال تھا۔ اس کا جواب کیا تھا؟ اب یہ سوچنے کا وقت نہیں رہ گیا تھا— شاید اس کی موت کے بعد دوسرے آدمی اس سوال کو دنیا کے سامنے پیش کریں گے— شاید کوئی اس کا جواب بھی دے سکے لیکن اس وقت وہ اس دنیا میں نہیں ہوگا......

جیلر نے اشارہ کیا، جلّاد نے ایک ہتہ دبایا۔ آدمی کے پیروں کے نیچے سے تختہ گر گیا اور آدمی پھانسی پر لٹک گیا۔ چند لمحوں میں اس کی زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا، اسٹیتھو اسکوپ لگا کر سینے کا معائنہ کیا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ دل کی حرکت —اسی دل کی حرکت جو ایک مرتے ہوئے آدمی کے کلیجے میں سے نکال کر دوسرے آدمی کے سینے میں لگایا گیا تھا— ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی ہے تو اس نے سرٹی فیکیٹ پر دستخط کر دیے۔ 'میری موجودگی میں پھانسی دے دی گئی اور وہ پھانسی پر لٹکا رہا۔ جب تک مجرم کے دل کی حرکت ہمیشہ کے لیے بند نہ ہوگئی۔

جج کے چہرے پر ایک گہرے اطمینان اور فتح مندی کے احساس کے آثار تھے— آج قانون اور انصاف کی بہت بڑی جیت ہوئی تھی۔

اور اوپر آسمان میں اڑتی ہوئی سفید بطخوں کی ڈار ایک سوالیہ نشان کی شکل میں دکھائی دی— اور اس سوالیہ نشان کی پرچھائیں جب اس جیل پر سے اڑتی ہوئی گزری تو ایسا لگا کہ جیسے پھانسی گھر اور پھانسی کی جھولتی ہوئی رسّی پر ایک لمحہ کے لیے یہ سوالیہ منجمد ہو گیا ہو۔

O

# مایانگری/پنچھی پنجرہ اور اڑان

گریٹر کیلاش میں جب بلڈنگ بننا شروع ہوئی اور لوگوں نے دیکھا کہ لوہے کی سلاخیں چاروں طرف لگائی جا رہی ہیں، تو کسی نے کہا یہ کوئی ماڈل جیل ہوگی۔ کوئی کہتا تھا پاگل خانہ ہے یہ۔ پھر بورڈ لگا 'پنجرا' تو یقین ہو گیا واقعی یہ جیل ہے۔ مگر یہ جیل نئے طرز کی تھی۔ اندر پالش کی ہوئی لکڑی کا فرش بنایا گیا تھا۔ اسی لکڑی کا اونچا 'بار' بھی بنایا گیا تھا۔ بار پر شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ جب پنجرے کے سائن بورڈ کے نیچے لکھ دیا گیا 'داخلہ فیس 25 روپے' تو لوگوں کو اندازہ ہوا کہ یہ نئے طریقے کا کلب اور بار ہے۔

جس دن پنجرے کا افتتاح ایک وزیر کے ہاتھوں ہوا اس دن وہاں بڑی چہل پہل تھی۔ دور دور کی کالونیوں سے موٹریں بھر بھر کر آنے لگیں۔ اندر سے سنگیت سنائی دینے لگا۔ پھر ایک کالے شیشے کی موٹر آئی، جس سے قیدی عورتیں نکلیں اور سیدھی اندر لے جائی جانے لگیں۔

ان قیدیوں کی حاضری ایک کالا سوٹ پہنے بڑی بڑی مونچھوں والا وارڈر لے رہا تھا۔

'یاسمین؟'

'حاضر جناب!'

'روبی'

لیس سر!'

'اروشی؟'

'لیس سر!'

'وائلیٹ؟'

'لیس سر!'

کچھ ہی دن میں 'پنجرا' بار اور کیبرے گریٹر کیلاش میں جم گیا۔

وہ جو غیر شادی شدہ نوجوان تھے، وہ جو رنڈوے تھے، وہ جنھیں اپنی بدمزاج بیویوں سے شکایت رہتی تھی ان کے لیے شام گزارنے کا ایک مہنگا بہانا ہاتھ آ گیا۔

شام ہوتی تو پچیس روپے کا ٹکٹ خرید کر سب اندر آتے۔ وہسکی کی بوتل (جو سو روپے میں ملتی تھی) یا ایک پیگ (جو دس روپے میں آتا تھا) اندر کرتے اور دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لگاتے۔

پھر رات کا پروگرام شروع ہوتا۔

پہلے یاسمین ایک غزل پیش کرتی، پھر اُروشی اور روبی قوالیاں پیش کرتیں، جن میں سے اکثر فلمی قوالیاں ہوتیں۔ کبھی کوئی فرمائش کرتا کہ 'زینت' کی قوالی ہو جائے۔ 'آہیں نہ بھری شکوے نہ کیے'، کسی کی مانگ ہوتی: 'میرے سامنے والی کھڑکی میں اک چاند سا ٹکڑا رہتا ہے' اور پھر کالج کے لڑکے چلاّتے: 'محبوبہ محبوبہ' ہو جائے۔

جب رات کے بارہ بجتے اور 'پنجرا' بند ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ جاتا تو وائلیٹ اپنا STRIPTEASE ڈانس کرتی۔ سنگیت کی دھن پر پہلے وہ اپنا ریشمی لباس اتارتی۔ پھر فراک اُتارتی، پھر بریسئر اتار کر TOPLESS ہو جاتی۔ اس کے بعد ریشمی موزے اتارتی۔ آخر میں PANTIES اتارتی، جس کے نیچے وہ ایک چھوٹی سی بکنی پہنے رہتی۔ اب سنگیت کی دھن چرم سیما پر پہنچتی اور ایک جھٹکے کے ساتھ وہ بکنی بھی اتار پھینکتی مگر اس جھٹکے کے ساتھ روشنی بھی بجھ جاتی اور وائلیٹ اسٹیج سے غائب ہو جاتی۔

ہال تالیوں سے گونج اٹھتا اور کچھ لوگ بار بار تماشہ اس اُمید کے ساتھ دیکھنے آتے کہ شاید

اگلے دن روشنی بجھانے والا ایک دوسیکنڈ کے لیے روشنی بجھانا ہی بھول جائے تو مزا ہی آ جائے مگر روشنی والے کو تنخواہ اسی بات کی ملتی تھی کہ کہاں اور کس وقت روشنی بجھائی جائے۔ بھلا وہ بھول کب کرنے والا تھا؟

وائلیٹ کو اسٹرپٹیز STRIPTEASE کرنے کے لیے دوسو روپے روز ملتے تھے۔ اس میں سے پچاس روپے روز تو اس کا ایجنٹ لے جاتا، جس نے یہ کنٹریکٹ کرایا تھا۔ تیس روپے رات کو ٹیکسی والے کو گھر لے جانے کے دینے پڑتے۔ ہفتہ میں ایک دن وہ چھٹی بھی کرتی تھی۔ وہ روپے بھی کٹ جاتے تھے۔ اس طرح اسے مہینے میں کوئی دو ہزار روپے کی آمدنی ہوتی۔ پانچ سو روپے مہینہ ایک کمرے کے لیے اس اینگلو انڈین خاندان کو دینے پڑتے جہاں وہ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتی تھی۔ باقی روپیوں میں سے وہ تین چار سو روپے مہینہ اپنے ماں باپ کو بھیجتی، جو شروع میں تو اپنی 'آوارا اور بدچلن' لڑکی سے روپے لینے میں شرم محسوس کرتے تھے مگر غریبی میں کاہے کی شرم؟ اس لیے اب وہ تین چار سو روپے مہینہ لے کر بھی اپنی بیٹی کو کبھی کبھی لکھ بھیجتے کہ اس میں ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ ہو سکے تو کچھ اور بھیج دیا کرے۔

وائلیٹ ہمیشہ وائلیٹ نہیں تھی۔ وائلیٹ سے پہلے اس کا نام 'روز' تھا۔ اس سے پہلے وہ 'گلاب' تھی۔

مگر جو نام اس کے پیدائش پر رکھا گیا تھا وہ 'گلاب' تھا۔

اس کی ماں آگرہ کی ویشیا تھی۔ ناچ گانا خاندانی پیشہ تھا۔ کبھی کبھی اپنا جسم بھی بیچ دیتی تھی۔ جب عمر بڑی ہوئی اور گلنار جوان ہوئی تو ماں نے پیشہ چھوڑ دیا اور اپنے طبلچی سے شادی کر لی۔ اسے امید تھی کہ گلنار (جس کی عمر اس وقت 14-13 سال کی تھی) اب دھندا کر کے ماں کا پیٹ بھرے گی مگر گلنار کی ماں نے بھول سے لڑکی کو اسکول میں پڑھایا تھا، اس لیے اس کو خاندانی پیشہ سے نفرت ہو گئی تھی۔ لیکن طبیعت رنگین اور رومانٹک پائی تھی۔ ایک کالج کے لڑکے سے نظر لڑ گئی۔ پیار بڑھا۔ عشق ہو گیا۔ ماں نے لاکھ سمجھایا، بیٹی یہ لڑکا تجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ تو اس عشق وشق کے چکر میں نہ پڑ مگر گلنار پر تو محبت کا بھوت سوار تھا۔ آخر میں جب عشق نے گل کھلایا تو اس نے اپنے عاشق (جس کا نام کمل داس تھا) سے کہا کہ اب وہ اس سے شادی کا وعدہ پورا کرے۔

لڑکے نے کہا 'ہاں میری جان! بس مہینے دو مہینے صبر کر لو۔ پھر شادی ہو جائے گی۔

گلنار نے سوچا مہینے دو مہینے کی تو بات ہے مگر اس دن سے کمل نے آنا جانا کم کر دیا۔

'کمل ڈارلنگ! تم تین تین دن تک نہیں آتے ہو میں نے منہ بسور کر اس سے کہا۔

'گلنار میری جان! اب کالج چھوڑ کر باپ کے دھندے کو سنبھالنے میں اکثر شامیں بزنس میں گزر جاتی ہیں مگر تم فکر نہ کرو شادی کے بعد تو تم میرے پاس رہو گی'

اس کے بعد کمل ہفتہ میں صرف ایک بار آنے لگا۔ وہی بزنس کی مشغولیت تھی۔ دو مہینے سے تین مہینے ہو گئے۔ نہ شادی ہوئی، نہ گلنار نے ابورشن ہی کرایا کہ اس کے ڈاکٹر نے مخالف مشورہ دیا تھا۔

دو مہینے تک حفاظت کے ساتھ ابورشن ہو سکتا تھا۔ اب چار مہینہ ہو چکا تھا۔ اب ڈاکٹر نے کافی خطرہ ظاہر کیا، بلکہ ابورشن کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

گلنار نے فیصلہ کر لیا کہ اب کے کمل آئے گا تو اس سے صاف صاف کہے گی کہ وہ فوراً شادی کر لے، نہیں تو بعد میں جگ ہنسی ہوگی۔ شادی کے صرف پانچ مہینے کے بعد بچہ ہوا تو بدنامی ہوگی مگر کمل کو شاید اس کی بھنک کان میں پڑ چکی تھی۔ اس کے بعد وہ آیا ہی نہیں۔

ہفتہ بھر بعد جب گلنار نے بے شرم ہو کر اس کے دفتر میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے باپ کے بزنس کے سلسلے میں یورپ چلا گیا ہے۔

پانچ مہینے تک اور گلنار نے انتظار کیا۔ پھر ایک کرسچین میٹرنٹی اسپتال میں داخل ہو کر اپنا نام مسز روز لکھوالیا (جو گلنار ہی کا انگریزی ترجمہ تھا) شوہر کا نام مسٹر مائیکل لکھوا دیا۔ پھر ایک بچے کو جنم دیا۔ بچہ، خوبصورت ماں اور اسمارٹ باپ کا بیٹا تھا۔ اچھی شکل لے کر پیدا ہوا۔ لیکن اس کے پیدا ہوتے ہی گلنار کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ اس لیے ماں باپ کی دیکھ بھال کے ساتھ بچے کا خرچ بھی بڑھنے لگا۔ ماں باپ کی جمع پونجی جو تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔

اس وقت ایک آدمی بابو آیا جو کبھی گلنار کی ماں کا دلال تھا۔

گلنار نے اس سے کہا کہ وہ اپنی ماں کا دھندا نہیں کرے گی۔

'پیشہ کرنے کو کون کہہ رہا ہے؟ یہ زمانہ ویشیاؤں کا نہیں ہے۔ ویشیاؤں کو خوبصورت سوسائٹی گرلز کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مگر ناچ گانا اب بھی ہوتا ہے۔ تمھاری شکل اچھی ہے، جیسی

تمھاری ماں کی شکل تھی۔ جسم بھی سیڈول ہے۔ فراک پہنتی ہو تو ٹانگیں بھی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔ تم گانے ناچنے پر تیار ہو جاؤ تو میں ہزار روپے مہینے پر تمھیں کسی ہوٹل میں رکھوائے دیتا ہوں، مگر دلی جانا ہوگا کیونکہ مارکیٹ وہیں ہیں۔'

گلنار نے بچے کو سنبھالا اور دلی آ گئی۔ بابو کو وہ انکل کہتی تھی۔ اس نے اسے ایک ہوٹل پروپرائٹر سے ملوایا جس کا ہوٹل ڈیفنس کالونی میں تھا۔ رات کو کیبرے ہوتا تھا۔ اس کے کورس میں مِس 'روزی' کی بڑھوتری ہوگئی۔

مِس روزی نے گا کر، ناچ کر لوگوں کا دل لبھایا۔ سب اس پر ہی نظریں جمائے رکھتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ ماں کا پیشہ ضرور چھوڑ دیا تھا، مگر بچپن میں اس نے ناچ کے سب انداز بہر حال سیکھ رکھے تھے۔ کس طرح جسم کا مظاہرہ کیا جائے کہ چھپنے پر بھی سینہ ننگا ہو جائے۔ ٹانگوں کو کہاں تک ننگا رکھا جائے۔ نیچے انڈرویئر کتنا چھوٹے سے چھوٹا ہونا چاہیے؟ یہ سب باتیں کیبرے کے لیے ضروری تھیں۔ اور ان کی مدد سے مہینہ بھر کے اندر ہی 'روزی' کورس سے نکل کر سولو پرفارمینس کرنے لگی مگر اس کی تنخواہ میں بھی ڈھائی سو روپیوں کی بڑھوتری ہوگئی۔

چھ مہینے بعد 'روزی' نے ایک اور ہوٹل والے کے ساتھ نیا کانٹریکٹ کرلیا۔ پندرہ سو روپے بابو لے جاتا تھا مگر بابو بڑے کام کا آدمی تھی۔ اس نے چاروں طرف 'روزی' کے فوٹو چھپوا کر ان کی اتنی شہرت کردی کہ ہر کیبرے والے کی نظریں اس پر جمنے لگیں۔

کئی بار بابو نے اپنا پرانا دھندا بھی کرنا چاہا اس کے لیے جسم کی دلالی کی لیکن گلنار عرف روزی اس سے بچتی رہی۔

بابو کہتا، 'اری، بہت بڑا بزنس مین ہے، عیش کرائے گا، عیش کرائے گا عیش!' مگر گلنار 'نہیں' کر دیتی اور اس پر اڑی رہتی۔

اصل میں گلنار کو کوئی فطری جھجک نہیں تھی مگر کمل کی یاد اس کے دل میں آج بھی تازہ تھی۔

کمل نے کہا تھا 'گلنار میری جان! ہمارے پیار کو دیکھ کر دنیا انارکلی کے فرضی رومانس کو بھول جائے گی۔'

کمل نے کہا تھا 'تمھاری آنکھوں میں مجھے ساری دنیا کی خوبصورتی سمٹی نظر آتی ہے۔'

کمل نے کہا تھا' گلنار، شادی کے بعد تمھارا نام اروشی رکھوں گا اس لیے کہ' آکاش کی نرتکی، تمھارے جسم میں جادو ہے جادو۔'

ایسے پیار کو وہ آسانی کے ساتھ نہ تو بھول سکتی تھی اور نہ بھولنے کے لیے تیار تھی۔

نئے ہوٹل کا منیجر جو روزی کو بڑی محبت کی نظر سے دیکھتا تھا اور جس نے اس کے گالوں کے بوسہ کے آگے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا، ایک دن کہنے لگا، روزی' وقت آ گیا ہے کہ دنیا تمھارے اجلے اور چمکدار جسم کا دیدار کرے۔'

'کیا مطلب؟' گلنار نے پوچھا۔

'مطلب یہ کہ تم اب سے اسٹرپٹیز کیا کرو۔ ساری دنیا کی لڑکیاں سینوں کی فاشی کو فاشی نہیں سمجھتیں۔ تمھیں بھی دنیا کی خوبصورت لڑکیوں کے سینوں کا مقابلہ کرنا ہے۔'

یہ کہہ کر اس نے انگریزی کی ایک میگزین کھول کر اس کے سامنے رکھ دی، جس میں ہر ملک کی خوبصورت لڑکیاں' ٹاپلیس' TOPLESS میں یعنی بنا بلاؤز یا بریسئر کے دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک ہوٹل میں تو اب بیئرریسیز (اس لیے کھانا کھلانے والیاں) TOPLESS ہی تھیں۔

ویسے تمھارے سینے میں کوئی خرابی ہو تو اس کی پرواہ نہیں۔ میں کسی اور لڑکی سے بات کرتا ہوں، کیونکہ ہر لڑکی چاہتی ہے اس کی تنخواہ بڑھ جائے۔'

'کتنی تنخواہ بڑھ جائے گی؟'

'فی الحال صرف ڈھائی سو روپے۔ ہم زیادہ خرچ نہیں کر سکتے مگر آگے کے لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تم جانتی ہو، اسٹرپٹیز (STRIPTEASE) بلاؤز اور بریسئر سے شروع ہوتا ہے، اور بکنی پر ختم ہوتا ہے۔ اسی طرح تنخواہ بھی بڑھتی جائے گی۔ THE SKY IS THE LIMIT اس نے اس ڈھنگ سے یہ انگریزی کا جملہ دوہرایا جس میں وعدہ بھی تھا، امید بھی تھی اور ایک طرح کی دھمکی بھی تھی۔ اس رات کو روزی کا سینہ ننگا ہو گیا۔

اسے کپڑے اتارنے کا طریقہ اچھی طرح معلوم تھا۔

پہلے اس نے بلاؤز کے بٹن کھولے۔ سنگیت کا دھما کہ ہر بٹن پر ہوا۔ پھر اس نے بے پرواہی کے ساتھ بلاؤز اتار کر پیانو بجانے والے پر پھینکا۔ پھر بریسئر پہنے ہوئے ڈانس فلور کے دو چکر

لگائے پھر اپنی کمر ایک ادھیڑ عمر کے تماشائی کی جانب کر کے کہا HELP ME DARLING اس گر ایک نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بریسیئر کا کلپ کھولا اور روزی ڈانس کرتی رہی۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا، کیونکہ روزی کا سینہ ہی اتنا خوبصورت اور سیڈول تھا۔

اس دن 'پنجرے' کا مالک بھی آیا ہوا تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد وہ بابو سے ملا اور اس سے کہا کہ 'روزی' کو کسی طرح راضی کر لے وہ ان کے نئے کیبرے میں شامل ہو جائے۔

بابو نے کہا 'سیٹھ صاحب، یہ بہت مشکل کام ہے۔ مس روزی عام طور پر نئے ہوٹلوں میں کام نہیں کرتی۔ ہاں، چھ مہینے یا سال بھر بعد آپ کا 'پنجرا' ذرا مشہور ہو جائے گا اور اس کی تالیاں سونے کی ہو جائیں گی۔ تب آپ کے بھی آفر پر غور وفکر کیا جا سکتا ہے۔

ارے کیا بات کرتا ہے؟' سیٹھ نے بابو کو گالی دے کر کہا۔ 'ہمارے پنجرے کو کیا سمجھا ہے؟ اس کی تالیاں شروع سے ہی سونے کی ہیں۔ بس کھلنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھو کیسے طرح طرح کے پنچھی آتے ہیں وہاں۔'

اس رات کو 'انکل' بابو نے روزی سے بات کی۔ روزی نے کہا۔ رات سینہ کھول کر تو روزی مر گئی ہے۔ اس کی جگہ اور کچھ نام رکھنا پڑے گا۔ تبھی کہیں اور کام کر سکتی ہوں۔ چاہے وہ پنجرا ہی ہو۔ مگر تالیاں سونے کی ہونی چاہیے، تا کہ میں اپنے بچے کے لیے آیا رکھ سکوں اور مجھے ہر رات کو بچے کو لا دکر کیبرے میں نہ لانا پڑے۔

'وہ میں سیٹھ سے بات کرلوں گا۔ کم سے کم ڈیڑھ سو روپے روز لیں گے ہم، روزی۔'

پنجرے کے سیٹھ نے سب شرطیں مان لیں مگر ایک اپنی شرط بھی رکھی۔

'روزی کو اپنا نام بدلنا پڑے گا۔ روزی بڑا عام سا نام ہے۔ ہمارے جوتشی نے بتایا ہے کہ ایک لڑکی 'وانکیٹ' نام کی اس پنجرے کی ہر تیلی کو سونے کا بنا دے گی۔ اس لیے ہم روزی کا نام وانکیٹ رکھ رہے ہیں۔ پوچھ لو، منظور ہے نا؟'

'منظور تو ہوگا ہی سیٹھ صاحب، روزی کا کہنا ہے جب دام کیبرے اچھا کے ہوں گے تو نام سیٹھ جی کی مرضی کی رکھ لوں گی۔'

اس طرح وانکیٹ نے اسٹرپٹیز کرنا شروع کر دیا۔ پنجرے کے اندر پہلے تو وہ صرف بلاؤز

اور بریسیئر ہی اتارتی تھی۔ پھر سیٹھ نے اسے سمجھایا کہ اسی پر نہ رکے بلکہ پوری ننگی ہونے کا اثر پیدا کرے۔ تمھارے جسم کو ڈھانپنے کے لیے ہم تمھاری کھال کے رنگ کا ایسا چست لباس منگوا دیں گے جیسا فلموں میں ہیلن اپنے ننگے ڈانس میں پہنتی ہیں۔

پھر وہ لباس بھی آ گیا۔ اب جب اسٹرپٹیز ہوتا تو 'وائلیٹ نیچے سے فراک' انڈرویئر اور پینٹیز اتار پھینکتی اب تو بڑی تالیاں بجتیں۔

دھیرے دھیرے لوگ اس اسٹرپٹیز کے بھی عادی ہو گئے اور جو پرانے گراہک تھے وہ پہچان گئے کہ ڈانسر نیچے بھی ریشمی نائلان کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ لاکھ اسے لال، نیلا روشنیوں سے چھپانے کی کوشش کرے، پھر بھی اصل، اصل ہی تھی اور نقل نقل۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ آدھی رات کے بعد وائلیٹ کا کیبرے ہی دیکھنے آتے تھے اس کی تعداد میں کمی ہونے لگی۔

گراہکوں کا دھیان کھینچنے کے لیے سیٹھ نے ایک اور ترکیب سوچی۔

ایک دن اس نے کہا، ''وائلیٹ، لوگ تمھاری ریشمی لباس سے تنگ آ چکے ہیں۔ وہ 'اسکائی لارک' ریستوراں میں جانے لگے ہیں، جہاں شہزاد بالکل ننگا اسٹرپٹیز پیش کر رہی ہے۔ اس لیے ہماری بھیڑ بھی اس طرف چلی گئی ہے۔ اب اگر یہ حال رہا تو ہمارے یہاں اسٹرپٹیز تم صرف اپنے سامنے کیا کرو گی اور اپنے آپ کو مجھے دوالیہ ٹھہرانے کے لیے کورٹ میں جانا پڑے گا۔'

'تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں بالکل ننگی ہو جایا کروں۔'

کچھ ایسا ہی کرنا ہوگا۔ یا کم سے کم ایسا ہی کرنا پڑے گا، جس سے پبلک یہی سمجھیں کہ ایک سیکنڈ کے لیے ڈانسر بالکل ننگی ہو گئی ہے۔ بعد میں لائٹ آف کر کے تمھارے اوپر اندھیرے کا پردا ڈال دیں گے۔

تنخواہ اور بڑھا دی گئی۔ اب ڈانسر کو دو سو روپے روز ملنے لگے۔ ایک سیکنڈ کو ننگا ہونے کے لیے یہ رقم ٹھیک ہی تھی۔ پولس کو پتہ چلا۔ اس نے بوگس کسٹمر بھیجے۔ ساتھ ہی سیٹھ کو اشارہ کر دیا کہ آج پولس اسٹرپٹیز کی جانچ کرنے آئے گی۔ سیٹھ اس کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے لائٹ مین کو سمجھا دیا کہ جیسے ہی وائلیٹ اپنی پینٹیز اتارنے لگے بس اسی وقت روشنی بجھا دے۔ ایک سیکنڈ کی بھی ننگی نہیں ہو گی۔ پولس والوں نے کوئی ننگا پن نہیں دیکھا اور سیٹھ صاحب کی ترکیب کی تعریف

کرتے رشوت کے روپے جیب میں ڈال کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اس سے اگلے دن اسکائی لارک ریستوراں پر چھاپا پڑا اور وہاں کی اسٹرپٹیز شہزاد کو گرفتار کرلیا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ دنوں میں ہی وہ چھوٹ گئے اور ایک ہفتہ بعد شہزاد کا ڈانس شروع ہو گیا۔ مگر 'اسکائی لارک' ایک ہفتہ بند رہا اور اتنے وقت میں پنجرے کے لب پرندے وانکیٹ کا اصل اسٹرپٹیز دیکھنے کے لیے پنجرے میں جمع ہو گئے۔

ایک دن بابو نے وانکیٹ سے کہا 'ایک بہت بڑے سیٹھ آئے ہیں۔ آج رات کو تم انھیں بھا گئیں تو وہ تمھیں رکھ لیں گے مناسب تنخواہ پر۔'

'کہاں سے آئے ہیں وہ سیٹھ؟' وانکیٹ نے پوچھا۔

'سیدھی انگلینڈ سے آرہے ہیں مگر رہنے والے ہیں آگرا کے۔'

وانکیٹ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

'کیا نام ہے ان کا؟'

'کمل داس، کروڑوں کا بزنس ہے ان کا۔'

مگر وانکیٹ (روزی یا گلنار) کے کانوں میں ایک ہی نام گونج رہا تھا۔

'کمل داس'

'کمل داس'

'کمل'

'کمل'

وہ سارے دن اس گھڑی کا انتظار کرتی رہی جب وہ کمل داس کے سامنے اپنا ننگا ناچ پیش کرے گی۔ کیسے اس ڈرامے کو پورا کرے گی جو خود کمل داس نے شادی سے انکار کر کے شروع کیا تھا۔

اس دن اس نے اپنا سنگار خاص طور سے کیا۔ بارہ بجنے سے پہلے ہی وہ اپنا اترانے والا ڈریس پہن کر تیار ہو گئی۔ اس نے پیچھے سے جھانک کر صبر کر لیا کہ کمل آ گیا اور آگے ہی بیٹھا ہے۔ وہ وہسکی پیئے جا رہا تھا۔ مگر شکل سے اب بھی بھولا بھالا کمل ہی لگتا تھا، جیسا دو سال پہلے آگرا میں دکھائی دیتا تھا۔

جب دس منٹ کے انٹرول کے بعد وانکیت کے ناچ کا اعلان ہوا تو وانکیت نے لائٹ مین کو بلا کر کچھ بتایا اور اس کو سو روپے کا نوٹ بھی بخشش دیا۔

افتتاحی سنگیت شروع ہوا۔ پھر وانکیت میدان میں سنگیت کے ایک دھماکے کے ساتھ اتری۔ آج وہ مشری نرتکی کے شکل میں آئی تھی، جس کے چہرے پر ریشم کا پردا پڑا تھا۔ دو سال میں اس کے جسم میں نیا ابھار پیدا ہو گیا تھا۔ کلہا اور سینہ ابھر گیا تھا۔ ٹانگیں زیادہ شیڈول ہو گئی تھیں۔ اب وہ اونچی ایڑی کے جوتے پہن کر ڈانس کر سکتی تھی۔ اس نے لب سے پہلے مشری اسٹائل سے حاضرین کو سلام کیا، جو ہر ایک نے محسوس کیا کہ اسی کے لیے کیا گیا ہے۔

کمل داس بھی اس جدائی اشارے کے اثر سے نہ بچ سکا۔ اس نے سوچا جانے یہ وانکیت کس چمن کی زینت بن چکی ہے، لیکن اس کی شکل دیکھے بغیر بھی اس کے ناچ کے اندر ایک کشش جھلکتا ہے، جو اس کی مردانگی کو للکار رہا ہے۔ اگرچہ کمل نے وانکیت کی شکل دیکھے بغیر ہی فیصلہ کر لیا اس کو کسی قیمت پر بھی حاصل کر کے رہے گا۔

ناچ کے ساتھ سنگیت کی دھن تیز ہوتی گئی۔ وانکیت کے کپڑے اترنے لگے۔ مگر آج اس نے پردا نہیں اتارا۔ پہلے ہریری سلک کا لبادا اتارا، پھر کفتان اتارا، پھر با. ؤز، پھر بریسیئر۔ اس کا ننگا سینہ جیسے باہر آنے کو بے چین تھا۔

کمل کو جانے کیوں اس سینے میں کسی جانے بوجھے جسم کی جھلک نظر آئی۔

پھر وانکیت نے منی فراک اتارا۔ پھر پینٹیز اتاری۔ اب ایک بکنی رہ گئی تھی۔ اس کو اتارنے میں آج اس نے زیادہ ہی دیر لگائی۔

وانکیت سنگیت کے ساتھ ناچتی رہی۔ اپنے کلہے مٹکا مٹکا کر لوگوں کا دل بہلاتی رہی۔ اس کے ننگے جذبات کے ساتھ کھیلتی رہی۔ یہاں تک کہ کئی لوگ چلا پڑے۔

'بکنی بھی اتارو......'

'بکنی۔'

'بکنی۔'

'اتارو۔

'اتار دو۔'

ان آوازوں میں وہ جانی بوجھی آواز بھی شامل تھی جسے سننے کے لیے وائلیٹ تڑپ رہی تھی۔ ایک آواز جس میں شاہی حکم بھی تھا، اور ایک بچکانی التجا کا انداز بھی۔

'بکنی اتار دو، ڈارلنگ۔'

یہ سن کر اس کا ناچ اور تیز ہو گیا۔ اس لمحے اس کے ارد گرد نہ صرف پنجرا گھوم رہا تھا بلکہ ساری دلی گھوم رہی تھی، ساری دنیا گھوم رہی تھی اور اس گھومتی ہوئی دنیا میں ایک ماضی کی یاد ابھر رہی تھی۔ اس لمحے کی یاد، جب کمل داس نے اس سے پہلی بار کہا تھا 'ساڑی اتار دو، ڈارلنگ۔ پیار کرنے کے بیچ کوئی بھی پردا نہیں ہونا چاہیے۔'

'ساڑی اتار دو، میری جان۔'

'میری جان۔'

'میری جان۔'

'آنا سنڈے کے' ایک پرانا گیت اس کے کانوں میں گونج اٹھا۔

'آنا ہر مہینے۔'

'آنا ہر مہینے۔'

'آنا ہر سال۔'

'آنا دو سال کے بعد۔'

'دو سال کے بعد۔'

'دو سال۔'

'دو سال جو اس نے انتظار میں گذارے تھے جن کے دوران پہلے چھ مہینے کے بعد اس کو ایک بچے کو جنم دینا پڑا تھا اور اس کے بعد ڈیڑھ سال سے اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اپنے ماں باپ کو گذارے کے لیے اور بچے کے دودھ کے لیے اس کو کیا کچھ نہ کرنا پڑا تھا۔ گانا پڑا تھا۔ (اس کی آواز زیادہ اچھی نہیں تھی)، اپنے جسم کا نظارہ کرنا پڑا، ناچنا پڑا تھا۔ (اس کے جسم میں لوچ تھا) کئی بار مالکوں اور مینیجروں کے ساتھ سونا بھی پڑا تھا، مگر پکی رکھیل وہ کسی کی نہیں بنی تھی، اس لیے

کہ اس کو معلوم تھا کہ کسی نہ کسی دن کمل داس ضرور آئے گا اور اسی دن کے لیے ہی وہ زندہ تھی، مگر اس کو معلوم نہیں تھا کہ کس طرح اور کن حالات میں کمل سے اس کی ملاقات ہوگی تو۔ وہ بالکل ننگی ہوگی اور اس کا چہرہ نقاب (پردے) میں چھپا ہوگا۔

انتظار کرانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بینڈ کے سنگیت پر تھرکتے تھرکتے ڈانس بھی تھک جاتی ہے۔ آخر اپنی بکنی اس کو اتارنی ہی پڑی۔ لیکن آج ایک سیکنڈ کے بعد روشنی نہیں بجھی۔ آج اس نے لائٹ مین کو اس بات کے لیے رشوت دے رکھی تھی کہ کم سے کم پانچ منٹ تک وہ روشنی کو ٹھہرائے رکھے گا، جب تک وہ ناچتی رہے گی۔

اب وہ اسٹیج پر نہیں ناچ رہی تھی، بلکہ بے شرمی سے پچیس روپے دینے والا کے بیچ تھرک رہی تھی، کولہے مٹکا رہی تھی۔ ناچتے ناچتے وہ کمل کی میز کے بالکل قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے بڑی بے حیائی، بے شرمی سے اسے گھورا، جیسے اپنے ننگے جسم کا پورا دیدار کرنا ضروری ہو، وہ سودا کرنے کے لیے جس کی پیش کش کمل داس کی طرف سے آئی تھی۔

'دیکھو میرا جسم دیکھو۔ کیا واقعی اس قابل ہے کہ تم اسے خریدو؟'

'پچاس ہزار میں۔'

'ستر ہزار میں۔'

'ایک لاکھ میں۔'

'یہ جسم جو کبھی تمھارا تھا۔ صرف تمھارا۔'

'مگر جب بچہ میری کوکھ میں تھا تو تم اس جسم کو اور اس بچے کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ آج تمھیں اس کی قیمت دینی پڑے گی۔'

یہ سب اس نے اپنی زبان سے نہیں، اپنے ڈانس سے (جیسے زبانِ حال سے) کہا۔

جب اس بے شرمی کے مظاہرے کو پانچ منٹ ہو گئے تو لائٹ مین نے آخرکار روشنی بجھا دی۔

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

'ایک بار پھر!'

'ایک بار پھر!'

لوگ پاگل ہو کر چلا رہے تھے۔ آج ان کا پیسہ وصول ہو گیا تھا اور ان بھیڑیوں کی طرح جن کے منہ کو خون لگ گیا ہو، وہ چلا رہے تھے۔ سیٹیاں بجا رہے تھے۔

کمل کو پسینہ آرہا تھا کیونکہ اس کو شک ہو رہا تھا کہ یہ جسم اس کا ننگا دیکھا ہوا ہے۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اندھیرے میں اس نے اٹھنے کی کوشش بھی کی مگر پیچھے سے کسی کے ہاتھ نے اس کا راستہ روک لیا اور کان میں کہا 'کہو سیٹھ، کیسا مال ہے؟'

اس سے پہلے کہ وہ اس کا جواب دے، روشنی پھر ہو چکی تھی اور ایک بار پھر وہی نرتکی ننگی ناچ رہی تھی۔ مگر اس بار ایک فرق تھا۔

اس کے چہرے کا کالا ہریری سلک کا پردا اتر چکا تھا اور وہ اپنے دائیں بازو میں اپنے بچے کو سنبھالے ناچ رہی تھی۔

یہ ناچ اس نے ٹھیک کمل داس کی میز کے سامنے کیا۔ مینکا کی طرح بچے کو پیش کیا۔ پھر پیچھے ہٹی۔ پھر آگے بڑھی۔ لوگ سمجھے کہ شاید یہ بھی ننگی ناچ کا کوئی پینترا ہے۔ بچہ بھی بالکل ننگا تھا۔ ناچتے ناچتے وہ ایک بار بالکل کمل داس کے قریب آ گئی اور جھک کر اس کے کان میں کہا۔ 'اس حرام کی اولاد کو پہچانتے ہو ڈارلنگ؟'

وہ بار بار اس کے قریب جھکتی اور کان میں کہا، 'مگر اس حرام کی اولاد کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اسے مار ڈالا ہے۔'

یہ کہتے کہتے وہ زور سے چلا پڑی اور اس کی آواز سنگیت کے دھن کے اوپر سنائی دی۔ اس لیے میں نے اسے مار ڈالا۔

یہ سن کر سننے والے سکتے میں آ گئے۔

یہ ناچ تھا یا ڈراما؟

یہ کامیڈی تھی یا ٹریجڈی؟

یہ ننگی مینکا تھی یا کوئی جل پری یا آگنی پری؟

اور پھر ناچتے ناچتے مُردا بچے کو اپنے کمل داس کی میز پر پٹک دیا۔

'گلنار! یہ تمھیں کیا ہو گیا؟' کمل چلایا۔

ناچنے والی کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کھل اٹھی۔ آخر تم نے مجھے پہچان لیا۔

اس کے ساتھ ہی سنگیت بند ہو گیا۔

سناٹے میں پنجرا کے پروپرائٹر کی آواز تیز ہوئی 'لائٹ بجھاؤ۔ لائٹ بجھاؤ۔'

پھر روشنی بجھ گئی اور صرف چاروں طرف لگی ہوئی پنجرے کی سنہری تالیاں چمکتی رہیں۔

کورٹ نے وائلیٹ (جس کا پہلا نام روز تھا اور اس سے پہلے گلنار) کو پاگل قرار دیا، اور بچے کے قتل کے جرم کی سزا کو ختم کرتے ہوئے اس کو پاگل خانے بھجوا دیا۔

بچے کے کفن دفن کے لیے پانچ سو روپے اپنے سکریٹری کی طرف کمل داس نے بھجوائے۔

کہتے ہیں پاگل خانے کی سلاخوں کو اب بھی کبھی کبھی پنجرا کی تالیاں سمجھ کر گلنار (یا روزی یا وائلیٹ) پاگل خانے کی طرف سے دیئے ہوئے اپنے کپڑے دیتی ہے اور ننگے ناچنے لگتی ہے۔

آخر پاگل ہے نہ بے چاری۔

O

# ایوا کے دو چہرے

''کون کہتا ہے روس میں لڑکیاں خوب صورت نہیں ہوتیں؟'' سردار جعفری نے مجھ سے کہا اس سامنے والی میز پر جو لڑکی کونے میں بیٹھی ہے اسے دیکھو۔

ماسکو کے باکو ریستوران میں اس وقت صرف ہم دو ہندوستانی تھے۔ باقی چاروں طرف روسی سوویت یونین کے ایشیائی علاقوں کے کالے بالوں' کالی آنکھوں والے آذر بائی جانی تاجک، ازبک اور ترکمانی بیٹھے تھے۔ اس آذر بائی جانی ریستوران میں نان، کباب، پلاؤ، قورمہ ملتا ہے اور اس لیے جب کبھی ہم ہوٹل کے بے مزہ یوروپین کھانے سے تنگ آ جاتے تھے تو 'باکو' پہنچ جاتے اور ایسا لگتا جیسے ہم بمبئی کے بھنڈی بازار یا دہلی کی جامع مسجد کے کسی ہوٹل میں آ نکلے ہوں۔

ہم دونوں کو ہندوستان سے آئے ہوئے صرف چند روز ہی ہوئے تھے اور ابھی تک ہم شہر میں نووارد گنواروں کی طرح ماسکو کی ہر چیز کو نہ صرف دلچسپی اور انہماک بلکہ اچنبھے کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سردار جعفری نے مجھ سے کہا ''کون کہتا ہے، روس میں لڑکیاں خوبصورت نہیں ہوتیں۔ اس سامنے والی میز پر جو لڑکی کونے میں بیٹھی ہے اسے دیکھو۔'' اور یہ بات سردار نے میرے کان میں گھُس پُھسا کر نہیں بلکہ اچھی خاصی اونچی آواز میں کہی، جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے صرف اس کا دایاں گال ہی دیکھ سکتے تھے۔ میں نے بھی بلا تکلف جواب دیا۔

''ہاں اس کا ایک رخ جو ہماری طرف ہے، بہت اچھا لگ رہا ہے مگر بے چاری بڑی اُداس معلوم ہوتی ہے اور نہ جانے کیوں دیوار کی طرف منہ موڑے بیٹھی ہے۔ شاید اپنے عاشق سے لڑ کر آئی ہے۔'' لڑکی تھی واقعی بڑی خوبصورت اور طرح دار، گھونگریالے ملائم پیلے پیلے بال نئے اسٹائل سے کٹے ہوئے۔ اونچی شفاف پیشانی، ستواں ناک، پتلے ترشے ہوئے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی سی سُرخی، بھرے ہوئے چکنے گال، یا کہنا چاہیے بھرا ہوا چکنا گال۔

ہم دونوں کو اطمینان تھا کہ ہماری ہندوستانی بات چیت سمجھنے والا وہاں کوئی نہیں ہے۔ کم سے کم وہ پیلے بالوں والی روسی لڑکی تو (ہمیں یقین تھا) گمان بھی نہیں کر سکتی کہ ہمارا روئے سخن اس کی طرف ہے..... مگر ایک پل کے لیے اس کی پلکیں اوپر کیوں اٹھیں؟ کیا سچ مچ اس کے اداس ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ جھلکی تھی یا میری نگاہوں کا وہم تھا؟ کہیں اسے ہماری باتوں کا اندازہ تو نہیں ہو گیا تھا؟ نہ جانے کیوں ہم خود ہی کچھ جھینپ سے گئے اور تھوڑی دیر کے لیے اپنی ساری توجہ میز پر لگے ہوئے کھانے کی طرف مبذول کر دی۔

کچھ دیر تک تو میں باکو کے چٹ پٹے 'کباب' کی داد دیتا رہا اور سردار جیور جین شراب کی شان میں قصیدہ پڑھتے رہے۔ پھر میں نے کن انکھیوں سے اس انجانی حسین لڑکی کی طرف دیکھا مگر اب وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اس کی جگہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت بلکہ بُڑھیا، دیوار کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے گالوں پر کم سے کم اس کے بائیں گال پر جو..... گہری جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا یہ ایک.....؟ میں ہے، ایک ایسی زندگی کا نقشہ ہے جس کے نشیب و فراز.....؟ نے کتنے دکھ کتنے درد چھپے ہوئے ہیں یہ عورت کون ہے؟ اور وہ لڑکی کہاں گئی؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ اس لڑکی اور اس عورت میں کوئی قریبی رشتہ ہے۔ شاید اس لیے کہ جھرّیوں والی بُڑھیا کے سر پر بھی ملائم پیلے بال تھے یا شاید اس لیے کہ دونوں ایک جیسا ہی فراک پہنے ہوئے تھیں حالانکہ میں نے اس لڑکی کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی تھی مگر اس کے حسین چہرے اور اس بڑھیا کے چہرے میں کوئی چیز مشترک ضرور تھی۔ کہیں یہ دونوں ماں بیٹی تو نہیں تھیں..... یا ہو سکتا ہے بڑی چھوٹی بہنیں ہوں!

''کیا ہوا؟'' سردار نے گلاس خالی کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ میں نے جواب دیا ''وہ

لڑکی تو چلی گئی۔"

"کہاں چلی گئی؟"

"کیا معلوم بس چلی گئی۔ اور اس کی جگہ یہ کھوسٹ آ کر بیٹھ گئی ہے سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ بڑے دنوں کے بعد ایک حسین صورت نظر آئی تھی۔"

سردار نے مجھے گھور کر دیکھا "کبھی تم پانی کی جگہ دو ٹکا تو پیتے نہیں رہتے ہو؟ شراب میں نے پی ہے مگر نشہ تم پر چڑھا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ لڑکی سامنے تو بیٹھی ہے اور تمھیں وہ بڑھیا نظر آ رہی ہے؟"

"کہاں بیٹھی ہے؟"

"وہ کیا بیٹھی ہے!" یہ کہہ کر اس نے سامنے لگے ہوئے قدِ آدم آئینے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی وہ حسین لڑکی آئینے میں بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی اور ایک بار پھر مجھے ایسا لگا، جیسے اُن اُداس ہونٹوں پر ایک عجیب سی تیکھی سی مسکراہٹ ہو۔ پھر میں نے مڑ کر اس میز کی طرف دیکھا اور وہاں وہی جھرّیوں والی بڑھیا بیٹھی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

میں نے آئینے میں دیکھا، پھر میز کی طرف دیکھا۔ "سردار، واقعی شراب تم نے پی ہے، مگر نشہ مجھ پر چڑھا ہے۔"

اور اس بار جب میں مڑا تو آئینے میں دیکھا، وہ لڑکی اپنی کرسی سے اُٹھ رہی ہے۔ جلدی سے میز کی طرف دیکھا تو وہ بڑھیا بھی اُٹھ رہی تھی اور پھر وہ لڑکی اور بڑھیا دونوں یک جا ہو گئیں۔ ایک ہی چہرے کے دو رُخ......ایک گال پر بڑھاپے کی جھرّیاں، دوسرے گال پر جوانی کا گداز۔ مگر دونوں گالوں کے اوپر آنکھیں نیلی تھیں اور بال سورج میں چمکتے ہوئے سن کی طرح پیلے۔ اور اب یہ دونوں چہرے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔

"اب آئی مصیبت" سردار نے میرے سے کہا۔

"لگتا ہے اس کو اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم اس کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔" اور

میں نے سردار کے کان میں گھُس پھُسایا۔

''فکر نہ کر دو وہ بولے گی روسی اور من روسی نہ می دانم۔''

مگر اگلے لمحے وہ دونوں چہرے جو دراصل ایک چہرے کے ہی دو رُخ تھے عین ہماری میز کے سامنے آ کر رُک گئے اور ہمارے کانوں میں آواز آئی۔

''نمستے جناب صاحب، آپ ہندوستانی مہمان ہیں۔ کیا میں آپ سے بات کر سکتی ہوں؟''

''جی......جی......ضرور...... بے شک......'' میں ہکلایا اور سردار نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تشریف رکھیے نا۔''

''شکریہ جناب صاحب، میرا نام ایوا ہے، ایوا، ایوا انوفنا۔ آپ شاعر سردار جعفری صاحب ہیں......اور آپ خواجہ احمد عباس۔ میں نے غلطی تو نہیں کی؟''

''جی نہیں......جی ہاں......'' ہم گڑ بڑا کر کہہ رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔

''یہ کم بخت تو گلے ہی پڑ گئی۔ اُردو اچھی طرح جانتی ہے۔ جو کچھ ہم بک رہے تھے وہ سب یہ سُن چکی ہے، اب ضرور ہماری خبر لے گی۔''

مگر سردار جعفری شاعر ہی نہیں ہے، ڈپلومیٹ بھی ہے، اس نے بڑے اطمینان سے جیور جین شراب انڈیلی اور لکھنوی نفاست سے جام پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''نوش فرمایے۔''

''خوشی......؟'' اس نے یہ لفظ ایسے دہرایا جیسے پہلے کبھی نہ سُنا ہو۔

''پیجیے۔'' سردار نے ''نوش فرمایے'' کا ترجمہ کیا۔

''شکریہ، جناب صاحب'' وہ اُردو صحیح بولتی تھی۔ ضرورت سے زیادہ صحیح۔ ایسے جیسے کوئی اٹک اٹک کر کتاب پڑھتا ہے۔

''آپ کا جام صحت'' اس نے گلاس اُٹھاتے ہوئے کہا۔

آپ نے اُردو کہاں پڑھی؟ سردار نے گفتگو جاری رکھنے کے لیے پوچھا۔

''مشرقی زبانوں کے انسٹی ٹیوٹ میں۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔ ''انگریزی، فرینچ، جرمن، اٹالین کو چھوڑ کر آپ نے ہندوستانی زبان ہی کیوں سیکھی۔''

"میں نے اُردو بھی پڑھی ہے، ہندی بھی، تھوڑی سی سنسکرت بھی جانتی ہوں۔ پالی سیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں ہندوستان، ہندوستان کے فلسفے، ہندوستان کے مذاہب کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی ہوں۔" مہاتمابدھ کے فلسفے کے بارے میں پڑھنا چاہتی ہوں......"

میں نے سوچا یہ لڑکی یا عورت جو بھی ہے کہیں ہمیں بے وقوف تو نہیں بنا رہی۔ بھلا ایک کیمونسٹ ملک میں کسی کو مہاتمابدھ کے روحانی فلسفے میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

سو میں نے سوال کیا! "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو ہندوستان اور خاص کر مہاتمابدھ کے فلسفے میں دل چسپی کیسے پیدا ہو گئی؟"

اُس کا جواب سن کر ہم اچنبھے میں رہ گئے۔ اس نے اپنے دونوں چہروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس لیے کہ مہاتمابدھ کے فلسفے نے میری جان بچائی ہے۔"

بے اختیار میری زبان سے نکلا 'وہ کیسے؟'

جواب دینے سے پہلے اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری، پھر بولی "یہ ایک لمبی کہانی ہے۔"

اب تو ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ ہم وہ کہانی سننا چاہتے ہیں۔ سردار نے سگریٹ کیس نکالا، اور بڑے اہتمام سے ایک سگریٹ نکالا، جلایا دھوئیں کا ایک بادل اُڑایا۔

میں عام طور سے سگریٹ نہیں پیتا۔ مگر گھبراہٹ میں، میں نے بھی ایک سگریٹ جلا لیا، اور اناڑی طریقے سے کش لے کر کھانسنے لگا۔

تب ایوا نے اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ سوچا، پھر اپنا بٹوہ کھول کر اس میں سے ایک سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ہماری طرف دیکھ کر بولی۔ "کیا میں سگریٹ پی سکتی ہوں؟"

"ضرور ضرور" سردار نے جلدی سے اپنا سگریٹ کیس بڑھاتے ہوئے کہا 'یہ لیجیے'۔

"کیا یہ انگریزی سگریٹ ہے؟"

"نہیں۔ ہندوستانی۔"

"تب میں ضرور پیوں گی۔"

سگریٹ منہ میں لگا کر اس نے ماچس جلائی تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ رعشہ سے کانپ رہے ہیں۔

ہمارے چہروں پر سوالیہ نشان دیکھ کر وہ بولی......اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ "جنگ کا تحفہ ہے" اور پھر اس نے کہا......اور یہ الفاظ میں اب تک نہیں بھولا۔ "عورتوں کا سگریٹ پینا ہمارے ملک میں برا سمجھا جاتا ہے۔ شاید آپ کے ملک میں بھی۔ مجھے بھی جنگ کے دنوں میں یہ بُری عادت پڑ گئی۔ واقعی سگریٹ پیتی ہوئی عورت اچھی نہیں لگتی مگر فوجی وردی پہنے، رائفل ہاتھ میں لیے بھی عورت اچھی نہیں لگتی۔"

"تو کیا جنگ میں بھی آپ کو محاذ پر لڑنا پڑا تھا؟"

"جی ہاں، یہی میری کہانی ہے۔ جنگ میں میں نے سب کچھ پایا۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس نے اپنے جھرّیوں والے گال کو آئینے میں دیکھا۔ جب وقت نازی فوجیں ماسکو سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر تھیں، اس وقت میں نے فوجی ڈرائیور کی حیثیت سے ایمبولنس کار بھی چلائی ہے، رائفل اٹھا کر گولی بھی چلائی ہے، دشمنوں کا خون بھی کیا ہے......وہ کون تھے جو میری گولی کا نشانہ بنے؟ کیا وہ وہی تھے جنھوں نے میرے بوڑھے باپ کو اس کے جھونپڑے میں زندہ جلا دیا تھا؟ یا وہ جن کے ہاتھوں میرا شوہر مارا گیا؟ یا وہ جنھوں نے میرے گھر پر وہ بم گرایا، جس کے دھماکے سے میرے دودھ پیتے بچے کے دماغ کی رگ ٹوٹ گئی اور وہ ہمیشہ کے لیے جانور سے بھی بدتر جیتے جاگتے گوشت کا ایک لوتھڑا بن گیا جس کا جسم وقت کے ساتھ بڑھ رہا ہے مگر جو نہ کبھی بول سکے گا، نہ سوچ سکے گا اور نہ کچھ محسوس کر سکے گا؟ یا وہ کوئی اور تھے؟ کسی ماں کے بیٹے؟ کسی بہن کے بھائی؟ کسی پتنی کے پتی؟ اپنے بچوں کے باپ؟ جو کچھ بھی وہ تھے میری رائفل کی گولیاں چلنے کے بعد وہ اس دنیا میں نہیں رہے......" اور پھر تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولی "اور اس لیے میں سوویت امن کمیٹی میں کام کرتی ہوں......اور......اور میرے چہرے کا یہ حال ہے......"

سردار نے جیورجین شراب کی ایک اور بوتل کا آرڈر دیا۔ ایوا نے ایک اور سگریٹ جلایا اور دھوئیں کے حلقے بنا کر ان میں اپنے ماضی کو کھوجنے لگی۔

پھر دفعتاً اس نے سوال کیا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں میری عمر کیا ہوگی؟"

سردار نے ٹالنے کے لیے کہا۔ "خواتین کی عمر کو کبھی نہیں پوچھنا چاہیے"

ایوا نے میری طرف دیکھا۔ ''آپ بتایئے۔''

میں نے اس کے ایک گال کو دیکھا، پھر دوسرے گال کو ''سترہ برس بھی ہو سکتی ہے اور ستر برس بھی۔''

میری عمر اکتیس برس ہے۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کئی سو برس جی چکی ہوں، کئی بار مر چکی ہوں۔''

سردار نے ایوا کے گلاس میں شراب انڈیلی۔ ایک گھونٹ پینے کے بعد اس نے دفعتاً ایک اور عجیب و غریب سوال کیا، کیا آپ بتا سکتے ہیں میرے بالوں کا رنگ کیسا ہے؟''

میں نے سوچا اس بے چاری پر کہیں شراب کا اثر ہونا تو نہیں شروع ہو گیا جو یہ ایسے اوٹ پٹانگ سوال کر رہی ہے۔

مگر سردار نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''آپ کے بالوں کا رنگ پیلے اور سنہرے کے بیچ میں ہے۔ جسے انگریزی میں ''بلونڈ'' BLONDE کہتے ہیں۔''

''آپ بھی دھوکا کھا گئے نا؟ میرے بالوں کا اصلی رنگ یہ نہیں ہے۔ میرے بال تو نوے برس کی بڑھیا کی طرح بالکل سفید ہیں۔ ہر ہفتے میں انھیں رنگواتی ہوں۔''

میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ آپ شاید مذاق کر رہی ہیں؟ بھلا اس عمر میں آپ کے بال سفید کیسے ہو سکتے ہیں؟

''میرے بال تو تیرہ برس سے سفید ہیں۔''

''یعنی اٹھارہ برس کی عمر میں ہی.....''

''جی ہاں'' اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا ''جنگ کسی بات کا لحاظ نہیں کرتی، نہ بڑھاپے کا، نہ بچپن کا۔ میں سولہ برس کی تھی، جب جنگ شروع ہوئی۔ میں اور ایوان دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ تب میرا نام ایوانیٹر انفا تھا اور اس کا نام تھا۔ ایوان ایوانوف۔ وہ فٹ بال بڑی اچھی کھیلتا تھا۔ گرمیوں میں ہم ماسکو وا ندی میں تیرتے تھے۔ جاڑوں میں ہم لینن پہاڑی پر اسکیٹنگ کرنے جاتے تھے۔ ایوا اور ایوان۔ ایوان اور ایوا سب کہتے کتنی اچھی جوڑی ہے۔ مگر ہم صرف دوست تھے۔ ہم نے شادی کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ پھر جنگ شروع ہو گئی۔ ایوان نوجوان کمیونسٹ پارٹی کا بڑا جوشیلا ممبر تھا۔ اس نے پہلے دن ہی فوج میں بھرتی ہونے کے

لیے درخواست دے دی۔ تب دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میں ایوان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور سو میں نے کہا ایوان جب تک تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے میں تمھیں فوج میں بھرتی ہونے نہ دوں گی۔ اس نے کہا ایوا پاگل ہوگئی ہے۔ سولہ برس کی عمر میں بیوہ بننا چاہتی ہے؟ میں نے کہا، میں تمھارے بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں، پھر بیوہ بننا بھی منظور ہے۔ سو ہماری شادی ہوگئی اور تین دن بعد ایوان کو یوکرین کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ تین مہینے کے بعد میں نے اسے خط لکھا کہ مبارک ہو تم ایک بچے کے باپ بننے والے ہو۔ اور ایوان نے جواب میں لکھا۔ اب میں جانتا ہوں میں کیوں لڑ رہا ہوں...... تاکہ ہمارا بچہ کبھی نازیوں کا غلام نہ کہلائے۔ اس کے مستقبل کے لیے مجھے جان بھی دینی پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں، اس کے چھ مہینے بعد ہمارا بچہ پیدا ہوا۔ جس دن مجھے اسپتال لے گئے ماسکو پر بم گر رہے تھے۔ سائرن بج رہے تھے، کتنی ہی بلڈنگوں میں آگ لگی ہوئی تھی اور فائر بریگیڈ کے انجن اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ مگر اس وقت میں جنگ کی ہولناکی سے بے خبر تھی۔ میرے لیے تو زندگی کی ایک ہی سچائی تھی کہ میں ایک بچے کی ماں بن گئی ہوں۔ اپنے پیارے ایوان کے بچے کی ماں۔''

بولتے بولتے وہ رُک گئی۔ شاید تھک گئی تھی۔ شاید سوچ رہی تھی، اپنی زندگی کے واقعات میں سے کیا سنائے کیا نہ سُنائے۔

پھر اس نے ایک تھکی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا: ''میرے ماں باپ ماسکو سے تیس میل باہر ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ میں نے بچے کی دیکھ بھال کے لیے اپنی ماں کو اپنے پاس بلا لیا مگر میرا باپ نہ آیا حالانکہ جرمن فوجیں اس علاقے کی طرف بڑھتی ہی چلی آرہی تھیں۔ اس نے کہا میں تو جہاں پیدا ہوا ہوں، وہیں مروں گا۔ اب میں بھی فوج میں بھرتی ہوگئی۔ فوج میں ڈرائیوروں کی کمی تھی۔ مرد ٹینک اور آرمرڈ کار اور توپ خانے کی گاڑیاں چلا رہے تھے۔ فرنٹ سے زخمیوں کو لانے کے لیے سو ایمبولنس کاروں کی ڈرائیونگ عورتوں اور لڑکیوں کے سپرد کی گئی۔ ایسی ہی ایک ایمبولنس کار میں بھی چلاتی تھی۔ میں اور اولگا۔ بارہ بارہ گھنٹے کی ہماری ڈیوٹی ہوتی تھی۔ اولگا بہت جلد میری دوست بن گئی۔ وہ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ ہر وقت ہنستی رہتی تھی۔ بموں اور گولیوں کی بوچھار میں بھی جب وہ ایمبولنس چلاتی تھی تو پرانے روسی گیت گاتی رہتی تھی اور زخمی سپاہی جن کو وہ

لاتی تھی کہتے تھے اولگا کی آواز میں جادو ہے۔ اس کے گیت سن کر مردے زندہ ہو جاتے ہیں۔ مگر ایک دن جب اولگا کی ایمبولنس پھٹے ہوئے ٹائروں پر لنگڑاتی ہوئی ماسکو اسپتال میں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ دشمن کی گولیوں سے لکڑی کی دیواریں چھلنی ہو چکی ہیں اسپتال کے اردلیوں نے جلدی جلدی زخمیوں کو اسٹریچروں پر ڈال کر اُتارا۔ سات میں سے تین راستے میں ہی دم توڑ چکے تھے۔ جب ایمبولنس خالی ہوگئی اور اولگا اپنی سیٹ سے نیچے نہیں اُتری تو میں گھبرا کر دوڑی، وہ اب تک ڈرائیور کی سیٹ پر ہی بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر تھے مگر وہ زندہ نہیں تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک گولی لگی تھی۔ اس جرمن گولی نے اس کی جان لے لی تھی۔ مگر اولگا کا مردہ چہرہ اب بھی ہنس رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ادھ کھلے تھے جیسے اب بھی وہ گا رہی ہو......''

سردار نے ایک جام اور ایوا کی طرف بڑھایا۔ پھر سردار نے اپنا گلاس اٹھا کر کہا ''اولگا کے اس مسرت بھرے گیت کے لیے جس کو نازیوں کے منحوس بم اور ان کی زہر بھری گولیاں بھی خاموش نہ کر سکیں۔''

ایوا نے خاموشی سے شراب کا ایک گھونٹ پیا، پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک اور سگریٹ جلایا، اور کہا ''جعفری صاحب، موت بڑی بھیانک چیز ہے۔ اس میں نہ شاعری ہے نہ سنگیت۔'' اور ایک بار پھر اس کے سگریٹ کے دھوئیں میں ماضی کے نقش اُبھرنے لگے۔

موت نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا، اولگا کی مسکراہٹ چھین لی۔ میرے ماں باپ کا سایہ چھین لیا۔ ایک دن خبر آئی کہ ہمارے گاؤں تک نازی آپہنچے ہیں اور گاؤں کا گاؤں جلا دیا گیا ہے۔ اور بوڑھے پتروف نے جہاں جنم لیا تھا وہیں جان دے دی۔ اولگا کے مرنے کے بعد وہ ایمبولنس سارے وقت مجھے ہی چلانی پڑی۔ ایک بار اسپتال پہنچی تو مجھے ایک خط ملا۔ فوراً واپس جانا تھا اس لیے میں نے خط اپنی جیب میں رکھ لیا۔ محاذ اب ماسکو سے صرف بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں پہنچی آج دشمن نے بڑی گھمسان کی گولہ باری کی تھی۔ ماسکو پر بھی کئی ہوائی حملے ہو چکے تھے۔ بیس زخمی ایمبولنس کا انتظار کر رہے تھے جس میں صرف آٹھ کو لے جانے کی جگہ تھی۔ ان سب کو کسی نہ کسی طرح اندر ٹھونسا جا رہا تھا کہ مجھے وہ خط یاد آیا جیب سے نکال کر پڑھا، ایوان کی موت کی خبر تھی اور وہ پڑھ کر نہ جانے کیا ہوا میں بے اختیار ہنسنے لگی۔ مجھے ہنسی کا دورہ پڑا۔ ایک

ڈاکٹر نے پوچھا کامریڈ کوئی اچھی خبر ہے، تمھارے ایوان کو بہادری کا تمغہ ملا ہے کیا؟ اور میں نے کہا 'ہاں' کامریڈ بہت اچھی خبر ہے اور میرے ایوان کو بہادری کا سب سے بڑا تمغہ ملا ہے۔

اس دن میں نے ماسکو اسپتال سے فرنٹ کے کتنے چکر لگائے مجھے یاد نہیں۔ ایک بار کسی ڈاکٹر نے کہا بھی کہ تم دو دن سے اکیلی ایمبولنس چلا رہی ہو۔ تھوڑی دیر آرام کرلو۔ مگر میں نے کہا۔ نہیں ڈاکٹر میں بالکل ٹھیک ہوں میں تو ابھی دو چار دن اور کام کرسکتی ہوں۔ اور سو میں ایمبولنس چلاتی رہی فرنٹ سے شہر۔ شہر سے فرنٹ۔ اور نازی بم گراتے رہے۔ نازی ہوائی جہاز میری ایمبولنس کو بھی نشانہ بناتے رہے۔ کتنے ہی زخمی راستے میں مر گئے۔ مگر اس وقت میرے لیے موت اور زندگی اور وقت سب ختم ہو چکے تھے۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ ایک منٹ کو بھی میں نے ایمبولنس کو بند کیا تو خود میری نبض کی حرکت بھی بند ہو جائے گی۔

اور پھر ایک بار میں اسپتال پہنچی تو ڈاکٹر نے کہا۔ ایوا تم گھر جاؤ۔ اس علاقے پر بہت زور کی بم باری ہوئی ہے۔ کئی بلڈنگیں تباہ ہو گئی ہیں اور ایک دم مجھے اپنے ننھے ایوان کی یاد آئی اور میں پاگلوں کی طرح ماسکو کی سڑکوں پر دوڑنے لگی......

بلڈنگ بم باری سے تباہ ہو چکی تھی۔ مگر ہماری فلیٹ صحیح سالم تھی میں بھاگتی ہوئی اندر گئی۔ ننھا ایوان پالنے میں پڑا تھا۔ میں نے اُسے گود میں اُٹھا کر بھینچ لیا مگر وہ رویا نہیں۔ وہ ہنسا بھی نہیں مسکرایا بھی نہیں۔ اس کی نیلی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر جو چمک ہمیشہ پیدا ہوتی تھی۔ آج وہ چمک بھی اُن آنکھوں میں پیدا نہیں ہوئی۔ وہ زندہ تھا مگر اس کے اندر کوئی چیز مر گئی تھی۔ بچّے کو گود میں لیے لیے میں کمرے میں پھر رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ بم کے دھماکے سے دیوار میں درار پڑ گئی ہے اور دیوار پر لگے ہوئے آئینے کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ ایک ٹکڑا دیوار پر لگا رہ گیا ہے اور دوسرا کرچیں کرچیں ہو کر زمین پر پڑا ہے۔'

یہ آئینہ مجھے بہت عزیز تھا کیونکہ ایوان نے سال گرہ کے تحفہ میں دیا تھا۔ میں تیز تیز چلتی ہوئی آئینے کے پاس گئی۔ کئی دن کے بعد اپنا چہرہ نظر آیا مگر یہ میرا چہرہ نہیں تھا۔ یہ تو کسی سفید بالوں والی بڑھیا کا چہرا تھا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ بم کے دھماکے سے ننھے ایوان کے دماغ کی رگ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی

ہے۔ اب وہ ایک زندہ گوشت کے لوتھڑے کی طرح بڑھتا رہے گا۔ نہ کبھی بول سکے گا۔ نہ سن سکے گا۔ نہ سوچ سکے گا۔ نہ محسوس کر سکے گا۔ ڈاکٹر نے یہ بھی بتایا کہ دہشت اور غم نے میرے بالوں کو ہمیشہ کے لیے سفید کر دیا ہے۔

اور سو میں ننھے ایوان کو اپنی ماں کی گود میں دے کر، واپس پھر ڈیوٹی پر چلی گئی۔ اب نازی فوجوں کو پیچھے دھکیلا جا رہا تھا۔ فرنٹ لائن ماسکو سے دُور ہوتی جا رہی تھی۔ اب مجھے زخمیوں کو سو میل دور سے لانا پڑتا تھا۔ ایک دن بڑے زور کی برف باری ہو رہی تھی۔ راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں فرنٹ سے گیارہ زخمیوں کو لے کر آ رہی تھی کہ ایک جرمن بم بار ہوائی جہاز نے میرا پیچھا کیا۔ میں نے ایمبولنس دوڑائی مگر اس شیطان ہوائی جہاز سے کوئی چھٹکارا نہیں تھا۔ ایک بم بالکل میرے سامنے گرا اور اس سے پہلے کہ میں بریک لگا پاتی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے بائیں گال پر کسی شیطان نے اپنے فولادی ہاتھ سے تھپڑ مارا ہے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی اور میرا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ کئی مہینے تک میں موت اور زندگی کے درمیان جھولتی رہی۔ اتنی بار میرے آپریشن کیے گئے کہ میں ان کی گنتی بھی بھول گئی۔ آخرکار ایک دن مجھے وہاں سے رہائی ملی تو میں نے ایک نرس سے کہا 'آئینہ دینا کامریڈ میں اپنی صورت تو دیکھوں۔'

اس نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''آئینہ دیکھ کر کیا کرو گی'' نہیں؟

تب میں نے باتھ روم میں جا کر آئینہ دیکھا تو میرے چہرے کی یہ حالت تھی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے میرے بائیں گال پر جتنے آپریشن کیے تھے ان کے زخموں کے گھاؤ جھرّیوں میں تبدیل ہو چکے تھے یہ ہے میرے دو چہروں کی کہانی......

'آپ نے پلاسٹک سرجری کیوں نہیں کرائی؟' میں نے دھیمے سے پوچھا۔

مجھے اپنے چہرے کی جھریاں دُور کرنے میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ زندگی ہی سے میرا وشواس اٹھ گیا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے وطن میں کمیونزم میں، انسانیت میں، آزادی میں بھی کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ اگر مجھے ننھے ایوان کا اور اپنی بوڑھی بیوہ ماں کا خیال نہ ہوتا تو میں پہلے دن ہی اسپتال سے زہر چرا کر اپنی جان دے دیتی۔

اور پھر جنگ ختم ہوگئی۔ سب نے خوشیاں منائیں مگر مجھے اب جنگ اور امن میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ دنیا نے میری ہر خوشی چھین لی ہے اور میرے دل میں غم اور غصہ اور نفرت اور تلخی بھر گئی ہے۔ پھر انفلوئنزا میں میری ماں مرگئی اور میں اور ننھا ایوان دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ تب کسی نے کہا سوویت سرکار نے ماسکو سے کچھ دور جنگل میں ایک نیا اسپتال بنایا ہے، ایوان جیسے بچوں کے لیے جن کے دماغ بیکار ہو چکے ہیں۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ ننھے ایوان کو وہاں داخل کر کے میں وہاں سے ہی نہیں، اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں گی ماسکو واندی کی لہروں میں کھو جاؤں گی یا کسی ٹرین کے نیچے آ جاؤں گی......

جب میں ننھے ایوان کو لے کر اس اسپتال میں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ باہر سے لے کر اندر تک بہت بڑی بھیڑ ہے۔ زیادہ تر عورتیں ہیں۔ کسی کی گود میں بچہ ہے، کوئی بچہ گاڑی میں ڈال کر اپنے بچے کو لائی ہے، کوئی وہیں کھڑی کھڑی بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ بچے پیلے بالوں والے بھی تھے۔ بھورے بالوں والے بھی اور کالے بالوں والے بھی۔ سینکڑوں بچے ہزاروں بچے اور ان سب بچوں میں ایک خصوصیت مشترک تھی دیکھنے میں وہ انسان کے بچے ہی لگتے تھے مگر ان میں جانوروں جتنی سمجھ بوجھ بھی نہیں تھی، بچے کیا تھے، بس زندہ گوشت کے لوتھڑے تھے جو کبھی نہ بول سکیں گے، نہ سُن سکیں گے، نہ سوچ سکیں گے......

اور دفعتاً جیسے کالے بادلوں میں بجلی چمک اٹھتی ہے۔ مجھے ایک نیا احساس ہوا کہ دکھ اور درد کے اس ڈرامے میں میں اکیلی نہیں ہوں۔ ایک دو نہیں سینکڑوں ہزاروں بلکہ شاید ملک بھر میں لاکھوں مائیں ایسی ہیں، جنگ میں جن کے بچوں کی دماغی حالت وہی ہوگئی ہے جو میرے ننھے ایوان کی ہے۔ میں اپنے بچے کو اس اسپتال میں چھوڑ آئی، جہاں پانچ ہزار سے زیادہ بچے پل رہے ہیں۔ ہر مہینے میں وہاں جاتی ہوں۔ ننھا ایوان اب بارہ برس کا ہو گیا ہے۔ اپنے باپ کی طرح اس کا قد بھی کافی اونچا ہے، کھانے کو اچھا ملتا ہے اس لیے صحت بھی اچھی اور موٹا تازہ بھی ہے مگر اب بھی وہ نہ سن سکتا ہے نہ کچھ بول سکتا ہے، نہ سوچ سکتا ہے مجھے بھی بس اتنا پہچانتا ہے کہ یہ عورت وہ ہے جو کبھی کبھی اس کے لیے کھانے کی اچھی اچھی چیزیں لاتی ہے۔ اتنا ہی پہچانتا ہے جتنا ایک کتا اس آدمی کو پہچانتا ہے جو اُسے وقتِ مقررہ پر پینے کے لیے دودھ یا کھانے کے لیے

گوشت اور چبانے کے لیے ہڈی دیتا ہے لیکن ایک ماں کے لیے یہ بھی بہت ہے کہ اس کا بیٹا کسی حالت میں بھی ہے، مگر وہ زندہ ہے......"

پھر ہماری میز پر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ سردار نے شراب کا ایک اور جام اٹھا لیا۔ ایوا نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور میں نے کہا "مگر آپ تو یہ بتانے والی تھیں کہ مہاتما بدھ کے فلسفے نے کیسے آپ کی جان بچائی۔

اچھا کیا آپ نے یاد دلا دیا" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سگریٹ کا دھواں نکالتے ہوئے کہا "جب میں ننھے ایوان کو داخل کرا کے آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ اسپتال میں جو کچھ میں نے دیکھا اس میں میرے لیے کوئی معنی خیز اور شاید زندگی بخش سبق ہے۔ لیکن وہ سبق کیا ہے وہ میں نہ سمجھ سکی۔ پھر بھی میں نے زندگی میں ایک بار پھر تھوڑی بہت دلچسپی لینی شروع کردی۔ سوچا کم سے کم کالج میں پڑھائی کے لیے نام لکھوالوں۔ داخلے کے امتحان کے لیے تیاری کرنا ضروری تھی۔ اس لیے لائبریری میں جانا شروع کیا۔ وہاں ایک دن مہاتما بدھ کی زندگی کے بارے میں ایک کتاب ہاتھ پڑ گئی۔ میں یوں ہی ورق الٹ رہی تھی کہ ایک صفحہ پر ایسا لگا جیسے میری زندگی کی کہانی ہی لکھی ہو۔

مہاتما بدھ کے پاس ایک عورت اپنے بچّے کی لاش لیے ہوئے آئی اور کہا: بھگوان سنا ہے تم مردے میں جان ڈال سکتے ہو تو پھر میرے بچّے کو زندہ کردو۔

تب گوتم نے کہا: 'تمھارے مردہ بچّے میں جان ڈال سکتا ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم گاؤں کے ہر جھونپڑے میں جاؤ اور اس گھر کے چولھے کی راکھ لے آؤ جس گھر میں کبھی موت نہ ہوئی ہو۔ وہ راکھ تمھارے بچّے کے مردہ جسم کو جیسے ہی لگائی جائے گی وہ زندہ ہو جائے گا۔'

تب وہ عورت باری باری گاؤں کے ہر جھونپڑے میں گئی لیکن اس کو کوئی گھر ایسا نہ ملا جہاں کوئی موت نہ ہوئی ہو اور تب وہ بھگوان بدھ کا مطلب سمجھ پائی کہ دنیا کا کوئی انسان بھی دکھ اور موت سے آزاد نہیں ہے۔ یہ صلیب ہر ایک نے اٹھائی ہے اور ہر ایک کو اُٹھانی پڑے گی اور سو وہ چپکے سے اپنے بچّے کی لاش کو کریا کرم کے لیے اٹھا کر لے گئی۔

اور تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ ہے وہ معنی خیز اور زندگی بخش سبق جو اس اسپتال میں مجھے ملا تھا، جہاں میرے ننھے ایوان کی طرح پانچ ہزار دوسری ماؤں کے اپاہج اور لاچار بچّے بھی پل

رہے تھے اور اس دن سے میری زندگی بدل گئی اور میں نے ہندوستان کی زبانوں اور ہندوستانی فلسفہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔

لیکن پھر بھی آپ نے پلاسٹک سرجری کے ان جھریوں کو دُور نہیں کرایا؟ میں نے سوال کیا۔

'نہیں' اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے جواب دیا: 'ان جھریوں کو میں نے منحوس جنگ کی ایک مستقل یادگار کی طرح رکھ چھوڑا ہے۔ یہ میرے دو چہرے...... ایک خوب صورت ایک بدصورت...... ایک جوان اور ایک بوڑھا...... یہ صرف میرے دو چہرے نہیں ہیں۔ یہ دنیا کے چہرے ہیں۔ ایک پر امن کا نکھار ہے۔، دوسرے پر جنگ کی نحوست ہے۔ جب تک دنیا پر جنگ کا منحوس سایہ ہے۔ میں اس جھریوں پڑے بدہیئت چہرے کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں تا کہ دنیا والوں کو ہر وقت میرے چہرے پر جنگ کا ہولناک انجام نظر آتا رہے۔ امن کمیٹی میں میرے ساتھی کہتے ہیں کہ میرے دو چہرے جنگ کے خلاف ایک موثر اشتہار کا کام دیتے ہیں......

یہ گفتگو نو برس ہوئے ماسکو کے باکو ریستوران میں ہوئی تھی لیکن پچھلے ہفتے کئی برس کے بعد ایوا کا خط مجھے ملا۔ لفافے میں ایک تصویر بھی تھی۔ ایک خوبصورت چالیس سالہ نوجوان عورت کی تصویر جس کے دونوں گالوں پر جوانی کی چمک اور چکناہٹ ہے اور کسی جھرّی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے'' عباس صاحب۔ یہ میری نئی تصویر ہے۔ اب میں ایسی لگتی ہوں۔ آپ کی ہدایت کے بموجب میں نے پلاسٹک سرجری کرالی ہے۔ میڈیکل سائنس کی بدولت میرے بچے کی دماغی حالت بہت بہتر ہوگئی ہے۔ اب وہ تھوڑی بہت بات کر سکتا ہے اور مجھے ماں کہہ کر پکارنے لگا اور ایسا لگتا ہے کہ دنیا نے امن کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ موت سے تو انسان کو کوئی چھٹکارا نہیں ہے لیکن اب منحوس ایٹم بم کسی بچے یا اس کے ماں باپ پر نہیں برسیں گے اور وہ دن دُور نہیں جب کسی ماں کا بچہ قحط سے، بھوک سے، بے چارگی سے یا جنگ کی تباہ نا کی سے ہلاک نہیں ہوگا۔ لگتا ہے مجھے ہی نہیں دنیا کی ہر ماں کو اس چھوٹے کی راکھ مل گئی ہے......

اخیر میں ایک سطر اور لکھی ہے'' آپ کو یہ جان کر شاید دلچسپی ہوگی کہ پچھلے ہفتہ میں نے دوسری شادی کر کے دوسری زندگی شروع کر دی ہے۔ میرے اس شوہر کا نام بھی ہے...... ایوان!

O

# بمبئی

بمبئی رات کی کالی مخملی بانھوں میں لیٹی ہوئی ہنس رہی تھی۔

آسمان سے نیچے اترتے ہوئے ہوائی جہاز کی کھڑکی میں سے ایسا لگتا تھا کہ شہر کی لاکھوں کروڑوں روشنیاں آنکھیں جھپکا رہی ہیں، دانت دکھا رہی ہیں، کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں۔

نیچے ایئرپورٹ پر ایک بوئنگ اتر رہا تھا، جو وقت سے دس منٹ پہلے آ گیا تھا۔ (کیونکہ سنگاپور سے اسے موافق سمت میں چلنے والی تیز ہوا ملی تھی)۔ اس لیے دہلی سے آنے والے وائیکاؤنٹ کو نیچے اترنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ سواپنے ساٹھ مسافروں کو لیے ہوئے یہ ہوائی جہاز ایک بار پھر شہر کے اوپر پورا چکر لگا رہا تھا۔ شاید تیسری بار بھی اسے چکر لگانا پڑے۔

ارجن اروڑا، جو بمبئی ٹائمز کے چیف رپورٹر کی حیثیت سے دہلی سے ری پبلک ڈے پریڈ کی رپورٹ لے کر لوٹ رہا تھا، اپنے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کو کھڑکی میں سے بمبئی کی روشنیاں دکھا رہا تھا۔ وہ دیکھو، سمندر میں نیوی (NAVY) کے جہاز کھڑے ہیں، گیٹ دے آف انڈیا اور تاج محل ہوٹل کے بالکل سامنے یہ ہے کُلابا۔ جنوب میں بمبئی کا آخری کنارا۔ یہ ہے مَرین ڈرائیو ہمارے شہر کی سب سے خوبصورت سڑک، جو میلوں سمندر کے کنارے کنارے چلی گئی ہے اور وہ نیچے روشنیوں کا جو جھرمٹ نظر آ رہا ہے، وہ چوپاٹی ہے۔ چوپاٹی کا ذکر تو آپ نے ضرور سنا......

مگر اس نے دیکھا کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا مسافر نہ کھڑکی میں سے روشنیاں دیکھ رہا ہے، نہ شاید وہ اس کی بات ہی سن رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور اپنے ہاتھوں سے سیٹ والی پیٹی کو وہ کس کر پکڑے ہوئے ہے۔ اپنے ہر سفر میں اَرجن کا عجیب اور دلچسپ آدمیوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ مگر ایسا ہمسفر اسے کبھی نہ ملا تھا۔ ابھی پالم سے ہوائی جہاز اڑا بھی نہیں تھا کہ بوڑھے نے اپنے کوٹ کے اندر کی جیب سے ہزار ہزار کے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اَرجن کو دکھایا اور پوچھا، ''کیوں جی، تیس ہزار روپے کافی ہوں گے نا؟ بات یہ ہے کہ میں زندگی میں پہلی بار بمبئی جا رہا ہوں۔ دلّی میں دریبے میں سونے چاندی کے زیوروں کی دکان ہے۔ بمبئی جانے کو سوچا تو کتنی ہی بار، مگر دھندے سے کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ پچھلے سال میں نے سارے تیرتھوں کی یاترا کر لی تو اب جی چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے بس ایک بار بمبئی دیکھ لوں۔ عمر بھر میرے بیٹے پوتوں نے میری کمائی پر عیش کیے ہیں جی! میں نے سوچ لیا ہے کہ مہینہ بھر میں بھی بمبئی میں جی بھر کر عیش کروں گا۔۔ عمر بھر کی کسر نکال لوں گا۔ سنا ہے جی بمبئی میں رات کو بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں جی......' اور ان کے خیال سے ہی اس کی بوڑھی بجھی بجھی سی آنکھیں چمک اٹھی تھیں اور اس کے سوکھے ہوئے پتلے پتلے ہونٹوں سے رال ٹپکنے لگی تھی۔ مگر اب اس کی آنکھیں بند تھیں اور شاید متلی کو روکنے کے لیے اس نے اپنے سوکھے پتلے ہونٹ کس کر بند کر رکھے تھے۔

بے چارا بوڑھا، ارجن نے سوچا۔ پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھا ہے نا! ہوائی جہاز نیچے اترتا ہے تو پرانے تجربہ کار مسافروں کو بھی پیٹ میں کھینچاؤ سا محسوس ہوتا ہے اور متلی ہونے لگتی ہے۔ ضرور اس بے چارے کی حالت خراب ہے، تبھی چہرہ بھی پیلا پڑ گیا ہے۔

ارجن تو درجنوں بار ہوائی سفر کر چکا تھا۔ اس کو کبھی متلی نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کو بھی متلی ہونے لگے تو دیکھ کر اس کی طبیعت بھی خراب ہونے لگتی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے ہم سفر کا پیلا چہرہ دیکھتے ہی فوراً کھڑکی کی طرف منہ موڑ لیا اور نیچے شہر کی روشنیاں دیکھنے لگا۔ گھومتے ہوئے ہوائی جہاز میں سے اسے ایسا لگا کہ وہ خود تو آکاش میں لٹکا ہوا ہے اور بالکل ساکت ہے، مگر دور کہیں نیچے روشنیوں سے جگمگاتا ہوا شہر گھوم رہا ہے......گھوم رہا ہے۔

'رات!' ارجن نے گھومتے ہوئے، شہر کی روشنیوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا،

رات ایک حسین جادوگرنی ہے۔ ہر شام وہ شہر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتی ہے اور اس پر اپنا ستاروں ڈھکا کامدانی کا کالا دوپٹہ ڈال دیتی ہے اور پھر صبح ہونے تک شہر کی ساری بدصورتی، شہر کے جسم پر جھولتے ہوئے میلے، بدبودار چیتھڑے، شہر کے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر خون اور پیپ سے رستے ہوئے زخم اور ناسور۔ وہ سب اس جادو کے دوپٹے سے ڈھکے رہتے ہیں۔ ہر برائی ہر بدصورتی، ہر بے انصافی، ہر ظلم پر اندھیرے کا پردا پڑا رہتا ہے۔ اور رات کی طلسمی بانہوں میں سمٹ کر شہر کے چہرے پر نکھار آجاتا ہے۔ شہر خوب صورت، جوان اور صحت مند ہو جاتا ہے، روشنی کے لاکھوں دانتوں کی نمائش کرنے کے لیے کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ مگر پھر صبح ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے روشنیاں بجھتی جاتی ہیں، جیسے کسی کے چہرے سے کھسیانی ہنسی کے آثار آہستہ آہستہ مٹ جاتے ہیں اور پھر سورج اپنا بے رحم ہاتھ بڑھاتا ہے اور ایک ہی بار میں اس طلسمی چادر کو نوچ لیتا ہے اور شہر کو رات کی نرم بانہوں میں سے گھسیٹ کر حقیقت کے تلخ اجالے میں ننگا کھڑا کر دیتا ہے......

مگر، ارجن نے سوچا۔ ابھی سویرا ہونے میں دیر ہے۔ اس وقت رات کا پہلا پہر ہے اور رات کو بمبئی سے زیادہ خوب صورت شہر دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کالی مخمل پر ہیرے جواہرات بکھرے پڑے ہوں۔ مگر نہیں، یہ سب تو شاعری ہے۔ اس نے پھر سوچا، یہ نیچے پھیلی ہوئی کالی مخمل نہیں ہے۔ اندھیرا سمندر ہے اور یہ ہیرے جواہرات نہیں ہیں۔ یہ سڑکوں، گھروں اور دکانوں، ہوٹلوں اور تھیٹروں، کلبوں اور ناچ گھروں، کارخانوں اور فیکٹریوں، چالوں اور جھونپڑیوں کی روشنیاں ہیں۔ نیون لائٹ میں لکھے ہوئے موٹر اور بسکٹوں، کپڑے کی ملوں اور صابن کی ٹکیوں اور ناچ گانوں سے بھرپور فلموں کے لال، پیلے رنگوں کے اشتہار ہیں۔

ملک کے بٹوارے کے بعد اس نے پندرہ برس اس شہر میں گذارے تھے۔ اور بمبئی کی رات سے وہ اس طرح واقف تھا، جیسے مرد اپنی عورت کے جسم کی بوٹی بوٹی سے واقف ہوتا ہے۔ یہ بکھری ہوئی روشنیوں کا جال، جو نیچے گھوم رہا تھا، اس میں سے ہر روشنی اس کی جانی پہچانی تھی۔ برسوں تک ہر رات کو وہ اخبار کے دفتر سے نائٹ ڈیوٹی کر کے ان روشنیوں کی چھاؤں میں فلورا فاؤنٹین سے 'بائی کلا' پیدل گیا تھا۔ اپنے پہلے عشق میں پہلی ناکامی کے بعد مہینوں اس نے میرین ڈرائیو کا پتھریلا فٹ پاتھ ناپا تھا اور اس پر لگی ہوئی سڑک کی روشنیاں گنی تھیں اور جب اوشا سے

اس کی نئی نئی محبت ہوئی تھی، تو کتنی ہی بار وہ دونوں رات کو چوپاٹی پر گئے تھے اور وہاں چاٹ کی دوکانوں پر لگے ہوئے گیس کے ہنڈوں کی پیلی روشنی میں انھوں نے دہی بڑے اور گول گپے کھائے تھے اور پھر فالودا پی کر بنارسی پان والے کی دوکان سے مہوبے کے خوشبودار پان بنوائے تھے اور پھر ان پانوں کو چباتے، ہنستے بولتے بال کشور روڈ پر لگی ہوئی بتیوں کو گنتے ہوئے مالابار ہل کی چوٹی تک گئے تھے، تاکہ سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ اور شور شرابے سے بہت دور اور بہت اوپر ہینگنگ گارڈن کے سامنے پڑی ہوئی کسی بینچ پر بیٹھ کر ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سن سکیں۔

مگر اب وقت کے ساتھ مہوبے کے ان پانوں کا مزا کسیلا پڑ چکا تھا۔ اب برسوں سے انھوں نے چوپاٹی پر نہ چٹ پٹی چاٹ کھائی تھی، نہ ٹھنڈا میٹھا فالودا پیا تھا اور نہ ہی مدتوں سے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنی تھیں۔ اب وہ رات بھر اوشا کے خراٹے سنتا تھا اور اوشا اسے نیند میں دنیا بھر کی سیاست کے بارے میں بڑبڑاتے ہوئے سنتی تھی اور دونوں مل کر رات بھر اپنے تین بچوں کا چھینکنا، کھانسنا اور رونا دھونا سنتے تھے۔

کیا ہو گیا ہے ہمیں؟ اس نے سوچا۔ میں اب بھی اوشا سے محبت کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اوشا بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ پھر اب ہم اکٹھے چوپاٹی پر جا کر چاٹ کیوں نہیں کھاتے؟ مہوبے کے خوشبودار پان کیوں نہیں بنواتے؟ مالابار ہل پر جا کر رات کے سناٹے میں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں کیوں نہیں سنتے؟ اور ابھی وہ اپنی زندگی کے اس سب سے اہم سوال کا جواب نہیں سوچ پایا تھا کہ اس نے دیکھا، نیچے پھیلے ہوئے شہر نے گھومنا بند کر دیا ہے۔ اب ایئرپورٹ کی نیلی پیلی، لال روشنیاں تیزی سے اوپر کی طرف اٹھ رہی ہیں اور پل بھر کے لیے اسے ایسا لگا کہ اس کا ہوائی جہاز ان روشنیوں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور وہ سب بلور کی کرچیوں کی طرح ستارے بن کر اندھیرے آسمان میں بکھر جائیں گے۔

ایک جھٹکے کے ساتھ بریک لگے اور ہوائی جہاز تھرتھراتا ہوا ٹھہر گیا۔

سیٹ کی پیٹی سے اپنے آپ کو آزاد کرتے ہوئے ارجن نے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف مڑ کر کہا، لیجیے آ گیا بمبئی! اب ڈٹ کر سیر کیجیے۔ مگر اسے کوئی جواب نہ ملا اور اب اس نے

دیکھا کہ بوڑھے کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، مگر اس کی گردن ایک عجیب، بھیانک اور بے جان انداز سے ایک طرف ڈھلکی ہوئی ہے۔

دوسری طرف اس کے برابر کی سیٹ سے ایک پتلی مونچھوں والا نوجوان، اپنے ایئر بیگ کو جھلاتا ہوا اٹھا اور اس نے جھک کر اس بوڑھے کو جھنجوڑا، ارے اٹھو مسٹر اور جب اسے کوئی بھی جواب نہ ملا، تو وہ کچھ گھبرا سا گیا اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا، اولڈ مین از ڈرنک OLD MAN IS DRUNK بوڑھا پیئی لا ہے۔

دومنٹ کے بعد ائیر پورٹ کے ڈاکٹر نے (جسے ائیر ہوسٹیس نے کیپٹن سے کہہ کر بلایا) سرسری جانچ کرتے ہی کہہ دیا تھا کہ بوڑھا ہارٹ فیل ہو کر مر چکا ہے۔

ارجن نے کہا، بے چارے کی آخری حسرت دل کی دل میں ہی رہ گئی۔

کیا کہا آپ نے؟ پولیس انسپکٹر نے اسے شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، آپ کو ہمارے ساتھ ایئر پورٹ کے تھانے تک چل کر اپنا نام پتہ لکھوانا ہوگا۔ کیا آپ مرنے والے کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟

جی نہیں، صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ مرنے سے پہلے بمبئی دیکھنا چاہتا تھا۔

جو کچھ بھی ہے، آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔

چلیے۔

جب سب مسافر اتر چکے، تو اسٹریچر پر بوڑھے کی لاش کو اتارا گیا۔ اس کے بعد ارجن اپنا پورٹ فولیو لیے ہوئے اترا اور اس کے بعد پولیس انسپکٹر، ڈاکٹر اور ہوائی جہاز کے دونوں پائلٹ۔

سانتا کروز ایئر پورٹ کی ہزاروں روشنیاں اندھیرے میں اپنی نیلی، پیلی، لال آنکھیں چمکا رہی تھیں، جیسے بمبئی آنے والوں کا استقبال کر رہی ہوں، ان کو سیر تماشے کی دعوت دے رہی ہوں۔ مگر ارجن نے اسٹریچر کو اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھ کر سوچا، وہ بوڑھا جس نے عمر بھر بمبئی دیکھنے کا خواب دیکھا تھا، آج رات کی بانھوں میں ہمیشہ کے لیے سو چکا ہے۔

ٹیکسی۔ٹیکسی۔

آوازیں دو بلند ہوئیں، مگر سارے ایئرپورٹ پر ٹیکسی صرف ایک تھی۔

ارجن کا ہوائی جہاز اترا تھا آٹھ بجے، مگر پولیس کے سوال جواب ختم ہوتے ہوتے نو بج گئے۔ اس نے سوچا تھا، دفتر میں نائٹ ڈیوٹی کے لیے جانے سے پہلے ماٹونگا میں اپنے گھر ہوتا جائے گا، نہیں تو اوشا پھر شکایت کرے گی اور ہمیشہ کی طرح چلائے گی۔ تین دن بعد دلّی سے آئے اور ایئرپورٹ سے سیدھے دفتر۔ رپورٹ کیا کل نہیں لکھ سکتے تھے؟ اور پھر اسے سمجھانا پڑے گا کہ اخبار کے کام میں صرف آج ہوتا ہے کل نہیں ہوتا۔ کیونکہ صرف آج کی خبر خبر ہے، اگلے دن وہ مر جاتی ہے، سڑ جاتی ہے اور سڑی ہوئی مچھلی کی طرح بازار میں اس کا کوئی گاہک نہیں ہوتا ہے۔ مگر اب تو یہیں اتنی دیر ہوگئی تھی کہ دس بجے تک دفتر پہنچا بھی تو شاید ہی ایک ڈیڑھ بجے تک اپنی رپورٹ پوری کر پائے۔ اس پر یہ ستم ہوا کہ ایئرپورٹ پر ساری ٹیکسیاں غائب اور ایک ملی بھی تو ایک اور مسافر پہلے سے اس پر قبضہ جمانے کو تیار!

'آپ کو کہاں جانا ہے؟' پوچھنے والا وہی پتلی مونچھوں والا نوجوان تھا، جو ان کے ساتھ ہوائی جہاز میں دلّی سے آیا تھا اور اب دو بھاری سوٹ کیسوں کو ٹیکسی کے پیچھے لدوا رہا تھا۔

'مجھے تو فلورا فاؤنٹین جانا ہے۔ اور آپ کو؟'

میں تو ادھر جوہو پر رہتا ہوں۔ ویری نیئر ہوٹل جل ترنگ۔ میں اتر جاؤں گا، پھر آپ ٹیکسی فورٹ لے جایئے گا۔

ارجن کو ایک انجانے آدمی کے ساتھ ساجھے میں ٹیکسی کرنا بالکل اچھا نہیں لگا، مگر اس وقت اس کے سوا اور کوئی چارا بھی نہیں تھا۔ پتلی مونچھوں والا سانولا نوجوان پیلے چمڑے کا لمبا نوکیلا جوتا پہنے ہوئے تھا۔ اس کی آسمانی رنگ کی پتلون اتنی پتلی موہری کی تھی کہ بالکل چوڑی دار لگتی تھی اور چمڑے کی ہری جیکیٹ کے نیچے گلے میں وہ ایک پنچ رنگی سِلک کا اسکارف باندھے ہوئے تھا۔ نا جانے کیوں، ہوائی جہاز میں بھی اس نوجوان کو دیکھ کر ارجن کو ایسا لگا تھا، جیسے اپنی پتلی مونچھوں سے لے کر نوکیلے پیلے جوتوں تک اس میں ہر طرف آڑی ترچھی، تیز چبھنے والی نوکیں ہی نکلی ہوئی ہوں۔ ٹیکسی میں اس کے برابر بیٹھتے ہوئے وہ بے اختیار ایک طرف کو دروازے سے بالکل سٹ کر بیٹھ گیا، جیسے اسے ڈر ہو کہ پتلی مونچھوں والے کی ہر طرف نکلی نوکوں میں سے کوئی اس کو نہ چبھ جائے۔

ٹیکسی روانہ ہو کر ایئر پورٹ کے کمپاؤنڈ سے باہر نکلی، تو اس نے اپنے ساتھی سے پوچھا، 'تم بھی دہلی سے آئے ہو نا؟ پھر تمھیں اتنی دیر کیوں لگی؟ دوسرے مسافروں کو گئے تو گھنٹہ بھر ہو گیا ہوگا۔'

'ویل، یو سی WELL! YOU SEE،' پتلی مونچھوں والے نوجوان نے کہنا شروع کیا۔ پھر وہ رک گیا۔ پھر سوچ کر بولا، 'یو سی، YOU SEE سامان میں میرا ایک سوٹ کیس ادھر اُدھر ہو گیا تھا۔ اس کی تلاش میں اتنی دیر لگ گئی۔' اور پھر ایک دم قہقہہ مار کر وہ بولا، 'اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔' اور نہ جانے کیوں ارجن کو وہ ہنسی بڑی ہی کھوکھلی اور بناوٹی لگی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ سکے، وہ نوجوان اس سے پوچھ رہا تھا، 'مگر آپ تو بتایئے تھانے میں آپ پر کیا بیتی؟ پولیس والے شریف آدمیوں کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ کہیں آپ پر تو اس بوڑھے کے مرڈر کا چارج نہیں لگا دیا؟'

'نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ پولیس والے مجھے جانتے ہیں۔'

'رئیلی! REALLY پولیس والے تم کو بھی — آئی مین I MEAN تم کو جانتے ہیں؟ کبھی اندر جا چکے ہو؟'

اب جا کر ارجن کی سمجھ میں آیا کہ پتلی مونچھوں والا نوجوان اس کو کوئی چور اچکا سمجھ رہا تھا۔

ہنس کر اس نے جواب دیا، 'نہیں، ایسی کوئی بات نہیں مگر میں رپورٹر ہوں، اس لیے پولیس والوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ دیر تو اور ہی وجہ سے لگی۔'

'وہ کیا؟'

جواب دینے سے پہلے ارجن نے سوچا، پھر بولا، کوئی حرج نہیں، بتائے دیتا ہوں۔ کل سویرے تو سب کچھ پیپر میں آنے والا ہے ہی۔ بات یہ ہے کہ بوڑھے کے پاس جیب میں تیس ہزار روپے تھے۔'

'تیس ہزار روپے!' نوجوان نے بے اختیار سیٹی بجاتے ہوئے دوہرایا، 'تیس ہزار روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ کیا ہزار ہزار روپے کے نوٹ تھے؟'

'ہاں، ہاں، ہزار ہزار روپے کے نوٹ ہی تھے۔ جب بوڑھے نے مجھے ہوائی جہاز میں دکھائے تھے، مگر..... مگر.....'

'مگر کیا'

'مگر تھانے میں جب میں نے انسپکٹر کو یہ بتایا اور لاش کی تلاشی لی گئی تو وہ روپے جیب میں نہیں نکلے۔ بنڈل کا بنڈل غائب ہو گیا۔'

'اوہ بوائے! OH! BOY' نوجوان جوش سے بول اٹھا، 'تیس ہزار روپے۔ اگر ایک بار مجھے اتنا روپیہ مل جائے، تو...... تو...... تو...... مگر وہ تو تو ہی کہتا رہا۔

جیسے بچے سے کوئی پوچھے، بیٹا تمھیں ایک روپیہ دیں، تو تم اس کا کیا کرو گے، ویسے ہی ارجن نے پوچھا، کیوں مسٹر، تمھیں وہ تیس ہزار روپے مل جاتے، تو تم کیا کرتے؟'

اور جیسے بچہ جواب دیتا ہے میں چار آنے کا کوکا کولا پیوں گا، چار آنے کی چاکلیٹ خریدوں گا، آٹھ آنے کی کامکس کی کتاب لوں گا، ویسے ہی نوجوان نے جواب دیا، میں...... میں...... دس سوٹ بنواؤں گا اور ہر سوٹ کے ساتھ اسی رنگ کا ایک جوتا، سلک کی بیس شرٹس سلواؤں گا اور ایک لمبی رپہنگ موٹر کار خریدوں گا۔ اور ایک رات کو اصلی اسکاچ وسکی پیوں گا، خوب پیوں گا، پھر ہوٹل جل ترنگ میں ڈنر کھاؤں گا، لوسی کا گانا سنوں گا پھر اس سے کہوں گا، کم آن، لوسی، اپنی نئی گاڑی میں تمھیں ڈرائیو کرانے لے چلتا ہوں۔ اور وہ کہے گی......'

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ٹیکسی جوہو پر سمندر کے کنارے ہوٹل جل ترنگ کے پاس ایک کالج کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور اتر کر سوٹ کیس اتارتے ہوئے بولا، صاحب، ان بکسوں میں کیا آپ نے پتھر بھر رکھے ہیں؟'

'پتھر ہی سمجھو، ڈرائیور! مگر تم ان کی فکر نہ کرو، تم یہ لو، اور یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی والے کے ہاتھ پر دس روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

'صاحب، میرے پاس چھٹا نہیں ہے۔' ڈرائیور ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ نوجوان فوراً بڑی شان سے بولا، 'کیپ دی چینج KEEP THE CHANGE!' پھر اس نے ارجن سے کہا، تھینک یو مسٹر......'

'ارجن...... ارجن اروڑا...... مگر تمھارا نام کیا ہے، مسٹر......؟'

'میرا نام؟...... نام ہے...... مسٹر...... مسٹر جوزیف۔ گڈ نائٹ!' اور یہ کہہ کر وہ بھاری سوٹ کیسوں کو اٹھا ہی رہا تھا کہ اندر سے ایک دبلی پتلی، سانولی سی سولہ سترہ برس کی لڑکی خوشی سے

چلاتی ہوئی آئی، 'ڈیڈی، مائک آ گیا۔ ڈیڈی مائک آ گیا۔'

جب وہ دوڑتی ہوئی موٹر کی روشنی کے قریب آئی، تو ارجن نے دیکھا کہ اس لڑکی کی بڑی بڑی آنکھیں ہیں اور ان آنکھوں میں اس نوجوان کے لیے بڑی محبت ہے، جس نے اپنا نام جوزیف بتلایا تھا۔

'روزی، یہ کیا بکواس ہے؟ چلو اندر۔' ایک سوٹ کیس اس نوجوان نے اٹھایا اور دوسرا اس لڑکی نے، حالانکہ سوٹ کیس بہت بڑا اور بہت بھاری تھا اور وہ اس بوجھ سے لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔

'گڈ نائٹ!' ارجن نے چلا کر کہا اور پھر ڈرائیور سے بولا، چلو بھائی جلدی کرو، مجھے بہت دور جانا ہے۔'

ٹیکسی ہوٹل جل ترنگ کے پاس سے گذر رہی تھی کہ وہاں سے ڈانس بینڈ کی دھن اور ایک پتلی نازک سی آواز سنائی دی، جو مائکروفون پر ٹوئیٹس کا ایک نیا گیت گا رہی تھی:

'اوہ مائی ڈیئر۔۔۔
کم ہیئر۔۔۔
کم ہیئر۔۔۔
مائی ڈارلنگ!'

اب ڈرائیور نے اس سے کہا، 'یہ جوان بڑا دل والا نکلا صاحب۔ اپنے کو پورا سات روپیہ ٹپ دے دیا۔ مگر یہ ہے کون؟'

'معلوم نہیں کون ہے،' مگر ایک بات معلوم ہو گئی۔ وہ جو بھی ہے، اس کا نام جوزیف نہیں، مائک ہے۔'

'ہیلو، مائک!'
'ہیلو، انکل!'
دلی سے آ گئے؟'
'یس، انکل!'

'سب سامان لے آئے؟'

'یس، انکل۔'

'ایمبیسی میں سب ٹھیک ہے، نا؟'

ایک دم فرسٹ کلاس، انکل۔'

'راستے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟'

'نو انکل۔ ایوری تھنگ نارمل۔' NO UNCLE EVERY THING NORMAL

'گڈ۔ سوٹ کیس کھولو۔'

مائک نے سوٹ کیس کھولے۔ اوپر پرانے کپڑے، موزے، جوتے اور ان کے نیچے وہسکی کی بوتلیں، برانڈی کی بوتلیں، جن کی بوتلیں، شامپین کی بوتلیں۔

انکل ایک پرانا ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے تھا اور اس کی کھچڑی مونچھیں سگار کے دھوئیں سے پیلی پڑ چکی تھیں۔ اب بھی وہ ایک بدبودار سگار پی رہا تھا اور اس کے گہرے سانولے چہرے پر جھریوں کے ساتھ ایک عجیب گہری مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ مگر ان بوتلوں کو دیکھتے ہی اس کی بٹن جیسی چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھڑک اٹھیں اور اس کی جھرّیاں مسکراہٹ کی لکیروں میں تبدیل ہو گئیں۔

'گڈ بوائے۔ ویل ڈن۔ یہ لو۔'

بس تیس روپے؟' مائک نے نوٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے ان کو ایسی نفرت سے دیکھا، جیسے وہ تیس روپے نہ ہوں، تیس نئے پیسے ہوں۔

اور کیا چاہیے، تیس ہزار؟'

دینے والے تیس ہزار بھی دے سکتے ہیں، انکل۔' اور سیٹی بجاتے ہوئے اس نے گلے سے مفلر اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔

'اونہہ۔' انکل نے مائک کی طرف ہنکارا اور پھر آواز دی، روزی۔'

'یس، ڈیڈی۔' وہی دُبلی سی سانولی سی سپاٹ سینے والی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کا نام روزی ضرور تھا، مگر وہ ایک ایسا گلاب تھی، جو کھلنے سے پہلے مرجھا گیا تھا۔ تمھارے لیے چائے

بتاؤں مائک؟ اس نے پتلی مونچھوں والے جوان کو پکارا، جو کونے میں لگے ہوئے واش بیسن پر منہ دھو رہا تھا۔

'نو، تھینک یو، روزی۔ یہ چائے کا وقت نہیں ہے۔' اس نے بے دلی سے جواب دیا اور روزی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

'روزی، چائے کا پانی تیار ہے؟'

'یس، ڈیڈی۔'

چھلنی میں چھانا ہے، نا؟ کوئی پتی تو نہیں رہ گئی؟'

'نو، ڈیڈی۔'

'گڈ گرل! اب یہ بوتلیں اٹھا کر میرے کمرے میں لے جاؤ اور انجکشن کی سیرنج نکال کر رکھو۔'

'یس، ڈیڈی۔' مگر روزی کی بڑی بڑی کالی آنکھیں برابر مائک کی طرف جمی ہوئی تھیں جو اب تولیئے سے منہ پونچھ رہا تھا۔

روزی بوتلیں اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئی، تو انکل نے کہا، 'مائک، آج چھ بوتلیں کارمائیکل روڈ پہنچانی ہیں۔ ٹیکسی کر لینا، کرائے کے پندرہ روپے اوپر سے ملیں گے۔'

'پندرہ روپے؟' مائک نے حقارت سے دوہرایا۔

'پندرہ روپے کم ہوتے ہیں، یو فول؟ YOU FOOL' انکل نے چلا کر کہا، 'یہاں سے کارمائیکل روڈ تک ٹیکسی میں جانے کے لیے؟ تیرا باپ دن بھر مچھلی پکڑتا ہے، تب چار پانچ روپے کماتا ہے۔ اور بھول گیا، جس گیراج میں تو میکینک تھا، وہاں تجھے کیا ملتا تھا؟ مہینے پیچھے ایک سو بیس روپے۔ اور میں تجھے ہر تیسرے دن ہوائی جہاز میں دلی بھیجتا ہوں، ہر بار تیس تیس چالیس چالیس روپے دیتا ہوں۔ یہاں پر پندرہ بیس روپے کمانے کا چانس دیتا ہوں اور تو 'نا' بولتا ہے.....'

مگر مائک پر اس لیکچر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے انکل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، سوری انکل، میں نہیں جا سکتا۔ آئی ہیو اے ڈیٹ ود لوسی I HAVE A DATE WITH LOUSIE مجھے لوسی سے ملنا ہے۔'

'لوسی! مائی ڈیئر بوائے، اس گولڈ ڈگر GOLD DIGGER دولت کی لالچی لڑکی کے پیچھے

کیوں اپنا وقت خراب کرتے ہو؟ اس کے پیچھے تو کتنے ہی پرنس اور لکھ پتی اور بزنس مین گھوم رہے ہیں۔ وہ تو تیری طرف دیکھے گی بھی نہیں۔'

'دیکھا جائے گا، انکل، دیکھا جائے گا۔' یہ کہہ کر اس نے قمیض اتار کر دوسرے کپڑے بدلنے شروع کر دیئے اور انکل ہنکارتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سیٹی بجاتے ہوئے مائک ٹائی کی گانٹھ باندھ رہا تھا کہ روزی واپس آ گئی۔ اب وہ میلی فراک کے بجائے ایک دُھلا ہوا گلابی پھولوں والی چھینٹ کا فراک پہنے تھی اور اس کے سیدھے کنگھی کیے بالوں میں ایک گلابی ربن لگا ہوا تھا۔

'مائک'۔

'یس'۔

'لک ایٹ می LOOK AT ME ۔ میری طرف دیکھو نا، میں کیسی لگتی ہوں؟'

مائک نے کوٹ پہنتے ہوئے گھوم کر دیکھا اور کہا، 'بہت اچھی لگتی ہو، روزی۔ کیوں، کہیں جا رہی ہو۔ ہیو یو گاٹ اے ڈیٹ؟ HAVE YOU GOT A DATE'

'ہاں، مائک۔ تمھارے ساتھ۔'

'مگر میں تو جل ترنگ ہوٹل میں جا رہا ہوں۔'

'مجھے بھی لے چلو نا مائک! میں تمھارے ساتھ ڈانس کرنا چاہتی ہوں۔ مائک پلیز۔' اس کی زبان پر التجا تھی اور اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں مایوسی کے آنسو تھے۔

'روزی، آئی ایم ساری، مجھے معاف کرو۔ مجھے لوسی سے ملنا ہے۔' اور یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

روزی اس کو روکنے کے لیے دروازے تک دوڑی، مگر مائک جا چکا تھا۔ باہر صرف سناٹا تھا اور اندھیرا۔۔ اور سمندر کی لہروں کا شور، جو ایک بے زور دساحل پر اپنا سر پٹک رہی تھی۔

کارمائیکل روڈ پر نئی بنی ہوئی گلستان بلڈنگ کی ساتویں منزل پر جمبو پٹیل کا پورا فلیٹ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ اس لیے بند دروازوں میں سے سمندر کی لہروں کا شور اندر نہیں آ سکتا ہے مگر بڑے

بڑے شیشوں کی کھڑکیوں میں سے ہر طرف شہر کی روشنیاں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

'لُک مائی ڈیئر' گلوری ایڈ دانا ئزرس کے ٹوٹو لال کا کا نے اس بہانے سے بیبی منیر بھائی کے سلیولیس بلاؤز سے نکلے ہوئے گدرائے ہوئے بازو کو چھوتے ہوئے کہا، 'اس کھڑکی سے کتنا خوبصورت نظارا نظر آتا ہے۔ بائیں ہاتھ کو مہالکشمی مندر ہیں، جس کے کلس پر لائٹ لگی ہوئی ہے اور اس سے آگے ہی سمندر سے گھرا ہوا حاجی علی کا مزار ہے۔'

'نیشنل انٹی گریشن'، ایک آواز ان کے پیچھے سے سنائی دی۔ انھوں نے چونک کر مڑ کر دیکھا، تو گنجا چاچا چتّی لال وہسکی کا گلاس ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ چاچا چتّی لال کسی زمانے میں وام پنتھی سیاسی تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے، مگر اب وہ اسٹاک ایکس چینج میں شیئروں کی دلالی کرتا ہے۔ مگر اب بھی ہر پارٹی میں وہسکی کے چوتھے پیگ کے بعد وہ اچھے انداز میں بات چیت کرتا ہے۔

قومی یک جہتی کی سب سے اچھی اور روشن مثال کیا ہو سکتی ہے۔ ایک طرف مندر ہے، دوسری طرف مسجد ہے، مزار ہے۔ اس سے آگے بڑھیے، تو مہالکشمی مندر یعنی مہالکشمی کا ریس کورس۔ اس کے پیچھے جو روشنیاں آپ کو نظر آرہی ہیں وہ کپڑے کی ملیں ہیں، جو اس وقت رات کو بھی چل رہی ہیں، جہاں اتنا نفیس اور مہنگا کپڑا بنایا جاتا ہے کہ جسے خود اسے بنانے والے مزدور نہیں خرید سکتے اور ان ملوں کے پیچھے چَپل کی وہ چالیں ہیں، جہاں اس فلیٹ کے باتھ روم سے بھی چھوٹی چھوٹی کھولیوں میں ان مزدوروں کی بیویاں، اپنے شوہروں کا رات کی 'پالی' سے لوٹنے کا انتظار کر رہی ہیں اور ادھر ریس کورس سے دوسری طرف گندے نالے کے کنارے وہ جھونپڑیاں ہیں، جو بیسویں صدی میں بھی ہمیں اس پرانے زمانے کی یاد دلاتی ہیں، جب انسان نے اینٹ پتھر، سیمنٹ لکڑی اور لوہے کے گھر بنانا نہیں سیکھا تھا، مگر یہ سب اس ایئر کنڈیشنڈ فلیٹ کے باہر ہے۔ یہاں شیشے کی ان بند کھڑکیوں کے پیچھے نہ مسجد کی آواز سنی جا سکتی ہے، نہ مندر کی آرتی اور نہ ملوں کی گڑگڑاہٹ اور نہ پھولوں سے مہکتے ہوئے اس فلیٹ سے اس گندے نالے کی بدبو آسکتی ہے۔ ہم محفوظ ہیں۔ آؤ، یہ جام اس سیکورٹی کے نام پر پئیں۔ جلدی پیو، کیونکہ ہمارے بچاؤ کے لیے صرف شیشے کی یہ دیواریں ہیں اور کون جانتا ہے کہ اب دیوانے اپنے پتھروں سے اس کانچ کے قلعے کو توڑ ڈالیں۔ ہیئر از ٹو یور HERE IS TO YOUR مگر گئے کہاں تم لوگ؟'

اور جب چاچا چمّی لال نے دیکھا کہ ٹوٹو اور میمی دونوں موقع پا کر وہاں سے کھسک گئے ہیں اور وہ کھڑکی کے سامنے اکیلا کھڑا اپنی تقریر کر رہا ہے، 'اچھا تو ہم اکیلے ہی تمھارا جام صحت پیتے ہیں۔' اور پانچواں پیگ بھی حلق میں انڈیل دیا گیا۔

'سر' ایک میٹھی، سریلی سی آواز آئی۔

پانچ پیگ وہسکی کے گلابی دھندلکے میں سے چاچا چمّی لال نے دیکھا، ایک غیر ملکی جوان عورت اس کی طرف آ رہی ہے۔

کیا میں اپنا تعارف کرا سکتی ہوں۔ میں کیرول اسمتھ ہوں، مسز کیرول اسمتھ! کل ہی امریکہ سے آئی ہوں۔ مسٹر پٹیل سے میری ملاقات نیویارک میں ہوئی تھی، جہاں وہ اپنے نئے ہوٹل کے لیے سامان خریدنے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے اس ہاؤس وارمنگ پارٹی میں بلا تو لیا ہے، مگر وہ اور مسز پٹیل گرہ پرویش میں اتنے منہمک ہیں اور وہاں اتنی بھیڑ ہے کہ ابھی تک کسی نے کسی سے تعارف تک نہیں کرایا۔'

چاچا چمّی لال نے اپنے چہرے پر گمبھیر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے جواب دیا، 'مائی ڈیئر مسز اسمتھ، یہ کام میں بڑی خوشی سے کر سکتا ہوں۔ پہلے تو اپنا تعارف کرادوں۔ میں ہوں چمّی لال۔ سب مجھے چاچا چمّی لال کہتے ہیں۔'

'تو آپ چاچا ڈانس بہت اچھا کرتے ہوں گے؟'

'نو، مائی ڈیئر! وہ 'چاچا' نہیں۔ ہندوستانی میں چاچا انکل کو کہتے ہیں۔ تم بھی مجھے انکل کہہ سکتی ہو۔'

'تھینک یو، انکل! مجھے بتایئے، یہ لوگ، جو یہاں اکٹھے ہیں، کون کون ہیں؟'

'او کے، مائی ڈیئر! اپنے میزبان کو تو تم جانتی ہی ہو۔ اس کا اصلی نام جسونت ہے، مگر اس کے موٹاپے کی وجہ سے اس کے سب دوست اسے جمبو کہتے ہیں۔ یہ فلیٹ اس نے ابھی خریدا ہے، ڈیڑھ لاکھ کا، جس میں سے پچاس ہزار بلیک دیئے گئے ہیں۔ یہ پارٹی اسی خوشی میں دی جا رہی ہے۔ اچھا، تو جمبو اور اس کی بیوی شمی پٹیل کو تو تم جانتی ہی ہو۔ وہ لمبا گورا اور تنگڑا آدمی، جوان

سے بات کر رہا ہے، لالہ للوانی بلڈنگ کنٹریکٹر ہے، جس نے یہ بلڈنگ بنوائی ہے اور جس کی جیب میں بلیک کی دو لاکھ پچاس ہزار روپے کی رقم گئی ہے۔ اس لیے آج اس کے چہرے پر اتنی رونق ہے۔ اس کے ساتھ جو چھوٹے سے قد کی سانولی سی لڑکی شامپین پی رہی ہے، وہ فی فکر یا ہے، جو عورتوں کے ماہانہ رسالہ 'مہارانی' کی اسسٹنٹ ایڈیٹر ہے اور کہا جاتا ہے للوانی نے اس کے لیے بھی ایک فلیٹ بنوایا ہے مگر اس کی قیمت کا حساب کتاب دل ہی دل میں ہو رہا ہے۔ ان کے پیچھے بار کا سہارا لیے جو لوگ کھڑے ہیں، ان میں وہ جو کالے بالوں والی خوبصورت سی لڑکی ہے، وہ چھوٹا شاہپور کی مہارانی شیلا دیوی ہے، جو ایک خوبصورت بیوہ ہے، جس کی بیٹی کی شادی پچھلے برس ہوئی ہے۔ مگر وہ ہر تیسرے برس تمہارے دیش امریکہ جاتی ہے اور وہاں فیس لفٹنگ کرنے والے ڈاکٹر نہ جانے کیا جادو کرتے ہیں کہ وہ پہلے سے بھی جوان اور خوبصورت ہو کر لوٹ آتی ہے۔ اس کے پاس جو بھورے بالوں والا جو نوجوان بات کر رہا ہے، وہ ایک انگریز فلم ڈائریکٹر ہے، جو مہارانی پر بری طرح عاشق ہے اور ہر مہینے اس سے شادی 'پروپوز' کرتا رہتا ہے اور اس کے برابر میں جو گھنگھرالے بالوں والا نوجوان ہے، وہ کوئی نوجوان نہیں ہے، پچپن برس کا فلم ایکٹر ہے، جو میری ہی طرح گنجا ہے۔ اس کے گھنگھرالے بال اصلی نہیں ہیں۔ نقلی بالوں کی 'وگ' ہے، جس کو روز ایک ہیئر ڈریسر پانچ کلپ لگا کر 'کرل' بناتی ہے اور اس کے برابر ہے...

مگر ابھی چاچا جی لال یہیں تک پہنچے تھے کہ بار کی طرف سے ایک آواز آئی، 'لیڈیز اینڈ جینٹل مین، وہسکی ختم ہو گئی ہے۔ اب آپ لوگ ریفریجریٹر کا ٹھنڈا پانی پی سکتے ہیں۔'

'شیم شیم۔' SHAME-SHAME چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔ اور جمو پٹیل دوڑتا ہوا بار کی طرف گیا۔ اس کا چہرہ شرم اور غصے اور چھ پیگ وہسکی کے نشے سے لال ہو رہا تھا۔ 'ٹی ٹو، تم کیا بک رہے ہو؟ میں نے پوری درجن بھر بوتلوں کا انتظام کیا تھا۔'

'ہائی ڈیئر جمو، بارہ بوتلیں وہسکی کی ضرور یہاں تھیں۔ دو بوتلیں جن کی، ایک برانڈی کی اور تین بوتلیں شامپین کی بھی تھیں مگر سب ختم ہو گئیں۔ مہمان تم نے زیادہ بلا لیے اس لیے شراب کم پڑ گئی۔ کوئی بات نہیں ہے، میں اپنے بوٹ لیگر کو فون کر دیتا ہوں..... اس کے یہاں اپنا

کریڈٹ کھاتا چلتا ہے۔'

'ٹی نو، تم میری اِنسلٹ کرنا چاہتے ہو مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسکاچ کی چھ ایکسٹرا بوتلوں کے لیے پہلے سے کہہ رکھا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آج ہی دہلی کے ایوننگ پلین سے اسٹاک آنے والا ہے۔'

سندر کمار نے اپنی 'وگ' کے نقلی بالوں کو ایک فلم اسٹاری انداز کا جھٹکا دیتے ہوئے کہا: 'جبو ڈارلنگ، تمھارا دلّی کا پلین تھوڑا لیٹ ہو گیا ہے۔'

اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔

مگر مینو ٹیکم داس نے کہا، 'پلین کو کیوں دوش دیتے ہو، یار۔ اسی ایوننگ پلین سے تو میں دلّی سے آیا ہوں۔ ہاں، اس پلین میں ایک بڈھا ہارٹ فیل ہو کر مر گیا۔ کہیں وہی تو جبو کا بوٹ لیگر نہیں تھا؟'

ایک بار پھر سب کو ہنسی کا دورا پڑا۔

اور اب چاچا چمّی لال نے فقرہ کسا، 'جبو پیارے، وہسکی وداؤٹ سوڈا WITHOUT SODA نہیں تو سوڈا اوداؤٹ وہسکی SODA WITHOUT WHISKY ہی پلا دو۔ پیاس کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔'

اس پر اور بھی زور کا قہقہہ پڑا۔ اور ہر طرف سے جبو پر بوچھار ہونے لگی، 'شراب بندی کا نام سنا تھا، مگر دیکھا آج ہے۔'

'گورنمنٹ کو چاہیے جبو کو 'پروہی بیشن' PROHIBATION پولیس کا انچارج بنا دے۔'

'پہلے اناج کی راشننگ تھی، پھر دودھ کی راشننگ ہوئی۔ اب جبو نے وہسکی کی راشننگ بھی کر دی۔'

جبو غصے کے مارے کانپ رہا تھا مگر اس سے کوئی جواب نہ بن پڑ رہا تھا۔ آخر اس کی بیوی نے کہا، 'ڈارلنگ، اپنے بوٹ لیگر کو فون تو کرو۔ آخر اتنی دیر کیسے ہو گئی؟'

جبو دوڑ کر فون کے سامنے گیا۔ کانپتی ہوئی انگلیوں سے نمبر ملایا، 'ہیلو، انکل ڈی سوزا، میں جبو بول رہا ہوں۔ کہاں ہیں وہ چھ بوتلیں وہسکی کی؟ تمھاری وجہ سے آج میری سخت انسلٹ

ہوئی..... تمھارا بھتیجہ چلا گیا، تو میں کیا کروں؟..... تمھیں خود آنا چاہیے تھا یا کسی اور کو بھیجتے۔ کیا کہا؟ بوتلیں بھیجی ہیں۔..... اب پہنچتی ہی ہوں گی۔..... او کے تھینک گاڈ۔' اس نے فون رکھا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

نوکر سے پہلے جبو خود وہاں پہنچا۔ دروازہ کھولا، تو دیکھا ایک دبلی سی، سانولی سی سپاٹ سینے کی لڑکی، گلابی پھولدار فراک پہنے کھڑی ہے اور اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک بیگ ہے۔

'سر، مسٹر پٹیل کا فلیٹ یہی ہے نا؟ مجھے انکل ڈی سوزا نے..... میرا مطلب ہے، ڈیڈی نے.....'

وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ جبو نے اسے تھیلے سمیت اندر گھسیٹ لیا اور گھسیٹتا ہوا ہال میں لے گیا۔

'لیڈیز اینڈ جینٹل مین! وہسکی آگئی ہے اور انکل ڈی سوزا نے خود اپنی بیٹی کے ہاتھ بھیجی ہے۔ تھری چیئرس فار مس..... مس.....'

'روزی۔'

'تھری چیئرس فار مس روزی ڈی سوزا۔'

'ہپ ہپ.....'

ہُرّا۔

چاچا چٹنی لال نے روزی کو سر سے پیر تک اپنی نشیلی آنکھوں سے دیکھا اور پھر بے تکلفی سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا 'روزی، یو آر اے لائف سیور YOU ARE A LIFE SAVER! تم نے ہماری جان اور جبو کی عزت بچالی۔' اور یہ کہہ کر اس کو دبوچ کر پیار کر لیا۔

اور تو تو چلایا، جیسے کسی بچے کے ہاتھ میں ایک نیا کھلونا آگیا ہو، 'چاچا چٹنی لال، دیٹ از اے گڈ آئیڈیا۔'

'سر..... سر'، روزی ہکلاتی رہی، مگر کسی نے اس کی نہیں سنی۔

ایک طرف وہسکی کی بوتلیں کھلتی رہیں، گلاس بھرے جاتے رہے، سوڈے سے جھاگ ابھرتے رہے۔ دوسری طرف ہر شخص، روزی کو باری باری، بے تکلفی سے چومتا رہا۔

وہ، جو گھوڑ دوڑ اور رمی اور فلیش سے اُکتا گئے تھے، ان کے لیے یہ ایک نیا کھیل تھا۔

کسی نے کہا، 'روزی ڈارلنگ کو بھی وہسکی پلاؤ'
پہلا گلاس کسی نے اسے زبردستی پلایا۔ اسے ایسا لگا، جیسے کسی نے اس کا گلا چاقو سے چیر دیا ہو۔ مگر اگلے لمحے میں اس کے سارے جسم میں گرمی کی ایک عجیب لہر دوڑ گئی۔

دوسرا اس نے بغیر زبردستی کے پی لیا۔

تیسرا گلاس اس نے مانگ کر پی لیا۔

اس کے بعد وہ گنتی بھول گئی۔

کسی نے ریڈیوگرام پر ریکارڈ لگا دیا۔ اب سب ناچ رہے تھے۔

روزی کو بھی باری باری سب کے ساتھ ناچنا پڑ رہا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا، ساری دنیا گھوم رہی تھی۔

ہال کی ساری روشنیاں اب سنگیت کی لہروں پر ناچ رہی تھیں۔

وہسکی کی ساری بوتلیں ناچ رہی تھیں۔

روزی کی رگوں میں خون ناچ رہا تھا، گا رہا تھا۔

پھر نا جانے کب اور کیسے وہ ڈانس فلور پر نہیں، بیڈروم میں تھی اور عین اس کے سر کے اوپر چھت میں لگا ہوا ایک بجلی کا بلب گھوم رہا تھا، ناچ رہا تھا۔ پھر گھومتا گھومتا وہ بلب بجھ گیا۔ اب صرف اندھیرا تھا اور رات تھی، اور رات کی مضبوط اور سخت بانہیں تھیں، جو روزی کے جسم کو لوہے کے ایک شکنجے میں کس رہی تھیں۔ روزی، جو اس بے ہوشی میں بھی بڑبڑائے جا رہی تھی، سر سر اور وہسکی سے ڈوبی ایک سانس اس کے ہونٹوں کے قریب قریب آتی جا رہی تھی...... قریب اور قریب یہاں تک کہ اس کا دم گھٹ گیا اور وہ ایک برداشت کے باہر تکلیف کے اندھیرے سمندر میں ڈوب گئی اور اس کی چیتنا کی گہرائیوں سے صرف ایک شبد نکلا، 'ماتک'

اور ایئر کنڈیشنڈ فلیٹ کے باہر سمندر رات کے سنگ دل ساحل پر اپنا سر پٹکتا رہا پٹکتا رہا۔

سمندر کی لہریں بھی ہوٹل جل ترنگ کے ڈانس بینڈ کی دھن پر ناچ رہی تھیں۔
اوپن ایئر ڈانس فلور پر جوڑے ناچ رہے تھے۔ اور لوگ چاروں طرف اپنی اپنی میزوں

کے گرد بیٹھے چائے دانیوں میں سے وہسکی ڈال کر چائے کی پیالیوں میں پی رہے تھے۔

باہر ہوٹل کے پورٹیکو کے نیچے ان کی شاندار لمبی چوڑی موٹریں کھڑی تھیں۔

'یہ موٹر کس کی ہے؟' ایک نیچی لمبی ٹو سیٹر ریسنگ کار کی طرف اشارا کرتے ہوئے مائنک نے پوچھا۔

دربان نے کہا، 'یہ موٹر نواب صاحب چلن پور کی ہے۔'

اور دو منٹ بعد مائنک نواب صاحب چلن پور کو اپنا تعارف دے رہا تھا، 'آئی ایم مائیکل ڈی سوزا، یور ہائینس۔'

'بیٹھیے، مسٹر ڈی سوزا۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'

'کیا مجھے اپنی موٹر بیچ سکتے ہیں؟'

'پاگل ہوئے ہو! میں اپنی موٹر کیوں بیچنے لگا؟'

'تو مجھے افسوس ہے۔' اور پھر وہ چلایا۔ 'بوائے' اور اب بیرا بھاگا ہوا آیا، نواب صاحب کا بل لاؤ، جلدی۔'

'دیکھو مسٹر۔ تم کون ہو؟ اور تمھیں میرا بل دینے کی اجازت کس نے دی؟'

اتنے میں بیرا بل لے کر آ گیا۔ 'ساٹھ روپے ہوئے ہیں، صاحب۔'

'یہ لو!' اس سے پہلے کہ نواب صاحب اسے روک سکتے، مائنک نے بٹوے میں سے ہزار کا نوٹ نکالا اور ٹرے میں پھینک دیا۔

'مگر سر، یہ تو ہزار کا نوٹ ہے۔'

'تو کیا ہوا؟'

'اس کا چینج اس وقت ملنا مشکل ہے، صاحب۔ کوئی چھوٹا نوٹ نہیں ہے؟'

'دیکھتا ہوں۔' اور یہ کہہ کر مائنک نے لاپروائی سے بٹوا کھولا اور اس میں سے ہزار ہزار کے نوٹوں کا پلندہ نکال کر میز پر ڈال دیا۔

'سوری، کوئی چھوٹا نوٹ ہے ہی نہیں مگر کوئی بات نہیں۔ میں چینج کل لے لوں گا۔ نوٹ تم رکھو...... اچھا تو نواب صاحب، اجازت ہے۔'

'بیٹھو مسٹر ڈی سوزا۔' اب نواب صاحب کا لہجہ بدل چکا تھا۔ 'تم میری موٹر کیوں خریدنا چاہتے ہو اور وہ بھی یہاں، اس وقت؟'

'یہ محبت کا معاملہ ہے، شاید آپ نہیں سمجھیں گے۔ مگر موٹر مجھے چاہیے اور اسی وقت۔ بولیے، کیا لیں گے آپ؟'

'بھئی، بیس ہزار کی تو میں نے لی تھی۔'

'تو لیجئے بیس ہزار۔'

اور اس نے بیس نوٹ گن کر سامنے رکھ دیے۔ نواب صاحب نے وہ موٹر سیکنڈ ہینڈ چودہ ہزار کی لی تھی۔ مسکرا کر انھوں نے نوٹ اٹھا لیے۔

'رسید لکھئے کہ موٹر کی پوری قیمت وصول پائی۔'

نواب صاب نے رسید پر دستخط کر دیے۔

'گڈ نائٹ، یور ہائینس۔ تھینک یو۔'

'تھینک یو، مسٹر ڈی سوزا۔' نواب صاحب نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے جواب دیا، گڈ نائٹ۔'

اور اسی وقت بینڈ کی دھن بدلی، ڈانس فلور خالی ہو گیا، روشنی کا دائرہ لوی پر پڑا، جو مائکروفون کے پاس کھڑی تھی۔ سارا ہوٹل تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔

اناؤنسر نے کہا، 'ہوٹل بند ہونے سے پہلے مس لوی اپنا آخری گیت پیش کریں گی۔' چاروں طرف سے آوازیں آئیں، 'اوہ مائی ڈیئر! اوہ مائی ڈیئر!' لوی نے مسکرا کر اپنی سریلی نکھرے والی آواز میں گانا شروع کیا۔

وہ صرف زبان سے ہی نہیں، اپنے کسے ہوئے جسم کے انگ انگ سے گاتی تھی۔ ہاتھوں کے اشارے سے، آنکھوں کی چتونوں سے، سینے کے اتار چڑھاؤ سے، کولہوں کے مٹکاؤ سے۔

اوہ مائی ڈیئر!

اوہ مائی ڈیئر!

کم ہیئر!

کم نیئر!

اوہ مائی ڈارلنگ......

یہ گانا نہیں، ایک اشارہ تھا، ایک دعوت تھی، ایک وعدہ تھا۔ اور جس ادا سے وہ اسے گاتی تھی، سننے والوں اور دیکھنے والوں میں ہر ایک کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ گانا اسی کے لیے، صرف اسی کے لیے گایا جارہا ہے۔

اور جب وہ اپنے ڈریسنگ روم میں پہنچی، تو وہاں (پھولوں) کے آدھا درجن گلدستے اور کارڈ موجود تھے۔

بڑی بناوٹی لاپروائی سے اس نے کارڈ اٹھا کر پڑھنے شروع کیے۔

'نواب صاحب چلن پور۔'

'مسٹر مول چند جوہری۔'

'ٹھاکر پورن سنگھ۔'

'مسٹر بومن جی کلاک والا۔'

'مسٹر پیٹر سیمسن۔'

'مسٹر مائکل ڈی سوزا۔'

آخری کارڈ پڑھ کر وہ بگڑ گئی اور اپنی آیا سے بولی، 'یہ لوفر پھر آ گیا یہاں۔ کس نے اجازت دی اسے؟'

'لوسی ڈارلنگ!' اپنی آواز کے ساتھ ہی مائکل کمرے میں گھس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں وہسکی کی دو بوتلیں تھیں، 'مجھے تمھارے سوا بھلا کس کی اجازت کی ضرورت ہے۔ میں تو تمھیں تمھارے گھر تک پہنچانے کے لیے آیا ہوں۔ جوہو سے بانکلا تک تم اکیلی کیسے جا سکتی ہو۔'

'میں ٹیکسی میں نہیں جاؤں گی۔ میں آج نواب صاحب چلن پور کے ساتھ جاؤں گی۔'

'تب تو ٹیکسی میں ہی جانا پڑے گا۔'

'کیا مطلب؟ نواب صاحب کے پاس تو بڑی خوبصورت موٹر ہے۔'

'مطلب یہ ہے کہ وہ موٹر اب نواب صاحب کی نہیں، میری ہے۔ آیا، جاؤ، سب سے کہہ دو، لوسی میم صاحب ڈی سوزا صاحب کے ساتھ جائیں گی۔ سب لوگ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر جائیں۔ اور یہ لو، دو گلاس لاؤ اور سوڈے کی چار بوتلیں۔'

آیا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ 'سر سر، یہ تو ہزار روپے کا نوٹ ہے۔'

'مائیکل ڈارلنگ،' لوسی نے بڑی میٹھی آواز میں کہا، 'یہ سب تم کیا کہہ رہے ہو؟ میرا تو سر گھوم رہا ہے۔'

جواب میں مائیکل نے اس کے گانے کے الفاظ ہی دوہرا دیے:

'اوہ مائی ڈیئر!

کم ہیئر!

کم نیئر!

کم نیئر.....'

ارجن نے دو بجے کے قریب اپنی رپورٹ نیوز ایڈیٹر کو دی، تو پوچھا، 'کہیے، شہر کی کیا خبریں ہیں؟'

نیوز ایڈیٹر نے لوکل نیوز کی رپورٹوں پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا، 'کوئی خاص خبر نہیں۔ سچ پوچھو، تو بمبئی میں آج کل کوئی سنسنی ہوتی ہی نہیں۔ ایک تو بوڑھے کی موت کی خبر ہے، جو ہارٹ فیل ہو کر پلین میں مر گیا۔ وہ رپورٹ تو تم نے لکھی ہے۔ سیوری کی جھونپڑیوں میں ایک شکی شوہر نے اپنی بیوی کی ناک کاٹ لی۔ پریل کی ایک مل میں نائٹ شفٹ میں ایک مزدور اونگھ گیا اور اس کا ہاتھ مشین میں آ کر کٹ گیا۔ اور بس! گورنر کے سامنے مس رجنی والا کا ڈانس ڈرامہ 'شکنتلا' ہوا۔ کرشی منتری نے چیمبر آف کامرس کے سالانہ ڈنر میں بھاشن دیتے ہوئے اناج کے تاجروں کی ملک کی خدمات کو سراہا۔ تاج محل ہوٹل میں پنجراپول کی مدد کے لیے ایک فینسی ڈریس ڈانس ہوا۔ بس اور کچھ نہیں۔ رات کو بمبئی میں ہوتا ہی کچھ نہیں۔ بے جان شہر ہے۔ ایک ڈیڈ سٹی۔' DEAD CITY

'ڈیڈ سٹی۔' روزی نے سوچا، شہر بھی مر گیا ہے اور میں بھی مر گئی ہوں۔ یہ سڑکوں کی روشنیاں

نہیں ہیں، ان بھوتوں کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہیں جو قبرستانوں اور شمشانوں میں منڈلاتے رہتے ہیں۔'

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس کو ٹھوکر لگی۔ ٹھٹھک کر دیکھا، تو وہ سہم گئی۔ میلوں تک لاشوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ مرد، عورتیں، بچے سب فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے تھے۔ ساکت، بے جان، مردہ، نہ جانے کس جنگ میں یہ مارے گئے تھے کہ آج تک بے گور و کفن آسمان کے نیچے پڑے تھے۔ ڈرتی ڈرتی وہ ان سب لاشوں کے پاس سے گذر کر سڑک کے بیچ میں آ گئی۔

ایک موٹر آنکھیں چمکاتی ہوئی اس کی طرف آئی اور سن سے اس کے پاس سے گذر گئی۔

پھر پیچھے سے ایک اور کار ہارن کی آواز کرتی ہوئی آئی اور اس کے اتنے قریب سے گذر گئی کہ روزی کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہوا کا جھونکا اس کی روح کو بھی اڑا کر لے گیا۔

مگر اب سامنے سے کیا آ رہا تھا؟ روشنی کی دو لمبی انگلیاں تھیں، جو سردی کی رات کی دھند کو چیرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ 'نہیں نہیں' روزی نے سوچا، یہ موٹر کی روشنیاں نہیں ہیں۔ یہ رات کی نورانی بانہیں ہیں، جو مجھے اپنی نرم گود میں لینے کے لیے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان بانھوں ہی میں میری زندگی ہے، میری موت ہے، میری آزادی ہے۔' اس نے بھی اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور اسی لمحہ آسمان کے سب چاند ستارے آپس میں ٹکرا گئے اور ساری مخلوق میں اس کے بلوری ذرّے بکھر گئے۔

'ڈرائیور، ٹیکسی روکو!' ٹیکسی حاجی علی کے موڑ سے ورلی کی طرف جا رہی تھی کہ ارجن نے چلا کر اسے رکوایا۔ بریک لگتے ہی وہ کودا۔ نہ جانے کیوں اس کو ایک دم یہ محسوس ہو رہا تھا کہ موٹر کے اس حادثہ سے خود اس کا بھی کوئی گہرا رشتہ ہے۔

موٹر کے شیشوں کی کرچیں دور تک سڑک پر پھیلی ہوئی تھیں۔ موٹر سڑک چھوڑ کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی تھی اور ایک بجلی کے کھمبے سے گلے مل رہی تھی۔ دو پہیئے زمین پر تھے اور دو ہوا میں۔ ایک پہیہ اب بھی گھوم رہا تھا اور اس میں لتھڑا ہوا خون بوند بوند کر کے فٹ پاتھ کے پتھروں پر گر رہا تھا۔

پاس ہی پولس کا ایک سپاہی پہرا دے رہا تھا۔

'کیوں حوالدار، کیا ہوا؟'

'بارہ آدمی مارے گئے، صاحب۔'

'بارہ؟ اتنی چھوٹی سی موٹر میں بارہ آدمی بھرے ہوئے تھے؟'

'نہیں صاحب، موٹر میں تو صرف دو تھے۔ ایک صاحب، ایک میم۔ بڑی سندر میم تھی، صاحب۔ انسپکٹر صاحب بولتے ہیں، کسی ہوٹل میں گاتی تھی۔'

ارجن نے کہا، 'لوسی۔'

'ہاں صاحب، ایسا ہی نام بولے تھے۔ پر صاحب ایک دم پیئے ہوئے تھا۔ صاحب کی جیبوں میں ہزار ہزار کے آٹھ نوٹ نکلے۔ کوئی بڑا امیر آدمی ہوگا۔'

'ارجن نے کہا، 'جوزیف، اصلی نام مائیکل۔'

'آپ کو کیسے معلوم ہوا، صاحب؟'

'حوال دار، کبھی کبھی رات اپنے بھید میرے کان میں پھسپھسا دیتی ہے۔..... مگر یہ تو صرف دو ہوئے۔ اور کون مارا گیا؟'

'ایک تو وہ کرشچین چھوکری تھی صاحب، جو سڑک کے بیچوں بیچ چل رہی تھی، موٹر کی چپیٹ میں آ گئی۔

'کیسی تھی وہ چھوکری؟'

'بڑی دُبلی تھی.......'

'سانولی سی بڑی بڑی آنکھوں والی.....'

'ہاں صاحب، مشکل سے سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ پر صاحب، وہ بھی پیئے ہوئے تھی۔ اسی کمبخت کو بچانے کے لیے صاحب نے بریک مارا ہوگا.....'

'صاحب نے بریک نہیں لگایا حوالدار، یہی تو زندگی کی ٹریجڈی ہے۔ مگر باقی نو آدمی کون تھے؟'

'ایک پورا خاندان تھا، صاحب، جو یہاں فٹ پاتھ پر پڑا سو رہا تھا۔ ماں باپ، سات بڑے چھوٹے بچے۔ موٹر ان کو پیستی ہوئی گذر گئی، صاحب۔ وہ دیکھیے اب تک ان کا خون پڑا ہے وہاں۔'

جدھر حوال دار نے اشارا کیا، وہاں میونسپلٹی کا ایک آدمی پانی کا نلکا مار کر فٹ پاتھ کو دھو رہا تھا۔

'کیوں بھائی! کیا پانی سے یہ خون دُھل جائے گا؟'

'ہاں، صاحب، خون ہے تو بہت۔ دم لگے گا۔ پر دھل ہی جائے گا۔'

'مشکل ہے، میرے دوست، بہت مشکل ہے، یہ خون پانی سے نہیں دھل سکے گا۔'

ٹیکسی میں بیٹھنے لگا، تو ارجن نے دیکھا کہ سمندر اتار پر ہے اور لہریں اس پتھریلی ساحل پر سر پٹک پٹک کر اب ناکام لوٹ رہی ہیں۔

'اوشا، اٹھو۔'

'کیا ہوا؟'

'کچھ نہیں، آہستہ بولو، نہیں تو بچے اٹھ جائیں گے۔ کچن میں چلو، مجھے بھوک لگی ہے۔'

گیس پر انڈے فرائی ہوتے ہوئے چھن مُن چھن مُن کر رہے تھے۔ ارجن نے کہا، 'اوشا، یاد ہے؟ ہماری شادی کی رات کو تم نے مہمانوں کے سامنے شرم کے مارے کچھ نہیں کھایا تھا اور آدھی رات کو تمھیں بھوک لگی تھی اور ہم نے انڈے فرائی کر کے کھائے تھے؟'

'مجھے تو سب کچھ یاد ہے۔'

'اور چوپاٹی پر جو چاٹ کھایا کرتے تھے؟'

اوشا نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

'اور بنارسی پان والے کے مہوبے کے پان؟'

اوشا نے سر ہلا کر کہا، 'اب تو ان کی خوشبو ہی یاد رہ گئی ہے۔'

'اور مالابار ہل پر وہ بینچ، جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے؟'

اوشا کے گال لال ہوگئے۔ 'اب کیوں یہ باتیں یاد دلاتے ہو؟'

'اس لیے کہ کل سے ہم ہر شام کو چوپاٹی کی چاٹ کھایا کریں گے۔'

'اور مہوبے کے پان؟'

'ہاں، اور مہوبے کے پان۔ اور پھر مالابار ہل پر گھومنے جایا کریں گے۔'

'اور تمھارا دفتر کا کام؟'

'وہ بھی ہوتا رہے گا! محبت سے بڑھ کر کوئی ضروری کام نہیں اوشا۔'

'یہ پرانا سبق کس نے تمھیں یاد دلا دیا ہے؟'

'ایک بوڑھے نے، جو ساٹھ برس تک بمبئی آتا ٹالتا رہا اور بمبئی پہنچنے سے پانچ منٹ پہلے

ہارٹ فیل ہو کر مر گیا اور بمبئی کی رات نہ دیکھ سکا، حالانکہ اس کی جیب میں تیس ہزار روپے تھے۔'

'اور تمھارے پاس کیا ہے؟' اوشا نے مسکرا کر پوچھا۔

'میرے پاس تیس روپے ہیں اور......'

'اور......؟'

'تم ہو......؟'

'پھر؟'

'میرے پاس آؤ!'

'آ گئی۔'

اور قریب۔'

'تم تو کانپ رہے ہو۔ تمھارا دل بھی زور سے دھڑک رہا ہے۔

'ہاں اوشا، مجھے رات سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے تو تم اپنی بانہوں میں لے لو۔'

O

# آج کے لیلیٰ مجنوں

ایک تھی لیلیٰ، ایک تھا مجنوں۔

مگر لیلیٰ کا نام لیلیٰ نہیں تھا، للی تھا، للی ڈی سوزا۔

اور مجنوں کا نام مجنوں نہیں تھا، موہن تھا، سوہن ماہمیکر۔

وہ دونوں اور ان کے قبیلے صحرائے عرب میں نہیں رہتے تھے۔ ماہم اور باندرہ کے بیچ میں سڑک کے نیچے اور کھاری پانی کے کھاڑی کے کنارے جو جھونپڑیوں کی بستی ہے وہاں رہتے تھے۔

مگر صحرائے عرب کی طرح اس بستی میں بھی پانی کی کمی تھی۔ ڈیڑھ سو جھونپڑیوں میں جو سات سو مرد عورتیں اور بچے رہتے تھے ان سب کے لیے میٹھے پانی کا صرف ایک نل تھا اور اس نل میں صرف دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام کو پانی آتا تھا۔ ایک کنستر ایک گھڑا پانی لینے کے لیے کئی کئی گھنٹے سے لائن لگانی پڑتی تھی۔

ایک رات کو موہن جھونپڑی میں اپنے باپ کی کھٹیا کے نیچے سو رہا تھا کہ اس کی ماں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

''موہن، اے موہن! جا نل پر اپنی گاگر لائن میں رکھ کر آ نہیں تو پانی نہیں ملے گا۔''

موہن کی عمر اس وقت مشکل سے نو برس کی ہوگی اور نو برس کی بچے کو جو دن بھر کیچڑ مٹی میں

دوڑتا بھاگتا رہا ہو، بڑی پکی نیند آتی ہے۔ آدھی رات کو اسے اٹھانا آسان نہیں ہے۔

''ارے او موہن۔ اٹھتا ہے یا نہیں۔'' ماں نے ایک بار پھر اسے جھنجھوڑا

''سونے دو نہ ماں۔ ابھی تو آدھی رات ہوئی ہے۔ نل میں تو پانی صبح آٹھ بجے آئے گا۔''

''اچھا تو سوتا رہ۔ ابھی تیرا بابا آتا ہے وہ اٹھائے گا تجھے۔''

بابا کا نام سنتے ہی موہن ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دنیا میں وہ کسی سے ڈرتا تھا تو اپنے باپ سے، اور خاص کر رات کو جب وہ دارو پی کر گھر لوٹتا تھا۔

''اچھا اماں، میں جاتا ہوں۔'' آنکھ ملتا ہوا وہ اٹھا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر گاگر اٹھائی اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

ساری بستی اندھیرے میں سوئی ہوئی تھی۔ مگر سڑک کی پیلی روشنی نل کے پاس زمین پر رکھے ہوئے کنستروں، گاگروں اور گھڑوں پر پڑ رہی تھی۔

موہن نے سوچا سچ مچ مجھے دیر ہو گئی ہے۔ یہاں تو سب پہلے ہی اپنے اپنے برتنوں کی لائن لگا گئے ہیں۔ اس طرح تو نل میں پانی آٹھ بجے آیا تو اپنا نمبر آتے آتے دس بج جائیں گے اور اس وقت تک پانی آنا بند ہو گیا تو......؟

موہن نے ادھر ادھر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ صرف نل سے لے کر بستی کے پچھلے کونے بلکہ سڑک تک پانی کے برتنوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ پہلے ایک چمکتی ہوئی گاگر، پھر ایک لال مٹی کا گھڑا، پھر ایک پرانا زنگ لگا کنستر، پھر ایک ڈالڈا کا خالی ٹین، پھر ایک صراحی، ایک بالٹی، ایک کنستر، ایک گھڑا، دو گاگریں، تین ٹین کے ڈبے، دو بالٹیاں، ایک گاگر...........

موہن نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھ کر سوچا، کسی کا برتن ہٹا کر اپنی گاگر آگے رکھ دوں۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ بستی کے قانون کے مطابق ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں، تب ہی تو لائن میں اپنا برتن رکھ کر چین سے سو جاتے ہیں۔ نہیں تو ہر کسی کو رات بھر پہرا دینا پڑے۔ پانی کے لیے لائن توڑنے پر تو مار پیٹ کیا خون خرابے ہو جاتے ہیں۔ سو اپنی گاگر کو سب سے پیچھے لائن میں ہی رکھنا چاہیئے۔ مگر پھر اسے یاد آیا کہ اس کا نمبر آنے سے پہلے نل بند ہو گیا اور گھر میں پانی نہ پہنچا تو اس کا باپ ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دے گا۔

کوئی پرواہ نہیں۔ اس نے سوچا۔ سب سو رہے ہیں، میں چپکے سے اپنی گاگر آگے بڑھا دیتا ہوں اور وہ نل کی طرف بڑھا، مگر وہ کسی کا کنستر سرکانے والا ہی تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"اے چھالا (سالا) کیا کلتا ہے"؟

موہن گھبرا کر مڑا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کالی سی، دبلی سی، چھوٹی سی سات برس کی بچی ایک میلی پھٹی فراک پہنے ہاتھ میں اپنے قد سے بڑا بانس کا ڈنڈا لیے کھڑی ہے۔

"چھالے بے ایمانی کرتا ہے۔" بچی ڈنڈا لیے موہن کی طرف بڑھی۔ "چل لکھ (رکھ) اپنی گاگل، لائن میں چھپ جے (سب سے) پیچھے۔"

موہن کو اس توتلی چھوکری کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ "اری جا جا۔ میں جہاں جی چاہے اپنی گاگر رکھوں گا۔ تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی۔"

یہ کہہ کر وہ گاگر رکھنے والا ہی تھا کہ وہ بولی "تو پھل (پھر) میں چھول (شور) مچا کے چھپ کے بلاتی ہوں وہ چھپ مال مال (مار مار) کے تمھالا (تمھارا) بھلکس بنا دیں گے۔"

موہن کا ہاتھ رک گیا۔ وہ جانتا تھا اگر اس چھکری (چھوکری) نے سچ مچ شور مچایا تو کیا ہوگا۔ ہر جھونپڑی سے لوگ لاٹھیاں، ڈنڈے، چاقو، چھرے، پتھر لیے ہوئے نکلیں گے اور کوئی سوال و جواب کیے بنا اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ صحرائے عرب کی طرح اس بستی میں بھی ایک چلو پانی کے لیے دس چلو خون بہایا جا سکتا تھا۔

سو اس نے کہا "اچھا بابا تو چلا مت۔ میں اپنی گاگر لائن میں سب سے پیچھے رکھ دیتا ہوں۔"

مگر بچی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ وہ اپنے ڈنڈا گھسیٹتی ہوئی موہن کے پیچھے پیچھے آئی تا کہ وہ کوئی بے ایمانی نہ کر سکے۔

موہن نے لائن کے اخیر میں اپنی گاگر زمین پر رکھ دی اور بولا "بس اب تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں چھپ ٹھیک ہے، اب تم جا کے چھو جاؤ۔"

"پر یہ جگہ سڑک کے پاس ہے۔ کوئی راستہ چلتا میری گاگر اٹھا کر چلتا بنا تو؟"

"تم پھکل (فکر) نہ کرو۔ میں جو ہوں"۔ اور یہ کہہ کر اس نے چوکیداروں کی طرح ڈنڈے کو زمین پر مار کر کہا "کوئی تمھالی گاگل کو ہاتھ بھی لگائے گا تو اس کا چھل (سر) پھول (پھوڑ)

دوں گی۔ ہاں!''

اور اتنی سی بچی کی اتنی بڑی بڑی باتیں سن کر موہن بے اختیار مسکرا دیا۔

بستی کے کنارے جہاں وہ کھڑے تھے۔ وہاں سڑک پر بجلی کا کھمبا لگا ہوا تھا اور اس کی روشنی کے دائرے میں وہ دونوں بچے کھڑے تھے۔ ساری دنیا اس وقت سو رہی تھی، صرف محبت جاگ رہی تھی اور وہ دونوں...... ایک نو برس کا لڑکا ایک چھ برس کی لڑکی۔

للّی اور موہن۔

موہن اور للّی۔

موہن نے اس توتلی کالی دبلی چھوکری کی طرف دیکھا، جو پھٹی فراک پہنے، ننگے پاؤں، اپنے قد سے بڑا ڈنڈا لیے کھڑی تھی اور کھمبے کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ جن آنکھوں سے وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے وہ بڑی بڑی اور خوبصورت ہیں جیسے ان ہرن کی آنکھیں جو اس نے چڑیا گھر میں دیکھی تھیں اور جس کے جنگلے پر لکھا ہوا تھا ''عربستان کی ہرن''۔

اور للّی نے موہن کی طرف دیکھا جو ایک میلی نیکر پر اپنے باپ کا پھٹا ہوا ایک بنیان پہنے ہوئے تھا اور اس نے خاموش تتلاہٹ سے اپنے دل میں سوچا۔ ''یہ چھوکلا مجھے اچھا لگتا ہے، اچھ چھے میں دوچھتی کلوں گی (اس سے میں دوستی کروں گی)۔ اب میں اِچھے (اسے) ڈنڈے نہیں مالوں گی۔''

روشنی کے دائرے میں وہ دونوں ایسے کھڑے تھے جیسے ان کے اردگرد کسی نے قسمت کا ایسا حصار کھینچ دیا ہو جس سے باہر نکلنا اب ان کے بس میں نہ ہو اور پھر وقت رک گیا اور وہ دونوں وہاں خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ نہ جانے کتنی دیر تک..................

شاید صرف ایک منٹ۔

شاید ایک سو برس۔

شاید پانچ منٹ۔

شاید پانچ سو برس۔

☆☆

فادر ولیم کی لمبی سفید داڑھی ہوا میں ایسے اڑ رہی تھی جیسے وہ اڑتا ہوا کبوتر ہو اور سامنے بیٹھے

ہوئے سب بچے حساب کا سوال کرنے کے بجائے فادر ولیم کی داڑھی کا کھیل دیکھ رہے تھے جو کبھی ہوا کے جھونکے سے اپنے پر پھیلا لیتی تھی اور کبھی پامفریٹ مچھلی کی طرح گول اور سپاٹ ہو جاتی تھی۔ ان کی کرسی کے پاس ان کی بید کی چھڑی رکھی ہوئی تھی۔ جس کی مار کا مزہ ہر بچہ چکھ چکا تھا اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ فادر اسے روز تیل میں بھگو کر لاتے ہیں، مگر اس وقت کسی کو مار کھانے کا ڈر نہیں تھا کیونکہ فادر ولیم کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے بلکہ شاید سو رہے تھے۔ صرف ان کی داڑھی جاگ رہی تھی۔

فادر ولیم در اصل ''فادر'' کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ کسی زمانے میں وہ پادری ضرور تھے، مگر انھیں رومن کیتھولک چرچ سے نکلا ملا ہوا تھا کیونکہ انھوں نے لاٹ پادری سے کہہ دیا تھا چرچ کا کام عیسیٰ مسیح کا امن اور محبت کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ نہ ہندوؤں مسلمانوں یا ہریجنوں کو مختلف قسم کے لالچ دے کر ان کو عیسائی بنانا۔ سو ان کا پادریوں والا لمبا چوغہ ان سے چھین لیا گیا تھا مگر ان کی لمبی داڑھی لاٹ پادری بھی ان سے نہ چھین سکے تھے اور اب وہ اس جھونپڑیوں کی بستی میں آسمان کے نیچے اپنا اسکول چلاتے تھے۔ جس میں وہ بچے پڑھتے تھے جن کا کسی سرکاری اسکول میں داخلہ نہ ہو یا جن کے ماں باپ سرکاری یا بیوپاری اسکولوں کی فیس نہ دے سکتے ہوں۔ فادر ولیم کے اسکول کا نہ کوئی نام تھا نہ اس میں میز کرسیاں، بینچ اور ڈیسک تھے۔ بس ایک تین ٹانگ کے کٹہرے پر لگا بلیک بورڈ تھا جس پر اس وقت موہن چاک سے فادر ولیم کی اڑتی ہوئی سفید داڑھی کی تصویر بنا رہا تھا۔

اور دور اپنی جگہ پر بیٹھی للی اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے بلیک بورڈ کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں کالے تختے پر دھیرے دھیرے فادر ولیم کا گول چہرہ اور اُن کی ہوا میں بکھری ہوئی سفید داڑھی ابھری رہی تھی مگر در اصل وہ اپنے موہن کی طرف دیکھ رہی تھی اور اب بغیر ہکلائے دل ہی دل میں سوچ رہی تھی ''میرا موہن کتنا اچھا ہے۔ اُس نے تصویر بھی بنائی ہے تو کتنی اچھی بنائی ہے۔ ایسا لگتا ہے فادر ولیم کی داڑھی اب اُڑی اَب اُڑی!''

ابھی موہن نے تصویر پوری نہیں کی تھی کہ فادر ولیم جاگ پڑے اور سب بچے جواب تک شور مچا رہے تھے یا آپس میں دھول دھپا کر رہے تھے، ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور زور زور

سے سی اے ٹی کیٹ۔ کیٹ معنی بلی' کرنے لگے۔ مگر موہن کا منہ ابھی تک بلیک بورڈ کی طرف تھا۔ وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ فادر ولیم کے ساتھ ساتھ ان کی تیل میں بھیگی ہوئی چھڑی بھی اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔

'م۔م۔م۔موہن!' للی اب ساڑھے سات برس کی ہو چکی تھی۔ اور اس نے تتلانا بند کر دیا تھا مگر موہن کو مار پڑے گی اس ڈر سے وہ ہکلاتی ہوئی چلائی۔ 'م۔م۔م موہن۔ف۔ف۔ف۔ا۔۔در۔۔!'

موہن گھبرا کر مڑا اور ساتھ ہی اس کی کمر پر چھڑی کی مار پڑی۔

یہ دیکھ کر سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ سب، سوائے ایک للی کے۔ اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا اور وہ دھیرے دھیرے فادر ولیم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

'ہاتھ باہر نکالو موہن!' فادر ولیم نے ڈانٹ کر کہا، اور جب جب ڈر کے مارے موہن ہچکچایا تو انھوں نے ایک عجیب انداز سے (جس میں حکم بھی تھا اور التجا بھی) کہا۔

'ہاتھ باہر نکالو، یو فول، ہاتھ باہر نکال اور کہیں مار پڑی تو کسی ہڈی پر چوٹ آجائے گی'۔

سو موہن نے ہاتھ آگے کر دیا۔

فادر ولیم کی چھڑی ہوا میں اٹھی اور سڑاپ سے موہن کے ہاتھ پر پڑی۔

موہن نہیں چاہتا تھا کہ للی کے سامنے وہ کسی کمزوری یا بودے پن کا اظہار کرے۔ چھڑی کا نشان اس کے ہاتھ پر پڑ گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے ہتھیلی پر کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو مگر اس نے دانت کچکچا لیے اور اُس کے منھ سے اُف نہ نکلی۔

مگر چلتے چلتے للی چلاّ پڑی، جیسے مار اُس کو پڑی ہو۔

'ون!'

'ٹو'۔

'تھری'۔

'فور'۔

فادر کی چھڑی چار بار ہوا میں اٹھی اور چار بار موہن کے ہاتھ پر پڑی اور ہر بار موہن اپنے

درد کو پی گیا اور ہر بار للّی بے اختیار چلّا پڑی۔

'دیٹ وِل ڈُو۔ THAT WILL DO فادر نے چھڑی واپس میز پر رکھتے ہوئے موہن سے کہا اور پھر اپنی لمبی سفید داڑھی پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ اب کبھی کوئی میری داڑھی کی تصویر بنائے تو یاد رکھے کہ میری داڑھی اتنی چھوٹی نہیں ہے جیسی موہن نے بنائی ہے۔ پورے ساڑھے تیرہ انچ لمبی ہے'

یہ سُن کر سب بچے ہنس پڑے۔ فادر ولیم بھی ہنس پڑے۔ موہن ہنس کر جلدی جلدی بلیک بورڈ کو کپڑے سے صاف کرنے لگا۔ تب فادر ولیم نے للّی کو دیکھا جو آنکھیں پھاڑے فادر کو دیکھ رہی تھی۔

'ویل۔ للّی تم کو کیا چاہیئے'۔ فادر نے نرمی سے پوچھا۔

'فادر.....'

'یس مائی چائلڈ!'

للّی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیدھی بلیک بورڈ کے پاس گئی اور موہن سے چاک چھین کر خود اسی جگہ فادر ولیم کی تصویر بنانے لگی۔

سب حیرت سے دیکھتے رہے کہ للّی کو دفعتاً نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

للّی کی بنائی ہوئی تصویر نہ صرف اچھی نہیں تھی بلکہ کسی طرح سے فادر ولیم کی تصویر نہیں لگتی تھی۔ نہ فادر ولیم اتنے موٹے تھے، نہ وُہ اتنے لمبے تھے، نہ اُن کے گلے میں اتنا بڑا کراس لٹکا رہتا تھا۔ نہ اس کی آنکھیں اتنی بڑی اور ایسی بھیانک تھیں جیسی للّی نے اپنی تصویر میں بنائی تھیں۔ مگر داڑھی کو للّی نے بڑی احتیاط سے بنایا اور تصویر ختم کرتے ہوئے فادر ولیم کی طرف مڑ کر بولی۔

'اب آپ فُٹ رول لے کر اپنی داڑھی کو ناپ لیجئے'۔

اس پر ساری کلاس کھلکھلا کر ہنس پڑی اور باوجود فادر ولیم کے اپنی بید سے میز کو دھڑ دھڑا نے کے بچّے ہنستے ہی رہے۔

اس سے خفا ہو کر فادر نے للّی کی طرف مُڑ کر پوچھا 'کون ہو تم؟'

للّی نے کہا۔ 'للّی'

ایک چھوکرا کلاس کے پیچھے سے چلّایا۔ 'للّی نہیں فادر، لیلیٰ!'۔

'سائنس' کلاس کو اچھی طرح سے گھور کر فادر نے لّی سے کہا۔'تم نے بھی یہی حرکت کی ہے؟ پھر تمھیں بھی وہی سزا ملے گی۔ نکالو، اپنا ہاتھ باہر'۔

اور فادر ولیم جو اِس دنیا اور اُس دُنیا دونوں کے سب جسمانی اور روحانی بھیدوں سے واقف تھے، یہ دیکھ کر اُلجھن میں رہ گئے کہ لّی کے ہاتھ پر چار گہری نیلی لکیریں پڑی ہوئی تھیں جیسے اس کی ہتھیلی پر پہلے ہی سے چار بار بید کی مار پڑ چکی ہو۔

☆☆

للّی شام کو دفتر سے باہر نکلی تو فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تین ٹیڈی بوائیز TEDDY BOYS نے بہ یک وقت سیٹی بجائی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں للّی تھی بھی سیٹی بجانے کے قابل۔ رنگت سانولی مگر خوبصورت آنکھیں۔ قدرتی گھونگریالے چمکیلے سیاہ بال، چھریرا مگر بھرا ہوا جسم جو اس کے چست فراک میں اور بھی نمایاں نظر آتا تھا۔ اونچے فراک میں سے نکلی ہوئی سڈول ٹانگیں۔ ایسی لڑکی کو دیکھ کر بھلا کون سیٹی نہیں بجائے گا؟'

لّی کو ٹیڈی بوائیز کی سیٹی سننے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دن میں کئی بار اس کو اس قسم کی سیٹیاں سنائی دیتی تھی۔ لّی کو ان لفنگے چھوکروں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اگر اسے دیکھ کر ان کا جی سیٹی بجانے کو چاہتا ہے تو شوق سے سیٹی بجائیں۔ بڑی لاپرواہی سے وہ اپنا بیگ ہلاتی ہوئی ان کے پاس سے گزر جاتی اور اس کا یہ انداز دیکھ کر وہ بھی سیٹی بجانا بھول جاتے۔

لیکن آج اس کا موڈ خراب تھا۔ جیسے ہی ٹیڈی بوائیز نے سیٹی بجائی، لّی نے پلٹ کر دیکھا، پھر وہ ان کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی سیٹی کی آواز تینوں چھوکروں کے ہونٹوں پر سے غائب ہو گئی۔

'کیا ہے؟' اس نے ڈانٹ کر کہا 'شرم نہیں آتی، لوفر کہیں کے! کیوں، بلاؤں پولیس کو؟'

اور پولیس کا نام سنتے ہی تینوں تنگ مہری کی پتلونیں اور نکیلے جوتوں کے تینوں جوڑے وہاں سے بھاگتے ہوئے نظر آئے۔

'سوائن!' انھیں بھاگتے دیکھ کر لّی چلاّئی — 'سؤر کہیں کے!'

پھر وہ بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑی۔ آج اس کا موڈ اتنا خراب تھا کہ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی اونچی ایڑی کے سینڈل کی آواز میں بھی غصہ بھرا ہوا لگتا تھا۔

'سوائن!' سُور کہیں کا' چلتے چلتے دانت بھینچ کر اس نے اتنے زور سے کہا کہ آگے چلنے والے ایک ادھیڑ عمر کے شریف آدمی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ مگر یہ گالی اس نے اس بے چارے کو نہیں دی تھی۔ نہ ہی یہ گالی اس نے ان ٹیڈی بوائز کو دی تھی، جن کی لوفرانہ حرکت کو وہ اب تک بھلا بھی چکی تھی۔ اس وقت اس کو غصہ آرہا تھا اپنے دفتر کے منیجر پر، جو موٹا تھا اور گنجا تھا۔ مگر اپنے گنج کو چھپانے کے لیے کنپٹی کے لمبے بالوں کو گنجی کھوپڑی کے اوپر چپکائے رکھتا تھا اور جس کی رنگت مینڈک کے پیٹ کی طرح پیلی تھی اور جس کے موٹے موٹے گدّے دار ہاتھ ہمیشہ ہوس کے پسینے سے بھیگے رہتے تھے اور جو دفتر میں کام کرنے والی ہر لڑکی سے فلرٹ کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔

للی کو اس دفتر میں کام کرتے ہوئے صرف دو مہینے ہوئے تھے مگر اتنے عرصے ہی میں اس نے منیجر کی بدنیت کو بھانپ لیا تھا اور اس لیے وہ جہاں تک ممکن ہوتا۔ اس کے قریب جانے سے کتراتی رہتی تھی مگر اس دن منیجر نے اپنی اسپیشل اسٹینو گرافر کو چھٹی دے دی تھی اور للی کو اس کی جگہ کام کرنا پڑا تھا۔

تین گھنٹے تک للی نے شارٹ ہینڈ کی کتاب پر منیجر کے ڈکٹیٹ کرائے ہوئے خطوں کے ڈرافٹ لکھے تھے۔ ہر خط شروع ہوتا تھا۔ 'ڈیر سر' مائی ڈیر......' سے اور ہر بار جب اس کے منہ سے 'ڈیر' کا لفظ نکلتا تھا، وہ ایک خاص انداز سے للی کی طرف دیکھتا تھا، جس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا مگر جس کو سمجھنے کے لیے للی تیار نہ تھی اور پھر شام ہوتے ہوتے جب وہ ان سب خطوں کو ٹائپ کر کے دستخط کرانے لے گئی تھی، اس بدمعاش نے للی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا 'آج رات کے شو میں سینما دیکھنے کے لیے چلتی ہو؟' اور پھر اس نے للی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا، تاکہ اسے اپنی گود میں بٹھا لے اور تب للی کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ منیجر کے ایک زنانے دار تھپڑ رسید کرے اور ہاتھ چھڑا کر وہاں سے بھاگ آئے۔

منیجر کا دفتر ایئر کنڈیشن تھا اور اس لیے اس تھپڑ کی آواز کسی نے نہ سنی تھی۔ مگر سب نے یہ

ضرور دیکھا کہ لِلّی جب باہر نکلی تو اس کا چہرہ سرخ تھا اور اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ لِلّی تیز تیز چلتی ہوئی اپنی میز تک گئی، دراز کھول کر اپنی سب چیزیں نکال کر اپنے بیگ میں ڈالیں اور پھر بغیر کسی سے کچھ کہے وہ دفتر سے باہر نکل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اس دفتر میں پھر کبھی قدم نہیں رکھے گی۔

دفتر میں جتنے دوسرے نوجوان کلرک تھے سب ہی نے تو باری باری لِلّی سے دوستی کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ان میں سے کسی کو منہ نہ لگایا تھا، نہ کسی کے ساتھ سنیما گئی تھی۔ نہ کسی ریستوران میں چائے پینے کی دعوت قبول کی تھی اور ایک دن جب کسی نے زیادہ اصرار کیا تھا تو اس نے کہہ دیا تھا' آئی ایم سوری' مگر شام کو مجھے موہن سے ملنا ہوتا ہے'۔

'موہن!' پتلی مونچھوں والے ٹامس نے حیرت سے پوچھا تھا۔'یہ موہن کون ہے؟' اور لِلّی نے جواب دیا تھا' وہ میرا موہن ہے!'

'کیا تمھاری اس سے منگنی ہوئی ہے؟'

'ہاں، یہی سمجھو۔' لِلّی نے جواب دیا تھا۔

'کب سے؟'

'بارہ برس سے'۔

'تو کیا تمھاری منگنی بچپن ہی میں ہوگئی تھی؟'

'ہاں، یہی سمجھو'۔

'مگر موہن! وہ تو ہندو ہوگا، اس سے تمھاری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟'

لِلّی نے مسکرا کر جواب دیا تھا' مجھے نہیں معلوم تھا محبت کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے'۔ اور یہ کہہ کر وہ بیگ ہلاتی ہوئی دفتر سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد چگی داڑھی والے اکبر علی لیجر کلرک نے اپنا رجسٹر بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

'ارے واہ۔ اپنی لِلّی تو لیلیٰ نکلی'۔

اور جب ٹامس نے پوچھا۔ لیلیٰ ہو از شی؟' —WHO IS SHE— تو اکبر علی نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

'وہ بھی ایک محبت کی دیوانی تھی، للّی کی طرح'۔

☆☆

لوکل ٹرین پریل کے اسٹیشن پر پہنچی اور للّی دھکم پیل کر کے تھرڈ کلاس کے ڈبے کی بھیڑ میں سے باہر نکلی تو اس نے موہن کو حسبِ معمول کلاک کے نیچے کھڑا پایا۔

موہن اب اکیس برس کا جوان تھا۔ وہ ایک مل میں میکینک تھا اور اس کی نیلی شرٹ اور پتلون پر پڑے تیل کے دھبے اعلان کر رہے تھے کہ وہ سیدھا کام سے آرہا ہے۔

'ڈارلنگ!' للّی نے موہن کے بازوں میں اپنا ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ 'تمھیں بہت انتظار کرنا پڑا کیا؟'

'موہن نے مسکرا کر جواب دیا 'صرف آدھ گھنٹہ۔ اتنی دیر میں صرف چار ٹرینیں گئی ہیں۔ کیوں، آج دفتر میں کام زیادہ تھا یا اپنے منیجر سے ذکر چھیڑ رہی تھیں؟'

للّی نے جلدی سے کہا۔ 'اس شیطان کا تو نام مت لو۔ جی چاہتا ہے اس کا منہ نوچ لوں۔ مگر آج سے تمھیں کبھی انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نوکری چھوڑ آئی ہوں۔'

اتنے میں ٹرین چلی گئی تھی اور اگلی ٹرین آنے تک پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔

ٹی اسٹال کے پاس اپنی مقررہ بینچ پر بیٹھے ہوئے للّی اور موہن بھجیا کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بھجیا ختم ہوگئی، مگر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ دوسری ٹرین آئی۔ مسافر ڈبّوں میں سے اُترے، مسافر ڈبوں میں چڑھے۔ ٹرین چلی گئی۔ ایک بار پھر اسٹیشن پر سناٹا چھا گیا۔

رات ہوگئی۔ اسٹیشن کی روشنیاں جل اٹھیں۔ ٹرینیں آتی رہیں۔ ٹرینیں جاتی رہیں۔ مسافر اترتے رہے، مسافر چڑھتے رہے، للّی اور موہن اسی جگہ بیٹھے رہے، باتیں کرتے رہے اور بھجیاں خرید کر کھاتے رہے اور پیار بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر کار للّی نے کہا 'اچھا تو اب دیر ہوگئی ہے۔ مجھے جانا ہی چاہیے۔'

موہن نے جیسے خواب میں کوئی بات سنی ہو۔ 'للّی کچھ کہا تم نے؟'

'نہیں کچھ نہیں کہا'۔ للّی نے اسے یقین دلایا۔

اور وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے میں کھو گئے۔

ایک کے بعد ایک دو ٹرینیں جنوب کو گئیں۔تین ٹرینیں شمال کو گئیں، مگر وہ دونوں اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ یہاں تک کہ چائے اور بھجیاں کی دکان بھی بند ہوگئی اور چائے والا جاتے جاتے ان سے کہہ گیا۔'ابھی آخری ٹرین آنے والی ہے۔اس کے بعد صبح تک کوئی ٹرین نہیں ملے گی۔'

تب وہ دونوں چونکے۔دور سے ٹرین قریب آنے کی آواز دھیرے دھیرے بڑھتی جارہی تھی۔

'تو کل تم دفتر نہیں جاؤ گی؟' موہن نے پوچھا۔

'نہیں،اب میں کبھی دفتر نہیں جاؤں گی'۔

'پھر میں تم سے کیسے ملا کروں گا؟'۔

'تمھارے مل کی شفٹ ختم ہونے سے پہلے میں یہاں آجایا کروں گی'۔

'اور اگر تمھارے ڈیڈی نے تمھیں اس وقت گھر سے نہ نکلنے دیا؟'

'پھر میں کیسے آسکتی ہوں؟ تم ہی بتاؤ۔پھر کریں تو کیا کریں؟'

'تو پھر ایک ہی راستہ ہے کل ہی ہم شادی کرلیں گے۔'

للّی کے کانوں میں ننھی ننھی گھنٹیاں بجنے لگیں اور اتنے میں ٹرین آگئی اور جو للّی نے دھیرے سے کہا وہ ریل کی دھڑ دھڑاہٹ میں کھو گیا۔

موہن نے للّی کا بازو پکڑا۔' آؤ تمھیں گھر پہنچا آؤں۔اور وہ دونوں سامنے والے ڈبے میں سوار ہو گئے۔

☆☆

باندرہ کی سڑکیں رات کے سناٹے میں سوئی ہوئی— صرف للّی اور موہن کے قدموں کی آواز تھی اور فٹ پاتھ پر سونے والوں کے خراٹے۔

دور کہیں کسی گھڑیال نے دو بجائے۔

موہن نے چلتے چلتے کہا' للّی یاد ہے! ہم والی بستی میں جب ہم پہلی بار ملے تھے اس وقت بھی رات کے دو ہی بجے تھے'۔

'بالکل یاد ہے۔تم چوری سے اپنی گاگر لائن میں آگے رکھ رہے تھے۔'

'اور تم ڈنڈا ہاتھ میں لیے پہرا دے رہی تھیں اور تتلا تتلا کر کہہ رہی تھیں — مال مال کے بھل کچھ بنادوں گی۔'

'مجھے ماہم والی بستی بہت یاد آتی ہے۔ وہاں ہم کتنے خوش تھے۔'

'مگر اب تو تم بہت اچھی فلیٹ میں رہتی ہو۔'

'ہاں، یہ گھر تو اچھا ہے مگر تم جو نہیں ہو۔ وہاں ماہم کی بستی میں تو ہم دن بھر ساتھ کھیلتے تھے۔'

'یاد ہے جب میں نے بلیک بورڈ پر فادر ولیم کی تصویر بنائی تھی؟'

راستے کی روشنی میں للّی نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا جہاں ہلکی نیلی نیلی دو لکیریں پڑی ہوئی تھیں اور اس نے کہا 'یاد ہے۔'

اور پھر للّی کا گھر آ گیا۔

دوسری منزل پر جس فلیٹ میں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی، وہاں ایک کھڑکی میں روشنی ہو رہی تھی۔

موہن نے کہا۔ 'لگتا ہے تمھارے ڈیڈی ممی جاگ رہے ہیں۔ تمھیں کچھ کہیں گے تو نہیں؟'

للّی نے جواب دیا 'فکر نہ کرو۔ وہ میرا کمرہ ہے اور اس کی لیچ کی LATCH KEY، میرے پاس رہتی ہے۔ اچھا گڈ نائٹ، میں کل ہی ڈیڈی سے بات کر کے شام کو تمھیں ملوں گی۔'

'تو پھر چار بجے ریل اسٹیشن پر۔'

للّی اندھیرے زینے پر راستہ ٹٹولتی ہوئی اوپر چڑھ گئی اور جب تک اس کے قدموں کی آواز آتی رہی۔ موہن وہیں سڑک پر کھڑا رہا۔

للّی 'لیچ کی' LATCH KEY سے دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی، تو سب سے پہلے سڑک والی کھڑکی کھولی۔ کتنا اچھا ہے میرا موہن! اس نے سوچا 'میری فکر میں اب تک سڑک پر کھڑا ہے۔ پھر اس نے ہاتھ کے خاموش اشارے سے موہن کو 'بائی بائی' کہا اور جب مطمئن ہو کر موہن بھی ہاتھ ہلا کر چل پڑا۔ تب ہی وہ کھڑکی سے ہٹی۔

وہ مڑی ہی تھی کہ للّی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ڈریسنگ گاؤن پہنے اس کا باپ دروازے میں کھڑا تھا۔

☆☆

پریل اسٹیشن پر لوکل ٹرینیں آرہی تھیں۔ٹرینیں جارہی تھیں۔'فاسٹ' ٹرینیں دھڑ دھڑ کرتی ہوئی، پلیٹ فارم کو ہلاتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ایک بنچ پر للّی اور موہن بیٹھے تھے اوران کے درمیان کاغذ میں بھجیا رکھی تھی، مگر آج دونوں میں سے ایک کا ہاتھ بھی اس چٹ پٹی مسالے دار بھجیا کی طرف نہ اٹھ رہا تھا۔

'سو تمھارے ڈیڈی نے انکار کر دیا؟' موہن نے خاموشی کو توڑتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

'انکار ہی نہیں کیا، موہن'۔للّی بولی۔'بہت کچھ کہا۔شراب پیے ہوئے تھے۔سو گالیاں بھی دیں مجھے۔تمھیں بھی بہت برا بھلا کہا۔'

'کیا کہا؟ معلوم تو ہو، ان کو مجھ میں کیا برائی نظر آتی ہے؟'

للّی نے ایک دم جواب نہ دیا۔جیسے بولتے ہوئے ہچکچا رہی ہو۔اتنے میں ایک ٹرین آکر ٹھہر گئی۔سارے ڈبے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔مسافر اترے، مسافر چڑھے، سب ڈبے جوں کے توں بھرے رہے۔گاڑی پھر چل دی۔اترنے والے مسافر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پل پر ہو لیے— پلیٹ فارم پھر سنسان ہو گیا۔

اب للّی نے دھیرے سے کہا 'ڈیڈی کہتے ہیں تم — تم — ہندو ہو، اور بولتے ہیں میں مر جاؤں گا پر اپنی بیٹی کی شادی ہندو کے ساتھ نہ ہونے دوں گا۔'

'تمھارے ڈیڈی کرسچن ہیں؟'

'ہاں!'

'چرچ جاتے ہیں؟'

'پہلے کبھی کبھار سنڈے کو چلے جاتے تھے۔اب تو انھیں شراب پینے سے فرصت ہی کب ملتی ہے جو وہ چرچ جانے کا سوچیں۔'

'اور جب فرصت ملتی ہے تب کیا کرتے ہیں؟'

'تم تو جانتے ہی ہو موہن۔ میں تمھیں بتا چکی ہوں۔' للّی نے آواز کو دھیمی کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر جواب دیا۔ 'ڈیڈی دارو کا دھندا کرتے ہیں۔'

اتنے میں دوسری طرف کی ٹرین آگئی۔ یہ اتنی بھری ہوئی نہیں تھیں۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں سے پندرہ بیس مسافر اترے۔ فرسٹ کلاس سے ایک بھی نہیں اترا۔ ٹرین چل دی۔ پلیٹ فارم پھر سنسان ہو گیا۔

'اور کیا کہتے ہیں تمھارے ڈیڈی؟' موہن نے ایک ایک لفظ کو چبا کر کہا۔

'کیا کرو گے سن کر موہن؟ تمھارے بارے میں بری بری باتیں جو وہ کہتے ہیں، ان کو دہرانا مجھے اچھا تھوڑا ہی لگتا ہے۔'

'پھر بھی میں جاننا چاہتا ہوں، وہ کیا کہتے ہیں، کیا سوچتے ہیں میرے بارے میں؟— میرے ہندو ہونے کے علاوہ اور بھی کوئی اعتراض ہے ان کو؟'

'ہے۔' للّی نے جواب دیا۔

'کیا ہے؟'

'وہ کہتے ہیں تم ایک لیبر ہو، مل میں مزدور ہو، تمھارے کپڑوں سے پسینے اور تیل کے دھبّوں کی بو آتی ہے انھیں۔'

'تو وہ دن بھول گئے ہیں جب ہم اور وہ دونوں گھرانے ماہم والی بستی کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے؟'

'اب وہ اس بستی کی بات سننا نہیں چاہتے، وہ ان جھونپڑیوں کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ وہ میرے باپ ہیں، میں ان سے بحث نہیں کر سکتی۔ تم بتاؤ تمھارے بابا نے کیا کہا؟ وہ تو ہمیں آشیرواد دیں گے نا؟'

موہن جواب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک تیسری ٹرین آگئی۔ یہ پہلی ٹرین سے بھی زیادہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ جو اندر تھے وہ باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے اور جو باہر تھے وہ اندر گھسنے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی منٹ ٹرین کو ٹھہرنا پڑا۔ پھر بھی ٹرین چلی تو کئی مسافر جو اترنا چاہتے تھے، وہ اندر ہی رہ گئے اور کئی جو اس میں چڑھنا چاہتے تھے وہ پلیٹ فارم پر کھڑے رہ

گئے۔ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو میلا پاجامہ اور ڈھلی ہوئی قمیض پہنے ہوئے تھا،اس بینچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جہاں موہن اور للّی بیٹھے ہوئے تھے۔وہ بینچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا مگر منہ پھاڑے ہوئے ان دونوں کو اتنے تعجب اور غور سے دیکھ رہا تھا جیسے عجیب جانوروں کا جوڑا اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

موہن نے اس آدمی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔'یہ نہ جانے کون ہے جو ہمیں یوں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔بابا کا جاننے والا نہ ہو؟'

'تو پھر کیا کہا تمھارے بابا نے؟ للّی نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

موہن کو، جواب تک اس سوال سے کترا رہا تھا، جواب دینا ہی پڑا۔'وہ — وہ — بھی اس شادی کے خلاف ہیں، للّی۔'

'وہ کیا وجہ بتاتے ہیں؟

' کہتے ہیں، ہندو ہو کر میں کرسچین لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں؟'

' کیوں، کرسچین لڑکیوں میں انھیں کیا برائی دکھائی دیتی ہے؟'

'وہ کہتے ہیں — کرسچین چھوکریاں بڑی خراب ہوتی ہیں۔ ہر مرد سے آنکھیں لڑاتی ہیں۔'

للّی کے سانولے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔'کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو؟'

'نہیں نہیں، للّی یہ بات نہیں ہے۔ بھلا میں ایسا کیسا سوچ سکتا ہوں۔مگر بابا کو کون سمجھائے۔ تمھارے ڈیڈی کو بھی برا بھلا کہتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ دارو کا دھندہ کرتا ہے۔'

'اور تمھارے بابا کیا دھندہ کرتے ہیں؟'

موہن نے ہچکچا کر جواب دیا'سٹے کا'۔

للّی کچھ کہنے والی تھی مگر اتنی دیر میں دوسری ٹرین آ گئی اور پلیٹ فارم پر پھر گہما گہمی شروع ہو گئی مگر وہ آدمی جو ان کی بینچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھا تھا، وہیں بیٹھا رہا اور اسی طرح ان کو گھورتا رہا بلکہ ان کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔

گاڑی گئی تو للّی نے کہا'اب کیا ہوگا موہن؟'

موہن نے کہا' کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں تو آج اسی فکر میں مل میں کام کرنے بھی نہیں گیا۔

اگر تمھارے ڈیڈی نے تمھاری شادی کسی اور سے کر دی تو میں جان دے دوں گا۔'

لتی بولی 'تو کیا سمجھتے ہو، میں زندہ رہوں گی؟ ڈیڈی نے زبردستی کی تو میں زہر کھالوں گی—
موہن! تم مجھے تھوڑا سا زہر لا دو۔'

'زہر میں کہاں سے لاؤں گا۔ زہر پر تو کنٹرول ہے۔ ڈاکٹر کی چٹھی دیے بنا زہر مل ہی نہیں سکتا۔'

تھوڑی دیر وہ چپ چاپ بیٹھے رہے اور ان کے بیچ میں ہچکیا اسی طرح پڑی رہی۔ پھر نہ جانے کیسے پہلے لتی کی اور پھر موہن کی نگاہ ریل کی پٹری پر جم گئی۔ فولاد کی کالی پٹری جو ریل کے پہیوں کی رگڑ سے چمک رہی تھی۔ شاید دور سے ریل چلی آ رہی تھی۔ پٹری میں سے ایک عجیب زوں زوں کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی— جیسے ستار کے تار کو کسی نے چھیڑ دیا ہو اور اب اس کی جھنکار کی گونج رہ گئی ہو۔ جیسے کتنی ہی شہد کی مکھیاں بھن بھنا رہی ہوں۔ جیسے وہ پٹریاں کتنی عجیب انجانی زبان میں ان سے کچھ کہہ رہی ہوں۔

ان کی نگاہیں ریل کی پٹری پر جمی ہوئی تھیں کہ ایک دم دھڑ دھڑ کرتی ہوئی ایک ٹرین آ گئی۔ ان کے سامنے کی پٹری پر سے ٹرین کے کتنے ہی بھاری ہیبت ناک پہیے دھڑ دھڑاتے ہوئے گزر گئے۔ پھر وہ ٹرین بھی چلی گئی، مگر وہ پٹری پہلے کی طرح چمکتی رہی، گنگناتی رہی، ان سے کچھ کہتی رہی۔

اور پھر ایک ساتھ ان دونوں کی سمجھ میں آ گیا کہ ریل کی پٹری ان سے کیا کہہ رہی ہے۔

لتی نے موہن کی طرف دیکھا۔

موہن نے لتی کی طرف۔

اور دونوں کی نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا اور ایک ہی جواب۔ اس زندگی سے موت بہتر ہے اور موت وہاں ان کے سامنے وہاں اس ریل پٹری کی تلوار جیسی دھار پر ان کا انتظار کر رہی تھی۔

اب قریب آنے والی ریل کی آواز سے ریل کی پٹریاں جھنجھنا اٹھیں۔

وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

ایک لمحے کے لیے انھوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خاموشی سے

اقرار محبت کیا۔ پھر لتّی کا نرم ہاتھ موہن کے سخت کھردرے اور مردانہ ہاتھ میں آ گیا۔

اب ٹرین ان کی طرف دھڑ دھڑاتی ہوئی آ رہی تھی۔

ایک لمحہ، اور پھر وہ دونوں ریل کی پٹری پر کود جائیں گے۔ اس ٹرین کے بھاری پہیے ان کی مشکل آسان کر دیں گے۔ موت کی گود میں ان کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ سلا دیں گے۔ ان کی محبت کو امر کر دیں گے۔

'اے'۔

ایک آواز نے ان کو چونکا دیا اور اسی لمحے میں ٹرین آ گئی اور ڈبے ان کے پاس سے گزرنے لگے۔ لتّی اور موہن نے مڑ کر دیکھا تو یہ وہی ادھیڑ عمر کا میلا پاجامہ، پھٹی قمیض والا آدمی تھا— جو مسکرا کر بھجیاں کی پڑیا کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

'اپنی بھجیا تو ساتھ لیتے جاؤ'۔ اس نے چلّا کر کہا۔

'بھجیا! چٹ پٹی مسالے دار بھجیا! نہ جانے کیوں بھجیا کا نام سن کر ان دونوں کے منہ میں پانی آ گیا۔

بھجیا! چٹ پٹی مسالے دار بھجیا!

اور اگر وہ مر گئے ہوتے تو بھجیا کیسے کھاتے؟'

ٹھنڈا میٹھا فالودہ کیسے پیتے؟

چاندنی رات میں جُوہو کے کنارے نرم نرم ریت کا لمس اپنے گالوں پر کیسے محسوس کرتے؟

مالا بار ہل پر جا کر ہینگنگ گارڈن میں کھلے ہوئے پھولوں کا نظارہ کیسے کرتے؟

وہ بھجیا نہیں تھی، وہ زندگی تھی جو اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ چٹ پٹے مسالے کی خوشبو کے ساتھ ان کو واپس بلا رہی تھی۔

اترنے والے مسافر چڑھنے والے مسافروں سے دست و گریباں تھے— کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

موہن نے لتّی کے کان میں چلّا کر کہا۔ 'چلو، سول میرج کر لیں؟ کیوں منظور ہے؟'

تو لتّی نے موہن کے کان میں چلّا کر کہا 'ہاں ہاں منظور ہے'۔

'تو چلو، چرچ گیٹ چلیں'۔

اور یہ کہہ کر موہن نے للّی کا ہاتھ پکڑا اور ڈبے میں گھسنے والی بھیڑ پر پل پڑا۔ کسی نہ کسی طرح وہ بھیڑ کے ریلے کے ساتھ اندر گھس ہی گئے۔

ٹرین چلی گئی۔

مگر وہ آدمی بینچ پر اسی جگہ بیٹھا رہا۔

وہ بھجیا اسی طرح پڑی رہی۔

پھر وہ آدمی آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور بھجیا کی پڑیا اٹھا کر کھانے لگا۔

تب چائے والے نے اپنی دکان سے آواز دی 'کیوں چلے گئے وہ دونوں؟'

'ہاں چلے گئے'

'روز مجھ سے بھجیا لے کر کھاتے ہیں' چائے والے نے کہا۔

'مگر اب وہ تمھاری بھجیا کھانے نہیں آئیں گے۔ اب وہ اپنے لیے خود چٹ پٹی مسالے دار بھجیا بنایا کریں گے'۔

'کیا تم ان کو جانتے ہو؟ کون ہیں یہ دونوں؟'

اور وہ جو کھٹائی کی چٹنی میں ڈبو ڈبو کر اور مزے لے لے کر بھجیا کھا رہا تھا۔

بولا 'لیلیٰ مجنوں'

○

# واپسی کا ٹکٹ

انسان نے انسان کو ایذا پہنچانے کے لیے جو مختلف آلے اور طریقے اختیار کیے ہیں ان میں سب سے زیادہ خطرناک ہے ٹیلی فون! سانپ کے کاٹے کا منتر تو ہو سکتا ہے مگر ٹیلی فون کے مارے کو تو پانی بھی نہیں ملتا۔

مجھے تو رات بھر اس کمبخت کے ڈر سے نیند نہیں آتی کہ صبح سویرے نہ جانے کس کی منحوس آواز سنائی دے گی۔ دو ڈھائی بجے آنکھ لگ بھی گئی تو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ساری دنیا کی گھنٹیاں اور گھنٹے گھڑیال بیک وقت بجنے شروع ہو گئے۔ مندروں کے پیتل کے بڑے بڑے گھنٹے، پولیس کے تھانے کا گھڑیال، دروازوں کی بجلی والی گھنٹیاں، سائیکلوں کی ٹرنگ ٹرنگ، فائر انجنوں کی کلینگ کلینگ اور جب آنکھ کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اس غیر وقت رات کو کس کا فون آیا ہے؟ ضرور ٹرنک کال ہوگی۔ پل بھر میں نہ جانے کتنے وہم دل دھڑکاتے ہیں۔ ایک دوست مدراس میں بیمار ہے۔ ایک رشتہ دار لندن اور بمبئی کے درمیان ہوائی جہاز میں ہے۔ بھتیجے کا میٹرک کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

میں فون اٹھا کر کہتا ہوں۔ 'ہلو'

دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے۔ ''چنی بھائی، کیم چھو۔''

میں کہتا ہوں کہ یہاں نہ کوئی چتی بھائی ہے نہ کیم چھو۔
مگر وہ کہتا ہے— ''چتی بھائی۔ٹاٹا ڈلیز ڈار پر جا رہا ہے۔''
میں کہتا ہوں— ''جانے دو۔''
وہ گجراتی میں گالی دے کر کہتا ہے— کیسے جانے دیں— برٹش الیکٹرک کے سودے میں پہلے ہی گھاٹا کھا چکے ہیں۔'' میں سمجھاتا ہوں کہ دیکھو بھائی میں چتی بھائی نہیں ہوں۔''
'اوہ۔' ادھر سے آواز آتی ہے جیسے ایک دم ٹائر میں سے ہوا نکل گئی ہو— ''تم چتی بھائی نتھی چھو۔''
میں پوچھتا ہوں۔''آپ کو کون نمبر چاہیے۔''
وہ کہتا ہے۔''ایٹ— سیون— ایٹ— سکس— سکس—''
میں کہتا ہوں— ''یہ تو ایٹ سکس۔ایٹ سیون، سیون ہے۔''
وہ کہتا ہے، ڈانٹ کر: ''تو پہلے ہی کیوں نہیں بولتے رونگ نمبر ہے۔''
میں کہتا ہوں: ''اچھائی بھئی میرا ہی دوش ہے۔اب شما کرو۔''
اور فون رکھ دیتا ہوں۔اور نیند کو واپس بلانے کے لیے بھیڑیں گننا شروع کر دیتا ہوں۔
اور پھر صبح اٹھ کر تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا سلسلہ ہی شروع ہو جاتا ہے۔
''آپ مجھے نہیں جانتے۔آپ کے پرانے وطن پانی پت کے قریب جو قصبہ ہے ریواڑی۔ وہاں سے آیا ہوں، فلم کمپنی میں ہیرو بننے......''
''مجھے آپ سے اپوائنٹ مینٹ چاہیے۔اپنی کہانیاں سنانا چاہتا ہوں۔''
''اگلی اتوار کو ہماری انجمن کا سالانہ جلسہ اور مشاعرہ ہے آپ کو آنا ہی پڑے گا— آپ کے نام کا اعلان پہلے ہی کر چکے ہیں......''
''پرچہ پریس میں رُکا پڑا ہے۔صرف آپ کے مضمون کے انتظار میں......''
''دیکھیے۔آپ مجھے نہیں جانتے۔لیکن کیا آپ مجھے کرپا کر کے راج کپور کا ایڈریس دے سکتے ہیں۔''
کل سویرے کی بات ہے کہ یہی سلسلہ چل رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی— میں نے

ہمت کر کے فون اٹھایا۔

'ہیلو—' میں نے کہا۔ حالانکہ ٹیلی فون کی ڈائرکٹری حکم دیتی ہے کہ 'ہیلو' مت کہو۔

'ہیلو' دوسری طرف سے بڑے ہی یورپین انداز کی آواز آئی۔ میں سمجھا کوئی امریکن یا انگریز بول رہا ہے۔

پھر اس نے انگریزی میں پوچھا۔

''کیا میں خواجہ احمد عباس سے بات کر سکتا ہوں۔''

میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا— ''میں عباس ہی بول رہا ہوں۔ کہیے، کون صاحب بول رہے ہیں۔''

دفعتاً فون کے دوسرے سرے پر انگریزی ہندوستانی میں بدل گئی مگر لہجہ ولایتی رہا۔ جیسے کوئی انگلستان سے پڑھ کر دس برس بعد حال ہی میں لوٹا ہو۔ کیوں بھائی میری آواز پہچان سکتے ہو؟

میں تکلفاً جھوٹ بولا— ''آواز تو آپ کی جانی بوجھی معلوم ہوتی ہے لیکن معاف کیجیے گا۔''

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ بڑے بے تکلف انداز میں مگر لہجہ وہی ولایتی رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انگریزی فوج کا کرنل ہندوستانی بول رہا ہو— ''چھوڑو یار۔ تم میری آواز پورے پچیس برس بعد سن رہے ہو۔ آخری بار ہم لکھنؤ میں ملے تھے۔ انیس سو چھتیس میں۔''

نہ جانے کیسے میرے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی۔ میں نے کہا ''برجیند رکمار سنگھ؟ برجو؟''

ادھر سے آواز آئی: ''رائٹ برجو۔''

برجو، میں نے خوشی سے چلاّ کر کہا— ''کہو بھئی اتنے دن کہاں رہے، کیا کرتے رہے؟ آج کل کیا کرتے ہو؟''

ٹیلی فون پر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دوسری طرف جواب دینے سے پہلے اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی ہو۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز بالکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ جیسے ایک دم کسی گہری فکر میں ڈوب گئی ہو۔ ''یہ سب ایک لمبی کہانی ہے۔ کیا میں تم سے ابھی ملنے آسکتا ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''میں تو شہر سے بہت دور جوہو میں رہتا ہوں۔ مگر ہر روز دوپہر کو میں شہر آتا ہی ہوں۔ ایسا کیوں نہ کریں کل کسی ریستوراں میں اکٹھے لنچ کھائیں۔ اب یہاں بمبئی میں بھی

تمھارے لکھنؤ کی طرح ایک مے فیئر MAY FAIR ریستوراں کھل گیا ہے۔

"مے فیئر؟" اس نے ریستوراں کا نام ایسے دہرایا۔ جیسے دفعتاً کسی نے اس کی چٹکی لے لی ہو۔ "نہیں نہیں۔ میں تم سے کسی ریستوراں میں نہیں ملنا چاہتا۔ وہاں بہت لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ہم اطمینان سے باتیں نہیں کر سکیں گے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "تو تم یہاں ہی آجاؤ۔ میں تمھارا انتظار کروں گا۔ کتنے بجے آؤ گے۔؟"

"جتنی دیر ٹیکسی کو چرچ گیٹ سے جوہو پہنچنے میں ٹائم لگے گا۔"

"کوئی چالیس پینتالیس منٹ میں اپنے برآمدے میں کھڑا ملوں گا۔"

اگلے پینتالیس منٹ تک پچیس برس پرانی تصویریں میرے دماغ میں ابھرتی رہیں۔

برجو۔

برجیندر۔

برجیندر کمار سنگھ۔

برجو۔

ہمارا یار برجو۔

برجو دی بیوٹی فل۔

برجو دی بریلینٹ

برجو جو خوبصورت تھا، قد آور تھا، ذہین تھا، ٹینس کا چمپئین تھا اور یونین میں بہترین مقرر تھا۔

برجو جس کے پیچھے درجنوں لڑکیاں دیوانی تھیں۔

ہائی کورٹ کے جج جسٹس سر رمیش سکسینہ کی بیٹی آشا سکسینہ جو آئی ٹی کالج میں پڑھتی تھی۔

ڈاکٹر ستیش بنرجی کی لڑکی کرونا جس کی خوبصورت آنکھیں جیمنی رائے کی کسی تصویر سے چرائی ہوئی لگتی تھیں۔

پروفیسر حامد علی کی چھوٹی بہن، ثریا ماجد علی جس نے کرامت حسین گرلس اسکول کا پردہ دار ماحول چھوڑ کر یونیورسٹی میں اسی سال داخلہ لیا تھا اور جو ہر ڈبیٹ اور ڈرامے میں یونین ہال میں

سب سے آگے بیٹھتی تھی تاکہ برجو کو دل بھر کر دیکھ سکے۔

سرلا ماتھر جو ہندی میں ایم اے کر رہی تھی اور کویتا لکھتی تھی اور جس کی ہر کویتا میں برجو کا روپ جھلکتا تھا۔

موہنا جسپال سنگھ جو نہایت خوبصورت تھی اور ایک چھوٹے موٹے جاگیردار کی بیٹی تھی اور جس نے صرف برجو کی وجہ سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔

سلویا ٹامسن جو اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی تھی اور ریلوے کلب کے ہر ڈانس میں برجو کو دعوت دینے خود اس کے ہاسٹل جاتی تھی۔ حالانکہ وہاں لڑکیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

برجو—

واقعی وہ کتنا قابل رشک نوجوان تھا۔

پہلی بار جب میری ملاقات اس سے ہوئی تو وہ علی گڑھ یونی ورسٹی کی آل انڈیا ڈی بیٹ میں حصہ لینے لکھنؤ یونی ورسٹی کی طرف سے آیا تھا۔

چھبیس برس بعد بھی مجھے اس سے وہ پہلی ملاقات اچھی طرح یاد تھی۔ میں اپنی یونی ورسٹی یونین کی طرف آنے والے مہمانوں کا استقبال کرنے اسٹیشن گیا۔ اس ٹرین سے لکھنؤ، الہٰ آباد، بنارس، کانپور کے کالجوں کے ڈی بیٹر آئے تھے۔ کل ملا کر وہ سب شاید بارہ چودہ تھے لیکن ان سب میں ایک سب سے نمایاں تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ قد آور تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے سوئٹر میں اس کا کسرتی بدن اپالو کے بُت کی طرح گٹھا ہوا اور سڈول تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اور جب میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس کے شیک ہینڈ میں بڑا خلوص تھا اور گرم جوشی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگوں سے مل کر اسے واقعی بڑی خوشی ہوئی ہے۔ اسی ایک پل ہی میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں بڑے پرانے دوست ہوں اور برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

پھر آل انڈیا ڈی بیٹ ہوئی۔ موضوع زیر بحث یہ تھا کہ:

''سماجی انقلاب کے بغیر سیاسی آزادی کافی نہیں ہے''

میں اس موضوع کے خلاف بولا۔ اپنی تقریر میں میں نے سامراج کے خلاف اور قومی

آزادی کی تحریک کی حمایت میں نہایت جذباتی تقریر کی اوران لوگوں کو خوب لتاڑا جو جنگ آزادی کی قربانیوں اور خطروں سے بچنے کے لیے سماج سدھار کے گوشۂ عافیت میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ میری تقریر ختم ہوئی تو خوب زور کی تالیاں بجیں اور میں نے یہی سمجھا کہ میں نے میدان مارلیا ہے۔

میرے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی کے برجیندر کمار سنگھ کا نام پکارا گیا۔ اب وہ سفید فلالین کی پتلون پر بند گلے کا سیاہ جودھپوری کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لباس میں وہ بڑا ہی بچ رہا تھا۔ ابھی اس نے تقریر شروع نہیں کی تھی کہ اوپر گیلری میں جہاں چکوں کے پیچھے گرلس کالج کی لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں، دلچسپی کی ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی اور چکوں کے بیچ میں سے سیاہ خوبصورت آنکھیں اور رنگین آنچل جھلملانے لگے۔

"مسٹر پریسیڈنٹ" اس نے نہایت شستہ انگریزی لہجہ میں تقریر شروع کی۔ مجھ سے پہلے میرے دوست نے جب اپنی تقریر ختم کی تو سب نے پرجوش تالیاں بجائیں۔ میں نے بھی تالیاں بجائیں۔ وہ تقریر واقعی لاجواب تھی۔ میرے خیال میں بہترین تقریر کے لیے انعام میرے اس دوست ہی کو ملنا چاہیے۔ اس لیے کہ اتنے کمزور دلائل کو اتنی خوبصورتی اور اتنے زور وشور سے پیش کرنا واقعی بڑا کارنامہ ہے۔

اور اس سے پہلے کہ میں یہ فیصلہ کرسکوں کہ وہ واقعی میری تعریف کر رہا ہے یا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ میرے دوست ایک بہت کامیاب وکیل ثابت ہوں گے۔'' اور اس پر سارے ہال میں اتنے زور کا قہقہہ پڑا کہ اس کی لہروں میں میرے تمام زوردار دلائل بہہ گئے۔

اسے ڈی بیٹ میں اول انعام ملا۔ مجھے دوسرا۔ وہ تین دن علی گڑھ ٹھہرا۔ پہلے دن وہ مسٹر برجیندر کمار سنگھ تھا۔ دوسرے دن صرف برج، رہ گیا۔ جب دلوں اور دماغوں کی ہم آہنگی ہو تو غیرت کے فاصلے کتنے جلدی دور ہو جاتے ہیں۔

اسٹیشن پر جب میں اسے چھوڑنے گیا تو میں نے اس سے پوچھا تھا..... ''برج یہ بات کہ سماجی انقلاب سیاسی آزادی سے زیادہ ضروری ہے۔ تم نے ایسی ہی ڈی بیٹ کی خاطر اتنے زور

وشور سے کہی یا تم واقعی اس میں اعتقاد رکھتے ہو؟

پچیس چھبیس برس کے بعد بھی اس کا جواب میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے کہا تھا: ''سنو ملکوں اور قوموں کی آزادی ضروری ہے لیکن اتنی مشکل نہیں۔ سماجی انقلاب جو ہمارے دماغوں کو صدیوں کے تعصبات اور وہموں سے آزاد کرے وہ مشکل کام ہے اور جب تک ہمارے دماغ آزاد نہیں ہوں گے، ہمارے ملک کی سیاسی آزادی غیر مکمل رہے گی۔''

پھر اس نے اور بڑی پتے کی باتیں کہی تھیں۔ فرض کرو ہندوستان آزاد ہو گیا اور ہمارے تمھارے دماغ مذہبی جنون اور فرقہ دارانہ تعصب اور نفرت کے بندھنوں سے آزاد نہ ہوئے تو ذرا سوچو کیا ہوگا۔ اتنے برسوں کی تعلیم اور سماج سدھار کی باتیں کرنے کے بعد بھی ہم پڑھے لکھے ہندوؤں میں سے کتنے ہیں، جنھوں نے اپنے ذہنوں کو پوری طرح ذات پات کے بندھنوں سے آزاد کر لیا ہے؟ تم مسلمانوں میں کتنے ہیں جو سچ مچ شیخ، مغل، پٹھان، جلاہے کمہار کو برابر سمجھتے ہیں۔؟''

میں نے اس سے پوچھا تھا...... ''اور برجو تم......؟'' کیا تمھارا دل اور دماغ ان بندھنوں سے آزاد ہے؟ کیا تم بڑے خاندان کے راجپوت ہو کر ایک اچھوت لڑکی سے بیاہ کر سکتے ہو؟ یا کسی طوائف زادی کو اپنی پتنی بنا سکتے ہو؟''

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا...... ''اگر مجھے اس سے محبت ہو تو ضرور کر سکتا ہوں اور وقت آیا تو کر کے دکھا دوں گا۔''

اور پھر اس کی ٹرین آ گئی اور وہ لکھنؤ واپس چلا گیا۔

اس کے بعد ہم ایک اور آل انڈیا ڈی بیٹ کے سلسلے میں بنارس میں ملے تھے اور سارناتھ کے کھنڈروں میں ساتھ گھومے تھے اور برجو نے مجھے مہاتما بدھ کے حالات زندگی سنائے تھے اور کہا تھا۔ ''اگر دھرم اور مذہب کے خیال ہی سے میں بیزار نہ ہو گیا ہوتا تو ضرور بدھ مت اختیار کر لیتا۔''

جانتے ہو مہاتما بدھ کا دیہانت کیسے ہوا؟ اس نے میوزیم میں مہاتما بدھ کی شانت اور مسکراتی ہوئی مورتی کے سامنے کھڑے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔ ''وہ ایک غریب اچھوت کے

آزادی کی تحریک کی حمایت میں نہایت جذباتی تقریر کی اور ان لوگوں کو خوب لتاڑا جو جنگ آزادی کی قربانیوں اور خطروں سے بچنے کے لیے سماج سدھار کے گوشۂ عافیت میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ میری تقریر ختم ہوئی تو خوب زور کی تالیاں بجیں اور میں نے یہی سمجھا کہ میں نے میدان مارلیا ہے۔

میرے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی کے برجیندر کمار سنگھ کا نام پکارا گیا۔ اب وہ سفید فلالین کی پتلون پر بند گلے کا سیاہ جودھپوری کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لباس میں وہ بڑا ہی بج رہا تھا۔ ابھی اس نے تقریر شروع نہیں کی تھی کہ اوپر گیلری میں جہاں چکوں کے پیچھے گرلس کالج کی لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں، دلچسپی کی ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی اور چکوں کے بیچ میں سے سیاہ خوبصورت آنکھیں اور رنگین آنچل جھلملانے لگے۔

''مسٹر پریسیڈنٹ'' اس نے نہایت شستہ انگریزی لہجہ میں تقریر شروع کی۔ مجھ سے پہلے میرے دوست نے جب اپنی تقریر ختم کی تو سب نے پرجوش تالیاں بجائیں۔ میں نے بھی تالیاں بجائیں۔ وہ تقریر واقعی لاجواب تھی۔ میرے خیال میں بہترین تقریر کے لیے انعام میرے اس دوست ہی کو ملنا چاہیے۔ اس لیے کہ اتنے کمزور دلائل کو اتنی خوبصورتی اور اتنے زور وشور سے پیش کرنا واقعی بڑا کارنامہ ہے۔

اور اس سے پہلے کہ میں یہ فیصلہ کرسکوں کہ وہ واقعی میری تعریف کر رہا ہے یا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ میرے دوست ایک بہت کامیاب وکیل ثابت ہوں گے۔'' اور اس پر سارے ہال میں اتنے زور کا قہقہہ پڑا کہ اس کی لہروں میں میرے تمام زوردار دلائل بہہ گئے۔

اسے ڈی بیٹ میں اول انعام ملا۔ مجھے دوسرا۔ وہ تین دن علی گڑھ ٹھہرا۔ پہلے دن وہ مسٹر برجیندر کمار سنگھ تھا۔ دوسرے دن صرف برج، رہ گیا۔ جب دلوں اور دماغوں کی ہم آہنگی ہو تو غیرت کے فاصلے کتنے جلدی دور ہو جاتے ہیں۔

اسٹیشن پر جب میں اسے چھوڑنے گیا تو میں نے اس سے پوچھا تھا...... ''برج یہ بات کہ سماجی انقلاب سیاسی آزادی سے زیادہ ضروری ہے۔ تم نے ایسی ہی ڈی بیٹ کی خاطر اتنے زور

دشور سے کہی یا تم واقعی اس میں اعتقاد رکھتے ہو؟

پچیس چھبیس برس کے بعد بھی اس کا جواب میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے کہا تھا: ''سنو ملکوں اور قوموں کی آزادی ضروری ہے لیکن اتنی مشکل نہیں۔ سماجی انقلاب جو ہمارے دماغوں کو صدیوں کے تعصبات اور وہموں سے آزاد کرے وہ مشکل کام ہے اور جب تک ہمارے دماغ آزاد نہیں ہوں گے، ہمارے ملک کی سیاسی آزادی غیر مکمل رہے گی۔''

پھر اس نے اور بڑی پتے کی باتیں کہی تھیں۔ فرض کرو ہندوستان آزاد ہو گیا اور ہمارے تمھارے دماغ مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ تعصب اور نفرت کے بندھنوں سے آزاد نہ ہوئے تو ذرا سوچو کیا ہوگا۔ اتنے برسوں کی تعلیم اور سماج سدھار کی باتیں کرنے کے بعد بھی ہم پڑھے لکھے ہندوؤں میں سے کتنے ہیں، جنھوں نے اپنے ذہنوں کو پوری طرح ذات پات کے بندھنوں سے آزاد کرلیا ہے؟ تم مسلمانوں میں کتنے ہیں جو سچ مچ شیخ، مغل، پٹھان، جلاہے کمہار کو برابر سمجھتے ہیں۔؟''

میں نے اس سے پوچھا تھا...... ''اور برجو تم......؟'' کیا تمھارا دل اور دماغ ان بندھنوں سے آزاد ہے؟ کیا تم بڑے خاندان کے راجپوت ہو کر ایک اچھوت لڑکی سے بیاہ کر سکتے ہو؟ یا کسی طوائف زادی کو اپنی پتنی بنا سکتے ہو؟''

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا...... ''اگر مجھے اس سے محبت ہو تو ضرور کر سکتا ہوں اور وقت آیا تو کر کے دکھادوں گا۔''

اور پھر اس کی ٹرین آگئی اور وہ لکھنؤ واپس چلا گیا۔

اس کے بعد ہم ایک اور آل انڈیا ڈی بیٹ کے سلسلے میں بنارس میں ملے تھے اور سارناتھ کے کھنڈروں میں ساتھ گھومے تھے اور برجو نے مجھے مہاتما بدھ کے حالاتِ زندگی سنائے تھے اور کہا تھا۔ ''اگر دھرم اور مذہب کے خیال ہی سے میں بیزار نہ ہو گیا ہوتا تو ضرور بدھ مت اختیار کر لیتا۔''

جانتے ہو مہاتما بدھ کا دیہانت کیسے ہوا؟ اس نے میوزیم میں مہاتما بدھ کی شانت اور مسکراتی ہوئی مورتی کے سامنے کھڑے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔ ''وہ ایک غریب اچھوت کے

ہاں بھیک مانگنے گئے اور اس بیچارے کے پاس گھر میں صرف سڑا ہوا سور کا گوشت تھا۔ وہی اس نے جھولی میں ڈال دیا اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ گوشت سڑ کر زہریلا ہو چکا تھا انھوں نے اسے کھا لیا، جان دے دی مگر کسی غریب اچھوت کا دل نہیں توڑا۔"

پھر جب ہم یہی باتیں سوچتے ہوئے تانگے میں شہر واپس ہو رہے تھے۔ ہم نے دیواروں پر دیوداس فلم کے اشتہار لگے دیکھے تھے اور برجو نے کہا تھا۔ "اور ایک بھائی دیوداس تھے کہ پاروتی کو تو منجدھار میں چھوڑا ہی تھا، چندرا کا دل بھی توڑ دیا اور شراب کے سمندر میں ڈوب گئے مگر سماج نے انسانوں کے درمیان جو کھائیاں کھود رکھی ہیں ان کو پار نہ کر سکے۔"

میں نے کہا تھا۔ "دیوداس کوئی فرضی فلمی ہیرو نہیں تھا۔ شرت بابو نے ایک معمولی انسان کا کردار دکھایا ہے جو سماج کے مقابلے میں ہماری تمھاری طرح کمزور تھا۔"

اور اس نے ہنس کر کہا تھا۔ "تمھاری طرح کمزور ہوگا۔ اگر یہ صورت حال مجھے پیش آئی تو میں کمزور ثابت نہیں ہوں گا۔"

اس رات ہم لوگ بنارس سے رخصت ہو رہے تھے لیکن ہماری ٹرینیں آدھی رات کے بعد روانہ ہونے والی تھیں، میری ٹرین ڈیڑھ بجے اور برجو کی ٹرین پونے تین بجے۔ ڈی بیٹ کے لیے اور جتنے طالب علم مختلف یونی ورسٹیوں سے آئے تھے وہ سب جا چکے تھے۔ صرف میں اور برجو رہ گئے تھے اور ہماری دیکھ بھال کرنے کے لیے بنارس یونی ورسٹی کا ایک ایم۔اے کا طالب علم تھا گوند سکسینہ۔

کھانے کے بعد ہم باتیں کر رہے تھے کہ گوند نے کہا۔ "ریل میں تو ابھی کئی گھنٹے ہیں چلیے آپ لوگوں کو گانا سنوا دیں۔"

میں نے اس وقت تک بھی کسی طوائف کا گانا نہیں سنا تھا، مگر بنارس کی گانے والیوں کی بڑی تعریف سنی تھی کہ پکّے گانے، دادرا اور ٹھمری میں ان کا جواب نہیں۔ سو میں نے کہا "یہ اچھا خیال ہے چلو برجو۔"

مگر اس نے کہا۔ "چھوڑو جی، اچھے خاصے یہاں گپ شپ کر رہے ہیں وہاں کوئی کالی موٹی بھدّی بائی جی پان کھا کھا کے پکّا گانا سنائیں گی اور ہمیں بور کریں گی۔"

اس پر گوند بولا...... ''تم لکھنؤ والے سمجھتے ہو کہ لکھنؤ کے چوک کے باہر حُسن کہیں ہے ہی نہیں— ارے ایک بار لکشمی کو دیکھ بھی لو گے تو نہ جانے لکھنؤ کی کتنی ریلیں نکل جائیں گی۔''

مگر برجو نہیں مانا۔ تمھاری لکشمی بائی تم بنارس والوں کو مبارک— اور سچی بات یہ ہے کہ کوٹھے والیوں کا گانا سننے میں اپنے کو کوئی دلچسپی نہیں۔''

اور مجھے کہنے کا موقع مل گیا...... ''کیوں سماج سدھارک جی ویشیا کے گھر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیا......؟''

برجو کو کہنا ہی پڑا...... ''ڈر تو مجھے شیطان کے گھر جاتے ہوئے بھی نہیں لگتا......'' اور سو ہم لوگ تانگہ لے کر لکشمی کے کوٹھے کے لیے روانہ ہو گئے۔

اتنے برسوں کے بعد بھی لکشمی کی صورت کو میں نہ بھولا تھا۔

چھوٹا سا بوٹا سا قد، گدرایا ہوا جسم، گوری تو نہیں مگر سنہری رنگت، گھنے لمبے بال جن کو دو چوٹیوں میں گوندھا ہوا تھا، بڑی بڑی آنکھیں اور بوجھل لمبی پلکیں۔ لالی رنگے ہونٹ جن پر ایک عجیب سی اداس سی مسکراہٹ سی کھیل رہی تھی۔ چھوٹی سی مگر بڑی خوبصورت سی ناک جس میں ہیرا جڑی ایک چھوٹی سی نتھنی پڑی ہوئی تھی۔ گوند نے میرے کان میں کہا......''اس نتھنی کو اتارنے کے لیے ایک جاگیردار صاحب پچاس ہزار تک پیش کر چکے ہیں۔''

مُجرا شروع ہوا۔ ہمیں ماننا پڑا لکشمی جتنی خوبصورت ہے، اتنی ہی سریلی اس کی آواز ہے۔ ٹھمری کے بعد دادرا اور دادرا کے بعد غزل— گوند کی فرمائش پر ایک آدھ فلمی گیت بھی ہوا۔ محفل میں کتنے ہی لوگ تھے جو بھوکی نظروں سے لکشمی کو گھور رہے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ خود لکشمی کی نگاہیں برجو کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔

آہستہ آہستہ محفل بکھرتی گئی۔ اپنی اپنی جیبیں خالی کر کے لوگ اُٹھتے گئے۔ پھر صرف ہم لوگ رہ گئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کہا ''میری گاڑی کا تو وقت ہو گیا۔ چلو بھئی گوند''

گوند میرے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا لیکن جب برجو نے اُٹھنا چاہا تو لکشمی نے اپنا مہندی لگا چھوٹا سا نرم سا ہاتھ اس کے سخت ٹینس کھیلنے والے ہاتھ پر رکھ دیا۔ آپ کو ہماری قسم کنور صاحب

لکھنؤ کی گاڑی میں تو ابھی بہت دیر ہے......

برجو نے حیران ہو کر پہلے میری طرف دیکھا پھر گوند کی طرف اور پھر لکشمی کی طرف جس کا ہاتھ اب تک اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ ہمارے ساتھ اُٹھنا بھی چاہتا ہے اور لکشمی کو مایوس کرنا بھی نہیں چاہتا۔

میں نے انگریزی میں کہا: شام کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے THIS MEAT IS POISONED اس گوشت میں زہر ہے۔

برجو نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

جانتا ہوں۔ مگر کسی کا دل دُکھانے سے زہر کھالینا بہتر ہے۔

"چلو گوند ہم چلتے ہیں۔" میں نے کسی قدر چڑ کر کہا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرا ایک عزیز دوست ایک گندی نالی میں گر پڑا ہے اور وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا۔

"اچھا تو پھر اگلے سال لکھنؤ کی ڈی بیٹ میں ملیں گے" برجو نے مجھ سے صلح کرنے کے لیے آواز دی مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ برجو کا جو خیالی مجسمہ میں نے اپنے من میں بنایا تھا اس لمحے میں وہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سماجی انقلاب پر تقریر کرنے والا برجو، مہاتما بدھ کے پوتر مارگ پر چلنے والا برجو ایک معمولی رنڈی باز نکلے گا۔

غصّے سے بھرا میں زینے سے اتر ہی رہا تھا کہ آواز آئی "سنیئے" مڑ کر دیکھا تو لکشمی تھی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور اس کے لبوں کے کنارے کانپ رہے تھے۔

"میں نے آپ کے دوست کو روک لیا۔ وہ بولی۔" اس کے لیے میں آپ سے شما مانگتی ہوں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور مڑ کر جانے لگا۔ اس پر اس کی آواز میں تیر کی سی تیزی تھی۔ جانے سے پہلے یہ سنتے جایئے کہ میں انگریزی سمجھتی ہوں، اگر میں زہریلا گوشت ہوں تو کبھی یہ بھی سوچئے گا کہ میرے جیون میں یہ وِش کس نے گھولا ہے۔

میں کوئی جواب نہ دے سکا اور وہاں سے چلا آیا۔

اگلے برس جب میں لکھنؤ آل انڈیا ڈی بیٹ کے لیے گیا تو میں اس واقعہ کو تقریباً بھول چکا تھا۔ یونی ورسٹی کے طالب علموں کا کسی طوائف کے کوٹھے پر گانا سننے جانا یا وہاں رات بھر کے لیے

بھی ٹھہر جانا کوئی ایسا غیر معمولی سانحہ نہیں کہ اس پر برسوں سوچ بچار کی جائے۔ برجو کا رویّہ اس وقت مجھے ضرور برا لگا تھا مگر بعد میں میں نے یہ سوچ کر اسے معاف کر دیا تھا کہ جوانی میں ایک آدھ بار کس کے پیر نہیں لڑکھڑاتے۔

وہ اسٹیشن پر مجھے لینے آیا تھا اور اگلے تین دن تک تقریباً وہ ہر وقت میرے ساتھ ہی رہا۔ وہ بی۔اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر چکا تھا اور اب ایم۔اے میں پڑھ رہا تھا۔ کہنے لگا 'میرے ماں باپ تو چاہتے ہیں' میں آئی، سی، ایس کے مقابلے میں شریک ہوں لیکن میں سرکاری نوکری کرنا نہیں چاہتا۔

میں نے پوچھا: ''تب کیا کرو گے؟''

بولا۔ ایم۔اے کر کے کسی چھوٹے موٹے کالج میں لیکچرر ہو جاؤں گا۔ یا ایل ایل بی کر کے وکالت کروں گا۔ ورنہ تمھاری طرح میں بھی جرنلزم کے میدان میں آ کودوں گا۔

اس نے پورے لکھنؤ کی سیر کرائی اور اس بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لڑکیوں میں کتنا مقبول ہے۔

ہم یونی ورسٹی یونین کے کیفے میں چائے پی رہے تھے کہ کرونا بنرجی مل گئی اور کہنے لگی۔ دیکھو مسٹر برجنیدر کو مارا مارے بنگالی کالج کے پروگرام میں زرور (ضرور) آنا۔ ہم گرودیو کا ناٹک رکتو کروبی کر رہے ہیں۔

اور جب برجو نے کہا، کرونا میرا آنا مشکل ہے۔ یہ میرے دوست علی گڑھ سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کو لکھنؤ کی سیر کرا رہا ہوں۔ تو وہ بولی،، تو اپنے فرینڈ کو بھی لے آیئے نا پلیز اور اُس کی جیمنی رائے کی تصویر جیسی بنگالی آنکھوں میں پیار ہی پیار بھرا ہوا تھا۔

وہاں سے مجھے وہ لائبریری دکھانے لے گیا تو سرلا ماتھر سے ملاقات ہو گئی جو برجو کو گوی سمیلن میں مدعو کرنے کے لیے تلاش کر رہی تھی۔ وہ بولی برجنیدر جی! یہ میں نے ایک نئی کویتا لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر بتایے کہ کیسی ہے، میں کوئی شاعر نہیں بس پڑھنے والی ہوں۔ جب وہ چلی گئی تو برجو نے کویتا مجھے دکھائی۔ عنوان تھا 'میرے سپنے' اور دو ہی سطریں سن کر میں جان گیا کہ اس بیچاری کے سارے سپنوں کا مرکز برجو ہی تھا۔

شام کو ٹینس کلب میں آشا سکسینہ سے ملاقات ہوئی۔ جن کا اصرار تھا کہ برجو ٹینس ٹورنامنٹ

میں مکسڈ ڈبلس کے لیے ان کا پارٹنر بن جائے اور جس انداز سے وہ اسے 'پارٹنر پارٹنر' کہہ کر بلا رہی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ انھیں برجو کو زندگی بھر کا 'پارٹنر' بنانے میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔

ے نیئر ریستوران میں چائے پینے گئے تو وہاں ایک نہایت خوبصورت اور اسمارٹ لڑکی 'ہیلو برجو' کہہ کر دوڑی اور جب برجو نے اس کا تعارف کرایا تو معلوم ہوا وہ ہے موہنا جسپال سنگھ۔ میں نے دیکھا اس کی کاجل لگی آنکھوں میں برجو کو دیکھتے ہی ایک عجیب سی آگ چمک اٹھی ہے اور نہ جانے کیوں مجھے اُن بھوکی، سلگتی ہوئی آنکھوں سے ڈر سا لگا۔

اگلے دن میں نے برجو سے پوچھا۔ ارے یار تم بڑے خوش قسمت ہو کہ یہ سب لڑکیاں تم پر مرتی ہیں۔ مگر اب تک یہ نہ پتہ چلا کہ تم کس میں دلچسپی لیتے ہو یا سب سے ہی فلرٹ کرتے ہو؟

وہ بولا،، میں جس میں دلچسپی لیتا ہوں وہ کوئی اور ہی ہے اور اس سے میں بہت جلد شادی کرنے والا ہوں۔

میں نے کہا: اگر ان سب حسین اور اسمارٹ لڑکیوں کو چھوڑ کر تم نے کوئی اور پسند کی ہے تو وہ واقعی کوئی خاص چیز ہوگی۔ ہمیں بھی ملاؤ۔

اس نے مسکرا کر کہا تھا: خاص چیز تو ہے وہ، اسی لیے میں نے اسے پردے میں رکھ چھوڑا ہے۔

میں نے کہا: ہم مسافروں سے کیا پردہ۔ ہم تمھارے رقیب نہیں ہیں یار۔

تو پھر آج شام کو چار بجے 'ے فیئر' فیر ریستوران میں چائے پیو اور اس سے ملو۔

کون موہنا؟

نہیں موہنا تو بور ہے۔ اگر چہ میرے ماتا پتا اس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ ایک جاگیردار کی بیٹی ہے لیکن جس سے میں تمھیں ملانا چاہتا ہوں وہ کوئی اور ہی ہے۔

چار بجے ے فیئر میں داخل ہوا تو ایک کونے کی میز پر برجو کے پاس سفید ساڑی میں ملبوس ایک لڑکی بیٹھی تھی میں بالکل قریب پہنچ گیا تب بھی اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔

تم ان سے مل چکی ہو؟، برجو نے کہا اور سفید ساڑی والی لڑکی نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

وہ لکشمی تھی!

نمستے! اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

نمستے! میں نے نہایت بددلی سے جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ کر بینڈ کی دھن سننے لگا۔

اس شام کو گومتی کے کنارے گھومتے ہوئے گھنٹوں میں اور برجو اس مسئلے پر باتیں کرتے رہے۔ میں نے کہا' برجو تم پاگل ہو گئے ہو کہ موہنا جسپال سنگھ اور آشا سکسینہ اور کرونا بنرجی اور سرلا ماتھر جیسی خوبصورت پڑھی لکھی بڑے خاندانوں کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس طوائف سے شادی کر کر رہے ہو۔

لکشمی طوائف نہیں! اس نے غصے سے کہا

'' طوائف نہ سہی طوائف زادی سہی، مگر تم نے اس میں کیا دیکھا ہے جو ساری دنیا کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اسے پسند کیا ہے؟

وجہ تو ایک ہی ہے، میرے دوست۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ میری خاطر اپنے گھر والوں کو، اپنے پیشے کو اپنے ماضی کو چھوڑ کر چلی آئی ہے۔ اگلے مہینے ہم شادی کرنے والے ہیں۔

اور تم سمجھتے ہو کہ تمھارے گھر والے تمھیں اس حماقت کی اجازت دے دیں گے؟

مجھے ان کی اجازت نہیں چاہیے۔ زندگی کے ایسے فیصلوں کے لیے کسی کی اجازت نہیں چاہیے۔ ماں باپ کی بھی نہیں، دوستوں کی بھی نہیں۔

'شکریہ' میں نے بڑی تلخی سے کہا تھا۔ تو پھر مجھے یہ سب کیوں سنا رہے ہو۔

چلتے چلتے رک کر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ تمھاری اجازت نہیں چاہیے، تمھاری محبت چاہیے۔ دوست جج بن کر اپنے دوستوں کے اعمال کی جانچ پڑتال نہیں کرتے۔ ان کو اپنی دوستی اور محبت کی چھاؤں میں پناہ دیتے ہیں۔

اس کے بعد میرا کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں نے صرف اتنا پوچھا تھا۔ تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

اس نے کہا تھا، کل میں اپنے وطن جا رہا ہوں۔ اپنے ماں باپ کو اس فیصلے کی اطلاع دینے۔ ماتا جی بیمار ہیں اس لیے خط لکھ کر ان کو ایک دم SHOCK دینے کے بجائے خود جا کر انھیں زبانی سمجھانا چاہتا ہوں اور اگر وہ لوگ راضی نہ ہوئے تو؟

تو ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر یہ شادی ہوگی اور اس کے کہنے کے انداز میں اتنی

قطعیت تھی کہ میں خاموش ہو گیا۔

اگلے دن ہم اکٹھے ہی اسٹیشن پر گئے۔ پہلے اس کی گاڑی جاتی تھی اس کے بعد میری۔ ٹکٹ کھڑکی پر جا کر جب اس نے کہا، ایک فرسٹ کلاس شام نگر، تو بابو نے پوچھا، سنگل یا ریٹرن۔

'ریٹرن' اس نے بڑے زور سے کہا۔ ہمیشہ واپسی کا ٹکٹ ہی لینا چاہیے۔

لکشمی بھی اسے چھوڑنے اسٹیشن پر آئی تھی۔ جب گارڈ نے سیٹی دی اور جھنڈی ہلائی اور برجو اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار ہوا تو لکشمی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔

اری پگلی، گھبراؤ نہیں، برجو نے چلتے چلتے چلا کر کہا،، میں تو پرسوں ہی لوٹ آؤں گا۔ یہ دیکھ تین دن کا ریٹرن ٹکٹ۔

ریل چل پڑی تھی اور ریل میں برجو تھا۔ برجو کے ہاتھ میں ایک ہرا واپسی کا ٹکٹ تھا۔ پھر ریل آگے جا کے اپنے دھوئیں کے بادل میں کھو گئی اور اب نہ ریل تھی نہ برجو اور نہ وہ واپسی کا ٹکٹ اور اب پلیٹ فارم پر صرف لکشمی تھی۔ لکشمی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ان آنسوؤں میں پریتم سے بچھڑنے کا غم بھی تھا اور اس سے جلد پھر ملنے کی آرزو اور امید بھی تھی۔

میں علی گڑھ واپس چلا آیا۔ امتحان کی تیاریوں میں لگ گیا۔ چند ہفتے میں نے برجو کے خط کا انتظار کیا مگر کوئی خط نہ آیا۔ میں نے سوچا نئی نئی شادی ہوئی ہے، شاید ہنی مون پر کہیں گئے ہوں۔ پھر امتحان کے چکر میں سب کچھ بھلانا پڑا۔ امتحان ختم ہوا تو مجھے نوکری کے سلسلے میں بمبئی آنا پڑا۔ نئے نئے کام کا ایسا چکر پڑا کہ علی گڑھ، لکھنؤ، برجو، لکشمی سب پرانی یادیں بن کر کھو گئے۔ 1943 کا سیاسی ہنگامہ آیا 1946 میں فساد اور خون خرابے ہوئے۔ 1947 میں آزادی آئی میں کئی بار دنیا کے سفر کو گیا۔ زندگی میں کتنی ہی خوشیاں اور کتنے ہی غم آئے اور بگولوں کی طرح گزر گئے۔ کتنی ہی کامیابیوں اور ان سے بھی زیادہ پریشانیوں اور ناکامیوں سے دو چار ہونا پڑا پھر بھی برجو اور لکشمی کی یاد ایک سوالیہ نشان بن کر میرے دل کے کونے میں دبکی رہی اور اس صبح جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، وہ سوالیہ نشان دن دہاڑے ایک بھوت بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

اس بار گھنٹی بجی تو وہ ٹیلیفون کی نہیں تھی، دروازے کی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ ایک ڈھیلی سی ملگجی سی بش شرٹ اور پتلون پہنے ایک بوڑھا سا آدمی

کھڑا، موٹے موٹے شیشوں کے عینک سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کا پورٹ فولیو تھا۔ جیسا انشورنس ایجنٹ رکھتے ہیں۔ عین اسی وقت جب میں اور برجو پچیس برس کے بعد ملنے والے تھے یہ بوڑھا انشورنس ایجنٹ نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔

کیا چاہیے؟ میں نے قدرے درشتی سے پوچھا۔

جھریوں دار گہرے سانولے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کہا: کیوں بھول گئے؟

برجو—اگلے لمحے ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہورہے تھے۔

میں بہت بدل گیا ہوں نا؟ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ تم نے بھی نہیں پہچانا۔

یہ واقعہ تھا کہ پچیس برس پہلے کے برجو اور اس بوڑھے میں کوئی دور کی بھی مشابہت نہ تھی میں نے سوچا ضرور بے چارہ سخت بیمار رہا ہوگا۔ تبھی تو اس کے چہرے اور بازوؤں پر کھال اس طرح لٹکی ہوئی ہے جیسے اس کے ڈھیلے کپڑے۔ میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ پچیس برس میں ہم سب ہی بدل گئے ہیں۔ مجھے ہی دیکھو چندیا بالکل صاف ہوگئی ہے۔

اس نے کہا۔ میں نے تمھارا نام ٹیلیفون ڈائریکٹری میں تلاش کیا۔ امید تو نہ تھی۔ تم ملو گے۔ سنا ہے اکثر ہندوستان سے باہر رہتے ہو۔

ٹیلیفون کے ذکر پر میں نے کہا: میں تو فون پر تمھاری آواز سن کر سمجھا تھا کوئی انگریز یا امریکن ہے جس سے میں کہیں سفر میں ملا ہوں گا۔،،

اوہ میرا ACCENT ایکسنٹ؟ میں بھی تو کتنے ہی برس انگلستان میں رہا ہوں۔ ویسے ہی بات کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔

نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بات کہنا چاہتا ہے اور اسی بات کو چھپانا بھی چاہتا ہے۔ کئی قسم کے خیالات اور خدشے میرے دماغ میں آئے۔

شاید اس کی نوکری چھوٹ گئی ہے۔ بیکار ہے۔ شاید مدد مانگنے آیا ہے۔ شاید اس کو شراب کی لت پڑ گئی ہے، تب ہی بہکا بہکا سا لگتا ہے اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کانپتی ہیں۔ شاید اس نے کوئی جرم کیا ہے اس لیے اس کی آنکھیں بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھ رہی ہیں۔ کچھ سیکنڈ

تک ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے میں اپنے ماضی کی تلاش کرتے رہے۔ پھر میں نے کہا:
کیوں بھئی اکیلے ہی آئے ہو۔ بھابی ساتھ نہیں ہیں کیا؟

اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا میں نے طلاق لے لی ہے۔،،

لیکن اب کم سے کم اس کی پریشانی کی وجہ تو معلوم ہوگئی۔ اتنے برسوں کے شدید عشق کے بعد اگر طلاق کی نوبت آئی ہے تو اس حالت پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میں نے کہا: بڑا افسوس ہے برجو، لیکن ہوا کیا، جو طلاق لینی پڑی؟ اس عمر میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے،،

میاں بیوی! اس نے دونوں لفظوں کو کسی کڑوی دوا کی طرح تھوکا۔ پہلے دن ہی سے ہماری شادی ایک جھوٹ تھی۔ ایک بھیانک غلطی تھی۔ چوبیس برس تک میں نے اس غلطی سے نباہ کیا۔ اس جھوٹ کو سچ کرنے کی کوشش کی لیکن میں کامیاب نہ ہوا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ میرے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ بے چارا مجھ سے کوئی صلاح مشورہ کرنے کے لیے نہیں اپنے دل کا بخار نکالنے کے لیے آیا تھا۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے ایک سگار جلایا اور منہ سے دھوئیں کا ایک بادل اڑاتا ہوا بولا۔ تم سوچ رہے ہو نا کہ میں اتنے برس کہاں غائب رہا۔ شادی کے فوراً بعد ہی میں بیوی کو اپنے ماں باپ کے پاس چھوڑ کر انگلستان چلا گیا۔ آئی سی ایس کا امتحان دیا اور بدقسمتی سے پاس ہوگیا۔

''تو تم آئی سی ایس میں تھے اور ہمیں کبھی پتہ ہی نہ چلا؟''

میں کسی کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ تم لوگ ان دنوں سرکاری نوکریوں کا بائیکاٹ کر رہے تھے۔ ستیا گرہ کر کے جیل جا رہے تھے۔ میں کس منہ سے تم لوگوں کے سامنے آتا۔ اس لیے میں نے جان بوجھ کر ایسے ایسے مقام چنے جہاں کسی پرانے دوست سے ملاقات نہ ہو۔ پہلے کئی سال فرنیٹر میں رہا پھر آسام میں۔ پھر کورگ میں، وہیں ہمارا پہلا لڑکا پیدا ہوا۔

کتنی ہی دیر وہ دھوئیں کے بادلوں میں نہ جانے کیسی کیسی تصویریں بناتا اور بگاڑتا رہا۔ پھر بولا: مگر وہ لڑکا ہمارا نہیں تھا۔ وہ اس کا لڑکا تھا۔ جو میرے ایک چپراسی سے پیدا ہوا تھا

جب مجھے یہ معلوم ہوا تو تم سمجھ سکتے ہو کہ میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ چند مہینے تک تو میں بالکل پاگل ہو گیا۔ شراب تو میں پہلے بھی پیتا تھا لیکن اب میں نے اپنی ذلت کو ڈبونے کے لیے اندھا دھند پینا شروع کر دیا۔ جب وہسکی سے کام نہ چلا تو کوکین کھانے لگا۔ تین مہینے پاگل خانے میں علاج کرایا اور جب علاج کر کے حواس پر کسی قدر قابو پایا اور باہر نکلا تو نوکری سے استعفیٰ دینا پڑا۔ ذلیل ہو کر نکالے جانے سے یہی بہتر تھا کہ میں خود ہی بیماری کا بہانہ کر کے، وقت سے پہلے پنشن کی درخواست دے دوں۔ میں نے اس کی منت کی کہ مجھے طلاق دے دو اور بچہ لے جاؤ۔ میری ساری پنشن لے لو۔ مجھے چھوڑ دو تا کہ میں اپنی نئی زندگی بنا سکوں لیکن وہ نہ مانی۔ 'بولی' تم نے میری زندگی تباہ کی ہے، اب تم مجھ سے اتنی آسانی سے چھٹکارا نہ پاؤ گے۔''

پھر؟ میں نے نرمی سے کہا۔

پھر میں ان دونوں کو لے کر انگلستان چلا گیا۔ ہندوستان میں اب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھا۔ پنشن بیچ کر جتنا روپیہ وصول ہوا، اس سے میں نے لندن میں مکان خرید لیا۔ ایک حصے میں ہم خود رہتے تھے اور باقی میں ہندوستانی اور افریقن طالب علم کرایہ دے کر رہتے تھے بس یہی ہمارے گزارے کی صورت تھی۔

'پھر؟'

پھر وہی پرانی کہانی دہرائی جاتی رہی۔ اب مجھ میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ میں اس بدکار سے کچھ باز پرس بھی کر سکتا۔ رات کو جب تک 'پیاؤ' بند نہ ہوتا میں وہاں بیٹھا شراب پیتا رہتا تھا اور وہ نوجوان طالب علم کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرتی تھی۔ دس سال میں تین اور بچے ہو گئے۔ ایک بالکل کالا۔ ایک سانولا۔ ایک گورا۔

مجھے اپنے دوست کی حالت پر رحم بھی آرہا تھا اور غصہ بھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول ہی پڑا اور تم نامردوں کی طرح سب دیکھتے رہے اور تم سے نہ ہوا کہ دو جوتے رسید کرتے اور نکال باہر کرتے اس چھنال کو۔ میں نے چوبیس برس ہوئے تم سے کہا تھا۔ برجو، رنڈی کی بیٹی سے سوائے بے وفائی کے تم اور کچھ نہ پاؤ گے۔

رنڈی کی بیٹی؟ اس نے حیرت سے دہرایا۔

ہاں ہاں رنڈی کی بیٹی لکشمی! میں نے نفرت سے بھرپور لہجے میں وہ نام لے ہی ڈالا جو اتنی دیر سے ہم دونوں کے درمیان ایک پہیلی بنا ہوا تھا، جس کو بوجھنے کی ہمت نہ مجھ میں تھی نہ اس میں۔

لکشمی؟ اس نے ایسے لہجے میں دہرایا جیسے عمر میں پہلی بار یہ نام سنا ہو۔ پھر وہ بے اختیار ہنس پڑا اور ہنستا رہا، ہنستا رہا۔ ایک قہقہے کے بعد دوسرا قہقہہ، اسے ہنسی کا دورہ پڑ رہا تھا لیکن اس ہنسی میں ایک کھوکھلی سی آواز ہی آواز تھی کوئی مسرّت نہ تھی۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔

تو تم سمجھ رہے ہو کہ میں اب تک، تم سے لکشمی کا ذکر کر رہا ہوں؟

تو اور کیا؟ میں نے کہا: اسی سے تو تم نے شادی کی تھی نا؟

کاش ایسا ہی کیا ہوتا۔ دوست اس نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سی سانس بھر کر کہا۔ مگر جس سے میری شادی ہوئی وہ طوائف کی بیٹی لکشمی نہیں تھی — ایک جاگیردار کی بیٹی موہنا تھی۔

موہنا — اور میں نے اس حسین چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی جو میں نے لکھنؤ کے ے فیئر ریستوران میں دیکھا تھا اور پچیس برس کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ کاجل کا حاشیہ لگی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب آگ چمک رہی تھی۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن اسی آگ میں برجو کی زندگی جھلس جائے گی اور لکشمی؟ میں نے پوچھا۔ لکشمی کا کیا ہوا؟ آخری بار جب ہم لکھنؤ میں ملے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم تین دن کا واپسی کا ٹکٹ لے کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ اپنے ماں باپ کو اس شادی کی اطلاع دینے؟"

جواب میں اس نے کچھ نہ کہا۔ جیب سے ایک پُرانا بٹوا نکالا اور اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ۔ اس کاغذ کی تہوں میں سے ایک ریلوے ٹکٹ کا آدھا حصّہ نکالا جو برسوں کے بعد اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ اس پر چھپے ہوئے سب حروف غائب ہو گئے تھے۔ صرف اس کے سائز سے معلوم ہوتا تھا کہ کبھی یہ ریٹرن ٹکٹ کا واپسی والا آدھا حصّہ رہا ہوگا۔

اب میں کچھ کچھ سمجھا کہ کیا ہوا ہوگا۔

تو جب تم گھر پہنچے تو کنور صاحب اور کنور رانی کو قائل نہ کر سکے؟ تمھارے ماتا پتا نے تمھیں جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی؟

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔

انھوں نے تمھیں لکھنؤ واپس جانے سے بھی روک دیا؟

اس کے سر کی جنبش نے اثبات میں جواب دیا۔

انھوں نے زبردستی تمھاری شادی اپنے جاگیردار دوست کی بیٹی موہنا سے طے کردی؟ انھوں نے تمھیں انگلستان بھیجنے کا لالچ دیا۔ انھوں نے تمھیں ڈرایا کہ اگر تم نے طوائف کی بیٹی سے شادی کر کے سماج میں طوفان برپا کیا تو تمھیں نہ صرف آئی سی ایس سے ہاتھ دھونا پڑے گا بلکہ کوئی بھی معقول نوکری نہ مل سکے گی۔

اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟

میں نے کہا ایسا ہمارے ملک میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ فلموں میں بھی۔ زندگی میں بھی۔ اور اُن دنوں میں تو اور ہی کچھ ہوتا تھا۔ سماجی انقلاب کے بارے میں تقریر کرنا اپنی زندگی میں انقلاب لانے سے زیادہ آسان تب بھی تھا اور اب بھی ہے۔

اپنی اسی کمزوری کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہوں۔ میں جو دیوداس کی کمزوری پر ہنستا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایسی باتیں کر کے اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا ہے۔

''اور سنور یٹرن ٹکٹ کی تین دن کی مدّت گزر گئی اور تم لکھنؤ وپس نہ آئے اور واپسی کا حصّہ بے کار تمھاری جیب میں پڑا رہا؟''

یہی تو مشکل ہے، میرے دوست'' اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے'' زندگی کے سفر میں ریٹرن ٹکٹ نہیں ملتا۔ جہاں سے ہم چلے ہیں اور جن مقاموں سے گزرے ہیں، ہزار کوشش کرنے پر بھی ہم وہاں لوٹ کر نہیں جا سکتے۔

تو اب کیا ارادہ ہے؟ میں نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

برجو نے کہا میں نے موہنا کو لندن کا گھر دے دیا ہے۔ اپنی ساری جائیداد اس کے نام لکھ دی ہے۔ اس قیمت پر وہ مجھے طلاق دینے پر راضی ہوئی ہے۔

'تو کیا وہ — موہنا — ہمیشہ سے ایسی تھی؟'

''نہیں۔ تب ہی تو پچیس برس نباہ کرنے کی کوشش کی میں نے۔

پھر ایسی کیسے ہوگئی؟

کچھ دیر تک برجو خاموش رہا۔ اس نے نیا سگار جلایا۔ آہستہ آہستہ اس نے کئی کش لیے۔ پھر وہ بولا گنا ہگار تو میں ہی ہوں۔ میں اسے وہ کچھ نہ دے سکا جسے وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔ کوشش کرنے کے باوجود میں اس سے محبت نہ کر سکا۔

تو کیا، اسے لکشمی کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا؟''

''شادی کے سال بھر بعد معلوم ہو گیا تھا۔ اس وقت میری پوسٹنگ فرینٹر میں تھی۔ ایک رات میں کلب سے بہت شراب پی کر لوٹا تھا۔ جب میں اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے گیا تو چاندنی میں دیکھا کہ سفید کپڑے پہنے لکشمی میرے پلنگ پر لیٹی ہے۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ بہت پیار کیا۔ اس نے کہا برجو تم رو رہے ہو؟ کیا ہوا؟ میں نے کہا۔ وعدہ کرو اب مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جاؤ گی لکشمی، لیکن وہ لکشمی نہیں تھی۔ اور اس رات کے بعد سے موہنا بھی وہ نہ رہی کچھ اور ہی ہو گئی اس نے میرے ساتھ شراب پینا شروع کی۔ پھر دوسروں کے ساتھ۔ اس کے بعد جو ہوا وہ تم کو معلوم ہی ہے۔ مگر میں اب بھی اس کو دوش نہیں دیتا۔ اپنی تباہی اور اس کی تباہی دونوں کا ذمہ دار میں ہوں۔''

اور لکشمی۔

اس کی زندگی بھی میری وجہ سے تباہ ہو گئی۔ جب میرا سہارا چھوٹ گیا تو اسے اپنی ماں کے پاس جانا پڑا۔ وہ سب کرنا پڑا جس سے صرف میں اسے بچا سکتا تھا۔ بنارس سے دہلی کے چاوڑی بازار میں آئی۔ وہاں سے کلکتہ کے سونا گاچی میں۔ وہاں سے بمبئی کے فارس روڈ پر۔

اب سنا ہے کہ وہ بوڑھی اور بیمار، اس دھندے کے لیے بے کار ہو کر بنارس لوٹ گئی ہے۔ وہاں کسی مندر کی سیڑھیوں پر پڑی ہے اور......اور؟

'اور؟' میں نے پوچھا۔

میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔

اس شام کو جب میں اسے چھوڑنے اسٹیشن پر گیا اور ہم ٹکٹ خریدنے لگے تو بابو نے حسب معمول پوچھا: سنگل یا ریٹرن۔ تو برجو نے جلدی سے کہا 'سنگل' اور پھر پلیٹ فارم پر پہنچ کر مجھ سے بولا: یہ میرا آخری سفر ہے۔ اس پر مجھے واپسی کے ٹکٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔

ٹرین روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک عجیب معجزہ دیکھا۔ وہ جھریوں دار چہرے اور کھچڑی بالوں والا بوڑھا، اب بوڑھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے گال ایک عجیب مسرت اور جوش سے تمتما رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی زندگی چمک رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک کردار پن آ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے وہ اپنا وہی پچیس برس والا برجو لگا۔

میں نے کہا: برجو لکشمی بھابی کو میرا پرنام ضرور کہنا۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم تمھارے رقیب نہیں ہیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ نئے نویلے دولھا کی طرح شرما رہا ہے۔

○

# سنترے

رات کے اندھیرے میں سمندر میں ستارے تیر رہے تھے۔

دفعتاً ایک ستارہ ٹوٹا اور روشنی کی لکیر بناتا ہوا فضا کی تاریک گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔

ہوائی جہاز کی کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئی آشا نے سوچا۔ ستارا ٹوٹنا تو برا شگون ہوتا ہے نا! نہ جانے آج کیا ہونے والا ہے! اور ایک نامعلوم خوف سے وہ کانپ اٹھی۔ مگر پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ سب واہمہ ہے۔ اگر ہر بار ستارہ ٹوٹنے پر ہوائی جہاز کریش(CRASH) ہوجایا کرے تو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرنا ہی چھوڑ دیں! اور پھر اس وقت تو اس سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ساری دنیا میں نہ ہوگی! یہ جو گوراچٹا شخص اس کے برابر کی سیٹ پر کمبل اوڑھے سو رہا ہے۔ بلدیوراج کوہلی، جس کے ہاتھ میں اس وقت آشا کا ہاتھ ہے اور جس کے ساتھ وہ کل بمبئی سے بوئنگ جیٹ ہوائی جہاز میں ساری دنیا کی سیر کو روانہ ہونے والی ہے، یہ رائے بہادر سرجیت، کوہلی کا اکلوتا بیٹا ہے اور رائے بہادر سرجیت کوہلی، آٹھ بڑے ہوٹلوں کے مالک ہیں جو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں! دہلی میں راج محل، بمبئی میں کارلٹن، مسوری میں ہمالیہ گرینڈ، نینی تال میں، لیک ویو، کلکتے میں 'ایسٹ انڈیا' لکھنؤ میں 'گومتی پیلیس'، ناگپور میں 'ماؤنٹ بیٹن'، اوٹا کمنڈ

میں 'بلیو ماؤن ٹین' اور مدراس میں، 'نیر ینا'۔ دل ہی دل میں یہ فہرست دہرا کر وہ آپ ہی آپ مسکرادی کیونکہ بل دیو کے منہ سے اس نے یہ نام اتنی بار سنے تھے کہ اسے زبانی حفظ ہو گئے تھے۔ بل دیو کو اپنے باپ کی اس 'ہوٹل ایمپائر' پر بڑا ناز تھا اور اس نے آشا سے وعدہ کیا تھا کہ جب یہ سلطنت اس کے قبضے میں آئے گی تو وہ دہلی میں ہندوستان کا سب سے بڑا، سب سے خوبصورت اور سب سے عالیشان ہوٹل تعمیر کرائے گا اور اس کا نام ہوگا 'آشا پیلیس' اور یہ وعدہ یاد کر کے آشا نے ہلکے سے محبت اور تفکر سے بلدیو کا ہاتھ دبادیا۔ بلدیو کا ہاتھ جو اسکن لوشن اور ہینڈ کریم کے استعمال سے نرم رہتا تھا، جس پر محنت نے کوئی گٹھا نہیں ڈالا تھا۔ جس کی انگلیوں کے ناخن 'راج محل' ہوٹل کی حسین 'مینی کیورسٹ' لڑکیاں بڑے اہتمام سے تراشتی تھیں ان کو نوکیلا بنا کر ان پر نیل پالش لگاتی تھیں۔

بلدیو کے ہاتھ کی نرمی اور گرمی میں کتنے ہی خوش آئند وعدے تھے۔ بمبئی سے وہ بوئنگ میں قاہرہ جائیں گے۔ وہاں نیل کے کنارے دنیا کے مشہور ہوٹل 'نائل ہلٹن' کے کلیوپیٹرا سویٹ میں ٹھہریں گے، اونٹ پر بیٹھ کر اہرام مصر کے سامنے تصویر کھنچوائیں گے۔ کیبرے میں نیم برہنہ مصری لڑکیوں کا ناچ دیکھیں گے۔ پھر لندن جائیں گے۔ وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل 'سیوائے' میں ٹھہریں گے، بکنگھم پیلیس کے سامنے مَلِکہ کے گارڈز کے ساتھ تصویر کھنچوائیں گے۔ پھر پیرس میں فرانس کے سب سے مہنگے ہوٹل 'جارج پنجم' میں ٹھہریں گے اور پھر نیویارک میں والڈروف ایسٹوریا، پھر شکاگو اور پھر لاس اینجلس LOS ANGELES جہاں آشا ہالی ووڈ اسٹارس کے آٹوگراف لے گی اور گریگری پیک GREGORY PECK کے ساتھ تصویر کھنچوائے گی، جو 'آن لوکر' اور 'ایوز ویکلی' میں شائع ہوگی اور جسے دیکھ کر اس کی ساری سہیلیاں رشک سے جل مریں گی اور پھر وہ ٹوکیو جائیں گے اور وہاں کے 'امپیریل ہوٹل' میں قیام کریں گے اور پھر ہانگ کانگ اور سنگاپور کے مشہور ہوٹلوں کا معائنہ کرتے ہوئے واپس آ جائیں گے۔

'بات یہ ہے ڈارلنگ!' بلدیو نے خود ہی آشا کو سمجھایا تھا۔ ڈیڈی اس سفر پر مجھے بھیج رہے ہیں، تاکہ میں دنیا کے سب سے بڑے ہوٹلوں کے انتظام کو اچھی طرح سے مطالعہ کر کے کر ان کے طور طریقوں کو اپنے ہوٹلوں میں رائج کرسکوں اور ان سب ہوٹلوں کے مالک میرے ڈیڈی

کے دوست ہیں اور ہندوستان میں ہمارے مہمان رہ چکے ہیں، اس لیے ان میں سے ہر ایک نے بڑے اصرار سے ہمیں مدعو کیا ہے اور چونکہ ہر جگہ میرے لیے دو آدمیوں کا سوئیٹ ریزرو کیا گیا ہے، اس لیے ڈیڈی نے کہا، تم چاہو تو ساتھ اپنی کسی فرینڈ کو لے جاؤ، سو، ڈارلنگ، ہندوستان واپس آکر ہماری شادی تو ہوگی ہی لیکن پہلے ساری دنیا کا دورہ کر کے ہنی مون منا لیا جائے۔!'' اور پھر نقلی امریکن لہجے میں اس نے کہا تھا۔

''اینڈ دیٹ گوئن بی وِنڈرفل سویٹی پائی'' ! .AIN'T THAT GONNA BE WONDERFUL

SWEETE PIE? اور بل دیو کا وہ بچکانہ لہجہ یاد کر کے آشا مسکرا دی۔

ہوائی جہاز میں تقریباً اندھیرا تھا۔ زیادہ تر مسافر سو رہے تھے۔ سامنے کی سیٹ پر ایک موٹے تازے سیٹھ صاحب بڑے زور سے خراٹے لے رہے تھے، جن کی آواز ہوائی جہاز کی گھڑگھڑاہٹ پر بھی حاوی تھی۔ ان کے برابر میں سیٹھانی بچے کو گود میں لیے سو رہی تھی۔ راستے کی دوسری طرف ایک اینگلو انڈین جوڑا ایک ہی کمبل تانے سو رہا تھا۔ ان سے اگلی سیٹ پر ایک کھدر پوش منسٹر اپنی سیٹ کے اوپر لگی ہوئی ننھی سی ریڈنگ لائٹ جلائے ایک امریکن جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے۔ ان کے برابر میں شارک اِسکن کا سوٹ پہنے ایک سندھی بیوپاری تھا، جو منسٹر صاحب سے کانا پھوسی کرتے کرتے سو گیا تھا۔

آشا نے سوچا، یہ نائٹ ایئرمیل کا سفر بھی کتنا دلچسپ اور کتنا عجیب ہوتا ہے۔ اور اس اندھیرے ہوائی جہاز میں جو اپنی مستقل رفتار سے اندھیرے کے سمندر میں تیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کو بیٹھے بیٹھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ صرف تین گھنٹے پہلے دہلی کے پالم ایئرپورٹ سے نہیں روانہ ہوئی بلکہ عمر بھر سے اسی نائٹ ایئرمیل میں سفر کر رہی ہے اور یہ زندگی کا ہوائی جہاز ہمیشہ یوں ہی اس لامتناہی فضا میں اڑتا رہے گا، بہتا رہے گا کیونکہ وقت کے اس سمندر کا کوئی کنارا نہیں ہے...... یہاں تک کہ ایک دن وہ اور یہ تمام مسافر، یہ ساری دنیا، ایک عمیق سناٹے میں ڈوب جائیں گے اور کائنات کے نظام میں اتنا فرق بھی نہیں پڑے گا، جتنا کروڑوں ستاروں میں سے ایک ستارہ ٹوٹ جانے سے پڑتا ہے۔

اور اسی لمحہ میں یکا یک ہوائی جہاز کی ساری روشنیاں جل اٹھیں اور کچھ لوگ ہڑبڑا کر اٹھ

بیٹھے۔ مگر وہ اینگلو انڈین جوڑا اسی طرح کمبل میں لپٹا لیٹا رہا اور سیٹھ جی بہ دستور خراٹے لیتے رہے۔ آشا نے دیکھا کہ سیٹھانی بچے کو دودھ پلاتے پلاتے سو گئی تھیں اور بچہ ابھی تک ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ کھدر پوش منسٹر صاحب نے روشنی ہوتے ہی وہ امریکن جاسوسی ناول جس کے اوپر ایک نقاب پوش پستول باز اور ایک نیم برہنہ مردہ عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی، بند کر کے جلدی سے اپنے کھدر کے تھیلے میں ڈال لیا، جس کے دونوں طرف مہاتما گاندھی کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور اس میں سے پنج سالہ پلان کے بارے میں ایک موٹی سی رپورٹ نکال کر ہاتھ میں لے لی، تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت، یعنی جب پریس فوٹوگرافر تصویر لینے آئیں تو کام آئے۔

اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھنے کے لیے آشا نے دھیرے سے اپنا ہاتھ بلدیو کے ہاتھ سے نکال لیا۔ اندھیرے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ اس وقت اسے بلدیو کے ہاتھ کی ملائمت ایسی لگی، جیسے مچھلی، مینڈک یا سانپ کے چکنے جسم کی ملائمت اور بے اختیار اس نے اپنے ہاتھ کا پسینہ کمبل سے رگڑ کر خشک کر دیا۔

لاؤڈ اسپیکر پر ائیر ہوسٹس کی آواز سنائی دی — جس کا لہجہ اسی طرح سدھا ہوا اور جچا تلا تھا، جیسے اس کے سانولے چہرے پر مستقل چپکی ہوئی مسکراہٹ، اور اس آواز نے کہا: ''چند منٹ میں ہمارا ویمان ناگپور کے ہوائی اڈّے پر اترے گا۔''

ناگپور!

ناگپور!

ناگپور!

ہزاروں لاکھوں آوازوں کا کورس آشا کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ناگپور! ناگپور! ناگپور!!!

وائلن ایک ساتھ بیتھوون BEETHOVEW کا کوئی نغمہ سنا رہے تھے۔ روی شنکر کے ستار اور علی اکبر کے سَرود کی جُگل بندی سے ساری کائنات جھنجھنا رہی تھی۔ مدورا اور کانجی ورم کے تمام مندروں کی گھنٹیاں بہ یک وقت بول پڑیں اور اس موسیقی کے سمندر میں صرف ایک لہر

۔۔ تھی، ایک لے تھی، ایک آہنگ، ایک سُر، ایک تال ۔۔ ناگپور! ناگپور! ناگپور!

اور وہ ہوائی جہاز اب فاصلے کی منزلیں نہیں طے کر رہا تھا، وقت کی حدوں پر سے اڑتا ہوا ماضی کی طرف جا رہا تھا۔

☆

وہ اب بھی ہوائی جہاز میں بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ ہوائی جہاز اب بھی ناگپور ہی کے ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا۔

مگر وقت اور تھا، دنیا اور تھی، وہ خود اس وقت کچھ اور تھی۔

وہ اس دن کتنی خوش تھی! جب لڑکی اٹھارہ برس کی ہو اور پھر خوبصورت بھی ہو تو بلا وجہ بھی خوش ہو سکتی ہے مگر اس دن خوش ہونے کی کتنی ہی وجوہات تھیں۔ اس دن اس کا بی۔ اے کا نتیجہ بھی نکلا تھا اور وہ پاس ہو گئی تھی۔ اسی دن اسے دہلی سے منسٹری آف ایجوکیشن کا خط ملا تھا کہ امریکن اسکالرشپ کے لیے جو اس نے درخواست دی تھی، اس کے لیے وہ پہلے سلیکشن میں آ گئی ہے۔ انٹرویو کے لیے دہلی آنا ضروری ہے۔ سرکاری خط، حسبِ معمول دیر سے ملا تھا۔ انٹرویو اگلے دن، صبح کے گیارہ بجے تھا اور وقت پر پہنچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ وہ نائٹ ایئر میل سے روانہ ہو جائے۔ اس کے سب گھر والے اسے چھوڑنے مدراس ایئرپورٹ آئے تھے۔ چلتے چلتے ماں نے ہدایت کی تھی کہ دیکھ راستے میں کوئی انجان آدمی بات چیت کرنے کی کوشش کرے تو اسے جواب نہ دینا۔ ایسے آدمی بہت خطرناک ہوتے ہیں اور دیکھو میں نے مسز راماسوامی کو تار دے دیا ہے۔ وہ تمھیں لینے پالم آئیں گی یا اپنے کسی نوکر کو بھیجیں گی۔'

جب نائٹ ایئر میل کے سب مسافر اکٹھے ہوئے تو آشا کی ماں نے ایک معمر خاتون سے بیٹی کا تعارف کراتے ہوئے کہا، ''بہن یہ میری بچی پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھ رہی ہے۔ کرپا کر کے اس کا خیال رکھیے گا۔'' اور آشا کو جھنجلاہٹ بھی ہوئی کہ ماں مجھے کیا بالکل دودھ پیتی بچی سمجھتی ہے مگر پھر سفر کے خوش آئند خیال سے وہ مسکرا دی اور بولی، ماں تم بالکل نہ گھبراؤ۔ میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی مسز نارائن کا پلّو نہیں چھوڑوں گی۔'

مسز نارائن کافی مشہور سوشل ورکر تھیں اور مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اکثر انھیں ہوائی جہاز سے سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے انھوں نے آشا کو ہدایت کی کہ سیٹ پیچھے جھکا کر وہ بھی ان کی طرح کمبل اوڑھ کر لیٹ رہے اور چند ہی منٹ میں، اکثر دوسرے مسافروں کی طرح، وہ تو سو گئیں، مگر آشا بیٹھی سوچتی رہی کہ کرسی اگر گدے دار آرام کرسی بھی ہو تو اس پر کیسے سویا جا سکتا ہے۔ اپنے بدن کو ہر زاویے سے موڑ توڑ کر اس نے سونے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہیں ہوئی تو وہ بیٹھی بیٹھی ایئر ہوسٹیس کو کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی، جو مسافروں کو مٹھائی کی گولیاں، کان بند کرنے کے لیے روئی، سر کے نیچے رکھنے کے لیے تکیہ، اوڑھنے کے لیے کمبل اور من بہلانے کے لیے اپنی پیٹنٹ مسکراہٹیں بانٹ رہی تھیں۔ پھر روشنیاں گل کر دی گئیں اور نہ جانے کتنی دیر آشا نیم بیٹھی نیم لیٹی اپنے مستقبل کے اندھیرے میں جھانکتی رہی، جس کے آسمان پر دور، بہت دور، ستارے جگمگا رہے تھے لیکن ابھی تک اسے یہ نہ معلوم تھا کہ ان میں اس کی قسمت کا ستارہ کون سا ہے۔

اور پھر ہوائی جہاز نیچے اترنا شروع ہوا اور روشنیاں جل اٹھیں اور ایئر ہوسٹیس نے اعلان کیا کہ ویمان ایک گھنٹے کے لیے ناگپور کے ہوائی اڈے پر رکے گا۔

اس نے مسز نارائن سے کہا: 'مگر میں تو سمجھتی تھی کہ یہ ہوائی جہاز سیدھا دہلی جائے گا۔'

'جائے گا، مگر ایک گھنٹے کے بعد۔'

'اور ایک گھنٹے تک ہم کیا کریں گے؟'

'تم ایئر پورٹ کے ریستوران میں جانا، وہاں ایئر لائنس کی طرف سے کچھ ناشتہ اور کھانے پینے کو ملے گا۔'

'جی، اور آپ؟'

'بیٹی میں تو ناگپور ہی تک آئی ہوں۔ ہماری کانفرنس یہیں ہو رہی ہے۔'

جب تقریباً سارے مسافر اتر گئے تو آشا نے ایئر ہوسٹیس سے کہا: ''اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں یہیں ٹھہری رہوں؟''

'نہیں۔نہیں! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ دیمان دہلی نہیں جائے گا، کلکتے جائے گا۔ادھر سب مسافروں اور سامان کی ادلا بدلی ہوتی ہے، تم کو نہیں مالوم (معلوم)؟''

اور پھر اس نے آشا کو بتایا کہ پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے چار ہوائی جہاز ناگپور پہنچتے ہیں — ایک دہلی سے، ایک بمبئی سے، ایک کلکتے سے اور ایک مدراس سے۔ سب جگہ کے مسافر یہاں جمع ہوتے ہیں اور پھر جس کو جہاں جانا ہوتا ہے، وہ وہاں جانے والے ہوائی جہاز میں چلا جاتا ہے۔

'مگر یہ سب ناگپور میں کیوں ہوتا ہے؟'

'اس لیے کہ ناگپور ہندوستان کے بیچ میں ہے،' ایئر ہوسٹیس نے ہنس کر آشا کو باہر نکالتے ہوئے کہا، 'اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ناگپور کے سنترے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ جاؤ، ریستوران میں اورنج جوس پیو، فری!'

'میڈم، چائے یا اورنج جوس؟'' ایئر پورٹ ریسٹورینٹ کے بیرے نے پوچھا۔

'اورنج جوس،' آشا نے ایئر ہوسٹیس کی بات یاد کر کے کہا۔

'اور صاحب، آپ؟'

'جو میڈم کے لیے وہی ہمارے لیے — اورنج جوس!'

'جی!' آشا نے جلدی سے مڑ کر دیکھا کہ ایک نوجوان خاکی ملٹری قسم کی شرٹ اور کارٹ رائے کی پتلون پہنے، دو ایئر بیگس، ایک موٹے پورٹ فولیو اور ایک کیمرے سے لدا پھندا برابر کی کرسی پر بیٹھ رہا ہے۔ کیمرا اس نے میز پر پٹکا، ایئر بیگس کو کرسی کے کونے میں لٹکایا اور پورٹ فولیو کو پاس ہی خالی پڑی ہوئی کرسی پر رکھ دیا۔

'معاف کیجیے گا،' اس نے مسکرا کر اپنے چمکیلے شفاف دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اور اپنے سامان کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا، ''بات یہ ہے کہ میں آج ہی ولایت سے واپس آیا ہوں۔

آشا کو ماں کی ہدایت یاد آئی کہ خبر دار کسی انجانے مرد سے بات چیت نہ کرے! مگر جواب

نہ دینا بھی تو عجیب لگتا تھا۔ اور، اس کے علاوہ اس لمبے، سانولے رنگ کے نوجوان کی بول چال میں، اس کی کالی اور چمکیلی آنکھوں میں اور اس کی مسکراہٹ میں ایک ایسا معصوم رفیقانہ انداز تھا، جس پر کسی قسم کا شبہ کرنا مشکل تھا۔ سو، آشا نے حیرت سے پوچھا۔

'جی، آپ ولایت سے آئے ہیں؟ آج ہی؟ اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہیں، تھکے نہیں؟ میں تو مدراس سے یہاں تک پہنچتے پہنچتے ہی تھک گئی۔' اور جب وہ یہ کہہ چکی تو اسے خود تعجب ہوا کہ ایک انجان نوجوان سے اتنی بہت سی باتیں اس نے کیسے کر ڈالیں۔؟

تب اس نوجوان نے اسے بتایا کہ وہ لندن سے 'سوپر کانسٹیلیشن' میں آیا ہے۔ ایسے بڑے ہوائی جہازوں میں کوئی تھکان محسوس نہیں ہوتی۔ اور پھر اس نے بتایا کہ وہ دو برس کے لیے انجینئرنگ کی ٹریننگ لینے کو انگلینڈ بھیجا گیا تھا اور اب اسے دہلی سے بھاکھڑا ڈیم پر کام کرنے بھیجا جائے گا۔

آشا نے سوچا، میں نے اس کا نام بھی تو نہیں پوچھا مگر اتنے میں بیرا واپس آ گیا اور اس نے دو پلیٹیں ٹماٹر سینڈوچ کی اور دو گلاس سنترے کے رس کے رکھ دیے۔

'لیجیے،' نوجوان نے آشا کی طرف ایک گلاس بڑھایا، 'چکھ کر دیکھیے، ناگپور کے سنگتروں کا مزا کیسا ہے۔؟'

آشا نے ایک گھونٹ لیا اور کہا، 'کھٹا ہے۔'

نوجوان نے بھی ایک گھونٹ لیا اور کہا، 'ہوں، مگر ٹھنڈا ہے۔'

آشا نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا، 'اتنا کھٹا بھی نہیں ہے۔'

نوجوان نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا، 'کھٹ میٹھا کہہ سکتے ہیں۔'

آشا نے تیسرا گھونٹ لے کر کہا، 'بلکہ خاصا میٹھا ہے۔'

نوجوان نے تیسرا گھونٹ اتنا لمبا لیا کہ گلاس خالی ہو گیا۔ پھر وہ بولا، 'بوتل کے اورنج اسکوایش میں یہ مزا کہاں! بوائے، ایک گلاس اسی جوس کا لاؤ۔ کیوں، آپ بھی پئیں گی نا؟'

'ٹھیک ہے۔ بیرا، مجھے بھی ایک گلاس اور دو۔'

جب بیرا نئے گلاس لایا تو نوجوان نے آشا کی طرف اپنا گلاس اٹھا کر کہا، 'چیئرز۔'

'جی؟' آشا نے پوچھا۔

'انگلینڈ میں جب دو دوست شراب پینے بیٹھتے ہیں، تو اس طرح ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں۔'

آشا نے ڈر کر پوچھا' آپ شراب بھی پیتے ہیں؟'

'کبھی کبھی،' نوجوان نے جواب دیا،''اگر دوست اصرار کریں لیکن آپ فکر نہ کریں، اس وقت میں نشے میں نہیں ہوں۔ دوستوں کا جامِ صحت اورنج جوس سے بھی پیا جا سکتا ہے۔ سو، چیئرز!''

''دوست؟'' آشا نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے حیرت سے کہا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ وہ ماں کی ہدایت کے خلاف کیوں اس نوجوان سے، بنا پہچان کے ایسی باتیں کر رہی ہے کہ وہ اتنا بے تکلف ہوا جا رہا ہے۔

'چیئرز!'

'چیئرز!'

نوجوان نے اپنے جوس کا گلاس آشا کے گلاس سے ٹکرانے کے بعد ہونٹوں سے لگایا اور غٹ غٹ کر کے ایک سانس میں پی گیا۔ پھر اس نے خالی گلاس کو میز پر الٹا رکھ دیا،' اس کا مطلب ہے کہ میں آپ کی صحت اور مسرت کا خواہش مند ہوں۔'

آشا کو ایسا لگا کہ جیسے اسے چیلنج کیا جا رہا ہو۔ سو، اس نے بھی گلاس اٹھایا اور ہمت کر کے ایک سانس میں پینے لگی اور ناگپور کے سنگتروں کا ٹھنڈا کھٹ میٹھا رس اس کے گلے کو گدگداتا ہوا اس کی رگوں کے جوان خون میں سرایت کر گیا اور گلاس کو میز پر الٹا رکھتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کے منہ سے نکلا' ایسے ایسے تو ایک سو ایک گلاس میں پی سکتی ہوں۔'

☆

سب مسافروں کے ساتھ اندھیرے لاؤنج میں بیٹھے وہ دونوں بھی' کشمیر کی بہار، یہ رنگین ڈاکیومنٹری فلم بہت ہی حسین تھی اور ان حسین مناظر کو دیکھ کر آشا سوچ ہی رہی تھی کہ کاش وہ بھی

ایک دن کشمیر پہنچ جائے کہ.................

'دہلی جانے والا ہوائی جہاز تیار ہے۔کر پا کر کے دہلی جانے والے یاتری.....'

ایئر پورٹ اناؤنسر کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونجی۔نو جوان نے نہ صرف اپنے دو ایئر بیگ، موٹا ڈفیل پورٹ فولیو اور کیمرا بلکہ آشا کا ایئر بیگ اور مٹھائی کی ٹوکری، جو وہ مسز راما سوامی کے لیے لے جا رہی تھی، سب سامان اپنے کاندھے پر لادا اور دوسرے سب مسافروں کے ساتھ وہ دہلی والے جہاز کی طرف چل پڑے۔

راستے میں آشا نے کہا،''لایے، یہ ٹوکری میں لے لوں۔آپ کے پاس پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔میرا سامان آپ کیوں ڈھوتے ہیں۔؟''

اور نو جوان نے جواب دیا،''اس لیے کہ مجھے بوجھ اٹھانے کی عادت ہے اور اس کے علاوہ مجھے بعض لوگوں کا سامان ڈھونے میں مزا بھی آتا ہے۔

ان کو برابر کی سیٹیں مل گئیں۔

ایئر ہوسٹیس نے اعلان کیا،'اپنی اپنی پیٹیاں باندھ لیجیے۔

آشا نے نو جوان سے کہا،'آپ کو تو ہوائی جہاز سفر کی عادت ہوگئی ہوگی۔میں پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھی ہوں۔''

اور سانولے چہرے پر مسکراتے ہوئے دانت پھولوں کی طرح کھل گئے۔نو جوان نے پوچھا 'کیوں، ڈر لگ رہا ہے؟'

'کسی قدر!' آشا نے جواب دیا۔

'آپ تو مدراسی ہو کر اتنی اچھی ہندوستانی بولتی ہیں۔'

میں مدراسی نہیں ہوں گو اس وقت مدراس سے آ رہی ہوں۔ہم لوگ بنگلور کے رہنے والے ہیں۔کنڑ زبان بولتے ہیں۔''

'تو ہندوستانی کہاں سیکھی؟'

''میرے بابا سکریٹریٹ کی نوکری سے پنشن لینے تک دہلی ہی میں رہتے تھے۔میں نے میٹرک وہیں سے کیا تھا۔'

اور اس کے بعد؟

بی۔اے میں نے مدراس یونی ورسٹی سے کیا ہے۔ میرے بابا اب وہاں رہتے ہیں۔ میری ماں اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ پنشن ملا کر گذارا ہو جاتا ہے۔

اب ہوائی جہاز ہوا میں تھا۔ ایئر ہوسٹیس نے دونوں کو تکیے اور کمبل دیے۔ پھر وہ دوڑ دوڑ کر مسافروں کو چائے اور کافی وغیرہ دینے لگی۔

نہ جانے کیوں، آشا کو اس نوجوان سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے بی۔اے انگریزی لے کر فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ اس کے بابا اسے آگے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجنا چاہتے ہیں لیکن جتنی پنشن اور ماں کو تنخواہ ملتی ہے، اس میں گھر کا خرچا بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ ہاں، اگر اسکالرشپ مل جائے تو وہ جا سکتی ہے۔۔

'اسکالرشپ تو آپ کو نہیں ملے گا۔'

'کیوں؟'

'اس لیے کہ ہم نہیں چاہتے۔'

آپ نہیں چاہتے کہ میں آگے پڑھوں؟ گورنمنٹ کے خرچ پر انگلینڈ ہو آؤں۔ مگر وجہ؟

'ہے ایک وجہ — مگر پرائیویٹ!'

'آپ بہت مذاق کرتے ہیں! آپ کو تو انجینئر کے بجائے ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔'

'سچ؟'

'ہاں، اور کیا!'' اب وہ بھی مذاق پر اتر آئی تھی، ''صورت شکل بھی خاصی ہے آپ کی۔'

'وہ ہنسنے لگا۔'

آشا بولی: 'آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟'

'پیدا ہوا تھا میں لاہور میں، مگر اب ہم لوگ دہلی میں رہتے ہیں۔'

'اب آپ کو بھاکھڑا ڈیم جانا پڑے گا، کیوں؟'

'ہاں، اور کیا! وہاں کام کرنے کے لیے ہی تو گورنمنٹ نے دو برس ولایت میں ٹریننگ دلوائی ہے۔ ڈیم کے ساتھ جو بجلی گھر بن رہا ہے اس میں کام کروں گا۔'

'وہاں جنگل میں آپ رہیں گے؟ آپ کا جی نہیں گھبرائے گا؟'

'شاید گھبرائے گا۔ پھر ضرورت پڑی تو دل بہلانے کا کوئی انتظام کیا جائے گا۔'

'آپ کی مسز بھی آپ کے ساتھ جائیں گی؟'

'میری شادی نہیں ہوئی۔'

'اوہ!' اور دفعتاً آشا یہ سوال کر کے جھینپ گئی اور چپ ہوگئی۔ اتنے میں ایئر ہوسٹس نے روشنیاں گُل کرنا شروع کر دیں اور نوجوان نے کہا، 'اچھا، بھئی، اب سونا چاہیے۔ گڈ نائٹ!'' یہ کہہ کر اس نے سیٹ پیچھے سرکائی اور کمبل اوڑھ کر دراز ہوگیا۔

تھوڑی دیر میں سارے ہوائی جہاز میں سناٹا چھا گیا، خراٹوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔

آشا نے اندھیرے میں اپنے برابر کی سیٹ سے کہا، ''یہ تو بتایئے کہ آپ کا نام کیا ہے؟''

مگر نوجوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سو چکا تھا اور آرام سے لیٹا سوتا رہا، جب تک ایئر ہوسٹس نے دہلی پہنچنے کا اعلان نہ کر دیا

☆

'دیکھئے آپ یہاں ٹھہریے!' پالم پر اتر کر نوجوان نے آشا کی چیزیں اسے دیتے ہوئے کہا، میں ذرا ٹیلیفون کر لوں، کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔''

لیکن وہ I.A.Co کاؤنٹر کی طرف چلا ہی تھا کہ دفعتاً اس کے پورے خاندان نے اسے گھیر لیا اور دور سے اس ملاپ کو دیکھتے ہوئے آشا کو اندازا ہوا کہ جس نوجوان کی ہمراہی میں وہ ناگپور سے یہاں آئی تھی، وہ کس قسم کے خاندان سے تھا۔ اس کی ماں اور بہنیں، جو بھیا بھیا کہہ کر اس سے لپٹ رہی تھیں، شلواریں پہنے ہوئے تھیں۔ باپ کے سر پر سفید پگڑی تھی۔ شریف، سیدھے سادے متوسط درجے کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ نوجوان ضرور اپنے گھر والوں سے اس کا تعارف کرائے گا کہ اتنے میں اسے خود مسز راما سوامی کے حملے کا مقابلہ کرنا پڑا۔

'تم آشا ہو، آشا شاستری؟' ایک موٹی، بوڑھی، سفید بالوں والی خاتون نے اپنے موٹے موٹے شیشوں کی عینک میں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا اور جیسے ہی آشا نے سر ہلا کر کہا 'ہاں

کہ بڑی بی نے اسے گلے سے لپٹا لیا، ''جیتی رہو، بیٹی! میں تمھاری ماں کی بچپن کی سہیلی ہوں۔ ہم لوگ بنگلور میں ساتھ ہی اسکول جاتے تھے۔

کیا دن تھے وہ بھی! مگر اب یہاں کھڑی کس کا انتظار کر رہی ہو؟ چلو، چلو، موٹر باہر کھڑی ہے۔ ڈرائیور تمھارا سامان لے لے گا۔ ارے واہ! تم اتنی لمبی ہوگئیں جیسے بانس! میں نے تو جب دیکھا تھا تم اِتی سی تھیں!......وغیرہ وغیرہ۔'' یہاں تک کہ انھوں نے آشا کو تقریباً زبردستی باہر تک دھکیل کر موٹر میں سوار کر دیا اور جب موٹر فرّاٹے بھرتی ہوئی روانہ ہوگئی تو آشا کو دل کے ایک جھٹکے کے ساتھ یاد آیا کہ اسے تو اس دلچسپ اور مہذب نوجوان کا نام بھی معلوم نہ ہوا تھا اور نہ اسے آشا کا۔

☆

اور پھر اس پہلے سفر کے دس دن بعد آشا دوسری بار اسی طرح رات کے دو بجے ناگپور کے ہوائی اڈّے پر پہنچی۔

لیکن اس بار اس کا موڈ ہی دوسرا تھا۔ انٹرویو میں وہ فیل ہوگئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اس انجانے نوجوان کو کوسا تھا، جس نے اسے بد دعا دی تھی کہ اسے اسکالرشپ نہیں ملے گا اور کوسنا چاہیے بھی تھا کیونکہ انٹرویو کے وقت بھی وہ اسی کمبخت کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اسی لیے سوالوں کا جواب دینے میں وہ بار بار گڑبڑا گئی تھی۔ تم انگریزی کے شاعروں میں کسے پسند کرتی ہو؟ جواب میں اس نے کہہ دیا تھا، جی میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتی۔ اور جب ایک اور ممتحن نے پوچھا کہ ہوائی ڈاک کے انتظام میں ناگپور کی کیا اہمیت ہے تو وہ بول اٹھی، جناب ناگپور کا ایئرپورٹ ہندوستان کا سب سے اہم ایئرپورٹ ہے۔ آدھی رات کو وہاں چار ہوائی جہاز دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس سے آتے ہیں، وہاں ڈاک اور مسافروں کی ادلا بدلی ہوتی ہے اور دو دو گلاس سنگتروں کا رس پینے کو ملتا ہے۔ وہ بھی فری۔

ایک بار پھر اسی پرانے بیرے نے آکر اس سے پوچھا تھا، میڈم، چائے یا اورنج جوس؟' اور اس نے جواب میں کہا تھا، ہاں، اورنج جوس ہی لے آؤ۔' اس امید میں کہ شاید آج پھر کسی کی

آواز آئے گی، جو میڈم کے لیے وہی ہمارے لیے۔' لیکن آج ایئر بیگ، پورٹ فولیو اور کیمرے سے لدا ہوا، مسکراتا ہوا کوئی نو جوان نظر نہ آیا۔ برابر کی کرسی پر ایک موٹے مارواڑی سیٹھ توند پر ہاتھ پھیر پھیر کر ڈکاریں لیتے رہے اور اپنی سونے چاندی سے لدی گھونگھٹ دار پتنی سے کہتے رہے: یہ 'ہوائی جہاج (جہاز) کے سپھر (سفر) میں سوری ڈکاریں ڈھیر ساری آوے ہیں۔'' اور پھر جب بیرے نے گلاس سامنے لا کر رکھا اور آشا نے اسے منہ سے لگایا تو نہ پہلے جیسی خوشبو آئی، نہ وہ کھٹ مٹھا مزا۔ ایسا لگتا تھا کہ سڑے ہوئے سنگتروں کا رس نکالا گیا ہے۔ دو گھونٹ ہی پیئے تھے کہ اسے ابکائی آئی اور وہ قے کرنے کے لیے باتھ روم کی طرف بھاگی۔

بعد میں اس نے سوچا، چلو سنیما ہی دیکھوں، شاید دل بہل جائے لیکن آج رو پہلے پردے پر کشمیر کی رنگین بہار نہیں تھی۔ شر رنارتھیوں ہی کے بارے میں ایک ڈاکیومینٹری فلم تھا۔ اور جب آشا نے تقسیم اور فسادات کے مارے، لٹے کھٹے قافلوں کے منظر دیکھے، جیسے ساری دھرتی پر دکھ اور مایوسی کے بادل چھا گئے ہوں، تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایسی ہی مایوسی، ایسا ہی دکھ بھرا سناٹا، آج خود اس کے اپنے من میں بھی ہے اور وہاں سے اٹھ کر وہ باہر آ کر کھڑی ہوگئی۔ جہاں ناگپور شہر کے نو جوان بے فکروں کا ایک گروہ کھڑا ہوا رات کے تین بجے سرچ لائٹس کی روشنی میں ہوائی جہازوں میں پٹرول بھرنے کے منظر کو ایسے انہماک سے دیکھ رہا تھا، جیسے چاندنی رات میں تاج محل کا نظارا کر رہا ہو۔

اور آشا کھڑی کھڑی سوچتی رہی، کمبخت کیسا بے مروت نکلا۔ پھر ملنے کی ذرا بھی تو کوشش نہیں کی۔ مجھے دیکھو کہ کتنے بہانے کر کے دہلی پورے ایک ہفتے ٹھہری۔ ہر شام کو کناٹ پلیس کے چکر لگائے۔ ہر روز 'گے لارڈ' GAYLORD میں کافی پی۔ ہر دوپہر کو ALPS میں آئس کریم ICE CREAM کھائی۔ رفیوجی مارکیٹ سے نہ جانے کتنی غیر ضروری چیزیں خرید ڈالیں۔ اتوار کے دن پکنک کرنے قطب تک گئی۔ ہر جگہ یہ اُمید لے کر گئی کہ شاید کہیں وہ کمبخت نظر آ جائے۔ وہ، جس کے سانولے چہرے پر مسکراتے ہوئے دانت ایسے کھلتے ہیں، جیسے پھول کھلتے ہیں۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔

آخر کار اناؤنسر کی آواز نے اسے چونکا دیا، ''مدراس جانے والا ہوائی ویمان تیار ہے...........

اور آشا دوسرے مسافروں کے پیچھے پیچھے اپنا ایئر بیگ لادے، آہستہ آہستہ چلتی رہی اور ہوائی

جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے من ہی من میں فیصلہ کرتی رہی، میں اس کی یاد کو یہیں تا گپور کے ہوائی اڈّے پر چھوڑ جاؤں گی، جہاں اسے پایا تھا۔ میں اسے بھول جاؤں گی! میں اسے بھول جاؤں گی! میں اسے.........................

اور سب مسافر اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے۔ صرف ایک سیٹ خالی تھی۔ ایئر ہوسٹس نے اس کی طرف اشارا کیا اور آشا وہاں بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگی۔ تب اس نے دیکھا کہ برابر والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہے اور اسے غور سے دیکھ رہا ہے اور نہ جانے کیوں، آشا کو ایسا لگا، جیسے خاموشی سے کوئی اس کا ناپ تول بلکہ مول تول بھی کر رہا ہو۔ مگر اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا گورا چٹا خاصہ موٹا تازہ آدمی ہے، جو گلابی شارک اسکن کے سوٹ پر ایک موٹی گانٹھ کی چوڑی چکلی ٹائی لگائے ہوئے ہے، جس پر ایک ننگی عورت کی تصویر بنی ہوئی ہے، جسے دیکھ کر آشا کو ایسی ابکائی آئی۔ جیسے کچھ دیر پہلے ایئر پورٹ ریسٹورینٹ میں سنگتروں کا رس پی کر آئی تھی۔

'آپ چاہیں تو ادھر کھڑکیوں والی سیٹ پر آجایئے' اس شخص نے اپنے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھیوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ آشا نے دیکھا کہ اس کے دانت سگریٹ اور شاید شراب کی کثرت سے پیلے اور گندے ہیں اور اس نے تیز خوشبو والا سینٹ لگا ہوا ہے، پھر بھی اس کے بدن سے سڑے ہوئے سنگتروں کی بو پھوٹ رہی تھی۔

سو، آشا نے کہا، 'جی نہیں، شکریہ! میں ٹھیک ہوں۔' اور شارک اسکن کے سوٹ والے نے ایک انگریزی رسالے کا مطالعہ شروع کر دیا۔ آشا نے دیکھا کہ میگزین کا نام ہے، 'گے نائٹس' GAY NIGHTS۔ اور اس کے سرورق پر ہی جو تصویر چھپی ہوئی تھی اس کو دیکھ کر اسے پھر ابکائی آ گئی۔

مدراس کے ہوائی اڈے پر ہوائی جہاز اتر رہا تھا کہ آشا نے اپنے ہم سفر کی آنکھیں اپنے چہرے اور بدن پر محسوس کیں۔ اب تک وہ سوتا آیا تھا لیکن ایئر ہوسٹس کے اعلان کے بعد وہ انگڑائی لے کر اٹھا تھا اور اپنے پورٹ فولیو میں سے اس نے یوڈ کولون EAUDE COLOGNE کی بوتل نکالی تھی اور تقریباً چُلّو بھر خوشبودار لوشن اپنے چہرے پر چپڑ لیا تھا اور پھر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس نے آشا سے کہا تھا، ''اس سے میں بالکل فریش ہو جاتا ہوں۔ لیجیے آپ بھی۔'

'جی نہیں، شکریہ!' آشا اس قسم کے آدمی سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

'آپ مدراس ہی میں رہتی ہیں کیا؟'

'جی ہاں!'

'تو دہلی کیا سیر کرنے گئی تھیں؟'

'جی نہیں، ایک اسکالرشپ کے لیے انٹرویو تھا۔'

'خوب! تو اسکالرشپ مل گیا؟'

'جی نہیں ملا۔'

'تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟'

'شاید نوکری کروں گی۔'

ویری گڈ! تو یہ لیجیے، میرا کارڈ رکھیے۔ شاید کبھی کام آئے۔

کارڈ پر لکھا تھا، مسٹر بلدیوراج کوہلی، ایسٹرن ہوٹلز لمیٹیڈ، دہلی، کلکتہ، بمبئی، مدراس۔

☆

دو برس بعد وہ آج پھر ناگپور کے ہوائی اڈے پر اتر رہی تھی، زندگی میں تیسری بار۔ اس بار وہی بلدیوراج کوہلی اس کے ساتھ تھا، جس کے بدن سے کبھی سڑے ہوئے سنگتروں کی بو آتی تھی۔ دو برس میں کیا کچھ بدل جاتا ہے۔! بدبو خوشبو میں تبدیل جاتی ہے! ہیرے کی انگوٹھیاں پہننے والا ادھیڑ عمر کا آدمی گورا چٹا، اسمارٹ نوجوان معلوم ہوتا ہے۔ کل تک جو مالک تھا، باس تھا، وہ شادی کا پروپوزل دے کر کم سے کم غیر سرکاری طور پر منگیتر بن جاتا ہے۔ آشا نے سوچا، کاش، یہ کمبخت یاد بھی پیچھا چھوڑ دے۔ کتنا اچھا ہوتا، اگر وہ اس نائٹ ایئرمیل کے بجائے سویرے کے ڈائریکٹ پلین سے چلے ہوتے، تاکہ کم سے کم ناگپور سے تو چھٹکارا ملتا۔

آشا نے اپنے دل کو تسلی دی۔ گھبراتی کیوں ہے؟ تو تجھے تو خواہ مخواہ احساس جرم ہو رہا ہے۔ آخر تو نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟ گھر میں تنگی تھی اور تجھے نوکری کرنی ہی تھی۔ سو، تو مسٹر

کوہلی جونیئر کا وہ کارڈ لے کر ان سے ملنے میرینا ہوٹل چلی گئی اور انھوں نے رحم کھا کر اسی ہوٹل میں ریسپشنسٹ RECEPTIONIST کی نوکری دے دی۔ دو سو روپے کا اسٹارٹ دیا۔ تین مہینے کے بعد جب وہ پھر دورے پر مدراس آئے تو تیرے کام سے خوش ہو کر تیری تنخواہ دو سو سے تین سو روپے کر دی۔ پھر تجھے کتنی سیر کرائی۔ اپنی بڑی موٹر میں پانڈی چیری لے گئے۔ مہابلی پورم اور کانچی ورم کے مندر دکھائے۔ یہ مانا کہ دو تین بار بلدیو نے عادت سے مجبور ہو کر دست درازی کرنے کی کوشش کی، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جتنے بھی مالک اور باس ہوتے ہیں، جن کے ہاں نوجوان لڑکیاں کام کرتی ہیں، وہ سب ایک آدھ بار ایسی کوشش کرتے ہی ہیں۔ اب یہ لڑکی کے کیریکٹر پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو بیچ دیتی ہے یہ اپنی عزت کو برقرار رکھتی ہے۔ تو نے بھی اپنے آپ کو نہیں بیچا اور کیونکہ تو نے دوسری چھچھوری اور آوارہ لڑکیوں کی طرح تین سو روپے ماہوار اور کچھ تحفوں کے عوض اپنے بدن کو فروخت نہیں کیا، تو وہ، جو ہر لڑکی کو ایک کھلونا سمجھتا تھا، وہ بھی تیری عزت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مدراس سے اس نے تیرا تبادلہ دہلی میں اپنے ہیڈ آفس میں کر دیا۔ ریسپشنسٹ سے تو پرسنل سکریٹری ہو گئی۔ تجھے راج محل جیسے عالیشان ہوٹل میں رہنے کو کمرا ملا۔ اتنے ہوٹلوں کے معائنے کے لیے بلدیو سارے دیش کا دورا کرتا اور ہر جگہ تو ساتھ ہوتی — چاہے ہوائی جہاز ہو یا ایئر کنڈیشنڈ ٹرین۔ تنخواہ پانچ سو ہو گئی، جس میں سے پورے چار سو روپے تو گھر بھیجتی رہی۔ تب ہی تو تیرے ماں باپ نے بھی اس نوکری کی مخالفت نہیں کی۔ تو نے اپنے میں بھی تو تبدیلی محسوس کی ہو گی! وہ دبلی پتلی، سانولی سی، لمبی چوٹی والی لڑکی کہاں ہے، جو دو برس پہلے ہوائی جہاز میں اکیلے سفر کرتے گھبراتی تھی۔ آج تو ایک اسمارٹ فیشن ایبل نوجوان، کیریئر ویمن CAREER WOMEN ہے۔ تیری تصویریں، 'ایوز ویکلی'، اور 'کرینٹ' میں چھپتی ہیں۔ بلدیو کے ساتھ بڑے بڑے گھروں میں تجھے ڈنر اور پارٹیوں میں دعوت دی جاتی ہے۔ مانا کہ لوگ تیرے اور بلدیو کے بارے میں اسکینڈل کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ تجھے معلوم ہے کہ تو نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے...... بلکہ اپنے اثر سے بلدیو کو بہت سی پرانی عادتوں سے بچایا ہے۔ اب اس نے شراب پینی کم کر دی ہے، پچاس سگریٹوں کے بجائے صرف بیس سگریٹ روزانہ پیتا ہے، اب ہر چھوکری کے پیچھے وہ نہیں بھاگتا، جُوا کھیلنا بھی کم کر دیا ہے۔

تب ہی تو خود رائے بہادر بھی آشا کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ جب ملتے ہیں، کہتے ہیں: ''بھئی آشا نے تو بلدیو کی زندگی ہی بدل دی ہے۔'' اور اب چوں کہ بلدیو نے آشا کو اپنے ساتھ ساری دنیا کے سفر پر چلنے کو کہا ہے تو ظاہر ہے کہ رائے بہادر نے بیٹے کو شادی کی اجازت بھی دے دی ہوگی۔

☆

ایک بار پھر وہی ناگپور ایئرپورٹ گو اب وہ پہلے سے زیادہ شاندار بن گیا تھا۔ مگر ابھی صرف ایک ہی ہوائی جہاز آیا تھا، اس لیے زیادہ گہما گہمی نہیں تھی۔

پھر وہی ایئرپورٹ ریستوران۔

پھر وہی بوڑھا بیرا۔

پھر وہی سوال 'میڈم چائے یا اورنج جوس؟'

بلدیو نے کہا: 'اورنج جوس دونوں کے لیے۔'

آشا نے کہا: 'نہیں، میں چائے پیوں گی۔'

بلدیو نے اصرار کیا: 'یہ بھی کوئی وقت ہے چائے پینے کا؟ سنگترے کا رس پیو۔ تمھیں نہیں معلوم ناگپور کے سنگترے سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔''

'معلوم ہے!' آشا نے کہا اور اس نے سوچا، اب میں تمھیں کیسے بتاؤں بلدیو، کہ سنگترے کے رس میں میرے لیے کتنی یادوں کا زہر گھلا ہوا ہے۔

اتنے میں بیرے نے دو بھرے ہوئے گلاس سامنے لاکر رکھ دیے۔

بلدیو نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لے کر کہا: ''واہ واہ! کتنا میٹھا ہے۔ میں سوچتا ہوں اپنے ہر ہوٹل کے لیے ناگپور سے سنگترے منگوایا کروں، تاکہ یہ فریش اورنج جوس ہمارے ہر کسٹمر CUTSTOMER کو صبح ناشتے پر مل سکے!...... ارے، یہ کیا؟ پیونہ، آشا!'

آشا نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔ رس نہ صرف کھٹا تھا بلکہ اس میں ایک عجیب قسم کی کڑواہٹ تھی جیسے نیم کے پتوں کا عرق گھلا ہوا ہو اور ایک کسیلا پن بھی تھا، جیسا سڑی ہوئی ترکاری میں ہوتا ہے اور ایک عجیب قسم کی اُبکائی آئی اور اسے متلی ہونے لگی۔ جیسے پھوڑے میں

سے رِستی ہوئی پیپ میں ہوتی ہے۔

اس نے بیرے سے کہا: 'اسے لے جاؤ، مجھے نہیں چاہیے۔'

'تو چائے لاؤں؟' بیرے نے پوچھا۔

'نہیں، صرف سادا پانی۔'

اتنے میں کسی دوسرے ہوائی جہاز کے مسافر آنے شروع ہوگئے اور ریستوران میں بھیڑ ہوگئی۔

'چلو آشا،' بلدیو نے کہا: ''پورا گھنٹہ گذارنا ہے اور یہاں تو بھیڑ بڑھتی ہی جائے گی سنیما ہی دیکھیں۔ وہ پرانا رنگین ڈاکیومینٹری دکھا رہے ہیں، کشمیر میں بہار۔''

کشمیر میں بہار! کشمیر میں بہار—!

آشا کے دماغ میں جیسے ہزاروں کیڑے سرسرا رہے تھے، لاکھوں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، کروڑوں بچھو ڈنک مار رہے تھے۔

'بلدیو، تم چلو، میں ابھی آتی ہوں۔'

وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ ایک ناٹے سے قد کے چکنے چپڑے آدمی نے بلدیو کو آواز دی، ارے یار بلدیو، کہاں ہو تم؟''

''او، ہیلو سمپورن! یار، خوب ملے۔ میں دہلی سے بمبئی جا رہا ہوں۔ کل سویرے بوئنگ سے قاہرہ جا رہا ہوں۔ اور تم؟''

''میں کلکتے سے آ رہا ہوں اور مدراس جا رہا ہوں۔ ادھر وِشاکھا پٹنم میں ایک ٹھیکا ملنے کی امید ہے۔ اور سناؤ تمھارے بارے میں تو بڑی بڑی خبریں گرم ہیں۔ سنا ہے تمھاری نئی......''

وہ اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ بلدیو نے کہا 'سمپورن ان سے ملو۔ آشا شاستری، میری پرسنل سکریٹری!'

'ہاؤ آر یو، مس شاستری؟'

اور یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا ہی دیا۔ آشا نے شیک ہینڈ کیا تو اس کا ہاتھ سمپورن کی ہتھیلی کے پسینے سے تر بتر ہوگیا اور اسے میز پوش کے نیچے چپکے سے ہاتھ خشک کرنا پڑا۔

'اچھا، تو آشا تم چاہو تو یہاں بیٹھو۔ میں فلم دیکھتا ہوں اور سمپورن سے گپ شپ کرتا ہوں۔ چل، بھئی سمپورن!'

ایک منٹ تو آشا وہیں بیٹھی رہی۔ تیسرا ہوائی جہاز بھی اتر چکا تھا اور اب اس کے مسافر بھی اندر آ رہے تھے۔ اور ان میں ایک لمبا قد، ایک سانولا چہرہ، ملیٹری وضع کی خاکی قمیض، موٹے ٹوئیڈ کا کوٹ اور کارڈ رائے کی پتلون، ہاتھ میں ایئر بیگ، کندھے پر کیمرا......!

وہی!

وہی!

وہی!

مگر نہیں! آشا نے اپنے آپ کو سمجھایا! اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب اس ڈیم انجینئر کا خیال چھوڑ دو، جو نہ جانے بھاکھڑا جنگل سے اب کس جنگل میں خاک چھاننے جا رہا ہوگا۔ تو کل پیرس جا رہی ہے، پیرس اور لندن اور نیویارک، گریگری پیک کے ساتھ تصویر کھنچوانے۔ تیرا اس آدمی سے کیا واسطہ، جس کا تو نام بھی نہیں جانتی۔ تیری جگہ اس وقت بلدیو کے پاس ہے، جس نے تیرا بوئنگ جیٹ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدا ہوا ہے۔

اندھیرے لاؤنج میں آخر کار اس نے بلدیو اور سمپورن کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ ان کے پیچھے ایک کرسی خالی تھی۔ وہ چپکے سے وہاں بیٹھ گئی۔

سنیما کے پردے پر چنار کے لال پتے جھڑ رہے تھے اور کشمیری عورتوں کا ایک درد بھرا لوک گیت سنائی دے رہا تھا۔

بلدیو اور سمپورن کانا پھوسی کر رہے تھے۔

'کیوں یار، یہ لونڈیا تو نے اچھی پھانسی ہے! پچھلی دفعہ جب ملا تھا تو وہ بنگالن تھی تیرے پاس۔ مگر سنا ہے تو اس مدراسن کے چکر میں آ گیا ہے......'

'چکر میں آیا نہیں، اسے چکر دینے کی فکر میں ہوں یار، مگر یہ ذرا بدکتی ہے، سو ذرا دنیا گھمانے لے جا رہا ہوں۔'

'مگر لوگ کہتے ہیں تو اس سے شادی کر رہا ہے۔'

'پاگل ہوا ہے رے! تو تو جانتا ہے اپنی زندگی کا اصول — گائے کا دودھ پیو، گائے گھر میں نہ باندھو۔ ایسی ایسی تو نہ جانے کتنی آئیں اور گئیں۔'

اور آشا کو یہ محسوس کر کے کتنا تعجب ہوا کہ یہ سن کر اس کے دل پر کوئی چوٹ نہیں پڑی بلکہ ایسا معلوم ہوا جیسے دفعتاً بہت سی زنجیریں جو اسے جکڑے ہوئی تھیں، چھن سے زمین پر گر پڑیں۔

سنیما کے پردے پر دفعتاً رنگا رنگ پھول کھل آئے تھے۔ شالیمار کے فوارے ناچ رہے تھے۔ ڈل جھیل کی سطح پر شکاروں میں نوجوان جوڑے کندھے سے کندھا لگائے سیر کر رہے تھے، ایک کشتی والے کی بچی مسکرا رہی تھی، آبشار کا پانی ہنس رہا تھا، کشمیر میں بہار آ گئی تھی......!

☆

'لاسٹ کال فار مس شاستری! لاسٹ کال فار مس شاستری LAST CALL FOR MISS SHASTRI بمبئی جانے والا ویمان اب اڑنے کے لیے بالکل تیار ہے۔' اناؤنسر کی آواز ایئر پورٹ کی سنسان بلڈنگ میں گونجتی رہی کیونکہ سب مسافر اپنے اپنے ایروپلین میں جا چکے تھے۔ اور پھر ایک ایک کر کے وہ سب اڑ گیے۔

دہلی جانے والا ہوائی جہاز!

مدراس جانے والا ہوائی جہاز!

کلکتہ جانے والا ہوائی جہاز!

بمبئی جانے والا ہوائی جہاز، جس میں ایک سیٹ خالی تھی!

اور جب سب ہوائی جہاز اڑ گئے تو ایئر پورٹ کے وسیع میدان میں صرف سرخ اور پیلی اور سبز روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی رہ گئیں تو......

میدان کے ایک اندھیرے کنارے پر دو مسافر کھڑے رہ گئے تھے، جو کہیں نہیں جا رہے تھے جن کی منزل آ گئی تھی۔

'آشا، کل میں تمھیں بھلائی لے جاؤں گا۔ پہلے تم دیکھ لو کہ کس ماحول میں مجھے رہنا اور کام کرنا ہے۔ وہاں بڑے شہروں کی چہل پہل نہیں ہے۔ بس فولاد کا کارخانہ ہے اور اس میں کام

کرنے والے ہیں۔'

'اور تم ہو؟'

'ہاں میں ہوں، مگر ساتھ میں گرمی ہے، کارخانے میں کام کرنے والے انجینئروں کے لیے خطرہ ہے۔ تنخواہ صرف چار سو روپیہ ماہوار ہے۔ دو کمروں کا مکان ہے۔'

'اور تم ہو!'

'اور میں ہوں، اور محنت ہے اور انجینئروں کی سمجھ بوجھ اور قابلیت کا امتحان ہے اور مزدوروں کی قوت بازو ہے، ان کا خون اور پسینہ ہے اور پانی کی طرح بہتا ہوا فولاد ہے، جس میں مستقبل کے سانچے ڈھالے جارہے ہیں۔'

'اور تم ہو!.....مگر کم از کم اب تو مجھے اپنا نام بتادو۔'

'میرا نام نرمل ہے۔ پورا نام نرمل کمار شرما۔ میرے ماتا پتا اور بہنوں کو تم اس دن دیکھ چکی ہو۔ وہ دو برس سے تم سے ملنے کے منتظر ہیں۔'

میرے منتظر ہیں؟ مگر تمھیں کیسے معلوم تھا کہ میں.....' اور آگے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

'جیسے یہ معلوم تھا کہ تمھیں اسکالرشپ نہیں ملے گا۔'

'تو پھر اب؟'

'اب ہم کچھ پئیں گے۔'

بیرے ریستوران بند ہی کر رہے تھے، جب یہ دونوں داخل ہوئے۔ بوڑھے بیرے نے حسب معمول پوچھا، چائے یا اورینج جوس؟'

'اورینج جوس' نرمل نے کہا۔

''مگر میم صاحب کو تو اورینج جوس پسند نہیں۔ ابھی واپس کر دیا تھا۔''

'تم لاؤ تو!' نرمل نے اصرار کیا اور بیرا دو گلاس بھر کر لے آیا۔

نرمل نے گلاس اٹھایا۔

آشا نے گلاس اٹھایا۔

نرمل نے آشا کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔ آشا نے نرمل کی

آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔ نرمل نے اپنا گلاس آشا کے گلاس سے ٹکرایا۔ چیئرس۔'

'چیئرز!'

'پیو آشا'

نرمل نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک گھونٹ لیا اور ہونٹ چاٹنے لگا۔

آشا نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک لمحے کے لیے اس کی خوشبو سونگھتی رہ گئی۔ تازہ رس بھرے ناگپور کے سنگترے کی خوشبو، جو کسی سینٹ سے کم نہیں ہوتی۔ پھر اس نے بھی ایک گھونٹ لیا اور حیران رہ گئی۔

سنگترے کا عرق ٹھنڈا تھا، کھٹا میٹھا تھا۔ کھٹا جیسے بچپن میں توڑی ہوئی کچی کیریاں۔ جیسے چرائی ہوئی جامنیں کھٹی ہوتی ہیں، جیسے پہلی ملاقات۔ ایک عجیب دل گداز کھٹاس جو منہ تو ں چٹخارہ دیتی رہتی ہے اور ساتھ میں میٹھا بھی۔ رس بھری مٹھاس، جیسے کیوڑے میں بسی ہوئی گنڈیریوں میں مٹھاس ہوتی ہے، جیسے دودھ پیتے بچوں کے ہونٹوں میں مٹھاس ہوتی ہے، جیسے محبت کے اقرار میں مٹھاس ہوتی ہے۔

نرمل نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

آشا نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

بیرے نے کہا، 'اور پئیں گے سرکار؟'

'ضرور!' آشا نے کہا، مجھے تو ایک گلاس اور چاہیے۔'

بیرے نے جگ سے انڈیل کر دو اور گلاس بھر کر ان کے سامنے رکھ دیئے اور اپنی بوڑھی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ یہ کیا معجزہ ہے کہ وہی سنگتروں کا رس، جسے پی کر یہ لڑکی ابھی چند منٹ پہلے قے کر چکی ہے، اب کتنے مزے لے کر پی رہی ہے۔

اور نرمل نے آشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

'ایک نہیں، ابھی تو تمھیں پورے ایک سو ایک گلاس پینے پڑیں گے۔

○

# ایک تھا راجا

''سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار''

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔ جھوٹ سچ بیان کرنے والے کی گردن پر۔

ایک تھا راجا

راجا راج کرتا تھا۔ اور کرتا بھی کیا؟ شکار کھیلتا تھا، گانا سنتا تھا، ناچ دیکھتا تھا، اپنی سترہ رانیوں اور انتیس داسیوں کے ساتھ باری باری دل بہلاتا تھا۔ اپنے شاہی گیرج کی پینتالیس شاندار موٹروں میں سے ہر روز ایک نئی موٹر میں سیر کو جاتا تھا۔ کبھی کبھی کرکٹ بھی کھیلتا تھا، چند انگریز کھلاڑیوں کے ساتھ، جو خاص طور پر اسی کام کے لیے نوکر رکھے گئے تھے۔ مگر ہٹ لگا کر رن بنانے کے لیے وہ خود نہ دوڑتا، کیونکہ راج محل کے ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ ایسی محنت سے راجا صاحب کا وزن دو من پچیس سیر سے کم ہو جائے گا۔ اس لیے ہٹ لگاتے راجا صاحب اور رن بناتا ایک اور آدمی، جو اسی کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ تمام کھلاڑیوں کو حکم تھا کہ راجا صاحب کا کیچ کبھی نہ لیا جائے۔ مختصر یہ کہ راجا راج کے کام میں بہت ہی مشغول رہتا تھا۔

راجا بڑا انصاف پسند تھا۔ اس کے تخت کے پیچھے انصاف کے ترازو کا نشان بنا ہوا تھا اور کیونکہ ترازو کے دونوں پلڑے بالکل خالی تھے، اس لیے برابر بھی تھے۔ انصاف دونوں میں سے

ایک میں بھی نہیں تھا۔ راجا اتنا انصاف پسند تھا کہ اس کے راج میں شیر اور بکری دونوں ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ پانی پینے کے بعد شیر رسی سے بندھی ہوئی بکری کو کھا جاتا تھا اور پھر آس پاس کی مچانوں سے راجا صاحب اور ان کے درجن بھر شکاری گولیاں برسا کر شیر کو ختم کر دیتے تھے۔ گولی کسی کی بھی لگتی پر شیر کے اوپر بڑی شان سے اپنی بندوق ٹکا کر تصویر راجا صاحب ہی کھنچواتے، جو بعد میں انگریزی کے چکنے کاغذ والی رسالوں میں چھپتی۔

راجا جمہوریت اور انسانی بھائی چارے پر بڑا یقین رکھتا تھا، ہر خوبصورت لڑکی کے بھائی کو اپنا سالا سمجھتا تھا۔ اس کے رنگ محل کے دروازے ہر امیر اور غریب حسین لڑکی کے لیے کھلے رہتے تھے۔ ایک بار گھوڑے پر سوار ہوتے وقت اس نے اپنے ایک سائیس کی چودہ سال کی بیٹی کو دیکھ لیا اور اگلے دن ہی اس غریب سائیس کی بیٹی کو اپنے محل میں بلوا لیا اور اس کے باپ کو اصطبل کا داروغا مقرر کر دیا گیا۔

راجا طبقات اور ذات پات پر بالکل یقین نہ رکھتا تھا۔ اس کے مذہب میں ہر مذہب اور طبقے، ہر قوم اور ذات کی لڑکی جائز تھی۔ پکا وطن پرست ہونے کے باوجود وہ انگریزوں سے بھی کوئی ذاتی رنجش نہ رکھتا تھا۔ چند ہی سال کی بات ہے کہ اس نے مسوری کے ایک ناچ گھر میں ایک انگریز حسینہ کو دیکھ کر پسند کر لیا تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کا شوہر پولس کا سارجینٹ ہے تو جھٹ راجا نے شوہر کو اپنی ریاست کا انسپکٹر جنرل پولس بنا دیا تھا۔ ریاست میں ڈاکوؤں کا کافی زور تھا اور اس لیے انسپکٹر جنرل پولس کو ان کی تلاش میں کئی کئی ہفتہ جنگل چھاننے پڑتے۔ پر راجا نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے اکیلے پن کے لیے بالکل نہ گھبرائے اور یہ کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ خود اپنے انسپکٹر جنرل پولس کی بیوی کے آرام اور سکھ کا پورا پورا خیال رکھے گا۔

راجا کی ہمدردی اور محبت انسانوں ہی تک محدود نہ تھی۔ اسے جانوروں سے بھی بڑا پیار تھا، خاص طور سے کتوں سے۔ اس کے محل کا ایک حصہ اس کے ڈیڑھ سو پالتو کتوں کے لیے محفوظ تھا۔ ان میں سے ہر ایک دس پیڑھی تک اصلی نسل کا تھا اور کسی کی قیمت بھی آٹھ دس ہزار سے کم نہ تھی۔ ہر ایک کتے کے لیے ایک الگ کمرہ تھا، جہاں وہ مخملی گدوں پر لوٹتا تھا۔ ہر ایک کتے کے لیے ایک

الگ نوکر رکھا ہوا تھا، جو اپنے چار پاؤں کے مالک کے آرام کا خیال رکھتا تھا۔ محل کے دوسرے کمروں کی طرح کتوں کے کمرے بھی ایئر کنڈیشن کرائے ہوئے تھے، تاکہ نازک مزاج کتوں کو موسم کی تبدیلی سے زکام نزلے وغیرہ کی شکایت نہ ہو جائے۔

راجا نفاست پسند، حسن پرست اور فن کا پرستار تھا۔ کتنے ہی کلاکاروں کا وہ احترام کرتا تھا۔ جو بھی شاعر اس کی شان میں قصیدہ لکھ کر لاتا، وہ اس کا منہ ہیرے جواہرات سے بھروا دیتا۔ جو مصوّر اس کی تصویر ایسی بناتا کہ اس کا چہرہ اصل کے برعکس خوبصورت اور شاندار نظر آئے، راجا اسے مالا مال کر دیتا۔ درجنوں گانے والے اور ناچنے والیاں محل میں نوکر تھیں۔ راجا کو خود گانے اور ناچنے کا شوق تھا اور اس کے درباریوں نے اسے یقین دلا رکھا تھا کہ اس کا گلا تو لاجواب ہے ہی، ناچنے میں بھی وہ کسی ڈانسر سے کم نہیں۔ راجا کو دنیا میں حسین چیزوں سے عشق تھا۔ خوبصورت فرنیچر، نفیس قالین اور پردے، رنگارنگ شرابیں، جھاڑ فانوس، خوشبودار پھولوں کے چمن اور سب سے زیادہ حسین عورتیں! وہ ریاست کا کام کرنے دربار میں بھی بیٹھتا تو اس کے گرد حسین اور نوجوان داسیوں کا جھرمٹ ہوتا اور جب دن بھر کام کرنے کے بعد تھک کر وہ اپنے شبستان میں جانے کے لیے محل کے سنگ مرمر کے چمکیلے زینہ پر چڑھتا تو سہارا دینے کے لیے ہر سیڑھی پر ایک ننگی داسی کھڑی ہوتی اور راجا اس کی چھاتیوں کا سہارا لیتا ہوا زینہ چڑھتا چلا جاتا۔

راجا کے راج میں پوری طرح امن اور شانتی تھی۔ زمیندار، تعلق دار، ساہوکار خوش بھی تھے اور خوشحال بھی۔ کسان، مزدور، کاریگر نہ خوش تھے، نہ خوشحال پر اپنی حالت پر مطمئن تھے۔ روکھی سوکھی کھا کر یا بھوکے پیٹ سو کر بھی، راجا کے لیے ان کی زبان سے دعا ہی نکلتی تھی۔ لیکن چند سال سے سفید ٹوپی والے، راجا کی شانتی بھنگ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ عوامی پارٹی بنانا چاہتے تھے۔ عوام کی حکومت کے سبز باغ دکھا کر سیدھے سادے کسانوں، مزدوروں کو پھسلانا چاہتے تھے۔ ان کے جلسوں جلوسوں اور تقریروں سے ریاست کی شانتی خطرے میں تھی۔ راجا فکرمند تھا کہ اس کی پرجا سیاست اور جمہوریت کے چکر میں پڑ کر دکھی ہو جائے گی اور یہ کسی حالت میں بھی اسے پسند نہیں تھا۔ اس کا حکم ماننے والے زمیندار اور ساہوکار ایک وفد لے کر اس کے پاس آئے اور کہا— 'مائی باپ! اس پرجا پارٹی کے سازش کو دبایئے، نہیں تو ہم خطرے میں ہیں۔ ہماری

جائیدادیں، ہماری تجوریاں، ہماری دکانیں، ہماری اناج کے کوٹھے، ہمارے بہی کھاتے خطرے میں ہیں، ہم ہی نہیں، سرکار آپ بھی خطرے میں ہیں۔ آپ کے محل، آپ کے ہیرے جواہرات، آپ کی بھڑکیلی پوشاکیں، آپ کی موٹریں، آپ کے گھوڑے، آپ کے کتے، آپ کی عورتیں، سب خطرے میں ہیں۔ ان داتا! اپنی فوج اور پولس کو حکم دیجئے کہ جمہوریت کے اس زہریلے پودے کو فوراً اکھاڑ پھینکیں۔"

سوراجا نے اپنے انگریز انسپکٹر جنرل پولس کو بلایا (وہی، جو کبھی سارجینٹ تھا اور جس کی بیوی اب بھی بڑی حسین تھی) اور اس سے کہا کہ فی الحال ڈاکوؤں کا پیچھا چھوڑ کر وہ باغیوں، جمہوریت پسندوں اور پرجا پارٹی کے کارکنوں کی کھوج کرے۔ گاؤں گاؤں پھرے اور جہاں کہیں بھی اسے پرجاراج کی چرچا کرتے ہوئے کوئی ملے اسے قید کرے اور کوڑے لگائے، ننگا کر کے برف کی سلوں پر لٹائے اور ضرورت پڑے تو پھانسی بھی دے دے۔

جب انسپکٹر جنرل 'یس سر!' کہہ کر حکم کی تعمیل کے لیے جانے لگا تو راجا نے کہا، 'اور دیکھو واپسی کی جلدی نہ کرنا۔ کام پورا کر کے ہی لوٹنا۔ اور اپنی بیوی کے اکیلے پن کی بالکل فکر نہ کرنا، ہم خود اس کا دل بہلانے کی کوشش کریں گے۔"

انسپکٹر جنرل کو پرجا پارٹی کے سب کارکنوں کو گرفتار کرنے میں چھ سات مہینے لگے۔ پر اتنی دیر لگانے پر راجا ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوا اور انسپکٹر جنرل کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار کی جگہ دو ہزار کر دی گئی۔

سال بھر کے بعد پرجا پارٹی والوں نے پھر سر اٹھایا، لیکن اس وقت تک راجا کا جی انسپکٹر جنرل کی بیوی سے بھر چکا تھا۔ اس لیے اس بار اسے اس کام پر نہ لگایا۔ اس کی جگہ پر اس نے اپنے سیاسی صلاح کار کے مشورے سے چھ نئے وزرا کی تقرری کا اعلان کر دیا اور ان میں سے تین سفید ٹوپی والے پرجا پارٹی کے کارکنوں میں سے چنے۔ اس پر پرجا پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ تین نئے منتریوں اور ان کے ساتھیوں نے بیان دیا کہ ریاست میں جمہوری نظام قائم ہو گیا ہے۔ اب پرجا پارٹی یا جمہوریت کے لیے تحریک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ساری پرجا کو چاہیے کہ راجا کی سلامتی کی دعائیں مانگے۔ جن کو منتری نہیں بنایا گیا تھا، انہوں نے کہا کہ راجا کا بنایا

کابینہ، کیبنیٹ ایک ڈھونگ ہے اور پرجا کو اپنی تحریک جاری رکھنا چاہیے۔

سفید ٹوپی والوں کا رہنما ایک مذہبی شخص تھا، جو ریاست سے باہر کے علاقے میں جنتا راج کا پرچار کر رہا تھا۔ وہ پریم، سچائی اور عدم تشدد سے انقلاب لانے کا خواب دیکھتا تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ دشمن کے دل پر پریم اور ایثار سے فتح پانا لازمی ہے۔ راجا نے جب اس کا چرچا سنا تو فوراً اسے دعوت نامہ بھیجا کہ وہ خود آکر ریاست کا معائنہ کرے اور یہ بھی لکھا کہ آپ کے مقدس قدموں کو چھو کر میں اپنے کو ممنون سمجھوں گا۔

جب وہ مذہبی رہنما آیا تو اسٹیشن پر راجا نے خود اس کا خیر مقدم کیا۔ اس دن راجا نے نہ تو ولایت کا بنا ہوا سوٹ پہنا اور نہ جواہرات سے لدی ہوئی ریشم اور مخمل کی پوشاک، بلکہ اپنے سائیس سے مانگے ہوئے موٹے کھدر کے کپڑے (وہ سائیس نہیں، جواب راجا کا سسر بن چکا تھا۔) مذہبی رہنما نے جب دیکھا کہ راجا کتنا سادا لباس پہنے ہوئے ہے تو وہ بڑا متاثر ہوا۔ لیکن محل کی شان دیکھ کر تو وہ بالکل ہی دنگ رہ گیا۔ ہر کمرے میں سفید کھدر کا فرش۔ جگہ جگہ چرخے رکھے ہوئے ہیں۔ کہیں پوجا ہو رہی ہے تو کہیں غریبوں کو کپڑے (کھدر کے) بانٹے جا رہے ہیں۔ جہاں پیرس کی ننگی عورتوں کی قد آدم تصویریں لگی ہوئی تھیں، وہاں اب دیوی دیوتاؤں، سادھو سنتوں کی تصویریں لگا دی گئی تھیں۔

شام کو جب محل کے عالیشان دربار ہال میں مذہبی رہنما کی دعائیہ تقریب ہوئی تو اس میں راجا ہی نہیں، بلکہ اس کی سبھی رانیاں، لونڈیاں، داسیاں بھی کھدر کی ساڑیاں پہن کر شریک ہوئیں اور واپسی پر مذہبی رہنما نے ایک بیان دیا کہ اگر سب راجا اسی طرح سادی زندگی اور خدمت خلق کو اپنا لیں تو پرجا راجا کے لیے کسی طرح کے جدو جہد کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ راجا کا راج ہی رام راج بن جائے گا۔

اس طرح ریاست میں امن شانتی تو قائم ہوگئی پر راجا کو فکر لگی تھی کہ نہ صرف آس پاس کے علاقوں میں بلکہ ساری دنیا میں انقلاب، بغاوت، جمہوریت اور آزادی کی تیز اور بھیانک ہوائیں چل رہی ہیں۔ کہیں یہ طوفان اس کی ریاست کو بھی اپنے انقلاب کی لپیٹ میں نہ لے لے۔ یہ سوچ کر اس نے شہزادہ یعنی اپنے سب سے بڑے بیٹے کو بلا کر کہا: ''بیٹا، آج تک تم نے بیس

سال راج محل کے عیش اور آرام میں کاٹے ہیں۔ آج ہمارا راج محل ہی نہیں، دنیا کے سب راج محل خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ساری دنیا کے سفر کو جاؤ۔ ہر ملک کی سیر کرو، اپنی آنکھوں اور کانوں کو کھلا رکھو۔ دیکھو کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ سنو کہ مختلف زبانوں میں کیا کہا جا رہا ہے۔ کل تمھیں اس گدی پر بیٹھنا ہے، یہ تاج پہننا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تم دنیا کی بدلتی ہوئی حالت کا مطالعہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ لاعلمی اور ناتجربہ کاری کے سبب تمھیں مسند اور تاج سے ہاتھ دھونا پڑے۔"

راجا کا بیٹا اڑنے والا گھوڑا لے کر دنیا کی سیر کی خاطر چل کھڑا ہوا۔

پہلے وہ اُتر کی طرف گیا۔ پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے اوپر سے اڑتا ہوا وہ ایک نئے دیش میں پہنچا، جہاں ہزاروں میل تک میدان پھیلے ہوئے تھے۔ ایک بڑا اور خوبصورت شہر دیکھ کر وہ اتر پڑا۔ ایک ندی کے کنارے اونچے اونچے میناروں اور کلسوں والا ایک محل نظر آیا۔ اس نے سوچا۔ یہاں ضرور اس ملک کا راجا رہتا ہوگا۔ چلو اس سے ملا جائے اور اس دیش کا سب حال معلوم کیا جائے۔ پر جب اس نے راہگیر سے پوچھا: "کیوں بھائی؟ اس دیش کے راجا کا نام کیا ہے؟" تو وہ یہ سوال سن کر ہنس پڑا۔ بولا، "کیوں، کیا پچاس سال کی نیند سے جاگے ہو؟ جانتے نہیں کہ اس دیش میں راجا مہاراجا کب کے ختم ہو چکے۔"

یہ سن کر راجا کا بیٹا بہت گھبرایا، مگر محل کے اونچے اونچے برجوں کو دیکھ کر اسے کسی حد تک ڈھارس ہوئی۔

"تو پھر اس محل میں کون رہتا ہے؟" اس نے پوچھا اور جواب سن کر حیران رہ گیا، "اس محل میں ایک موچی کا بیٹا رہتا ہے۔" راجا کے بیٹے نے پھر پوچھا، "تو پھر اس دیش کا پچھلا راجا کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے؟" راہ گیر نے کہا، "وہ تو مر چکا۔ اس کا بیٹا کسی دوسرے دیش میں رہتا ہے اور موچی کا کام کرتا ہے۔ جوتیاں بناتا ہے۔" یہ کہہ کر راہگیر ایک کارخانے کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ایک اور سوال کرنے کے لیے راجا کے بیٹے کو اس کے پیچھے بھاگنا پڑا، "کیوں بھائی، جس کارخانے میں تم کام کرتے ہو اس کا مالک کون ہے؟" راجا کے بیٹے نے پوچھا، کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ کارخانے کے مالک سے مل کر اس عجیب غریب دیش کے بارے میں کچھ اور جانکاری حاصل

کرے۔ لیکن راہ گیر کا جواب سن کر تو وہ بالکل ہی حیرت میں پڑ گیا، "اس کارخانے کا مالک کون ہے؟ — اس کا مالک میں ہوں۔" راجا کے بیٹے نے راہگیر کے پھٹے پرانے اور پیوند لگے کپڑوں کی طرف دیکھا اور سوچا، بھلا ایسا معمولی آدمی ایک کارخانے کا مالک کیسے ہو سکتا ہے! راہگیر شاید اس کی حیرت کو تاڑ گیا، کیونکہ وہ بولا، "بھلے آدمی! میں مالک ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ میری طرح سارے مزدور جو اس کارخانے میں کام کرتے ہیں، اس کے مالک ہیں۔ چلو تمھیں بھی کارخانے میں کام دلوا دوں۔ اس دیش میں بیکار رہنا جرم ہے۔"

راجا کا بیٹا یہ سن کر گھبرا گیا۔ اس نے عمر بھر اپنے ہاتھ سے پانی بھی نہ پیا تھا۔ اس نے سوچا، ایسے ملک میں رہنا خطرناک ہے، جہاں کے راجا کا بیٹا موچی کا کام کرتا ہے اور ایک موچی کا بیٹا راج محل میں رہتا ہے، جہاں مزدور اپنے کارخانوں کے مالک ہیں اور جہاں بیکار رہنا جرم ہے۔ یہاں سے بھاگ چلنا چاہیے۔

اڑنے والے گھوڑے پر بیٹھ کر راجا کا بیٹا پچھم کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک ہرے بھرے، پھولے پھلے دیش کو دیکھ کر وہ اترا اور شہر کے باہر بڑی بھیڑ دیکھ کر وہ ٹھہر گیا۔ سامنے ایک اونچے چبوترے پر گلوٹین لگی ہوئی تھی اور ایک کے بعد ایک مجرموں کے سر کھٹاک سے اڑائے جا رہے تھے۔ راجا کے بیٹے نے پھانسی تو دیکھی تھی، کیونکہ اس کا باپ دو چار باغیوں کو ہر مہینے پھانسی پر چڑھایا کرتا تھا، مگر اس نے گلوٹین نہیں دیکھی تھی۔ یہ کل دار تلوار دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ سوچا کہ یہاں کا راجا بہت سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ ایک دن میں کئی سو باغیوں کا سر اڑا سکتا ہے۔ بھیڑ میں ایک آدمی سے اس نے پوچھا، "کیوں بھائی، اس ملک کے راجا کا کیا نام ہے؟ بڑا سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ میں اس سے مل کر ایسی ہی ایک گلوٹین اپنی ریاست کے لیے خریدنا چاہتا ہوں!" یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے، "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" راجا کے بیٹے نے حیرت سے پوچھا۔ ایک بڈھا جو ہنستے ہنستے دوہرا ہوا جا رہا تھا، بڑی مشکل سے ہنسی روک کر بولا، "راجا؟ راجا سے ملنا چاہتے ہو تو وہاں جاؤ...... نہ...... وہاں گلوٹین پر...... جلدی کرو نہیں تو ہمارے راجا صاحب......!"

اور راجا کا بیٹا یہ دیکھ کر کانپ اٹھا کہ اس دیش کے راجا اور رانی کو انقلابی حکومت کے حکم

سے گلوٹین کیا جارہا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے پوچھا، ''اس راجا نے کیا جرم کیا تھا؟'' جواب ملا ''وہی، جو سب راجا کرتے ہیں۔ پرجا پر ظلم، آبروریزی، زبردستی، ناانصافی...... ہزاروں کو کال کوٹھری میں سڑا سڑا کر مار ڈالا، لاکھوں اس ریاست میں بھوکوں مر گئے۔ سینکڑوں بے گناہوں کو اس نے گلوٹین کیا۔''

''مگر رانی؟ رانی کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟''

''جب پرجا بھوکی مر رہی تھی، لوگ روٹی روٹی مانگ رہے تھے تو اس سنگ دل رانی نے ہنس کر کہا تھا۔ اگر روٹی نہیں ملتی تو یہ لوگ مٹھائی کیوں نہیں کھاتے؟''

اتنے میں گلوٹین کی تلوار گرنے کی آواز کھٹاک سے آئی اور بھیڑ نے 'انقلاب زندہ باد؟ ''شہنشاہیت مردہ باد!' کے نعرے لگائے اور راجا کے بیٹے نے اپنے اڑنے والے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

اس بار اس نے سوچا، پورب کی سیر کی جائے۔ پورب کی جنتا ہمیشہ اپنے راجاؤں مہاراجاؤں، نوابوں اور بادشاہوں کے احکام بجالانے والی اور فرماں بردار رہی ہے۔ وہ اس طرح کا کوئی کام نہیں کر سکتی۔ وہاں راجاؤں کا راج ضرور چلتا ہوگا۔ پورب کی پہاڑیوں پر سے اڑتا ہوا وہ ایک بڑے اور شاندار ملک میں جا پہنچا۔ پہاڑیوں کے بیچ گھاٹیوں میں دھان کے کھیت لہلہا رہے تھے، مندروں اور پیگوڈاؤں کے سنہرے کلس دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ راجا کے بیٹے نے سوچا، یہاں کا راجا ضرور آرام سے راج کرتا ہوگا۔ گھوڑا روک کر وہ اترا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اچانک ایک چٹان کے پیچھے سے نوجوان فوجی سپاہیوں کی ایک ٹکڑی نے نکل کر اسے گھیر لیا۔ وہ پھٹی پرانی وردیاں پہنے ہوئے تھے، پر ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی۔

''تم کون ہو؟'' ان کے افسر نے سوال کیا۔

''میں ایک راجا کا بیٹا ہوں اور تمھارے راجا سے ملنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر سب ہنس پڑے۔

''کامریڈ! راجاؤں کا راج یہاں مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے۔ اب ہمارے عظیم ملک پر کسانوں اور مزدوروں کا راج ہے۔ ہم باغی عوام کے ساتھ آخری لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اگر تم ہمارا

ساتھ دینے کے لیے تیار ہو تو آؤ۔''

''لیکن جاگیردار، زمیندار، پونجی پتی، ساہوکار، کوئی تو شریف آدمی ہوگا یہاں......۔''

''سب ختم ہو چکے۔ جو بچ گئے وہ بھاگ رہے ہیں۔ اگر ان کے ساتھی ہو تو تم بھی بھاگ جاؤ......۔''

راجا کے بیٹے نے اڑنے والے گھوڑے کی کل دبائی اور وہاں سے اڑ گیا۔ بادلوں کے قریب پہنچ کر جب نیچے نگاہ کی تو اس نے دیکھا کہ لاکھوں کسانوں مزدوروں کی فوج پورب میں بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈر کے مارے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے سوچا کہ اب لوٹ جاؤں تا کہ اپنے باپ کو آگاہ کر دوں کہ پورب، پچھم اور اتر، تینوں طرف راجاؤں کا راج ختم ہو چکا ہے۔ آپ بھی ہوشیار ہو جایے۔

ابھی اس نے اپنے دیش کا رخ کیا ہی تھا کہ دیکھا ادھر سے کچھ لوگ بھاگے آ رہے ہیں۔

گھوڑا روک کر وہ اترا تا کہ ان سے پوچھے کہ ان پر کیا گذری ہے۔ اس نے دیکھا کہ یہ سفید چمڑی کے وہ لوگ ہیں، جو بہت زمانے سے اس کے دیش پر حکومت کیا کرتے تھے۔

''کیوں صاحب لوگو! تم پر کیا بپتی کہ اس طرح بھاگے چلے آ رہے ہو؟''

ان کا جواب سن کر راجا کے بیٹے کے ہوش اڑ گئے۔

انہوں نے کہا، دیش آزاد ہو گیا ہے، انقلاب ہو گیا ہے۔ سفید چمڑی والوں کی حکومت کی جگہ سفید ٹوپی والوں کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔'' ...... یہ کہا اور وہ بھاگتے چلے گئے۔

سفید ٹوپی والوں کی حکومت؟ بھگوان اس کے پتا کی مدد کرے۔ وہ کمبخت تو پہلے ہی راجاؤں مہاراجاؤں کے جانی دشمن ہیں۔ انہوں نے راجا کو یقیناً ہی گدّی سے اتار دیا ہوگا۔ کون جانتا ہے پچھم والوں کی طرح اس کا سر اڑا دیا گیا ہو......

اپنے باپ کے انجام کا خیال کرتے ہوئے راجا کے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے جھٹ کل دبائی اور گھوڑا اڑتا ہوا اس کی اپنی ریاست میں آ پہنچا تا کہ ہو سکے تو اپنے باپ کو ان بھیانک سفید ٹوپی والوں کے چنگل سے کسی طرح چھڑوائے۔

طرح طرح کے بھیانک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔ اس کے باپ کو

پھانسی دی جارہی ہے، اس کو کوڑے مارے جارہے ہیں، اسے کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہے، اس کا منہ کالا کر کے سلطنت سے نکال دیا گیا ہے۔ لیکن جب وہ ریاست کی سرحد پر پہنچا تو دیکھا کہ وہی پرانے سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح انھوں نے اس بار بھی شہزادے کو سلام کیا۔

آگے بڑھا تو دیکھا، کسان اسی طرح پھٹے پرانے کپڑے پہنے اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا ہے! زمین دار اسی طرح اپنی توندوں کو شاندار گھوڑا گاڑیوں میں لادے پھر رہے ہیں۔ ساہوکاروں کی دکانوں پر ویسے ہی سونے چاندی کے ڈھیر ہیں۔

اسے کچھ کچھ ڈھارس ہوا۔ محل کے نزدیک گیا تو دیکھا، راجا کا جھنڈا اب بھی لہرا رہا ہے۔ دربار لگا ہوا تھا۔ توپوں سے سلامی دی جا رہی تھی۔ بھڑکیلے چمکیلے لباس پہنے درباری قطاریں بنائے کھڑے تھے اور راجا کا بیٹا یہ دیکھ کر خوشی اور حیرت سے چلا اٹھا کہ اس کا باپ صحیح سلامت گدی پر شان سے بیٹھا ہے اور ایک سفید ٹوپی والا مشہور رہنما اس کے سر پر تاج رکھ رہا ہے۔

اس نے سوچا، میں جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔

''پتا جی'' ۔ وہ چلایا، ''مہاراج میں تو ڈر رہا تھا کہ اور دیشوں کی طرح آپ کو بھی گدی اور راج سے ہاتھ دھونا پڑا ہوگا۔ مجھے تو آپ کی جان کی بھی بڑی فکر تھی۔''

''گھبراؤ مت،'' راجا نے بیٹے کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا، ''یہاں سب ٹھیک ہے۔''

''تو آپ...... آپ...... ابھی تک راجا ہی ہیں نا؟''

راجا نے سفید ٹوپی والے نیتا کی طرف دیکھ کر کہا— ''نہیں بیٹا، اب میں راجا نہیں ہوں۔''

راجا نہیں ہیں؟'' بیٹے کے دل میں پھر خوف اور اندیشے نے چٹکی لی، تو آپ کو گدی سے اتارا جارہا ہے......؟''

راجا نے مسکرا کر انکار میں سر ہلایا، ''مجھے گدی سے اتارا نہیں، بیٹھایا جارہا ہے۔''

''لیکن آپ نے ابھی کہا نہیں کہ اب میں راجا نہیں رہا......؟''

''ٹھیک ہے۔ اب میں راجا نہیں، صدرِ مملکت بنا دیا گیا ہوں......''

○

# ہاتھی اور انسان

شام کے وقت سارا جنگل امن اور اداسی کی کالی چادر اوڑھے ہوئے آرام کر رہا تھا۔ جھیل کے کنارے اُگے ہوئے پیڑوں کے سائے کھائی میں پھیلتے پھیلتے دھندلکے میں گم ہوتے جا رہے تھے، مگر ان کا عکس جھیل کے گہرے پانی میں اب بھی جھلملا رہا تھا۔ دھیمی دھیمی ہوا پتوں میں سرسرا رہی تھی اور جھیل کی لہریں خاموشی سے کنارے پر ٹکرا رہی تھیں۔

دن کا یہ وہ وقت تھا، جو امن پسند کالیا کو سب سے زیادہ بھاتا تھا۔ اس جنگل کے ہاتھیوں میں مشہور تھا کہ ان کا سردار کالیا گھاس نہیں کھاتا، اپنے انکار کی جگالی کرتا ہے۔ جب دوسرے ہاتھی کھانے پینے میں لگے ہوتے تو وہ گھنٹوں کھڑا کھڑا اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے قدرتی منظروں کا معائنہ بلکہ مطالعہ کیا کرتا۔ گھنے جنگل میں سورج کی کرنوں کی آنکھ مچولی، جھیل میں سورج ڈوبنے کا منظر، آسمان پر تیرتے ہوئے بادل — یہ سب اس کی روح کو ایک نایاب اور خوشگوار سکون اور خوشی میسر کرتے تھے۔

لیکن آج بوڑھے کالیا کے دل کو سکون نہیں تھا۔ دماغ کو برانگیختہ کرنے والے خیال، جنگل کی زہریلی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ اپنی لمبی سونڈ سے وہ جنگلی گھاس کو توڑتا جا رہا تھا لیکن ایک بار بھی اس نے گھاس منہ میں نہ ڈالی تھی۔ آج اس کی بھوک اور پیاس دونوں اڑ گئی

تھی۔ سویرے سے اس نے پانی کا بھی ایک گھونٹ نہیں پیا تھا۔

عقل مند سے عقل مند ہاتھی کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے، جب وہ اپنے خیالوں اور احساسات کے جال میں بالکل الجھ جاتا ہے۔ یہی حالت آج کالیا کی تھی۔ اس کے فیصلہ کرنے کی طاقت نے جواب دے دیا تھا اور یہ خیال، کہ نہ صرف اس کے جھنڈ کے ہاتھیوں بلکہ جنگل کے سب جانوروں کی نگاہیں اس وقت اُس پر لگی ہوئی ہیں، اس کی پریشانی کو اور بڑھا رہا تھا۔ کسی نازک مزاج والے کے لیے ذمہ داری کا احساس اور بھی گمبھیر ہو جاتا ہے۔ خاص کر جب کالیا کو معلوم تھا کہ نہ صرف اس کے جھنڈ کے ہاتھیوں کی آزادی، بلکہ سارے جنگل کا سکون آج اس کے فیصلہ پر منحصر ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہ سکتا کہ وہ اپنے پاگل پن سے اتنے سارے امن پسند جانوروں کی زندگی کو مصیبت میں ڈالے۔ فطرت کے ان قوانین کے مطابق، جن سے جنگل میں امن بنائے رکھا جاتا ہے، بادل کو سزائے موت ملنی ہی چاہیے، جس سے اس کا پاگل پن سارے جنگل میں جھگڑے اور تشدد کی آگ نہ لگا دے۔ لیکن......اور یہ سب تھا بوڑھے اور ذہین کالیا کی الجھن کا— بادل اس کا بیٹا ہے.........اس کا اکلوتا بیٹا......

کالیا سے تھوڑی دور اس کی بیوی بڑکنو کھڑی اونچی پہاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور خاموشی میں ایک گہری اداسی اور ناقابل بیان دکھ کا احساس تھا۔ ممتا کی ماری بیچاری اپنے اکلوتے بیٹے کے خاتمے کو آتے دیکھ رہی تھی اور مجبور تھی، کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

اپنی بیوی کو اس حالت میں دیکھ کر کالیا کے خیال کی رو ماضی کی طرف گھوم گئی۔ کتنی میٹھی، کتنی احساس طمانیت سے بھرپور تھیں ان کی عنفوان شباب کی یادیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک نہ جانے کتنے موسم بدل چکے تھے، مگر ایسا لگتا تھا جیسے کل ہی کی بات ہو، جب کالیا نے پہلی بار اس ننھی منی موہک ہتھنی کو دیکھا تھا، جو اپنے بڑے بڑے کانوں کی وجہ سے بڑکنو کہلاتی تھی۔

کتنی چنچل اور الہڑ تھی وہ اپنی جوانی میں! اسے دیکھ کر کس مزے سے چلاتی تھی— ''کالا۔ کالا کالیا، کالا۔ کالا کالیا!'' پہلے دن ہی کالیا بڑکنو پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اور پھر ایک دن بڑکنو نے اپنی سڈول سونڈ اٹھا کر اور اپنے بڑے بڑے کانوں کو پنکھوں کی طرح ہلا کر بڑی ادا سے پکارا—

''کالا......کالا......کالیا، کالا......کالا......کالیا!'' اور یہ کہہ کر جنگل کی طرف چل دی تو کالیا کو یقین ہو گیا کہ وہ بھی اس سے پریم کرتی ہے اور راستے کی جھاڑیوں اور پیڑوں کو روندتا ہوا وہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔

جب ان کا پہلا بچہ پیدا ہوا تو کالیا نے اپنی سونڈ اٹھا کر ایک مسرت کی چنگھاڑ سے سارے جنگل میں اس مبارک واقعے کا اعلان کر دیا۔ جب اس نے اپنے بیٹے کو پہلی بار دیکھا تو وہ ننھی سی جان اپنے بڑے بڑے پنکھے جیسے کانوں میں بالکل لپٹا ہوا تھا۔

کالیا نے اپنی بیوی سے ہنس کر کہا— ''بڑکنو! اس کے کان تو دیکھ، بالکل تیرے جیسے ہیں۔''

اور بڑکنو بولی— ''ہاں، مگر رنگت تو تمھارے جیسی کالی ہے۔''

جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا گیا، وہ ماں باپ دونوں کے لاڈوں میں بھی چڑھتا گیا۔ اس کی شرارتیں بھی دل موہنے والی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر جب وہ چھوٹی سی سونڈ ہلاتا ادھر اُدھر بھاگتا تو کالیا اور بڑکنو دونوں کے دل خوشی اور فخر سے بھر جاتے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں جب کبھی وہ چنگھاڑتا تو ایسا لگتا جیسے آسمان میں بادل گرج رہے ہیں۔ ایک دن اس کے باپ نے کہا— ''بس ٹھیک ہے۔ اس کا نام بادل رکھ دو۔''

اور پھر اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بادل جوان ہو گیا۔ گٹھا ہوا بدن، چکنی کالی کھال، چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، مضبوط اور سڈول سونڈ اور ماں کی طرح بڑے بڑے کان۔ جنگل میں ایک بھی ہاتھی کا بچہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جتنی بھی کنواری جوان ہتھنیاں تھیں، سب ہی تو بادل کی پیار بھری نظر کی متمنی تھیں لیکن وہ خود صرف 'جوجو' کو چاہتا تھا، جو کالیا کے پرانے دوست موٹو ماں کی خوبصورت اکلوتی بیٹی تھی۔

اپنے خوبصورت اور تجیلے بیٹے کے بارے میں سوچتے سوچتے کالیا اس غور و فکر میں کھو گیا کہ آخر اتنے مضبوط، تندرست اور جوان جسم میں پاگل پن کے کیڑوں نے کیسے جنم لیا؟ کس موسم میں ہاتھیوں کو کون سی بیماری کیوں اور کیسے ہوتی ہے، یہ اسے معلوم تھا۔ گندا پانی پینے سے بخار ہوتا ہے، سارا بدن جلنے لگتا ہے۔ معمولی سے گھاؤ پر بھی اگر جنگلی مکھیاں بیٹھ جائیں تو بدن میں زہر دوڑ جاتا ہے۔ مگر بادل کو جو بیماری تھی، وہ جسمانی سے زیادہ ذہنی تھی۔ اور جنگل کا سب سے تجربہ کار

ہاتھی بھی اس مرض کا کوئی ایک سبب نہیں بتا سکتا تھا۔

پچھلے سال جو سوکھا اور قحط پڑا تھا— جب جھیل کا پانی ہی نہیں پیڑوں کے پتے تک سوکھ گئے تھے— اس کا اس بیماری سے شاید کوئی تعلق تھا۔ اس زمانے میں بلا کی گرمی پڑی تھی۔ ایسے موسم میں کبھی کبھی کسی کسی ہاتھی کے دماغ کی نرم اور حساس نسوں میں حرکت کو جیسے آگ لگ جاتی ہے۔ بادل کو اس زمانے میں دماغی بخار کی شکایت بار بار ہوتی تھی اور اپنے باپ کی دی ہوئی جڑی بوٹیوں کے باوجود اس کا یہ اعصابی بخار اترا نہیں تھا۔ اس کا مزاج چڑ چڑا ہو گیا تھا۔ بات بات پر وہ چنگھاڑنے اور جھگڑنے لگا اور اس کے دماغ میں یہ خبط الحواس خیال نہ جانے کیسے بیٹھ گیا تھا کہ جنگل کے سب جانور اس کے خلاف ہیں، کہ اس کے جھنڈ کے سب ہاتھی...... یہاں تک کہ خود اس کا باپ بھی اس کا دشمن ہے...... اس کے یہ شکوک پہلے تو مضحکہ خیز لگتے تھے لیکن بعد میں اس کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔ خاص طور سے جب اسے معلوم ہوا کہ جوجونے، جو کبھی اس کی محبت کا دم بھرتی تھی، اب ایک دوسرے جھنڈ کے نوجوان ہاتھی کے ساتھ گھومنا پھرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد بادل نے دوسرے ہاتھیوں سے ملنا جلنا اور ان کے ساتھ رہنا بھی چھوڑ دیا اور گھنے جنگل میں اکیلے گھومنے لگا۔ اب تو اس کا پرانا شک اور بھی پکا ہو گیا کہ جنگل کے سب جانور اور خاص طور سے سب ہاتھی اس کے دشمن ہیں۔ کوئی اس سے پیار نہیں کرتا، کوئی اس کا دوست نہیں ہے۔ شک و شبہ کے بطن سے نکلا خوف، خوف سے نفرت اور نفرت سے پیدا ہوئی تشدد کی ایک بھیانک انتہائی صورت۔ کالیا کو تو اسی وقت اپنے بیٹے کی خطرناک حالت کا احساس ہو گیا تھا، جب یہ خبر آئی کہ بادل مست ہو کر جنگل میں پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا ہے۔ اس نے کتنے ہی پیڑوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے اور ایک معصوم ہرن کو بھی اپنے نوکیلے دانتوں سے مار ڈالا ہے۔

کالیا، جو اپنے جھنڈ کا ہی نہیں سارے جنگل کا سردار مانا جاتا تھا، جانتا تھا کہ بادل نے جنگل کے دائمی فطری قانون کو توڑا ہے— وہ قانون، جس کے مطابق ایک جانور کے لیے دوسرے جانور کو مارنا منع تھا۔ وہ قانون درندہ صفت شیروں پر لاگو نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی وہ اس حد تک اس قانون کا احترام ضرور کرتے تھے کہ وہ کسی ہرن یا جنگلی بھینسے یا بکرے کو صرف اپنا

خوراک حاصل کرنے کے لیے مار سکتے تھے۔ جہاں تک سبزی خور اور امن پسند ہاتھیوں کا تعلق تھا، ان کو تو ہمیشہ اپنی امن پسندی اور صبر سے سارے جنگل کے لیے ایک آدرش قائم رکھنا پڑتا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی یہ ہوتا تھا کہ کوئی ہاتھی دماغی بخار کی گرمی سے مست ہو کر سارے جنگل کے امن کے لیے خطرہ بن جاتا۔ ایک مست ہاتھی کا خونی پاگل پن چھوت کی بیماری کی طرح نہ صرف جنگل کے جانوروں میں پھیل جاتا بلکہ اس کا اثر لازمی طور پر انسان پر بھی پڑتا...... انسان، جو جنگل کی سرحد پر گاؤں میں رہتا تھا...... اس انسان کی عادت تھی کہ جب کبھی کوئی مست ہاتھی کسی گاؤں یا قصبے میں گھس آتا تو وہ بندوق لے کر جنگل کا رخ کرتا اور اندھادھند ہر جانور کو آگ کے تیر مار کر ان کی جان لینا شروع کر دیتا۔

کالیا کو ابھی ابھی خبر ملی تھی کہ بادل چیختا چنگھاڑتا دکھن کی طرف جا رہا ہے، جہاں جنگل کے کنارے پر انسان اپنے گاؤں میں رہتا ہے۔ ایک بار وہ وہاں پہنچ گیا تو قیامت ہی آ جائے گی۔ نہ صرف انسان کو جنگل میں دخل اندازی کرنے اور جنگل میں اپنی بندوق شاہی چلانے کا بہانہ مل جائے گا بلکہ سارے جنگل میں بدامنی اور تشدد کی مہاماری پھیل جائے گی۔ کالیا نے عمر بھر یہی دیکھا تھا کہ تشدد اور مار کاٹ کی مہاماری بھی جنگل کی آگ کی طرح ہوتی ہے۔ ایک بار شروع ہو جائے تو اسے روکنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ بس پھیلتی ہی جاتی ہے۔ انسان شیروں پر گولی چلائے گا، شیر ہاتھیوں پر حملہ کریں گے، ہاتھی نہ صرف شیروں کو کچلنے کی کوشش کریں گے بلکہ جنگلی بھینسوں پر بھی حملے کر دیں گے اور کچھ نہیں تو پیڑوں پر غصہ اتاریں گے اور ان کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ جنگلی بھینسے معصوم ہرنوں پر حملہ کریں گے اور ہرنوں کے جھنڈ کے جھنڈ جنگل چھوڑ کر انسان کے کھیتوں کا رخ کریں گے اور پوری کی پوری فصل کو نوچ کر اور کچل کر برباد کر دیں گے۔ جنگل کے بڑے بوڑھے تجربہ کار جانور اس مہاماری کو انسانی مرض کہتے تھے۔ کیونکہ سب ذی روح جانداروں میں انسان ہی تو ہے، جو بے وجہ دوسروں کی جان لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک بار یہ مہاماری پھیل جاتی تو ہمیشہ یہی ہوتا کہ بڑے جانور اپنے سے کمزور جانوروں پر حملہ کرتے، اس طرح قتل و غارت گری کی آگ جنگل میں پھیل جاتی اور پھر انسان اپنی بندوق اپنے جال، پھندے اور عیاری و مکاری کے دوسرے ہتھیار لے کر جنگل میں آتا اور ہزاروں جانوروں کی جان جاتی

اور ہزاروں اپنی آزادی کھو بیٹھتے۔

یہ سب سوچ کر کالیا— جو نہ شیر سے ڈرتا تھا نہ اجگر سے، کانپ اٹھا۔ کچھ بھی ہو جائے، بادل کو انسان کی بستی تک پہنچنے سے پہلے روکنا ہی چاہیے۔ اگر وہ پھر بھی نہ رکے تو اسے ختم کر دینا چاہیے۔ یہی تھا قانون کا فیصلہ......اور اپنے جھنڈ کے سردار اور جنگل کے امن کے محافظ کی حیثیت سے کالیا کا فرض تھا کہ وہ اس قانون کی ہر حالت میں تعمیل کرے۔

لیکن کیا وہ یہ کر سکے گا؟ بادل اس کا بیٹا ہے، اس کی پیاری بڑکنو کا بیٹا ہے۔ بادل اس کے جگر کا ٹکڑا ہے۔ خود اس کے جسم کا حصہ ہے۔ بادل کو سزائے موت دینا اس کے لیے خودکشی کے برابر ہوگا۔ نہیں۔ نہیں، وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی نہیں دے سکتا۔ اس نے اپنی سونڈ اٹھائی اور اس کی چنگھاڑ سارے جنگل میں گونج گئی، جیسے وہ آکاش کے دیوتاؤں کے سامنے اپنی مخالفت کا اظہار کر رہا ہو۔

تب بڑکنو کو احساس ہوا کہ اس کے شوہر کے دل میں کیسا طوفان اٹھ رہا ہے۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہ اس کے پاس گئی۔ کالیا نے اپنی بیوی کو آتے ہوئے دیکھا اور یہ دیکھ کر بے سبب مسکرا دیا کہ اس مصیبت زدہ لمحہ میں بھی بڑکنو اپنے بڑے بڑے کانوں کو پنکھوں کی طرح ہلا رہی تھی۔

آج سے کتنے ہی سال پہلے جب وہ جوان تھا، بادل کی طرح ایک اور بدمست ہاتھی نے انسان کی بستی پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں خود انسان اپنی بندوق لے کر جنگل پر پل پڑا تھا اور سینکڑوں ہاتھی، شیر، بھینسے، اور ہرن اس کی آگ کے تیروں اور گولیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ پھر 'انسانی مرض' سارے جنگل میں پھیل گیا اور خود کالیا اس مرض کا شکار ہو گیا۔ بڑکنو کے آنسوؤں کے باوجود وہ چیختا چنگھاڑتا جنگل میں گھس گیا۔ کتنے ہی پیڑ جڑ سے اکھاڑ ڈالے، کتنی ہی جنگلی بکریوں اور ہرنوں کو اپنے بھاری پیروں تلے کچل ڈالا اور آخر کار ایک خونخوار شیرنی سے الجھ پڑا۔ اس کمبخت شیرنی نے اپنے زہریلے پنجوں سے اس کی آنکھیں لگ بھگ پھوڑ دی تھیں لیکن اس وقت کالیا میں پاگل پن کی شیطانی طاقت تھی اور اس نے اپنے لمبے دانتوں سے شیرنی کو بری طرح گھائل کر دیا۔ لنگڑاتی، چیختی، زخمی شیرنی جنگل کی طرف بھاگی اور اس کے پیچھے پیچھے کالیا

بھاگا کیونکہ اس کے سر پر تو خون سوار تھا۔ شیرنی کا پیچھا کرتے کرتے ایک دم اسے ایسا لگا جیسے اچانک اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو اور وہ موت کے اندھیرے میں گر رہا ہو۔ وہ حقیقت میں ایک گہرا گڑھا تھا جسے انسان نے اس جیسے مست ہاتھیوں کو پکڑنے کے لیے کھودا تھا۔

سو وہ انسان کا غلام بنا لیا گیا۔ اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئیں۔ اس کے سر پر ایک ادنیٰ سا انسان بیٹھ کر نوکیلے بھالے، نیزے سے کچوکے مارتا۔ غلامی میں آرام واطمینان بھی تھا۔ محنت کیے بغیر وقت پر کھانا، رہنے کو آرام دہ مکان، پہننے کو چمکیلی بھڑکیلی جھولیں اور چاندی سونے کے زیور! مگر ان کے نیچے ہوتیں غلامی کی زنجیریں۔ انسان اپنے غلام ہاتھیوں پر چاندی سونے کے ہودے رکھ کر سواری کرتا تھا، سرکس میں اس سے بندروں جیسے کرتب کرواتا تھا اور جب اسے یقین ہو جاتا کہ اتنا وقت غلامی کرنے کے بعد ہاتھی اپنے آزاد جنگل کو بھول چکے ہیں، تب انھیں جنگل میں واپس لا کر ان سے بوجھ ڈھلواتا تھا اور حد یہ تھی کہ انھیں دوسرے ہاتھیوں کو قید کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

کالیا نے یہ سب بے عزتی اور تکلیف برداشت کیے تھے لیکن وہ اپنے آزاد جنگل کو نہیں بھولا تھا، اپنی پیاری بڑکنو کو نہیں بھولا تھا اور جس دن اسے پوری طرح پالتو ہاتھی سمجھ کر اس کی زنجیریں کھول دی گئیں، اسی دن وہ غلامی کے آرام وسکون کو چھوڑ کر جنگل کی محنت کی زندگی اور جنگل کے خطروں کی طرف دوڑ پڑا کیونکہ اس طرف آزادی تھی اور اس کی پیاری بڑکنو تھی۔

اس واقعہ کو کتنے ہی سال گزر چکے تھے لیکن جو ایک بار ہوا وہ دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔ پچھلی بار انسان کے چنگل میں پھنس کر کالیا غلام بنا تھا، اس بار کسی اور کی باری ہو سکتی ہے۔ شاید اس کا پرانا دوست موٹو یا اس کا چھوٹا بھائی بلوتو، یا بیچاری جوجو، اور کون جانتا ہے شاید بڑکنو۔ ہو سکتا ہے وہ سب ایک ساتھ ہی فریبی انسان کے جال میں پھنس جائیں یا اس کی گولیوں کا شکار ہو جائیں۔ سوال بادل کی زندگی اور موت کا نہیں تھا، سوال بڑکنو کی محبت اور کالیا کی ممتا کا نہیں تھا، سوال تھا قانون کا، انصاف کا، ہاتھیوں کی قوم کی آزادی کا۔ سوال یہ تھا کہ کیا ایک شخص، چاہے وہ سردار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، ساری قوم کی آزادی کو خطرے میں ڈال سکتا ہے؟ نہیں۔ جو کچھ بھی ہو، بادل کو روکنا ہی پڑے گا، چاہے کالیا کو خود اپنے بیٹے کی جان لینی پڑے۔ اس فرض سے منہ موڑنا اس

کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے سونڈ اٹھائی اور ایک فیصلہ کن چنگھاڑ سے اپنے بیٹے کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

جہاں گھنا جنگل ختم ہوتا ہے، وہاں اونچی اونچی گھاس کے ایک میدان میں کھڑا ہوا بادل انسان کی بستی کی روشنیوں کو حقارت اور خوف اور غصے بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس کا بیمار دماغ دھیرے دھیرے اس فیصلے پر پہنچ رہا تھا کہ ایک ہی دھاوے میں انسان کی ساری بستی کو جڑ سے مٹا دے۔ ان روشنیوں کو ہمیشہ کے لیے بجھا دے، جو زہریلے کانٹوں کی طرح اس کے دماغ میں چبھ رہی تھیں۔ پھر ساری دنیا اندھیری ہو جائے گی، جیسے اس کا دل اور اس کا دماغ اندھیرا تھا لیکن جب اس نے بستی کی طرف قدم اٹھایا تو سامنے ایک کالے اور ہیکل عکس کو کھڑا پایا۔ یہ اس کا کالیا تھا مگر بادل نے اسے نہیں پہچانا۔ اس کا دماغ اب کسی کو پہچاننے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے دماغ میں خوف وحقارت کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ ایک بھیانک چنگھاڑ کے ساتھ اس نے اچانک حملہ کر دیا۔ یکا یک حملہ ہونے سے کالیا اپنا بچاؤ نہیں کر سکا۔ اس کے بیٹے کے مضبوط تیز دانت اس کے کندھے میں گڑ گئے اور گھاؤ گہرا آیا مگر بوڑھے ہاتھی میں اب بھی اتنی طاقت تھی کہ بیٹے کے پاگل پن بھرے حملوں کا جواب دے سکے۔ ایک طرف جوانی تھی، پاگل پن تھا، حقارت اور غصہ تھا، دوسری طرف طاقت تھی، تجربہ تھا، قانون اور انصاف تھا۔ جھنڈ کے سارے ہاتھی گھیرا باندھے باپ اور بیٹے کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ دخل دے سکے اور آخر میں انھوں نے دیکھا کہ بادل اپنے باپ کی مار کی تاب نہ لا کر پیٹھ کے بل گر گیا ہے اور اس کے ماتھے سے خون کا فوارا جاری ہے۔ پیشانی پر چوٹ کھا کر موت سے پہلے بادل کی آنکھوں میں اس کی کھوئی ہوئی یاد ایک لمحہ کیلیے بجلی کی طرح چمکی لیکن اسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ اپنے باپ کے ہاتھوں مارا گیا ہے کیونکہ اس وقت کالیا کے چہرے پر نہ نفرت تھی، نہ غصہ۔ صرف پیار اور ایک گہرا غم وحزن۔ کالیا نے اپنے مردہ بیٹے کے چہرے کو اپنی سونڈ سے چوما اور پھر وہی سونڈ اٹھا کر آسمان میں جھلملاتے ہوئے ستاروں کی طرف دیکھا: ''بیٹے! مجھے معاف کرنا۔ میں تمھیں مارنا نہیں چاہتا تھا۔ صرف تم سے انسانی مرض کو ختم کرنا چاہتا تھا۔''

○

# پیرس کی ایک شام

'ہم سفر لیمیٹیڈ' ایجنسی کے دفتر میں قدم رکھتے ہی، آدمی کا دل خود بخود تعریف کرنے کو ہو اٹھتا ہے۔ وہاں کی ہر چیز پر صفائی اور سلیقے کی چھاپ تھی۔ ہزاروں لوگ اس ایجنسی کے ذریعہ ٹکٹ خرید کر دنیا کے دور دور کے کونوں تک کا سفر کر چکے تھے۔ تجربہ کار یوروپین سیاح اور ملک دبیرون ملک گھومے ہوئے ہندوستانی سبھی تو ایجنسی کے دفتر کی جدید سجاوٹ سے متاثر اور وہاں کام کرنے والوں کے مہذب، برتاؤ اور غیر معمولی انتظامی صلاحیت کے قائل تھے۔ آسمانی رنگ کی دیواروں پر بنی تصویر ایک سیلانی مُصوّر کی تخیل کی اڑان کا خوبصورت نمونہ تھی۔ اس کے برش اور تخیل کی اڑان بمبئی اور لنکا کے فن پرستوں میں شہرت حاصل کر چکی تھی۔ یہ تصویر ان خوبصورت اور قابل دید جگہوں کی تھی، جہاں پہنچنے کی سنہری کنجی 'ہم سفر لیمیٹیڈ' کے پاس تھی۔ شرط یہی تھی کہ ہوائی یا سمندری جہاز کے ٹکٹ کے دام آپ کی جیب میں ہوں۔ لیکن ان تصویروں میں مصور کے تخیل نے ضرورت سے زیادہ اڑان بھری تھی۔ اس لیے تاج محل کا ایک مینار آئیفل ٹاور کی شکل کا تھا۔ میکسیکو کے کسانوں کے جھونپڑے یونان کے سنگ مرمر کے کھنڈروں سے ملے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے گلاسوں سے شامپین ابل ابل کر کمل کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی ڈل جھیل میں گر رہی تھی۔

فولاد کا چمکدار جدید ترین فرنیچر، قیمتی میزیں، جن کے اوپر کا حصہ شیشے کا تھا۔ بجلی کے نہ دکھنے والے لٹوؤں سے نکلتی ہوئی پر اسرار روشنی، موٹے قیمتی قالین اور باہر کے کمرے کی ایک پوری دیوار پر پلاسٹر سے بنا ہوا دنیا کا نقشہ۔ خلاصہ یہ کہ دفتر کی ہر چیز مینیجنگ ڈائریکٹر موہن وسوانی کی دلچسپی اور فن پرستی کا ثبوت تھی۔ موہن وسوانی کے سندھی لکھ پتی والد کی سِلک کی دکانیں دنیا کے ہر ایک کونے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ کولمبو، ہانگ کانگ اور ٹوکیو سے لے کر امریکہ میں وینکوور تک میں شاخیں تھیں۔ اس لیے بچپن سے ہی موہن کو گھومنے پھرنے کا کافی موقع ملا۔ پیرس کے لیٹن کوارٹر میں چھ مہینے چھٹیاں گذارنے کے بعد اسے فن کا بھی کچھ علم اور اس کے سلسلے میں دلچسپی ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے اس سارے علم اور تجربہ سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمسفر لیمیٹیڈ کے دفتر کی ہر چیز دیکھنے والے کو سیاحی کا دعوت دیتی معلوم ہوتی۔ خوبصورت رنگین تصویریں، عجیب وغریب سجاوٹ کے سامان، ننھے منے آئیفل ٹاور، شیشے کے ڈبوں میں رکھے ہوئے سیل کڑی کے تاج محل، نیویارک کی فلک بوس عمارتوں کے ماڈل اور اس کے ساتھ خوبصورت لباس والے اسٹنوں کی امریکی ٹون میں بات چیت، ان کی چستی اور اچھا برتاؤ— کہیں بھی کوئی ایسی چیز نہ تھی، جس پر انگلی اٹھائی جا سکے۔ ہر بات سے انتظامی صلاحیت ظاہر ہوتی تھی، ہر چیز سے سلیقگی ٹپکتی تھی۔ صرف ایک چیز وہاں کے معیار کے مطابق نہ تھی اور خوبصورت مناظر میں کھٹکتی تھی اور وہ تھی معمولی شکل و صورت اور سانولے رنگ کی ''ریسپشنسٹ' کملا کمتیکر، جو نئی نئی بحال کی گئی تھی۔ وہ ہمسفر لیمیٹیڈ کے خوب صورت اور نفاست بھرے ماحول میں بالکل بھی نہ پھبتی تھی۔ اس کی گھر کی دھلی ہوئی سفید ساڑی، ناریل کے تیل سے چمکتے ہوئے بالوں اور کسے ہوئے جُوڑے کو دیکھ کر نیویارک یا پیرس کے رومانٹک ماحول کی جگہ پونا، ستارا یا مہاراشٹر کے کسی گمنام قصبے کا خیال آتا تھا۔

شارک اسکن کے بڑھیا سوٹ پہننے والے ٹورسٹ 'کملا کمتیکر' کا روپ رنگ اور پہناوا دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے۔ بلکہ کچھ بے تکلف لوگ تو مینیجنگ ڈائریکٹر سے شکایت کر بیٹھے کہ ایسی معمولی شکل کی لڑکی، ایجنسی کے اپ ٹو ڈیٹ اور خوبصورت ماحول سے بالکل میل نہیں کھاتی اور اس کی موجودگی وہاں کی پرانی روایت کے ایک دم خلاف ہے، کیونکہ اس سے پہلے وہاں کام

کرنے والی لڑکیاں ایک سے ایک حسین اور فیشن ایبل تھیں۔

''یہی تو ساری دشواری ہے،'' موہن دسوانی مسکراتے ہوئے جواب دیتا۔ ''اس میں شک نہیں کہ حسین لڑکیوں کے سبب ہمارے آفس کی خوبصورتی بہت بڑھ جاتی تھی، لیکن آپ کو اندازہ نہیں کہ مجھے اس کی کتنی بھاری قیمت چکانی پڑتی تھی۔ کیونکہ اس کام میں حسین چہرے کے علاوہ تھوڑے بہت علم اور قابلیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ساری دنیا کا جغرافیہ ریپشنسٹ کی زبان کی نوک پر ہونا چاہیے اور ملک کے متعلق کچھ نہ کچھ جانکاری بھی ہو تو بہت اچھا ہے۔ سفر اور سیاحی سے کچھ دلچسپی بھی ہو۔ ان سب چیزوں کو سیکھنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب تین چار مہینے میں لڑکی کام کا طور طریقہ سیکھ جاتی ہے تو آپ صاحبان میں سے کسی کو اس سے پیار ہو جاتا ہے اور چند دن کے بعد مجھے استعفیٰ اور شادی کا دعوت نامہ ایک ہی ڈاک سے ملتا ہے۔''

پھر اپنی بات کے ثبوت میں موہن دسوانی یاد کی سوئی گھماتا۔ ''کٹی کیلاوالا تو آپ کو یاد ہوگی۔ بمبئی کی سوسائٹی کی تو وہ جان تھی۔ جب اس نے ہماری ایجنسی میں کام شروع کیا تو کافی سنسنی پھیلی تھی۔ ہاں، تو صاحب، جب کسی نہ کسی طرح اسے یہ یاد ہو گیا کہ 'پنٹنگ' انگلینڈ میں ایک دریائی کھیل کا نام ہے، چین کے کسی شہر کا نہیں، اور کومیٹ یچ مچ چھل تارے اور کانسٹلیشن' تاروں کے جھنڈ کو نہیں کہتے، بلکہ یہ ہوائی جہاز کی دو قسمیں ہیں تو معلوم ہوا کہ لکھ پتی بوبی بھوکھن والا سے اس کی شادی طے ہو گئی اور یہ ہوا اس طرح کہ بوبی ونٹر گیمس' میں شرکت کے لیے جنیوا جانا چاہتا تھا لیکن کٹی نے غلطی سے اس کے لیے اٹلی کے بندرگاہ جنیوا کا سمندری راستے کا ٹکٹ خرید دیا۔ یہ بات بوبی کو اس وقت معلوم ہوئی جب سوئزرلینڈ جانے والا جہاز کبھی کا اڑ چکا تھا۔ بوبی غصے میں بھنّاتا ہوا ہمارے آفس میں پہنچا، یہ معلوم کرنے کو کہ یہ غلطی کس کی بیوقوفی سے ہوئی ہے اور یہاں کٹی نے کچھ ایسے چارمنگ' انداز سے معافی مانگی کہ بوبی کا موڈ بدل گیا اور وہ کٹی کو شام کو ڈانس کی دعوت دے گیا اور نتیجہ وہی ہوا، جو سب کو معلوم ہے۔

''اور وہ غزال آنکھوں والی بنگالی حسینہ مایا گپتا سے بھی آپ شاید ملے ہوں، جس نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ وہاں کچھ شاعری اور ڈرامہ لکھنے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اسے ہمارے دفتر میں کام کرتے ہوئے مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ سابق ٹینس چیمپین سونی شرما، جو بابے نیوز'

کے اسپورٹ ایڈیٹر ہیں، اس پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ آئے تھے ہمارے یہاں 'ہیل سنکی' جانے کے لیے ہوائی جہاز کی سیٹ بک کرانے کو، جہاں وہ بین الاقوامی کھیلوں کے مقابلہ میں حصہ لینے کے لیے جا رہے تھے لیکن ہماری خوبصورت 'ریپشنسٹ' کی نشیلی آنکھوں نے انھیں سب کچھ بھلا دیا اور دو ہفتوں کے بعد کشمیر جا کر ہنی مون منانے کے لیے انہوں نے ہماری ایجنسی سے ہی سیٹیں بک کروائیں۔

''اور آشا متھانی، جو اپنی بے مثال خوبصورتی کی وجہ سے تقسیم سے پہلے 'مس کراچی' چنی گئی تھیں، اس کی کہانی تو اتنی تازہ ہے کہ دہرانے کی ضرورت نہیں لیکن میرے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔ گووانی حسینہ ڈائنا کولس کے حادثے کے بعد، جو ایک امیر امریکی کے ساتھ نو دو گیارہ ہو گئی۔ ذرا دیکھیے تو، وہ بھلا آدمی آیا تھا ہمارے یہاں اپنے ٹریولر چیک بھنانے اور ہماری ریپشنسٹ کو لے اڑا۔ بس اسی دن میں نے طے کر لیا کہ مستقبل میں 'ہم سفر لیمیٹیڈ' میں صرف معمولی شکل و صورت کی اور سیدھی سادی کپڑوں میں ملبوس لڑکی کام کرے گی۔''

اور اس طرح کملا کمتیکر جو جغرافیہ میں بی اے آنرس تھی، گھر کی دھلی ہوئی سفید ساڑی پہنے، بالوں میں ناریل کا تیل لگائے، نہ ہونٹوں پر لپ اسٹک، نہ سانولے رنگ کو سرخی پاؤڈر سے چھپانے کی کوشش، لوہے کے سستے سے فریم کے پیچھے چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھپکاتی، مختصر یہ کہ ہر زاویے سے اپنے سے پہلے کام کرنے والی خوب صورت اور فیشن ایبل لڑکیوں کے بالکل برعکس، ہمسفر لیمیٹیڈ کے دفتر میں کام کرنے پہنچ گئی۔

مہینے بھر کے اندر اندر دفتر کے سب لوگوں پر اس کی قابلیت کا سکہ جم گیا۔ ایک تو جغرافیہ کی تعلیم اس کے بہت کام آئی۔ شہروں کے عجیب عجیب اور نامانوس نام، جیسے کام چیٹکا، بیونوز، اے ایریز اور یاکوہاما اس کے لیے نئے نہیں تھے اور کچھ ہی دنوں میں مسافروں اور سیاحوں کی ضرورتوں اور دلچسپی کی اور باتیں بھی اسے زبانی یاد ہو گئیں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد تو وہ بین الاقوامی سیاحی کی بولتی چالتی انسائیکلو پیڈیا بن گئی۔ مثلاً اسے سین فرانسسکو سے لاس اینجلیس اور یاکوہاما سے ناگاساکی تک کے ٹھیک ٹھیک فاصلہ اور نیویارک سے رایوڈی جنیر یو کا ہوائی جہاز کا کرایہ زبانی یاد تھا۔ جتنی دیر کسی دوسرے آدمی کو نقشے میں لندن ڈھونڈنے میں لگتی، اتنی دیر میں تو وہ افریقہ کے

بالکل اندرونی علاقوں میں سفر کرنے کا پورا پروگرام تیار کر دیتی۔

غیر ملکی کرنسی اور زر مبادلہ اسے ایسے یاد تھے کہ وہ منٹوں میں زبانی حساب کر کے بتا سکتی تھی کہ ہزار روپے یا ہزار روبل یا ہزار کرونر کے بدلے میں کتنے ڈالر، کتنے سینٹ ملیں گے۔ دھیرے دھیرے 'ہم سفر لیمیٹیڈ' کے سب گاہکوں کو بھی اس کی قابلیت اور ذمہ داری بھرے تجربہ کا قائل ہونا ہی پڑا۔ اب وہ اکثر اپنے سفر کا پروگرام بناتے وقت اس سے صلاح اور مشورہ لیتے اور اس کی رائے کی قدر کرتے۔ کیا ہوا اگر 'ہم سفر لیمیٹیڈ' کی نئی ریسپشنسٹ خوبصورتی کے معیار پر پوری نہ اترتی تھی لیکن اس کی رائے اور صلاح پر چلنے والوں کو سفر کرنے میں کبھی کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی۔

کملا کمتیکر 'ہمسفر لیمیٹیڈ' میں کام کرنے سے پہلے اسکول میں پڑھاتی تھی، اس لیے اپنے نئے کام میں بھی اس نے استانیوں کا سا صبر دکھایا۔ ایجنسی کے ذریعہ سفر کرنے والوں کے پروگرام اور ان کی پریشانیوں میں وہ ماں کی سی ہمدردی اور دلچسپی دکھاتی، مسٹر مول جی! آپ نے گرم بنیائنیں تو کافی تعداد میں رکھ لی ہیں نا؟ انگلینڈ کے موسم کا کچھ بھروسہ نہیں۔ وہاں کبھی کبھی موسم بہار میں بھی کڑی سردی پڑنے لگتی ہے۔"

"مسز سکینہ! آپ بے فکری سے بچے کی گاڑی ساتھ لے جایئے۔ جہاز کے ڈیک پر اسے گھمانے کی بہت جگہ ہوتی ہے۔"

کسی کو وہ ٹرانس اٹلانٹک جہاز پر سفر کرتے ہوئے بین الاقوامی پتے بازوں سے بچنے کی تاکید کرتی تو کسی کو روم کے قابل دید جگہوں کے نام بتاتی۔

اگر کوئی نوجوان طالب علم پیرس کے راستے انگلینڈ جانے کا ٹکٹ خریدتا تو کملا کمتیکر اسے فوراً نصیحت کرتی۔ "مسٹر! آپ پیرس جا تو رہے ہیں، پر یاد رکھیے کہ وہاں دیکھنے کے لائق چیزیں ہیں لوور کا میوزیم، وارسائی کے راج محل یا پھر یونیسکو ہیڈ کوارٹرس۔ یہ نہیں کہ آپ مومارت کی رنگین راتوں کے چکر میں پڑ کر ماں باپ کے گاڑھے پسینے کی کمائی برباد کریں۔"

کبھی کبھی کوئی اس کی معلومات سے متاثر ہو کر پوچھتا، "مس کمتیکر! آپ کو یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ کیا آپ ان سب جگہوں پر گھوم آئی ہیں؟"

''جی نہیں۔ ابھی تک تو ایسا موقع نہیں ملا۔'' اور دبانے کی کوشش کرنے پر بھی اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل جاتی، کیونکہ اس جواب کے پیچھے مس کمتیکر کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کا راز چھپا تھا۔

اگرچہ مس کمتیکر کی شکل بہت معمولی اور مزاج دیکھنے میں استانیوں کی طرح خشک اور بے مزہ لگتا تھا لیکن حقیقت میں اس کا مزاج بہت رومانی تھا۔ اسکول میں ہی جغرافیہ پڑھتے وقت، دور دور کے ملکوں کا حال پڑھ کر وہ وہاں گھومنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ جیسے جیسے عمر بڑھی، یہ شوق بڑھتا گیا، یہاں تک کہ دنیا کے دور دور کے ملکوں کی سیر وتفریح کرنا، امریکی رسالوں اور کچھ انگریزی رومانٹک ناولوں کی ہیروئنوں کی طرح انجانے مقامات کے دلچسپ واقعات کا سامنا کرنا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن گئی۔ ویسے تو غریب خاندانوں کی، چھوٹے سے شہر میں بسنے والی لڑکی کے لیے، جس نے وظیفہ لے لے کر اور فیس معاف کرا کرا کے اسکول کا اور ٹیوشن کر کے اور پونا کے راشن آفس میں ہاف ٹائم کام کر کے گھر کا خرچ چلایا تھا، بمبئی پہنچ جانا ہی بہت بڑی بات تھی۔ شاندار سمندری جہاز پر ملک ملک کی سیر کرنا یا تیز رفتار ہوائی جہاز پر چند گھنٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچ جانا تو اس کے لیے ان چیزوں میں سے تھا جو صرف خواب کی دنیا میں ممکن ہیں۔ اس کے لیے تو یہی غنیمت تھا کہ کہ اسے ہمسفر لیمیٹیڈ میں کام مل گیا تھا، جہاں وہ سفر اور سیاحی کے دلکش دنیا کے اتنے نزدیک تھی۔

اس کی زندگی یوں ہی خواب دیکھتے دیکھتے گذر رہی تھی۔ جب وہ شام کو چرچ گیٹ سے دادر جانے کے لیے لوکل ٹرین میں سوار ہوتی تو تخیل کی دنیا میں وہ اس ٹرین میں یوروپ ہی کا سفر کر رہی ہوتی۔ اس کی چال تک جانے والی تنگ گلیاں لندن کے لائم ہاؤس کے علاتے یا پیرس کی پرانی گلیوں میں بدل جاتیں! کبھی دفتر میں اس کی میز پر رکھا ہوا کانسٹلیشن ہوائی جہاز کا ماڈل اس کے تصور کی اڑان کا ساتھ دیتا اور اسے کبھی کائرو، کبھی روم، کبھی لندن اور کبھی نیویارک کی سیر کراتا لیکن اس کی سب سے بڑی خواہش تھی پیرس جانے کی۔ پیرس! وکٹر ہیوگو، ڈیوما اور ژولا کا ملک، موپاساں کی کہانیوں کی بنیاد اور فرانس کے ٹورسٹ محکمہ سے شائع ان سب رنگین خوبصورت پمفلٹ اور تصویروں کا حقیقی مجموعہ، جن سے اس کا آفس اٹا پڑا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ یہ سب خواب کی سی باتیں ہیں۔ پر کبھی کبھی خواب سچے بھی ہو جاتے ہیں اور شاید اسی ہلکی سی امید پر اس نے چپکے چپکے باہر جانے کی سب تیاریاں کر رکھی تھیں۔ کیا پتہ، اچانک کوئی ایسا موقع آ جائے۔ اسی لیے اس نے ایجنسی میں کام شروع کرنے کے دوسرے دن ہی پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی تھی اور اب اس کی ڈیسک کی سب سے نچلی دراز میں اس کا پاسپورٹ بالکل تیار رکھا تھا۔ وہیں کالرا، ٹائیفائڈ اور چیچک کے سرٹیفکیٹ بھی رکھے تھے، جن کو ہر چھ مہینے کے بعد دوبارا بنوانا پڑتا تھا لیکن بار بار ٹیکہ لگوانے کی تکلیف یا اس کی فیس بھرنا اسے ذرا بھی نہ کھلتا۔ کون جانے کس دن وہ سنہرا موقعہ اچانک آ جائے اور وہ پیرس جا سکے۔ اس موقع کے لیے اسے ہر گھڑی تیار رہنا چاہیے۔

اور سچ مچ وہ گھڑی ایسی اچانک اور اتنی جلدی آئی کہ خود اس نے کبھی اس کا تصور نہیں کیا تھا۔ شروع میں تو کسی طرح اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں سچ مچ ہوائی جہاز کا ٹکٹ ہے، جس سے وہ اسی رات کو پیرس جا سکتی ہے۔

شام ہو چکی تھی۔ ایک ایک کر کے دفتر سے سب لوگ جا چکے تھے۔ روز کی طرح وہ ڈاک کے خطوط کو چھانٹنے میں مشغول اکیلی رہ گئی تھی۔ جھٹپٹے کا خوابیدہ وقت تھا۔ وہ وقت، جب دبی ہوئی خواہشات اور سوئے ہوئے ارمان جاگ اٹھتے ہیں۔ ہمیشہ اسی وقت ہر طرف پڑے ہوئے رنگین پمفلیٹوں، تفریحی جگہوں کی تصویروں اور اشتہارات، کوپنوں، رسیدوں اور ریزرویشن کے ٹکٹوں میں سے اس کے خواب جھجکتے جھکتے، شرماتے جھانکتے تھے۔ اسی لیے اس وقت ٹکٹ کو دیکھتے ہوئے بھی وہ یہی سمجھتی رہی کہ وہ روز کی طرح جاگتے میں خواب دیکھ رہی ہے لیکن آخر میں اسے ماننا پڑا کہ ٹکٹ اصلی ہے — کڑکڑاتے کاغذ پر ایک مشہور بین الاقوامی ہوائی کمپنی کا مس کملا کمتیکر کے نام پیرس کا واپسی ٹکٹ، جس سے وہ اسی رات کو پیرس روانہ ہو سکتی تھی۔ ضرور ہی یہ کوئی کرشمہ تھا۔

لیکن مس کمتیکر کو یہ بھی پتہ تھا کہ یہ کرشمہ ہوا کیسے۔ کوئی بات بھی ایسی نہیں تھی جو ناممکن کہی جا سکتی ہو مگر ان واقعات کا اس ترتیب سے ایک کے بعد ایک ہونا کرشمہ ہی تھا۔ مثلاً یہ بات کوئی ایسی مشکل نہیں تھی کہ نائکا دیوی بالا کے دل میں پیرس جا کر چھٹی منانے کی دھن سمائی اور یہ بات بھی سمجھ میں آ سکتی تھی کہ وہ نامہ نگاروں اور پبلسٹی سے بچنے کے لیے کسی فرضی نام سے ٹکٹ خریدنا

چاہتی تھی، تاکہ کسی کو اس کے جانے کی خبر نہ ہو۔ (اگر چہ یہ بھی ممکن ہے کہ شہرت سے بچنے کی خواہش اور گمنامی کے شوق کا ڈھونگ اس لیے رچایا ہو کہ بعد میں اس کے ذریعہ اس کی 'خاکساری' کا ڈنکا پیٹا جا سکے۔)

وجہ کچھ بھی ہو، دیوی بالا کے لیے اپنی اس خواہش کو پورا کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی، اس لیے جب وہ قیمتی سینٹ کی خوشبو میں مہکتی ہوئی، اجنتا اسٹائل کا جوڑا بنائے، یونانی ڈھنگ کی چپلوں میں اپنے صندلی پاؤں اور ان کے کیوٹیکس لگے ہوئے لال ناخنوں کا مظاہرہ کرتی ہوئی 'ہمسفر لیمیٹیڈ' ایجنسی کے دفتر میں پہنچی تو اس نے کملا کمتیکر سے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا—

''بہن! عورت ہونے کے ناتے تمھیں میرا یہ 'سیکریٹ' رکھنا ہوگا۔ ہم دونوں کے علاوہ تیسرے کسی کو یہ بات نہ معلوم ہو کہ میں دو ہفتہ کے لیے اٹلی، سوئزرلینڈ اور فرانس چھٹیاں منانے جا رہی ہوں لیکن زیادہ وقت میں 'گو پا گی' میں گذارنا چاہتی ہوں۔'' اس نے فرانسیسی تلفظ کی ناکام نقل کرتے ہوئے پیرس کو 'گیپا گی' کہا؛ ''لیکن میں پبلسٹی سے بہت گھبراتی ہوں، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ کسی اور نام سے یاترا کروں۔''

''یعنی آپ اپنے نام سے ٹکٹ نہیں لینا چاہتیں؟'' کملا نے تھوڑا حیرت سے پوچھا۔

''آپ ٹھیک سمجھیں! میں آپ کو کیا بتاؤں کہ 'سنیما فینس' کے ہجوم سے میرا کتنا ناکوں دم ہے۔ کہیں جاؤں یہ لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ آپ تو خود میری طرح عورت ہیں۔ سمجھ سکتی ہیں کہ ایک عورت کو 'پرائیویسی' کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔''

کملا نے 'اپنی طرح کی عورت' کی باریک شفون کی ساڑی کی جانب دیکھا، جس میں سے اس کی کمخواب کی چولی اور پاؤڈر لگی ہوئی کمر صاف دکھ رہی تھی، اور پھر اپنی گھر کی دھلی ہوئی ساڑی کی جانب دیکھا اور دیوی بالا کی 'پرائیویسی' کی ضرورت پر من ہی من مسکرائی۔ وہ اس ضرورت کو خوب سمجھ سکتی تھی۔ مگر دیوی بالا کے سفر کا پروگرام بناتے ہوئے ہی ایک سوال بار بار اس کے دماغ میں گونج رہا تھا— 'آخر یہ کہاں کا انصاف ہے؟ اس کی طرح میں بھی جہاں چاہوں، کیوں نہیں جا سکتی؟ آخر کیوں؟ آخر کیوں؟''

''ٹکٹ کس نام سے بناؤں؟'' اس نے اپنے من میں اٹھنے والے طوفان کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''ارے جو سمجھ میں آئے لکھ دو۔'' دیوی بالا نے لاپرواہی سے کہا۔

''کملا کمتیکر نام کیسا رہے گا؟'' آخر دل کی خواہش اچانک ہی منہ پر آگئی، پھر اس نے تھوڑا جھجکتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا نام ہے۔''

بھلا دیوی بالا کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس نے فوراً چیک کاٹ دیا اور چل دی۔ ایجنسی والوں نے طے شدہ تاریخ کے لیے اس کا ٹکٹ خرید لیا لیکن ٹھیک روانگی کی شام کو دفتر بند ہونے سے کچھ منٹ پہلے دیوی بالا کا ٹیلی فون آیا کہ کچھ ضروری وجوہات سے اس شام کو اس کا جانا ناممکن ہے اور وجہ یہ تھی کہ سینسر کی کاٹ چھانٹ کی وجہ سے اس کی تیار فلم کے کچھ مناظر کی پھر سے شوٹنگ کرنا پڑے گی، جس کے لیے اس کا بمبئی میں رہنا ضروری ہے۔ مگر کملا نے اس بات کو پوری طرح سمجھے بنا جلدی سے کہا۔ ''مس دیوی بالا! اس طرح تو آپ کا کئی ہزار روپے کا نقصان ہو جائے گا۔ اگر آپ چوبیس گھنٹہ پہلے اطلاع کر دیتیں تو دوسری بات تھی۔'' مگر دیوی بالا نے اتنا کہہ کر ''اونہہ، چند ہزار روپے کا نقصان کون سی بات ہے۔ یہاں تو لاکھوں کی پکچر کا سوال ہے۔'' ٹیلیفون بند کر دیا اور ٹکٹ کی طرف نظر ڈالتے ہوئے کملا کمتیکر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آج اس کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتے ہیں مگر کیا وہ اتنا بڑا قدم اٹھا سکے گی؟ کیا اس میں اتنی ہمت ہے؟ کیا وہ سچ مچ......

دیوار پر لگا ہوا گھنٹہ ٹن ٹن بجنے لگا۔ 'ایک ............ دو...... تین، دفتر کے خالی کمرے میں گھنٹے کی کھوکھلی اور ڈراؤنی سی آواز سنائی پڑ رہی تھی۔ 'چار...... پانچ' شاید اسے بخار کی حرارت ہوگئی ہے اور سر چکرا رہا ہے، یا اس فیصلہ کن لمحہ کے نشے نے اسے ساکت و جامد کر دیا ہے۔ 'چھ......سات...... آٹھ' دفتر کے کمرے کی دیواریں، جھومتی سی لگ رہی تھیں۔ 'نو......دس' اور ایسا لگا کہ گھنٹے کی ٹن ٹن ختم ہوتے ہی پورا گھنٹہ گھوم گیا۔ جیسے خود وقت اسے جلد ہی فیصلہ کرنے کا حکم دے رہا ہو— 'بس یہی ایک موقع ہے۔ اگر آج نہ گئیں تو پھر کبھی نہ جا سکو گی۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں!' من میں دبی ہوئی خواہشات، امنگوں اور حوصلوں نے اس کے سینے میں ہلچل مچا رکھی تھی، جس کی وجہ سے اس کی عجیب حالت تھی، جیسے آدمی تیز بخار میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ اس کی شریانوں میں خون کا بہاؤ تیز ہوا تھا اور جیسے اس کے دل میں پنکھ لگے ہوں۔ جانے یہ اس کے

دل کی دھڑکن تھی یا ہوائی جہاز کے پنکھوں کی گھڑگھڑاہٹ۔ اور یہ جہاز جو اسے نظر آ رہا تھا، سچ مچ کا تھا یا اس کی میز پر رکھا ہوا کانسٹلیشن کا ماڈل؟

اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن سچ مچ کا شاندار ہوائی جہاز اسی طرح سامنے موجود تھا اور کچھ لمحوں کے بعد وہ ایک ہاتھ میں پاسپورٹ اور دوسرے میں ٹکٹ لیے اس کی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی۔ اندر نرم اور آرام دہ سیٹیں تھیں، جن کی تعریف میں کتابچوں کے صفحے کے صفحے رنگے ہوئے تھے۔ ایئر ہوسٹس نے، جو پوسٹر پر بنی ہوئی تصویر کی طرح حسین اور اسمارٹ تھی، مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی مائیکروفون پر اس کی دلکش آواز سنائی پڑی۔۔ لیڈیز اینڈ جینٹل مین! مہربانی کر کے اپنی اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیجیے۔" جہاز ہوا کے کندھوں پر اونچا ہوا اور بمبئی کا چمکیلا نقشہ، جیسے کالے مخمل پر ہیرے جگمگا رہے ہوں، کہیں دور نیچے ہوتے ہوتے رات کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔ اس کے بعد کے سفر کی ساری تفصیل وہی تھی، جو وہ پیرس جانے والے مسافروں کو کئی بار بتا چکی تھی۔ قاہرہ پہنچتے ہوئے جہاز مصری پرامڈوں پر سے اڑا، جو اتنی اونچائی پر سے ریت کی لہروں پر ڈبکیاں کھاتے ہوئے ننھے منے کھلونے لگ رہے تھے۔ دوپہر کو روم کے پرانے کھنڈروں پر چکر لگاتے ہوئے لگا، جیسے وہ وہاں کی رنگین تصویر دیکھ رہی ہو اور پھر پیرس! اس کے سپنوں کا شہر پیرس۔۔ جہاں وہ خواب میں نہیں، آج سچ مچ پہنچ گئی تھی۔

"ٹیکسی مادام؟" ٹیکسی ڈرائیور نے ادب سے جھکتے ہوئے پوچھا۔ کملا کو اس کی شکل ایسی جانی پہچانی لگی جیسے کسی فلم یا کتاب یا خواب میں اسے دیکھ چکی ہو۔

"ادا لیے وہ مادام؟"

"آلا اوتیل۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ برسوں پہلے کالج میں سیکھی ہوئی فرنچ بولتے ہوئے اسے بڑی جھجک ہو رہی تھی۔

"اوتیل شانزا یلیز۔" اور ہوٹل کا یہ نام بھی یا تو پہلے اس نے کہیں خواب میں سنا تھا یا شاید ان ہوٹلوں کی فہرست میں پڑھا تھا۔ جن کی مدد سے وہ سیاحوں کو پیرس میں ٹھہرنے کے سلسلے میں صلاح دیا کرتی تھی۔

ہوٹل بھی خواب کی طرح خوبصورت نکلا۔ سنگ مرمر کا چکنا فرش، مہوگنی کا قیمتی فرنیچر، سنہرے فریموں کے قد آدم شیشے، قالین بچھی سیڑھیاں اور ایک ننّی کھلونا سی لفٹ، جو ایس کے لیٹر ESCALATOR کہلاتی تھی۔ اور اپنا کمرا دیکھ کر تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جیسے فلموں میں اس نے بادشاہوں کے کمرے دیکھے تھے، بالکل ویسا ہی۔ سنہرے ملمّعے کا شاندار چھپر کھٹ، جس کے چاروں طرف کمخواب کے پردے لگے تھے۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ آسمان پر شفق چھا رہی تھی۔ چائے خانوں کی رونق دیکھتے ہی بنتی تھی۔ ایسے میں کون کمرے میں بیٹھنا پسند کرے گا؟ کمرے سے ملے ہوئے غسل خانے میں ہلکے نیلے، چینی کے باتھ ٹب میں غسل کر کے بدن میں ایک نئی تازگی آ گئی تھی۔ لیکن نرم روئیں دار تولیوں کے لمس کا لطف لیتے ہوئے اسے ایک دم اپنی گھر کی دھلی ساڑی کا دھیان آ گیا اور وہ آسمان پر اڑتے اڑتے زمین پر آ رہی۔ اب کیا ہو؟ کیا وہ پیرس کی اس جادو بھری شام میں ایسی بھدّی ساڑی پہن سکتی ہے؟ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا سفری بیگ کھولا اور اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ ہوا۔ کئی بہت بھڑکیلی اور قیمتی ساڑیاں اور کندھوں پر ڈالنے کی کالی مخملی شال، کارچوب سے جھمچا رہی تھیں۔ جیسے شہزادیوں کا لباس ہو، اور کیا پتا اس کا بیگ کسی طرح اس شہزادی کے بیگ سے بدل گیا ہو، جو جہاز پر اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ مگر اس وقت وہ ان سوالوں سے اپنا دماغ کیوں پریشان کرے! اس کے لیے تو یہ ایک غیبی امداد تھی، تا کہ وہ پیرس کی اس حسین شام کا لطف لینے کے لیے باہر نکل سکے۔ پیرس کی مستی بھری ہوا اور رومانی نظارے سے دل اور نگاہ کی پیاس بجھا سکے۔ کیا پتا اس شام کوئی ایسا واقعہ وقوع پذیر ہو جائے، جو اسے زندگی بھر یاد رہے۔ شاید وہ بھی آج کسی کی پیار بھری نظر کا مرکز بن سکے۔ اس کے کانوں میں بھی پیار بھرے فقروں کا رس ٹپکے اور اس کا دل پیار کے لطف سے متعارف ہو لیکن پھر تلخ اور حقیقی تجربوں کی یاد نے اسے دھرتی پر لا پٹکا۔ اس کی شکل اس لائق کہاں کہ کوئی ایک بار سے دوسری بار اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھے بھی۔ اس نے شیشے پر ایک مایوس نظر ڈالی اور چونک پڑی۔ کہتے ہیں، آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔ تو کیا یہ سچ مچ اسی کا عکس تھا؟— حیرت انگیز طور سے بدلا ہوا۔ کیا یہ پیرس کا کرشمہ تھا کہ اس کے موڈ کے ساتھ اس کا روپ بھی بدل گیا تھا! شیشے میں ایک سانولا حسین چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ چہرہ کسی بھی نقطۂ نظر سے

بدصورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ صرف خواب میں ہی وہ اپنی شکل ایسی دیکھتی تھی۔

ہوٹل سے اتر کر کیفے کے سامنے سے گذرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کافی اور شراب پیتے پیتے لوگ اسے دیکھ کر لحہ بھر کو رک گئے اور اس کی طرف دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ایک بار اس نے سنا، کوئی دھیرے سے کہہ رہا تھا۔ ''ایلے ایست یون پرنسس۔'' (کوئی ہندوستانی شہزادی لگتی ہے) اور کملا نے فرینچ میں سوچا۔ 'ست ایں ریو۔' (ضرور یہ سب خواب ہے)

اور پھر نہ جانے کہاں سے، کس خواب کی دنیا سے ایک نہایت ہی خوبصورت نوجوان اس کے پاس آیا۔ چارلیس بائر سے بھی زیادہ خوبصورت! کملا کو جتنی فرینچ آتی تھی اس کی مدد سے اور کچھ اپنی سمجھ سے وہ بڑی مشکل سے اس کی بات سمجھ سکی۔

''کیا میں آپ کا تعارف حاصل کرنے کی سعادت پا سکتا ہوں؟''

کملا نے جھجکتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کہا۔ ''ناچیز کو کاؤنٹ پال وردی کہتے ہیں۔''

نیا ہونے پر بھی یہ نام کملا کو سنا سنا سا لگا۔ پر اسے ذرا بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے کہاں اور کب سنا تھا۔

''میں پیرس میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ کیا میں آپ کو پیرس کی سیر کرانے کا فخر حاصل کر سکتا ہوں؟'' پھر اس نے ویٹر سے کہا۔ ''اے گارسو!'' (شامپین لاؤ!)

اور ویٹر فوراً چاندی کی بالٹی میں برف میں لگی شامپین کی بوتلیں لے آیا اور کملا کو یاد آیا کہ پیرس میں بمبئی کی طرح شراب پر پابندی نہیں ہے۔

آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں آئی ہوں؟'' اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی لڑکھڑاتی فرینچ میں پوچھا۔

''مجھے تو ہمیشہ سے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ میں اس دن کا نہ جانے کب سے انتظار کر رہا تھا۔''

''تو آپ بھی میرا...... مطلب ہے، کسی کے انتظار میں تھے۔

''کسی کے نہیں، میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ تمھارے آنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔''

اور میں تمھارے......'' اس نے قبول کیا اور پہلی بار اپنے جھجک اور شرم پر قابو پا کر اس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال دیں۔

''تو آؤ، اس ملن کی خوشی میں جام ٹکرائیں۔ زندگی کے اس سب سے حسین خواب کے سچ ہونے کی خوشی میں۔''

کملا نے جس طرح فلم میں لوگوں کو شراب پیتے دیکھا تھا، اسی طرح شامپین کا ایک گھونٹ پیا۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور لطف کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔

''چلو وکٹری ٹاور تک چلیں۔

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔ لالی چھائے آسمان کے سامنے وکٹری ٹاور کی خوبصورتی، دیکھنے والوں کے دل پر عجیب اثر پیدا کر رہی تھی۔ کملا کو محسوس ہو رہا تھا کہ آج اس کے سارے خواب سچ ہو اٹھے ہیں۔ رومانی پیرس......سندر اور نوجوان کاؤنٹ جو کملا کی نظر میں پیرس کی مجموعی جمالیات اور رنگینی کی مورتی تھا۔ اور کچھ دیر کے بعد تجربے کے بنیاد پر کملا کہہ سکتی تھی کہ وہ نوجوان صرف عادات واطوار اور آداب میں ہی نہیں، ہمت اور بہادری کی نظر سے بھی بے مثال تھا۔ ہوا یہ کہ وکٹری ٹاور کے پاس پہنچنے پر کسی بگڑے دل نوجوان نے کملا کو دیکھ کر، بڑے بھدّے اور گندے ڈھنگ سے سیٹی بجائی۔ یہ دیکھتے ہی کاؤنٹ نے نہ کچھ کہا نہ سنا، فوراً ڈوئیل کو چنوتی دی اور اس سے پہلے کہ کملا واقعے کو ٹھیک سے سمجھ سکتی، دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل آئیں اور کملا کے کاؤنٹ نے اس کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی۔

آس پاس کے لوگ ڈوئیل دیکھنے کو جمع ہو گئے، پر کسی نے دونوں آدمیوں کو الگ کرنے کی کوشش نہیں کی اور کملا، وہ تو ایسی بھونچکی کھڑی تھی، جیسے اس کی ٹانگیں جواب دے گئی ہوں۔

شام کے دھندلکے میں لڑنے والوں کی تلواریں بجلی کی طرح کوند رہی تھیں۔ فلمی ایکٹروں کی طرح دونوں کبھی پینترے بدلتے، کبھی اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے، کبھی جھک کر دوسرے کا وار خالی دیتے لیکن ایک بار کاؤنٹ نے تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ مخالف کی تلوار اچھل کر دور جا پڑی اور کاؤنٹ کی تلوار کی نوک اس کے سینے کو چھید کر گئی اور وہ کٹے ہوئے

پیڑ کی طرح دھرتی پر گر پڑا۔ کاؤنٹ کی تلوار اس کے خون سے لال تھی۔

کاؤنٹ کملا کی طرف گھوم کر جھکا اور پھر کھڑا ہو کر بولا— ''یہ سب تمھاری خاطر ہے، میری دلربا!''

ٹھیک اسی وقت پولس کی سیٹی کی آواز سنائی پڑی۔

''جندارم!'' کاؤنٹ کے منہ سے اچانک نکلا اور کچھ ہی وقت میں کملا کو بھول کر جس کے لیے اس نے قانون کے خلاف 'ڈوئیل' لڑ کر ایک آدمی کا خون کر دیا تھا، پولس سے بچنے کے لیے چھلانگیں مارتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا۔ کملا بھی پیچھے پیچھے بھاگی، لیکن اس کو پکڑ نہیں سکی۔ پتلی پتلی پرانی پتھریلی گلیوں میں وہ اس کا پیچھا کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی سانس پھول گئی۔ ایک بار تو وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے کاؤنٹ کے بالکل قریب پہنچ گئی لیکن جب سانس لینے کو رکی تو وہ موڑ پر سے بھاگتا ہوا ہمیشہ کے لیے نظر سے اوجھل ہو گیا۔

لیکن پولس کی سیٹی کی آواز بھی کملا کا پیچھا کر رہی تھی اور وہ اسی طرح بدحواس سی بھاگ رہی تھی۔ آخر وہ ایک بند گلی میں پھنس گئی اور گھبرا کر ایک دروازے میں گھسی اور تیزی سے زینے پر چڑھنے لگی تاکہ پولس سے بچ سکے کہ ایک دم اس کا پاؤں ایسا پھسلا کہ وہ سر کے بل لڑھکتی ہوئی زینے سے نیچے آ رہی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

اور جب اندھیری رات ختم ہوگئی۔ تب اس نے دیکھا کہ وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر پڑی ہے اور اس کے کمرے میں ساتھ رہنے والی سہیلی اوشا نے اسے بتایا کہ وہ سیڑھیوں پر سے گر پڑی تھی اور سر میں سخت چوٹ آنے کے سبب دو دن، دو رات تک بالکل بے ہوش رہی۔ اوشا نے، جو میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں پڑھ رہی تھی، یہ بھی بتایا کہ بے ہوشی کی حالت میں وہ عجیب اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی تھی جن کا نہ سر تھا، نہ پیر۔ کبھی پیرس کا چرچا، کبھی کسی کاؤنٹ کا۔

''اور جانتی ہو، تم کیا کہہ رہی تھیں؟ میں تو اس کاؤنٹ کو پکڑ کر شیشی میں بند کر کے آفس میں رکھنا چاہتی ہوں۔ اس سے ہماری ایجنسی کی بڑی اچھی پبلسٹی ہوگی۔ میری رائے مانو تو تم کسی اچھے ماہر نفسیات کو دکھاؤ۔

''اور میرے کپڑے کیسے تھے؟ کیا کچھ سامان بھی ساتھ تھا؟'' کملا نے بُجھی ہوئی آواز میں

پوچھا۔اس پر ابھی تک اس لمبے خواب کی تھکاوٹ چھائی تھی۔

''کپڑے تو تمھارے وہی روز کے پہننے والے تھے لیکن ہاتھ میں پیرس کا ٹکٹ تھا، جسے تم نے کس کر پکڑ رکھا تھا۔''

کئی دن کے بعد جب کملا دفتر جانے کے قابل ہوئی تو وہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے ہوائی جہاز کی کمپنی کو ٹیلیفون کیا۔ ''میں ہمسفر لمیٹیڈ سے بول رہی ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں بیماری کی وجہ سے آپ کو بروقت اطلاع نہ کر سکی۔ ہم نے کملا کمتیکر کے نام پر پیرس کا جو واپسی ٹکٹ خریدا تھا، اسے کینسل کر دیجیے۔''

جواب سن کر اسے اپنے کانوں پر یقین نہ ہوا اور اس نے چیخ کر پوچھا۔ ''کیا؟......ذرا پھر سے کہیے۔''

ادھر سے کہا گیا۔ ''یہی کہ جس ٹکٹ کو آپ کینسل کرنے کو کہہ رہی ہیں، وہ تو کبھی کا استعمال ہو چکا۔ مس کملا کمتیکر پیرس جا کر واپس بھی آ چکی ہیں۔ ہاں، یہ بات ضرور عجیب ہے کہ وہ صرف ایک شام وہاں ٹھہر کر واپس آ گئیں۔ عجب سنکی نکلیں۔

یہ سن کر کملا عجیب الجھن میں پڑ گئی۔ اس کے ساتھ جو کچھ بیتی تھی، وہ خواب تھا یا سچ؟ لیکن کچھ دن بعد اخباروں کے فلمی کالم میں ایک خبر پڑھ کر یہ گتھی بھی حل ہو گئی۔ خبر تھی:

''معروف فلم اسٹار دیوی بالا نام بدل کر پیرس پہنچی لیکن اسٹوڈیو کے انتہائی ضروری کاموں کے سبب انھیں ایک ہی شام کے بعد لوٹ آنا پڑا۔''

O

# اُداس دیواریں

ہاں، میری بیوی، میری تجی بہت بہادر تھی۔ کم بخت کی بہادری اس حد تک پہنچ گئی کہ جب اسے دل کی تکلیف ہوئی، اس نے وہ بھی مجھ سے چھپائی۔ پتہ نہیں یہ کس طرح کی بہادری ہوتی ہے۔تجی جیسے تو کسی کو دل دے کر بھی' دل کا درد اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔

ایک سال گذر گیا مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کا دل کیسے دھڑک رہا ہے، کیسے ڈر رہا ہے، کیسے اپنے درد کو دبا رہا ہے!

ایک دن میں نے اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ وہ پانچویں سیڑھی پر پہنچ کر ہانپنے لگی اور رک گئی۔ مجھے شک گزرا تو میں اسے زبردستی ڈاکٹر بالگا کے پاس لے گیا۔ اس نے معائنے کے بعد بتایا کہ دل تک پورا خون نہیں پہنچ رہا ہے۔ میں اتفاق سے روس جا رہا تھا، اسے بھی ساتھ لے گیا۔ وہاں اسپتال میں دکھایا تو انھوں نے بستر سے اٹھنے نہیں دیا اور کہا: ''اسے یہاں پورا مہینہ رہنا پڑے گا۔''

جب میں اسے اسپتال میں داخل کرا کے واپس ہندوستان آیا تھا تو وہ وہاں ہنس کھیل رہی تھی۔ ایک ماہ بعد روسی ڈاکٹروں نے مرض کو لاعلاج بتا کر اسے واپس بھیج دیا۔

بمبئی میں، میں پھر ڈاکٹر بالگا سے صلاح مشورے کر رہا تھا۔ جب عالمی ادارۂ صحت کے

لوگ وہاں آئے تو معلوم ہوا کہ وہ کچھ مریضوں کے آپریشن کریں گے لیکن پھر ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ آپریشن کے لیے چھ افراد کو وہ پہلے ہی چن چکے ہیں۔ ان چھ مریضوں میں دو لڑکیاں بھی تھیں۔ جن میں سے ایک کا تعلق فلم کے شعبے سے بھی تھا۔ جب آپریشن کیے گئے تو دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی بعد میں مرگئی۔ میں نے سوچا کہ اگر عالمی ادارۂ صحت نے ساتواں مریض قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اچھا ہی کیا تھا۔

میری جی اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی لیکن لے رہی تھی۔ وہ میرے پاس تھی اور یہی بات ہم دونوں کے لیے وجہ تسلی بھی تھی لیکن اکھڑے سانسوں کی تسلی کب تک چل سکتی تھی۔ ڈاکٹر بالگا نے بتایا کہ کے۔ ایم اسپتال کے ڈاکٹر سیٹھ سے اچھا کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ ہم اس سے ملے تو وہ آپریشن کرنے پر رضامند ہو گیا۔ مشکل یہ تھی کہ اس اسپتال میں کوئی اسپیشل وارڈ نہیں تھا۔ صرف جنرل وارڈ تھا۔ جہاں مریض کے اردگرد چیخیں تھیں اور موت کے سائے تھے۔ ڈاکٹر سیٹھ نے کافی مہربانی کے بعد برآمدے کے کونے میں مسہری بچھوانے کے بعد پردہ لٹکا کر جی کے لیے ایک اسپیشل وارڈ بنوا دیا۔

اور جناب جی کے پاس ہونٹوں سے پھول بانٹنے کا جو ہُنر تھا۔ اس کی وجہ سے ڈاکٹر سیٹھ اس کا قریبی دوست بن گیا پھر جس دن آپریشن ہونا تھا' اس رات جی نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں رات اس کے نام خط لکھوں۔ صبح پانچ بجے اسے وہ خط دوں جس کے ایک ایک لفظ کو وہ اپنی روح میں سمو کر آپریشن تھیٹر جائے گی اور ضرور زندہ رہے گی!

میں نے اس رات جی کے نام اٹھارہ صفحوں کا طویل خط لکھا، صبح پانچ بجے اس کے حوالے کیا اور چھ بجے تک اس کا فیصلہ تھا کہ وہ نہیں مرے گی۔ اس نے بے ہوش ہونے تک خط کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے رکھا۔

نہیں جی، وہ خط میرے پاس نہیں ہے۔ اس نے کہا تھا: ''نرسوں کو ہدایت کر دو کہ وہ میرے بے ہوش ہو جانے کے بعد خط کو سنبھال کر رکھیں'' لیکن اس وقت اتنی گھبراہٹ تھی کہ میں نرسوں کو یہ ہدایت دینا بھول گیا۔

تین گھنٹے تک آپریشن ہوتا رہا۔ میں باہر منتظر رہا۔ ''سانس رو کے! آپریشن کے دوران

زندگی کا خاتمہ کر دینے والا ایک حادثہ ہو گیا۔ ڈاکٹر سیٹھ کے ہاتھ سے وہ رگ پھسل گئی جسے دوسری جگہ جوڑنا تھا' لیکن لہو کے سیلاب میں اس رگ کو تلاش کر لینے کے بعد بھی ڈاکٹر سیٹھ اس قدر گھبرا یا ہوا تھا کہ وہ ڈاکٹر بالگا کو مریضہ کے پاس چھوڑ کر باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے ایک سگریٹ پیا' اپنے آپ کو سنبھالا اور دوبارہ آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔

میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ ڈاکٹر سیٹھ' میری مجی کا قریبی دوست بن گیا تھا چنانچہ اسے بھی اپنے حصے کی دوستی کا درد سہنا پڑا۔ وہ درد اس نے سہہ لیا اور آپریشن کامیاب ہو گیا لیکن آئندہ تین دن ہم سب پر بہت بھاری تھے۔ مجی کی حالت نازک تھی۔ تین راتیں، میں سر کے نیچے ہاتھ یا کوئی کتاب رکھ کر سوتا رہا تھا۔

ان دنوں میرے دن، میرے نہیں تھے، وہ گروی رکھے ہوئے تھے۔ میں فلم 'چار دل' چار راہیں'' بنا رہا تھا جس میں نمی بھی تھی اور مینا کماری بھی۔ شوٹنگ کے لیے روز صبح اسی میل دور جانا پڑتا تھا۔

نہیں جی شوٹنگ آگے پیچھے نہیں ہو سکتی تھی۔ مینا کماری کے شوہر کمال امروہوی نے مجھے صرف پندرہ دن دیئے تھے۔ سولہویں دن کی سزا یہ ہوتی کہ سولہواں دن اور اس کے بعد آنے والا ہر دن دُگنے پیسوں کے حساب سے خریدنا پڑتا۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا، لیکن فلم ختم ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس بات سے گھبرا کر کمال امروہوی نے مجھ پر دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ ساتھ ہی نمی نے بھی دعویٰ کر دیا کہ شاید میں اس کے پیسے اپنے وعدے کے مطابق ادا نہیں کر دوں گا۔ سو مجھے عدالت کی تاریخیں بھی بھگتنا پڑتی تھیں اور شوٹنگ بھی کرنا ہوتی تھی' لیکن رات میری ہوتی تھی' میری اپنی۔ اس لیے میں نے بے ہوش مجی کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔ ''مجی! تمھیں زندہ رہنا ہے۔ زندہ رہنا ہے، زندہ رہنا ہے!'' اور جس گھڑی میں کتاب پر سر رکھ کر سو جاتا۔ نیند میں بھی میرے ہونٹ ہلتے رہتے اور خود اپنی آواز سے جاگ پڑتا' کہہ رہا ہوتا۔ ''مجی! تمھیں نہیں مرنا ہے' زندہ رہنا ہے!''

قیامت کے تین دن گذر گئے اور مجی ہوش میں آ گئی۔ ڈاکٹر سیٹھ نے مارے خوشی کے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''اب کوئی خطرہ نہیں۔''

مجی بچ گئی تھی۔ وہ اب صرف کمزور تھی۔ اس کمزوری کی حالت میں اسے خاص حفاظت

میں رکھنا تھا۔اس لیے ڈاکٹر سیٹھ کے کہنے پر میں نے ایک اچھے سے نرسنگ ہوم کا بندوبست کیا۔ نجی وہاں رہنے لگی اور روز بہ روز صحت مند ہوتی چلی گئی۔

آپ کو راز کی ایک بات بتاؤں۔اس کمزوری کی حالت میں' جب نجی کو میری مصیبتوں کا پتہ چلا تو اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں آئندہ اپنی کسی فلم میں کسی 'اسٹار' کو نہیں لوں گا۔نجی سے کیا ہوا یہ وعدہ' میں اب تک پورا کر رہا ہوں لیکن اس سے اگلا درد صرف میں سمجھ سکتا ہوں کہ نجی نے ان دنوں میرے ساتھ جو وعدہ کیا تھا' وہ پورا نہیں کیا۔

نجی جب روز بہ روز صحت مند ہو رہی تھی' اسے اچانک نمونیہ ہو گیا اور وہ......اور وہ......

خواجہ احمد عباس کی یہ سچی کہانی سن کر ان کے کمرے کی دیواریں اداس ہو گئیں۔ پھر دیواروں نے ان کی طرف نہیں بلکہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ایک دیوار دوسری دیوار سے کہنے لگی کہ اس شریف آدمی کو جو گھن لگ چکا ہے' اس کے بارے میں' وہ اور کسی کو نہیں بتائے گا۔ اس کے بارے میں صرف خدا جانتا ہے یا ہم دیواریں جانتی ہیں۔حساس دل کا ہونا بھی شاید گناہ کی بات ہے۔ یہ بندہ اس گناہ کے درد کو اپنے دل میں چھپائے بیٹھا ہے اور سوچتا ہے' اگر ایک دن نرسنگ ہوم میں' وہ نجی کے لمس کو بہت قریب سے محسوس نہ کرتا' اس کے لبوں سے اپنی حکایت دل نہ کہتا تو نجی نہ مرتی۔وہ سوچتا ہے کہ نجی کے لبوں سے حکایت دل کہنے کے سبب نمونیئے کے جراثیم نجی کے اندر چلے گئے تھے۔وہ تو صحت مند ہو رہی تھی' سنبھل رہی تھی اور ہر وقت ہنستی رہتی تھی لیکن ایک دن جب بڑے لاڈ میں آ کر اس نے اپنے لبوں کی تشنگی عباس کے لب کے سپرد کر دی تھی تو اسے سنبھل جانا چاہیے تھا۔نجی کی زندگی تو' کسی کچے دھاگے کی طرح تھی۔ اس نے جب عباس کو اپنے قریب کیا تو شاید وہ اسی وقت دھاگے کی طرح ٹوٹ گئی۔باہر شہر کی ہوا میں جانے کتنے جراثیم بھرے ہوتے ہیں۔وہ شہر کی خاک چھانتا آیا تھا اور نمونیے کے جراثیم کو بھی وہ کہیں سے ضرور اپنی سانسوں میں بسا کر لایا ہوگا۔

دوسری دیوار نے پہلی دیوار کی بات پر ہنکارا بھرا اور بولی، اس صبح بھی تو کچہری میں تاریخ تھی۔وہ نمی اور مینا کماری کے مقدمے سے نمٹ رہا تھا۔وہ سوچتا ہے' کچہریوں ہی میں نہیں بلکہ طرح طرح کے لوگوں میں بھی طرح طرح کے جراثیم ہوتے ہیں۔

گھر کی دو دیواروں کی بات چیت میں تیسری دیوار نے بھی اپنی آواز شامل کر دی، اسی لیے تو وہ سچا ہے کہ بے اعتباریوں اور بے انصافیوں کو بھی انسانی بیماریاں سمجھتا ہے۔ جس ہوائیں، ان بیماریوں کے جراثیم ہو سکتے ہیں۔ اس میں اور کون سے جراثیم نہیں ہو سکتے!

تینوں اداس دیواروں کا چہرہ دیکھنے کے بعد چوتھی دیوار نے دروازے کی طرف دیکھا اور بولی، اس دروازے میں سے گزر کر جب وہ گھر میں آیا کرتا تھا' ایک سکون بھی اس کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا تھا۔ اب وہ بے چین ہو کر باہر جاتا ہے اور بے چین ہی لوٹتا ہے۔ سوچتا ہے تجھی سے حکایت دل کہنا اس کا گناہ تھا۔

پھر چاروں دیواروں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا جسے کھول کر آہستہ سے عباس کمرے میں اس طرح داخل ہو رہا تھا جیسے کوئی گنہگار شخص دیواروں سے بھی نظریں چرا رہا ہو۔

○

# انٹلکچوئل اور بینگن

(مینڈکوں کی موسمی کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال)

ایک تھا مینڈک۔ مینڈکوں کا کام ہے ٹرانا اور پھدکنا' سو وہ بھی ٹراتا اور پھدکتا تھا بلکہ وہ ٹرانے اور پھدکنے میں دو جوتی آگے ہی تھا۔ یہی نہیں' اسے ہر وقت یہی خیال رہتا تھا کہ ہم کسی سے کم نہیں۔ ہوتے ہوتے ایک دن ایسا ہوا کہ وہ پھدکتا ہوا ایک لوہار کے پاس جا نکلا' جو بیل کے نعل ٹھونک رہا تھا۔ مینڈک نے سوچا' میں کیا اس بیل سے بھی گیا گزرا ہوں۔ مینڈک نے لوہار سے کہا: ''بھئی ہمارے بھی نعل ٹھونک دو!''

یہ ایک لوک کہانی ہے۔ نہ جانے اس کے بعد لوہار نے کیا کیا۔ کہیں لوہار بیوی سے لڑ کر آیا ہوگا تو اس نے مینڈک کے ضرور نعل ٹھونک دی ہوگی اور جو ٹھونک دی ہوگی تو بے چارے مینڈک پر کیا بیتی ہوگی۔ اس کا تصور کر کے ہی آج کے مینڈکوں کو عبرت پکڑنی چاہیے۔

## جدید مینڈک

بہر حال یہ قصہ ہے دورِ جدید کے مینڈکوں کا' جو کچھ یوں شروع ہوتا ہے۔ (سچ تو یہ ہے کہ

سارے قصے یوں ہی شروع ہوتے ہیں۔)

برسات جو آئی تو ندی نالے، سیلاب کے پانی سے بھر گئے، چھوٹے چھوٹے گڈھے تک جل تھل ہو گئے۔ برسات کا پانی مینڈکوں کے لیے آب حیات سے کم نہیں۔ اب کیا تھا، جدھر دیکھو ادھر مینڈک پھدک رہے ہیں۔ پھدکتے ہیں اور گاتے ہیں' گاتے ہیں اور پھدکتے ہیں۔

زمانہ جمہوریت کا ہے۔ اس جمہوریت کی وجہ سے مینڈکوں تک میں ایک خاص قسم کا شعور پیدا ہو گیا ہے' جسے بورژوا استعارے میں' خطرناک' قسم کا شعور کہتے ہیں۔ اس بار برسات میں اپنے اسی شعور کی وجہ سے یہ مینڈک پوری فضا پر چھا گئے۔ ان کی آواز اور ان کی قلابازیاں کچھ نہ پوچھیے۔ جھیلوں' تالابوں' ندی نالوں' گڈھوں' کنوؤں وغیرہ کے اردگرد کیسا سرکس ہوا ہے۔

ویسے سرکس کہہ کر مینڈکوں کی تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش غیر شریفانہ حرکت ہو گی لیکن آپ جانتے ہیں' جب کبھی نئی نسل اپنے شعور اور ضمیر کا پرچم اٹھاتی ہے' تو پرانی نسل' نئی نسل پر کیچڑ اچھالتی ہے اور پھر مینڈکوں کے پاس کیچڑ کی کیا کمی لیکن اب کی بار دورِ جدید کے مینڈکوں کا ردِعمل دوسرا ہوا۔ انھوں نے پرانی نسل کی کیچڑ بازی کا جواب کیچڑ بازی سے دیا۔ ایسا کہ بڑے بڑے گھاگ مینڈک کی جان کے لالے پڑ گئے۔ ہر طرف سے آواز آتی تھی:

'پگڑی سنبھال جٹا'

حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ بڑے بوڑھے قسم کے مینڈکوں نے تو پھدک کر پانی کی تہہ میں پناہ لی۔ کچھ نے ہنس کر بات ٹال دی۔ کچھ نے دیکھا کہ نوجوان مینڈکوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ انھیں اپنی جان کی فکر ہوئی۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور نوجوان مینڈکوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولے:

'نوجوانو' سچی بات تو یہ ہے کہ ہم پر اس فلک کج رفتار نے بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ ہماری کج رفتاری بھی فلک کی ہی کج رفتاری کا نتیجہ ہے۔ ہم نے زندگی میں ٹرانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ بہت ہوا تو ایک کنوئیں سے پھدک کر نکلے اور دوسرے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر شچنت ہو گئے لیکن اب نیا زمانہ ہے۔ مینڈک بھی پڑھ لکھ کر کیا سے کیا ہو گئے۔ آج تک کسی نے نہیں سنا تھا کہ

مینڈک شعر کہتے ہوں یا افسانے لکھتے ہوں۔لیکن آفریں ہے تم پر نوجوانو' کہ تم نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور ہم ٹاپتے رہ گئے۔ ٹراہٹ کو تم نے ایک فن بنادیا۔تم نے ٹراہٹ کے فنی نسخے تیار کیے۔ ان میں اتار چڑھاؤ پیدا کر کے یکسانیت اور بوریت دور کی۔ اب ٹراہٹ میں چونکانے والی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ انسان تو انسان' تمھاری ٹراہٹ سن کر خود مینڈک چونک جاتے ہیں، واہ واہ۔ ہونٹ ہلتے ہیں اور آواز نہیں پھوٹتی۔ آواز پھوٹتی ہے اور ہونٹ نہیں ہلتے۔ روز آفرینش سے ہم ایک ہی ڈھنگ سے پھدکتے آئے تھے لیکن آپ لوگوں نے پھدکنے کا بھی ایک خاص انداز پیدا کیا۔صرف اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر نہیں بلکہ آپ آڑے ترچھے بھی پھدک لیتے ہیں۔

سینگ کٹانے والے مینڈک

کچھ 'وضعدار' قسم کے مینڈک آپ کے ان کارناموں پر طعنہ زن ہیں۔ وہ سر پیٹتے ہیں اور ٹراتے ہیں کہ آپ انقلاب اور ترقی کے راستے پر بہت آگے نکل گئے ہیں۔ وہ بار بار نعرہ لگاتے ہیں:

'مینڈکوں کی آبرو خطرے میں ہے۔'

آپ کو چڑنے کے بجائے یہ کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہیے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

اگر یہ لوگ آپ کے ساتھ نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ میں اکیلا ان سب پر بھاری ہوں۔ میں جو آپ کے ساتھ ہوں۔

ایک نوجوان مینڈک نے اسے مشکوک نظر سے دیکھا:

''کیوں بڑے میاں سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونا چاہتے ہو؟ ہم دوسروں کی بتائی ہوئی ڈگر پر نہیں چلنا چاہتے ہم اپنی راہ خود بناتے ہیں۔ اپنی راہ لو۔تم بھی ان ہی لوگوں میں ہو جو ہمیں نٹڈی کہتے ہیں۔ بدچلن اور گمراہ کہتے ہیں۔ ہمیں باغی اور بوہیمین کہتے ہیں' اور اب ہمیں فتح یاب دیکھ کر ہماری صف میں شامل ہونا چاہتے ہو۔ تاناشاہی نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی۔'' وہ پھیپھڑے پھلا کر چلایا۔

تمام نوجوان مینڈکوں نے لبیک کہا:

''پرانے مینڈک اُلّو ہیں' بھولومت' بھولومت!'' دوسرا نعرہ پانی پر گونجتا چلا گیا۔

## چھک چھک

پاس ہی ایک کنوئیں میں' جو برسات کے پانی سے لبالب تھا' ایک بہت ہی شریف قسم کا ادھیڑ مینڈک بہت دیر سے چکر لگا رہا تھا اور باہر کا سارا مباحثہ سن رہا تھا۔ اب تک اس نے ساری زندگی کنویں میں چکر لگانے اور ٹرّانے میں گذار دی تھی۔ اس نے کنویں میں چکر لگاتے لگاتے اپنا مطالعہ بہت بڑھا لیا تھا۔ مطلب ہے زندگی کا مطالعہ یعنی کنویں کا مطالعہ۔ اگر بھولے بھٹکے کوئی بے وقوف مینڈک اس کے کنویں میں آن ٹپکتا تو وہ فوراً اس کو کنویں کی رام کہانی سنانی شروع کر دیتا' بے وقوف سے بے وقوف مینڈک بھی کنویں کی کہانی بار بار نہیں کہہ سکتا لیکن یہ مینڈک جس نے اپنا تخلص' چھک چھک' رکھ چھوڑا تھا کیونکہ اسے اپنی ٹرّاہٹ کے بعد اگر کوئی آواز پسند آئی تھی تو وہ ریل گاڑی کی تھی' جو پاس ہی کی پٹریوں پر' کیا جاڑا کیا گرمی' کیا برسات' چھک چھک کرتی گذرا کرتی تھی' یہی ایک قصہ سنایا کرتا تھا۔ بعض مینڈکوں نے اس پر اعتراض بھی کیا:

''کیوں بھئی تم ہو تو کہانی کار لیکن شاعروں کی طرح اپنا تخلص کیوں رکھا ہے؟''

چھک چھک نے بھنا کر جواب دیا:

''یہ میری انفرادی آزادی کا سوال ہے۔ مجھے ریل گاڑی کی چھک چھک پسند ہے اور میں اپنے آپ کو چھک چھک کہوں گا۔ میں اپنے کنویں میں چھک چھک کرتا رہوں گا۔ کر لیجیے جو کچھ کر سکتے ہوں آپ میرا۔ چھک چھک۔''

اس کے مزاج میں جدّت بھی تھی اور شدّت بھی۔ اس کے منہ آنے والے مینڈک بھاگ کھڑے ہوئے۔ مطلب یہ کہ ایک طرف کو پھدک لیے۔

## مینڈکوں کے تیور

ہاں تو وہ بہت دیر سے دَم سادھے باہر کی تو تو میں میں سن رہا تھا۔ وہ پھدک کر بھرے ہوئے کنویں سے باہر آ گیا۔ اس کو دیکھتے ہی پہلے تو سارے مینڈک بھونچکا رہ گئے۔ کہاں سے آ گیا یہ مردِ نامعقول! جذباتی مینڈکوں کے تیور دیکھ کر ایک لمحے کو تو وہ سٹ پٹایا' لیکن کنویں میں

اس نے بے کار چکر نہیں لگائے تھے' پچیس سال۔ اس نے گلا صاف کیا اور بڑے لحن سے ٹرایا۔ اس کی ٹراہٹ پہاڑی سے ٹکرائی اور فضا لرز اٹھی۔

''بھائیو! میں تم سے عمر میں بڑا ہوں لیکن دل اور ذہن کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ اس نظر سے دیکھو تو میں ابھی جوان ہوں''...... چھک چھک کا چہرہ سرخ ہوا اور پھر نیلا پڑ گیا۔ اس پر معلوم ہوتا تھا کسی قسم کا دورہ پڑ گیا...... ''آپ حیران نہ ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر آپ کنویں کی تہہ تک اتر سکتے ہیں تو پھر آپ میری بات کی تہہ تک بھی اتر سکتے ہیں۔ جہاں تک میرے دل ودماغ کی عمر کا تعلق ہے۔ میں جوان ہوں بلکہ بچہ ہوں بلکہ یقین مانئے میں پیدا بھی نہیں ہوا ہوں۔''

''نہیں بھائی تم چالیس سے کم کے نہیں لگتے۔ تم ہمارے ہم عمر کیسے ہو سکتے ہو؟'' ایک کم سن مینڈک نے جو شدت فکر سے بہت مدقوق نظر آرہا تھا' کہا:

''سچی بات یہ ہے کہ جب میں کنوئیں سے باہر نکلا تو میں پیدا ہوا اور میں اسی کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میں پیدا ہو چکا ہوں اور میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

تھوڑی دیر تک تو مینڈکوں کے درمیان اس مسئلے پر گرما گرم باتیں ہوتی رہیں اور ایسا محسوس ہوا کہ نوجوان مینڈک چھک چھک کی باتوں میں آگئے کیونکہ ان کے تیور بدل رہے تھے۔ چھک چھک نے اپنے پھیپھڑوں کی دھونکنی تیز کردی۔ اس نے دیکھا کہ منزل قریب ہے۔ وہ ان نوجوان مینڈکوں کا لیڈر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

## سعادت اور مسرت

''بھائیو! جہاں ہم نے دوسرے میدانوں میں ترقی کی ہے بلکہ نئے محاوروں کی روایت قائم کرتے ہوئے کہنا چاہیے' جہاں ہم نے دوسرے کنوؤں یا تالابوں یا جوہڑوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہاں ابھی کچھ ایسے کنویں' تالاب یا جوہڑ باقی ہیں جہاں ہم نے پھدکنے یا ٹرانے کی سعادت حاصل نہیں کی ہے۔''

''نہیں' ایسا کوئی تالاب یا جوہڑ یا کنواں نہیں جہاں ہمارا طوطا نہیں بولتا۔''

''طوطا؟''

''ہاں طوطا۔''

چھک چھک نے دیکھا کہ بنتا کھیل بگڑ رہا ہے۔ تو اس نے فوراً ہاں میں ہاں ملادی۔ اسے معلوم تھا کہ ہاں میں ہاں ملا کر انسان تو انسان مینڈک تک کیا سے کیا نہیں بن سکتا۔ اس نے کنویں میں بند بڑے داناؤں کی گرہ میں باندھ کر رکھنے والی باتیں سنی تھیں۔

مینڈکوں کی ترقی

''بھائیو! چھک چھک کا گلا خشک ہو رہا تھا اور اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ اس نے قریب کے گڑھے میں جمع پانی میں ڈبکی لگائی اور اگلے ہی منٹ باہر آ گیا۔

'بھائیو! اگر بندر ترقی کر کے انسان بن سکتا ہے تو کیا ہم صدیوں کنویں میں چکر لگانے کے بعد انٹلکچول بھی نہیں بن سکتے؟''

سامعین نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ''ٹرٹر! ٹرٹر!!''

چھک چھک بڑا چکرایا لیکن یہ چکرانا کنویں میں چکرانے سے مختلف تھا۔ اسے بالائی طبق روشن ہوتے ہوئے محسوس ہوئے، جیسے سویرا ہو رہا ہو حالانکہ وقت رات کا تھا اور آدھی رات بیت چکی تھی۔

''کیوں بھائی، تم لوگوں نے قہقہہ کیوں لگایا؟ کیا مجھ سے حماقت ہو گئی؟''

''بالکل۔''

''وہ کیسے؟''

''بھئی آپ ہمیں انٹلکچول بننے کی صلاح دے رہے ہیں۔ ہم انٹلکچول نہیں تو اور کیا ہیں؟ اب کیا پھر سے......؟''

'میرا مطلب ہے۔'

''مطلب وطلب کچھ نہیں، حضور، آپ بالکل اکسپوز ہو گئے ہیں۔ آپ کچھ نہیں ہیں، انٹلکچول بھی نہیں۔ آپ جینگن ہیں آپ کی عزت افزائی صرف تھالی کر سکتی ہے۔ ہماری تحریک میں آپ کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ آپ جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں۔ آپ جدھر کی ہوا دیکھتے ہیں ادھر کو چل پڑتے ہیں۔ آپ جدھر سے آئے ہیں ادھر ہی تشریف لے جایئے۔''

'شٹ آپ۔' چھک چھک پاجامے سے باہر ہو گیا۔

''ہندوستانی کو جب غصہ آتا ہے تو وہ انگریزی بولتا ہے۔'' پھر قہقہہ گونجا۔

چھک چھک نے تین بڑے نام لیے اور کہا ''میں ان کی نسل کا ہوں۔ تم سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہوں۔''

## چھک چھک کا مقام

''چھک چھک میاں ہوش کے ناخن لو۔ تم جن کے نام لے رہے ہو وہ مینڈک نہیں ہیں۔ ہر روز جہاں گھوڑے پیدا ہوتے ہیں' وہاں گدھے بھی پیدا ہوتے ہیں اور مینڈک بھی۔ اب اگر گدھے کہیں کہ میں فلاں فلاں ریس کے گھوڑوں کی نسل کا ہوں تو...... آپ یہ بتایئے اَعلکوئل مینڈکوں میں آپ کا کیا مقام ہے؟''

''میرا مقام؟ بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے۔ میں اس بدتمیزی کا انتقام لوں گا۔''

''انتقام؟'' مینڈکوں نے کورس میں دہرایا اور ٹوٹ پڑے چھک چھک پر اور اس کے جسم پر پھدکنے لگے۔

چھک چھک کو اپنے سر پر اجل پھدکتی نظر آئی' اس کے منہ سے ایک کربناک چیخ نکلی اور اُچھل کر غڑاپ سے کنویں میں جا رہا اور چکر لگانے لگا۔ اس کے گلے سے ایک ہی قسم کی قراہٹ نکل رہی تھی۔

''مقام۔ مقام۔ مقام۔''

باقی مینڈکوں کو محسوس ہوا کہ چھک چھک پاگل ہو گیا۔ ان کے دل میں ہول سا اٹھا اور وہ چھلانگ لگا کر پانی کی تہہ میں چلے گئے۔

○

# دیوار کے پاس

ہم اس سڑک پر سفر کر رہے ہیں جو پاکستان کو جاتی ہے۔ یہ میں اشاراتی طور پر نہیں کہہ رہا ہوں (ان معنوں میں تو ہم کئی سال سے سفر کر رہے ہیں) مراد اس وقت مادّی سفر سے ہے۔ یہ طویل سیدھی سڑک فاصلہ کے ساتھ ساتھ دھندلاتی چلی جاتی ہے اور سیالکوٹ اور اس سے پرے لاہور کو جاتی ہے۔

غروبِ آفتاب سے قبل کا مسحور کن وقت ہے، جب سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کے سائے طویل ہوتے ہوتے شام کے دھندلکے میں مدغم ہو جاتے ہیں دھندلکا! جس کے دامن پر کسی سائے کا داغ معلوم نہیں ہوتا اور اس وقت پرانی یادیں خود بخود دل کے کسی گوشہ میں چیخنے لگتی ہیں۔ دھرتی پر خاموشی چھائی ہوئی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی رفتار سے دوڑتی ہوئی جیپ کار کی آواز خاموشی کے دل کی دھڑکن ہے۔ یہ لمحہ سحر و اسرار کا لمحہ ہے۔ چمگادڑ درختوں کی چوٹیوں کو چھوڑ کر اڑ رہے ہیں۔ جہاں وہ لٹکے ہوئے تھے اور انھیں کی طرح یادوں کے بھی پر لگ گئے ہیں۔ جو ابھی تک دل کے گوشوں میں پناہ گزیں تھیں۔

کئی سال پہلے بالکل اسی موسم میں، اور شام کے ایسے ہی دھندلکے میں، میں نے آخری بار اس سڑک پر سفر کیا تھا۔ اس زمانہ میں یہ سڑک 'پاکستان جانے والی سڑک' نہیں تھی، اگر چہ سیاسی

اور نظریاتی طور پر عوام کی ایک بڑی تعداد اس سڑک پر چل رہی تھی جو کہ پاکستان جاتی تھی۔ اس زمانہ میں یہ سڑک صرف 'جموں سیالکوٹ روڈ' تھی۔

میں سری نگر سے صبح روانہ ہوا تھا اور اسٹیشن ویگن نے سانپ کی طرح لہراتی ہوئی بہنال سڑک کی مسافت نو گھنٹے سے پیشتر ہی طے کر لی تھی۔ وادی سے پرے بہت اونچے اونچے درختوں سے ہوتی ہوئی اننت ناگ تک اور پھر نشیب کی پہاڑیوں سے تیزی سے گذرتی ہوئی اور بہنال کی سخت چڑھائی کے گرد چکر لگاتی ہوئی ٹھٹھرتی ہوئی' یہ سڑک۔ بادلوں کی سطح سے بھی کچھ اوپر آجاتی ہے اور پھر درّہ سے ہوتی ہوئی وادیٔ جموں میں اترتی ہے جو نسبتاً گرم علاقہ ہے۔ یہ سڑک فاصلہ کے ساتھ ساتھ ہی اترتی رہتی ہے اور ہر سوفٹ کے بعد اُور کوٹ، سوئٹر اور پھر مفلر اتارنے پڑتے ہیں۔ سنہرے گنبدوں والے مندروں اور گنجان آبادی کے چھوٹے سے شہر جموں سے ہوتی ہوئی یہ سڑک سیدھی سیالکوٹ آتی ہے۔ پھر لاہور، پھر امرت سر، انبالہ، کرنال، پانی پت، دہلی اور پھر آگرہ اور الہ آباد ہوتی ہوئی یہ سڑک کلکتہ جاتی ہے اور یہاں سمندر کو چھوتی ہے۔

میں سری نگر سے آرہا تھا جہاں میں نے عوام کے انقلابی مزاج کا مشاہدہ کیا تھا۔ جہاں میں نے روح کو لہرا دینے والے ''کشمیر کو چھوڑ دو'' کے نعرے سنے تھے۔ میں لاہور ان لوگوں سے ملنے کے لیے جارہا تھا جو کشمیر کی تحریک آزادی کے قائد تھے اور پنجاب میں انڈر گراؤنڈ تھے۔ میں سری نگر جاتے وقت بھی ان سے ملا تھا۔ لاہور سے مجھے دہلی اور بمبئی جانا تھا تاکہ میں تقریر اور تحریر کے ذریعے سے لوگوں کو بتاؤں کہ میں نے کشمیر میں کیسی بڑی بڑی اور عجیب باتیں دیکھی اور سنی ہیں۔

سیالکوٹ'۔۔۔ ۱۲ میل!!

سیالکوٹ'۔۔۔ ۱۱ میل!!

ہر ڈیڑھ منٹ کے بعد سڑک کے کنارے لگا ہوا میل اور فرلانگ بتانے والا ایک پتھر تیزی سے گذر جاتا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس آرام سے سیٹ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور میری نظریں مناظر کے حسن اور سکون میں کھو گئیں۔ میری نظروں کے سامنے لامتناہی اور ہموار میدان تھا جو فاصلہ میں پھیلتا چلا جارہا تھا۔ دن بھر کی محنت کے بعد کسان اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور

سَروں پر گھاس کے بڑے بڑے گٹھر لیے بَیلوں کی جوڑیوں کے پیچھے۔ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے، جو ہماری سڑک کے دونوں طرف تھے۔

آج پھر وہی طلسمی لمحہ تھا۔ وہی خاموش منظر، وہی سڑک، زمین و آسمان وہی تھے اور افق میں ڈوبتا ہوا سورج کا نارنجی گیند بھی وہی تھا۔

سیالکوٹ، —9 میل!!

میرے خیالات جیپ سے زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ رہے تھے، سیالکوٹ!! امرتسر!! لاہور!! جالندھر! انبالہ!! پانی پت!! دہلی!!

سیالکوٹ، —8 میل!!

طویل سیدھی سڑک آگے بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ دہلی سے بھی پرے کلکتہ تک، یا بمبئی تک، یا مدراس تک، یہاں ہم ہندوستان کی وسعتوں کو چیرتے ہوئے جارہے تھے۔

لیکن نہیں، نہیں!!......ایک جھٹکے کے ساتھ جیپ رک گئی۔ سوچیت گڈھ کی چنگی کی چوکی پر ریاست جموں و کشمیر کی سرحد ختم ہوتی تھی اور یہاں سڑک کانٹے دار تاروں سے بند تھی۔ بائیں ہاتھ کو چند فٹ پر تار اور ٹیلیفون کے تار کٹے ہوئے تھے۔ تار کی دیوار کے دونوں طرف سڑک پر ایک ایک کھمبا تھا لیکن ان دونوں کے درمیان کے تار کٹے ہوئے تھے......دونوں طرف کے، دھول میں اَٹے ہوئے انسانوں کے رشتے منقطع ہو گئے ہیں! کیا کوئی ایسا آدمی نہیں تھا؟......کیا کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو ان ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑ دے؟

ریاضی کا مشہور AXIOM کہ دو نقطوں کے درمیان سب سے کم فاصلہ ایک سیدھی لکیر ہے اب صحیح نہیں رہا۔ سڑک پر آدھے میل آگے سرحد کی حفاظت کرنے کے لیے پاکستانی فوج کا دستہ ہے لیکن اگر وہ سوچیت گڈھ میں مقیم ہندوستانی فوج سے کوئی گفت و شنید کرنا چاہے تو اسے یہ کرنا پڑے گا کہ بذریعہ تار سگنل بھیجے اور یہ سگنل سیالکوٹ، لاہور، امرتسر، پٹھان کوٹ اور جموں ہوتا ہوا سوچیت گڈھ آئے گا۔ جو کام صرف ایک طرف سے چیخ کر دوسری طرف اطلاع کر دینے سے ہوسکتا ہے، اس کے لیے دو سو میل کا چکر ہو گیا ہے۔

اس وقت ہی مجھے معلوم ہوا کہ اسی طرح دو سو میل کی مسافت طے کر کے سیالکوٹ کے

پاکستانی کمانڈنگ بریگیڈیئر کا ایک پیغام ہندوستانی بریگیڈیئر کے پاس آیا ہوا تھا کہ وہ ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ یہ ملاقات دوستانہ اور تہذیبی تھی اور اس طرح ایک بار کانٹے دار تاروں کی دیوار سڑک پر سے ہٹ گئی اور پاکستانی فوج کے نوجوان بریگیڈیئر کی جیپ ہندوستانی علاقہ میں آ گئی۔ یہ دونوں بریگیڈیئر ایک دوسرے کے پرانے دوست نکلے۔ دونوں ملٹری اکیڈمی اور اسٹاف کالج میں ساتھ ساتھ تھے اور ایک دوسرے کو پہلے نام سے پکارتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی پیٹھ تھپتھپائی اور گلے ملے' پھر دونوں چائے پر گذرے دونوں کے قصے لے کر بیٹھ گئے۔ پاکستان کے بریگیڈیئر نے (جو شاید بھوپال کا رہنے والا تھا) بتایا کہ اس کی بیوی حیدرآباد میں ہے اور اس فکر سے وہ پریشان ہے۔ ہندوستان کے بریگیڈیئر نے وعدہ کیا کہ وہ پتہ لگائے گا۔ (اور اس نے پتہ لگایا کہ...... وہ خیریت سے تھی۔) پھر پاکستان کے افسر نے کہا: ''ہم لوگوں میں سنا جا رہا ہے کہ تم لوگ حملہ کرنے والے ہو۔'' ہندوستان کے افسر نے یقین دلایا کہ اس کا نہ ایسا ارادہ ہے' اور نہ کوئی حکم اسے ملا ہے۔ اس کے بعد دونوں نے ہاتھ ملائے۔ پاکستان کی جیپ واپس چلی گئی اور کانٹے دار تاروں کی دیوار پھر سڑک پر کھنچ گئی۔

میں نے تاروں کی اس فصیل کو دیکھا اور میرے ذہن میں یہ خیال گونجنے لگا کہ یہ فصیل ہندوستان کا مکروہ ترین منظر ہے' زنگ آلود' گندے کانٹے دار تار' خوبصورت منظر کا ستیاناس کر رہے ہیں۔ میرا شدت سے جی چاہا کہ اس کو توڑ دوں اور ہماری جیپ سیالکوٹ جائے وہاں سے لاہور اور امرتسر' ہوتی ہوئی سیدھی دہلی...... کیوں نہیں؟...... ایک بار ایسا ہوا تھا...... اب کیوں نہیں؟ قدرتی INSTINCTS ان مصنوعی حدوں سے بغاوت کر رہی تھیں جن کا تعین سیاست دانوں نے کیا تھا۔

میں نے داہنی طرف مڑ کے دیکھا۔ میری نظروں کے سامنے سوچیت گڈھ کا دیہات تھا لیکن ویرانہ تھا۔ ان سرحدی دیہاتوں میں کئی میل تک جھونپڑیاں ہیں مگر بغیر چھپر یا کھپریل کی۔ کھیت ہیں مگر ان میں فصلیں نہیں!......

میں نے بائیں طرف مڑ کے دیکھا۔ تاروں کی دیوار کے اس پار پاکستانی علاقہ میں' قریب آدھے میل پر سوچیت گڈھ کا ریلوے اسٹیشن تھا...... لیکن وہ بھی ہندوستانی علاقے کے دیہات کی

طرح ویران تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن نہیں تھا' صرف ریلوے اسٹیشن کا بھوت تھا۔

میں نے چند لمحوں کے لیے تو کیلے تاروں کی فصیل ہٹانے کی اجازت حاصل کر لی۔ میں، میرا دوست' اور سکھ کپتان (جو ہمیں اسکورٹ کرا رہا تھا) پاکستانی علاقہ میں داخل ہو گئے مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کوئی بین الاقوامی قانون توڑا تھا۔ ایک سال بعد' میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں خود کو پاکستان میں کس طرح محسوس کروں گا۔ وہاں رہنے کے بعد (وہ چاہے میں ایک ہی لمحہ رہا ہوں) میں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہاں رہنے کے کیا تاثرات ہیں۔ کچھ نہیں! کوئی فرق نہیں! وہی زمین اور وہی آسمان!!

میں نے سڑک کے پاکستانی حصے پر کسی چیز کو متحرک دیکھا۔ میں نے کپتان سے اس کی دوربین مانگ لی۔ ایک کسان اپنے سر پر گھاس کا گٹھر لادے جا رہا تھا۔ بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ طاقتور شیشوں نے اسے مجھ سے بالکل قریب کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پھٹی ہوئی میلی جیکٹ فتوہی اور پنجابی تہبند پہنے ہے۔ میں نے گھوم کر دوسری طرف دیکھا۔ سڑک کے ہندوستانی حصہ پر بالکل اسی طرح کا ایک کسان سر پر گھاس کا گٹھر لادے جا رہا تھا۔ بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ بھی دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی پھٹی ہوئی میلی جیکٹ فتوہی اور پنجابی تہبند پہنے ہے۔

اور اس ایک لمحہ میں مَیں نہیں بتا سکتا تھا کہ کس طرف پاکستان ہے' اور کس طرف ہندوستان!!

O

# مفلس مُووی ٹون

اسٹیج پر بالکل اندھیرا ہے۔ دھیرے دھیرے روشنی بڑھتی جاتی ہے۔ نقیب کی آواز سنائی دیتی ہے۔

نقیب: باادب' باملاحظہ ہوشیار' شہنشاہ موسیقی' سنگیت سمراٹ میاں تان سین کی سواری آتی ہے۔ اگر اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہیں تو سب بے سُرے اس راستے سے ہٹ جائیں (جب روشنی ہوتی ہے تو دربار موسیقی سجا ہوا نظر آتا ہے۔ موسیقاروں اور سازندوں کے جلوس کے ساتھ میاں تان سین آتے ہیں اور تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں' برابر کا تخت خالی ہے۔)

تان سین: (برابر کے تخت کو خالی دیکھتے ہوئے) آج بانسری بے آواز ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارا پیارا چھلیا نہیں آیا۔

درباری: ''جی سرکار؟ یہ چھلیا کون ہے؟''

تان سین: وہی جس کے بنا نہ باجے بانسریا رے۔

(بیجو باورے کا ترانہ سنائی دیتا ہے' آواز قریب آتی جارہی ہے۔)

تان سین: اہاہا۔ آگیا۔ آگیا۔ ہمارا پیارا متوا بیجو باورا۔ (بیجو گاتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ تان سین

اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

بیجو: سلطان الموسیقی! یہ کیا غضب؟ آپ اور مجھ ناچیز کے لیے اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ کہاں آپ اور کہاں میں؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

تان سین: یہ تمھارا انکسار ہے بیجو ورنہ ہم تو شہنشاہ اکبر کے بھرے دربار میں تم سے ہار مان چکے ہیں۔

بیجو: اوہ! وہ تو فلمی پلے بیک کا شعبدہ تھا۔ سلطان الموسیقی! ورنہ میری کیا مجال......؟

تان سین: (بات کاٹتے ہوئے) خیر جو بھی ہوا! آؤ بیٹھو! آج ہم تمھیں ایک حیرت انگیز چیز دکھاتے ہیں......ایک معجزہ......چمتکار۔ (تالی بجاتا ہے نوکر ایک عجیب ڈیزائن کا ریڈیو لاتا ہے۔)

بیجو: (حیرت سے دیکھتے ہوئے) یہ کیا گورکھ دھندا ہے، سلطان الموسیقی؟

تان سین: یہ ایک نیا آلہ ہے جو ہمارے فرنگی دوست مارکونی صاحب نے دیا ہے اور جس کی مدد سے ہم جنت میں بیٹھے بیٹھے دنیا کا سب حال سن سکتے ہیں۔ ہم آج دیکھنا چاہتے ہیں کہ مرکزِ موسیقی، سنگیت بھومی بھارت ورش میں تان سین اور بیجو کے بعد سنگیت کلا نے کتنی ترقی کی ہے۔

ریڈیو کی آوازیں: (سوئی گھمانے پر ایک کے بعد ایک مختلف اسٹیشنوں کے پروگرام گڈمڈ سنائی دیتے ہیں۔) یہ آل انڈیا ریڈیو ہے، ملے جلے گانے ......فرمائشی پروگرام......ریڈیو سیلون......ایک دو تین......بل کے پیئو اور دل ٹمن......میک لین......میک لین چکا بوم بوم......شعلہ جو بھڑ کے......بستر بچھا دیا ہے تیرے گھر کے سامنے......آ نا میری جان سنڈے کے سنڈے......وغیرہ وغیرہ۔

(تان سین، بیجو اور درباری پہلے حیرت اور پھر حقارت کے ساتھ ان آوازوں کو سنتے ہیں۔)

تان سین: بیجو! یہ سب کیا ہنگامہ ہے؟ ہم موسیقی سن رہے ہیں یا کسی چڑیا گھر میں مرغوں اور بلّیوں کی لڑائی ہو رہی ہے؟

ریڈیو (گویا تان سین کا جواب دیتا ہے) ابھی ابھی آپ فلمی گیتوں کے ریکارڈ سن رہے تھے۔ آخری ریکارڈ مفلس مودی ٹون کے پچھلے فلم "نیاراگ" کا تھا۔

تان سین: بند کر دیہ سب بکواس ......نیاراگ!......لاحول ولاقوۃ...... اگر یہ راگ تھا تو میں نے تو ساری عمر بھاڑ ہی جھونکا' کیوں بیجو؟ تمھیں اس شور وغوغا میں کوئی راگ سنائی دیتا تھا۔

بیجو: سلطان الموسیقی' راگ تھا تو کوئی ضرور...... مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایمن کلیان کی شادی زبردستی میاں کی توڑی سے کر دی گئی ہو اور اس سے کوئی نہایت بے سُری اولاد پیدا ہوئی ہو۔

تان سین: ہمیں یقین نہیں آتا کہ بھارت بھوی میں جہاں اوم کے پاکیزہ سُر سے سنگیت نے جنم لیا۔ جہاں شہنشاہوں کے درباروں میں موسیقی پروان چڑھی' وہاں راگ راگنیوں کی یہ درگت بنائی گئی ہو۔

ایک درباری: سرکار! ضرور اس میں فرنگیوں کے اس جادوئی باجے کا ہاتھ ہے۔

تان سین: (کچھ سوچ کر) تو پھر کیوں نہ ہم خود دنیا میں جا کر دیکھ آئیں کہ ہمارے بعد بھارت ورش میں سنگیت کلا پر کیا بیتی' بیجو! تم اندر پوری کی اس سنگیت سبھا کو سنبھالو میں چلا! (روشنی دھیرے دھیرے غائب ہوتی جاتی ہے۔)

بیجو: لیکن اس نئے بھارت کے لیے سنگیت کی کھوج میں آپ کہاں کہاں جائیں گے۔ (تقریباً اندھیرا ہو چکا ہے۔)

تان سین: (اندھیرے میں سے آواز آتی ہے) سنا نہیں تم نے ......مفلس مودی ٹون' جہاں نیاراگ بنتا ہے' میں بھی وہیں جاتا ہوں۔ (مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے۔)

(دوسرا منظر)

(چند لمحوں تک اسٹیج پر مکمل اندھیرا......پھر آہستہ آہستہ روشنی بڑھتی جاتی ہے۔ اب دربار موسیقی کے بجائے مفلس مودی ٹون فلم کمپنی کے پروڈیوسر کا دفتر نظر آتا ہے۔

پروڈیوسر کرسی پر بیٹھا کھیاں مار رہا ہے۔)

پروڈیوسر: (ہوا میں کھیاں مارتے اور گنتے ہوئے) چھبیس......ستائیس اٹھائیس......انتیس

(ایک چھوکرا جو دفتر میں چپراسی کا کام کرتا ہے' داخل ہوتا ہے۔)

چھوکرا: کوئی آیا ہے۔

پروڈیوسر: (خوش ہوکر) کون؟ مدھو بالا؟

(چھوکرا سر ہلا کر نہیں کرتا ہے۔)

پروڈیوسر: نرگس؟ ثریا؟ بینا رائے؟ گیتا بالی؟

(چھوکرا ہر نام پر سر ہلا کر نہیں کرتا ہے۔)

چھوکرا: نہیں صاحب، وہ تو کوئی مرد ہے۔

پروڈیوسر: لیکن وہ ہے کون اور کیا چاہتا ہے؟ شکل وصورت؟ چال ڈھال' کا سیٹوم پراپرٹی اور میک اپ سے کیا لگتا ہے؟

چھوکرا: بال بڑھے ہوئے ہیں' دو مہینے سے حجامت نہیں بنوائی' اس لیے ہوسکتا ہے ایکٹر ہو!

پروڈیوسر: (بددلی سے) وہ' ایکٹر!

چھوکرا: پان کھا کھا کر پیک تھوک رہا ہے۔ جیب میں تین پیسے والی پنسل اور سوا روپے والا فاؤنٹن پین ہے' اس لیے رائٹر بھی ہوسکتا ہے۔

پروڈیوسر: (بددلی سے) رائٹر؟ کہہ دو مجھے فرصت نہیں ہے۔

چھوکرا: لیکن صاحب سوچ لیجیے میلی دھوتی پہنے ہوئے ہے' اس لیے......! بولتے بولتے رک جاتا ہے۔

پروڈیوسر: اس لیے؟

چھوکرا: (جیسے بہت اہم راز کی بات کہہ رہا ہو) اس لیے فائینسر بھی ہوسکتا ہے

پروڈیوسر: (خوشی سے تقریباً بے ہوش ہوتے ہوتے) فائینسر؟ ارے تو کھڑے کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو' بلا......بلا جلدی سے۔

(چھوکرا جانے لگتا ہے۔)

مگر ٹھہر ٹھہر! پہلے ذرا میز تو صاف کر...... چنے بکھرے پڑے ہیں۔

چھوکرا: (میز جھاڑتے ہوئے) یہ چنے نہیں ہیں صاحب! یہ تو مکھیاں ہیں.....مکھیاں۔

پروڈیوسر: اچھا......اچھا جلدی جا' سیٹھ صاحب کو بلا۔

(چھوکرا باہر جاتا ہے۔ پروڈیوسر رجسٹر اور فائل کھول کر سامنے رکھ لیتا ہے۔ جیسے بہت مصروف ہے۔)

(فلمی دلاّل داخل ہوتا ہے۔)

دلاّل: (پروڈیوسر کو مصروف پا کر کھنکارتا ہے پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) اگر آپ کام میں مصروف ہیں تو......؟

پروڈیوسر: کون؟ اوہ! آپ؟ معاف کیجیے گا' میں پچھلی پکچر کے حساب دیکھنے میں مصروف تھا۔ آپ نے تو ضرور دیکھی ہوگی 'نیاراگ' کمبخت جہاں بھی چلی ہے' ریکارڈ توڑے ہی نہیں' چکنا چور کر دیے ہیں۔ 'جھانسی کی رانی' کو سلا دیا۔ دلّی میں 'انارکلی' کو بٹھا دیا اور کلکتے میں 'بیجو باورا' کے چھکے چھڑا دیے۔ میں تو ڈسٹری بیوٹروں کے چیک وصول کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔ ابھی بیٹھا حساب کر رہا تھا کہ کوئی سترہ لاکھ کا منافع ہونے والا ہے۔ انکم ٹیکس والے تو چمڑی ادھیڑ دیں گے...... چمڑی!

دلاّل: تو میں پھر کبھی......(اٹھ کر جانے لگتا ہے۔)

پروڈیوسر: (جلدی سے رجسٹر اور فائل نیچے رکھتے ہوئے) نہیں نہیں' بیٹھیے بیٹھیے پدھاریے تشریف رکھیے، آپ کے آنے سے تو مرجھائے ہوئے دلوں میں بہار انگڑائیاں لینے لگی ہے۔ چاند کا چہرہ چمکیلا پڑ گیا ہے اور کوؤں کی کائیں کائیں' کوئل کی سریلی پکار میں تبدیل ہوگئی ہے۔

دلاّل: (حیرت سے) جی......؟

پروڈیوسر: جی کچھ نہیں! بے خیالی میں' اپنی پکچر کا ڈائیلاگ بول گیا تھا۔ آپ کیا پئیں گے' کچھ ٹھنڈا' کچھ گرم؟ کیا پیش کروں؟ چائے؟

دلاّل: جی کوئی ضرورت نہیں، میں ابھی چائے پی کر ہی آ رہا ہوں۔

پروڈیوسر: ہاں تو فرمائیے بمبئی آنا کب ہوا؟ آپ اس دھندے میں نئے معلوم ہوتے ہیں اس لیے ذرا ہشیار رہیے گا۔ آج کل بہت سے پروڈیوسر بس اسی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کب کوئی فائنسر پھنسے اور وہ......!

دلاّل: فائنسر؟

پروڈیوسر: جی ہاں آپ جیسا کوئی سیٹھ!

دلاّل: سیٹھ میرے جیسا (ہنستا ہے) آپ تو مذاق کر رہے ہیں مَیں تو بروکر BROKER ہوں صاحب...... بروکر! یعنی دلاّل، پکچروں کا دھندا کرتا ہوں۔

پروڈیوسر: (نہایت بددلی سے) اوہ!

دلاّل: بات یہ ہے کہ دلّی، یوپی، سی پی اور بنگال کی کئی پارٹیاں بالکل میری مٹھی میں ہیں لیکن انھیں کوئی بڑی تگڑی پکچر چاہیے۔ آپ کا اگلا پروگرام کیا ہے؟

پروڈیوسر: اوہ! اگلا پروگرام؟ وہ...... بھئی ویسے تو ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگلی پکچر ٹیکنی کلر میں بنائیں گے۔ تم جانتے ہو کہ آج کل زمانہ کلر مانگتا ہے مگر وہ...... وہ...... ولایت سے ویٹنگ لیٹر! نہیں نہیں میرا مطلب ہے جنریٹر آنے میں دیر ہے۔ ٹیکنی کلر کا کیمرہ لینے کو تو میں خود ولایت گیا تھا لیکن کیا ہوا کہ...... کہ میں تو گیا سمندری جہاز سے، ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہوئے میں ذرا گھبراتا ہوں اور راجو...... یہ راج کپور ہے نا...... اپنا بچہ ہے۔ اسے میں پیار سے راجو، راجو کہتا ہوں۔ پہلے اپنے ہاں ہی کام سیکھتا تھا۔ ہاں تو اس نے جو سنا کہ میں ٹیکنی کلر کیمرہ لینے جا رہا ہوں تو وہ فاٹاً ہوائی جہاز میں پہنچ گیا اور جب تک میں وہاں پہنچوں، اس نے کیمرہ ریزرو کرا لیا۔ خیر کوئی بات نہیں اپنا ہی بچہ ہے، سو ابھی تو وہ بنا رہا ہے...... اچھا......!

دلاّل: اور آپ؟ ایلی فینٹا؟

پروڈیوسر: (ہنس کر) بڑے مذاقیہ معلوم ہوتے ہو تم؟ ہاں تو فی الحال بلیک اینڈ وہائٹ ہی پروگرام ہے۔ پکچر سمجھو کہ فلور پر جانے والی ہے۔

دلاّل: ہیروئن کون ہے؟

پروڈیوسر: کنٹریکٹ تو مدھوبالا سے پرانا کیا ہوا ہے لیکن سوچتا ہوں آج زمانہ نیو فیسیز مانگتا ہے' اس لیے ایک نئی لڑکی آئی ہے "چم چم بالا" اسے لیا ہے۔

دلاّل: اور ہیرو؟

پروڈیوسر: ہیرو کی بہت مشکل ہے۔ اسٹوری اتنی تگڑی ہے کہ راج کہتا ہے مجھے لو اور دلیپ کمار کا اصرار ہے مجھے' اپنے لیے دونوں برابر ہیں۔ سوچتا ہوں اس جھگڑے میں ہی نہ پڑوں' اس لیے......؟

دلاّل: دیوآنند کو لے رہے ہیں!

پروڈیوسر: ہاں دیو کو ہی لینے والا تھا لیکن وہ اپنی نوتن کی پکچروں میں اتنا مصروف ہو گیا ہے کہ اب تو سوچتا ہوں کہ خود ہی کیوں نہ اس میدان میں کود پڑوں۔

دلاّل: گویا کہ' ہیرو آپ......؟

پروڈیوسر: ہاں یہی سمجھو۔

دلاّل: اور ڈائریکٹر؟

پروڈیوسر: بھئی میں تو دو ہی ڈائریکٹروں کا قائل ہوں۔ شانتا رام اور محبوب! یہ دونوں کسی قیمت پر باہر پکچر بنانے کو تیار نہیں، اس لیے مَیں نے سوچا' خود ہی کیوں نہ ڈائریکٹ کرلوں۔

دلاّل: ہوں! اسٹوری کس کی ہے؟

پروڈیوسر: (ادھر ادھر دیکھ کر) وہ ریگل میں پکچر آئی تھی من کی بزنس؟ بس سمجھ جاؤ۔ ہاں لیکن بات باہر نہیں جانی چاہیے۔ اس میں چودہ گانے اور دو ڈانس ڈال دیئے ہیں۔ ایک بندر' بندریا کا ڈوئٹ رکھا ہے۔
میں تیرا باندرا تو میری باندری...... بالکل نئی چیز ہوگی۔

دلاّل: میوزک ڈائریکٹر کون ہے؟ وہ بھی آپ خود ہی ہیں کیا؟

پروڈیوسر: ارے بھئی نہیں' میں اس کا بالکل قائل نہیں کہ سارے کام خود ہی کرلوں۔ ویسے ٹیونیں وغیرہ تو میں خود ہی بنایا کرتا ہوں لیکن دوسروں کو بھی چانس دینا چاہیے۔

دلاّل: بس تو پھر نمبر ون ڈائریکٹر لے لیجیے۔ پکچر کا بزنس میں کرائے دیتا ہوں۔

پروڈیوسر: نمبر ون میوزک ڈائریکٹر تو ہوگا ہی' کہو تو نوشاد کو لے لوں؟

دلاّل: ارے واہ! پھر تو سمجھئے کل ہی پکچر سائن ہوگئی۔

پروڈیوسر: بے چارہ جب ملتا ہے یہی کہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک پکچر بنانے کی حسرت ہے۔

دلاّل: (خوش ہوکر) بس تو پھر کام ہوگیا۔

پروڈیوسر: نابابا میں نے صاف کہہ دیا کہ جب تمھیں محبوب صاحب' سنّی صاحب' صادق صاحب' ان سب سے فرصت ہو تو مجھ سے بات کرو۔ مجھے تو ایسا میوزک ڈائریکٹر چاہیے جو رات دن میرے ساتھ رہے' صرف میرا کام کرے' اسی لیے......سی رام چندر کو بھی انکار کر دیا ورنہ وہ بھی......!

دلاّل: (کھڑے ہوتے ہوئے) خیر آپ کی مرضی لیکن یاد رکھیے کہ آج کل پکچریں بکتی ہیں میوزک پر......یا تو کوئی اچھا میوزک ڈائریکٹر لے لیجیے یا کسی نئے آدمی کو لے کر دو چار پھڑکتے ہوئے گانے ریکارڈ کرا لیجیے' بزنس میں کرادوں گا۔ وہ باہر جاتا ہے۔ پروڈیوسر اکیلا رہ جاتا ہے۔

پروڈیوسر: میوزک ڈائریکٹر؟ میوزک ڈائریکٹر نوشاد؟ اوں ہوں' کئی پکچروں میں پھنسا ہوا ہے۔ سی رام چندر' برمن' انل بسواس' شنکر جے کشن......سب چھ چھ پکچریں لیے ہوئے بیٹھے ہیں۔ کوئی نیا آدمی چاہیے۔"

(چھوکرا اندر آتا ہے۔)

سمجھا بھولا، ایک نیا میوزک ڈائریکٹر چاہیے' جو اپنے گانوں سے ساری فلمی دنیا میں آگ لگادے۔

چھوکرا: (کارڈ دیتے ہوئے) تو یہ لیجیے صاحب! ایک نیا میوزک ڈائریکٹر آیا ہے۔

پروڈیوسر: (کارڈ لیتے ہوئے) تان......سین ......سنگیت کار......یہ تو کوئی بنگالی جینئس معلوم ہوتا ہے۔ بلاؤ' بلاؤ۔

(تان سین داخل ہوتے ہیں۔)

تان سین: نمستے!

پروڈیوسر: نمستے نمستے، بیٹھو بڑے وقت پر آئے ہو۔ کہو کسی پکچر میں میوزک دیا ہے؟

تان سین: میوزک؟

پروڈیوسر: ہاں ہاں میوزک، یعنی موسیقی سنگیت!

تان سین: جی ہاں! سنگیت تھوڑا بہت جانتا ہوں۔

پروڈیوسر: کہو کچھ پھڑکتی ہوئی دھنیں بنائی ہیں؟

تان سین: جی......کوئی پھڑکتی ہوئی دھن تو میں نے ہی بنائی تھی، جس سے بجھے چراغ جل اٹھتے تھے اور تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔

پروڈیوسر: ارے وہ تو تان سین فلم میں ٹرک فوٹوگرافی سے کیا گیا تھا۔ کیا کہا کیا نام ہے تمھارا......

تان سین: تان سین؟

پروڈیوسر: دیکھو مسٹر! یہ تان سین نہیں چلے گا، خواہ مخواہ لوگ مذاق اڑائیں گے اور پھر جو بھی پبلسٹی میں یہ نام دیکھے گا سمجھے گا' پکچر میں پکّے گانے ہوں گے۔ ٹی سین اچھا رہے گا۔ میں ابھی منیجر سے کہتا ہوں۔ ابھی تمھارے بارے میں خبر چھپوا دے۔ ''مفلس موودی ٹون کا نیا سنگیت کار بنگالی جینئیس' ٹی سین آنے والی فلم ''مرلی والا شیام'' کے لیے ایسی دھنیں تیار کر رہا ہے جنھیں وکٹوریا والا' تانگے والا' لنگے والا اور رکشے والا جاگتے ہوئے گنگنائے گا اور سوتے ہوئے بڑبڑائے گا۔

تان سین: (پکّے گانے کے انداز میں گاتے ہوئے) مرلی والے شیام......!

پروڈیوسر: بس ٹھیک ہے یہ ہوا تھیم سونگ۔ آج کل ہر پکچر میں تھیم ہو یا نہ تھیم سونگ ضرور ہونا چاہیے۔

تان سین: جی۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔

پروڈیوسر: تمھیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم تو بس فوراً اس تھیم سونگ کو کمپوز کر ڈالو۔ میں منشی مستانہ کو بلوا دیتا ہوں ان سے بول لکھوا لینا مگر یاد رکھو اصلی چیز ٹیون ہے۔ بول کچھ بھی ہوں اور اب میں چلا۔ مس چم چم بالا کو ریہرسل کرانا ہے۔

(روشنی دھیمی ہوتی چلی جاتی ہے)

لیکن یاد رکھنا' پرسوں اس گانے کا ٹھیک ساڑھے چھ بجے شام کو۔

(اندھیرا چھا جاتا ہے)

(تیسرا منظر)

(روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اب اسٹیج ایک ریکارڈنگ روم میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جہاں ایک گانے کو ریکارڈ کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سازندے اپنے اپنے سازوں پر سر ہلا رہے ہیں۔ تان سین سازندوں کو ہدایات دیتے جا رہے ہیں لیکن سازندے انھیں ایسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے ان کا میوزک ڈائریکٹر پاگل ہو۔ تان سین ایک پکے راگ میں گانا گاتے ہیں' جو ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ گانا ختم ہوتے ہی پروڈیوسر جراغ پا ہو کر ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے کمرے سے باہر نکل آتا ہے۔)

پروڈیوسر: اے بڑا میوزک ڈائریکٹر بن کے آیا ہے، یہ گانا ہے یا رونا؟

تان سین: اس کو راگ کہتے ہیں۔

پروڈیوسر: (بات کاٹتے ہوئے) ارے یہ مرتیو راگ ہے' ایسے دو چار گانے میری پکچر میں ہوئے تو وہ سیدھی شمشان بھومی پہنچ جائے گی۔

تان سین: دیکھیے جناب! مت بھولیے کہ آپ سنگیت سمراٹ تان سین سے بات کر رہے ہیں۔

پروڈیوسر: ''ارے جاؤ جاؤ' ایسے ایسے سمراٹ پانچ روپے روز پر ایکسٹرا میں بھرتی ہوتے ہیں۔ تم سین ہو' چکرورتی ہو' یا بھٹہ چاریہ ہو لیکن جو تم نے ابھی گایا ہے' یہ گانا نہیں ہے۔''

تان سین: ٹھہریے! میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔

پروڈیوسر: کہو!

تان سین: آپ کو چینی بھاشا آتی ہے؟

پروڈیوسر: نہیں' پھر۔

تان سین: پھر کچھ نہیں' صرف یہ کہنا ہے کہ آپ کے لیے سنگیت بھی چینی بھاشا کی طرح ہے۔ اس پر بات کرنے سے پہلے کچھ سیکھ لیجیے بس اب میں جا رہا ہوں۔

(اتنے میں ایک اور میوزک ڈائریکٹر آ جاتا ہے۔)

میوزک ڈائریکٹر: ٹھہریئے ٹھہریئے مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔
تان سین: کیوں آپ کو بھی میرا گانا بکواس معلوم ہوتا ہے؟
میوزک ڈائریکٹر: نہیں نہیں' میں تو یہاں اپنی ریکارڈنگ کا پروگرام فکس کرانے آیا تھا آپ کا گانا سن کر تو میں مست ہو گیا۔
تان سین: (حیرت سے) سچ؟ تم میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہو؟
میوزک ڈائریکٹر: نہیں نہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ جیسے اسکول کے لڑکوں کو گرامر پڑھائی جاتی ہے۔ اسی طرح فلم انڈسٹری کے سب میوزک ڈائریکٹروں کو آپ کے گانے سن کر آپ سے سیکھنا چاہیے۔
تان سین: اس یگ میں تمھارے جیسے قدر دان سے مل کر حیرت ہوتی ہے' کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ ایسے گانے ہی فلموں میں ہونے چاہئیں؟
میوزک ڈائریکٹر: اس کا جواب دینے سے پہلے' میں بھی آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے زمانے میں لوگ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور طوطے مینا کی کہانیاں پسند کرتے تھے...... یا قواعد اور گرامر کی کتابیں۔
تان سین: میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔
میوزک ڈائریکٹر: ...... مطلب یہ ہے کہ اچھا لٹریچر پیدا کرنے کے لیے گرامر جاننا ضروری ہے اور اچھے گانے بنانے کے لیے پکّے راگوں کا گیان ہونا چاہیے۔ لیکن عام لوگ نہ گرامر سمجھ سکتے ہیں' نہ پکّے راگ۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ کے پکّے راگوں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ہر ایک ان سے لطف اٹھا سکے۔
تان سین: کیا آج کل کے زمانے میں بھی یہ ممکن ہے؟
میوزک ڈائریکٹر: کیوں نہیں؟ ابھی لتا کا گانا ریکارڈ ہوا ہے' آپ نے جو راگ گایا تھا' اسے لتا کی زبانی سنیے؟

(ساؤنڈ ریکارڈسٹ لتا کا ریکارڈ چڑھاتا ہے)

تان سین: شاباش' شاباش۔ اس لڑکی نے تو کمال کر دیا۔ میں نہیں جانتا کہ عورتیں بھی اتنا

ریاض کر سکتی ہیں۔

میوزک ڈائریکٹر: لتا اس وقت ہندوستان کی بہترین گانے والی ہے لیکن اس نے بھی جو سیکھا ہے، وہ آپ جیسے سنگیت کاروں سے ہی سیکھا ہے۔

تان سین: اب میں بے فکر ہو کر جنت کو واپس جا سکتا ہوں۔

میوزک ڈائریکٹر: نہیں نہیں، ابھی آپ نے ایک گانا ریکارڈ کرایا ہے، اس لیے آپ باقاعدہ میوزک ڈائریکٹر ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو کل میوزک ڈائریکٹرس ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔

تان سین: کل تو میں نہیں ٹھہر سکتا۔ جنت کے فرشتوں سے میں صرف ایک دن کی اجازت لے کر آیا ہوں۔

میوزک ڈائریکٹر: تو جاتے ہوئے ہماری برادری کے لیے کوئی پیغام تو دیتے جایے۔ ہمیں آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے اور شاید آپ نے بھی ہم سے کچھ سیکھا ہو۔

تان سین: بے شک، بے شک! یہ میں نے آپ لوگوں سے ہی سیکھا ہے کہ سنگیت کو محلوں میں قید رکھنے کی بجائے عام لوگوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ کوئی شک نہیں اپنی فلموں کے ذریعے آپ لوگوں نے ہندوستانی جنتا کو سنگیت سے مالا مال کر دیا لیکن! اگر آپ برا نہ مانیں تو کہوں۔ خیال رکھیے کہ نقلی ہیرے اور کھوٹے سکے نہ چلنے لگیں، نئے ڈھنگ لایئے مگر اور کسی کی نہیں تو میری خاطر ذرا سُر اور تال کا خیال بھی رکھیے بس اب مجھے واپس جانا ہے۔ سنگیت زندہ باد (فوراً اندھیرا ہو جاتا ہے، روشنی ہوتی ہے تو تان سین غائب ہوتے ہیں۔

سب: ارے تان سین جی چلے گئے؟

میوزک ڈائریکٹر: نہیں نہیں! تان سین ہم سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے، وہ تو ہماری سنگیت کی اَمر آتما ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

○

# رنگین جستجو

میرے دوست رام کشن اس دیس کے اچھے خاصے ڈائریکٹروں کی گنتی میں آتے ہیں۔ اس لائن کی آب و ہوا میں انھیں کام کرتے کرتے دس سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ وہ مشاق ہیں اور سوجھ بوجھ سے کام کرنے والے۔ ان کی تصویروں میں ملک کے نامی گرامی ستاروں نے حصہ لیا ہے۔ تمام اسٹوڈیوز والے ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایسا ہونے پر بھی ان میں ایک کمزوری ہے۔ ان کی نہ اپنی رائے رائے ہے اور نہ ذاتی فیصلہ کوئی فیصلہ۔ جب تک وہ آدھے درجن دوستوں سے مشورہ نہ لیں۔ میں بھی اپنی اچھی یا بری قسمت کے ہاتھوں ان کے دوستوں کی برادری میں شامل ہوں۔ ہر تیسرے چوتھے روز ٹیلی فون کھڑکتا ہے اور اس کے سروں میں رام کشن کی سوز بھری آواز الگ پہچان لی جاتی ہے۔

ہیلو، ہیلو۔ یہ میں ہوں......رام کشن۔ میں بول رہا ہوں۔

'ٹھیک۔ ٹھیک میں سمجھا۔'

ارے بابا۔ اس دفعہ کیا ہے۔

''اگر آج شام تم خالی ہو تو بھئی ذرا تھوڑی دیر کے لیے یہاں آجاؤ۔ ایک نئی کہانی۔ تمھیں سنانی ہے۔

ہاں! اگر کوئی نئی کہانی نہیں بھی ہے تو نیا چہرا ضرور ہے یا کسی گانے والی کے گانوں کی آزمائش منظور ہے یا کسی تاریخی فلم کی ہیروئین کے کپڑوں اور لباس کی جانچ پڑتال ہے۔ یہ باتیں اور ڈائریکٹر رام کشن فیصلہ کرنے سے مجبور اور لاچار جب تک وہ نجو، خیرو، کالو، عباس، موہن، واسنت شکور سے ان کی رائیں معلوم نہ کرلیں۔

پچھلے سال کی بات ہے کہ ایک روز میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ چاہتا تھا آخری صفحہ پورا کرلوں کہ ٹیلی فون نے کہا" حضرت میری بھی تو سنئے۔"

"ہاں بھائی۔

ہیلو، ہیلو۔ میں ہوں۔ رام کشن

"اچھا۔ آپ ہیں۔ فرمایئے کیا بات ہے۔

"بھئی آج شام اگر خالی ہو تو ذرا۔

"یعنی میں آپ کے پاس......

"ہاں ہاں۔ آج شام کچھ مشورہ کرنا ہے۔

"کس بات......

"آؤ گے تب بتاؤں گا۔ ہاں کھانا میرے بھی ساتھ کھائیں کہ ٹیلی فون ایک دم بند ہو گیا۔

حسب وعدہ میں دولت سرائے رام کشن کے ہاں موجود۔ حسب توقع دیکھا کہ تین بند وقچی موجود ہیں، داؤد۔ واسنت اور شکور۔ چائے اڑ رہی ہے۔ میں نے آخر رام کشن کی اس فراخ دلی کی علّت پوچھنا چاہی تو اس پر شکور ذرا رازدارانہ لہجہ میں بولا۔"

"میاں رام کشن سے پوچھو" وہ ذرا کپڑوں سے ہو رہے ہیں۔ ابھی ایک منٹ میں آتے ہیں۔ لیکن شکور کی دھاری دار سوٹ سے میں سمجھا۔ یار معاملہ کچھ ہو یا نہ ہو۔ درمیان "عورت ضرور ہے۔ کم سے کم ایک تو بس ہے ہی۔

رام داخل ہوا ہے۔ مورت تو تھی ہی اور اس پر سلیقہ کے کپڑے رام کی خاموشی خود راز اگل رہی تھی۔

"ہائے ظالم! قیامت کا لباس پہنتا ہے مگر شکار دکار رفتہ رفتہ راستہ بھی کھلتا گیا۔ رام کو رقاصہ کی

تلاش تھی۔ نئی کہانی کی تیاری تھی۔ ویسے تو دیس میں اعلیٰ اعلیٰ ناچنے والیوں کی کمی نہ تھی مگر کوئی گھری ہوئی تھی تو کسی نے دام زیادہ مانگے تو کوئی موٹی زیادہ تھی تو دوسری دبلی اور صرف...... اس لیے دل ناداں نے کہا" چل ناچنے والی چھوکری کے کھوج کی منزل کی طرف چل۔ کم کس کوچوں کی سیر کو نکل۔

کم سے کم آپ نے فلموں میں ان شکاریوں کو تو ضرور دیکھا ہوگا۔ جو افریقہ کے گھنے جنگلوں میں درندوں کا شکار کرنے جاتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے کیسے لیس ہوتے ہیں۔

ایک رائفل کندھے پر تو دوسری پہلو میں۔ خنجر آب دار بغل میں۔ موٹا چکلا چوڑا ہیٹ سر پر اور بھاری بھرکم جوتوں میں پیر غائب۔ عین مین اسی طرح یہ فلم والے نئے چہرے کی تلاش میں نکلے۔ بیشک رائفل تو نہ تھی مگر جیب میں پارکر نمبر باون کا سنہرا قلم سامنے کی رخ پر جھکا ہوا کہ "نئی تلاش" ملے اور جھٹ قلم پیش اور عہد نامہ پر دستخط حاصل۔ رہی کارتوسوں والی بات تو سگریٹ اور ٹین اور جیبوں میں پچاسیوں نوٹوں کی گڈیاں ٹھسی ہوئی۔ اس نئے چہرے کی تلاش والے شکار اور اس افریقہ والے شکار میں بالکل بھی فرق نہیں ہے۔ یہاں دل یوں یوں ہوتا ہے اور وہاں بھی یوں یوں۔ ننھے دل کے ہلانے والی داستانیں یہاں بھی سناتے ہیں اور وہاں بھی۔

افریقہ کے جنگل میں شیر کی تلاش میں جائیں یا بمبئی کی فورس روڈ پر رقاصہ کی تلاش میں۔ ایک رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندھی نگری کا حال کسے معلوم۔

ایسا رہنما جو بھانت بھانت کے جانوروں کو جانتا ہے اور گھر، گھر کی مایا کا حال بھی جانتا ہے۔ جیسے ہی رام کشن کی موٹر فورس روڈ کی بستی میں داخل ہوئی۔ سڑک کے بازو والے نکڑ پر نظر آیا۔ اس کی موجودگی گویا پکار پکار کے کہتی تھی۔

"کیوں صاحب۔ لڑکی چاہیے۔ بالی عمریا پتلی کمریا۔ ناز والی۔ انداز والی۔ جو من کرے اور جی بھی خوش کرے اور اس پر اس نے ایک آنکھ ماری۔ رام کشن کی گھبراہٹ کا عالم نہ پوچھو۔ چاہا کہ موٹر روکے مگر وہ اس قدر بے اوسان ہوا کہ موٹر گیئر سے نکلی جاتی تھی۔ وہ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بجلی کے کھمبے کے پاس جا کر ٹھہر ہی گئی۔ رام نے بریک دبائے اور انجن کو معطل کر دیا۔

دیکھو۔ ہم کو ناچنے والی چاہیے۔ فلم میں کام کرنے کے لیے سمجھے" ہاں۔ ناک نقشے میں سندر ہو۔ اور ناچنے میں لچک دار"

"میرے ساتھ آئیں صاحب۔ میرے پاس ایک ایسی ہی لڑکی ہے جس کی آپ کو تلاش ہے۔ ارے حضور وہ سادھنا بوس اور آزوری بھلا اس کے سامنے کیا ناچیں گی۔"

لیکن اس کی صورت شکل......

شکور نے ذرا اپنے جی کو اطمینان دلانے کے لیے اس سے پوچھا۔

"ہائے صاحب۔ وہ تو پرستان کی حور ہے حور۔ اللہ میاں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ گنگا جمنی روپ ہے۔ نسیم اور وینا کے روپ کا سنگت ہے۔

ذرا تنگ اور اندھیرے زینہ سے گذر کر ہم پہلے مالا پر ایک کمرے پر آئے جو بجلی کے قمقموں سے چمک رہا تھا۔ ہمارے رہنما نے جس حور کی اتنی تعریف وتوصیف کی تھی وہ ایک کھائی کھیلی، پختہ عمر اور شباب والی رنڈی تھی۔ عمر کوئی تیس کے لگ بھگ ہوگی اس نے فلمی ناچوں کی بھونڈی بھونڈی نقلیں سیکھ رکھی تھیں۔

ہاں اس وقت اس کا نام یاد نہیں رہا۔ شاید پریم لتا تھا یا پریم بالا۔ بہرحال کچھ ایسا ویسا ہی تھا لیکن یہ داستان اس پریم لتا یا پریم بالا کی نہیں ہے اور نہ ان چھ موٹی تازی کالی کلوٹی صورت حرام لڑکیوں کی ہے، جن کے کوٹھوں پر ہم باری باری جاتے رہے اور نہ آپ کو شاید اس میں کوئی دلچسپی ہو کہ ان کوٹھوں میں سے ایک کوٹھے پر ہارمونیم بجانے والا میرے وطن میں میرے گھر کے پاس پڑوس کا رہنے والا تھا اور مجھے جوتیاں سنبھالے چپکے چپکے لوٹنا پڑا تھا اور نہ آپ کو یہ بھلا لگے گا کہ آپ حساب کتاب کی فہرست بھی دیکھ لیں کہ وہاں ان کے بدلہ میں رام کشن کو کتنا اور کیا کیا دینا پڑا۔

قصہ مختصر، جب آدھی رات گذر چکی اور تاروں نے اپنی مرگ جھالا بجھائی اور ہم کو نہ تو منزل ہی ملی، نہ اس کا نشان، یعنی کوئی لڑکی بھی اس قابل نہیں ملی کہ فلم میں کام آسکے تو آخر تنگ آمد بہ جنگ آمد۔

ہم نے اس رہنما سے کہا" حضور ہماری خطا معاف۔ ہمیں کوئی حور درکار نہیں ہے اور نہ ہمیں سلو چنا اور مدھوری کے روپ کا سنگیت چاہیے اور نہ نرگس، ثریا دلہن لیکن اس کمبخت کی کھال گویا گینڈے کی کھال تھی جس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ ہماری ایسی ذلت بھری باتوں کے باوجود وہ پُر جوش لہجہ میں کہنے لگا۔

اچھا صاحب! میرے کہنے سے میری خاطر ایک جگہ اور (اگر من پسند نہ ہو نین سکھ تھے) جی کو بھلی نہ لگے تو زن بچہ کو کولہو میں پلوا دیجئے گا۔ اپنے ہاتھوں کھال اتروا لیجیے گا۔ مگر سرکار کینیڈی برج چلنا پڑے گا۔ ایسے وقت میں واسنت کے پیٹ میں آگ لگی۔ اس کا خیال ہوا کہ تنگ وود ناکام رہے گی۔ ہاں میں بھی کچھ کچھ اس کا ہم خیال سا تھا لیکن رام کشن کا قیمتی سیٹ اسٹوڈیو میں پکار پکار کے کہہ رہا تھا۔''ہائے ناچنے والی، ہائے ناچنے والی اور سچ مچ رام کشن کی تصویر ناچ کے سین کے بغیر رکی پڑی تھی اور کافی نقصان بھی ہو چکا تھا۔ رہے شکور اور داؤد تو وہ خود چاہتے تھے کہ رات کوچۂ دلبراں کی میر ہو یا جب تک پان کی تھالی میں روپیہ نذر کرنے کیلئے رام کشن کی جیب میں زرِ نقد ہے۔

اچھا بسم اللہ۔ قسمت آزمالیں ہم۔ ایک بار اور آخر یہ بات ٹھہری، یہ دھاوا آخری ہے (سودا ورنہ واپسی) میں نے بھی سوچا۔ یاروں کی دل شکنی کیا ضرور۔ ہماری موٹر لیمنگٹن روڈ ہوتی ہوئی ٹھیک کینیڈی برج کے نیچے اندھیرے میں رکی۔

سامنے عالیشان پانچ منزلہ عمارت تھی۔ صاف شفاف اور نئی نئی۔ کان بہت سے گانوں کے ملے جلے سروں کو آسانی سے سن سکتے تھے۔ شاید ناچنے والی چھوکریوں کے پاؤں کی جھنکاریں آوازوں میں کہہ رہی تھیں۔'' کیسے جاؤ گے بچ کے۔''

بہت سے گورے اُوپر نیچے ہائے کیسی بیقراری میں اتر چڑھ رہے تھے۔ سامنے والی ریسٹورنٹ کا بوائے آدھی درجن سوڈا واٹر کی بوتلیں لیے شپا شپ چڑھتا ہوا پاس سے گذرا۔ ان روشن روشن کمروں میں سے ایک کمرے میں ایک عورت زور سے ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی ایک ایسا لا علاج قہقہہ تھا جو ایک دورہ کی سی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا لیکن ان دیوانے قہقہوں کو دبا دینے والی ایک ہائے سنائی دی۔ ایک اور عورت کی درد بھری ہائے گھائل بلّی کی آواز کی طرح فوراً ہی بجلی کی ٹرین پل کے نیچے سے قہقہوں اور درد بھری صحبتوں کو دنیا کے کانوں سے محو کرتی اور روندتی ہوئی گذرتی چلی گئی۔ گاڑی چلی گئی۔ ملی جلی گانے کی آوازیں اور چھم چھم چھما چھم کا شور بے ہنگام، فضا پر ایک دم چھا گیا۔ دور پرے کوئی اللہ کو مارا کسی کی یاد میں بے سُرا لایا جا رہا تھا۔

ہماری گلی آنا...... ساجن

ہم زینہ چڑھ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ شاید یہ سیڑھیاں زندگی کے چڑھاؤ کے ساتھ ختم ہوں گی۔

کمرے کا دروازہ خوش آمدید کہنے کو کھلا تھا۔ فرش پر چاندنی بچھی تھی جو کبھی اور کسی زمانہ میں سفید ہوتو ہو۔ موٹے موٹے گوتکیہ دیوار سے لگے تھے۔

بوڑھے پھوس نے اپنے وجود بابرکت سے ہمیں نوازا اور تشریف رکھنے کے لیے فرمایا۔ ہم نے جوتے اتارے اور وہاں ہم بیٹھ گئے۔ کمرہ خالی تھا۔ نہ آدم نہ اس کے برتنے کا سامان۔ ہاں ایک طرف ہارمونیم پڑا تھا اور دوسرے کونے میں طبلہ کی جوڑی۔ ہمارے رہنما نے ایک اطمینان بخش ہائے کی جیسے وہ اپنے دولت خانہ پر تشریف لے آئے ہیں، اور جھٹ سامنے لٹکے ہوئے میلے پردے کے اس طرف دوسرے کمرے میں گیا۔ فوراً ہی واپس آ کر نہایت اطمینان سے پان چباتے ہوئے بولا۔

حضور وہ تو باہر گئی ہیں...... ابھی آتی ہوں گی......

اتنے میں بوڑھا نوکر جس کی داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی۔ پان کی تھالی لیے ہوئے آیا۔ تھالی ہمارے سامنے رکھ کر جس صفائی سے آیا تھا اسی شتابی سے چلا گیا۔

کچھ عجیب معاملہ ہے۔ شکور نے کہا۔

میں نے بھی ہوں کی جیسے واقعی پردوں کے پیچھے کچھ گڑبڑ ہو رہی ہو یا کوئی حادثۂ عظیم۔

ارے کیا ہو رہا ہے۔ بس ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر لیتے ہو۔'' رام نے کہا۔

''اماں! ایسی ویسی باتیں تو فلم لائین میں ہوا کرتی ہیں''

لیکن (شکور نے کہا) ذرا اس بوڑھے کے انکھیوں کو تو دیکھو' شاید موتیابند کا مریض ہے۔

واسنت نے اپنی گھڑی دیکھی اور کہا۔

ارے بھائی ساڑھے بارہ کا عمل ہو گیا، ہمیں اب کھسکنے کی ٹھانی چاہیے۔

میں بھی ہاں میں ہاں ملانے والا تھا کہ پردہ کے پیچھے سے ایک آدمی نکلا۔ اور اس کے آتے ہی کمرہ کی خاموش فضا میں ایک طلاطم برپا ہو گیا۔ جیسے کوئی طوفان آیا ہو۔ اس کی صورت شکل میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ میانہ قد۔ پکا رنگ۔ چھوٹی چھوٹی تنگ آنکھیں جن پر بلی کے دیدوں کا گمان ہوتا تھا لیکن بڑی خوبی کی بات تو اس کی گفتار میں تھی۔ اس نے مشین گن کی

طرح الفاظ کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ میں بہت سے باتونی، بیچنے والوں، پھیری لگانے والوں، اشتہار بازوں اور چرب زبان شاطر عورتوں سے بھی ملا ہوں، مگر جو روانی، جو تیزی اور بلا کی تیزی اس کی زبان میں پائی وہ کہیں نہ دیکھی۔

آداب عرض نمستے۔ بندگی۔ بیٹھئے بیٹھئے۔ تشریف رکھیے، تشریف رکھیے۔ اپنا ہی گھر تصور فرمایئے میں اپنے اعلیٰ قدر مہمانوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ کیا شوق فرمائیں گے۔ وہسکی؟ برانڈی؟ جن؟ یا آپ بیئر پسند فرمائیں گے۔ اُوہ! کوئی نہیں پیتا، آپ میں سے کوئی نہیں پیتا۔ خیر۔ خیر۔ کچھ ٹھنڈا پیجئے گا۔ یا گرم چائے یا سوڈا لیمن۔ بیشک بیشک گرمی ہو رہی ہے۔ میری ناقص رائے میں ٹھنڈا لیمن بہتر رہے گا۔ ارے اوسیتا۔ اور جیسے ہی وہ بوڑھا نوکر آیا۔

''ارے پانچ گلاس لیمن۔ ہاں دیکھو۔ برف خوب پڑی ہوئی ہو۔ اور پھر ہماری طرف رخ پھیر کر وہ یوں گویا ہوا۔

تو آپ چندرا کا ڈانس دیکھنے تشریف لائے ہیں۔ ہمیں معاف کیجیے جو آپ کو اتنا انتظار کرنا پڑا۔ بڑی زحمت ہوئی۔ وہ ابھی ابھی آتی ہوگی۔ پولس کلب سے۔ پولس کمشنر صاحب نے اپنے ہاتھوں اسے ہار پہنائے۔ خدا اس کو سدا خوش رکھے وہ پورے تین گھنٹہ ناچی ہے۔ اب بھی بڑے جتن سے میں اس کو نکال کر لایا ہوں۔ ورنہ آپ خود خیال فرمائیں وہ لوگ اس کا یوں پیچھا تھوڑے ہی چھوڑتے۔ حضور، جسے دیکھو اس کے ڈانس پر فریفتہ ہے۔ جی ابھی ایک ہفتہ کی تو بات ہے۔ وہ ریڈیو کلب میں ڈانس دکھانے گئی تھی۔ وہاں کوئی قسمت کا مارا امریکن ڈائریکٹر بھی موجود تھا۔ میری چندرا کا ناچ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جھٹ پاس آ کر کہنے لگا کہ ہمارے ساتھ ایگریمنٹ کر، چل امریکہ۔ ہالی ووڈ پر۔ آپ تو جانتے ہیں جنگ کی وجہ سے جہاز کب ملتے ہیں۔ ورنہ میری چندرا ابھی کی ہالی ووڈ پہنچ گئی ہوتی۔

کیا میری باتوں سے سمع خراشی ہو رہی ہے۔ لیکن یہ بات تو دیس کے سارے اخباروں میں چھپ گئی ہے۔ کیا آپ کی نظر سے نہیں گذری۔ اس سوال کا وار مجھ پر تھا۔ شاید اس نے سمجھا میں کوئی اخبار والا ہوں مجھے بھی جھوٹ بولنا پڑا۔

''کیوں'' بیشک۔ یہ خبر تو ہر اخبار میں نکل چکی ہے۔

ٹھیک اس دم ایک توند پلے سیٹھ آدھمکے۔ شراب میں مست ہوکر آئے تھے۔ ساتھ میں تو ساتھی بھی تھے۔ سیٹھ نے فرش کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ چندرا یہاں رہتی ہے۔ ہم چندرا کا ڈانس دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ آرزو لے کر آیا ہے۔

مشین گن حرکت میں آئی۔

آیئے آیئے سیٹھ صاحب نمستے۔ بندگی۔

آپ کی تشریف آوری چندرا کے لیے باعث صد ہزار عزت ہے۔ وہ ایک منٹ میں آپ کے حضور میں حاضر ہوتی ہے...... دیکھئے وہ ابھی گورنمنٹ ہاؤس سے پلٹی ہے۔ وہاں ناچنے گئی تھی۔ آخر کس طرح ایسے سرکاری بلاؤں کو واپس کردے۔

خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ یہ انگریز آرٹ کی قدر جانتے ہیں۔ گورنر صاحب نے خود اپنے ہاتھوں اسے ہار پہنائے ہیں۔ اور اسی طرح مشین گن بغیر رکے تھمے، پہلو بدلے چلتی رہی۔ داؤد نے میرے کان میں کہا ذرا دیکھنا باہر کوئی اور تو نہیں نکلا۔ اگر کوئی اور آدھمکا تو یہ شہنشاہ تک کی خبر لائے گا۔

''آ' میری دلاری۔ آ۔ ارے تو کتنی شرم کرتی ہے۔ شرم سے باؤلی ہوئی جاتی ہے۔ آجا، میری پیاری، شرم نہ کر۔

پردہ اٹھا۔ چندرا آگئی۔ پیچھے پیچھے ایک چھریرہ بدن کا آدمی تھا۔ ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں اور لبوتری داڑھی۔

چندرا: اگر میں کہہ دوں، مصور نے ایک تصویر بنائی تھی۔ جس میں جوانی منہ بولتی کھڑی تھی (آنکھ میں میل ہیں چندرا میں اس کا گمان بھی نہ تھا) اس کا جوبن سلگا دینے والی آگ سے کم نہ تھا۔ وہ غضب تھی۔ قیامت تھی تو شاید آپ کو مایوس ہونا پڑے اسے ہم کسی صورت میں حسین اور دُلارا نہیں کہہ سکتے۔ کریم اور پاؤڈر کی دبیز دبیز لگاوٹ کے باوجود بھی اسے دلفریب حسن سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔

خدوخال معمولی کھڑی کھڑی سی ناک۔ ملائمیت اور شباب کے علاوہ اس کے چہرے پر ایک پختگی تھی اور کھڑے کے بھولپن کے بجائے اس کی بے نور آنکھوں میں مُردہ حسیات کی مدھم آگ کے کچھ نشانات باقی رہ گئے ہیں، جو اس قماش کی لڑکیوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں لیکن ہاں اس کے متعلق اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے۔ وہ خیر سے جوان تھی۔ اس کے جسم کے اُبھار اور

موڑ بتا رہے تھے، ابھی کس ہے اور رس بھی ہے، سن یہی کوئی بیس کا تھا۔ وہ اس شجر کی مثال تھی جو راس نہ آنے والی ہواؤں اور گرم گرم تھپکیوں میں وقت سے پہلے جوان کر دیا گیا ہے۔ اس کا چہرہ جوان تھا۔ رنگ پہ شباب تھا۔ وہ جوانی کی چستیوں میں رہی ہوئی سی تھی لیکن شباب اس کی مستیوں کی تازگی اور مٹھاس سے بہت دور ہو چکی تھی۔

سب کو سلام کرنے کے بعد وہ ہمارے درمیان یوں بیٹھ گئی جیسے غیروں کی محفل میں ہو اور اسے شرم آتی ہو۔ اب سیٹھ کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنی نیم وا آنکھوں سے کہنے لگا۔

''تم...... چندرا۔ نہیں۔ نہیں...... تم چندرا نہیں ہوسکتیں۔

اپنی بناوٹی شرم کو ایک طرف ہٹا وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی جس میں اور بھی بناوٹ تھی۔ اس پر مشین گن پھر حرکت میں آئی۔

سچ ہے سیٹھ صاحب لیکن میں بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ بہت سے لوگ اول اول اسے پہچان ہی نہیں سکتے۔ انھیں بڑی حیرت ہے کہ یہ سولہ سال کی اتنی چھوٹی عمر میں اس قدر شاندار ڈانسر کیسے ہوسکتی ہے؟

حضور آپ کو تو معلوم ہے کہ یہ پولس کمشنر صاحب، ارے تو بہ! میرا مطلب ہے گورنر صاحب کے سامنے تھالی کے کناروں پر ناچی۔'' سب حیران ہو کر گھورتے تھے۔ جی میں کہتے تھے۔ ارے یہ ڈانس تو اَن سُنا اور اَن دیکھا ہے۔ بھئی واہ واہ۔

تھالی کے کناروں پر ناچ۔ واہ واہ۔

شاباش۔ شاباش۔

سیٹھ نے مطمئن ہو کر کہا۔

یہ تو کچھ بھی نہیں ہے سیٹھ صاحب۔ میں اسے تلوار کی دھار پر نچواؤں گا۔ اتنا کہہ کے وہ چیخا۔

مسیتا۔ ارے او مسیتا۔ ذرا تلوار لائیو۔

جب نوکر تلوار لے کر آیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں صرف دکھ اور رنج کی آبادی نہ تھی بلکہ چہرہ پر بھیانک خوف چھایا ہوا تھا۔ جیسے کوئی ظالم قصاب چھری لیے اس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ جیسے ہی وہ چمکتی ہوئی تلوار نیام سے نکلی۔ تمام نظریں چندرا پر جم گئیں ہر شخص کی یہی آواز تھی،

کیا واقعی وہ تلوار پر ناچ سکے گی جس کی دھار جلاد کے دو دھارے سے زیادہ تیز معلوم ہو رہی تھی۔

دیکھئے میرا مطلب یہ ہے کہ ایک روز چندرا آپ کے سامنے اسی تلوار پر ضرور ناچ دکھائے گی۔ مگر (تلوار رکھتے ہوئے) آج نہیں۔ اس روز جم کر بڑا جشن منائیں گے۔ اس روز خلقت جڑے گی۔ ناچ کے ہنر مند آویں گے۔ کون جانتا ہے، پولس کمشنر میرا مطلب ہے گورنر صاب اس جشن کو عزت بخشیں (اور مسیتا سے) ارے اس کو وہیں رکھ دے۔

نہ معلوم کیوں میں نے نوکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جب بھی رنج جھلک رہا تھا لیکن ایسا ضرور معلوم ہوتا تھا کوئی پھانس نکل گئی ہے قدرے سکون آ چلا ہے یا یہ بات بس یونہی بات ہے جس کو میرے تصورات نے یک بیک جنم دے دیا ہے۔

چاروں طرف کی فرمائشوں پر چندرا ناچنے لگی۔ فوراً ہی اس کی قلعی کھل گئی کہ اسے ناچ کے فن اور علم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کے ناچ میں نہ آرٹ تھا اور نہ ہنر، نہ ہاتھوں کی جنبش میں سبھاؤ تھا اور نہ چہرہ پر بناؤ کی لہک، نہ پیروں کی آمد و شد ٹھیک۔ ہاتھوں کے پھیرے ساز کی روں روں کے سرگم سے گرے جاتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی وہ پیدائشی ڈانسر تھی اس کی کمر میں غضب کی لچک تھی اور آنکھیں نہایت ہی موثر۔ ہر قدم میں چستی تھی اور جسم کی جنبشوں میں سازوں سے ہم آہنگ ہو جانے کی زبردست کوشش۔ آواز، تعلیم اور ریاض سے بے خبر تھی، انجان تھی مگر بری نہ تھی۔ وہ مشہور فلمی گانوں کی اچھی یا بری۔ مکمل نامکمل سی نقل ضرور اتار لیتی اور اپنی سمجھ کے مطابق غیر موزوں بناؤ سے مطلب ادا کرنے کی کوشش کرتی۔

بہرحال یہی وہ لڑکی تھی جس کو رام کشن کو تلاش تھی۔

''ہاں کیا فیصلہ ہے (رام نے داؤد سے سرگوشیاں کیں)

''ٹھیک رہے گی''

''اور تم کیا کہتے ہو۔

یہ سوال مجھ سے کیا گیا۔ میں نے داؤد کی ہاں میں ہاں ملا کر، جسے میں اسے معاملات کا آزمودہ کار مانتا ہوں۔ اپنی رائے بھی اس کے حق میں دے ڈالی۔

ڈانس کے اختتام پر چندرا نے سب کو پان پیش کیا۔ اچھی خاصی رقم اس کی تھالی میں جمع

ہوگئی۔ اب وہ سیٹھ کے پاس آئی۔ اس نے چاہا کہ چندرا گلوری اس کے منہ میں رکھ دے۔ اس نے ویسا ہی کیا اور دس روپے کا نوٹ انعام ملا۔ لیکن ابھی سیٹھ کو چین نہیں آیا تھا۔ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ ویسے تو چندرا کو یہ مذاق نہ بھایا لیکن وہ مدہوش بوڑھا اپنی ترنگ میں تھا۔

تم تو ابھی جوان ہو۔ اچھا! اس لیے بوڑھے کے پاس آتے کھنچتی ہو۔ ہم ایسے عاشقوں کے پاس...... ہک لیکن ہک...... بھولومت چندرا۔ ایک دن تم پر بھی یہ سال آئے گا۔ تم بوڑھی ہو جاؤ گی۔ ایک کھوسٹ بوڑھیا۔ (اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔)

تم چندرا نہیں۔ نہیں تم۔ چندرا نہیں ہو۔

مجھے خطرہ تھا کہیں شرابی کی بڑ اور بکواس شروع ہو نہ جائے۔ یہی ایک چیز ایسی ہے جس سے مجھے سخت نفرت ہے لیکن چندرا کے جواب نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ سیٹھ بھی کچھ لا جواب سا ہو گیا۔

چندرا نے کہا۔ ''پھر اس شے سے خوف ہی کیا جو آنی جانی ہوئی۔''

میں نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں غم گینی تیرتی ہوئی دیکھی۔ اس وقت اس کی آواز میں سختی آ گئی تھی جو شاید دھوپ چھاؤں کی طرح مداری کا ایک شعبدہ تھا۔ یہ بات ابھی تک فیصلہ کن تھی کہ سیٹھ اس کی باتیں سمجھ بھی سکا ہے؟ ہم نے دیکھا کہ سیٹھ چندرا کی گول مول چکنی چپڑی ران پر اپنا ہاتھ پھیر رہا ہے۔ اسے یہ اطوار بھلے نہ لگے اور وہ وہاں سے چلی آئی۔

''اے ہے۔ شرما گئی۔ میری جان۔ وہ زور سے ہنسا۔

''جب اوکھلی میں سر دیا تو پھر دھماکوں سے کیا خطرہ۔''

پھر نہ معلوم کیوں وہ میری طرف مڑا اور مجھ سے کہنے لگا۔

'' آپ کا کیا خیال ہے مسٹر۔

میں نے جواب نہ دینا چاہا مگر وہ تو ہاتھ دھو کے پیچھے ہی پڑ گیا۔

آپ کا کیا خیال ہے مسٹر۔

مسٹر۔

اس نے مسٹر۔ مسٹر کی رٹ لگائی۔

''آپ بجا فرماتے ہیں سیٹھ صاحب''

میں نے اس کا اوٹ پٹانگ سا جواب دے مارا۔

''ہاں اگر کوئی چلتی ہوئی مشین میں اپنا ہاتھ ڈالتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ وہ بغیر کٹے نہیں رہے گا۔

''جی ہاں۔ بیشک ٹھیک ہے۔''

مجھے چندرا کی آواز پر حیرت ہوئی۔

''اور اگر یہ اپنا پیر مشین میں ڈالتا ہے تو اسے یقیناً اپنا پیر گنوا دینا چاہیے۔

یہ کہہ کے اس نے اپنی پشواز سنبھالی۔ اس انداز میں جیسے وہ کہیں کی بڑی اعلیٰ ڈانسر ہے۔ کلائیوں پر کسے ہوئے مجیرے کھولنے لگی۔

چمڑا اور ڈوریاں کچھ اس درجہ گوشت میں گھس گئی تھیں کہ انھوں نے اچھا خاصا نشان بنا دیا تھا۔ فوراً ہی اس کے دائیں بازو کی مرہم پٹی شروع ہو گئی۔

اب سیٹھ اٹھا اور مشین گن سے بات کرتا ہوا کمرہ کی طرف چلا تاکہ معاملہ طے کر لے۔ اب ہلکی ہلکی مونچھوں والے شخص کو زبان دانی دکھانے کا موقع ملا۔ رام کشن کی طرف اشارہ کر کے وہ کہنے لگا۔

چندرا! تو نے آپ کو بھی پہچانا۔

یہ ہمارے مشہور فلم ڈائریکٹر ہیں۔ مسٹر رام کشن۔

آخرکار رام کشن کا بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔ حالانکہ اس نے چلتے چلتے گائیڈ کو یہ بات بتا دی تھی کہ دیکھو بھئی یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو۔ آخر کار مجبور ہو کر رام کشن کو سب کا تعارف کرانا پڑا اور جب میری باری آئی تو اس نے ان لوگوں کی توجہ اپنی طرف سے ہٹا کر میری طرف کرنی چاہی اور بے محل بولا' اوہ! لیکن آپ نے ان کی کہانیاں اور ان کے مضمون تو ضرور پڑھے ہوں گے۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ کس نے نہیں پڑھے ہیں' ان کے قصے اور پھر کچھ عجیب خوشامدانہ لہجہ میں کہنے لگا۔

''کیا آپ میرے لیے کہانی نہیں لکھیں گے۔

ایسے موقع پر آخر اس ہلکی ہلکی مونچھوں والے سے کہاں صبر ہوتا۔ اس نے اپنا تعارف یوں کرایا۔

کیا یہ حقیر بھی اپنا تعارف کرا دے؟

''یہ سب مجھے امرت ٹھاکر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آپ ہی کی طرح میں بھی یو۔ پی کا رہنے والا ہوں اور میں بھی اب اس کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں بھی اسی پیشے میں ہوں۔

''اوہو۔ آپ بھی۔''

''رام ایسے گندے اور زہریلے ٹھکانوں میں پیشہ ور ہم جنسوں کو پا کر کچھ خوش سا ہوا۔

''جی ہاں میں بھی ڈائریکٹر ہوں۔

میں اپنی پہلی کہانی کا سینریو SCENARIO لکھ رہا ہوں۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو میں چاہوں گا کہ آپ اسے سن لیں اور اپنی قیمتی رائے سے مجھے مشکور کریں۔''

آپ کون سے اسٹوڈیو کا کام کرتے ہیں۔

اصل میں بات یہ ہے کہ میں نے بہت سی کمپنیوں میں کام کیا ہے۔ بمبئی ٹاکیز، پربھات، نیو تھیٹر۔ پرکاش۔ اس کے بعد میں موہن چلا گیا۔ اب میں یہ کہانی ایک نئی کمپنی کے لیے ڈائرکٹ کروں گا جس نے فی الحال فلم کے لائسنس کے لیے عرضی دے رکھی ہے۔

''آپ کیا کاسٹ کر رہے ہیں۔ دیکھئے ہم غریبوں کو کہیں نہ بھول جائیے گا۔''

بھلا موقع آنے پر داؤد کب ٹھاکر صاحب کی ٹانگ گھسیٹنے سے باز رہ جاتا۔

مس چندرا یقیناً اس کی ہیروئین ہیں۔ مردانے رول کے لیے میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ پرتھوی راج کو لوں یا موتی لال کو یا کسی نئے کو۔

ارے حضور آپ ہی کیوں نہ ہیرو کا حق ادا کریں۔ آپ تو بالکل ہیرو معلوم ہوں گے۔

شکور کم بولتا ہے مگر جب کبھی چہکتا ہے غضب کی چونچیں مارتا ہے۔

ٹھاکر شاید کچھ اوندھا سیدھا جواب دیتے مگر اتنے میں سیٹھ صاحب باہر آئے۔ ان کے ساتھ مشین گن بھی تھی۔

''چندرا بیٹی۔ سیٹھ صاحب کو نمسکار کرو۔ یہ اب جاتے ہیں۔

(ساقی: ادب اپریل، 1947)

○

# سہاگ رات

آج ان کی سہاگ رات تھی۔

ٹوٹو ٹیکا چند اور لکشمی لال چند۔

ٹوٹو ٹیکا چند، جو بیالیس سال کا تھا، جس کا سر گنجا تھا، جس پر وہ گنجے فلم اسٹاروں کی طرح وگ پہنتا تھا، جو کرکٹ کلب میں رمی کھیلتا تھا، جو مہالکشمی ریس کورس پر گھوڑے کھیلتا تھا، جو غیر ملکی موٹریں سستے قیمتوں دہلی کے سفارت خانوں سے خریدا کرتا تھا اور اس دھندے میں اس نے لاکھوں روپے کمائے تھے، اور دو بڑی بڑی موٹریں آج اس کے پاس تھیں، لیکن جب سے گورنمنٹ نے یہ سارا دھندا اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کے لیے محفوظ کر لیا تھا، اس نے بمبئی ہی میں سیکنڈ ہینڈ کاروں کا دھندا شروع کر دیا تھا۔ اس کی پہلی شادی بیس سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ ایک سیدھی سادھی تقریباً جاہل لڑکی سے، مگر بھگوان کی مہربانی سے وہ چند برس بعد ہی کوئی اولاد پیدا کیے بغیر ہی چل بسی تھی اور اس وقت سے سیکنڈ ہینڈ کاروں کے ساتھ اس نے سیکنڈ ہینڈ بیویوں کا بھی دھندا شروع کر دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک کتنی ہی جوان اور ادھیڑ بیواؤں سے اور طلاق شدہ عورتوں سے اس نے دوستی کی تھی، کئی سے جتنا پیار کر سکتا تھا، اتنا پیار بھی کیا تھا، لیکن اس کے پاسپورٹ میں اور ٹرف کلب HORSE-RACING میں ممبرشپ کارڈ میں 'مسز' کا خانہ خالی ہی رہا تھا۔

لکشمی لال چند اکتالیس سال کی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی تین بیٹیوں اور دو بیٹوں میں سب سے بڑی تھی۔ وہ ڈاکٹری پڑھ رہی تھی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اتنے بڑے خاندان کو سنبھالنے کی ذمہ داری اس کے سر آ پڑی۔ میڈیکل کالج سے نام کٹوانا پڑا۔ انشورنس سے جو روپیہ ملا، اس کو لکشمی نے بڑی حفاظت سے اپنے باپ کے ایک دوست کے بزنس میں لگا دیا، جس سے تقریباً دو تین ہزار روپے سال کا منافع مل جاتا تھا۔ تین کمروں کا فلیٹ پرانے کرائے پر، ڈیڑھ سو روپے مہینہ پر تھا۔ اس میں سے ایک کمرا سبلیٹ SUB-LET کر دیتی تھی۔ کبھی کوئی طالب علم لے لیتا، کبھی کوئی دن بیاہا سرکاری ملازم۔ مگر سب سے پہلے ایک پرائیویٹ نرس اس میں آ کر رہی تھی، جس سے لکشمی کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں سے زیادہ آمدنی تو پرائیویٹ نرسوں کی ہوتی ہے، چالیس روپے روز کے ملتے ہیں اور ڈاکٹروں سے، اسپتالوں کے منیجروں سے اور کھاتے پیتے (اور بیمار ہوتے ہوئے) حلقے میں جان پہچان اور دوستی ہو جائے، تو مہینے میں بیس پچیس دن (یا رات) تو کام مل ہی سکتا تھا۔ سو لکشمی بھی پرائیویٹ نرس بن گئی۔ وہ اپنا کام محنت سے ہی نہیں، بڑے لگاؤ سے کرتی۔ اس کے بیمار کہتے تھے کہ آدھی بیماری تو لکشمی کی مسکراہٹ دیکھ کر ہی غائب ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کی مانگ بہت تھی۔ آمدنی بھی اچھی خاصی ہونے لگی تھی، جس سے لکشمی نے اپنے دونوں بھائیوں اور بہنوں کو پڑھایا لکھایا، ان کی شادیاں کیں، بڑھاپے میں اپنی ماں کی خدمت کی۔ اپنی شادی کرنے کا اس کو خیال ہی نہیں آیا اور جب آیا، تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب تو اس کی بہنوں بھاوجوں کے دو دو تین تین بچے ہو چکے تھے۔ اس عمر میں شادی رچانا اسے نہ اچھا لگتا تھا، نہ ضروری۔ ویسے اس کے مرد دوست کافی تھے۔ ہفتے میں ایک دو بار وہ کسی کے ساتھ کھانا کھاتی، ایک آدھ پیگ وہسکی کا یا ایک دو گلاس بیئر کے لے لیتی، کسی کلب یا ریستوراں میں ڈانس کر لیتی اور مہینے میں ایک آدھ بار کسی دوست کے ساتھ سو جاتی۔ اس کی زندگی کی کمی کچھ دیر کے لیے پوری ہو جاتی اور اگلے دن وہ اپنے کام پر مسکراتی ہوئی پہنچ جاتی۔

لکشمی کے ایسے ہی عارضی دوستوں میں ایک ٹوٹو ٹیکم چند بھی تھا، جس کے ساتھ لکشمی کئی بار اس کی موٹر میں سوار ہو کر نائٹ ڈیوٹی کے بہانے برسووا کے ساحل کی گرم ریت پر رات گذار آئی

تھی۔ اور ان کی دوستی اسی طرح عارضی فلرٹیشن کی سطح پر چلتی رہتی، اگر ٹوٹو کو ایک ہلکا سا ہارٹ اٹیک نہ پڑ جاتا اور اس کو بریچ کینڈی اسپتال میں داخل نہ ہونا پڑتا۔ نرس کی حیثیت سے، دوست کی حیثیت سے لکشمی نے رات دن بغیر کوئی فیس لیے اپنے اس بیمار کی نہ صرف تیمارداری کی، بلکہ ایسی دیکھ بھال کی، جیسی کوئی ماں اپنے بچے کی کرتی ہے۔ اور اب ٹوٹو کو معلوم کہ زندگی ہمیشہ سکینڈ ہینڈ کاروں اور اور کرائے کی سکینڈ ہینڈ عورتوں کے سہارے نہیں گذاری جا سکتی۔ ایک وقت آتا ہے، جب انسان کے اکیلے پن کو دوستیوں اور ملاقاتوں اور عارضی معشوقوں سے نہیں بھرا جا سکتا۔ برسوں ٹوٹو نے یہ کہہ کر شادی کو ٹال دیا تھا کہ بازار میں دودھ ملتا ہو، تو گائے کیوں پالی جائے، لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ گائے کا پیار، گائے کی ممتا، گائے کی سنگت اور چیز ہے اور گائے کے ملک پاؤڈر کا ڈبہ اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اس کو بھرنے کے لیے زندگی کے فارم پر 'مسز' کا خانہ بھرنا پڑتا ہے، اس کے لیے ایک بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سو بیالیس برس کے کنوارے نے اکتالیس برس کی کنواری سے اسپتال کے پلنگ پر پڑے پڑے پرپوز کر دیا تھا۔ اکتالیس برس کی کنواری اس سوال سے، اس تجویز سے، بوکھلا سی گئی تھی، شرما سی گئی تھی اور اس نے ایک لمحہ کے لیے اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ کیا میں اپنی آزادی کو قربان کر دوں؟ اس نے اپنے من سے پوچھا تھا، اور وہ 'نہیں' کہنے کے لیے سر اٹھا ہی رہی تھی کہ سامنے واش بیسن کے اوپر لگے ہوئے آئینے میں اس کو اپنا چہرہ نظر آ گیا تھا، جس پر اکتالیس برس کی محنت کی زندگی نے اپنے نقش ونگار بنا دیے تھے، اس کے سر پر بندھے ہوئے رومال کے نیچے سے اس کے کھچڑی جیسے بال دکھائی دے رہے تھے اور اس کو ایک دم خیال آیا کہ سیاہ بال کم ہوتے جائیں گے اور سفید بالوں کی تعداد زیادہ ہوتی جائے گی اور کوئی خضاب اور کوئی ہیئر ڈائی یا ہیئر ڈو اس کے تھکے ہوئے، بوڑھے ہوتے ہوئے دل کو جوان نہ بنا سکے گا۔ اچانک اسے خیال آیا، یہ سوال، یہ تجویز، پھر کوئی نہ کرے گا، یہ اب یا کبھی نہیں۔ اور اس نے 'ہاں' کہہ دی۔

آج ہی ان کی شادی ہوئی تھی۔ ٹوٹو کے ماں باپ تو مر چکے تھے، مگر لکشمی نے اپنی بوڑھی ماں کے خیال سے سات پھیرے لینا منظور کر لیا تھا، ورنہ اس عمر میں دلہن بننا اسے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ شادی ہو گئی تھی، شام کو ایک شاندار ہوٹل میں ریسیپشن بھی ہو گیا تھا، جس میں ٹوٹو کے

سب دوست یار، اس کی سکینڈ ہینڈ موٹروں کے خریدار، اس کی سکینڈ ہینڈ عورتیں اور ان کے سکینڈ ہینڈ شوہر، لکشمی کے مریض، اس کے ڈاکٹر، اس کے دوست اور وہ بھی جو 'دوست' سے زیادہ رہ چکے تھے، اس کی سہیلیاں، جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی تھیں اور ان کے پہلے یا دوسرے شوہر غرض کافی ہنگامہ تھا۔ وہسکی کے بعد شامپین کا دور چلا، اور اب جب کہ وہ بارہ بجے رات کو ٹوٹو کے ایئر کنڈیشنڈ فلیٹ میں آخرکار اکیلے ہوئے تھے، تو ان دونوں کے سر میں دھیما دھیما درد ہو رہا تھا، آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ شاید ہینگ اُوور تھا، مگر ساتھ میں کسی قدر مایوسی کا بھی احساس تھا، جیسے مٹھائی اندر سے کڑوی نہیں تو پھیکی ضرور نکلی ہو۔

آج ان کی بھی سہاگ رات تھی۔

سکھارام، جو مہاراشٹر کے ایک گاؤں سے آیا تھا۔

گوری، جو راجستھان کے ایک گاؤں سے آئی تھی۔

سکھارام کے گاؤں میں، سارے ضلع میں، سارے علاقے میں قحط سالی پڑ رہی تھی۔ ہزاروں کسان اپنے گاؤں، اپنے کھیت، اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

گوری کا گاؤں جیسلمیر کے پاس تھا، جہاں چاروں طرف ریت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ وہاں تو بارہ مہینے سوکھا پڑتا تھا۔ سات سات برس تک بارش کی ایک بوند نہ پڑتی تھی۔ گوری نے اپنی اٹھارہ برس کی عمر میں صرف دو بار بارش کے چند چھینٹے پڑتے دیکھے تھے۔ مگر ان بوندوں سے بھی ریت کے سمندر میں ہریالی کے ٹاپو ابھر آئے تھے۔ ان کی ہری ہری تراوٹ آج بھی گوری کی سوکھی زندگی میں یاد بن کر جب ابھرتی تھی، تو اس کا من کھل اٹھتا تھا۔

سکھارام کے خاندان نے جب اپنا گاؤں چھوڑا، تو ان کو دو دن روٹی کھائے ہو گئے تھے۔ خالی پیٹ ان کو بیس میل چلنا تھا، جب وہ اس سرکاری کیمپ میں پہنچ سکیں گے، جہاں سڑک بنانے کے لیے پتھر توڑنے کا کام ہو رہا تھا۔ بیمار، بھوکی ماں نے تو راستے میں ہی دم توڑ دیا، رہ گیا ایک بوڑھا باپ اور سکھارام۔ دونوں نے پتھر توڑنے کی نوکری کر لی۔

دن بھر دھوپ میں محنت کرتے۔ پینے کو پانی تک نہ ملتا۔ شام کو مزدوری ملتی، تو راشن لا کر باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں پکا کر کھا لیتے اور ایک ایک روٹی صبح کھانے کے لیے رکھ لیتے۔ دن

بھر افسروں، ٹھیکیداروں، مقدموں کی ڈانٹ ڈپٹ، جھڑکیاں، گالیاں سنتے۔ باپ کو تو برسوں پرانی عادت تھی۔ وہ کہتا تھا۔ برا ماننے سے کیا فائدہ؟ یہ سب تو ہماری قسمت میں ہی لکھا ہے۔ مگر سُکھارام نے گاؤں کے اسکول میں چار جماعتیں پاس کی ہوئی تھی۔ اس نے اسکول کے ماسٹر جی سے اور بی ڈی او صاحب سے 'سماج واد'، 'غریبی ہٹاؤ' اور 'لوک راج' کے لفظ سنے ہوئے تھے۔ دھندلا دھندلا سا کچھ تھوڑا بہت پتہ ہو گیا تھا کہ ان لفظوں کا مطلب کیا ہے۔ اس کا دل واقعی یہ بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ رات دن ٹرک آتے جاتے تھے، جن میں سے کئی سیدھے بمبئی جاتے تھے۔ بمبئی شہر، جو سکھارام نے خواب میں دیکھا تھا، جس کی سنہری جھلک وہ کئی بار سنیما کے پردے پر دیکھ چکا تھا۔ ایک رات کو چپکے سے وہ ایک خالی ٹرک میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ راستے میں سویرے ٹرک ایک پٹرول پمپ پر رکا، تو سردار جی ڈرائیور نے اسے پکڑ لیا اور پنجابی میں گالی دے کر ٹرک سے اتر جانے کو کہا۔ سُکھارام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور سردار جی کا دل پسیج گیا۔ انھوں نے راستے کے ڈھابے میں دو روٹیاں بھی کھلائیں اور بمبئی لا کر چھوڑ دیا۔

گوری پندرہ برس کی ہوئی، تو اس کی ماں کو فکر ہوئی کہ لڑکی کا بیاہ کر دیا جائے۔ مگر قحط کی وجہ سے گاؤں میں نہ صرف گیہوں کا، بلکہ لڑکوں کا بھی اکال تھا۔ جیسے ہی لڑکا سولہ سترہ برس کا ہوتا تھا، وہ منہ اٹھا کر جیسلمیر، جے پور، دہلی، کلکتہ یا بمبئی کا رخ کرتا تھا۔ گاؤں میں ٹھہر کر کرتا بھی کیا؟ نہ کھیتی ہی ہو سکتی تھی، نہ آس پاس کوئی کارخانہ یا مل، جہاں کام مل جاتا۔ سو دو برس تک گوری کے ماں باپ لڑکے کو ڈھونڈتے رہے، جس کے ہاتھ میں گوری کا ہاتھ پکڑا کر وہ اپنا سماجی فرض پورا کریں اور بیکنٹھ جانے کی تیاری شروع کریں۔ پھر ایک دن پاس کے گاؤں کا ایک چھوکرا، جو چھوکرا تو نہیں تھا، بتیس تینتیس برس کی پکی عمر کا آدمی تھا، گھومتا پھرتا آ نکلا۔ اس کی نظر گوری پر پڑی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ صورت شکل سے بھلا آدمی لگتا تھا۔ کپڑے بھی شہر کے فیشن کے پہنے تھا۔ تنگ موہری کی پتلون اور پھولوں والی شرٹ۔ گوری کے باپ نے اس سے بات کی، تو اس نے بتایا کہ اسے بابو کہتے ہیں۔ بمبئی میں، ایک مل میں کام کرتا ہے۔ تین سو روپے مہینہ کماتا ہے۔ گوری کے ماں باپ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ گھما پھرا کر اس سے شادی کی بات چیت کی، تو اس نے کہا سوچ تو میں بھی رہا ہوں کہ ڈھنگ کی لڑکی مل جائے، تو اس بار شادی کر کے اسے بمبئی لے جاؤں۔

گوری کو وہ آدمی پہلے کوئی خاص پسند نہ آیا، پر یہ سن کر اس کے من میں بھی بمبئی کے لڈو پھوٹنے لگے۔ اور جب اس کے باپ نے کہا لڑکی تو ہمارے یہاں بھی بیاہ کے قابل ہے، مگر تمھیں پسند ہو تو...... گوری کے سارے تن بدن میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ اور پھر وہ کتنا اچھا نکلا کہ جہیز میں دو سو روپے سے زیادہ رقم بھی نہیں مانگی۔

وہ کہنے لگا بس، اتنا ہی کہ ہم بمبئی پہنچ جائیں۔ پھر تو میں انتظام کر لوں گا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن بعد دولہا دو چار دوستوں کو لے کر آیا اور گوری کو بیاہ کے لے گیا۔

ایک رات بابو نے گاؤں میں گذاری۔ مگر گوری کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ کہنے لگا جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ ابھی تو تمھیں ساری زندگی گزارنی ہے اور گوری کے من میں ہلکا سا شک گذرا کہ اس نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ابھی تو ہم دونوں کو ساری زندگی ساتھ گزارنی ہے۔ اور پھر بابو دوسری طرف منہ کر کے سو گیا۔

اگلے دن وہ گوری کو ریل میں بٹھا کر بمبئی لے آیا اور آتے ہی چھ سو روپے میں اسے ایک عورت کے ہاتھ بیچ دیا۔ وہ گوری کو دیکھ کر صرف پانچ سو روپے دینے کو کہتی تھی، مگر بابو نے کہا سو روپے زیادہ ملنے چاہیے۔ اس لیے کہ میری بیاہتا ہوتے ہوئے بھی میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ تم تو کافی رقم وصول کر لو گی۔

پہلے تو گوری روئی، چیخی، چلائی، بابو کو گالیاں دیں، کوسا، پھر اس عورت نے اسے کمرے میں بند کر دیا۔ پیاسا رکھا، لیکن گوری تو بھوک اور پیاس، دونوں کی عادی تھی...... اس عورت نے اسے ہنٹروں سے مار مار کر آدھ مرا کر دیا۔ جب گوری نے ہاں میں سر ہلایا، تب جا کر اسے کھانے کو ملا۔ ہنٹروں کی مار پر عورت نے مرہم لگایا۔ گوری کو نہلایا دھلایا۔ دھلی ہوئی ساڑی پہننے کو دی اور گہرے کٹاؤ کا بلاؤز دیا، جس میں سے اس کا راجستھانی سینہ آپ باہر نکلا پڑتا تھا۔ پھر باہر کے کمرے میں ایک سیٹھ سے بھاؤ تاؤ کیا۔ دو سو روپے پیشگی وصول کیے۔ پھر دروازہ کھول کر گوری کو دکھلایا۔ گوری نے شرم کے مارے سر جھکا رکھا تھا۔ عورت کہنے لگی شرم مت کر، بیٹی۔ یہ تیری سہاگ رات ہے۔ سیٹھ جی کو اپنا مکھڑا دکھلا۔

اس دن عورت نے سہاگ رات لفظ استعمال نہ کیا ہوتا، تو آج گوری کب کی پیشہ کرتے کرتے پرانی بھی ہوگئی ہوتی۔ لیکن اس کے من کے اندر سہاگ رات کا ایسا انوکھا، اچھوتا، پاک اور خوبصورت تصور تھا کہ اس بوڑھے سیٹھ کے ساتھ سہاگ رات گذارنے کے خیال سے ہی اس کو اُبکائی آ گئی۔ سیٹھ نے کہا موٹر میں گھومنے چلوگی؟ جوہو میں میرا بنگلہ ہے۔ وہیں رات گذاریں گے۔ صبح ہوتے ہی تمھیں ڈرائیور چھوڑ جائے گا۔

گوری کو دوسرا چارہ بھی کیا تھا؟ شرماتی، لجاتی، گھونگھٹ لٹکاتی، سیٹھ جی کے ساتھ جا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ روشنیوں سے سجے ہوئے شہر کے بیچوں بیچ سے موٹر دوڑنے لگی اور سیٹھ جی اس کی طرف سرکنے لگے۔ کھسکتے کھسکتے وہ اس کے بالکل پاس آ گئے۔ اب گوری ان کی گرم گرم سانس کو اپنے گال پر محسوس کر سکتی تھی۔ پھر وہ سانس اور قریب آ گئی۔ اس کے ہونٹوں تک آ پہنچی۔ گرم سانس کے ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے پائریا کی بدبو کا بھبھکا آیا، تو گوری کو بڑے زور کی اُبکائی آئی۔

سیٹھ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ بولا تجھے اُلٹی آ رہی ہیں کیا؟ گوری نے سر ہلا کر ہاں کی، تو سیٹھ نے ڈرائیور کو موٹر روکنے کو کہا۔ سڑک پر روشنی کم اور اندھیرا زیادہ تھا۔ گوری نے موٹر سے سر نکال کر اُلٹی کرنے کی کوشش کی، تو سیٹھ نے اسے ڈانٹا، موٹر کو گندا کرے گی؟ چل، باہر نکل، سڑک کے کنارے بیٹھ کر اُلٹی کر!

گوری موٹر سے باہر نکلی اور سڑک کے کنارے پیڑوں کے اندھیرے کو غنیمت جان کر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اس دن سے آج تک وہ بھاگتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن سکھارام نے، جس کا بدن گٹھا ہوا تھا، جو جوان تھا، جس کی رنگت دھوپ میں کام کرنے سے تانبے کی طرح ہوگئی تھی، مگر جب وہ مسکراتا تھا، تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکتے تھے، اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا 'اے گوری، مجھ سے شادی کروگی؟'

وہ دونوں فٹ پاتھ پر نہیں رہتے تھے، مگر آج اپنی سہاگ رات فٹ پاتھ پر بسر کرنے پر مجبور تھے۔ سکھارام پانچ اور آدمیوں کے ساتھ کھولی میں رہتا تھا۔ جب بہت گرمی لگتی، تو سکھارام اور دو ایک اور آدمی باہر فٹ پاتھ پر سو جاتے، مگر ان کے ساتھیوں میں کئی ایسے تھے، جو فٹ پاتھ پر سونے کی ذلت کے مقابلے میں گرمی کے باوجود بند کھولی میں سونا بہتر سمجھتے تھے۔

رہی گوری، سو شروع شروع میں کسی اندھیری فٹ پاتھ پر کسی بُڈھیا بھکارن کے پاس سو جاتی تھی۔ دن بھر گھروں میں جا کر مصالحہ پیستی، برتن مانجھتی، کپڑے دھوتی۔ پھر ایک عورت کو جب معلوم ہوا کہ وہ فٹ پاتھ پر سوتی ہے، تو اس نے رحم کھا کر اپنے گھر کے برآمدے میں گوری کو سونے کی اجازت دے دی۔ وہاں ہی وہ ایک چٹائی بچھا کر سو جاتی تھی۔

گوری جب سکھارام سے ملی، تو اس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ نوجوان بھروسے کے قابل ہے اور ایسے آدمی کے ساتھ مل کر گرہستی بسائی جا سکتی ہے۔ جب سکھارام نے اس سے پوچھا کیوں، تیری شادی تو نہیں ہوئی؟ تو گوری نے کچھ سوچ کر کہہ دیا نہیں تو۔ کیونکہ اس بھیانک ناٹک کو، جو بابو نے اس کے ساتھ کیا تھا، وہ اب شادی ہی نہیں سمجھتی تھی۔

پھر سکھارام نے پوچھا کیوں ری، سچ سچ بول، کسی نے تیرے بدن کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟ تو وہ چمک کر بولی نہیں رے۔ تو مجھے کیا سمجھتا ہے؟ کیا میں ایسی ویسی ہوں؟

جب سکھارام نے آگے سوال کیا مجھ سے شادی کرو گی؟ تو اس نے شرما کر گردن جھکا لی اور دھیرے سے کہہ دیا ہاں!

سکھارام کو جب مل سے چھٹی ملتی اور گوری کو اپنے کام سے فرصت ملتی، تو کئی دنوں تک وہ دونوں چالوں اور جھونپڑ پٹیوں کے چکر لگاتے کہ شاید کہیں کوئی خالی یا کوئی جھونپڑی رہنے کو مل جائے۔ گوری نے تنخواہ میں سے کوئی سو روپے بچا کر رکھ چھوڑے تھے اور سکھارام کے پاس تو ڈھائی سو روپے سے بھی زیادہ رقم تھی، لیکن کوئی کھولی دو ڈھائی ہزار سے کم پگڑی میں نہیں مل سکتی تھی۔ ایک جھونپڑی کے لیے بھی لوگ کم سے کم ہزار روپے مانگتے تھے۔ چلتے چلتے ان کے پاؤں دکھ گئے۔ ایک سڑک سے گزر رہے تھے کہ دیکھا، لوہے کے موٹے موٹے پائپ پڑے ہیں، جن میں چھوٹے قد کا آدمی تو کھڑا بھی ہو سکتا ہے۔ گوری یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ان میں بھی لوگ آباد ہیں۔ دونوں سروں پر میلے گندے چیتھڑوں کے اور ٹاٹ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر پردے لٹکا رکھے ہیں اور ان لوہے کے بڑے بڑے پائپوں میں لوگ رہتے ہیں۔ عورتیں کھانا پکا رہی ہیں، بچے کھیل رہے ہیں۔ پورا گھر بسا ہوا ہے۔

ہم بھی ایسا ایک نلکا کیوں نہ ڈھونڈ لیں؟ گوری نے کہا۔
سکھارام نے کہا، کیا ہم گٹر کے نلکے میں رہیں گے؟
گوری بولی اب بھی تو گٹر ہی میں رہتے ہیں۔
سکھارام نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر کہا مگر ان گٹر کے نلکوں میں سے خالی تو ایک بھی نہیں۔
اتنے میں ایک آدمی ان کی طرف گھورتا ہوا ان کے پاس آیا۔ کیوں، رہنے کو جگہ چاہیے؟
گوری نے گھونگھٹ کرلیا۔ سکھارام نے کہا ہاں، بھائی، چاہیے تو۔
سو روپے ہیں تمھارے پاس؟
ہاں۔ سو روپے تو ہو جائیں گے۔

تو بس، یہاں آجاؤ۔ میں اتنے بڑے پائپ میں اکیلا رہتا ہوں، اس کے بیچ میں پردا لٹکا لیں گے۔ ایک طرف تم رہنا، دوسری طرف میں۔ جب تک پائپ گٹر میں نہ اتارے جائیں، تم یہاں سو سکتے ہو۔

سکھارام نے اس آدمی کا شکریہ ادا کیا اور کہا، تو ہم آج رات ہی کو آجائیں؟
ہاں ہاں، ضرور، مگر پچاس روپے پیشگی دے جاؤ۔ پائپ تمھارے لیے ریزرو رہے گا۔ بالکل جیسے ٹکٹ خرید کر سنیما میں کرسی ریزرو رہتی ہے۔
سکھارام نے پچاس روپے اس آدمی کو دے دیے۔
اسی شام کو مندر میں ان کا بیاہ ہو گیا۔ وہ میاں بیوی بن گئے۔
پھر اپنا سامان ساتھ لے کر وہ اس نلکی کی بستی میں پہنچے۔
آدمی ان کا انتظار کر رہا تھا۔

لو جی، میں نے تمھارے لیے سب انتظام کر رکھا ہے۔ ادھر تمھارا دروازہ ہے، ادھر میرا۔ گوری جلدی سے پائپ کی دوسری طرف چلی گئی۔ آج اس کی سہاگ رات اس نلکے میں بسر ہوگی۔ مگر پھر بھی سہاگ رات تو ہوگی۔ گوری نے اپنے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ مگر ابھی اس نے پائپ کے منہ سے پردا اٹھایا ہی تھا اور اپنا سامان اندر رکھنے ہی والی تھی کہ سکھارام بھاگا ہوا آیا اور بولا چلو، ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا۔

راستے میں گوری نے پوچھا مگر وہ پچاس روپے، جو ہم نے اس آدمی کو دیے تھے، ان کا کیا ہوگا؟

بھاڑ میں گئے وہ روپے! سکھارام نے چلتے چلتے اتنے زور سے کہا کہ گوری ڈر کے مارے چپ ہوگئی۔ پھر سکھارام خود ہی بولا، جانتی ہے، کیا کہتا تھا وہ مجھ سے؟

بڑی بے شرمی کی بات تھی رے؟

گوری پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کیا بات تھی، مگر وہ کچھ نہ بولی۔

پھر سکھارام خود ہی بولا، کہہ رہا تھا کہ میں نے تمھیں اپنے پاپ میں ساجھی بنایا ہے۔ اب تم مجھے اپنی بیوی میں بھی برابر کا حصہ دار سمجھو!

ہائے رام! گوری کے منہ سے نکلا اور اس نے بے اختیار گھونگھٹ نیچے کرلیا۔

چل ری! آج کی رات کہیں فٹ پاتھ پر ہی گذارنی پڑے گی۔

ٹوٹو کے بیڈ روم میں بہت بڑا پلنگ تھا۔ پاس ہی ایک بڑا اونچا کشمیر کا بنا ہوا لیمپ اسٹینڈ تھا، جس پر لال لیمپ شیڈ لگا ہوا تھا۔ لال رنگ کا ہی پلنگ پوش تھا۔ قالین کا رنگ بھی لال تھا دیواروں پر گلابی پینٹ کیا ہوا تھا۔ ہر چیز سہاگ رات کے لیے تیار تھی۔ سوائے دلہا دلہن کے۔

لکشمی باتھ روم سے شیفون کی گلابی نائٹ گاؤن پہن کر نکلی، تو دیکھا کہ ٹوٹو کا گنجا سر گلابی روشنی میں چمک رہا ہے اور وہ اپنی وگ کو ایک کاٹھ کے بنے ہوئے سَر پر رکھ رہا ہے۔ لکشمی کو وگ کے بارے میں معلوم تھا۔ مگر آج کی رات اسے دھیمی دھیمی گلابی روشنی میں نہ جانے کیوں ایک دم ایسا لگا، جیسے ٹوٹو اپنا کٹا ہوا سر ڈریسنگ ٹیبل پر سجا رہا ہے اور کسی اور کا مانگا ہوا گنجا سر اس نے اپنی گردن پر رکھ لیا ہے۔

ڈارلنگ! ٹوٹو کی گردن پر رکھا ہوا، مانگا ہوا سر کہہ رہا تھا۔ میں بھی کپڑے بدل لیتا ہوں اور پھر ٹوٹو لپک کر باتھ روم میں بند ہوگیا۔

لکشمی نے اپنی گاؤن کا اوپر کا بٹن کھولتے ہوئے سوچا، آج سچ مچ میں نے بہت پی لی ہے۔ اس کا نہ صرف سر گھوم رہا تھا، بلکہ بڑی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ ہر طرف کی کھڑکیاں بھی تو بند تھیں۔ اس نے سڑک کی طرف کی کھڑکی کھول لی۔ تیسری منزل سے نیچے جھانک کر دیکھا، تو

فٹ پاتھ پر سوتے ہوئے لوگوں کی قطار ایسی لگی، جیسے چادریں لپیٹے مُردے پڑے ہوں۔ مگر ان مُردوں میں بھی ایک جگہ حرکت نظر آ رہی تھی۔ ایک مرد اور ایک عورت پاس لیٹے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر لکشمی نے دیکھا، مرد کا ہاتھ آہستہ آہستہ عورت کے ہاتھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر ان دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔ اور اتنی دور سے بھی لکشمی کو محسوس ہوا کہ صرف ایک ہاتھ کو ہاتھ سے چھو لینے سے عورت یا لڑکی یا جو بھی تھی، اس کے سارے تن بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اتنے میں ٹوٹو سلیپنگ سوٹ پہن کر باہر نکل آیا اور لکشمی کو کھلی کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے دیکھ کر بولا: ڈارلنگ، یہ تم کیا کر رہی ہو؟ گرمی لگ رہی ہے، تو ایئر کنڈیشن کس کام کے لیے ہے؟ پھر اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک طرف ہٹا دیا اور لکشمی نے سوچا کہ ٹوٹو کے چھونے سے میرے بدن میں ویسی جھرجھری کیوں نہیں پیدا ہوئی؟ پھر ٹوٹو نے کھڑکی بند کر دی اور ایئر کنڈیشن کا بٹن دبا کر چالو کر دیا۔

کم آن، ڈارلنگ۔ ٹوٹو نے پلنگ پر لیٹتے ہوئے سوتی ہوئی آواز میں کہا، بہت رات ہو گئی ہے، اب سو جانا چاہیے۔ آج بہت تھک گئے ہیں۔

لکشمی بھی پلنگ کے دوسرے حصے پر اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

ایئر کنڈیشن میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ ٹوٹو نے پائنتی سے کمبل اٹھا کر اوڑھ لیا اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔

لکشمی نے بھی اپنا کمبل اپنے اوپر ڈال لیا اور دیر تک کمرے میں گلابی چھت کو، گلابی لیمپ شیڈ کو اور گلابی دیواروں کو دیکھتی رہی۔

پھر اس کو ٹوٹو کے خراٹے لینے کی آواز آئی۔

ایسا لگتا تھا، جیسے کوئی آخری سانسیں لے رہا ہے۔

لکشمی نے بھی دوسری طرف کروٹ لے لی۔ اس کا ہاتھ لیمپ کے سوئچ تک گیا، پھر اندھیرے سے ڈر کر اس نے ہاتھ ہٹا لیا۔ اور لیمپ گلابی دیواروں، گلابی چھت، گلابی کمبلوں اور گلابی قالین پر گلابی روشنی بکھیرتا رہا اور آخرکار لکشمی کی نشے سے بوجھل آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔

گوری کے ہاتھ میں سکھارام کا ہاتھ تھا۔
سکھارام کے ہاتھ میں گوری کا ہاتھ تھا۔
ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں ہوتی ہوئی......
ایک گرمی،
ایک نرمی،
ایک بجلی کی رو،
ایک سنسنی،
ایک جھرجھری دوڑتی رہی۔

اور دونوں لیٹے لیٹے اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے سڑک کے کنارے لگے ہوئے ہنڈے کو دیکھتے رہے۔

اوپر اندھیری بلڈنگ کے صرف ایک فلیٹ کی کھڑکیوں میں گلابی روشنی تھی۔ وہ اس روشنی کو جھلملاتے دیکھتے رہے۔

کتنے خوش قسمت ہیں وہ میاں بیوی، جو اس گلابی روشنی والے کمرے میں سو رہے ہیں۔ گوری نے سکھارام کے ہاتھ کو ہلکے سے دباتے ہوئے سوچا۔

رات کا ایک بجا۔
بسیں آنا جانا بند ہو گئیں۔
رات کے دو بجے۔
ٹیکسیاں چلنی بھی بند ہو گئیں۔
رات کے تین بجے۔

فٹ پاتھ پر سناٹا چھا گیا۔ یہاں سے وہاں تک مُردوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ صرف سکھارام اور گوری زندہ تھے اور جاگ رہے تھے مگر ان کے اوپر بجلی کا ہنڈا اپنی ایک آنکھ سے ان کو گھور رہا تھا۔

بھگوان کرے، سکھارام نے سوچا، اس ہنڈے کی آنکھ پھوٹ جائے۔

پھر دور کہیں چار بج رہے تھے اور پورب کا آسمان ملگجا سا ڈپٹا لگ رہا تھا۔

اور پھر سکھارام اور گوری کی دعا سن لی گئی۔

ایک دم ہنڈے کی روشنی گل ہو گئی۔ اوپر تیسرے مالے کے فلیٹ میں جلتی ہوئی گلابی روشنی بھی بجھ گئی۔

اسی وقت زمین کے اندر سے ایک بھیانک گڑگڑاہٹ کی سی آواز آئی، جیسے کوئی بڑا ہوائی جہاز زمین کے اندر اڑ رہا ہو۔ ہوا جیسے رک گئی تھی۔

پھر اسی وقت سکھارام اور گوری کو ایسا محسوس ہوا، جیسے کوئی ان کے پلنگ کو بڑے زور سے ہلا رہا ہے۔ مگر وہ پلنگ پر نہیں، پتھر کی سیج پر لیٹے ہوئے تھے۔

گھُپ اندھیرے میں لوگوں کے چیخنے چلّانے، اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بلڈنگ کے زینے سے سائے دوڑتے ہوئے نیچے اُتر رہے تھے۔ گندھک کی بو کہیں سے آ رہی تھی۔

زلزلہ ہے......زلزلہ!

زلزلہ ہے......زلزلہ!

بجلی پھیل ہو گئی ہے!

پھر ایک مرد کی آواز آئی۔

ڈارلنگ! ایئر کنڈیشن بھی تو فیل ہو گیا ہے!

میں تو روشنی جلا کر سوتی ہوں۔ وہ بند ہوئی، تو میری آنکھ کھُل گئی۔

زمین نے ایک اور جھٹکا لیا، تو عورتیں اور بچے چیخنے لگے۔

ڈارلنگ! بلڈنگ کی دیوار کے پاس سے ہٹ جانا چاہیے!

ہاں، کہیں بلڈنگ ہمارے اوپر نہ گر پڑے!

فٹ پاتھ سے لوگ ٹٹول ٹٹول کر سڑک پر آتے جا رہے تھے۔ صرف دو کالے سائے ہاتھ سے ہاتھ پکڑے ہوئے زینے پر ٹٹول ٹٹول کر چڑھ رہے تھے۔

تیسرا مالا ہے ان کا ہے۔

ہاں...... ہاں۔ اس کے کان میں کسی نے کہا تیسرے مالے پر ہی چل رہے ہیں۔
ٹٹول کر بیڈ روم میں سکھارام اور گوری داخل ہوئے۔ ان کے پیروں کے نیچے نرم قالین محسوس ہوا۔

اندھیرے میں کسی چیز سے زور سے دونوں ٹکرائے اور پلنگ پر گر پڑے۔

چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ساری دُنیا اُس وقت اندھیری تھی، اندھی تھی۔

مگر پلنگ پر نرم نرم گدا بچھا ہوا تھا۔

گوری کے جلتے ہوئے گالوں کو تکیے بڑے نرم اور ٹھنڈے لگے۔

زمین کا دم گھٹ رہا تھا۔ زمین کروٹیں لے رہی تھی۔ زمین ہل رہی تھی۔ زمین بے چین تھی۔ زمین آسمان کی طرف اُچھل رہی تھی۔ آسمان زمین کی طرف آتا محسوس ہو رہا تھا۔

سارے شہر میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

بھونچال آیا ہے! بھونچال آیا ہے!

زلزلہ ہے...... زلزلہ!

ارے بھائی طوفان ہے! طوفان!

بھونچال! بھونچال!

بلڈنگوں سے دور رہو! نہ جانے کس وقت گر پڑیں!

دُنیا کی ہر چیز پر اس وقت خوف طاری تھا۔

مگر گوری کو دو مضبوط بانہیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھیں۔

O

# اسپرش/لمس

اس کا نام دیویندر کمار تھا، مگر ساری فلمی دنیا اسے 'ڈپر اسٹار' کے نام سے جانتی تھی۔ اس کے پبلسٹی منیجر نے اسے سمجھایا تھا کہ 'سپر اسٹار' تو کوئی کلاکار کہلاتے ہیں یا کہلاتے تھے، مگر 'ڈپر اسٹار' ایک ہی ہے، اور وہ دیویندر کمار ہیں۔

یہ چہرا کہیں دیکھا ہوا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت درد اور تکلیف سے کچھ بدلا ہوا لگتا ہے۔ چترا بھاگوت نے ایئر کنڈیشنڈ 'اے' کلاس کمرے میں گھستے ہوئے سوچا۔

ہر طرف پھول ہی پھول کمرے میں بھرے ہوئے تھے، جو پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور دوسرے اسٹار جو دیویندر کمار سے ملنے آئے تھے، چھوڑ گئے تھے۔ ان کی خوشبو سے ایئر کنڈیشنڈ کمرا مہک رہا تھا۔

پھر جیسے ہی وہ اسپتال کے پلنگ کے سرہانے پہنچی، اس نے اس چہرے کو پہچان لیا۔ درجنوں بار روپہلے پردے پر وہ اسے دیکھ چکی تھی اور سیکڑوں فلمی پتر کاؤں کے اوپر اس کے کلوز اپ دیکھ چکی تھی۔ جب اسے کمرا نمبر 144 میں بھیجا گیا تو وہ ڈر رہی تھی کہ ہمیشہ کی طرح کوئی سیٹھ یا پیٹرو ڈالرس میں ڈوبا ہوا عرب کا کوئی شیخ ہوگا۔ اس کے خواب اور خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس کا پیارا سارے ہندوستانی کا پیارا فلمی ستارا دیویندر کمار اس اسپتال کے پلنگ پر لیٹا ہوگا۔ اس سے تو

صرف یہ کہا گیا تھا کہ اس بیمار کے زخم تو سب بھر گئے ہیں، مگر دو تین ہفتہ PHYSIO THERAPY سے علاج کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی اسے اسپتال سے چھٹی دی جاسکتی ہے۔

'فلم اسٹار دیویندر کمار ہیں نا آپ؟' چترا بھاگوت نے مسکرا کر غیر ضروری سوال کیا۔

'آپ مجھے جانتی ہیں؟' جواب میں دیویندر کمار نے اتنا ہی غیر ضروری سوال کیا، کیونکہ اسے تو پہچانے جانے کی عادت ہوگئی تھی۔

'کون نہیں جانتا آپ کو؟ بتایئے یہ ایکسیڈینٹ کب اور کیسے ہوا؟' چترا نے ڈاکٹری انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

'میں آپ کو سب سچ بتا دوں گا مگر آپ پہلے بیٹھ تو جایئے۔' دیویندر نے جواب دیا۔ 'کہانی لمبی ہے اور میں کسی لیڈی کو اتنی دیر تک کھڑی نہیں دیکھ سکتا۔'

چترا بھاگوت کمرے کی اکلوتی کرسی کو پلنگ کی جانب گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی۔

دیویندر نے وہی کہانی چترا کو سنا دی جو وہ کئی ہفتہ سے رپورٹروں کو سنا تا رہا تھا۔ کس طرح وہ ایک خطرناک سین کر رہا تھا۔ وہ جب بھی کوئی خطرناک سین کرتا ہے خود ہی کرتا ہے۔ کبھی STUNT MEN کو ڈپلی کیٹ کے طور پر استعمال نہیں کرتا، کیونکہ وہ نقلی ایکٹنگ کرنے کا عادی نہیں اور نہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے سے جھجکتا ہے (یہ بات وہ بار بار جتایا کرتا تھا)۔ سین یہ تھا: ہیرو ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک رسّی کی مدد سے چڑھ رہا ہے، جہاں ویلین بندھی ہوئی رسّی کو اپنے خنجر سے کاٹ رہا ہے۔ جہاں ہیرو لٹکا ہوا ہے، وہاں سے دو ہزار فٹ نیچے ایک گہری گھاٹی ہے۔ اس لیے حفاظت کی خاطر رسّی کا آخری سرا دیویندر کے کوٹ کے نیچے اس کی کمر کے گرد بندھا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی اسے رسّی کے سہارے ہی اوپر چڑھنا تھا۔ رسّی مضبوط تھی، لیکن مونج کی بنی ہوئی تھی، جس میں سخت ریشے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اسی رسّی کو پکڑ کر اس کو چڑھنا تھا۔ اس لیے رسّی کی رگڑ سے اس کے دونوں ہاتھ لہولہان ہوگئے۔ جب وہ پہاڑی پر چڑھ ہی گیا اور ہاتھ سے چٹان کی کگار کو پکڑ کر اس نے اپنے آپ کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی تو ٹھیک اسی وقت اس کے لہولہان ہاتھ پتھر پر سے پھسل گئے اور وہ پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے گر گیا۔ پھر اوپر سے پھسلتی ہوئی رسّی کو روک لیا گیا اور وہ صرف پچاس فٹ نیچے گرا، ورنہ رسّی چھوٹ جاتی تو پھر زندہ بچنے کی

صورت ہی نہیں تھی۔ پھر بھی جب اس کا گرنا رُکا تو اس کی کمر پر جہاں رسّی کا دوسرا سرا بندھا ہوا تھا، وہاں اتنے زور کا جھٹکا لگا تھا کہ کئی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

'میں تو اس وقت بے ہوش تھا جب مجھے اوپر سے کھینچا گیا۔ اس لیے جو سنا ہے وہ بتا رہا ہوں آپ کو۔ مگر میں ان STUNT MEN کی ہوشیاری اور طاقت کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو رسّی کو اوپر سے پکڑے ہوئے تھے اور جنھوں نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں اوپر کھینچا۔'

'باپ رے!' چترا بھاگوت نے یہ سب سن کر کہا، 'اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو بھگوان نے بچالیا۔ ذرا اپنی وہ مشہور ہتھیلیاں تو دکھایئے جو سب سے زیادہ لہولہان ہوئی تھیں۔'

کسی قدر جھجک کے ساتھ 'ڈپر اسٹار' نے اپنے دونوں ہاتھ کمبل اور چادر کے اندر سے نکالے۔ جیسی چہرے کی رنگت تھی، اسی طرح یہ ہاتھ بھی گورے تھے۔ (جیسے عام طور پر پنجابیوں کے ہوتے ہیں، چترا نے سوچا) مگر نرم اور نازک ہاتھ نہیں تھے۔ بڑے بڑے گٹھے پڑے ہوئے کھردرے ہاتھ تھے۔ ہاتھوں کے زخم بھر چکے تھے۔ مگر چترا کی تجربہ کار آنکھوں نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ زخم ایک رسّی کے پھونسڑوں کی رگڑ سے نہیں آئے تھے بلکہ ان ہاتھوں میں کوئی بہت تیز چبھنے والی چیز چبھی تھی۔

'اچھا، اب ذرا اپنی انگلیوں کو پھیلا دیجیے، اس طرح۔' اس نے کہا اور اپنی انگلیوں کو پھیلا کر دکھایا۔ نیچے سفید چادر تھی۔ اس وقت اپنی سانولی سلونی رنگت کا چترا کو تیز احساس ہوا، کیونکہ اس کے مقابلے میں وہ گورے گورے بڑے بڑے ہاتھ تھے، جو بند تھے اور بے جان گوشت کے لوتھڑے معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ دیویندر کمار دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی مدد کے بغیر اٹھا ہی نہیں سکتا تھا۔

اس نے انگلیاں پھیلانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا، 'یہ میں نہیں کر سکتا، بہت درد ہوتا ہے۔'

'آؤ آؤ کوشش تو کرو۔' چترا نے کہا، 'میں تمھاری مدد کرتی ہوں۔'

یہ کہہ کر اس نے دھیرے سے، ان بڑے بڑے، گورے گورے بند ہاتھوں کو اپنی نازک سانولی انگلیوں سے چھوا، بلکہ پھیلایا۔ اس لمس میں پیار بھی تھا، ممتا بھی تھی، ہمدردی بھی اور گرمی

بھی۔ اس نے دیویندر کی 'جمی' ہوئی انگلیوں کو پگھلایا۔ دھیرے دھیرے ان میں حرکت ہوئی اور انھوں نے کھلنے اور پھیلنے کی کوشش کی۔

'شاباش! شاباش!' چترا نے دیویندر کو بچّوں کی طرح پچکارا، بہلایا اور ہمّت بڑھائی، 'انگلیوں کو ذرا اور کھولو اور......اور......'

ایک جگہ جا کر انگلیاں ٹھہر گئیں۔ دیویندر نے مایوسی سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھ کر کہا، 'اب اور نہیں کھلتیں۔ تکلیف ہوتی ہے، جیسے کوئی سوئی انگوٹھے کے نیچے چبھی ہوئی ہو۔'

'سوئی؟' چترا نے حیرت سے دہرایا۔ وہ تو انگوٹھے کو برابر سہلائے جا رہی تھی، مگر اصل میں اپنی ڈاکٹری آنکھوں سے اور ڈاکٹری انگلیوں سے انگوٹھے کی جانچ کر رہی تھی۔

ڈپر اسٹار اتنی محنت کے بعد انگلیاں کھول کر پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ مگر تکلیف کی 'سوئی' اب کم تکلیف دے رہی تھی۔ چترا کا لمس ایک مرہم کا کام کر رہا تھا۔

چترا نے انگوٹھے کو سہلاتے سہلاتے، ذرا زور سے تھپ تھپایا۔ پھر اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور کہا، 'کل سے علاج اور ورزش شروع کریں گے۔' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

'آپ چلی جائیں گی؟' ڈپر اسٹار نے بچّوں کی طرح منہ بسور کر پوچھا اور ہاتھ کمبل اور سفید چادر کے اندر کر لیے۔

'اب جانا ہی ہوگا۔ دو تین اور بیماروں کو دیکھنا ہے۔' چترا نے کہا، 'آج تو میں آپ سے صرف تعارف کرانے آئی تھی۔'

دیویندر نے مایوس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی بہانے ڈاکٹر چترا کو روکا جائے؟ پھر اس کی نظر ان پھولوں پر پڑی جو ڈریسنگ ٹیبل پر سجے ہوئے تھے۔

'کچھ پھول تو لیتی جایئے اپنے ساتھ!' اس نے کہا۔

'بہت اچھا۔ شکریہ۔' چترا نے کہا۔ اسے سکھایا گیا تھا کہ بیمار کی کسی بات کو رد نہ کرو مگر وہ بھی زندگی میں بڑھیا تحفے لینے کے خلاف تھی، کیونکہ اس میں خطرا بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے گلاب کا ایک پھول ٹوکری میں سجے ہوئے پھولوں میں سے نکال لیا۔

'میں یہ پھول لے جاؤں گی۔ بہت بہت شکریہ، مسٹر کمار۔'

چترا کی چپلوں کی آواز ایئر کنڈیشنڈ کمرے کا دروازہ برابر ہوتے ہی غائب ہوگئی۔
دیویندر اپنے خیالوں کے ساتھ اکیلے رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا، اپنی بیوی دَیا کے بارے میں اور اپنی گرل فرینڈ رادھا کے بارے میں۔ یہ دونوں ہمیشہ اس سے ملنے آتی تھیں۔ بیوی صبح کو آتی تھی اور رادھا شوٹنگ کے بعد شام کو آتی تھی۔

دیویندر کمار نے زندگی میں درجنوں عشق کیے تھے اور رشتے تو سینکڑوں لڑکیوں کے ساتھ قائم کیے تھے۔ مگر ایک دن یا ایک رات کے لیے۔ ان میں فلم اسٹار بھی تھیں، ویمپ بھی، ایکسٹراز بھی، کالج گرلس بھی، ایئر ہوسٹیس بھی، کال گرلس بھی اور معمولی درجے کی طوائفیں بھی۔ مگر انھوں نے اس کی زندگی پر یا اس کے دل پر کوئی نشان نہ چھوڑا تھا۔ لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کے ساتھ اس کا برتاؤ بہت سیدھا سادا اور بہت کم ہوتا تھا۔ وہ نہ جھوٹ بولتا تھا، نہ وعدے وغیرہ کرتا تھا۔ ہاں، اپنی شہرت (یا بدنامی) سے فائدہ ضرور اٹھاتا تھا۔ وہ کسی لڑکی سے یہ نہیں کہتا تھا، 'ڈارلنگ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔' وہ تو بس اتنا کہتا تھا، 'دیکھو بھئی! تم ہمیں دلچسپ اور دلکش لگتی ہو۔ کیا تم میرے ساتھ لنچ یا ڈنر کے لیے ایک ہوٹل میں چل سکوگی؟' عام طور پر وہ لڑکی 'ہاں' کہتی تھی اور دو چار گھنٹے ساتھ گذارنے کے بعد کپڑے اتارنے کا وقت آجاتا تھا۔ فلموں کی ماری اس قسم کی لڑکیوں کے لیے 'نا' کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دیویندر کا پُرکشش مردانہ حُسن مشہور تھا۔ وہ لڑکیاں اس تاک میں رہتی تھیں کہ کب اس کی نظر ان پر پڑے۔ مگر وہ اپنی مصروفیت یا دستیابی کی ڈینگ نہیں مارتا تھا، کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی اندر ہی اندر اس کے احساس، اس کی انا کو سکون ضرور ملتا تھا اور اس سے اس کی فلمی شخصیت کو توانائی ملتی تھی۔

صرف دو لڑکیوں نے اس کی دعوت کو نرمی سے ٹھکرا دیا تھا۔ پہلی سے اس نے شادی کر لی تھی۔ دوسری کی شہرت 'شیرنی' کی تھی۔ فلم انڈسٹریز میں وہ MAN-EATER مردخور کہلاتی تھی۔ جب دیویندر کی اس سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ اس کے ساتھ ایک پکچر میں ہیروئین کا رول کر رہی تھی۔ اس کے چلتے پھرتے بناوٹی 'رومانسوں' کی بھی ہر طرف ایسی ہی چرچا تھی جیسی دیویندر کے رومانسوں کی۔ مگر جب دیویندر سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے بے جھجک 'ہائے

دیویندر' کہہ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ دیویندر کے لیے اس سے زیادہ دعوتِ محبت اور کیا ہو سکتی تھی؟ مگر اس شام کو جب اس نے رادھا کو ہوٹل میں چلنے کے لیے دعوت دیا تو رادھا نے بڑے نخرے کیے۔ بھولی بننے کا پوز کیا۔ پوچھنے لگی، 'ہوٹل میں کیا ہوگا؟'

'تم خوب جانتی ہو کیا ہوگا؟' دیویندر نے کہا۔

'میری ماں نہیں جانے دیتی ہوٹلوں ووٹلوں میں۔ کہتی ہیں، ایسی جگہیں خطرناک ہوتی ہیں، کنواری لڑکیوں کے لیے۔'

کنواری! یہ اچھا مذاق ہے، ڈارلنگ۔'

مگر رادھا اس وقت تک نہیں مانی جب تک کچھ دن اس نے دیویندر سے صرف یہ نہ کہلوا لیا، 'میں تم سے محبت کرتا ہوں، ڈارلنگ۔ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔' بلکہ یہ بھی کہلوا لیا، 'یہ معاملہ ایک دو دن کا نہیں ہے۔ میں اسے ہمیشہ نبھاؤں گا۔' اس دن سے رادھا نے اسے ایک رات کے لیے بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اب دیویندر کو معلوم ہوا کہ فلم انڈسٹری والے رادھا کو MAN-EATER کیوں کہتے تھے۔

ہر طرف اِن دونوں کے 'عشق' کے چرچے ہونے لگے بلکہ چھپنے بھی لگے۔ مگر رات کے چاہے دو بج جائیں، رات دیویندر اپنے گھر ہی جا کر گذارتا تھا۔ شروع شروع میں جب ان کی شادی ہوئی تھی تو دیا رات کو اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا ہوا، اور وہ آرام کرسی پر اونگھتی ہوئی۔ اس کی ساس نے پہلی رات کو ہی اسے سکھایا تھا، 'بیٹی، دھرم پتنی کا فرض ہے کہ جب تک شوہر گھر نہ آ جائے، رات کا کھانا نہ کھائے۔ ستی ساوتریاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔' مگر سال بھر کے بعد جب ان کا پہلا بچہ پیدا ہوا تھا تو دیویندر اسے سمجھا تھا کہ وہ کھانا جلدی کھا لیا کرے۔ 'آخر تم اب ماں بن گئی ہو۔ میرے بیٹے کی ماں۔ اب تمھیں اس بچے کی خاطر اپنی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ جلدی کھانا کھاؤ، جلدی سو جاؤ۔ اپنے فلم ایکٹر شوہر پر بھروسہ رکھو۔ اس کے اپنے لیے، تمھارے لیے، ہمارے بچے کے لیے دو روٹیاں کمانے دو، جس کے لیے اسے دو شفٹ روز کرنی پڑتی ہیں۔' یہ اس نے نہیں کہا کہ 'دو شفٹ' صرف اسٹوڈیو میں کرنی پڑتی ہے یا کہیں اور، مگر بیوی سمجھ گئی تھی اور اس دن سے اس نے رات کو دیویندر کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔

اس کی زندگی پہلے ہی دو حصّوں میں بٹی ہوئی تھی، آج سے تین حصّوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ دیویندر نے سوچا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ چترا بھاگوت کی انگلیوں میں ایسا جادو تھا جس کے چھوتے ہی اس کے تن بدن میں بے چینی پیدا ہو جاتی تھی، مگر اگلے لمحہ وہ طوفان تھم بھی جاتا تھا اور چترا کا 'اسپرش' ایک مرہم ثابت ہوتا تھا، جیسے وہ ایسا انجکشن ہو جس سے اس کی رگوں میں شہد بھر جاتا۔ وہ اتنی بے چینی سے چترا بھاگوت سے اپنی ملاقات کا انتظار کرنے لگا، جیسے وہ ۱۷ سال کا نوجوان ہو جس کی پہلی گرل فرینڈ نے کل کو آنے کا وعدہ کیا ہو۔

اگلے دن صبح کو جب چترا اسپتال آئی تو مسز دیویندر کمار کمرے سے باہر نکل رہی تھیں۔ دونوں کی مڈبھیڑ برآمدے میں ہوئی۔

'آپ تو مسز کمار ہیں۔' چترا نے پہچان کر کہا۔ اس نے دیویندر کمار کی لمبے قد والی، حسین بیوی کے سینکڑوں فوٹو رسالوں میں دیکھے تھے۔ 'آپ سے آج مل کر بہت خوشی ہوئی۔'

دونوں نے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

'تو پھر آپ وہ PHYSIO- THERAPIST ہوں گی، جن کا ذکر دیو سارے وقت کرتا رہا تھا۔'

اب چترا نے دونوں کے جسم اور چہروں کی یکسانیت اور ہم رنگی دیکھی۔ مسز دیویندر دیویندر کمار کی دور کی رشتے داری میں سے تھیں۔ ممبئی چھٹی پر آئی تھیں۔ جب دیویندر کمار سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی اور دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ ایک مہینے سے کم عرصے میں ان کی شادی ہو گئی۔

چترا کے نرم ہاتھ کو دبا کر دِیا نے کہا، 'مجھے یقین ہے کہ میرا شوہر محفوظ ہاتھوں میں ہے۔'

'اس کا میں پورا یقین دلاتی ہوں آپ کو نمستے!' چترا نے کہا اور روم نمبر 144 کی جانب بڑھ گئی۔

'میں کب سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔' ضدی بچوں کی طرح منہ بسورتے ہوئے دیو نے کہا، 'کہاں رہ گئی تھیں؟'

'سوری SORRY۔' چترا نے انگریزی میں معافی چاہی اور پھر کہا، 'میں کچھ لمحوں کے لیے

مسز دیویندر کمار سے باتیں کرنے لگی تھی۔ میرے خیال میں آپ نے میرا تعارف ان سے کرا دیا ہے۔'

'اچھا تو ذیا سے بات کر رہی تھیں؟ کیا کیا شکایتیں کی میری اس نے؟

میں نے تو اس سے بس اتنا کہا تھا کہ میرا علاج ایک ذہین اور خوبصورت PHYSIO-THERAPIST کر رہی ہے۔' دیویندر نے کہا۔

'علاج تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔ اب شروع ہوگا۔ مگر مسز کمار ہیں بہت خوبصورت عورت۔ آپ خوش قسمت ہیں جو آپ کو ایسی بیوی ملی۔'

'ہاں'، دیویندر نے سر ہلا کر کہا۔ جیسے اس کا یقین اس کو نہیں ہے۔ 'سب یہی کہتے ہیں۔ جب ذیا سے پہلی بار ملتے ہیں۔ کب شروع کریں گی آپ علاج؟'

جواب میں چترا نے ایک سرسری نظر دروازے پر ڈالی، جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ دروازہ کھلا اور ایک نوجوان پورٹیبل ایکسرے مشین پہیوں پر دھکیلتا ہوا اندر لایا۔

'یہ سب کیا ہے؟' دیویندر کمار نے چترا سے پوچھا۔

ایکسرے کا سامان میز پر رکھ دیا گیا۔ میز کو ٹرالی کی طرح سرکا کر ٹھیک دیویندر کمار کے تکیے کے سامنے کر دیا گیا۔

'ابھی آپ کے دائیں ہاتھ کا ایکسرے کرنا ہے۔' چترا نے جواب دیا۔ سامنے ایک ایکسرے پلیٹ رکھ دی گئی تھی۔ 'ہاتھ باہر نکالیے اور پھیلایئے۔'

تکلیف تو اسے ہوئی مگر چترا کی انگلیوں کے جادو سے اس کی انگلیاں بھی کھل گئیں۔

ایکسرے کیمرے کا 'کلک' ہوا اور پھر سارے سامان اور ایکسرے پلیٹ کو باہر لے جایا گیا۔

پانچ منٹ میں چترا ہاتھ میں گیلی ایکسرے پلیٹ 'ڈارک روم' میں لے کر آئی۔

'بالکل وہی حال ہے جیسا میرا شک تھا۔' چترا نے ایکسرے پلیٹ دیویندر کو دکھاتے ہوئے کہا۔ 'ایک شیشے کی پتلی کرچی آپ کے انگوٹھے کے اندر گھسی ہوئی ہے۔ اس کو نکالنا پڑے گا مگر مجھے حیرت ہے کہ اس پہاڑ پر شیشے کی کرچیں کہاں سے آ گئیں؟'

دیویندر نے کوئی جواب نہ دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس طرح کے سوال جواب اس کو پسند

نہیں تھے۔

'آج میں تھک گیا ہوں مگر آپ PHYSIO- THERAPIST ہیں یا پرائیویٹ جاسوس؟ کب علاج شروع کریں گی؟'

'ابھی ابھی شروع ہوگا، آپ کا علاج لیکن صرف بائیں ہاتھ کا۔ دائیں ہاتھ کا پہلے آپریشن ہوگا۔ جب شیشے کی کرچ نکل جائے گی تب اس کا علاج کریں گے۔'

وہ پلنگ کے گرد گھوم کر دوسری جانب چلی گئی تا کہ اس کے بائیں ہاتھ کے قریب ہو سکے۔

'اب آپ میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کیجیے۔' چترا نے کہا۔

'بڑی خوشی سے'، دیویندر نے کہا اور یہ رسمی لفظ نہ تھے۔ یقیناً یہ بہت سیدھا سادا اور دلچسپ نسخہ تھا۔ کون ایک خوبصورت لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا؟

'مضبوطی سے پکڑیے۔'

دیویندر نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جب چترا نے ہاتھ کھینچا تو اس کا ہاتھ ایک چکنی مچھلی کی طرح دیویندر کے پنجے سے آزاد ہو گیا۔ اس کی انگلیوں میں اب طاقت بالکل نہیں تھی۔

'پھر کوشش کیجیے۔' چترا نے انتباہ کیا۔

اس بار دیویندر نے اس کی انگلیوں کو مضبوطی سے پکڑا اور چترا کو اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے خاصا زور لگانا پڑا۔ اب وہ محسوس کر سکتی تھی کہ پہلے کے مقابلے میں ہاتھ میں طاقت واپس آ رہی ہے۔

'ایک بار پھر کوشش کیجیے۔'

اس بار چترا کو یہ کہنا نہ پڑا بلکہ دیویندر نے خود کہا۔

چترا نے اپنا نرم ہاتھ دیویندر کی سخت انگلیوں میں دے دیا، جن کا اب کافی مشق ہو گیا تھا۔ اب دیویندر نے چترا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ہاتھ میں طاقت کم تھی، مگر پھر بھی ایسے نازک ہاتھ پکڑنے کے لیے کافی تھی۔

'مضبوطی سے پکڑے رہیے۔'

اس بار دیویندر نے اتنی مضبوطی سے چترا کے ہاتھ کو پکڑا جیسے اس کی زندگی کا سارا انحصار

اسی پر ہوا اور اس بار چترا کو اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے یقیناً کافی زور لگانا پڑا۔ اس کھینچا تانی میں وہ پسینے سے شرابور ہوگئی۔ آخر میں اس کا ہاتھ پھسل کر دیویندر کے پنجے سے باہر نکل آیا۔

مرد اور عورت کا ایک دوسرے کے ہاتھ کو پکڑنا پرانا رومانٹک پینترا ہے۔ اس طرح ہاتھ پکڑنا PHYSIO-THERAPY کا جز سمجھا جاتا ہے، لیکن دیویندر کو ایسا مزا آ رہا تھا جیسے یہ ورزش رومانس ہی کا ایک جز ہو۔ شاید چترا کو یہ محسوس ہوگیا کہ دیویندر کو اس کا ہاتھ پکڑنے میں مزہ آ رہا ہے، اس لیے اس نے پانچ بار یہ عمل دوہرا کر چھٹی کر دی۔

'تمھاری انگلیوں کی پکڑ ابھی سے تیز اور مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ دو چار دن میں نارمل ہو جائیں گی۔' چترا نے کہا۔

اب اس نے ایک اور 'کھیل' ایجاد کیا۔

اس نے دیویندر کے انگوٹھے کو اس کی باقی انگلیوں سے ملا دیا اور کہا، زور سے بھینچیے۔

پھر اس نے اپنی نرم اور نازک انگلی باہر نکالنے کی کوشش کی۔ پہلی بار بغیر کسی دقت کے وہ اپنی انگلی باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئی۔

دوسری بار وہ اس کھیل کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے انگوٹھے کو دوسری انگلی کے ساتھ اتنی زور سے بھینچا کہ چترا کی انگلی اس پھندے میں پھنس کر رہ گئی۔ بچوں کی طرح دیویندر اپنی کامیابی پر ہنس پڑا۔

چار بار اور چترا نے کوشش کی، مگر ہر بار وہ اپنی انگلی چھڑانے میں ناکام رہی۔ جن ہاتھوں نے بچپن اور جوانی میں ہل اور ٹریکٹر چلایا تھا، چمڑے کا بھاری ڈول کھینچا تھا، والی بال کھیلی تھی اور کبڈی میں کام آئے تھے۔ ان میں اب بھی اتنی طاقت تو تھی کہ ایک مہاراشٹرین لڑکی کی انگلی کو اپنی پکڑ سے نکالنے نہ دے، اس لیے چترا نے اس 'کھیل' میں ہار مان لی۔ دیویندر کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

اب چترا نے کہا، 'اپنی انگلیاں پھیلاؤ۔' اس نے نرمی سے دیویندر کی انگلیوں کو سہلایا۔ اس کے کہنے سے، اور اس سے بھی زیادہ اس کے لمس کے جادو سے، دیویندر کا سخت ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ مگر پانچ ہفتے جو ہاتھ تنگ پٹیوں کی قید میں رہا تھا، اس کی انگلیوں کی لچک اور طاقت بہت کم

ہو گئی تھی۔ پھر بھی اب وہ دوبارہ نئے سرے سے واپس آ رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ ایک بار مٹھی بند کرتا اور پھر انگلیاں کھولتا۔ وہ اس نئی لچک اور طاقت کو واپس آتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ایک عورت کی انگلیاں کیا جادو جگا سکتی ہیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ یہ چمتکار بھی کر سکتی ہیں کہ بے جان انگلیوں میں طاقت بھر دیں۔

اگلی صبح کو جب ڈپر اسٹار کو پہیوں میں لگے اسٹریچر پر ڈال کر آپریشن تھیئٹر میں لے جایا گیا تو وہ آدھا بے ہوش تھا، کیونکہ نیند لانے کی دوا اس کو پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ مگر اس کے کان میں ایک آواز کی گونج پھر بھی سنائی دے رہی تھی۔

'میں حیران ہوں کہ ایک کانچ کی کرچ پہاڑ کی چوٹی پر کیسے پہنچ گئی۔' (یہ چترا نے کہا تھا)

'تم کیا ہو PHYSIO-THERAPIST یا پرائیویٹ جاسوس؟' (دیویندر نے پوچھا تھا)

جیسے ہی اسے آپریشن ٹیبل پر لے جایا گیا اور اس کے چہرے کو کلوروفارم کی نقاب سے ڈھنکا گیا تو اس کا آدھا جاگا ہوا پوری طرح جاگ اٹھا۔ گلابی گلابی سی دھند تھی، جس پر اس کا بنتا ہوا جا رہا تھا۔

اس کی بیوی ڈیا وہاں موجود تھی۔ ایک گلابی رنگ کا نائٹ گاؤن پہنے ہوئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت تھی، مگر اس کا جسم غیر معمولی حد تک لمبا چوڑا تھا۔ معلوم ہوتا ایک حسین عورت کی حسین لمبی چوڑی مورتی ہے۔ وہ اپنی بر فیلی آواز میں کہہ رہی تھی (جس میں کچھ طنز اور کچھ کڑواہٹ بھی تھی) 'دیو، کیا تم مہربانی کر کے اپنی گرل فرینڈ سے کہہ دو گے کہ اپنی وگ کے لال بال تمھارے سفید کوٹ کے کالر پر نہ چھوڑا کرے۔'

دور سے اس کی آواز آئی۔ 'تمھارا کیا مطلب ہے اس بیوقوفی بھرے سوال سے؟'

ڈیا نے اپنے راز دارانہ انداز سے کہا تھا: 'ڈارلنگ، اب مجھے تمھاری گرل فرینڈ کی عادت پڑ گئی ہے۔ ایک کیا میری طرف سے چھ گرل فرینڈ رکھو۔ مگر مجھے اعتراض تو یہ ہے کہ وہ اپنی وگ ہر دوسرے تیسرے دن بدلتی رہتی ہے۔ اس سے کہو کہ بالوں کی رنگت کا ایک بار فیصلہ کر لے۔ بھورے، مٹیالے، کالے یا امریکن کال گرلس جیسے لال جس طرح کے بال چاہے، وہی وگ ہمیشہ

استعمال کرے۔'

پھر یہ سپنا ایک اور سپنے میں بدل گیا۔ فلم کے ایک سین کے لیے دیو، رادھا کے عشق کا کھیل کھیل رہا تھا۔ سین بنا کسی مکالمے کا تھا مگر تھا بہت زوردار اور جذباتی۔ دیویندر اپنے بوجھ کے نیچے رادھا کا مچلتا ہوا سینہ محسوس کر سکتا تھا۔ سینے کے اتار چڑھاؤ، اسکرپٹ میں نہیں تھے، نہ زبانی۔ جو ڈائریکٹر نے ان کو بتایا تھا، اس میں ہی تھے۔ بیک گراؤنڈ میں سورج ٹیکنی کلر میں ڈوب رہا تھا اور پورے حصے میں ہندوستان کے دو مشہور عاشقوں کی جوڑی عشق کر رہی تھی، جب ہی تو وہ MADE FOR EACH-OTHER کہلاتے تھے۔ دیویندر نے دھیرے سے رادھا کے کان میں کہا تھا۔ 'جی چاہتا ہے، تمھیں کچا کھا جاؤں۔' رادھا نے محبت کی شدت میں آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر دیویندر کی نظر رادھا کی لال وگ پر پڑی اور اس نے دھیرے سے پوچھا۔ 'یہ تمھاری وگ کا رنگ کون چنتا ہے؟ آرٹ ڈائریکٹر تو کبھی نہیں کرتا ہوگا؟'

'کیا یہ لال رنگ تم کو مردانگی پر مجبور نہیں کرتا؟' رادھا نے دھیرے سے پوچھا۔

'نہیں۔' دیویندر نے جواب دیا۔ 'مردانگی کی بخار چڑھا بھی ہو تو اُتر جاتا ہے۔ مطلب سمجھیں؟'

'ہاں، خوب سمجھتی ہوں تمھارا مطلب۔ نامرد کہیں کا! اگر میرے بالوں کا رنگ تمھیں پسند نہیں ہے تو جاؤ اپنی بیوی کے پاس اور اس کے پیٹی کوٹ میں چھپ جاؤ۔ وہ تو خضاب سے ہمیشہ اپنے سارے بال کو کالا رکھتی ہے۔'

دیویندر دھیرے سے بول رہا تھا مگر رادھا کو جب کسی بات پر غصہ آتا تھا تو اس کے لیے دھیرے سے بولنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ اتنے زور سے بولی کہ یونٹ کے سارے لوگوں نے اس کی آواز سنی۔ اور ڈائریکٹر چلایا، 'کٹ کٹ!' پھر اس نے کہا، 'میرے خیال میں یہ شاٹ دوبارا لینا پڑے گا۔'

ڈائریکٹر نے دھیرے سے ان دونوں کو سمجھایا کہ 'شاٹ میں کوئی ڈائیلاگ نہیں ہے۔ میں ایک سیدھی سادی رومانٹک فلم بنا رہا ہوں، نہ کہ بے وجہ ننگی تصویریں۔ سورج غروب ہونے کا وقت ختم ہو گیا تو ہمیں کل پھر آنا پڑے گا۔ میرا لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔ مہربانی کر کے یہ شاٹ ہو جانے دو۔ جتنی فلم میں محبت ہے اتنی ہی کرو۔ اس سے زیادہ سینسر کو نہیں چاہیے۔' پھر اس

نے گدھوں کے آگے گاجر لٹکائی۔ 'دو منٹ بعد واپسی میں کار میں جتنی محبت یا نفرت کا اظہار کرنا ہے، کر لینا۔ مت بھولو کہ تم ایک ایکٹر ہو اور تم ایک ایکٹریس۔

یہ پینترا کام کر گیا۔ انھوں نے وہی کیا جو کرنا چاہیے تھا۔ دونوں نے محبت کا پوز بنا لیا۔ جب ہونٹوں تک آئے تو دیویندر نے پھر دیکھا کہ وگ کی ایک لٹ نے گر کر کیمرے کے لینس کو ڈھک دیا ہے۔

شوٹنگ پیک اپ ہوئی تو دیویندر کمار اپنی کار کی بجائے رادھا کی جاپانی گاڑی 'ٹیوٹا' میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا۔ رادھا اپنی گاڑی خود چلاتی تھی اور وہی اسٹیرنگ وہیل سنبھالے ہوئے تھی۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور خاموشی سے چلتی رہی۔ کوئی ایک میل آگے جا کر چوراہا آتا تھا۔ سڑک سیدھے ریسٹ ہاؤس کو جاتی تھی، جہاں یونٹ کے سب لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہیں دو ملے ہوئے کمرے دیویندر اور رادھا کے لیے ریزرو تھے، اگر چہ دونوں ایک کمرے میں ہی اپنا زیادہ وقت گذارتے تھے۔ دائیں جانب کی سڑک ڈھلان پر تھی اور گھوم کر شہر کی جانب جاتی تھی۔ بائیں جانب کی سڑک پہاڑی کی چوٹی کی جانب چڑھتی جاتی تھی۔ یہ بہت خطرناک راستہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ پہاڑی کی چوٹی پر جا کر سڑک بالکل ختم ہو جاتی تھی۔

رادھا نے تیزی سے بائیں جانب کی سڑک پر گاڑی ڈال دی تو دیویندر نے رادھا سے کہا، 'ڈارلنگ، یہ سڑک ریسٹ ہاؤس کو نہیں جاتی ہے۔'

'جاتی کیوں نہیں؟' وہ چلتی موٹر کی رفتار تیز کرتے ہوئے بولی۔ 'یہ تو سیدھی ہمیں اس ریسٹ ہاؤس تک لے جائے گی جہاں ہم ہمیشہ آرام کر سکیں گے۔'

'یہ کیا بکواس ہے؟ پاگل ہو گئی ہو، یا پھر ہسٹیریا کا دورا پڑا ہے تمھیں؟ اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو مجھ کو ہی ڈرائیونگ کرنے دو۔ مجھے افسوس ہے اگر میرا کہنا تمھیں برا لگا ہے، میں ڈرائیو کرتا ہوں۔ تم گاڑی تو روکو ذرا۔'

'نہیں!' وہ زور سے چلائی اور ایکسی لیٹر کو دبا دیا۔ گاڑی اور تیز ہو گئی، لیکن اس کی زبان گاڑی سے بھی زیادہ تیز تھی۔ 'تم مجھے اب کبھی ڈرائیو نہیں کرو گے۔ کافی ڈرائیو کر لیا ہے تم نے، جانم۔ سمجھ لو کہ میں مرنے جا رہی ہوں اور تمھیں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں، تا کہ اس بیوی کے

جنگل سے تم کو ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے۔ مر کر ہم تم ایک ہو جائیں گے۔ زندگی میں تم میرے نہ ہو سکے تو اب ہم ساتھ مر کر امر ہو جائیں گے۔'

'رادھا!' وہ چلایا۔ 'گاڑی روکو۔ تم پاگل کتیا ہو گئی ہو۔ خودکشی کا ناٹک کر کے مجھے ہتھیانا چاہتی ہو۔' یہ کہہ کر اس نے رادھا کو ایک زوردار تھپڑ مار دیا۔

'اچھا تو تم نے مجھے مارا ہے۔ خیر، تمھیں اب کچھ سیکنڈ میں ہمیشہ کے لیے مار رہی ہوں۔'

'رادھا! رادھا! گاڑی روکو۔ بھگوان کے لیے گاڑی روکو۔ بھگوان کے لیے گاڑی روکو۔ تم پاگل ہو گئی ہو۔ یہ سڑک اب ختم ہو رہی ہے۔'

'اور ہماری زندگی بھی ختم ہو رہی ہے۔' رادھا نے دانت پیس کر جواب دیا۔

'رادھا! دیویندر نے آخری بار آواز دی اور ایک بار اپنی پوری طاقت سے اسٹیرنگ وہیل کو اپنی جانب کھینچا۔ کار کھڈ میں گرنے سے تو بچ گئی، مگر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پیڑوں کے ایک جھنڈ سے ٹکرا گئی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے دیویندر نے اپنے آپ کو رادھا پر گرا دیا تھا اور ہاتھ اوپر اٹھا دیا تھا تاکہ موٹر کے اگلے شیشوں کی کرچیں رادھا کے جسم میں نہ گھس جائیں۔ مگر اس کوشش میں ایک باریک کرچ دیویندر کے انگوٹھے میں چبھ ہی گئی۔

یونٹ کے باقی لوگوں نے انھیں ٹوٹی پھوٹی ہوئی کار میں بے ہوش پڑا ہوا پایا۔ دیویندر کے جگہ جگہ زخم آئے تھے۔ اس کی پسلیاں اسٹیرنگ وہیل سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی تھیں اور وہ بالکل بے سدھ پڑا تھا۔ مگر اس کے بھاری بدن نے رادھا کی جان بچا دی تھی، جو بے ہوش ہو گئی تھی، مگر کوئی خراش اس کو نہ آئی تھی۔

یقینی طور پر دیویندر نے اپنی زندگی کی بازی لگا کر رادھا کی جان بچائی تھی۔ یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس کی حد سے زیادہ پبلسٹی کی جا سکتی تھی۔ اس پبلسٹی سے ان کی پکچر کو بھی بہت فائدہ ہوتا لیکن اصلی بات معلوم ہونے پر کہ دیویندر ایکسیڈینٹ کے وقت رادھا کی کار میں تھا، ایک اسکینڈل بھی کھڑا ہو جاتا۔ اسی بدنامی کے ڈر سے پروڈیوسر نے اپنے پبلسٹی منیجر کے ذریعہ یہ خبر باہر نہ نکلنے دی بلکہ یہ فرضی کہانی پریس میں چھپوا دی کہ کسی طرح ایک اسٹنٹ سین کرتے ہوئے دیویندر پہاڑی سے ٹکرا کر زخمی اور بے ہوش ہو گیا تھا۔ شوٹنگ ممبئی سے دور مہابلیشور میں ہوئی تھی،

اس لیے اس راز کو چھپانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ پروڈیوسر کی صرف ایک درجن انڈین وہسکی کی بوتلیں خرچ ہوئیں اور سب لوگوں نے قسم کھائی کہ کوئی بات باہر نہ جائے گی۔ مگر کلوروفارم کا نشہ وہسکی کے نشے سے تیز ہوتا ہے۔ اس نشے میں سچ اور جھوٹ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ دیویندر کا داخلی وجود سارا ڈراما جانتا تھا اور یہی ڈراما آپریشن ٹیبل پر ایک بار اس کے ساتھ گذرا۔

جب چھوٹے سے آپریشن کے بعد اپنے کمرے میں دیویندر نے آنکھیں کھولیں تو جیسے گلابی ریشمی پردے میں سے تین عورتوں کو اپنی جانب پیار اور ممتا، اور کس قدر پریشانی سے گھورتے ہوئے پایا۔ یہ تھیں وہ تین عورتیں جو اس کی زندگی کا جز بن گئی تھیں، ان میں سے ایک کو تو وہ تین چار دن سے ہی جانتا تھا۔

ذیا، جو اس کی بیوی تھی۔ خوبصورت، پرکشش مگر اپنے انداز میں ٹھنڈی برف۔

رادھا، جو ایک بہترین ایکٹریس تھی اور فلموں سے بھی زیادہ اچھے اور اصلی پریمی سین نجی زندگی میں کر سکتی تھی۔

چترا جو PHYSIO THERAPIST تھی، جس نے اس سے کسی قسم کے تعلق پیدا نہیں کیے تھے، لیکن جانے کیوں وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ چترا کی بھی اس کی زندگی میں اتنی ہی اہمیت ہے۔

لیکن تینوں سے ایک وقت میں محو گفتگو ہونا، اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اس نے کمزوری کا بہانہ بنا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بھی دماغ کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں۔ اب اس کو موقع ملا تھا ان تینوں کا مقابلہ کرنے کا۔ ذیا بیشک سب سے خوبصورت تھی، سب سے زیادہ پڑھی لکھی اور مہذب تھی۔ مگر وہ ایک سنگ مرمر سے تراشی ہوئی مورتی کی طرح ٹھنڈی تھی یا شاید اس نے اس میں گرمی ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

رادھا ایک بھوکی شیرنی کی طرح خوبصورت تھی۔ ہوس کی مورتی۔ وہ محبت بھی ایک بھوکی شیرنی کی طرح کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اسے اتنی محبت سے ڈر بھی لگتا تھا۔ پھر بھی رادھا کے بدن کا مالک ہونا اس کے لیے فخر تھا۔ سب ہیرو اس لیے دیویندر سے جلتے تھے۔

تیسری چترا تھی۔ وہ عمر میں ان دونوں سے ذرا بڑی لگتی تھی۔ اس کے وجود میں ایک ٹھہراؤ تھا، جیسے طوفانی ہوا چل کر تھم گئی ہو لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ کب اور کس کے اشارے پر طوفان پھر

شروع ہو جائے۔

اس کا حسن بھی 'چیختا' ہوا نہیں تھا۔ اس کی رنگت سانولی تھی۔ چکھنے میں ضرور نمکین ہوگا۔ اس کا چہرہ پرکشش تھا، جیسے ہیرا تراشا گیا ہو۔ اس کے غور و فکر کی طاقت ان دونوں سے زیادہ تھی۔ کیسے اس نے پکڑا تھا دیویندر کی جھوٹی کہانی کو۔ وہ نہ جذباتی تھی نہ ضرورت سے زیادہ بات کرتی تھی۔ مگر اس کا 'لمس' بیمار کو اچھا کر دینے کی خوبی رکھتا تھا۔ وہ رادھا کی طرح ہوس کا فوارا نہیں تھی جسے جب جی چاہا ایک 'پھر کی' گھوم کر چلا دیا۔ اس میں نہ رادھا کی حیوانیت تھی، نہ ذیا کی طرح ضرورت سے زیادہ تہذیب اور بناوٹ۔ اس کا نازک، نرم اور ممتا سے بھرپور لمس بتاتا تھا کہ جس پر اس کی مہربانی ہوگئی وہ خسارے میں رہے گا۔ اس میں ذیا اور رادھا دونوں کی خوبیاں تھیں مگر دونوں کی کمزوریاں نہیں تھیں۔

جب وہ بالکل اچھا ہو جائے گا (اس نے فیصلہ کیا) تو وہ چترا سے نجی روپ سے ملنے کی کوشش کرے گا۔ ذیا سے وہ شادی کے بندھن میں بندھا ہوا ضرور تھا، مگر رادھا کے ساتھ اس کا رشتہ صرف 'جسمانی' تھا اور یہ رشتہ ہمیشہ کے لیے نہیں تھا۔ شاید اس کی عمر رادھا کی ضرورتوں کے لیے زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے ان تینوں سے ایک ساتھ ملاقات کرنے کے ڈر سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ویسے تو وہ ان تینوں کا مقابلہ کرنے سے ہی تھک گیا تھا۔ جلدی ہی وہ سو گیا۔ شاید کلوروفارم کا اثر اب بھی یقینی طور سے دور نہیں ہوا تھا۔

آپریشن کی پٹی کھل گئی تھی۔ دیویندر کو خوشی تھی کہ آج چترا اس کے ہاتھ کا ورزش کرائے گی۔

وہ ٹھیک وقت پر آئی۔ کلپ لگی ہوئی آدھی آستین کے ڈاکٹری کوٹ میں کتنی اچھی لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح ایک مہربان مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

'آج صبح 'ہم' کیسے ہیں؟' اس نے لکھتے ہوئے پوچھا۔ 'ہم تو بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں اپنی ڈاکٹرنی کا۔'

'آپ کا مطلب ہے نہ ورزش کا، جو ڈاکٹرنی آپ کو بھی کرائے گی؟'

'دونوں کا— ڈاکٹرنی کا بھی اور اس ورزش کا بھی۔'

'تو دونوں ہاتھ باہر نکالیے۔ بلکہ میں تو کہوں گی، اب آپ انھیں مستقل باہر ہی رکھیے۔ اب انھیں چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'

اپنے ہاتھ نکالتے ہوئے دیویندر نے کہا، 'بات یہ ہے کہ میں اپنے ہاتھوں کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ یہ میرے سب سے بدصورت حصے ہیں۔ مجھے شرم آتی ہے، جب کوئی میرے ہاتھوں کو دیکھتا ہے۔'

نرمی سے چترا نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بجلی کا ایک دھیما سا کرنٹ اس کے ہاتھ سے دیویندر کے ہاتھ تک پہنچا۔ 'شرم کی کیا بات ہے اس میں؟ آپ کے ہاتھوں میں گٹے پڑے ہیں۔ ایمانداری سے محنت کرنے میں۔ جب آپ کھیتی کیا کرتے تھے، جب آپ اناج اگاتے تھے، تاکہ ہم بھارتی بھوکے نہ رہیں۔ پنجاب کے کسانوں کے ہاتھوں کے بغیر ہم میں سے کتنے ہی بھوکے مر جاتے۔'

کتنی سوجھ بوجھ اور عقل تھی اس کی باتوں میں! کتنے نرم اور نازک ہاتھ تھے اس کے! کتنا اطمینان بخش تھا اس کا لمس!

'مٹھی بند کیجیے۔'

'اب ہاتھ کھولیے۔'

'اپنی انگلیوں کو اس طرح پھیلائیے۔'

'اب میرا ہاتھ پکڑیے۔' (یہ تو خوشی کی بات ہے۔ دیویندر نے سوچا۔)

'زور سے پکڑیے۔'

'اب آپ کی پکڑ میں زور آتا جا رہا ہے۔ (کاش ایسا ہی ہوتا!)

'شاباش! اب تو آپ کے ہاتھوں کی طاقت واپس آتی جا رہی ہے۔'

'میرے خیال میں آپ کو PHYSIO-THERAPY کی ضرورت نہیں رہی۔' دو ہفتہ ورزش کرانے کے بعد ایک صبح چترا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

'آپ کو اس طرح اچانک اپنے بیماروں کو اتنا بڑا SHOCK نہیں دینا چاہیے۔' اس نے یہ مذاق کے انداز میں کہا تھا، مگر اس کو ایک دھکا سا لگا تھا۔' کچھ مریضوں کو آپ کے سہارے کی عمر

بھر ضرورت ہے۔'

'عمر بھر کا سودا تو میں نے صرف اپنے شوہر کے ساتھ کیا ہے۔'

'نہیں، مس بھاگوت۔'

'مسز بھاگوت۔'

'تو آپ شادی شدہ ہیں؟'

'جی ہاں، مسٹر کمار۔'

'اور مسٹر بھاگوت کیا کرتے ہیں؟'

'وہ ایک آرٹسٹ ہیں۔ ایک پینٹر۔'

'کہاں نمائش ہوتی ہے، ان کی پینٹنگس کی؟ میں شاید ان کی کوئی پینٹنگ خریدنا پسند کروں گا؟'

'وہ نہ اپنی تصویروں کی نمائش کرتے ہیں، نہ ان کو بیچتے ہیں۔'

'اچھا! میں سمجھا۔ کلا کے لیے فن کے حامی معلوم ہوتے ہیں، کیا میں ان کی پینٹنگس دیکھ سکتا ہوں؟'

'ضرور۔ مگر اس کے لیے آپ کو کسی صبح ہمارے گھر آنا پڑے گا۔ کیا میں آپ کو اپنا کارڈ دوں، مسٹر کمار!'

چترا نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا کارڈ نکال کر دیویندر کو دے دیا۔

اگلے دن دیویندر صبح سویرے اٹھا۔ اپنا سوٹ کیس خود پیک کیا مگر اسے کمرے میں ہی چھوڑ کر باہر نکلا۔ اسپتال کے کوریڈور سے ہو کر وہ لفٹ تک پہنچا۔ نیچے اُترا۔ باہر نکلا۔ صبح کے دھندلکے میں سمندر کی تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھری۔ پھر ٹیکسی اسٹینڈ سے ایک ٹیکسی لی۔ ڈرائیور کو گام دیوی کا پتہ بتایا اور کہا، 'کوئی گھنٹہ بھر رُکنا پڑے گا۔ میٹر چالو رکھنا۔'

'بہت اچھا کمار صاحب!'

'تم جانتے ہو مجھے؟'

'ڈیر اسٹار کو کیسے نہیں جانتا؟'

گام دیوی پانچ کر تنگ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ایک جگہ ٹیکسی رک گئی۔ ایک بچے سے جو دودھ کا برتن لیے جارہا تھا، دیویندر نے بھاگوت کا پتہ پوچھا تو اس نے اوپر کی منزل کی جانب اشارہ کردیا۔

لکڑیوں کی سیڑھیوں پر سے ہوتا ہوا دیویندر اوپر پہنچا تو دروازے پر بورڈ لگا دیکھا۔'ڈاکٹر مسز چترا بھاگوت۔'

قریب ہی گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنی انگلی گھنٹی کے بٹن پر رکھ دی۔ اندر سے گھنٹی کی سریلی آواز آئی۔ ساتھ میں چترا کی مراٹھی میں آواز سنائی دی۔' اتکیا پہاٹس کون اسوشکیل؟' (اتنی صبح کون آسکتا ہے؟)

ایک مرد کی آواز سنائی دی۔' کداچت تُجھا نوامترآواأسوا۔ ڈیراسٹار لا جاست واٹ بگھائیلا لاؤنہ کس!(شاید وہ تمھارا نیا دوست ہوگا۔ ڈیراسٹار کو زیادہ انتظار نہ کراؤ۔)

دروازہ کھلا تو سامنے چترا کھڑی تھی۔ یہ ڈاکٹر چترا نہیں تھی، گھریلو عورت چترا تھی۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ ایک ملگجا سا، مسلا سا، ہاؤس کوٹ' پہنے ہوئے تھی۔ مگر چہرے پر مسکراہٹ وہی تھی۔

'ویلکم مسٹر کمار۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آپ اتنی جلدی آجائیں گے اور اتنی صبح— آیئے، پدھاریے۔'

گیلری میں ہوتی ہوئی وہ اس کو ایک کمرے میں لے گئی، جو ڈرائنگ روم بھی تھا اور ایک پینٹر کا اسٹوڈیو بھی لگتا تھا۔ چاروں جانب پینٹنگس، دیواروں کی جانب منہ کیے کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک اسٹینڈ پر ایک پینٹنگ بن رہی تھی، جو چترا کی ہی معلوم ہوتی تھی۔

'یہ میرے شوہر ہیں، انل بھاگوت۔' دوسرے کمرے سے ایک وہیل چیئر پر ایک خوبصورت مگر ادھیڑ عمر کا آدمی باہر آیا تو چترا نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

اس کے بال کھچڑی کی رنگت کے تھے اور چوں کہ کنگھا نہیں کیا تھا، اس لیے کھڑے ہوئے تھے۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی روشنی نے اس کے گرد ایک ہالا بنا دیا تھا۔

'مجھے تو بتایا گیا تھا کہ آپ آرٹسٹ ہیں، مگر آپ تو کوئی سنت فقیر لگتے ہیں۔'

'وہیل چیئر' پر بیٹھا ہوا انل بھاگوت یہ سن کر ہنسا۔' سنت؟ بھئی خوب کہا! مگر میرے پاپوں

کی فہرست سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ دکھاوے پر نہ جاؤ میرے دوست۔ اگر چترا نے مجھے پہلے نہ بتایا ہوتا کہ آپ فلموں کے ڈپر اسٹار ہیں تو میں آپ کو پنجاب کا ایک کسان ہی سمجھتا، جو ممبئی کے گورکھ دھندے میں پھنس گیا ہے۔'

'ویسے تو ہوں میں ایک پنجابی کسان'، دیویندر اپنے گٹے پڑے ہوئے ہاتھ دکھاتا ہوا بولا۔ 'جو ممبئی کے سیمنٹ کے جنگلوں میں راستہ بھول گیا ہے۔'

یہ تھا ان کی بے تکلف بات چیت کا انداز۔

اتنی دیر میں چترا نے بیڈ روم میں جا کر بال بنائے۔ نارنگی رنگ کی ایک ساڑی پہن لی اور وہاں سے اندر ہی اندر کچن میں چلی گئی۔ کچھ منٹ بعد وہ ایک ٹرے لیے ہوئے آئی۔ تین پیالیاں کافی کی۔ ایک پلیٹ بڑوں کی اور ایک پلیٹ پورنا پولی کی۔ ساتھ میں تین کوارٹر پلیٹیں بھی رکھی تھیں۔

اب اس کا شوہر اور ڈپر اسٹار پنجابی کسانوں اور مہاراشٹرین کسانوں کے مسائل کا ذکر کر رہے تھے۔ چترا نے ٹرے سامنے میز پر رکھ دی اور دونوں کو ایک ایک کوارٹر پلیٹ میں بڑے اور پورن پولی ڈال کر دی۔

پورن پولی کھاتے ہوئے دیویندر نے کہا، 'مجھے یقین ہے بہت زیادہ بھوک لگی ہے۔ یہ سب مسز بھاگوت کی ڈاکٹری کی مہربانی سے ہے، ورنہ میں تو صبح کو اٹھ کر بس ایک گلاس سنترے کا رس پیتا ہوں۔'

'میں بھی چترا کا پرانا بیمار ہوں۔' انل نے کہا اور اس کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔ 'مگر مشکل یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر کم ہیں اور اسکول ٹیچر زیادہ۔ ہر وقت بیماروں کو حکم دیتی ہیں۔ یہ کرو، وہ کرو۔'

'مگر یہ کرو وہ کرو کہہ کر ہی انھوں نے میرے مُردہ ہاتھوں میں جان ڈال دی ہے۔' دیویندر نے کہا۔

'یہ تو ٹھیک ہے۔' انل نے اتفاق ظاہر کیا۔ 'پانچ سال ہوئے جب میں پہلی بار چترا سے ملا تھا تو پولیو سے میرے سارے جسم کی طاقت ختم ہو گئی تھی۔ ہماری شادی کے پھیرے بھی اسی وہیل

چیئر پر ہوئے تھے۔ ان دنوں اسے چترا ہی چلاتی تھی۔ اب تو میں اس پر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومتا پھرتا ہوں۔ مگر پھر بھی میں کہوں گا کہ یہ منہ پھٹ بہت ہے۔ ایک سیٹھ صاحب سے کہنے لگی۔ آپ کو دو بیماری ہیں۔ ایک یہ کہ آپ موٹے بہت ہیں اور دوسرے یہ کہ آپ کے پاس کالا روپیہ بہت ہے۔ بھلا بتاؤ ایسے ڈاکٹر کے پاس کون آئے گا؟'

دیویندر محسوس کر رہا تھا کہ ان اعتراضات کے پردے میں انل اپنی بیوی کی کتنی تعریف کر رہا تھا۔

کافی ختم کرتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ 'اب چلنا چاہیے مجھے۔ تھینک یو! آپ دونوں کا۔'

'کیا میری پینٹنگس نہیں دیکھنا پسند کریں گے آپ؟' انل نے اس سے سوال کیا۔

'اصل میں تو میں انھیں ہی دیکھنے آیا تھا، مگر چوں کہ آپ نے اپنی سب تصویروں کو پردے میں رکھ چھوڑا ہے، اس لیے میں نے نہیں پوچھا۔'

'سب کو اپنی پینٹنگس دکھانا ایسا لگتا ہے جیسے پبلک میں ننگے بدن نکلنا۔ اس لیے میں کسی غیر آدمی کو اپنی تصویریں نہیں دکھاتا۔'

'اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے غیر نہیں سمجھتے؟'

'نہیں۔' انل نے اسے یقین دلایا۔ 'آپ تو اب ہمارے دوست ہیں۔ آپ شوق سے سب تصویریں دیکھیے اور بتایئے کہ کون سی پینٹنگس آپ کو سب سے زیادہ پسند آئی۔'

چترا تصویروں کے رخ بدلتی گئی اور دیویندر نے دیکھا کہ ہر تصویر چترا کی ہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اپنی ساری محبت (جس کا جسمانی مظاہرہ وہ نہیں کر سکتا تھا) آرٹسٹ نے اپنے آرٹ میں ڈھال دی تھی۔ سب تصویریں چترا کی تھیں۔ ڈاکٹر چترا کی، PHYSIO- THERAPIST چترا کی۔ آدھی آستین کے ڈاکٹری کوٹ میں سے اس کے سڈول سانولے بازو نکلے ہوئے تھے۔ کسی میں وہ روگی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھی، کسی میں پاؤں، کسی میں ٹانگ کو سہارا دے رہی تھی، کسی میں کمر کی مالش کر رہی تھی، کسی میں اپنے روگی کو سائیکل چلاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ (وہ سائیکل جو ایک جگہ ہی کھڑی رہتی ہے اور صرف ٹانگوں اور پیروں کے ورزش کے لیے کام آتی ہے۔) مگر ہر تصویر میں چترا کے چہرے پر ایک اُمید بھری مسکراہٹ تھی، جیسے وہ زبان سے

کہہ رہی ہو' تم اچھے ہو جاؤ گے۔ ذرا محنت اور صبر سے کام لو۔'

سب سے اچھی تصویر جو دیویندر کو بہت زیادہ پسند آئی، اس میں چترا ایک بچے کو ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھا رہی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا: 'پہلا قدم' مگر چترا کے چہرے پر نورانی ممتا کا بے پناہ نکھار تھا، جسے آرٹسٹ نے اپنے برش کی لکیروں اور رنگوں کے انتخاب سے اور اپنی محبت سے پکڑ میں لے لیا تھا۔

'یہ سب سے خوبصورت ہے۔' دیویندر نے اعلان کیا۔ 'مگر اس کا نام غلط ہے۔ اس کا نام ہونا چاہیے 'ماں'۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تصویر میں آپ نے ساری دنیا کی ماؤں کی ممتا کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔'

انل نے کہا: 'تم جانتے ہو میں چترا کے کام کو کیا کہتا ہوں RE-EDUCATION (دوبارہ تعلیم دینا) فرانس میں PHYSIO- THERAPY کو جسم کے اعضا کو دوبارہ تعلیم دینا کہتے ہیں۔'

'انسانوں کو دوبارہ تعلیم دینا کیوں نہیں؟' دیویندر نے سوال کیا۔

'خود مجھے مسز بھاگوت نے دوبارہ تعلیم دی ہے، ہر معنی میں تعلیم دی ہے۔'

اب انل نے چترا کو اشارا کیا۔ اس نے وہ پینٹنگ انل کو ویل چیئر پر دے دی۔ انل نے قمیض کی جیب سے ایک اسکیچنگ پین نکالا اور تصویر کے پیچھے کچھ لکھ دیا اور تصویر دیویندر کو دے دی۔

'مگر میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کوئی پینٹنگ بیچنا نہیں چاہتے؟'

'اب بھی نہیں بیچنا چاہتا۔ مگر تحفہ تو دے سکتا ہوں اپنے دوست کو۔'

اب دیویندر نے وہ تحریر پڑھی جو انل نے تصویر کے پیچھے لکھی تھی۔

'اپنے نئے دوست دیویندر کے لیے، اس لیے کہ ہم دونوں ایک ہی ڈاکٹر کے روگی ہیں: انل۔'

اچانک دیویندر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اتنی دوستی، اتنی محبت اسے زندگی میں کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

'تھینک یو، مسٹر بھاگوت۔'

انل نے بناوٹی غصے سے دیویندر کو دیکھا۔

معاف کرنا، بھول ہوگئی۔ میرا مطلب تھا، تھینک یو انل۔'

'ہاں یہ بہتر ہے۔' انل نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

مگر چترا نے صرف ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس اب ایک یاد بن کر رہ گیا تھا۔

جب دیویندر اسپتال واپس پہنچا تو وہاں اس کے لیے دو موٹریں انتظار کر رہی تھیں۔ ایک اس کے گھر سے آئی تھی اور ڈیا نے بھیجی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک پرچا بھی بھیجا تھا۔ 'ڈارلنگ، بچّے کی وجہ سے میں اتنے سویرے نہیں آسکی۔ معاف کرنا، سیدھے گھر چلے آنا۔ اپنی گرل فرینڈ سے ملنا ہے تو شام کو مل لینا۔'

دوسری موٹر رادھا کے گھر سے آئی تھی۔ اس کا ڈرائیور بڑے بھروسے کے ساتھ آگے بڑھا اور موٹر کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

'نہیں فرنانڈیس، رادھا میم صاحب سے کہنا، میں گھر جا رہا ہوں۔'

پھر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ایک تصویر کو کلیجے سے لگائے ہوئے، جسے خاکی کاغذ میں دو سانولے ہاتھوں نے بڑے سلیقے سے پیک کیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ اپنے ڈرائنگ روم کی دیوار پر وہ تصویر لگا رہا تھا تو شرارت بھری نظروں سے ڈیا نے اسے دیکھا اور کہا۔ 'تم تو اپنی PHYSIO-THERAPIST کو گھر ہی لے آئے۔'

'ڈارلنگ'، اس نے محبت سے ڈیا کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ 'گھر تو یہ اب ہوگا۔ صرف اس کی وجہ سے، جس نے تمھارے آوارہ شوہر کو دوبارہ تعلیم دی ہے، RE- EDUCATE کیا ہے، انسان بنایا ہے۔'

○

# چاکلیٹ اور وقت

جہانگیر آرٹ گیلری میں آج بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ آرٹسٹ سدھیر جس کی تصویروں کی نمائش تھی۔ کتنے ہی برسوں تک یورپ اور امریکہ اور جنوب مغربی ایشیا کے ملکوں میں گھومنے کے بعد ہندوستان لوٹا تھا۔ ان سب ملکوں میں اس کا بڑا نام ہوا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں نیویارک اور لندن اور پیرس اور برلن اور ماسکو کی آرٹ گیلریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے ہالی وڈ میری لن منرو کی تصویر پینٹ کی تھی اس کے مرنے سے چند ہفتے پہلے۔ اور روم میں خاص اجازت حاصل کر کے اس نے پوپ کی تاجپوشی کے موقع پر عیسائیت کے سب سے بڑے روحانی پیشوا کی تصویر بنائی تھی۔ اور وہ جو اس کی شہرت سے جلتے تھے اور اس کی جدید طرز مصوری کے قائل نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ان تصویروں پر ان کے نام کے لیبل نہ لگے ہوں تو یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی تصویر پوپ کی ہے اور کون سی میری لن منرو کی۔

مگر سدھیر نے ایک اخبار کے رپورٹر کے ساتھ انٹرویو کے دوران میں کہا تھا کہ آرٹ حساب کا سوال نہیں ہے، الجبرے کا فارمولا نہیں ہے، جیومٹری کی ڈرائنگ نہیں ہے کہ اس کو بندھے ہوئے پیمانوں سے ناپا جا سکے۔ نہ ہی پینٹر کا کام فوٹوگرافی کرنا ہے کہ اصل میں اس کی تصویر میں مشابہت پیدا کرنا ضروری ہو۔ اس نے یہ بھی کہا تھا وہ جنھوں نے جاپانی زبان نہیں

پڑھی وہ جاپانی ادب کے بارے میں رائے نہیں دے سکتے اور جو آرٹ کی تاریخ اور تکنیک سے ناواقف ہیں وہ آرٹ کے بارے میں رائے زنی نہ کریں تو بہتر ہے۔ اس انٹرویو نے شہر کے آرٹسٹک حلقوں میں بڑی کھلبلی مچادی تھی اور سدھیر کے ان فنی مفروضوں پر بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ بعض لوگ اسے ''ڈھونگی'' اور ''خود ساختہ جینیس'' کہہ کر لتھاڑ رہے تھے۔ مگر ایسے بھی بہت سے تھے جو اس کے خیالات سے متفق تھے اور اسے آرٹ کی دنیا میں اپنا رہبر اور پیش رو ماننے کو تیار تھے۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔ خصوصاً جب کہ آرٹ گیلری کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوں۔ کالی ٹوپی والا جو شاید سیدھا سٹے بازار سے آیا تھا۔ ایک تصویر کو گھورتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

''گلابی بچھڑا؟ ارے واہ۔ بچھڑا بھی کبھی گلابی ہوا ہے۔''

اس کے ساتھی نے کہا۔ ''آرٹسٹ کی تخیل میں بچھڑا گلابی بھی ہو سکتا ہے اور پیلا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ آرٹسٹ نے کتنے پیگ پی کر تصویر بنائی ہے۔''

''اور قیمت تو دیکھو؟ سٹے بازار والے نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا: ساڑھے تین سو روپے، پچاس ساٹھ روپے میں تو سچ مچ بچھڑا خریدا جا سکتا ہے۔''

لمبی ناک پر ایک موٹے شیشے کی عینک لگائے ہوئے ایک آدمی نے ان کی باتوں میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر سچ کا بچھڑا ایک دن مر جائے گا۔ شاید قصائی کی چھری کے نیچے آجائے گا مگر یہ گلابی بچھڑا جو بچپن کی آزادی اور بے فکری کا SYMBOL ہے۔ ہمیشہ اس تصویر میں اسی طرح کلیلیں بھرتا رہے گا۔''

ایک نوجوان تصویر کو ہر زاویے سے دیکھنے کے بعد تعجب سے بولا۔ ''مگر گھنٹیاں کہاں ہیں؟ مجھے تو ایک گھنٹی بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔''

اس کے برابر کھڑے ہوئے ایک لمبے بالوں والے شاعر صورت آدمی نے کہا۔ ''یہ مندر کی گھنٹیاں نہیں ہیں، مندر کی گھنٹیوں کی آواز ہے۔'' پھر اس نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے سمجھایا۔ ''یہ دیکھو تصویر میں رنگوں کے دائرے مرکز سے باہر کی طرف جا رہے ہیں۔ جیسے گھنٹیوں

کی آواز پھیلتی جاتی ہے۔ مگر یہ دائرے الگ الگ باقاعدہ نہیں ہیں۔ ایک دوسرے سے گڈمڈ ہوتے ہوئے پھیلتے جا رہے ہیں کیونکہ گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ اس کی گونج بھی ہے۔ اب رنگوں پر غور کرو۔ یہ تانبے سا رنگ جو ہے اس کا مطلب ہے......''

نمائش میں سب سے زیادہ بھیڑ ایک قد آدم تصویر کے سامنے تھی جس پر لیبل لگا ہوا تھا۔ ''یہ تصویر بکاؤ نہیں ہے۔'' تصویر کا عنوان تھا۔ ''سنگھار''

سدھیر کی دوسری تصویریں اگر مصوری کے جدید یوروپین طرز کی نمائندگی کر رہی تھیں تو یہ تصویر ہندوستان کے کلاسیکل انداز میں بنی ہوئی تھی اور چاروں طرف پھیلی ہوئی ''امپریشنسٹ'' اور ''سوریلی'' تصویروں میں ایسی لگتی تھی جیسے موسٹ'' یا ''جیز'' موسیقی کے ہنگامے میں کسی نے بانسری پر ہلکے سے بھیروں کی تان چھیڑ دی ہو۔ ایک دبلی سی، نازک، پیلے گلاب جیسی رنگت کی لڑکی جو لال کنی کی سفید ساڑھی پہنے کندھے پر ایک پیلا تولیہ ڈالے ابھی نہا کر نکلی ہے اس کے لمبے گھنے چمکیلے سیاہ بالوں میں پانی کی بوندیں موتیوں کی طرح ٹنکی ہوئی ہیں۔ گیلا بدن تنگ چولی میں سے پھٹا پڑ رہا ہے اور ساڑھی کے درمیان نیلی کمر آن ڈھکی ہے اور پتلی ململ کی ساڑھی میں لپٹی ہوئی لمبی سڈول ٹانگیں دکھائی نہیں دے رہیں، محسوس کی جا سکتی ہیں۔ پیلے کتابی چہرے پر گیلے بالوں کی ایک لٹ آ گئی ہے جس کو وہ لڑکی کنگھے سے ابھی ہٹانے والی ہے ہٹا نہیں پائی کیونکہ اس نے جیسے ہی اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے کے لیے نظر اٹھائی۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گئی ہے جیسے زندگی پہلی بار اسے اچانک اپنے حُسن کا احساس ہو گیا ہے۔ اور بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی دھیمی سی مسکراہٹ کھل گئی اور اب حسن کی خود آرائی کا یہ لمحہ اس تصویر میں ہمیشہ کے لیے منجمد ہو گیا تھا جیسے کسی کی یاد کو کوئی اپنے دل میں عمر بھر ''قیدی ہی تو ہے، سدھیر نے دور کونے میں کھڑے ہوئے اپنی ہی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھتے ہوئے سوچا ''مینا نہیں جانتی مگر عمر بھر سے میں نے اسے اس تصویر میں اور اپنے دل میں قید کر رکھا ہے۔''

جب کبھی بھی اس کی تصویروں کی نمائش ہوتی تھی۔ سدھیر کا معمول تھا کہ وہ الگ کسی کونے میں اکیلا کھڑا ہوا چپکے چپکے لوگوں کی باتیں سنتا رہے، اپنے اور اپنے آرٹ کے بارے میں۔ اس طرح اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے فن کے بارے میں لوگوں کی سچی اور بے لاگ تنقید حاصل کر سکتا

ہے جو اخباروں کے پیشہ ور نقادوں کے لمبے لمبے مضامین میں اسے مشکل سے ملتی تھی۔

''سنگھار'' کو دیکھتے ہی آرٹ اسکول کا ایک نوجوان بے اختیار بول اٹھا۔ ''اُف کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔ آرٹ سے پتہ پوچھ کر اس موڈل سے ملنا چاہیے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''یہ بات موڈل میں کہاں ہوتی ہے یار۔ یہ ضرور سدھیر کی معشوقہ ہے۔''

اور دور کھڑے ہوئے ان کی یہ باتیں سن کر سدھیر مسکرا دیا اور اس نے سوچا۔ ''مینا کشی یہ سن لے تو کتنی بگڑے ہے۔''

اور اب نوجوان تصویر کو غور سے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ دوسری سب تصویریں تو ماڈل اسکول کی ہیں مگر یہ تصویر بڑی رومانٹک اور کلاسیکل انداز کی ہے۔''

اس کے ساتھی نے کہا۔ ''یہ بڑی پرانی تصویر ہے سدھیر نے جوانی کے زمانے کی۔ شاید ابھی کالج ہی میں پڑھتا تھا۔ اس وقت اس کا اسٹال MATURE نہیں ہوا تھا۔ دراصل اس تصویر میں فنی اعتبار سے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ورما کے کیلنڈروں جیسی سیدھی سادھی تصویر ہے۔''

''مگر پھر بھی اس تصویر کے سامنے اتنی بھیڑ کیوں رہتی ہے؟ ہر ایک کا جی کیوں چاہتا ہے کہ بس اس تصویر کو ہی دیکھتا رہے؟''

''اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ لونڈیا خوبصورت ہے۔''

''یہی کافی نہیں ہے، دوست۔ آرٹسٹ نے بڑے پیار سے یہ تصویر بنائی ہے۔ وہ ضرور اس لڑکی سے محبت کرتا ہوگا۔''

''اور اب ہر دیکھنے والا اس تصویر میں اپنی معشوقہ کو اور اپنی محبت کے زمانے کو دیکھتا ہے۔''

''تو بس یہی آرٹ کی کامیابی ہے کہ آرٹسٹ اپنے دل کا جذبہ دیکھنے والوں کے دل میں پیدا کر دے۔''

اچھا اب اس تصویر کو کافی دیکھ لیا۔ چلو تمھیں ایک سچ مچ کا شاہکار دکھاؤں۔ مندر کی گھنٹیوں کی آواز......۔

مندر کی گھنٹیوں کی آواز......

گھنٹیوں کی آواز............

سدھیر کی یاد میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ مندر کی گھنٹیاں۔ اور ان کے لال پیلے نیلے صوتی دائرے گھومتے گھومتے پھیلتے جا رہے تھے۔

سدھیر بچپن کے سوا شاید ہی کبھی مندر میں گیا ہوا ہو مگر مندر کی گھنٹیوں کی آواز اس کے لاشعور میں رچی ہوئی تھی۔ یہ مندر بینا کشی کے گھر کے پاس تھا۔

وہ آرٹ اسکول کا ایک غریب طالب علم تھا جو ڈرائنگ کی ٹیوشنیں کر کے کالج کی فیس دیتا تھا۔ بینا کشی ایک امیر باپ کی بیٹی تھی۔

ہر شام کو جب وہ بینا کشی کو ڈرائنگ سکھانے جاتا تھا تو مندر میں آرتی کی گھنٹیاں بجتی ہوتی تھیں۔ دن بھر سدھیر اس لڑکی کا انتظار کرتا تھا۔ شاید بینا کشی بھی انتظار کرتی تھی۔

باہر مندر کی گھنٹیاں بجتی ہوتیں اور اس کے اندر پہنچتے ہی بینا کشی ساڑھی کا پلو الھڑپن سے سنبھالتی۔ ڈرائنگ کی تصویر لیے دوڑتی آتی اور وہ کہتا۔ "کیوں بینا کشی ڈرائنگ تیار کر لی؟" اور وہ کہتی۔ "ہاں ماسٹر جی۔ مگر دکھاؤں گی نہیں۔" "چلیے میری چاکلیٹ نکالیے۔" اور وہ جیب سے چاکلیٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے ہنس کر کہتا۔ "یہ رہی تمھاری چاکلیٹ مگر کم دیا کرو نہیں تو موٹی ہو جاؤں گی۔" اور پھر وہ ہنس پڑتی اور چاکلیٹ کے اوپر کا کاغذ اتارنا شروع کر دیتی اور سدھیر اسے ڈرائنگ سکھاتا رہتا اور کاغذ پر نقش بنتے رہتے اور سدھیر کا دل دھڑکتا رہتا اور بینا کشی چاکلیٹ کھاتی رہتی۔

اور پھر جب مندر میں آرتی ختم ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ پڑھائی کا ایک گھنٹہ پورا ہو گیا ہے اور اب بینا کشی کی امی جی اسے کھانے کے لیے آواز دیں گی اور گھنٹیوں کی آواز بند ہونے کے بعد اس سناٹے میں سدھیر کو ڈر لگتا کہ کہیں اس کے دل کی دھڑکن نہ سن لے اور سو وہ اٹھ کھڑا ہو جاتا اور کہتا۔ "اچھا بینا کشی اب میں کل آؤں گا۔ تم ڈرائنگ کی تیاری کر کے رکھنا۔" اور وہ کہتی۔ "اچھا ماسٹر جی مگر میری چاکلیٹ لانی نہ بھولیے گا۔"

مگر اس آخری شام کو وہ دس دن کے بعد بینا کشی سے ملنے جا رہا تھا۔ دس دن اور دس رات میں اس نے "سنگھار" میں کیا تھا۔ آج وہ چاہتا تھا کہ بینا کشی سے کہے کہ چلو میں تمھیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں اور اس کو یقین تھا کہ ایک بار وہ اس تصویر کو دیکھے گی تو اس کو پورا اندازہ ہو جائے

گا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے کیونکہ اس تصویر میں ان کا فن ہی نہیں تھا۔ میناکشی کا حسن ہی نہیں تھا وہ محبت بھی تھی جو وہ میناکشی سے کرتا تھا مگر جس کا اظہار آج تک نہیں کر سکا تھا۔ آج اس نے سوچا تھا یہ تصویر میری طرف سے اعلان محبت کرے گی مگر اسے میناکشی کو وہ تصویر دکھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

مندر میں حسب معمول آرتی ہو رہی تھی جب وہ میناکشی کے گھر پہنچا۔ اس کے چہرے پر داڑھی بڑی ہوئی تھی، دس کو جاگ کر اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

''سدھیر کیا ہے تمھیں؟'' میناکشی کے باپ نے پوچھا تھا۔ ''بیمار ہو گیا؟ کتنے دن سے آئے نہیں؟''

''جی نہیں ٹھیک ہوں۔ ایک کام میں لگا ہوا تھا۔ میناکشی کہاں ہے؟ آج ڈرائنگ نہیں سیکھے گی۔''

''نہیں سدھیر اب اس کے پڑھنے لکھنے کے دن ختم ہوئے۔' میناکشی کی ماں نے مٹھائی کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''مٹھائی کھاؤ۔ آج میناکشی کی سگائی ہوئی ہے۔ لڑکا.....''

اور دفعتاً مندر کی گھنٹیاں اس کے کانوں میں اتنے زور سے گونج اٹھی تھیں کہ وہ اور کچھ نہ سن پایا تھا۔ لڑکا کون ہے۔ کیا کرتا ہے۔ شادی کب ہے؟ ماں جی نے شاید سب کچھ بتایا تھا مگر سدھیر کے کانوں میں صرف مندر کی گھنٹیاں گونجتی رہی تھیں۔

پھر وہ آخری بار میناکشی سے ملا تھا اور میناکشی نے حسب معمول اس سے کہا تھا۔ ''میرے لیے چاکلیٹ نہیں لائے ماسٹر جی؟'' اور اس نے جیب سے چاکلیٹ نکال کر حسب معمول جواب دیا تھا۔ ''یہ رہی تمھاری چاکلیٹ مگر کم کھایا کرو نہیں تو موٹی ہو جاؤ گی۔'' مگر یہ کہتے ہوئے آج اس کے ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔

اس دن جب وہ آخری بار میناکشی کے گھر سے نکلا تو ابھی آرتی جاری تھی اور مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

اور اس دن سے ان گھنٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

وہ لکھنؤ چھوڑ کر دہلی چلا آیا مگر وہ گھنٹیاں اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ اخبار میں پڑھا کہ رائے بہادر ماتا پرشاد کی سپتری مینا کشی کا بیاہ مسٹر لکشمی کانت آئی۔سی۔ایس جائنٹ مجسٹریٹ کانپور سے ہو گیا ہے۔

دہلی سے وہ بمبئی آ گیا۔ کئی برس وہ کلاسیکل مصوری اور سنگ تراشی کی کھوج میں اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں کھویا رہا اور وہاں بھی وہ گھنٹیاں اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔

ایک بار ہندوستان واپس آیا اور بمبئی میں ٹھہرا تو اخبار میں پڑھا کہ لکشمی کانت اب کسی سرکاری عہدے پر بمبئی میں تعینات ہے۔ ایک دن کسی نے اُسے ڈنر پر بلایا اور مہمانوں کی فہرست بتائی تو کہا۔ ''مسٹر اور مسز لکشمی کانت بھی ہوں گے۔ ان سے مل کر تم ضرور خوش ہوں گے۔ وہ لوگ بھی تمھاری ہی طرف کے رہنے والے ہیں۔'' اور اس بار تو مندر کی گھنٹیاں اتنے زور سے گونجیں کہ سدھیر کے کان جھنجھنا اٹھے۔ اس نے بیماری کا بہانہ کر کے اس دعوت کو چھٹکارا پایا اور اگلے ہفتے ہی انگلستان چلا گیا۔

اس بار اس نے سوچا کہ مینا کشی کو بھلانے کے لیے کسی اور سے دل لگا لے۔ اب اس کے پاس پیسہ تھا۔ آرٹ کی دنیا میں اس کا نام تھا۔ کتنی ہی خوبصورت اور معقول لڑکیوں سے اس کی جان پہچان تھی۔ اس نے ان میں سے ایک سے دوستی بڑھائی۔ میری مارشاں ایک حسین فرانسیسی لڑکی تھی جو انگریزی پڑھنے لندن آئی ہوئی تھی۔ ایک دن سدھیر اسے اپنے سٹوڈیو میں لے گیا جہاں وہ ایک ABSTRACT تصویر کے بہت بڑے کینوس پر کام کر رہا تھا۔ میری نے سٹوڈیو میں لگی ہوئی سب تصویروں کو دیکھنے کے بعد کہا۔ ''یہ سب تو جدید یوروپین آرٹ ہے۔ کیا تم نے کوئی تصویر پرانے کلاسیکل ہندوستانی انداز کی نہیں بنائی۔''

سدھیر نے کہا۔ ''ہاں بنائی تھیں مگر وہ سب تصویریں بیکار سمجھ کر میں ہندوستان چھوڑ آیا ہوں مگر اس زمانے کی ایک تصویر ہے میرے پاس۔''

اور سو اس نے میری کو سنگھار دکھائی تھی۔ میری بڑی دیر تک بڑے غور سے بڑی سنجیدگی سے اس تصویر کو دیکھتی رہی، پھر چپکے سے اٹھ کر چلی گئی اور اس رات کو اس نے سدھیر کو خط لکھا۔ ''میں اس حسین ہندوستانی لڑکی کی یاد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ تصویر پکار پکار کر کہہ رہی ہے تم اس

سے اور صرف اس سے محبت کرتے ہو۔ تم اور کسی سے محبت نہیں کر سکو گے۔"

لندن سے اُکتا کر سدھیر نیویارک گیا۔ وہاں بھی اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نقادوں اس کی تصویروں کی بہت تعریف کی۔ کتنی ہی تصویریں بڑی بڑی قیمتوں پر بک گئیں۔ اس: سدھیر کو کسی قسم کی مالی پریشانی نہیں تھی مگر اس کے دل میں ایک بے چینی تھی اور پاؤں میں اَ: چکر تھا اور اس کے کانوں میں اب بھی مندر کی گھنٹیوں کی گونج تھی اور سو اس نے اپنے کانوں اس مستقل گونج کو کینوس پر رنگین دائروں میں منتقل کر دیا تھا اور اس کی بنائی ہوئی پینٹنگ مندر گھنٹیوں کی آواز" نے آرٹ کی دنیا میں ایک سنسنی پھیلا دی تھی اور ایک نقاد نے تو یہاں تک لا تھا کہ "اس تصویر سے فن مصوری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔"

پھر وہ سارے امریکہ میں گھوما تھا۔ کینیڈا سے لے کر میکسیکو تک میکسیکو کی دھوپ اور گر میں اسے ہندوستان یاد آئی تھی اور وہاں کے آرٹ نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اور وہ دو برس تک میکسیکو کے گاؤں اور وہاں کے کالے دلوں والی حسین عورتوں اور وہاں کے "بل فائٹ" کے خوز کھیل کی تصویریں بناتا رہا تھا۔ پھر وہ میکسیکو سے بھی اکتا گیا تھا اور سوچتا گھومتا گھامتا ہالی وڈ پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات سب سے مشہور اور خوب صورت فلم سٹاروں سے ہوئی تھی۔ میری لن منرو دیکھتے ہی اس نے کہا تھا۔ "مس منرو میں آپ کی تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ میری لن نے کہا تھا۔ "کیا آپ بھی میرے ننگے بدن کو آرٹ کی سولی پر چڑھانا چاہتے ہیں؟" اور اس نے جواب دیا تھا۔ "مجھے آپ کے بدن میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں آپ کی زخمی روح کو کینوس پر اتارنا چاہتا ہوں جو مجھے آپ کی خاموش آنکھوں میں چلاتی ہوئی نظر آتی ہے" اور اس نے ایک سفید سے گاؤن میں میری لن کی تصویر بنائی تھی جس میں اس کا مشہور عالم بدن گاؤن کی لہراتی ہوئی سلوٹوں میں گھلا ہوا تھا اور اس کے سنہری بال شعلوں کی طرح اس کے چہرے کے گرد ایک آتشیں ہالہ بنائے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں درد تھا اور شرم تھی اور دنیا کی سفاکی کے خلاف احتجاج تھا۔ اس تصویر میں اور میری لن کی اپنی شکل میں کوئی مشابہت نہیں تھی۔ اعتراض کرنے والوں نے کہا تھا یہ میری لن منرو کی تصویر نہیں کسی فرشتے کی تصویر معلوم ہوتی ہے اور سدھیر نے جواب دیا تھا کہ بیشک یہ ایک فرشتے کی تصویر ہے۔ ایک فرشتہ جسے ہوس کی سولی پر

چڑھا دیا گیا ہے۔''

اور پھر فرشتے نے سچ مچ سولی پر جان دے دی تھی۔ میری لن کی موت کا سدھیر کو اتنا غم ہوا کہ وہ کئی دن تک دروازہ بند کیے ہوئے شراب پیتا رہا اور شاید پیتے پیتے وہ بھی جان دے دیتا اگر اس وقت لوسی لاقوش اس سے انٹرویو کرنے نہ آئی ہوتی۔

لوسی لاس اینجلز کے ایک روزانہ اخبار کی آرٹ رپورٹر تھی۔ وہ سدھیر سے میری لن منرو کے بارے میں انٹرویو کرنے گئی تھی لیکن جب اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کوئی جواب نہیں ملا۔ حالانکہ ہوٹل کے دفتر میں اسے بتایا گیا تھا کہ سدھیر اپنے کمرے میں ہی ہے) تو اس نے دھیرے سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اندر جا کر لوسی نے دیکھا کہ ہندوستانی آرٹسٹ نشے میں بے سدھ پڑا ہے اور پاس ہی وہسکی کی کئی خالی بوتلیں پڑی ہیں۔ اور جب سدھیر کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سرہانے سفید فراک پہنے ایک خوبصورت لڑکی کو بیٹھا دیکھا۔

''تم کون ہو؟'' اس نے نیم بیہوشی میں پوچھا۔ ''جنت کی کوئی حور ہو یا ہسپتال کی نرس ہو؟''

اور لوسی نے مسکرا کر اپنا ہاتھ سدھیر کے ماتھے پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نہ حور ہوں نہ نرس۔ ایک رپورٹر ہوں۔''

اور اس دن سے ان کی دوستی ہو گئی تھی۔ اور اس بار سدھیر کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اسے واقعی وہ رفیقۂ حیات مل گئی ہے جس کی اسے عمر بھر سے تلاش تھی۔ لوسی خوبصورت تھی، تعلیم یافتہ اور ذہین تھی، سدھیر کے آرٹ کی دلدادہ تھی اور پہلے دن ہی سے سدھیر کو چاہنے لگی تھی۔ وہ اکثر کہتی۔ ''سدھیر تم ایک بڑے آرٹسٹ بے شک ہوں گے مگر ویسے تم بالکل بچے ہو۔ تمھیں اپنی دیکھ بھال کے لیے کسی کی ضرورت ہے۔''

اور سدھیر نے لوسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیرے سے کہا تھا۔ ''مجھے تمھاری ضرورت ہے۔''

ایک طویل بوسے نے ان کے پیمان محبت پر مہر لگا دی تھی۔ دو بدن ایک دوسرے میں گھل کر ایک ہو گئے تھے اور سدھیر کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ کسی نے اس کی روح کے گھاؤ پر پیار کا پھاہا رکھ دیا ہے۔

مگر جتنی تیزی سے یہ محبت پروان چڑھی تھی اسی تیزی سے اس کا بخار اتر گیا۔

ایک دن سدھیر لوسی کو اپنے اسٹوڈیو میں چھوڑ کر بازار کینوس اور پینٹ خریدنے جا رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔ ڈارلنگ تمھیں کچھ چاہیے تو بتاؤ۔ دکان سے لیتا آؤں۔''

''تو پھر میرے لیے کچھ چاکلیٹ لے آنا۔''

چاکلیٹ!

''اچھا ماسٹر جی میری چاکلیٹ لانی نہ بھولیے گا۔''

چاکلیٹ!

''میرے لیے چاکلیٹ نہیں لائے، ماسٹر جی۔''

اور اس کے کانوں میں ایک بار پھر مندر کی گھنٹیاں گونج اٹھی تھیں اور اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا کہ لوسی کیا کہہ رہی ہے۔

''ڈارلنگ! سدھیر ڈارلنگ! کیا ہوا تمھیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

اور پھر اس نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سنا تھا۔ ''میں ٹھیک ہوں لوسی۔ مگر میں تمھارے لیے چاکلیٹ نہیں لا سکتا۔''

''چاکلیٹ نہیں لا سکتے؟ مگر کیوں!!

یہ میں نہیں بتا سکتا۔''

اور یوں زندگی کی کتاب کا وہ ورق بھی الٹ دیا گیا تھا۔ سدھیر امریکہ سے یوروپ آ گیا تھا۔ برلن، روم، پیرس ہوتا لندن آیا تو ایک دن انڈیا ہاؤس میں ہندوستانی اخباروں کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس نے یہ خبر پڑھی۔

''بمبئی! کل رات کو دفعتاً دل کی حرکت بند ہو جانے سے مسٹر لکشمی کانت ینیجنگ ڈائرکٹر نیو انڈیا ملز کا انتقال ہو گیا۔ ریٹائر ہونے سے پہلے مرحوم آئی۔ سی۔ ایس۔ میں تھے لیکن تین برس سے وہ بمبئی کی نیو انڈیا ملز کے مینجنگ ڈائرکٹر تھے۔ انتقال کے وقت مسز بینا لکشمی لکشمی کانت بمبئی کی مشہور سوشل ورکر اپنے شوہر کے پاس تھیں......''

اب سدھیر بمبئی لوٹ آیا تھا اور کتنے ہی برس کے بعد آج پھر اس کی تصویروں کی نمائش

بمبئی میں ہو رہی تھی۔ نمائش کی افتتاح کے لیے سینکڑوں دعوت نامے شہر کی سرآوردہ ہستیوں کو بھیجے گئے تھے۔ منسٹر۔ ایڈیٹر۔ ادیب۔ آرٹسٹ۔ سوشل سب ہی بلائے گئے تھے۔ سب ہی آئے تھے۔ لیکن ایک دعوت نامہ مسز میناکشی لکشمی کانت کو بھی بھیجا گیا تھا اور ساری شام سدھیر ایک کونے میں کھڑا دھڑکتے ہوئے دل سے اس کا انتظار کرتا رہا تھا اور اب جب کہ رات گئے نمائش ختم ہونے کا وقت ہو گیا تھا اور ایک ایک کر کے سب لوگ رخصت ہو گئے تھے سدھیر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ساری شام ہی نہیں ساری زندگی انتظار کرتا رہا ہے......

اور پھر آرٹ گیلری کے دربان نے آ کر کہا تھا۔ صاحب گیلری بند کرنے کا ٹائم تو ہو گیا ہے مگر ایک میم صاحب ابھی کہیے تو انھیں آنے دوں......"

"کہہ دو اب دیر ہو گئی...... مگر ٹھہرو نام کیا ہے؟"

"نام تو بولا نہیں صاحب۔ مگر یہ ان کا کارڈ ہے......"

سدھیر نے کارڈ پر لکھا ہوا نام پڑھا اور اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ "ہاں آنے دو" اس نے دربان سے کہا اور ایک اندھیرے کونے کی طرف کھسک گیا۔ اس کے کانوں میں مندر کی گھنٹیوں کی آواز گونج اٹھی۔

دروازہ کھلا۔ پہلے دربان داخل ہوا۔ پھر......

پھر ٹائل کے فرش پر اونچی ایڑی کے سینڈل کی آواز آئی اور پھر سدھیر کے کانوں میں مندر کی گھنٹیوں کی آواز یکلخت ہو گئی۔

ریشمی ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک موٹی عورت اپنے سینڈل کی بہت اونچی ایڑیوں پر ڈگمگاتی داخل ہوئی اور اس کے اوپر ہی ایک تیز خوشبو کا بھپکا آیا۔ بغیر آستینوں کی چولی میں سے اس کی موٹی موٹی بانہیں نکلی ہوئی تھیں ٹھوڑی کے نیچے لٹکے ہوئے گوشت نے ایک اور ٹھوڑی بنا دی تھی۔ آنکھیں اس کے چہرے کے موٹاپے کی تہوں میں چھپ گئی تھیں۔ اس کے لٹکے ہوئے بال خضاب سے کالے کیے ہوئے تھے اور اس کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں میں ایک لمبا ہاتھی دانت کا سیٹ ہولڈر تھا۔

یہ کون ہے سدھیر نے دل ہی میں سوچا۔ کیا یہ میناکشی ہو سکتی ہے؟ میری میناکشی؟ نہیں۔ کبھی نہیں۔

سے اور صرف اس سے محبت کرتے ہو۔ تم اور کسی سے محبت نہیں کر سکو گے۔''

لندن سے اُکتا کر سدھیر نیویارک گیا۔ وہاں بھی اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نقادوں نے اس کی تصویروں کی بہت تعریف کی۔ کتنی ہی تصویریں بڑی بڑی قیمتوں پر بک گئیں۔ اس میں سدھیر کو کسی قسم کی مالی پریشانی نہیں تھی مگر اس کے دل میں ایک بے چینی تھی اور پاؤں میں ایک چکر تھا اور اس کے کانوں میں اب بھی مندر کی گھنٹیوں کی گونج تھی اور سو اس نے اپنے کانوں کی اس مستقل گونج کو کینوس پر رنگین دائروں میں منتقل کر دیا تھا اور اس کی بنائی ہوئی پینٹنگ مندر کی گھنٹیوں کی آواز'' نے آرٹ کی دنیا میں ایک سنسنی پھیلا دی تھی اور ایک نقاد نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ ''اس تصویر سے فنِ مصوری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔''

پھر وہ سارے امریکہ میں گھوما تھا۔ کینیڈا سے لے کر میکسیکو تک۔ میکسیکو کی دھوپ اور گرد میں اسے ہندوستان یاد آئی تھی اور وہاں کے آرٹ نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اور وہ دو برس تک میکسیکو کے گاؤں اور وہاں کے کالے دلوں والی حسین عورتوں اور وہاں کے ''بل فائٹ'' کے خونی کھیل کی تصویریں بناتا رہا تھا۔ پھر وہ میکسیکو سے بھی اکتا گیا تھا اور سوچتا گھومتا گھامتا ہالی وڈ پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات سب سے مشہور اور خوب صورت فلم سٹاروں سے ہوئی تھی۔ میری لن منرو دیکھتے ہی اس نے کہا تھا۔'' مس منرو میں آپ کی تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ میری لن نے کہا تھا۔ ''کیا آپ بھی میرے ننگے بدن کو آرٹ کی سولی پر چڑھانا چاہتے ہیں؟'' اور اس نے جواب دیا تھا۔ ''مجھے آپ کے بدن میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں آپ کی زخمی روح کو کینوس پر اتارنا چاہتا ہوں جو مجھے آپ کی خاموش آنکھوں میں چلاتی ہوئی نظر آتی ہے'' اور اس نے ایک سفید سے گاؤن میں میری لن کی تصویر بنائی تھی جس میں اس کا مشہورِ عالم بدن گاؤن کی لہراتی ہوئی سلوٹوں میں گھلا ہوا تھا اور اس کے سنہری بال شعلوں کی طرح اس کے چہرے کے گرد ایک آتشیں ہالہ بنائے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں درد تھا اور شرم تھی اور دنیا کی سفاکی کے خلاف احتجاج تھا۔ اس تصویر میں اور میری لن کی اپنی شکل میں کوئی مشابہت نہیں تھی۔ اعتراض کرنے والوں نے کہا تھا یہ میری لن منرو کی تصویر نہیں کسی فرشتے کی تصویر معلوم ہوتی ہے اور سدھیر نے جواب دیا تھا کہ بیشک یہ ایک فرشتے کی تصویر ہے۔ ایک فرشتہ جسے ہوس کی سولی پر

چڑھا دیا گیا ہے۔''

اور پھر فرشتے نے سچ مچ سولی پر جان دے دی تھی۔ میری لن کی موت کا سدھیر کو اتنا غم ہوا کہ وہ کئی دن تک دروازہ بند کیے ہوئے شراب پیتا رہا اور شاید پیتے پیتے وہ بھی جان دے دیتا اگر اس وقت لوسی لاتوش اس سے انٹرویو کرنے نہ آئی ہوتی۔

لوسی لاس اینجلز کے ایک روزنامہ اخبار کی آرٹ رپورٹر تھی۔ وہ سدھیر سے میری لن منرو کے بارے میں انٹرویو کرنے گئی تھی لیکن جب اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کوئی جواب نہیں ملا۔ حالانکہ ہوٹل کے دفتر میں اسے بتایا گیا تھا کہ سدھیر اپنے کمرے میں ہی ہے) تو اس نے دھیرے سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اندر جا کر لوسی نے دیکھا کہ ہندوستانی آرٹسٹ نشے میں بے سدھ پڑا ہے اور پاس ہی وہسکی کی کئی خالی بوتلیں پڑی ہیں۔ اور جب سدھیر کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سرہانے سفید فراک پہنے ایک خوبصورت لڑکی کو بیٹھا دیکھا۔

''تم کون ہو؟'' اس نے نیم بیہوشی میں پوچھا۔'' جنت کی کوئی حور ہو یا ہسپتال کی نرس ہو؟''

اور لوسی نے مسکرا کر اپنا ہاتھ سدھیر کے ماتھے پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔'' میں نہ حور ہوں نہ نرس۔ ایک رپورٹر ہوں۔۔

اور اس دن سے ان کی دوستی ہوگئی تھی۔ اور اس بار سدھیر کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اسے واقعی وہ رفیقۂ حیات مل گئی ہے جس کی اسے عمر بھر سے تلاش تھی۔ لوسی خوبصورت تھی، تعلیم یافتہ اور ذہین تھی، سدھیر کے آرٹ کی دلدادہ تھی اور پہلے دن ہی سے سدھیر کو چاہنے لگی تھی۔ وہ اکثر کہتی۔'' سدھیر تم ایک بڑے آرٹسٹ بے شک ہوں گے مگر ویسے تم بالکل بچے ہو۔ تمھیں اپنی دیکھ بھال کے لیے کسی کی ضرورت ہے۔''

اور سدھیر نے لوسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیرے سے کہا تھا۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔''

ایک طویل بوسے نے ان کے پیمانِ محبت پر مہر لگا دی تھی۔ دو بدن ایک دوسرے میں گھل کر ایک ہو گئے تھے اور سدھیر کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ کسی نے اس کی روح کے گھاؤ پر پیار کا پھاہیہ رکھ دیا ہے۔

اور اگر یہ اس کی مینا کشی نہیں ہے کوئی اور ہے تو اندھیرے میں چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟

وہ ٹہلتا ہوا اس کونے کی طرف چلا گیا جہاں وہ عورت اب ایک موٹے شیشوں کے چشمے کی مدد سے دیوار پر لگی تصویروں پر ایک سرسری سی نظر ڈال رہی تھی جیسے وہ تصویریں نہ تو اس کی سمجھ میں آئی ہوں اور نہ اسے ان میں کوئی خاص دلچسپی ہو۔

کہئے کیسی لگیں یہ تصویریں آپ کو؟'' سدھیر نے ادب سے سر کو جھکاتے ہوئے پوچھا۔

موٹی عورت نے سگریٹ ہولڈر منہ سے نکال کر دھویں کی پچکاری چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''بس یوں ہی سی ہیں۔ یہ موڈرن آرٹ میری سمجھ میں خاک نہیں آتا۔''

اتنے میں وہ ''سنگھار'' کے سامنے پہنچ گئی تھی اس تصویر کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ ''یہ کچھ ٹھیک ہے۔ خوبصورت تو ہے مگر دبلی بہت ہے۔ کون لڑکی ہے یہ؟ ایسا لگتا ہے جیسے کہیں دیکھا ہے اسے۔''

سدھیر نے جلدی سے کہا۔ ''جی نہیں یہ تو صرف ایک خیالی لڑکی ہے۔ آرٹسٹ نے اپنے تخیل سے بنائی ہے۔''

''ہاں خیالی ہی ہوگی۔'' اس عورت نے کہا۔ مگر پھر بھی وہ کچھ دیر تک اس تصویر کو دیکھتی رہی جیسے وہ تصویر اس سے کچھ کہہ رہی ہو مگر کسی ان جانی زبان میں جیسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

پھر اس عورت نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اچھا جی۔ تھینک یو'' کہہ کر جانے کے لیے مڑی۔ پھر جاتے جاتے رکی۔ اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ اس میں سے ایک بڑا سا چاکلیٹ نکالا اور اس پر لگی ہوئی پنّی کا کاغذ اتارتے ہوئے بولی۔ ''کیوں جی آپ چاکلیٹ کھائیں گے؟''

''جی نہیں۔ تھینک یو۔ میں چاکلیٹ نہیں کھاتا۔'' سدھیر نے جلدی سے کہا۔

اپنے دانتوں سے (جو اتنے سفید اور خوب صورت تھے کہ ضرور نقلی رہے ہوں گے) چاکلیٹ کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹتے ہوئے وہ بولی۔ ''تب ہی آپ اتنے دبلے ہیں۔'' پھر وہ آپ سے آپ ایک کھوکھلی سی ہنسی ہنسی اور چاکلیٹ چباتے ہوئے چل پڑی اور آہستہ آہستہ اس کی اونچی ایڑیوں کی کھٹ کھٹ کی آواز دور ہوتی گئی...... دور ہوتی گئی...... یہاں تک کہ رات کے سناٹے میں کھو گئی۔

اب گیلری خاموش تھی۔ دربان سوئچ دبا کر روشنیاں بند کرنے جا رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب تصویریں اندھیرے میں کھو گئیں۔ آخر میں روشنی کے ایک جزیرے میں صرف ''سنگھار'' باقی رہ گئی۔ وہ دبلی سی نازک سی پیلے گلاب جیسی رنگت والی لڑکی...... جو وقت سے بے نیاز تھی۔

دربان اس روشنی کا سوئچ بھی دبانے والا تھا کہ سدھیر نے اسے روک دیا۔ ''نہیں اسے رہنے دو۔'' اور اسے چاروں طرف پھیلے ہوئے سناٹے اور اندھیرے میں ایسا محسوس ہوا کہ اگر یہ روشنی بھی بجھ گئی تو پھر اس کی زندگی میں کچھ بھی نہ رہے گا۔

O

# بنارس کا ٹھگ

(1)

ریل کے اسٹیشن پر لکھا تھا ——— وارانسی VARANSI
پولیس کے تھانے کے باہر لکھا تھا ——— وارانسی ———
اسپتال کے دروازے پر بورڈ لگا تھا ——— وارانسی ———
شراب کی دکان پر لکھا تھا ——— وارانسی ———
افیون، گانجہ اور چرس کی دکان پر لکھا تھا ——— وارانسی
کتابوں کی دکان پر، جہاں کوک شاستر کھلے عام بک رہی تھی لکھا تھا وارانسی ———
اوشدھالیہ پر، جہاں سدھ مکر دھوج خریدنے کے لیے بھیڑ لگی تھی، لکھا تھا — وارانسی ——— حکیم
حاذق الملک کے دار الشفا پر لکھا تھا ——— وارانسی
پنجراپول پر لکھا تھا ——— وارانسی
گئو شالا پر لکھا تھا ——— وارانسی
پاگل خانہ پر بورڈ لگا تھا ——— وارانسی
اور ڈاک خانہ میں چٹھیوں پر کھٹا کھٹ مہریں لگائی جا رہی تھیں — وارانسی — وارانسی —

وارانسی — جیسے ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی ہے۔ جیسے طبلے پر تھاپ پڑتی ہے وارانسی۔ وارنسی، وارانسی، وارانسی۔

مگر جب مسافر نے راہ گیر سے پوچھا 'بھائی یہ کون سا شہر ہے؟' تو جواب ملا......

'بنارس۔'

اور مسافر جو اب تک حیران و پریشان، کھویا کھویا ہوا گھوم رہا تھا۔ یک بیک اُس کے چہرے پر ایک عجیب خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں نہ جانے کتنی پُرانی یادیں جاگ اُٹھیں۔ اُس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب معصوم مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے بچّہ گھر آکر ماں سے کہہ رہا ہو— ماں میں آ گیا۔'

مسافر بہت دُور سے آیا تھا— مگر اُس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اُس کے گھر کے دھلے گاڑھے کے کپڑوں پر راستے کی کوئی گرد نہیں تھی۔ اس کے پاس نہ بستر تھا، نہ ٹرنک، نہ ناشتہ دان، نہ صراحی، نہ پانی کا لوٹا، نہ پانی کی لٹیا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ اُٹھا کر چل رہا ہے۔

مسافر کو ٹھہرنے کے لیے جگہ چاہیے تھی۔ راستے میں اُس نے کسی راہ چلتے سے پوچھا— 'بھائی یہاں بھولی بھٹیارن کی ایک سرائے ہوا کرتی تھی۔'

جواب ملا— 'سرائے تو یہاں کوئی نہیں— البتہ ایک مسلم مسافر خانہ ہے۔'

'اور جو مسلمان نہ ہوں وہ کہاں ٹھہرتے ہیں۔'

'ہندوؤں کے لیے کئی دھرم شالائیں ہیں۔'

'اور جو نہ ہندو ہوں، نہ مسلم ہوں؟'

راہ گیر نے ایک ہوٹل کی طرف اشارہ کر دیا۔

باہر بورڈ لگا تھا، جس پر لکھا تھا— 'ہوٹل وارانسی— وارانسی' اور مسافر یہ سوچتا ہوا اندر داخل ہو ہی رہا تھا کہ آخر یہ وارانسی دوبارہ کیوں لکھا گیا ہے، کہ اُس نے دیکھا کہ ایک کالا ناگ پھن پھیلائے اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گھبرا کر وہ ایک طرف ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ ایک ادھ ننگی جوان فرنگی عورت کھڑی ہے اور اُس کے گلے اور سینے اور کولھوں کے گرد ایک بھیانک

اژدہا لپٹا ہوا ہے اور ایک داڑھی والا مداری کھڑا کہہ رہا ہے—

'پائی تھن میم صاحب۔ پائی تھن۔ نو میک فیر۔ میم صاحب، ٹیک پکچر۔ اونلی ٹو روپی۔'

اور مسافر جو یہ بھاشا نہیں سمجھتا تھا سمجھا کہ یہ سپیرا اس فرنگی عورت کو اژدہے سے ڈسوا رہا ہے اور اس نے لپک کر اژدہے کو دونوں ہاتھوں سے کھینچا اور زور سے زمین پر پٹک دیا۔

فرنگی عورت اپنی بھاشا میں کچھ چلائی۔

سپیرے نے مسافر کو گردن سے پکڑ لیا— 'اے بڈھے، یہ کیا کرتا ہے؟ میرا کام خراب کر دیا۔' اور پھر اس کی آنکھوں میں ایک شبہ کی چمک آئی۔ 'اے تو بھی سپیرا ہے کیا؟'

مسافر نے کہا— 'میں سپیرا نہیں ہوں۔ پر تو یہ کیا کر رہا تھا۔ وہ بے چاری فرنگی عورت مر جاتی تو؟'

'ارے مُورکھ اژدہے کے دانت نہیں ہیں۔ اس کو گلے میں ڈال کر میم صاحب تو صرف تصویر کھنچوا رہی تھی۔ چل اپنا راستہ لے۔ پاگل کہیں کا۔' اور پھر اُس نے فرنگی عورت کی طرف دیکھ کر اُنگلی سے اپنی کھوپڑی کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ 'میم صاحب، اولڈ مین، اسکرو لوز، نو مائنڈ، پاگل مین ناؤ پائی تھن میک لو میم صاحب۔ صاحب ٹیک پکچر، اونلی ٹو روپی۔'

اور اب مسافر ہوٹل کے منیجر سے بات کر رہا تھا۔

'کیا میں اس سرائے میں ٹھہر سکتا ہوں؟'

'یہ سرائے نہیں ہوٹل ہے!'

'اچھا تو اب سرائے کو ہوٹل کہتے ہیں۔ میں یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔'

'آپ کہاں سے آئے ہیں؟'

'جی میں تو یہیں رہتا ہوں، اور یہاں سے اتنی دُور بھی رہتا ہوں کہ کوئی اِس فاصلہ کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔'

منیجر کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ پھر اِس نے اپنے رجسٹر میں لکھے ہوئے سوالوں پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ آپ نے سفر کیسے کیا؟ مطلب یہ کہ آپ آئے کیسے؟ ریل سے؟'

'جی نہیں!'

'بس سے؟'

'جی نہیں!'

ہوائی جہاز سے؟'

'جی نہیں — یا یوں سمجھئے، جی ہاں — آپ میرے سفر کو ہوائی جہاز کہہ سکتے ہیں!'

'آپ کا سامان کہاں ہے!'

'جی سامان۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں کسی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی!'

'تو آپ یہاں نہیں ٹھہر سکتے!'

'تم اس سرائے کے، یعنی ہوٹل کے۔ مالک ہو کیا؟'

'نہیں منیجر ہوں!'

'تو مالک کون ہے؟'

'اس کے مالک ہیں بھگوان کاشی دوار کا ناتھ جی۔'

'تو اس کو ہوٹل ووٹل کیا کہتے ہیں — یہ تو بھگوان کا مندر ہوا۔ اور مندر میں کوئی بھی مسافر بھگوان کا مہمان ہو سکتا ہے۔'

منیجر ہنس کر بولا — مگر جو دیوتا اس ہوٹل کا مالک ہے، وہ کرایہ مانگتا ہے۔ ہر کمرے کا چالیس روپیہ روز کرایہ۔ اتنا روپیہ ہے تمھارے پاس؟' اور مسافر غصّے سے بولا — 'تو پھر اس جگہ کا مالک بھگوان نہیں کوئی شیطان ہے۔ میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ میں جاتا ہوں!'

اور یہ کہہ کر وہ وہاں سے جلدی جلدی قدم بڑھاتا چلا گیا اور اُس کے جانے کے بعد منیجر نے بیرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ 'کیسے کیسے پاگلوں سے واسطہ پڑتا ہے۔'

اور بیرے نے کہا — 'صاحب، یہ تو کوئی خطرناک پاگل ہے۔ ابھی میں نے دیکھا وہ امریکن میم صاحب کو تنگ کر رہا تھا۔ وہ اپنا سپیرا ہے نا، اُس کا ناگ چھین کر بھاگنے والا تھا۔'

'تو پہلے کیوں نہیں بولا۔ ایسا پاگل لوگ ہمارے ہوٹل کے آس پاس گھومے گا تو ٹورسٹ لوگ اِدھر آنا بند کر دے گا۔'

یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون اٹھایا اور ڈائل گھمایا۔ 8۔6۔0۔4۔

(2)

اور اب مسافر بازار کی بھیڑ میں سے چلا جا رہا تھا۔ اُس نے سوچا میرے زمانے میں تو آبادی اتنی نہیں تھی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اپنے شہر میں اتنی رونق ہے۔ راستے میں اس نے بنارسی ساڑیوں اور کمخواب کی دکانیں دیکھیں۔ اُس نے سوچا کیا نفیس کپڑا آج بھی ہمارے کرگھوں پر بُنا جا رہا ہے۔ دکانیں رنگ برنگی ساڑیوں اور مختلف قسم کے تھانوں سے اَٹی پڑی تھیں۔ اس نے سوچا، اب تو اپنے شہر کی ہر عورت بنارسی ساڑی پہن سکتی ہے۔ کمخواب کا لہنگا یا پائجامہ سلوا سکتی ہے۔ دوسری دکانوں پر اُس نے دیکھا کہ ہر قسم کا اُونی کپڑا بھی بھرا پڑا ہے۔ اُس نے سوچا جاڑے کا انتظام اچھا ہے۔ یہ سب ترقی کے آثار ہیں۔ ورنہ ہمارے زمانہ میں تو اس موسم میں روئی کے دگلے پہنے جاتے تھے۔

مگر جب اس نے بازار کی طرف رُخ کیا اور چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا تو اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سب پھٹے پُرانے، میلے کپڑے پہنے کیوں گھوم رہے ہیں۔ دکانوں میں کئی لاکھ بنارسی ساڑیوں کا ڈھیر ہے اور سڑک پر کھڑی بھکارن ایک چیتھڑے میں اپنا اور اپنے بچے دونوں کا بدن کو ڈھانکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہاتھ گاڑی کو ڈھکیلتے ہوئے دو دُبلے دُبلے مزدور جا رہے ہیں اور اُن کے بدن پر پھٹے ہوئے سوتی کرتوں اور میلی دھوتیوں کے سوا کچھ نہیں اور وہیں قریب کی دکان پر ایک لالہ جی پشمینے کا دوشالہ پہنے انگیٹھی پر ہاتھ سینک رہے ہیں اور ایک مولوی صاحب کشمیری سنہری کام کا اونی چوغہ پہنے سر پر بیس گز کا عمامہ باندھ مسجد کی طرف جا رہے ہیں اور ایک داڑھی مونچھ منڈا نوجوان اُونی ولایتی سوٹ اُوور کوٹ، اُونی موزے مفلر اور دستانے پہنے منہ سے دُھواں نکالتا اپنی موٹر کی طرف جا رہا ہے۔ ایک لمبی چوڑی موٹر جس پر جھنڈا لگا تھا، قریب سے گذر گئی اور مسافر کو اس میں صرف ایک سفید ٹوپی کی جھلک نظر آئی اور پاس کھڑے ہوئے کسی راہ گیر نے کہا 'دیکھا تم نے چاروں طرف شیشے چڑھے ہوئے ہیں کہ کہیں منتری جی کو چھینک نہ آ جائے۔'

اور پھر ایک اُس سے بھی لمبی موٹر آئی اور ایک ساڑیوں کی دکان پر رُکی اور اُس میں سے اُتر کر ایک موٹا تازہ آدمی اندر گیا اور اُس کی کالی کالی انگلیوں پر انگوٹھیوں کے ہیرے ایسے چمکے جیسے

رات کے وقت گندی نالی کے بدبودار پانی میں ستاروں کا عکس جھلملاتا ہے۔ کسی نے کہا— 'پہچانا تم نے، یہ ہیں سیٹھ کروڑی مَل پکوڑی مل کالے بازار میں انھوں نے ایک کروڑ کمایا ہے۔ اس میں سے ایک لاکھ کا مندر بنایا ہے اور اب اپنی سُپتری کو پانچ لاکھ کا جہیز دینے والے ہیں۔ اس کے لیے ساڑیاں خریدنے آئے ہیں۔ اسپیشل ساڑیاں بنوائی گئی ہیں۔ ایک ایک پانچ پانچ سو کی، کیا سمجھے؟'

مسافر کچھ نہیں سمجھا۔ اُس نے صرف اتنا دیکھا کہ بھکارن دیوار سے لگی سردی کے مارے کانپ رہی ہے اور اُس کی گود کے بچے کا چہرہ اور بدن نیلا پڑتا جا رہا ہے۔

اور اسی وقت قریب کے ایک مندر میں بھجن شروع ہو گیا۔

جے جے رام کرشن ہرے۔ جے جے رام کرشن ہرے۔

اور مسافر کو نہ جانے کیا ہو گیا کہ وہ بھی زور زور سے بھجن گانے لگا۔ مگر یہ اُس کا اپنا بھجن تھا اور بازار کے سب لوگ اُس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کیونکہ یہ آواز جو اُن کو اپنے مَن کی لگتی تھی، انھوں نے صدیوں سے نہیں سُنی تھی۔ مسافر گا رہا تھا۔

اے بھگوان۔ یہ کیسا تیرا دربار۔
جہاں ہے ظلم کی بھرمار۔
رنگ محل میں بسیں مسخرے۔
عیش کریں سب چور لٹیرے
مُورکھ کو سب کہیں گیانی
گیانی کو سب کہیں گنوار
کوئی اوڑھے شال دوشالہ
اور کوئی ننگا بیچ بازار— یہ کیسا تیرا دربار
یہ کیسی سرکار رے بھگوان۔ یہ کیسی سرکار

یہ سُن کر کسی نے کہا— 'ضرور کوئی کمیونسٹ ہے۔'
مگر دُوسرے نے کہا— 'مجھے تو کبیر پنتھی لگتا ہے۔ یہ شبد تو کبیر کے جیسے ہیں۔'

تیسرے نے کہا 'نہیں جی، کبیر پنتھی آج کل کبیر کے ایسے شبدوں کو کب یاد کرتے ہیں۔'

چوتھے نے کہا— 'میں تو کہتا ہوں کوئی پاگل ہے پاگل بے چارہ۔'

پانچویں نے کہا— مگر خطرناک پاگل ہے جو ایسے خطرناک بھجن گاتا ہے۔

چھٹے نے کہا— بے چارہ گا ہی تو رہا ہے۔ کچھ کر تو نہیں رہا۔'

ساتویں نے کہا— تم کیا جانو۔ ایسے شبد آگ لگا دیتے ہیں۔'

آٹھویں نے کہا— ایسے شبد تو وہ زہریلے ناگ ہیں جن کے کاٹے کا کوئی منتر ہی نہیں۔'

اور اتنے میں کوئی چلایا۔ 'دیکھو دیکھو وہ پگلا کیا کر رہا ہے؟'

سب نے مڑ کر ادھر دیکھا کہ مسافر نے سیٹھ جی کا دوشالہ گھسیٹ کر ایک سائیکل رکشہ والے کو دے دیا جو ایک پھٹی قمیض اور نیکر میں کھڑا ٹھٹھر رہا تھا اور دوشالہ پاتے ہی وہ رکشہ والا پیڈل مارتا ہوا بگٹٹ ہولیا اور ابھی سیٹھ جی ہائے واویلا کر ہی رہے تھے کہ مولانا جو مسجد سے واپس ہو رہے تھے دفعتاً چلا پڑے 'ارے میرا چوغہ، پکڑو پکڑو، چور میرا چوغہ لے بھاگا۔' مگر اتنے میں مسافر نے وہ اُونی چوغہ بھکارن کو دے دیا اور وہ اُس میں اپنے بچے کو لپیٹے سرپٹ بھاگی جارہی تھی، اور اَب سب مسافر کی تلاش کر رہے تھے اور مسافر وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔

مولانا کی داڑھی غصے کے مارے ہل رہی تھی اور وہ بار بار کہہ رہے تھے۔ جیسے اسمِ اعظم کا وِرد کر رہے ہوں 'یا مظہر العجائب' ابھی وہ مردود یہاں تھا، اور ابھی غائب یا مظہر العجائب۔ ابھی وہ مردود یہاں تھا اور ابھی غائب!'

ایک نے کہا— دن دہاڑے ڈاکے پڑنے لگے۔ سیٹھ جی اور مولانا کو تھانے میں رپورٹ کرنی چاہیے— چور فوراً پکڑا جائے گا۔'

دوسرے نے کہا— 'چور نہیں جی ٹھگ تھا۔ آنکھوں میں دُھول جھونک کر دوشالہ اُڑا کر لے گیا۔'

تیسرے نے کہا— 'بھئی شکل وصورت سے تو ٹھگ نہیں لگتا تھا۔ سیدھا سادا بڈھا تھا کوئی۔'

دوسرے نے جواب دیا' بنارس کے ٹھگ دیکھنے میں ایسے ہی بھولے بھالے لگتے ہیں۔ ضرور وہ کوئی ٹھگ ہی تھا۔

چوتھے نے کہا— پھر میرے خیال میں بھی وہ ٹھگ یا چور نہیں تھا ورنہ چیزیں چُرا کر وہ خود لے جاتا۔ دوسروں کو کیوں دیتا۔ ضرور وہ پاگل ہے!'

اور سیٹھ جی کی توند، مولانا کی داڑھی کی طرح غصّے کے مارے ہل رہی تھی، بولے— 'پر یہ پاگل پَن بڑا خطرناک ہے جی۔ دو چار ایسے پاگل ہور (اور) آگئے تو ہمار دھندہ ہی سُورا بند ہو جاوے گا۔''

یہ کہہ کر انھوں نے پاس رکھا ہوا ٹیلی فون اُٹھایا اور ڈائل گھمایا—8-6-0-4

(3)

مگر مسافر وہاں سے بہت دور سارناتھ کے کھنڈروں میں گھوم رہا تھا۔ جہاں نہ سیٹھ آتے ہیں نہ مولانا۔ نہ موٹروں میں گھومنے والے منتری۔ یہاں خاموشی تھی، سکون تھا۔ ماضی کی دُھول پر چلتے ہوئے پیروں کی آواز بھی نہ ہوتی تھی۔

بڑی دیر تک مسافر عجائب گھر میں بھگوان بدھ کی مورتی کے سامنے کھڑا رہا اور گوتم کا ابھے مُدرا اُسے جیسے دلاسہ دیتا رہا۔ اور پتھریلی آنکھیں جنھوں نے دنیا کے غم کی تہہ کو پالیا تھا، اُس سے بہت کچھ کہتی رہیں اور اُسے ایسے محسوس ہوا کہ وہ ترشے ہوئے پتھریلے ہونٹ اس کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں۔ اے مسافر جس راستے پر تم چل رہے ہو اُس سے ہم بخوبی واقف ہیں، کیونکہ یہی ہمارا مارگ تھا۔ پر آج اس مارگ پر کون چلتا ہے۔ تمھارا پتھ بھی تو سونا پڑا ہے۔ ہمارے تمھارے راستے کی دُھول پر تو صدیوں کے بعد کسی کے بھولے بھٹکے کے نقشِ قدم ملتے ہیں۔'

اور مسافر کی نگاہوں نے خاموشی کی زبان سے کہا— 'مجھے شکتی دو۔ مجھے شانتی دو— شاکھیہ منی۔ میں بہت دنوں کے بعد واپس آیا ہوں۔'

اور گوتم کے ہونٹوں نے بن کھلے کہا— 'تم واپس نہیں آئے۔ تم کہیں گئے نہیں تھے۔ تم لوگوں کے من میں سو گئے تھے اور اب اُن کے مَن میں تم جاگ گئے ہو۔ تم یہیں تھے، اور یہیں رہو گے۔ تم یہاں ہو اور ہر جگہ ہو۔ جیسے میں یہاں ہوں، وہاں ہوں اور ہر جگہ ہوں۔ ہم ہر جگہ

ہیں اور ہر وقت میں ہیں، مگر خاص کر ہم آج ہیں اور یہاں ہیں۔'

'پرشا کھیہ منی۔ آج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اُس سے میں بہت دُکھی ہوں۔'

اور گوتم کی آنکھوں نے خاموشی سے کہا۔ 'دُکھ کیا ہے؟ سُکھ کیا ہے؟ کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہیں وہ ہمارے کرم ہیں، ہمارا عمل ہے اور آج تم نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ تمھارے شبدوں میں سنگیت ہی نہیں شکتی بھی ہے۔' اور اب مسافر نے دیکھا کہ وہ پتھریلی آنکھیں اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہی ہیں۔

پھر وہ گھومتا ہوا نئے بنے ہوئے بُدھ مندر کی طرف چلا آیا اور اندر جاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ سنگ مرمر کی سِلوں پر سیٹھوں، رئیسوں کے نام کھدے ہیں اور اُن میں سیٹھ کروڑی مَل پکوڑی مَل کا نام بھی ہے، جس کا دوشالہ آج اُس نے چھینا تھا۔

'یہ کیا ہے؟' اس نے مندر کے ایک بھکشو سے پوچھا۔

اور پیلی کفنی پہنے ہوئے بھکشو نے کہا۔ 'یہ اُن دانیوں کے نام ہیں جنھوں نے اِس مندر کو بنانے کے لیے چندہ دیا تھا۔'

مسافر نے بڑبڑا کر کہا۔ 'تو انھوں نے چندہ مہاتما بدھ کے لیے نہیں دیا تھا، دھرم کے لیے نہیں دیا تھا۔ اِس مندر کے لیے نہیں دیا تھا۔ سنگ مرمر کی سِل پر اپنا نام لکھوانے کے لیے دیا تھا۔'

اور وہ یہ کہہ کر اندر داخل ہوا اور اُس نے دیکھا کہ وہ مہان آتما جس نے دُنیا کے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو مُکتی دی تھی، وہ وہاں ایک پیلی دھات سے بنائے ہوئے خول میں قید تھا۔

بھکشو نے کہا۔ 'اس مورتی پر آٹھ من سونے کا خول چڑھا ہوا ہے۔'

اور مسافر نے جواب دیا۔ بڑی طاقت ہے سونے کی جو بُدھ جیسی آزاد آتما کو بھی اپنے پنجے میں جکڑ سکتی ہے۔' مگر یہ بات اس بھکشو کی سمجھ میں نہ آئی۔

پھر مسافر نے دیکھا کہ چاروں طرف بھدّی بھدّی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن میں مہاتما بُدھ کی زندگی کے مختلف منظر پیش کیے گئے ہیں۔

بھکشو نے کہا۔ 'یہ تصویریں جاپان کے ایک مہان کلاکار نے اپنی شردھا سے بنائی ہیں۔

پورے چار برس لگے تھے اُسے یہ کام پورا کرنے میں۔ وہ دیکھو کونے میں جاپانی آرٹسٹ کا پورا نام پتہ لکھا ہوا ہے۔'

اور ایک یاتری نے مسافر سے کہا— 'صرف چار برس۔ پھر بھی آرٹسٹ کو اپنا نام پتہ لکھنے کی اتنی فکر تھی اور اجنتا ایلورا کے غاروں میں دیکھو۔ ایک ایک غار کو اُس کے مجسموں اور تصویروں کو مکمل کرنے میں ڈھائی ڈھائی سو سال لگے اور کلاکاروں کی کئی کئی نسلوں نے ایک کے بعد ایک اس لافانی آرٹ کو تخلیق کیا۔ پھر بھی کسی نے ایک جگہ بھی اپنا نام نہیں لکھا۔ اسے کہتے ہیں سچی شردھا۔ سچی کلا۔'

مسافر نے یہ بات بڑے غور سے سنی۔ پھر وہ بولا۔ 'نام کے لیے لوگ سب کچھ کرتے ہیں۔ بُدھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔'

مگر اِس عرصہ میں وہ بھکشو دکان پر کھڑا تصویریں اور مورتیاں اور کتابیں بیچ رہا تھا۔ اب مسافر نے دیکھا کہ ایک اور بھکشو ہے جو بُدھ کی مورتی کے سامنے بار بار سجدہ کر رہا ہے۔

اور اُس نے سوچا— 'مگر بُدھ نے تو کہا تھا، میری مورتی بنانا اور یہ بھی کہا تھا کہ کسی کی مورتی کے آگے ماتھا نہ ٹیکنا۔'

مگر وہ بھکشو منہ ہی منہ میں کوئی دُعا بڑبڑا رہا تھا اور ہر بار سارے بدن کو زمین پر گرا کر ماتھا ٹیک رہا تھا۔ پہلے تو مسافر نے سمجھا کہ وہ کوئی ورزش کر رہا ہے اور اُس نے ایک یاتری سے کہا بھی— 'یہ مندر ہے کہ اکھاڑا؟' مگر یاتری نے کہا 'ش ش بھکشو مہاراج پوجا کر رہا ہے۔ بھگوان بُدھ کی مورتی کی۔'

اور اب مسافر نے دیکھا کہ اس بھکشو نے سنگ مرمر کے ٹھنڈے فرش پر دو بالشت چوڑا تہہ کیا ہوا اُونی کپڑا بچھا رکھا ہے، تا کہ اس کا بدن ٹھنڈے پتھر کو نہ لگے۔ جہاں اس کے ہاتھ زمین پر آتے تھے، وہاں بھی دونوں طرف ایک ایک اُونی کپڑے کا ٹکڑا پڑا ہوا ہے، تا کہ بھکشو کے ہاتھوں کو بھی ٹھنڈے فرش کو نہ چھونا پڑے۔ کتنا خیال تھا اُس بھکشو کو اپنے آرام کا، مگر وہ برابر اپنی کسرت کیے جا رہا تھا۔ جھکتا، زمین پر منہ کے بَل، اوندھا لیٹتا، پھر اُٹھتا، پھر جھکتا اور تمام عرصے کوئی دعائیں بڑبڑاتا رہا اور مسافر کو ایسا لگا کہ یہ ایک بھکشو نہیں ہے بلکہ پوجا کرنے کی ایک مشین

ہے جو بٹن دبانے پر اُٹھک بیٹھک کرنے لگتی ہے۔

اور اُسے ایسا لگا کہ یہ بھکشو اپنی ریاکارانہ عبادت سے بھگوان بدھ کی ہتک کر رہا ہے۔ اُن کا، اُن کی پوتر آتما کا منہ چڑا رہا ہے اور اُس نے ایک ہی وار میں بھکشو کے سامنے سے وہ گدیاں گھسیٹ لیں اور اس بار بھکشو سجدے میں گیا تو اُس کا ماتھا دھڑ سے ٹھنڈے سخت پتھر پر لگا اور ایک پَل میں اُس کی تپسیا، اُس کی شردھا اور اُس کی پوجا اور اس کی اہنسا کا بھرم کھل گیا اور مسافر کو مارنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑا مگر اس عرصے میں مسافر نے مورتی استھان کے پاس سے گھڑیال بجانے کی ایک لوہے کی موگری اُٹھالی تھی اور اُس سے وہ مورتی پر چڑھے ہوئے پیلی دھات کے خول کو توڑ رہا تھا۔ بدھ کو سونے کی قید سے آزاد کر رہا تھا۔

کتنے ہی بھکشو، پہرے دار یاتری مسافر کے پیچھے دوڑے لیکن وہ اُن کے ہاتھ نہ آیا۔ چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا اور جب اُس کا پیچھا کرنے والے مندر سے باہر نکل کر بھاگے تو انھوں نے دیکھا کہ دروازے کے دونوں طرف جو سنگ مرمر کی تختیاں لگی تھیں، جن پر چندہ دینے والے سیٹھوں کے نام اور اُن کے چندے کی رقمیں لکھی ہوئی تھیں، اِن کو کوئی پاگل اس طرح چکنا چور کر گیا ہے کہ اب نہ سیٹھ کروڑی مَل پکوڑی مل کا نام پڑھا جاتا ہے اور نہ اُن کی دان دی ہوئی سو روپے کی رقم۔

'بالکل پاگل ہے مہاراج' بھکشوؤں نے مندر کے منیجر کو رپورٹ کی جو اپنے رجسٹر میں دان کی رقموں کا حساب کتاب لکھ رہا تھا اور پہرے دار بولا — بڑا کھترناک (خطرناک) پاگل ہے مہاراج، مورتی پر چڑھے ہوئے سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کر گیا اور خود اس میں سے ایک ٹکڑا بھی اٹھا کر نہ لے گیا— بالکل پاگل، مہاراج!'

اور مندر کے منیجر نے 'بدھم شرنم گچھامی' کہہ کر ٹیلی فون اُٹھایا اور ڈائل گھمایا۔ 8-6-0-4

(4)

'مہاراج!' ایک آواز آئی مگر مسافر نے مُڑ کر نہ دیکھا۔

'شریمان!' وہی آواز پھر آئی مگر اب بھی اس نے ادھر کوئی توجہ نہ کی۔

بازار میں شام کے وقت بہت بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی اور ہی کو آواز دے رہا رہو۔

'او بھائی صاحب!'

'اے مسٹر!'

'اجی سنیے تو!'

'ارے او......!'

'اے......!'

اور اس آخری 'اے' میں اتنا زور تھا کہ مسافر ٹھٹک کر رک ہی گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک آدمی سفید کرتا دھوتی اور اُونی بنڈی پہنے، بالوں میں تیل ڈالے، ماتھے پر چندن لگائے اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

'کیا ہے بھائی؟'

'تم بنارس میں آج ہی آئے ہو لگتا ہے! کیوں ٹھیک ہے نا؟'

'آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں ہمیشہ سے بنارس ہی میں رہتا آیا ہوں، مگر اس وارانسی میں آج پہلی بار آیا ہوں۔'

'کیا ہے وہاں؟'

'ارے بھگوان کے درشن ہوں گے۔'

'کیوں بھگوان یہاں نہیں ہیں کیا، وہاں قید کر رکھا ہے کسی نے؟'

'ارے نہیں، وہاں شیو بھگوان کی مورتی ہے، اس کے درشن کرنا۔ پوجا کرنا۔'

مسافر نے کہا— 'اگر پتھر پوجنے سے ہی بھگوان ملتا ہے تو چکّی کی پوجا کیوں نہ کروں جو آٹا پیس کر انسانوں کا پیٹ بھرتی ہے۔'

'ارے نہیں، یہ پتھر کی نہیں، سونے کی مورتی ہے۔ مندر کے کلس پر چھبیس من سونا چڑھا ہوا ہے۔'

'مجھے بھگوان کی مورتی نہیں دیکھنی۔ نہ پتھر کی سونے کی۔ میں تو بھگوان کو ہر روز، ہر گھڑی،

ہر پل دیکھتا ہوں۔'

چکنے بالوں والا سمجھا، یہ بڑھا اُس سے ٹھول کر رہا ہے۔ سو وہ بولا— کیوں بڑے میاں بھلا بھگوان کو کہاں کہاں دیکھا ہے تم نے؟'

مسافر نے جواب دیا— 'میں نے بھگوان کو گلی میں بھیک مانگتے دیکھا ہے— میں نے بھگوان کو پھٹی قمیض پہنے سردی میں ٹھٹھرتے دیکھا ہے۔ میں نے بھگوان کو شراب خانے میں دیکھا ہے۔ وہ شراب میں ہے، شراب کی بھٹی میں بھی ہے۔ وہی شراب بناتا ہے، وہی پلاتا ہے، وہی پیتا ہے، وہی صُراحی ہے، وہی پیالہ ہے، وہی متوالا ہے۔'

مسافر ابھی بول ہی رہا تھا کہ وہ چکنے بالوں والا گھبرا کر وہاں سے چلتا بنا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ باپ رے میں بھی کس پگلے کے پلّے پڑ گیا۔

مسافر آگے چلا تو ایک اور پنڈا اسے ملا۔ وہ بولا— 'مہاراج لگتا ہے، آج ہی آپ اس پوتر بھومی میں پدھارے ہیں۔ چلو تمھیں گنگا جی میں اشنان کروا لاؤں!'

مسافر نے پوچھا— کیوں، گنگا میں اشنان کرنے سے کیا ہوتا ہے؟'

'جیون کے سب پاپ دُھل جاتے ہیں۔ ایک بار گنگا اشنان کرو گے۔، سیدھے سورگ میں جاؤ گے۔'

مسافر نے ایک پَل سوچ کر جواب دیا— 'کیوں شریمان، جو کوئی بھی گنگا نہائے وہ سچ مُچ سورگ میں جاتا ہے؟'

پنڈے نے کہا— بالکل سیدھا سُورگ میں جاتا ہے!'

اور مسافر بولا— 'تو پھر تو سب دھوبی اور دریا کے سب کچھوے سیدھے سورگ جانے چاہئیں۔'

'پاگل ہے بے چارہ۔' پنڈے نے سوچا اور کسی اور شکار کی تلاش میں چل پڑا۔ گھومتے گھومتے مسافر اب شمشان گھاٹ پر پہنچ گیا— جہاں اُس نے دیکھا کہ لکڑی کے ڈھیروں پر چتائیں جل رہی ہیں۔ اُن پر گھی اور تیل ڈالا جارہا ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ برہمن اشلوک پڑھ رہے ہیں۔ مرنے والے کے رشتہ دار برہمنوں کو دان دے رہے ہیں۔

مسافر نے ایک آدمی سے پوچھا جو جلتی ہوئی لکڑیوں کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ 'کیوں بھائی

کیا حال ہے؟'

دھندا بڑا مندا ہے آج کل بھائی!'

مسافر نے پوچھا— 'کون سا دھندا؟'

'یہی کریا کرم کا دھندا۔ نہ جانے کیا ہوگیا ہے؟ لوگوں نے مرنا ہی کم کر دیا ہے۔ کہاں دس برس پہلے روز سو ڈیڑھ سو لاشیں آتی تھیں۔ اب مشکل سے پچیس تیس آتی ہیں۔ پہلے سارے دیش کے کونے کونے سے لوگ یہاں مرنے آتے تھے۔ اب اُدھرم پھیل رہا ہے اور کتنے ہی لوگ اپنے گھر میں ہی مرنا پسند کرتے ہیں۔'

مسافر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ 'بڑا افسوس ہے بھائی۔ پھر بھی بھگوان پر بھروسہ رکھو وہ سب کا پالن ہار ہے۔'

اتنے میں مسافر نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی اکیلا اپنے بازوؤں پر کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش اُٹھائے چلا آرہا ہے۔ کوئی ارتھی کو کندھا دینے والا نہیں ہے۔

مسافر نے بوڑھے کے پاس جا کر کہا— 'تم تھک گئے ہوگے، لاؤ لاش کو مجھے دے دو!'

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لاش کو مسافر کے سپرد کرتے ہوئے وہ بولا۔ 'ذرا سنبھال کے بھائی۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔' اس کے لیے وہ اب تک 'ہے' تھا، 'تھا' نہیں ہوا تھا۔

اب وہ دونوں گھاٹ کے کنارے ایک جگہ پہنچے، جہاں لوہے کے کٹہرے کے پاس لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔

'اے اے!' ایک پانڈا چلاتا ہوا آیا 'تم لوگ اِدھر کیسے آئے؟ یہ راجوں مہاراجوں کے کریا کی جگہ ہے۔ یہاں انتم سنسکار کرنے کے پانچ سو روپے ہوتے ہیں۔'

'پانچ سو روپے!' مسافر نے دہرایا۔ 'موت بھی اتنی مہنگی ہوگئی ہے!'

'ہاں ہاں، جانتے ہو، یہ چندن کی لکڑی ہے۔ راجوں مہاراجوں کے لیے منگائی جاتی ہے۔ جاؤ اُدھر کے گھاٹ پر جاؤ۔'

مگر دوسری طرف دوسرے پہرے دار کھڑے تھے۔ موت کے محل کے چوکیدار۔

'چالیس روپے کی تو لکڑی ہی آئے گی۔' ایک نے کہا— 'روپے نکالو۔'

'پانچ روپے پنڈت کو دان' تیسرے نے اپنی مٹھی کھولی۔

'کل پچاس روپے ہوں گے۔' چوتھے نے حساب بتلا دیا۔

'مگر سو روپیہ ٹھیکیدار کو دینا ہوگا۔'

'ٹھیکیدار!' مسافر نے حیرت سے کہا۔ 'کیا کسی نے موت کا ٹھیکہ بھی لیا ہوا ہے؟'

ہاں، ہاں ٹھیکیدار کو سو روپے دیئے بنا یہاں کوئی کریا نہیں کر سکتا۔'

دوسرے نے کہا۔ 'اکیاون روپے اور پچیس نئے پیسے نکالو۔

تیسرے نے کہا۔ 'نہیں ہیں تو گھر کا راستہ لو۔'

چوتھے نے لاٹھی پٹکتے ہوئے کہا۔ 'چلو جلدی کرو۔ دھندے کا ٹائم ہے۔'

اور بوڑھا جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا جاری تھی۔ اُس نے مسافر کی طرف دیکھ کر کہا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، جو تھا وہ اس کی دوا دارو پہ لگا دیا۔'

اتنے میں کسی امیر آدمی کی ارتھی آئی۔ سینکڑوں آدمی ساتھ میں بینڈ باجا، ہار پھول۔ لگتا تھا کسی کی بارات ہے۔

موت کے سب ٹھیکیدار اُدھر بھاگے۔

اب یہ تین اکیلے رہ گئے۔

مسافر۔

بوڑھا۔

اور بوڑھے کے جوان بیٹے کی لاش۔

مسافر نے دیکھا کہ لکڑی کے ایک بڑے ڈھیر پر ایک چتا جل رہی ہے اور اس کے پاس کوئی نہیں ہے کیونکہ سب بینڈ باجے والی ارتھی کو دیکھنے چلے گئے ہیں۔ اس نے ایک پَل کے لیے کچھ سوچا اور اس کے بعد دبے پاؤں جلتی چتا کے پاس گیا اور وہاں بوڑھے کے لڑکے کی لاش کو جلنے کے لیے رکھ دیا۔ چند ہی لمحوں میں ایک کے بجائے دو لاشیں جل رہی تھیں۔

بوڑھے نے کہا: 'دھنیہ واد بھائی۔' اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اُس کے رونے کی آواز سُن کر موت کے کئی ٹھیکیدار اُدھر دوڑ کر آئے اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ ایک لاش کو بغیر

فیس دیئے جلا دیا گیا تو اُنھوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں۔
'کس نے بے اجازت یہ لاش اس چتا پر رکھی؟'
'میں نے!' مسافر نے کہا۔
'تو نکالوا کیاون روپے۔' ایک نے کہا۔
دوسرے نے یاد دلایا— 'اور پچیس نئے پیسے!'
پیسے ہمارے پاس نہیں ہیں۔' مسافر نے کہا۔
'تو پھر ہم اس لاش کو چتا پر سے اُٹھا کر دریا میں بہادیں گے۔'

مسافر نے بڑی نرمی سے کہا— 'وہ اب بھی مُردہ ہے اور جب بھی مردہ ہی رہے گا۔ جلنے نہ جلنے سے اُس کی آتما کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا مگر اس کے بوڑھے باپ کو دُکھ ہوگا— 'اور پھر اُس کی آواز میں ایک سختی کا انداز آ گیا۔' سو میں یہ نہ ہونے دوں گا۔' اور وہ چتا اور موت کے ٹھیکیداروں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔

'ہم تمھیں بھی اس آگ میں جھونک دیں گے بڑے میاں۔'

'جھونک دو۔ میں اب جلنے، ڈوبنے، مرنے کے خطروں سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو چکا ہوں۔ مگر تم میں سے کم از کم ایک کو میں اپنے ساتھ اس آگ میں گھسیٹ لے جاؤں گا۔'

لٹھیل اس کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی نے چلّا کر کہا— 'ارے اس کے پاس نہ جانا۔ یہ تو پاگل ہے۔ بڑا خطرناک پاگل ہے۔ اِسی نے آج بازار میں سیٹھ کروڑی مَل پکوڑی کا دوشالہ اتار لیا۔ سنا ہے سارناتھ میں جا کر بھگوان بدھ کی مورتی توڑ ڈالی۔ پولیس اور پاگل خانے والے سارے شہر میں اُس کی ڈھنڈیا مچا رہے ہیں۔

ایک اور آدمی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ 'تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بھی یہی سُنا ہے۔ پاگل آدمی کا کیا ٹھیک، آگ میں کود پڑے اور ساتھ کسی اور کو بھی لے مرے۔ میں نے تو سُنا ہے پولیس شکاری کتے لے کر اُس کا پیچھا کر رہی ہے۔' سو لٹھیل پیچھے ہٹ گئے اور بوڑھے کے نوجوان بیٹے کی لاش جل گئی اور جب چتا کے شعلے مدّھم پڑے تو سب نے دیکھا کہ وہ پگلا غائب ہے اور بوڑھا اکیلا کھڑا اپنے بیٹے کی راکھ کرید رہا ہے۔

'چلو چلو!' ایک نے کہا۔ 'تھانے میں رپورٹ کریں کہ پگلا ادھر ہی کہیں گھوم رہا ہے۔'

تھانیدار صاحب نے بڑے غور سے اُن کی رپورٹ کو سنا اور پھر ٹیلی فون اُٹھا کر نمبر ملایا-8-6-0-4۔

(5)

جاڑے کی رات اندھیری تھی، کالے آسمان میں ستارے ایسے جھلملا رہے تھے جیسے جھک کر دیکھنا چاہتے ہوں کہ نیچے زمین پر کیا ہو رہا ہے۔

ٹھٹھری ہوئی سُنسان سڑکوں پر پولیس کے شکاری ٹیئے ایک پاگل کی تلاش کر رہے تھے۔ جس نے ایک دن میں سارے شہر کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔

ایک اُجاڑ سُنسان مندر میں پُجاری دروازہ بند کر رہا تھا کہ اُس نے ایک پرچھائیں دیکھی۔

'کون ہے؟' اس نے ڈانٹ کر کہا۔ کیونکہ اُسے ڈر لگ رہا تھا۔

'میں ایک مسافر ہوں۔ رات کے لیے ٹھکانا چاہتا ہوں۔' آگیا' (اجازت) ہو تو مندر میں لیٹ رہوں؟'

'کون جات (ذات) ہو؟'

'مَنشیہ جات ہوں، مہاراج!'

'وہ جاتی ہم نہیں جانتے— دھرم کیا ہے؟ ہندو تو ہو نا؟'

مسافر نے کئی پَل سوچ کر گزارے۔ پھر بولا— 'نہیں مہاراج، میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں ہندو نہیں ہوں۔'

'پھر کیا ہو؟'

'انسان!'

'تو پھر جاؤ— انسانوں کا کوئی مندر کھوجو۔'

اور مسافر وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

مسجد کا مُلّا عشا کی نماز پڑھ کر اپنے حجرے میں جا رہا تھا کہ اُس نے دیوار کے پاس ایک سایہ دیکھا۔

'ارے کون ہے؟'

'میں ہوں۔ ایک مسافر!'

'کیا چاہتے ہو؟'

'رات بھر کے لیے ٹھکانا۔ بہت تھک گیا ہوں مولوی جی۔'

'تم کون ہو، مسلمان ہونا؟'

ایک بار پھر مسافر نے جواب دینے سے پہلے توقف کیا— جی نہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔'

تو پھر کیا ہو؟

انسان ہوں۔

جواب میں مُلّا نے دروازہ بند کر دیا۔

اور اب رات تھی۔ اندھیرا تھا۔ سناٹا تھا۔ برفیلی ہوا تھی اور ایک مسافر تھا۔ بے ٹھکانا۔ اور دور سے شکاری کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔

ستاروں کی روشنی میں ایک سفید سفید عمارت جھلملائی— پاس ہی چند لوگ اور بیٹھے تھے۔

'کیوں بھائی یہ عمارت کیا ہے۔ ایک طرف سے مسجد لگتی ہے، ایک طرف سے مندر۔'

'یعنی یہ مسجد بھی تھی اور مندر بھی۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں اسے بنایا گیا تھا کہ ہندو مسلمان سب دھرم والے ایک ہی جگہ اپنی اپنی عبادت یا پوجا پاٹھ کیا کریں۔ پھر اورنگ زیب نے اُسے توڑ کر اُسے مسجد بنا دیا۔ بعد میں کسی راجا نے اُسے مندر بنا دیا۔

'اور اب یہ کیا ہے؟' مسافر نے پوچھا۔

'اب یہ نہ مندر ہے نہ مسجد۔ کچھ بھی نہیں ہے۔'

'بس تو میرے جیسے آدمی کے لیے جو سب کچھ ہے اور کچھ نہیں ہے۔ جو ہر جگہ ہے اور کہیں نہیں ہے۔ یہی جگہ ٹھیک ہے۔'

ابھی وہ اس عمارت کے باہر ہی تھا کہ شکاری کتّوں کی آواز قریب آ گئی۔ بہت قریب۔

**(6)**

تھانے میں انسپکٹر پولیس نے پوچھا— اے بڈھے تمھارا نام؟'

مسافر نے اپنا نام بتادیا۔

'کام کیا کرتے ہو؟'

پہلے بُنکر تھا۔ جسے آپ بڑے لوگ جُلاہا بھی کہتے ہیں— کپڑا بُنا کرتا تھا اور پریم کے تانے اور گیان کے بانے سے سچائی کی چادر بننے کی کوشش کرتا تھا۔ پر میرا کرگھا تو کب کا ٹوٹ گیا۔ اُسی کی تلاش میں آیا تھا کہ شاید کسی اور کو مل گیا ہو اور میرا کام کر رہا ہو— مگر آپ نے وقت ہی نہیں دیا۔'

'سچ مچ پاگل ہے۔' سب انسپکٹر نے اپنے حوالدار سے کہا۔ 'ابھی بھیج دیتے ہیں، نہیں تو رات کو نہ جانے یہاں کیا گُل کھلائے۔'

تو پھر اُس نے ٹیلی فون اٹھایا اور ڈائل گھمایا۔

چار۔

صفر۔

چھ۔

آٹھ۔—4-0-6-8

اُدھر سے آواز آئی۔ 'ہیلو ماہم پاگل خانے سے بول رہے ہیں۔'

اور سب انسپکٹر نے کہا۔ 'ارے بھئی، وہ بنارس کا ٹھگ پکڑا گیا۔ ٹھگ وگ نہیں ہے۔ بڈھا بالکل پاگل لگتا ہے۔ سو اُسے بھیج رہے ہیں، کرپا کر کے ابھی داخلہ کرلو۔'

اُدھر سے آواز آئی۔ 'نام؟ نام کیا ہے؟'

سب انسپکٹر نے کہا۔ 'نام ہے کبیرا۔' اور فون رکھ دیا مگر مسافر وہاں سے جا چکا تھا۔

○

# تین عورتیں اور ایک ریل

تین عورتیں ایک ریل کی پٹری پر چل رہی تھیں۔

ایک عورت نے ( جو میلے چیتھڑے پہنے ہوئے بھکارن تھی) کہا 'میں تو اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ چند منٹ میں فرنٹیر میل آئے گی تو اُس کے نیچے آکر جان دے دوں گی۔ تمھارا کیا خیال ہے؟'

ماں نے کہا، جس کی گود میں تین ماہ کا بچہ تھا۔

'ہاں، ہاں ضرور بہت اچھا خیال ہے۔ اس ننھی سی جان کا بھی کام تمام ہو جائے گا۔ جس کے باپ کا ہی پتہ نہیں تو وہ جی کر کیا کرے گا۔'

مگر تیسری عورت جو جوان تھی اور جس کے بدن میں جوانی کا خمیر اور آنکھوں میں جوانی کا خمار تھا۔

'بولی: اری بیوقوفو۔ کیوں اپنی جان کی دشمن ہوئی ہو۔ زندگی جیسی قیمتی چیز کو قربان کرنا چاہتی ہو۔ میں تو زندہ رہنا چاہتی ہوں۔'

'مگر ہمارا تمھارا ساتھ تو بچپن سے ہے۔' بھکارن نے کہا:

'یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم مرجائیں اور تم زندہ رہو؟'

'ہاں ہاں۔' ماں بولی۔ 'اب مرنے کی ٹھان لی ہے تو سب کو ساتھ ہی مرنا ہوگا۔'

اتنے میں دوسری طرف سے سیٹی بجاتی، چھک چھک کرتی ہوئی فرنٹیر میل چلی آ رہی تھی۔

انجن ڈرائیور نے بڑے زور سے سیٹی بجائی۔

جوان عورت بھاگنا چاہتی تھی لیکن بھکارن اور ماں نے اُس کا دامن پکڑ لیا۔ وہ چھڑا نہ سکی۔

اگلے لمحے فرنٹیر میل نے بریک لگاتے لگاتے اُن کو کچل ڈالا۔

دفعتاً بریک لگانے کے جھٹکے سے مسافر جو اونگھ رہے تھے یا سو رہے تھے۔ اُٹھ بیٹھے۔ جھانک کر باہر دیکھنے لگے کہ کیا ہوا ہے۔

دو چار مَن چلے نیچے بھی اُتر گئے کہ خود معائنہ کریں کہ ریل کیوں رُک گئی ہے۔

واپس اپنے درجے میں آ کر اُنھوں نے کہا:

'ایک عورت اور اُس کا بچّہ ریل کے نیچے آ گئے ہیں۔ بھکارن جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھی مگر تھی جوان اور خوبصورت!'

بیسویں صدی، جون (1978)

○

# ڈریسنگ گاؤن

ایک بڑے سرکاری افسر کے بنگلے میں ایک چور کل سوتا ہوا پکڑا گیا۔ اس کے پاس ہی چوری کی ہوئی چیزوں اور کپڑوں کے تین گٹھر پڑے تھے۔ اور چور خود مالک مکان کی اونی ڈریسنگ گاؤن پہنے ڈرائنگ روم میں دیوان پر لیٹا خراٹے بھر رہا تھا۔ (نئی دہلی کی خبر)

دھیرے — بہت دھیرے .......... سے بھیکو نے باتھ روم کی کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں ہاتھ ڈال کر چٹخنی گرائی پھر بھی رات کے سناٹے میں چٹخنی گرنے کی آواز ایسی گونجی کہ بھیکو سمجھا اب تو سارا گھر جاگ گیا ہوگا۔ وہ فوراً دیوار کے سایہ میں دُبک کر بیٹھ گیا اور اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرتے، تالے توڑتے اُسے تین مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن اب بھی اس کے دل سے پکڑے جانے کا خوف نہ گیا تھا اور پھر آج تو وہ اس بنگلے میں چوری کرنے آیا تھا جہاں وہ کتنے ہی برس گذار چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جس گھر کا بچہ بچہ اسے پہچانتا ہے وہیں چوری کرنے جانا خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں آج اس کے قدم آپ سے آپ اُسے نمبر چھپن، گوتم روڈ تک لے آئے تھے۔

چٹخنی گرنے کی آواز باتھ روم ہی میں گونج کر رہ گئی اور سارا گھر اسی طرح لحاف میں لپٹا سوتا رہا۔ جب کئی منٹ تک نہ کوئی روشنی جلی اور نہ کوئی آواز آئی تو بھیکو کے دل کی دھڑکن کسی قدر کم ہوئی اور وہ اٹھا اور باتھ روم کی کھڑکی میں سے گھر میں داخل ہو گیا۔

اس بنگلے کا جغرافیہ بھیکو کو زبانی یاد تھا۔ اس باتھ روم سے ملا ہوا بچّوں کا بیڈ روم ہے جہاں گوپال اور گیتا اور سب سے چھوٹا منا سوتے ہیں اور ان تینوں کے پلنگوں کے بیچ میں ان کی کھلائی موٹی گلابو۔ اس کمرے کے سامنے ہی مسٹر بھوشن اور مسز بھوشن کا بیڈ روم ہے۔ پھر ڈرائنگ روم کا بڑا ہال جس کے دوسرے کونے پر ڈائننگ ٹیبل رکھی ہوئی ہے اور اس کے پاس ہی مہاگنی کا بڑا جناتی سائز کا سائڈ بورڈ جس کی درازوں میں چاندی کے چمچے کانٹے رہتے ہیں۔ چاندی کی آئس کریم کھانے کی پیالیاں اور چاندی کا چائے کا سیٹ دھرا رہتا ہے اور ان چیزوں کی تلاش میں ہی بھیکو آج ادھر آیا تھا۔

اس ہال کے بعد دوسری طرف بھی ایک بیڈ روم ہے مگر بھیکو کو معلوم تھا کہ اس کمرے میں اب کوئی نہیں رہتا۔ خالی پڑا رہتا ہے۔ نہ وہاں کوئی قیمتی سامان ہے۔ دیواروں پر پُرانی تصویریں ہیں جو وقت کے ساتھ پیلی پڑ چکی ہیں اور سنسکرت، ہندی اور اُردو فارسی کی پُرانی کتابیں ہیں اور ایک حقّہ ہے جو کئی مہینے سے بھرا نہیں گیا......

سو بھیکو نے شیشوں میں سے آتی ہوئی چاند کی روشنی میں ہی چیزیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ چمچے، کانٹے، چھریاں، چاندی کا چائے کا سیٹ، آئس کریم کی چاندی کی پیالیاں، چاندنی کے دُھندلکے میں اس نے دیکھا کہ دیوان پر کاغذوں میں لپٹے ہوئے چند بڑے بڑے پیکٹ رکھے ہیں۔ ان کو ٹٹولنے پر معلوم ہوا کہ لانڈری سے ڈرائی کلین ہو کر سوٹ آئے ہیں اور جلدی میں کوئی ان کو یہیں رکھ کر بھول گیا ہے۔ بھیکو نے سوچا ایک ایک سوٹ کم سے کم چالیس پچاس میں تو بک ہی جائے گا اس لیے ان کو بھی مالِ غنیمت میں شامل کر لیا۔ ایسے اس نے بچّوں کے بیڈ روم میں گزرتے گزرتے گوپال اور گیتا کی سونے کی گھڑیاں بھی میز پر سے اُٹھا کر جیب میں ڈال لی تھیں لیکن اس باقی سامان کو اُٹھا کر کیسے لے جائے؟ کوئی چادر مل جاتی تو کام بن جاتا۔ ایک گٹھری میں سب کچھ باندھ لیتا اور اُٹھا کر چلتا بنتا۔ چادر کہاں سے آئے؟ اس نے سوچا

مسٹر اور مسز بھوشن کا بیڈ روم تو اندر سے بند رہتا ہے بچّوں کی چادریں، تولیے وغیرہ بھی ان کی الماری میں رہتے ہیں۔ پھر اسے اس خالی کمرے کا خیال آیا جہاں ایک بستر اب بھی لگا ہوگا مگر سونے والا نہیں ہوگا۔

اس کمرے کے پچھواڑے ایک گھنا نیم کا درخت تھا۔ اس لیے اس میں چاندنی کا گذر نہیں تھا۔ گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بھیکو نے سوچا کھڑکیوں پر تو پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک منٹ کو روشنی کرلوں، چادر لیتے ہی پھر اندھیرا کردوں گا۔ برسوں اُس نے ہر رات کو پورے دس بجے بٹن دبا کر روشنی بُجھائی تھی۔ اُس کا ہاتھ بلا کسی دقت کے بجلی کے بٹن پر پہنچ گیا۔ ایک پل کے لیے تو دفعتا تیز روشنی ہونے سے اس کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ سامنے والی دیوار سے کوئی اسے گھور رہا ہے۔ یہ 'کوئی' صرف ایک بڑی تصویر تھی۔ ایک بوڑھے آدمی کی تصویر۔ گنجے سر کے اردگرد سفید بالوں کی جھالر، چمکدار آنکھیں جو تصویر کے پردے میں بھی رحم اور ہمدردی سے بھری نظر آتی تھیں۔ چہرے پر جھرّیاں مگر مسکراتے ہوئے ہونٹ۔

آپ سے آپ بھیکو کے ہاتھ نمسکار کے لیے اُٹھ گئے۔ من ہی من میں اس نے کہا 'نمستے پنڈت جی۔' وہ یہ بھول گیا کہ اس کمرہ میں وہ چادر لینے آیا تھا۔ چوری کے مال کا گٹھر بنانے۔ وہ اس گھر میں اس رات کیوں آیا تھا۔ کیا کرنے آیا تھا۔ وہ سب بھول گیا۔ اب وہ بیس برس کا ہٹا کٹا جوان نہیں تھا۔ سات برس کا ایک بچّہ تھا اور اس کے بدن پر پھٹے پُرانے چیتھڑے تھے اور وہ کناٹ پلیس میں کھڑا جاڑے کی رات میں بھیک مانگ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک راہ گیر کے سامنے ہاتھ پھیلایا اور اُس کے ہاتھ پر اکنّی رکھتے ہوئے راہ گیر نے پوچھا 'اے بچّے! تیرا باپ تجھے اس سردی میں بھیک مانگنے بھیجتا ہے۔ شرم نہیں آتی اسے۔'

'بچّے نے کہا تھا 'باپ نہیں ہے۔'

'اور ماں؟'

'ماں نہیں ہے۔'

'کاکا۔ ماما۔ پھوپھا۔ پھوپھی کوئی رشتہ دار تو ہوگا۔'

'کوئی نہیں ہیں۔'

'تو رہتا کہاں ہے؟'

'وہاں۔'

بچّہ نے ایک پیڑ کی طرف اشارہ کیا جس کے نیچے چند سائیکل، رکشہ والے الاؤ جلائے آگ تاپ رہے تھے۔

'میرے ساتھ چلے گا۔'

'چلوں گا۔'

اور سو بچّہ بوڑھے کی اُنگلی پکڑ کر اس کے ساتھ ہولیا تھا اور اس طرح پچپن نمبر گوتم روڈ میں پہلی بار داخل ہوا تھا اور کوٹھی کے اندر آتے ہی اُسے اپنی چھوٹی سی عمر میں پہلی بار چھت اور چار دیواری کا احساس ہوا تھا۔ بوڑھے نے اپنے بیٹے اور بہو سے کہا تھا۔ 'میں اس شرنارتھی بچّے کو لے آیا ہوں مگر یہ نوکر کی طرح نہیں رہے گا۔ میری اولاد کی طرح رہے گا۔' اور پھر جب پنڈت جی نے دیکھا تھا کہ بچّہ سردی سے کانپ رہا ہے تو انھوں نے اپنا اونی، کشمیری ڈریسنگ گاؤن اُڑھا دیا تھا اور ڈرائنگ روم ہی میں دیوان پر سُلا دیا تھا اور اپنی یاد میں پہلی بار بچّہ کو نرم اور گرم بستر نصیب ہوا تھا۔

باہر ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی اور رات کے سناٹے کو اور بھی سنگین بنا رہی تھی۔

بھیکو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس تصویر میں مسکراتے ہوئے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ اس سے کچھ کہہ رہے ہیں۔

'کیا ہے پنڈت جی؟' من ہی من میں اس نے سوال کیا۔

'پنڈت جی نہیں، بابا کہو بیٹا۔' تصویر خاموشی کی زبان بول رہی تھی۔ 'کیا ہے بابا؟'

'بڑے افسوس کی بات ہے کہ جس گھر میں میں تمھیں بیٹا بنا کر لایا اُسی گھر میں تم آج چوری کرنے آئے ہو۔'

'اب میں تمھیں کیسے سمجھاؤں بابا۔' بھیکو نے من ہی من میں ان تمام حالات کو یاد کیا جن کی وجہ سے وہ آج چور بن گیا تھا۔

جب پنڈت بال کرشن جی اسے اس گھر میں لائے تھے تو کئی برس تک انھوں نے اسے سچ مچ بیٹے کی طرح ہی پالا تھا۔ لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ اسکول بھیجا تھا لیکن پھر پنڈت جی پر فالج کا پہلا

دورہ پڑا تھا۔ دائیں ٹانگ اور دائیں بازو بیکار ہوگئے تھے۔ اب وہ گھر میں چل پھر نہیں سکتے تھے۔ بات بھی مشکل سے کر پاتے تھے۔ اب بیٹا اور بہو ان کی کوئی خاص پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ صرف بھیکو ہی ان کے پاس بیٹھا رہتا۔ ان کی سیوا کرتا۔ اسکول جانا بھی اس نے چھوڑ دیا۔ پھر ایک دن اس نے سنا کہ اسکول سے اس کا نام کٹوا دیا گیا ہے کیونکہ بھوشن صاحب کا کہنا تھا کہ نوکروں کے لیے زیادہ پڑھنا لکھنا غیر ضروری ہے۔ اب اسے کھانا بھی نوکروں کے ساتھ ملنے لگا۔ برتاؤ بھی نوکروں جیسا ہونے لگا۔ مگر اس نے ان باتوں کی خبر پنڈت جی کو نہ ہونے دی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ انھیں بہت دُکھ ہوگا۔ وہ لڑکھڑاتی زبان سے کبھی پوچھتے بھی کہ 'سب ٹھیک ہے نا' بھیکو ؟'

' تجھے کوئی تکلیف تو نہیں؟' تو وہ انھیں یقین دلا دیتا کہ وہ بالکل آرم سے ہے۔'

اور سو وقت گذرتا گیا۔ بوڑھے پنڈت جی کی حالت بگڑتی گئی۔ یہاں تک کہ سارا جسم مفلوج ہوگیا صرف آنکھوں میں جان باقی رہ گئی۔ اب تو بھیکو کے ساتھ اور بھی بُرا سلوک ہونے لگا۔ رات دن کا کام کرنا پڑتا۔ اب بھوشن صاحب کے جوتوں پر پالش کرو۔ اب مسز بھوشن کی ساڑی پر استری کرو۔ اب بچّوں کا کھانا اسکول لے جاؤ۔ اب رسوئی میں برتن مانجھو۔ اب ڈرائنگ روم کی صفائی کرو۔ تنخواہ کے نام کا اس کو ایک روپیہ بھی نہیں ملتا تھا کیونکہ مسز بھوشن کا کہنا تھا کہ آخر ہم نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے، پھر کھانا دیتے ہیں۔ رہنے کو جگہ دیتے ہیں، اور کیا چاہیے۔

پھر ایک دن پنڈت جی کا آخری وقت آن پہنچا۔ ان کی ٹانگیں بالکل ٹھنڈی اور بے جان ہوگئیں۔ بھیکو نے گھبرا کر ان پر دو تین کمبل اور ایک لحاف ڈال دیا۔ پھر بھی ٹانگوں میں گرمی نہ آئی تو اس نے پنڈت جی کا وہ پرانا اونی ڈریسنگ گاؤن بھی ڈال دیا اور اس ڈریسنگ گاؤن کو دیکھ کر پنڈت جی کے چہرے پر مرتے ہوئے بھی ایک مسکراہٹ دوڑ گئی جیسے ان کو اس میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا بچّہ یاد آگیا ہو اور انھوں نے بجھتی ہوئی آنکھوں سے ڈریسنگ گاؤن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خاموش ہونٹوں کی جنبش سے کہا۔ 'یہ تو لے لیجیو۔' اور پھر وہ چل بسے اور زندگی میں دوسری بار بھیکو یتیم ہوگیا۔

اور پھر ایک دن جب بھیکو اپنی نوکروں والی کوٹھری میں سردی سے کانپ رہا تھا۔ اسے

پنڈت جی کا آخری تحفہ یاد آیا مگر وہ ان کے کمرہ میں سے ڈریسنگ گاؤن لے کر نکل ہی رہا تھا کہ مسز بھوشن نے اسے دیکھ لیا اور چوری کے الزام میں اسے گھر سے نکال دیا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ 'کم سے کم سرٹی فیکیٹ دے دیجیے تا کہ کہیں اور کام مل جائے۔' مگر مسز بھوشن نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ 'میں چوروں کو سرٹی فیکیٹ نہیں دے سکتی۔'

وہ چور نہیں تھا پھر بھی انھوں نے اسے چور سمجھا اور سو وہ سچ مچ چور بن گیا تھا اور آج اسی گھر میں چوری کرنے آیا تھا۔

مگر پنڈت جی کی آنکھیں اس سے کچھ کہہ رہی تھیں۔

ادھر مڑ کر دیکھا تو دیوار پر وہی ڈریسنگ گاؤن لٹکی ہوئی تھی۔ اب وہ سمجھ گیا کہ پنڈت جی اس سے کیا کہہ رہے ہیں۔ 'بیوقوف چراتا ہے تو کوئی کام کی چیز چرا۔ چاندی کے چمچوں سے سردی نہیں جائے گی۔ اس کے لیے یہ ڈریسنگ گاؤن چاہیے۔'

اور سو وہ ڈریسنگ گاؤن لے کر ڈرائنگ روم میں واپس آیا جہاں وہ چاندی کے چمچوں، کانٹوں وغیرہ کا ڈھیر لگا گیا تھا مگر اب اس چاندی کے سامان میں وہ چمک نہیں رہی تھی۔

اوپر کا روشن دان شاید کھلا ہوا تھا۔ برفیلی ہوا کا ایک جھونکا اس کے قمیض کے کالر میں سے ہوتا ہوا اس کے سارے جسم کو کپکپا گیا۔ بے خیال اور بے اختیار اس نے ڈریسنگ گاؤن پہن لی اور دفعتاً اس کا سارا جسم ایک عجیب نرمی اور گرمی کے احساس سے بھرپور ہو گیا۔ یہ گرمی اون کی نہیں تھی۔ محبت کی گرمی تھی۔ ایک عجیب تھکن کے احساس سے چور ہو کر وہ دیوان پر بیٹھ گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے دفعتاً پنڈت جی نے اسے اپنی بانھوں میں لے لیا ہو۔ مگر اب وہ چور نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ جو بھوکا تھا اور تھکا ہوا تھا اور جسے بڑی سخت نیند آ رہی تھی اور جسے ڈریسنگ گاؤن کی ملائم گرماہٹ اب تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔

(نیا دور، لکھنؤ جنوری 1961)

○

# دیدی

دیدی نے کہا: 'میں تو آج نہاؤں گی۔'

سویتا بولی: 'تو میں بھی آج نہاؤں گی۔'

دیدی نے چڑ کر کہا: 'تو میں آج نہیں نہاؤں گی۔ مجھے تو بازار جانا ہے۔'

سویتا نے فوراً کہا: 'بازار تو مجھے بھی جانا ہے۔'

دیدی نے تنگ آ کر کہا: 'تو میں بازار نہیں جاؤں گی۔'

سویتا بولی: 'تو میں بھی بازار نہیں جاؤں گی۔'

سویتا نے بچپن سے ہی دیدی، یعنی بڑی بہن کی نقل کرنا سیکھا تھا۔ اگر دیدی پڑھ رہی ہے تو سویتا کی ضد ہوتی کہ وہ بھی پڑھے گی۔ اگر دیدی کھیل رہی ہے تو سویتا کا اصرار ہوتا کہ وہ بھی کھیلے گی۔

دیدی کی عمر پچیس برس سے زیادہ کی ہوگئی اور اُس کی شادی نہیں ہوئی۔ حالانکہ سویتا عمر میں بڑی بہن سے سات برس چھوٹی تھی۔ لیکن جو لڑکا بھی دیدی کو دیکھنے کے لیے آتا تھا اُس پر سویتا دل و جان سے فریفتہ ہو جاتی تھی۔

'دیدی کیوں اُس سے شادی کریں گی؟' وہ کہتی۔ 'شادی تو میں کروں گی۔ میری عمر اس

لڑکے کے برابر ہے۔ دیدی کی تو عمر اب بہت زیادہ ہوگئی ہے۔'

دیدی بہت پڑھی لکھی تھی۔ ڈبل ایم۔ اے، ہندی اور تاریخ میں۔ اس لیے عام طور سے اس کے پیغام بھی چھوٹے موٹے لیکچررس کے آتے تھے یا سول سروس کے نوجوان سرکاری افسروں کے۔ مگر سویتا جھٹ اُن پر عاشق ہو جاتی تھی اور اس لیے دو مُرغیوں میں مرغا حرام ہو جاتا۔

جل کر دیدی نے ایک دن اپنے باپ کی موجودگی میں کہا: 'میں نے تو فیصلہ کیا ہے کہ شادی ہی نہ کروں گی۔'

سنتے ہی سویتا جھٹ بولی: 'میں بھی شادی نہیں کروں گی۔ دیدی جو راستہ اختیار کریں گی وہی میں اختیار کروں گی۔'

دیدی نے جل کر کہا: 'میں تو مر جاؤں تو اچھا ہے!'

سویتا نے کہا: 'یہی تو میں سوچ رہی تھی کہ مر کیوں نہ جاؤں۔'

اُن دونوں کی ماں کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ ایک باپ بے چارہ تھا رام داس۔ وہ بھی گورنمنٹ ایجوکیشنل سروس سے پروفیسر کے گریڈ میں پہنچ کر ریٹائر ہو چکا تھا۔ دونوں لڑکیوں کی ضد سے وہ بھی ہار مان چکا تھا۔ لوگ لاکھ اُس سے کہتے کہ چھوٹی سویتا کی خاطر اُس کو بڑی لڑکی کی شادی نہیں روکنی چاہیے۔ مگر وہ کیا کرتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کو دونوں بن ماں کی بچیاں پیاری تھیں۔ کسی ایک کا دل توڑنا اُس کو منظور نہ تھا۔

آخر ایک نیا ضلع مجسٹریٹ اور کلکٹر آیا۔ تیس برس کے لگ بھگ عمر تھی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ خصوصاً آدی واسیوں کی معاشرت اور اُن کی تاریخ میں اُس کو بہت دلچسپی تھی۔ رائے پور میں اپنا تقرر اُس نے خود کرایا تھا۔ ایک دن اُس نے رام داس اور اُس کی دونوں بیٹیوں کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔

باتوں باتوں میں آدی واسیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اس نے دو دن آدی واسیوں کے علاقے میں دورے کا انتظام کیا تھا۔ سریتا کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اُس نے سریتا کو دعوت دی کہ آدی واسیوں کے علاقے میں اُس کے ساتھ چلے۔

سویتا نے فوراً کہا: 'کلکٹر صاحب، دیدی تو کہیں بھی اکیلی نہیں جاتیں، اس لیے اگر آپ ہم دونوں کو لے چلیں تو بہتر ہوگا۔' بے چارے کلکٹر نے ہاں کردی۔ اگرچہ جل کر اُس نے رام داس سے بھی کہہ دیا' آپ بھی چلیے۔ آپ کا تجربہ بھی کام آئے گا۔ ایک فیملی پک نِک ہوجائے گی۔'

مگر باپ کباب میں ہڈّی بننے کے لیے تیار نہیں تھا کہنے لگا: 'دراصل میری بڑی لڑکی اس سبجیکٹ میں بہت دلچسپی رکھتی ہے۔ اُسی کو آپ لے جائیں تو ٹھیک ہوگا۔'

'لیکن آپ کی چھوٹی بیٹی بھی ساتھ چلنا چاہتی ہے نا؟ اس لیے میں نے کہا کہ اگر آپ بھی ساتھ چلیں تو اچھا ہوگا۔'

'سویتا تو دیوانی ہے۔'

'کیوں پاپا، سریتا جائے تو کچھ حرج نہیں اور میں جاؤں تو دیوانی ہوگئی؟'

'ایسے معاملوں میں چھوٹے، بڑے آدمیوں کی بات میں ٹانگ نہیں اڑاتے۔ کلکٹر صاحب آپ سریتا ہی کو لے جایے۔ سویتا نہیں جائے گی۔'

پہلی بار سویتا باپ کے ڈر سے چُپ رہی اور زیادہ کج بحثی نہیں کی۔ ڈنر ختم ہونے پر وہ واپس گھر آگئے۔

اگلے دن کلکٹر صاحب کا فون آیا جو سریتا کے نام آیا تھا، مگر راستے میں سویتا حائل ہوگئی۔

'جی جناب۔' اُس نے ٹیلی فون پر کہا۔

کلکٹر نے صاف ہی پوچھ لیا: 'آپ سریتا بول رہی ہیں یا سویتا؟'

'آپ کا کیا خیال ہے؟'

'آپ تو چھوٹی بہن سویتا معلوم ہوتی ہیں۔' کلکٹر صاحب نے کہا۔

'اچھا۔ تو دیدی سے بات کیجیے مگر کم سے کم ہمارا نمستے تو وصول کیجیے۔'

'نمستے۔' کلکٹر صاحب نے کہا۔

'اب کون بول رہا ہے؟'

سریتا نے فون لیتے ہی کہا' میں سریتا بول رہی ہوں۔'

'سریتا یا سویتا؟' 'سریتا۔ س۔ ر۔ ی۔ ت۔ ا۔'

'اچھا نمستے، جناب!'

'فرمایے، کیا کہنا ہے؟'

'کہنا کیا ہے؟ یہ بتانا ہے کہ رات ڈنر بہت کامیاب رہا۔ میں نے تو اس سے پہلے کبھی اتنا کھانا نہیں کھایا۔ مگر آپ نے بہت کم کھایا۔ کیا آپ ہمیشہ کم کھاتی ہیں؟'

'جی ہاں۔ کچھ کم ہی کھاتی ہوں۔ موٹی ہونے سے ڈرتی ہوں نا۔'

'موٹی ہونے سے ڈرتی ہیں؟ آپ تو کبھی موٹی نہیں ہوں گی۔ اگر آپ کا وزن دس کیلو اور بھی بڑھ جائے تو اچھا لگے گا۔ میں نے اس لیے کہا کہ ساتھ چلنا ہے تو آپ کی بھوک کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ ہاں یہ بتایے کہ آپ گھوڑے پر سواری کر سکتی ہیں؟'

'جی ہاں، کر سکتی ہوں۔ اگر چہ چار پانچ سال سے پریکٹس نہیں کی ہے۔'

'تو ٹھیک ہے۔ آپ کے لیے ایک شریف گھوڑے کا سلیکشن کر لیں گے۔ آپ کو یاد رہے گا نا کہ پرسوں صبح کو جانا ہے ہمیں؟'

'جی ہاں، یاد ہے۔'

'آپ کی چھوٹی بہن کیا کہہ رہی ہیں؟'

'کچھ نہیں کہہ رہی ہے۔ مگر محسوس کر رہی ہے کہ اگر وہ بھی جاتی تو اچھا تھا۔'

'اچھا تو گڈ بائی۔ پرسوں ملاقات ہوگی۔'

'بائی بائی۔'

ٹیلی فون کا سلسلہ کٹ گیا تو سویتا بولی، 'جاؤ جاؤ، کلکٹر صاحب کے ساتھ اکیلی جاؤ۔ میں تو صرف تمھاری عزّت کی خاطر ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔' اور پھر وہ چپ چاپ بڑبڑاتی رہی۔

اس کے بعد سریتا اور سویتا دونوں ایک دوسرے سے کتراتی رہیں۔ سریتا تو خوش تھی کہ ایک اچھے اور خوش حال نوجوان کے ساتھ جانے کا موقع ملا ہے۔ بدنامی کے ڈر سے کلکٹر صاحب نے (جن کا نام سریش تھا) اپنی سیٹی CITY مجسٹریٹ مسز شرما کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ دو عورتوں کی ہمراہی میں اسکینڈل ہونے کا ڈر کم تھا۔

صبح کو چھ بجے کلکٹر کی کار سریتا کو لینے کے لیے آئی۔ سریتا اشتیاق کے مارے ساری رات

نہیں سوئی تھی۔ صبح کے پانچ بجے سے تیار تھی، اس لیے فوراً موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ سویتا اپنے کمرے کی کھڑکی سے اُسے 'بائی بائی' کر رہی ہے۔ شاید اُس کو بھی نیند نہیں آئی تھی۔

کلکٹر کے ہاں سریتا کی ملاقات لیلا سے ہوئی، جو سیٹی CITY مجسٹریٹ تھی۔ سریتا نے یہ نام سُن رکھا تھا۔ لیلا نے بھی سریش کی زبانی سریتا کا نام سنا تھا۔

گھوڑوں پر سوار ہو کر وہ آدی باسیوں کی بستی کی طرف چلے، جس کا نام تھا آنند گاؤں۔ کوئی بیس میل کا فاصلہ تھا۔ پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ راستے میں جنگل کے درختوں کی چھاؤں میں لنچ کھایا گیا جو کلکٹر کے خانساماں نے پکایا تھا۔ وہ بھی ایک چوتھے گھوڑے پر سوار تھا اور جلدی میں تھا کہ رات ہونے سے پہلے 'صاحب' اور اُن کے مہمانوں کے لیے کھانا پکا لے۔

لیلا سریتا کی ہم عمر تھی۔ باتوں باتوں میں انھیں کتنی ہی مشترکہ سہیلیوں کا سراغ ملا، جن میں سے اکثر کی شادی ہو چکی تھی۔ اُن کے بارے میں دونوں ساتھ چلتے ہوئے باتیں کرتی گئیں۔

لیلا شرما چابک دست گھوڑ سوار تھی۔ سریتا بے چاری نے تو کالج کے رائیڈنگ اسکول ہی میں گھوڑ سواری کی ٹریننگ لی تھی۔ اس کو بھی پانچ سال گزر چکے تھے۔ اس لیے دل ہی دل میں کچھ ڈر رہی تھی۔ لیکن اس نے اپنے کچے پن کو ظاہر نہ ہونے دیا بلکہ سریش نے تو ایک بار اُس کی گھوڑ سواری کی تعریف بھی کی۔ کہنے لگا 'مِس سریتا، آپ تو بہت اچھی گھوڑ سوار نکلیں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ کچی نکلیں تو کیا ہوگا؟'

سریتا ہنس کر بولی:

'ابھی تو ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔'

سریش نے کہا 'شعر تو آپ نے حسبِ حال چنا ہے۔'

شام ہوتے ہوتے وہ آدی باسیوں کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہاں سب آدی باسی بوڑھے جوان، عورت، مرد اور بچے لائن میں اُن کے سواگت کے لیے کھڑے تھے۔ سب نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کلکٹر صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو سلام کیا۔ کلکٹر صاحب نے اس کا جواب آدی باسیوں کی

بھاشا میں دیا۔

'کیا کہا ہے کلکٹر صاحب نے؟' سریتا نے لیلا سے پوچھا۔

لیلا نے دھیرے سے کہا 'پورا مطلب تو میں نہیں سمجھی۔ اتنا سمجھی ہوں کہ آشیرواد دیا ہے۔'

پھر گاؤں سے نکل کر انھوں نے آشرم کا معائنہ کیا جو سب کو بہت پسند آیا۔ تین کمروں کا اچھا خاصا مکان تھا۔ ایک چوڑا سا برآمدہ یا دالان تھا جس میں تین کمروں کے دروازے کھلتے تھے، جہاں لڑکے لڑکیاں رہتے تھے۔ دو کمرے لڑکوں کے لیے تھے اور ایک لڑکیوں کے لیے۔ بڑے صاف ستھرے کمرے تھے۔ جگہ جگہ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ الماریوں میں ایک مختصر سی لائبریری تھی۔ میزوں پر ہندی کے سرکاری رسالے رکھے ہوئے تھے۔

رات کو گاؤں کے بارہ لڑکوں، لڑکیوں کی مشترکہ شادی تھی، جو کلکٹر کو سرکاری نمائندے کی حیثیت سے انجام دینی تھی۔ یہ کام اُس نے بخوبی کیا اور سب کو پہلے آشیرواد دیا اور بعد میں اپنے ساتھ لائے ہوئے تحفے دیئے۔ جن میں لڑکوں کے لیے زیادہ تر کتابیں شامل تھیں اور لڑکیوں کے لیے سلائی کا سامان۔ سب جوڑے یہ تحفے پاکر بہت خوش ہوئے۔

دو خیموں میں اُن کے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک خیمے میں سریتا اور لیلا ٹھہریں۔ دوسرا خیمہ کلکٹر کو ملا، جہاں وہ رات کو سویا بھی اور آدی واسیوں سے بات چیت بھی کی۔ رات کو دیر تک گرام پنچایت کے ممبر کلکٹر سے اپنے گاؤں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ رات کے بارہ بجے کلکٹر نے گرام پنچایت کے ممبروں کو رخصت کیا۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو ایک عجیب وغریب آواز آنی شروع ہوئی جو بیک وقت گانا بھی تھا اور رونا بھی۔ سریتا تو پریشان سی ہوگئی۔ لیلا سے پوچھنے لگی کہ یہ کیسی آواز ہے۔ کلکٹر نے انھیں بتایا کہ گاؤں میں کوئی بوڑھا آدمی مر گیا ہے اور اب اُس کا ماتم ہو رہا ہے۔ ساتھ میں اُس کی روح کو ہدایات دی جارہی ہیں کہ اب اُس کو کیا کرنا چاہیے۔ مطلب کچھ ایسا تھا:

اب تم مر گئے ہو۔

تمھاری روح بھٹکتی ہوگی۔

تمھاری روح اب ایک نئے جسم میں داخل ہوگی۔
تم دوبارہ پیدا ہوگے۔
مگر اس کا خیال رکھنا کہ کسی افسر کے گھر نہ پیدا ہونا، نہیں تو گھوڑے پر سوار ہو کر مارے مارے پھرنا ہوگا۔
اور کسی سود خوار بنئے کے خاندان میں جنم نہ لینا، نہیں تو غریب آدی واسیوں پر ظلم کروگے۔
نہ کسی برہمن کے گھر میں جنم لینا کہ روز کہیں شادی کرانی ہوگی، کسی کا کریا کرم کرانا ہوگا۔
تمھارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اگلا جنم بھی کسی آدی باسی کے گھر میں لینا۔
تمھارے لیے یہی جنم سب سے اچھا رہے گا۔

سریتا کو یہ نصیحت نامہ بہت اچھا لگا اور اس نے اپنی نوٹ بک میں اسے لکھ لیا۔

صبح سویرے سب اُٹھ گئے۔ آدی واسیوں سے رخصت ہو کر وہ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ لیکن سریتا کی گھوڑی زور سے ہنہنائی اور چند سیکنڈ کے لیے الف ہوگئی۔ کلکٹر نے تجویز پیش کی وہ اپنا گھوڑا سریتا کی گھوڑی سے بدل لے گا، لیکن سریتا اس پر راضی نہ ہوئی۔ اس نے سوچا، شاید اُس کو سب اناڑی سمجھتے ہیں۔ وہ بڑی شدّت سے FEMINIST تھی بلکہ اُس کو LIBBER کہنا چاہیے۔ وہ اپنی گھوڑی پر جمی رہی، اگرچہ دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی۔ 'یہ میرا امتحان ہے آج، اُس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ آج میں فیل ہوگئی تو کسی قابل نہیں رہوں گی۔'

کلکٹر گھوڑ سواری کا ماہر تھا۔ مگر گھوڑا اُس کا بھی بھاگنے کا شوقین تھا۔ دو تین میل تک تو اس نے گھوڑے کو قابو میں رکھا، اس کے بعد وہ فروٹ ہوگیا۔

سریتا کی گھوڑی بھی اس گھوڑے سے خار کھاتی تھی۔ اس کو منظور نہیں تھا کہ وہ گھوڑا اس سے سبقت لے جائے۔ لاکھ سریتا نے اُس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی، مگر وہ نہیں مانی۔ اُس نے تھوڑی دیر میں ہی کلکٹر کے گھوڑے کو جالیا اور اگلے لمحے میں وہ اس سے کہیں آگے نکل چکی تھی۔

راستے میں سڑک ایک پہاڑی کے اوپر سے جاتی تھی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے گھوڑی سریتا کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ یکا یک گھوڑی نے اپنی لمبی گردن کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور سریتا اُس جھٹکے کے ساتھ گر پڑی اور پتھر پر سر لگنے سے بے ہوش ہوگئی۔ کلکٹر کا گھوڑا کچھ ہی پیچھے تھا۔ اس

نے فوراً ہی بے ہوش سریتا کو جالیا۔ گھوڑی ابھی تک سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ کلکٹر نے اپنی رائفل سے نشانہ لگایا اور ایک ہی فائر میں اُسے گرادیا۔ جب کلکٹر گھوڑی کے قریب پہنچا تو اُس کو تڑپتے پایا اور جیب سے پستول نکال کر اُس کی جان کنی کو ختم کر دیا۔

پھر واپس سریتا کے پاس پہنچ کر کلکٹر نے دیکھا کہ لیلا سریتا کو فرسٹ ایڈ دینے کا سامان کر رہی ہے۔ سریش بھی لیلا کی مدد کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اسے خوشی ہوئی کہ سریتا کے زیادہ چوٹ نہیں لگی ہے اور وہ صرف پتھر سے سر ٹکرانے کے باعث بے ہوش ہوئی ہے۔

بھگوان کا شکر ہے کہ بے چاری گر کر بچ گئی، ورنہ پروفیسر شرما کو میں کیا منہ دکھاتا۔ اب اس کو اس کے گھر لے چلنا چاہیے اور سول سرجن کو بلانا چاہیے۔'

عملے کے کئی آدمی کلکٹر کے ساتھ تھے۔ اُن کی مدد سے سریش نے ایک ڈولی اسٹریچر کا انتظام کیا اور سریتا کو اس پر ڈال کر لے چلے۔ گھوڑے اب آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

جب یہ قافلہ سریتا کے گھر پہنچا تو سویتا اور اُس کے پتا جی گھبرا گئے۔ وہ سمجھے کہ سریتا ایکسی ڈینٹ سے مرگئی ہے۔ مگر جلد ہی اُن کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔

'اس لیے میں کہتی تھی کہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے تو میں دیدی کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہوتی نا؟' سویتا بولی۔

سریتا کو اس کے کمرے میں لٹا دیا گیا۔ جب تک سول سرجن آکر اُس کا معائنہ کرے، سویتا اکیلی کمرے میں اس کے ساتھ رہی۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب تک کلکٹر سول سرجن کو لے کر آیا، سویتا نے سریتا کے کپڑے بدل دیئے تھے۔ اُس کے شلوار کرتے پر خون اور مٹی کے دھبے لگ گئے تھے۔ اُس کے بدلے اُس کو نائٹ سوٹ کا کرتا پاجامہ پہنا دیا گیا اور اس کو ایک باریک چادر سے ڈھک دیا گیا۔ سریتا بے ہوشی میں تھی، اس لیے سویتا کو حق تھا کہ اپنی دیدی کو جس طرح چاہے کپڑے پہنائے۔ کچھ دیر بعد رام داس کمرے میں آنے لگے تو سویتا نے اپنے باپ کو بھی کمرے میں آنے سے روکنا چاہا، مگر وہ نہ مانے اور کمرے میں آ ہی گئے۔ مگر اپنی بڑی لڑکی کا خاموش چہرہ دیکھ کر وہ فوراً باہر چلے گئے۔ جب سول سرجن آیا تو وہ اور کلکٹر پھر کمرے میں داخل ہوئے۔ سول سرجن کو ایسے حادثوں کی عادت تھی۔ اُس نے فوراً اپنے بیگ سے ایک

چھوٹی شیشی نکالی اور بے ہوش لڑکی کو سنگھادی۔ اُس سے اُس کو کئی چھینکیں آئیں اور اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

'میں کہاں ہوں۔' وہ کم زور آواز میں بولی۔

'بیٹی، تم اپنے گھر میں ہو۔' باپ نے اُسے یقین دلایا۔ 'سول سرجن صاحب تمھاری دیکھ بھال کے لیے آئے ہیں۔ بہت قابل آدمی ہیں۔ دیکھو نا، ایک چھوٹی سی شیشی سنگھائی۔ تمھیں دو چھینکیں آئیں اور تم بے ہوشی سے ہوش میں آ گئیں۔'

بعد میں سول سرجن نے کہا کہ اُس کو معائنہ کرنا ہے، اس لیے سب لوگ باہر چلے جائیں۔ باپ اور کلکٹر دونوں باہر چلے گئے۔ مگر چھوٹی بہن اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سول سرجن سے کہنے لگی 'آپ مجھے فی الحال اپنی نرس سمجھئے۔ میں آپ کی مدد کروں گی۔ میں بیمار کی چھوٹی بہن ہوں۔'

'اچھا، اُن سے پوچھئے کہ یہ خود پلنگ پر سہارا لے کر بیٹھ سکتی ہیں۔'

سریتا کی آواز مشکل سے نکلی۔ 'مجھ سے تو اٹھا نہیں جاتا۔ کمر میں بڑی سخت چوٹ لگی ہے۔'

'تو پھر آپ سہارا دے کر بٹھایئے۔' سول سرجن نے چھوٹی بہن سے کہا۔ اور اُس نے فوراً پلنگ پر بیٹھ کر بڑی بہن کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔

سول سرجن نے اسٹیتھو اسکوپ بار بار لگا کر سریتا سے لمبے لمبے سانس لینے کو کہا۔ جب اُس نے کہا کہ وہ سانس لیتی ہے تو کمر میں شدید درد ہوتا ہے تو سول سرجن نے 'نرس' سویتا سے کہا کہ وہ اپنی بہن کو آرام سے لٹا دے پھر اُس نے بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ نکالا۔ خوش قسمتی سے بلڈ پریشر تقریباً نارمل ہی نکلا، جب کہ اتنی سخت چوٹ لگنے سے بلڈ پریشر اکثر اونچا ہو جاتا ہے۔

پھر زخمی سریتا کو اطمینان دلانے کے لیے ڈاکٹر نے کہا: 'مس آپ خوش قسمت ہیں کہ اتنی سخت چوٹ کھا کر بھی زندہ ہیں۔ یہ ہماری پہلی جیت ہے، اُمید ہے کہ ہماری دوا اور آپ کے آرام کرنے سے آپ ایک دو مہینے میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ مگر ہمیں آپ کی اسکریننگ کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے آپ کو کہیں جانا نہیں پڑے گا۔ میں اسکریننگ مشین یہیں لے آؤں گا۔'

پھر وہ کمرے کے باہر گیا اور باپ اور کلکٹر صاحب کو بھی یہی خبر دی کہ اُس کا خیال ہے کہ کمر

میں کچھ پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ مگر یقین کے ساتھ اسکریننگ کے بعد ہی وہ کچھ کہہ سکے گا۔' فی الحال فکر نہ کیجیے۔ آپ کی لڑکی اور آپ کی دوست کی جان تو بچ گئی ہے۔ اتنی بڑی چوٹ کا نتیجہ تو خوف ناک بھی ہوسکتا تھا۔ اب پریشانی صرف صرف یہ ہے کہ دو ایک مہینے تک مس سریتا کو پلنگ پر لیٹے رہنا ہوگا۔'

اُس دن سریش سول سرجن کو لے کر چلا گیا۔ اگلے دن جب سول سرجن اسکریننگ مشین لے کر آیا تو سریش پھر موجود تھا۔ دراصل سریتا کی چوٹ کے لیے وہ خود کو ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ نہ وہ آدی واسیوں کے گاؤں جاتا، نہ یہ خطرناک حادثہ ہوتا۔ اس لیے اس کی پوزیشن ایک ملزم جیسی تھی۔ گھوڑے پر سوار سریتا نے اس سے شادی کا وعدہ کرلیا تھا اور اُس کے فوراً بعد ہی یہ حادثہ ہوا۔ پھر وہ خود کو ذمہ دار کیوں نہ سمجھتا۔

اسکریننگ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا، 'وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ دو یا تین پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔'

سویتا نے پوچھا'' کیا آپ پلاسٹر میں رکھیں گے ہماری دیدی کو؟'

'پسلیوں کے لیے پلاسٹر نہیں کیا جاتا، بلکہ پلاسٹر کی پٹیاں باندھی جاتی ہیں۔ وہی کرنا پڑے گا۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔'

پٹیوں پر پلاسٹر پہلے سے لگا ہوا تھا، اس لیے گیلی پٹیاں فوراً بدن سے چپک گئیں— گویا پٹیوں کے پنجرے میں دیدی قید ہوگئی۔ اٹھنے بیٹھنے کو تو پہلے ہی ڈاکٹر نے منع کر رکھا تھا، اب تو سانس لینا بھی مشکل ہوگیا۔ مگر دیدی جتنی مجبور ہوتی جارہی تھی، اُتنی ہی سویتا کی خوشی اور ذمہ داری بڑھتی جارہی تھی۔

ایک دن جب کلکٹر آیا تو اس نے سریتا سے علیحدگی میں بات کرنے کی اجازت مانگی۔ سویتا نے چاروناچار اجازت تو دے دی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا: 'کلکٹر صاحب۔ صرف پانچ منٹ کی اجازت ہے جو بات چاہیں کر لیجیے۔ مگر میں پانچ منٹ کے بعد آجاؤں گی۔'

سریش کو پانچ منٹ بھی نہیں چاہئیں تھے۔ اُسے ایک ہی بات کرنی تھی۔ سریتا کو صرف یہ یقین دلانا تھا کہ جو بات میں نے گھوڑے پر سوار ہوکر کی تھی، وہ اب بھی برقرار ہے۔ میرے

جذبات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اُمید ہے تم بھی وہی جذبات رکھتی ہوگی۔'

یہ سنتے ہی سریتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اُس نے آہستہ سے کہا 'شکریہ۔'

'تو شادی اِس حالت میں کروگی یا غسلِ صحت کرنے کے بعد؟'

'ابھی نہیں۔ اس پنجرے سے نکلنے کے بعد۔' اُس نے اپنی پٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اتنے میں سویتا واپس کمرے میں آ گئی اور گفتگو بند ہوگئی۔

'اچھا تو میں چلتا ہوں۔' کلکٹر نے اُٹھتے ہوئے کہا 'کل اسی وقت آؤں گا۔ اگر سویتا مجھے پانچ منٹ اپنی ڈیڈی سے بات کرنے کے لیے دے دیں گی۔'

'بس پانچ منٹ ملیں گے۔' سویتا نے مجبوراً وعدہ کر لیا۔

آج کل سویتا بہت خوش رہتی ہے۔ اپنی ڈیڈی کی وہ نہ صرف ڈاکٹر تھی، بلکہ نرس بھی تھی اس کے علاوہ وہ جیلر بھی تھی۔ اُس کی اجازت کے بغیر سویتا نہ کسی سے بات کر سکتی تھی، نہ کچھ کھا پی سکتی تھی۔

جب کلکٹر سریش چلا گیا تو سویتا نے اپنی بڑی بہن سے پوچھا: 'کیا باتیں ہوئیں؟'

سریتا نے مسکرا کر جواب دیا 'کچھ خفیہ باتیں ہوئیں۔'

'مجھ سے بھی خفیہ؟' سویتا نے پوچھا۔

'ہاں۔ بلکہ خاص طور سے تم سے خفیہ۔ میں تمھاری شکایت کر رہی تھی۔'

'کیا شکایت؟'

'یہی کہ تم مجھ پر ہر وقت حکم چلاتی ہو۔ کوئی بات تک نہیں کرنے دیتیں۔ ایسی میری نرس ہوتی تو میں کب کا اُس کو ڈسمس کر ڈالتی۔'

'اچھا نہ بتاؤ۔ میرے اپنے طریقے ہیں معلوم کرنے کے۔'

اُس روز سویتا نے نہ ڈیڈی کو پیشاب کرنے کا برتن دیا، نہ بیڈ پین دیا، جس کو صحیح جگہ لگانے کے لیے خود اُس کی ضرورت پڑتی تھی۔

بڑی بہن بھی اُس سے دن بھر نہیں بولی۔

یہ خاموش، سرد جنگ، دن بھر چلتی رہی۔ آخر تنگ آ کر دیدی نے کہا: اندھیرا ہو گیا ہے لائٹ جلا دے۔'

سویتا نے کمرے کی سب لائٹس جلا دیں تا کہ دیدی کی آنکھوں کو تکلیف پہنچے۔ تنگ آ کر بڑی بہن کو کہنا پڑا، 'سویتا، تم جیتیں، میں ہاری۔'

'تو پھر بتاؤ، کیا بات ہوئی تھی؟'

'وہ شادی کے وعدے کو یاد دلا رہے تھے؟'

'تو تم نے ایک دن کے ٹرپ میں شادی کا وعدہ بھی کر دیا!'

'کر تو دیا تھا۔ مگر اب پچھتا رہی ہوں۔'

'کیوں؟ اب کیا ہوا؟'

'اب میں ایک اپاہج ہوں۔ پتہ نہیں یہ حالت کب تک رہے۔ دو مہینے یا دو برس۔ یا عمر بھر کا روگ ہو جائے۔ میں تو اس سے نکلنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی کا ترس کھا کر شادی کرنا اچھا نہیں لگے گا۔'

'یہ تو ٹھیک بات کہی تم نے یاد ہے اسٹیفان زویگ کی کتاب BE WARE OF PITY؟'

'وہی میرا مطلب ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ سریش مجھ سے ترس کھا کر شادی کرے۔'

'یہ تو عقل کی بات سوچی تم نے دیدی۔'

پھر اُس نے سریتا کو پیشاب کا برتن بھی دے دیا اور بیڈ پین بھی لگا دیا۔

اگلی دفعہ جب سریش آیا تو اس نے سریتا سے بات کرنے کے لیے پھر پانچ منٹ مانگے۔

'پانچ منٹ تک شوق سے باتیں کر لیجیے، مگر آپ کا ترس کھانا دیدی کو پسند نہیں،' سویتا نے کہا۔

'کیوں کیا ہوا؟'

'اسٹیفان زویگ کب کا کہہ گیا ہے:

BEWARE OF PITY

دیدی نہیں چاہتی کہ آپ اُس پر ترس کھا کر اُس سے شادی کریں۔ کوئی بھی پڑھی لکھی لڑکی ایسی حالت میں شادی نہیں کرے گی۔'

'مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں ترس کھا کر شادی کر رہا ہوں؟'

'دیدی کی حالت ایسی ہے کہ رحم کے علاوہ کوئی اور جذبہ بیدار ہی نہیں ہو سکتا؟'

'یہ تو تمھارا کہنا ہے۔ میں اس سلسلے میں سریتا سے بات کرنا چاہوں گا۔'

'تو بات کر کے دیکھ لیجیے۔ مگر میں صرف پانچ منٹ آپ کو دے سکتی ہوں۔'

'اس پانچ منٹ کے لیے شکریہ، سویتا۔'

سریش پہلے ہر روز آتا تھا۔

پھر اس نے ایک دن بیچ میں ناغہ کرنا شروع کر دیا۔ بہانہ یہ تھا کہ کام بہت ہے۔

اس کے بعد اس نے ہر ہفتے آنا شروع کر دیا۔ چھٹی کا ایک ہی تو دن ہوتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی اتوار کو بھی اسے کوئی دورہ کرنا ہوتا تھا۔ کسی مرتبہ اگر اتوار کو دورہ نکل آیا تو پھر اگلے اتوار کو وہ ضرور آتا تھا۔

اس درمیان سویتا کے رنگ روپ اور شباب پر اور بھی نکھار آ گیا تھا۔ اب سریش سریتا سے کم ملتا تھا، اور جب ملتا بھی تھا تو زیادہ وقت سریتا کی مزاج پرسی میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھی سویتا سریش کے گھر پر کسی ڈنر یا پارٹی میں مدعو ہوتی تھی تو وہ دیدی اور اپنے پتا کو چھوڑ کر گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے ان کے ہاں ہو آتی تھی۔

'جب انھوں نے دیدی کے لیے اتنا کچھ کیا تو ہمیں بھی جواب میں کچھ کرنا چاہیے۔' سویتا اکثر کہتی۔ مگر یہ روز روز کی ملاقاتیں رنگ لائیں۔ کچھ ہی دن میں سریش نے اپنے دوستوں سے کہنا شروع کر دیا کہ پروفیسر شرما کی بڑی بیٹی نہ سہی تو چھوٹی بیٹی کو تو قبول کرنا ہی چاہیے۔ جب یہ خبر سریتا تک پہنچی تو اُس نے ایک لمبا سانس کھینچا اور رات کو جب روشنی گل ہو گئی تو لیٹے لیٹے اُس نے خوب آنسو بہائے۔ اسٹیفان زویگ کا کہنا اپنی جگہ ٹھیک تھا، لیکن آنسو کوئی انگریزی پڑھے ہوئے تو ہوتے نہیں۔ وہ خوب روئی یہاں تک کہ سویتا جب سریش کے ہاں سے واپس آئی تو سسکیوں کی آواز سن کر وہ دیدی کے کمرے میں آ گئی۔

'دیدی کیا ہوا؟'

'کچھ نہیں اکیلے لیٹے لیٹے جی بھر آیا تھا۔ میں تو اپاہج ہو کر ہر ایک کے لیے بوجھ بن گئی

ہوں۔ ڈیڈی کے لیے، تمھارے لیے، نوکروں کے لیے، یہاں تک کہ اپنی سہیلیوں اور ملنے والیوں کے لیے بھی ایک بوجھ بن گئی ہوں۔'

'کیوں، ڈاکٹر نے کچھ کہا ہے کیا؟'

'نہیں، ڈاکٹر بے چارہ کیا کہتا۔ وہ تو یہی کہتا ہے کہ اگلے ہفتے سے میں وہیل چیئر پر چل پھر سکوں گی۔'

'یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ پھر تو تم ہماری شادی میں بھی شریک ہو سکوگی۔'

پروفیسر شرما کا ایک بھتیجا کرشن چندر بمبئی میں ایک انجینئرنگ کمپنی میں ملازم تھا۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر رائے پور آیا۔ اُس نے سریتا کی حالت دیکھی تو اصرار کیا کہ اس کے علاج کے لیے بمبئی لے جایا جائے۔ پہلے تو سریتا نے انکار کیا۔ کہنے لگی 'میں تو پلنگ پر سوار ہوں۔ کب تک رہوں گی؟ یہ نہیں معلوم۔ جو چوٹ لگ چکی ہے، اس کا تو اب تک علاج یہاں نہ ہو سکا، سوا اس کے کہ پسلیوں کی پٹیاں اُتر چکی ہیں۔ مگر ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی ہے یا بے کار ہو گئی ہے۔ اُس کا علاج اب کیا ہوگا؟' پھر سویتا کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں، یہاں تک کہ کارڈ بھی چھپ کر آ گئے تو سریتا نے عین شادی کے دن بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ 'میں یہاں کے ہنگامے سے جتنی دور جا سکوں، اتنا ہی اچھا ہوگا۔' اس نے رات کو روتے ہوئے فیصلہ کر ڈالا اور چچازاد بھائی (جو اُس سے چھوٹا تھا) سے اگلے دن کہہ دیا کہ اپنے ساتھ ہی بمبئی کے لیے ایک برتھ اُس کے لیے بھی ریزرو کرادے۔

گھر میں ہنگامے ہوتے رہے اور دیدی، سویتا کی ڈولی جانے سے پہلے ہی رخصت ہو گئی۔

ٹرین دادر اسٹیشن پہنچی تو اسپتال سے ایک ایمبولنس سریتا کو لینے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ پہلے تو اُس کو عورتوں کے وارڈ میں پلنگ دیا گیا۔ جب ڈاکٹر اُس کو دیکھنے کے لیے آئے تو اُس کے سرہانے انھوں نے موٹی موٹی ہندی اور انگریزی کی کتابیں رکھی دیکھیں۔ انھوں نے اُس کی ریڑھ کی ہڈی کو غور سے دیکھا اور اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر مزید معائنہ کیا۔ دوپہر کے بعد اُس کو ایک اسپیشل وارڈ میں ایک اور لڑکی کے ساتھ جگہ دے دی گئی۔

اس لڑکی کی عجیب کہانی تھی۔ ابھی ڈانس سیکھ رہی تھی کہ سات برس کی عمر میں پولیو کا شکار ہوگئی۔ جب سے یہ اسپتال تو اُس کے لیے دوسرا 'گھر' ہوگیا تھا۔ پولیو سے سوکھے ہوئے پیروں سے وہ اب بھی ڈانس کرتی تھی۔ چار آپریشن ہو چکے تھے۔ اب پانچویں آپریشن کے لیے تیاری کی جا رہی تھی۔ بہت ہنس مکھ مہاراشٹرین لڑکی تھی۔ اُنیس بیس برس عمر ہوگی۔ ریلوے کے دفتر میں کام کرتی تھی۔۔ بیساکھیوں کی مدد سے صبح کو اندھیری اسٹیشن پہنچتی تھی، بیساکھیوں کی مدد سے لوکل ٹرین میں سوار ہوتی تھی، بیساکھیوں کی مدد سے چرچ گیٹ اسٹیشن پر اُترتی تھی، بھیڑ میں اسٹیشن کے باہر آتی تھی اور ٹیکسی میں سوار ہوکر اپنے دفتر جاتی تھی۔ بیساکھیوں کی وجہ سے دفتر کے سارے افسر اُس کا خیال رکھتے تھے۔ اب اُس کو آٹھ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اُس میں سے کوئی سو روپے تو اُس کے آنے جانے میں خرچ ہو جاتے تھے۔ سات سو روپے وہ اپنی ماں کو دیتی تھی۔ اس طرح گھر کا خرچ چلانے میں مدد ہو جاتی تھی۔ جب وہ اسپتال آتی تھی تو اُس کا خرچ لگ بھگ تین سو روپے ماہوار ہو جاتا تھا۔ کینٹین کے کھانے کی بجائے وہ گھر سے دو وقت کے لیے بھاجی ترکاری منگا لیتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے چھ پھلکے آتے تھے۔ اُس میں سے دو تین پھلکے وہ دیدی کو کھلانے لگی۔ (اُس نے بھی سریتا کو 'دیدی' کہنا شروع کر دیا۔)

وہ سویتا سے بہت مختلف تھی۔ شادی کے خیال کو وہ دل میں بھی نہیں آنے دیتی تھی۔ اکثر کہتی تھی: 'دیدی، تم تو جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔ میں تو بچپن ہی سے پولیو کا شکار ہوں۔ بی اے تک تعلیم بھی میں نے بیساکھیوں کی مدد سے پوری کی ہے۔ شروع میں کچھ لڑکے، لڑکیاں میری بیساکھیوں کو دیکھ کر ہنستے تھے۔ مگر وقت گزرتا گیا اور ہم سب ساتھ ہی کلاسیں چڑھتے گئے تھے۔ پھر سب کو میری بیساکھیوں کی عادت ہوگئی۔ بلکہ جب میں اسپتال میں آتی تھی تو کئی لڑکے لڑکیاں میرا حال پوچھنے آتے۔ اور جب میرا ڈانس ہوتا تو وہ سب زور زور سے تالیاں بجاتے، کیونکہ اُن کو تو معلوم تھا کہ میں لنگڑی ہوں اور میری ایک ٹانگ دوسری ٹانگ سے چھوٹی ہے، مگر کسی اور کو معلوم نہ ہوتا کہ ایک لنگڑی لڑکی ڈانس کر رہی ہے۔ میرے گھنگرو میرے لنگڑے پن کو چھپائے رکھتے۔ بھارت ناٹیم بھی میں نے ایک جنوبی ہند کے گرو جی سے سیکھا تھا۔ وہ بے چارے بھی میرا بڑا خیال رکھتے تھے اور سب لڑکیوں سے پہلے مجھے سکھاتے اور پریکٹس کراتے تھے۔

کتھک تو میں کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بھارت ناٹیم نسبتاً سست رفتار ڈانس ہے۔ اسی نے میرے لنگڑے پن کا داغ چھپائے رکھا تھا۔ اگلے مہینے میرا ایک ڈانس اسپتال میں ہوگا۔' آپ ضرور آیئے گا، دیدی۔ یہاں تو سب ہی لنگڑے لولے ہوں گے۔ یہاں یہ بات کسی سے چھپانے کی ضرورت نہیں کہ میں لنگڑی ہوں۔'

سریتا کا کمر کا آپریشن ہونے والا تھا۔ اُس کے تین دن بعد یہ ڈانس پروگرام ہونا تھا۔ سریتا نے پوچھا کہ وہ اس پروگرام میں کیسے جا سکے گی۔ لکشمی (اس لڑکی کا یہی نام تھا) بولی 'بہت آسانی سے۔ ممکن ہوا تو آپ کو وہیل چیئر پر بیٹھا کر لے چلیں گے اور اگر وہیل چیئر پر ممکن نہ ہوا تو اسٹریچر پر۔ یہ سب تو آپ پر ہی منحصر ہے کہ آپریشن سے آپ کی بیماری کتنی دور ہوتی ہے۔'

آپریشن کے لیے جب سریتا کو بے ہوش کیا گیا تو وہ بے ہوشی میں بھی لکشمی کا ڈانس دیکھتی رہی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں ہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر جو دیکھا تو لکشمی اُس کے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔

'مبارک ہو دیدی۔' لکشمی نے کہا۔ 'آپ کا آپریشن کامیاب رہا۔ اب آپ اُٹھ کر بیٹھ سکیں گی۔ کمر میں آپ کی ہڈیوں کو سہارا دینے کے لیے ایک لوہے کی سلاخ ڈال دی گئی ہے۔ یہ سلاخ بعد میں جب سب ہڈیاں جڑ جائیں گی تو نکال دی جائے گی۔'

سریتا کو کمر میں لوہے کی سلاخ موجود ہونے کا خیال کچھ اچھا نہیں لگا۔

'شام کو سرجن نے آکر سریتا سے پوچھا۔ 'ہیلو، ہاؤ آر یو؟'

'ہوش میں تو آ گئی ہوں مگر ابھی تک نشہ سا معلوم ہوتا ہے۔'

'اچھا۔ تم نے خود ہی اتنی دیر لگائی بے ہوش ہونے میں کہ ہماری ANES THESIST بے چاری تو پریشان ہو گئیں۔'

اب سریتا کو معلوم ہوا کہ جس لبادہ پوش ڈاکٹر نے اس کے بازو میں رگ تلاش کر کے اُس کے بے ہوشی کا انجکشن لگایا تھا، وہ ایک عورت تھی۔

'مگر جب میں بے ہوش ہو گئی تھی، تب تو میں نے زیادہ تنگ نہیں کیا؟' اُس نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا (اس کے دانت کتنے خوب صورت تھے، کیونکہ وہ شراب پیتا تھا،

سگریٹ نہیں پیتا تھا) 'نہیں — اب بتایئے' لکشمی کے پروگرام میں آپ وہیل چیئر پر چلیں گی یا اسٹریچر پر'

'ابھی تو یہی معلوم نہیں کہ وہیل چیئر پر جا بھی سکوں گی یا نہیں؟ مگر میں کرسی پر جانا ہی پسند کروں گی۔ اسٹریچر پر لیٹ کر پروگرام دیکھنا تو میرے لیے اور بھی مشکل ہوگا'

'تو سنئے، کل اگر اس بیڈ ریسٹ کے سہارے آپ بیٹھ گئیں تو پرسوں آپ کو وہیل چیئر پر لے چلیں گے۔ اب آپ ہی اس کا فیصلہ کریں گی کہ وہیل چیئر پر جائیں گی یا اسٹریچر پر'

'یا تو وہیل چیئر پر جاؤں گی یا پھر سرے سے نہیں جاؤں گی۔' اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔ 'چلیے، ابھی تو پانچ گھنٹے باقی ہیں۔ فیصلہ کر لیجیے گا۔ وہیل چیئر اور اسٹریچر، دونوں چیزیں حاضر رہیں گی'

اُس رات سریتا کو اسی فکر میں ٹھیک طرح نیند نہیں آئی کہ کل کو کیسے جائے گی۔ جب وہ سو کر اُٹھی تو لکشمی بیساکھیوں کی مدد سے اشنان بھی کر چکی تھی۔ پھر اس نے سریتا کو بھی اشنان کرا دیا۔

'کس بھگوان کی پوجا کرتی ہو تم؟ اور کیا کہتی ہو اس سے؟' سریتا نے ہنس کر پوچھا۔

'ہنومان جی کی پوجا کی ہے میں نے۔ اور یہی مانگا ہے کہ کل تم وہیل چیئر پر ہمارا ڈانس دیکھنے آسکو'

'کیوں اپنے پروگرام کی کامیابی کی پرارتھنا نہیں کی؟'

'نہیں — ہنومان جی میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، اس لیے صرف تمھارے لیے پرارتھنا کی۔ پتہ نہیں بھگوان سنتا ہے یا نہیں مگر اپنا دل ضرور ہلکا ہو جاتا ہے۔ آپ تو ڈبل ایم، اے ہیں۔ ان مورتیوں میں شردھا نہیں رکھتی ہوں گی؟'

'مورتی میں شردھا ہو یا نہ ہو، مگر جس محبت سے تم نے پرارتھنا کی ہے، اُس کو ضرور قابل عزّت مانتی ہوں'

لکشمی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس جملے کے جواب میں کیا کہے۔ اس نے پوجا ختم کی اور اپنا چمچماتا ہوا ڈانس کا ڈریس نکال کر ٹھیک کرنے لگی۔ جب سے اُس نے پچھلی بار ڈانس کیا تھا، وہ

کتھک تو میں کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بھارت ناٹیم نسبتاً سست رفتار ڈانس ہے۔ اسی نے میرے لنگڑے پن کا داغ چھپائے رکھا تھا۔ اگلے مہینے میرا ایک ڈانس اسپتال میں ہوگا۔' آپ ضرور آیے گا، دیدی۔ یہاں تو سب ہی لنگڑے لولے ہوں گے۔ یہاں یہ بات کسی سے چھپانے کی ضرورت نہیں کہ میں لنگڑی ہوں۔'

سریتا کا کمر کا آپریشن ہونے والا تھا۔ اُس کے تین دن بعد یہ ڈانس پروگرام ہونا تھا۔ سریتا نے پوچھا کہ وہ اس پروگرام میں کیسے جا سکے گی۔ لکشمی (اس لڑکی کا یہی نام تھا) بولی' بہت آسانی سے۔ ممکن ہوا تو آپ کو وہیل چیئر پر بیٹھا کر لے چلیں گے اور اگر وہیل چیئر پر ممکن نہ ہوا تو اسٹریچر پر۔ یہ سب تو آپ پر ہی منحصر ہے کہ آپریشن سے آپ کی بیماری کتنی دور ہوتی ہے۔'

آپریشن کے لیے جب سریتا کو بے ہوش کیا گیا تو وہ بے ہوشی میں بھی لکشمی کا ڈانس دیکھتی رہی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں ہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر جو دیکھا تو لکشمی اُس کے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔

'مبارک ہو دیدی۔' لکشمی نے کہا۔' آپ کا آپریشن کامیاب رہا۔ اب آپ اُٹھ کر بیٹھ سکیں گی۔ کمر میں آپ کی ہڈیوں کو سہارا دینے کے لیے ایک لوہے کی سلاخ ڈال دی گئی ہے۔ یہ سلاخ بعد میں جب سب ہڈیاں جڑ جائیں گی تو نکال دی جائے گی۔'

سریتا کو کمر میں لوہے کی سلاخ موجود ہونے کا خیال کچھ اچھا نہیں لگا۔

'شام کو سرجن نے آکر سریتا سے پوچھا۔' ہیلو، ہاؤ آر یو؟'

'ہوش میں تو آگئی ہوں مگر ابھی تک نشہ سا معلوم ہوتا ہے۔'

'اچھا۔ تم نے خود ہی اتنی دیر لگائی بے ہوش ہونے میں کہ ہماری ANES THESIST بے چاری تو پریشان ہوگئیں۔'

اب سریتا کو معلوم ہوا کہ جس لبادہ پوش ڈاکٹر نے اس کے بازو میں رگ تلاش کر کے اُس کے بے ہوشی کا انجکشن لگایا تھا، وہ ایک عورت تھی۔

'مگر جب میں بے ہوش ہوگئی تھی، تب تو میں نے زیادہ تنگ نہیں کیا؟' اُس نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا (اس کے دانت کتنے خوب صورت تھے، کیونکہ وہ شراب پیتا تھا،

سگریٹ نہیں پیتا تھا) 'نہیں— اب بتایئے' لکشمی کے پروگرام میں آپ وہیل چیئر پر چلیں گی یا اسٹریچر پر۔'

'ابھی تو یہی معلوم نہیں کہ وہیل چیئر پر جا بھی سکوں گی یا نہیں؟ مگر میں کرسی پر جانا ہی پسند کروں گی۔ اسٹریچر پر لیٹ کر پروگرام دیکھنا تو میرے لیے اور بھی مشکل ہوگا۔'

'تو سنئے، کل اگر اس بیڈ ریسٹ کے سہارے آپ بیٹھ گئیں تو پرسوں آپ کو وہیل چیئر پر لے چلیں گے۔ اب آپ ہی اس کا فیصلہ کریں گی کہ وہیل چیئر پر جائیں گی یا اسٹریچر پر۔'

'یا تو وہیل چیئر پر جاؤں گی یا پھر سرے سے نہیں جاؤں گی۔'؟ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔ 'چلیے، ابھی تو پانچ گھنٹے باقی ہیں۔ فیصلہ کر لیجیے گا۔ وہیل چیئر اور اسٹریچر، دونوں چیزیں حاضر رہیں گی۔'

اُس رات سریتا کو اسی فکر میں ٹھیک طرح نیند نہیں آئی کہ کل کو کیسے جائے گی۔ جب وہ سو کر اُٹھی تو لکشمی بیساکھیوں کی مدد سے اشنان بھی کر چکی تھی۔ پھر اس نے سریتا کو بھی اشنان کرا دیا۔

'کس بھگوان کی پوجا کرتی ہو تم؟ اور کیا کہتی ہو اس سے؟ سریتا نے ہنس کر پوچھا۔

'ہنومان جی کی پوجا کی ہے میں نے۔ اور یہی مانگا ہے کہ کل تم وہیل چیئر پر ہمارا ڈانس دیکھنے آسکو۔'

'کیوں اپنے پروگرام کی کامیابی کی پرارتھنا نہیں کی؟'

'نہیں— ہنومان جی میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، اس لیے صرف تمھارے لیے پرارتھنا کی۔ پتہ نہیں بھگوان سنتا ہے یا نہیں مگر اپنا دل ضرور ہلکا ہو جاتا ہے۔ آپ تو ڈبل ایم، اے ہیں۔ ان مورتیوں میں شردھا نہیں رکھتی ہوں گی؟'

'مورتی میں شردھا ہو یا نہ ہو، مگر جس محبت سے تم نے پرارتھنا کی ہے، اُس کو ضرور قابل عزت مانتی ہوں۔'

لکشمی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس جملے کے جواب میں کیا کہے۔ اس نے پوجا ختم کی اور اپنا چمچماتا ہوا ڈانس کا ڈریس نکال کر ٹھیک کرنے لگی۔ جب سے اُس نے پچھلی بار ڈانس کیا تھا، وہ

کچھ اور دُبلی ہوگئی تھی۔ اس کے لیے اُس نے وارڈ بوائے سے کہہ کر اسپتال کے ٹیلر کو بلایا اور بلاؤز کو چُست کرنے کو کہا۔

ادھر سریتا اس ادھیڑ بُن میں تھی کہ اگر وہیل چیئر پر جانے کی اجازت مل گئی تو وہ کون سے کپڑے پہن کر جائے گی۔ اُس کے پاس تو گنی چُنی ساڑیاں تھیں۔ اور سب کی سب بہت سادہ۔ آخر اس لکشمی سے ایک ساڑی اور بلاؤز مانگنا پڑا۔

شام کو ڈاکٹر صاحب آئے تو سریتا اپنے پلنگ پر تکیے کے سہارے بیٹھی تھی اور آدھی لیٹی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب نے کہا 'یہی تو میں چاہتا تھا۔ تمھارے WILL POWER (قوتِ ارادی) نے تمھیں بٹھا دیا۔ وہیل چیئر پر جا کر خود لکشمی کا ڈانس دیکھنے کا شوق تمھارے لیے زخموں سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوا۔ اب تم بے جھجک وہیل چیئر پر جا سکتی ہو۔'

لکشمی سریتا کو پیار کر کے چلی گئی، یہ کہہ کر کہ 'وقت سے پہلے آجانا، ورنہ میری آنکھیں تمھاری وہیل چیئر کو ڈھونڈتی رہیں گی۔'

جب سریتا کی وہیل چیئر پنڈال کے پاس پہنچی تو سریتا کا خیر مقدم خود بڑے ڈاکٹر نے کیا۔ پہلے اس نے سریتا کی نبض دیکھی، پھر وہیل چیئر چلانے والے وارڈ بوائے کو ہدایت کی کہ وہیل چیئر کو اگلی قطار میں لے آئے۔

لکشمی کا بھارت ناٹیم ڈانس بہت پسند کیا گیا۔ سریتا تو آگے بیٹھی خاص طور سے اُس کے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ جب ناچ ختم ہونے کو تھا تو لکشمی نے اس طرح زور سے اُس نے چک پھیریاں کھائیں کہ سریتا کو فکر ہوگئی کہ اب کیا ہوگا۔ اس نے دیکھا کہ اسٹیج کے درمیان اسٹیج کا ایک حصّہ اُبھرا ہوا ہے۔ کئی بار ڈانس کرتے کرتے لکشمی اُس حصے کے بالکل قریب آگئی۔ ایک دفعہ تو سریتا کا جی چاہا کہ وہ چیخ پڑے: 'ہوشیار، لکشمی!' مگر وہ چپ سادھے رہی۔ پھر لکشمی ڈانس کرتے کرتے عین اُس اسٹیج کے ابھار کے قریب آگئی اور اُس کا لہنگا اُس میں اٹک گیا۔ اگلے لمحے وہ چکرا کر گر پڑی۔ اور اسی دم سریتا وہیل چیئر کے باوجود کھڑی ہوگئی، مگر فوراً ہی گر پڑی۔ لکشمی کی طرف سے پریشانی نے اُس کو ایک لمحے کے لیے ہی سہی، مگر اتنی طاقت دے دی تھی کہ وہ اپنی قوتِ ارادی کے سہارے کھڑی ہوگئی تھی۔ یہ ماجرا بڑے ڈاکٹر صاحب نے بھی دیکھا تھا۔

'مس سریتا آپ ابھی ابھی کھڑی ہوگئی تھیں۔' وہ بولے۔

'وہ تو میں لکشمی کی طرف سے پریشان تھی۔'

'لکشمی ٹھیک ہے۔ ٹخنے کی ہڈی پھر ٹوٹ گئی ہے۔ ایک اور آپریشن اُس کا کرنا پڑے گا۔ وہ تو کمال کی لڑکی ہے۔ چھ آپریشن کرا چکی ہے۔ اب ساتواں ہوگا۔'

'مگر اب کیسی ہے؟'

'فی الحال بے ہوش ہے۔ مگر جلد ہوش آجائے گا۔'

کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے تو سریتا کے کان میں ایک پُرانی آواز آئی۔

'ویدی!'

یہ کون تھا جو اُسے اس طرح پکار رہا تھا؟ اُس نے مڑ کر دیکھا تو ناگ ارجن کھڑا نظر آیا۔

ناگ ارجن کبھی اُن کے ہاں ایک نوکر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ وہ اُسے ہمیشہ ویدی کہتا تھا، مگر اُس کی چھوٹی بہن سویتا کو سویتا ہی کہتا تھا، بلکہ بھوکی نظروں سے اس کو گھورا بھی کرتا تھا۔ ایک بار سویتا نے اپنے باپ سے شکایت بھی کی تھی کہ یہ ذلیل نوکر اس کو اس طرح کیوں گھورا کرتا ہے، مگر پروفیسر شرما نے اُس کی شکایت کو مذاق میں ٹال دیا تھا۔

'اب تم دیکھنے کی چیز ہو تو تمھیں دیکھتا ہے۔ کوئی انسلٹ تو نہیں کرتا۔' انہوں نے کہا۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ اتنا محنتی نوکر ان دنوں تین سو روپے میں بھی نہیں ملتا تھا، اور ناگ ارجن کو پروفیسر صاحب کو صرف ساٹھ روپے ماہوار دیتے تھے۔

پھر ایک دن سویتا نے ناگ ارجن کی ایک اور سنگین حرکت کی شکایت کی۔ دو پہر کو وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے لیٹے پڑھ رہی تھی۔ پڑھتے پڑھتے سوگئی تو ناگ ارجن نے اس کا بوسہ لے لیا۔

'بوسہ لے لیا؟' پروفیسر صاحب نے اپنے 'آزاد' خیالات کے باوجود کہا 'یہ تو بہت بھیانک جُرم ہے۔' پھر انھوں نے چلّا کر آواز دی 'ابے او ناگ ارجن!'

لڑکا، جو اپنے کالے جسم کے باوجود خاصا خوب صورت تھا، کمرے میں آیا تو پروفیسر نے دیکھا کہ مسکرا رہا ہے۔

'کیوں بے، تو نے چھوٹی بی بی کے گال کو چوما؟' انھوں نے فردِ جُرم عائد کرتے ہوئے کہا۔ 'نہیں جناب، میں نے گال کو نہیں چوما، صرف ہونٹوں کو چوما تھا۔'

'ارے یہ تو اور بھیانک جرم ہو گیا۔' کیوں، ہونٹوں کو کیوں چوما تھا؟'

'بس اپنا جی چاہا کہ چوم لیا جائے۔' اُس نے جواب دیا۔ 'اس کے علاوہ میرا خیال تھا کہ چھوٹی بی بی بھی چاہتی تھیں۔'

'جھوٹا! بدمعاش کہیں کا!' سویتا چلائی 'پتا جی، اس بدمعاش کو ابھی گھر سے نکال دیجیے۔ میں جس گھر میں یہ ہوگا، وہاں نہیں رہ سکتی۔'

ناگ ارجن کسی احتجاج کے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ واپس اپنے وطن تمل ناڈو چلا گیا ہوگا۔

اور اب چار برس بعد وہی ناگ ارجن، 'دیدی' کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اُس کی انگلیوں میں چار انگوٹھیاں تھیں۔ ان میں سچے ہیرے بھی چمک رہے تھے۔ جسم پر اسمارٹ سفاری سوٹ تھا۔

'دیدی، آپ نے مجھے پہچانا؟ میں ہوں وہی ناگ ارجن۔ ویسے سب لوگ مجھے میرے گاؤں کے نام سے مُدالیلار کہتے ہیں۔ یہاں چلا آیا تھا میں۔ رائے پور سے یہاں دھندا اچھا چلتا ہے۔'

'کیا ہے تمھارا دھندا؟'

'بس دھندا تو دھندا ہوتا ہے۔ مجھے آپ سے ایک کام ہے۔'

'کیا کام ہے؟' سریتا نے پوچھا۔

'یہاں بتانے کا نہیں ہے۔ کل آپ کے وارڈ میں آکر بتاؤں گا۔ آپ کر دیں گی نا؟'

'جب بتاؤ گے تو کہہ سکوں گی کہ میں کروں گی یا نہیں۔'

'آپ ضرور کر دیں گی۔ مجھے پورا وشواس ہے۔'

'اچھا، تو کل بات کریں گے۔'

اُس رات دیدی اپنے کمرے میں اکیلی رہی، کیونکہ لکشمی کو ایک الگ اسپیشل کمرے میں

بھیج دیا گیا تھا۔ ہوش آنے پر اُس کے آپریشن کا فیصلہ ہونا تھا۔

رات بھر ڈیڈی کو نیند نہیں آئی۔ ایک تو لکشمی کی موجودگی کی اُس کو عادت پڑ گئی تھی۔ دوسرے موہن ناگ ارجن اس کے ذہن پر چھایا رہا، جواب کافی امیر معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کہاں سے اُس کو اتنی دولت مل گئی تھی۔ وہ کیا دھندا کرتا تھا، جس میں اُس کو اتنا منافع ہوتا تھا۔ سریتا یہی سب کچھ سوچتی رہی، یہاں تک کہ سویرا ہو گیا اور نرس اُس کو اسپنج کرنے آ گئی۔ اُس نے نرس سے کہا 'آج صبح کو ایک آدمی اُس سے ملنے کے لیے آئے گا۔ اُس وقت وہ چاہتی ہے کہ کوئی اُس کے پاس رہے۔ اگر نرس کو چھٹی نہ مل سکے تو وہ ہیڈ نرس کو سمجھا کر بھیج دے۔'

اسپنج کرنے کے بعد نرس نے سریتا کے کپڑے بدلے اور سریتا آرام محسوس کر کے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ جلد ہی اُس کا ناشتہ آ گیا۔ اُس دن اُس کے لیے اسپیشل ناشتہ آیا تھا۔ کافی، اِڈلی، مسالہ دوسا، اُپما۔ اتنا تو وہ کھا بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے کینٹین کے لڑکے سے کہا تو اُس نے جواب دیا 'میڈم، میں یہ سب اس لیے لایا ہوں کہ مجھے یہی حکم دیا گیا تھا۔'

'کس نے حکم دیا تھا؟' اُس نے پوچھا۔

'ناگ ارجن صاحب نے۔ کل انھوں نے تین پیالیاں کافی اور یہ چیزیں آپ کے ناشتے کے لیے آرڈر کیں۔ کہنے لگے کہ یہ سب آپ کو پسند ہے۔'

'مجھے پسند وسند کچھ نہیں ہے۔ تم مجھ سے پوچھ کر لایا کرو جو بھی لاؤ۔'

'مگر میڈم، میں تو سمجھا تھا کہ وہ آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔'

'یہ تو کیسے سمجھا؟ میں تو اُن کی کچھ نہیں ہوتی۔'

'وہ تو آپ کو ڈیڈی کہتے ہیں۔ یہ پھول بھی انھوں نے بھیجا ہے۔'

'اچھا— دیکھوں؟' ڈیڈی نے پھول ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ گلاب بڑا اور خوشبودار تھا۔ ڈیڈی نے اُسے میز پر رکھا۔ پھر کینٹین بوائے سے پوچھا 'یہ دھندا کیا کرتے ہیں۔ ناگ ارجن صاحب!'

'کیا نہیں کرتے۔ ہر قسم کا دھندا کر لیتے ہیں۔'

ابھی ڈیڈی کچھ اور پوچھنے والی تھی کہ دروازہ کھلا اور ہیڈ نرس داخل ہوئی۔

'مسٹر موہن ناگ ارجن آئے ہیں۔' اُس نے بہت تکلف سے کہا۔

'اچھا۔ آپ سے نرس نے کچھ کہا ہے؟' ویدی نے پوچھا۔

'ہاں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ مجھے آپ کے باتھ روم کا انسپکشن کرنا ہے۔' موٹی ہیڈ نرس نے کہا اور آواز دی 'مسٹر ناگ ارجن اندر' ایک گل دستہ ہاتھ میں لیے ہوئے آ گیا۔

ویدی نے دیکھا کہ اب ناگ ارجن سفید ململ کا کرتا اور لٹھے کا ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ گل دستہ ویدی کو دے کر وہ قریب ہی اسٹول پر بیٹھ گیا۔

'ہاں، تو کیا چاہتے ہو، موہن؟'

'بس صرف ایک چٹھی۔'

'آپ کی بہن کے نام۔'

'تمھیں معلوم ہے کہ وہ کلکٹر کی بیوی بن چکی ہے؟'

'جانتا ہوں۔ اس لیے تو اُن کے نام چٹھی چاہیے۔ میرا ایک چھوٹا سا کام ہے جو کلکٹر صاحب آسانی سے کرا سکتے ہیں۔'

'یہ میں نہیں جانتی کہ وہ آپ کا کام کریں گے یا نہیں۔ میں تو بس چٹھی بہن کے نام دے دوں گی باقی آپ جانیں اور وہ جانے۔'

'تو دے دیجیے۔ کب لکھیں گی آپ؟'

'کم از کم ایک گھنٹہ تو لگے گا۔'

'تو میں اس وقت تک کینٹین میں جا کر کافی پیتا ہوں۔ آپ کے لیے بھی ایک کافی کا پیالہ بھجوا دیتا ہوں۔'

'نہیں، مجھے جو چاہیے گا منگوا لوں گی۔ تمھیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔'

اسی لمحہ اسے یاد آ گیا کہ اس نے کسی ناگ ارجن کے بارے میں کہیں اخبار میں پڑھا تھا کہ وہ بمبئی کا ایک دادا تھا۔ یقیناً موہن ہی وہ ناگ ارجن ہے، اس لیے وہ اُس سے رسم و راہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

اگلے دن ایک لمبی چوڑی نیلی کار کلکٹر صاحب رائے پور کے بنگلے پر آ کر رکی، جس میں

موہن ناگ ارجن سوار تھا۔ اس نے نوکر سے کہا کہ وہ ایک خط، مسز کلکٹر، کی ڈیڈی، کی طرف سے لایا ہے۔'

مسز کلکٹر، باہر نکل آئی اور سفاری سوٹ زیب تن کیے موہن ناگ ارجن کو پہچان کر، اور اُس کے لباس، خصوصاً اُس کی انگوٹھیوں کے ہیروں سے مرعوب ہوکر اس کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔

اب وہ تھپڑ کھانے والے موہن سے بہت دور نکل آیا تھا۔ ویسے بھی اسمارٹ لگتا تھا۔ اس لیے وہ اس قابل ضرور تھا کہ اُس کو بھی سویتا کے عاشقوں کے کیو Q میں لگا دیا جائے۔

کلکٹر صاحب سے اُسی روز سویتا کی ایک غلط فہمی کی بنیاد پر کچھ تکرار ہو گئی تھی۔ ایسی غلط فہمیاں موجودہ زمانے کے اکثر مردوں، عورتوں میں ہوتی ہیں۔ صبح کو غلط فہمی ہوتی ہے، رات ہونے تک دور ہو جاتی ہے اور زن وشوہر کے تعلقات استوار ہو جاتے ہیں، اور پھر اگلی غلط فہمی کے لیے زمین تیار ہو جاتی ہے۔

سویتا نے اپنی بہن کا خط ڈرائنگ روم میں ہی پڑھا۔ موہن سامنے صوفے پر بیٹھا اُسے بھوکی نظروں سے دیکھتا رہا۔ خط پڑھ کر سویتا ہنس پڑی۔

'آپ کیوں ہنسیں؟ کیا ڈیڈی نے کچھ ایسی بات لکھ دی ہے۔' موہن نے پوچھا۔

'کچھ نہیں— ڈیڈی تو اب تک ڈیڈی ہی ہیں۔ مجھے نصیحتیں کی ہیں، جن کا آپ سے تعلق نہیں ہے۔ مگر شاید کچھ تعلق ہے بھی۔ تم نے ڈیڈی پر کوئی اچھا امپریشن نہیں چھوڑا ہے وہ اب تک روسو کے مقولے پر عمل کرتی ہیں۔'

'کیا تھا وہ مقولہ؟' موہن نے پوچھا۔

'یہی کہ بڑی دولت کے پیچھے ایک جُرم کی کہانی ہے۔ تم کو اچھے کپڑے اور ہیروں کی انگوٹھیاں پہنے دیکھ کر وہ خوش نہیں ہوئیں۔ بعض لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں جن کو دوسروں کو خوش حال دیکھ کر خوش نہیں ہوتی۔ ہماری ڈیڈی بھی اُن میں سے ہیں۔

اچھا چھوڑیے اس بات کو بتایے، اتنے دن بعد رائے پور کیسے آنا ہوا؟'

'سچ پوچھیے تو تم کو میں اب تک بھول نہیں سکا ہوں۔ ہر رات کو تم میرے سپنوں میں آتی ہو۔ مگر ایک چھوٹا سا کام کلکٹر صاحب سے بھی تھا۔'

اتنے میں کافی آ گئی۔ نوکر نے سلیقے سے کافی کی ٹرے ٹیبل پر سویتا کے سامنے رکھ دی۔ 'کتنی شکر لیں گے آپ؟'

'چار چمچے۔'

یہ سن کر سویتا مسکرائی اور اس نے چار چمچے شکر پیالی میں ڈال دی۔ جب موہن نے اپنی پیالی اٹھائی تو سویتا نے پوچھا 'تو بلالوں کلکٹر صاحب کو؟'

'جی ہاں، بلا لیجیے۔' موہن نے کہا۔

سویتا نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ فوراً بیرا حاضر ہوا۔ 'حکم، میم صاحب؟'

'کلکٹر صاحب کو ہمارا سلام دو۔ کہو کہ ہمارے ایک پرانے دوست آئے ہیں۔ اُن کو کلکٹر صاحب سے ایک چھوٹا سا کام ہے۔'

'جی حضور۔' اُس نے کہا اور اندر دفتر کے کمرے کی طرف چلا۔

پانچ منٹ بعد کلکٹر صاحب داخل ہوئے۔

سویتا نے رمیش سے ناگ ارجن کا تعارف کرایا: 'ڈارلنگ، یہ میرا پرانا دوست ہے، موہن۔ اس کا ایک چھوٹا سا کام ہے جو تم آسانی سے کر سکتے ہو۔'

'آسانی سے کر سکتا ہوں تو کر دوں گا۔ تمھاری سفارش کے بغیر بھی۔ کلکٹر نے کہا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ کام کر کے اُس کے اور سویتا کے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی، دور ہو جائے گی۔

'یہ موقع اچھا ہے، اُس نے دل میں سوچا۔ پھر ناگ ارجن سے مخاطب ہوا: 'فرمایئے کیا بات ہے؟'

'کچھ زمین چاہیے مجھے۔ ایک کارخانہ لگانے کے لیے۔'

'کتنی زمین چاہیے اور کب چاہیے؟'

'بوڑ گاؤں اور آنند پور کے بیچ کی زمین چاہیے؟'

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا، لیکن کلکٹر نے جلدی سے کہا: 'وہ زمین تو میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہ آدی واسیوں کی زمین ہے۔ آپ کو کیوں چاہیے؟'

'وہاں ٹینڈو کا جنگل ہے، جس کے پتے میرے بیڑی کے کارخانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ وہاں کام بھی آدی واسی ہی کریں گے۔ اُن کو راضی کرنے کی بات مجھ پر چھوڑ دیجیے۔'

کلکٹر سوچ رہا تھا کہ اس آدمی کی تصویر اُس نے کہیں دیکھی ہے۔ غور سے دیکھنے پر کچھ یاد بھی آرہا تھا کہ اتنے میں موہن نے خود اپنا راز فاش کر دیا۔ اُس نے کہا 'آپ نے میری کمپنی کا نام سنا ہوگا۔ 'ناگ بیڑی کمپنی۔' میری بیڑیاں امریکہ کو ایکسپورٹ ہوتی ہیں۔ وہاں سگریٹوں پر جیسے جیسے پابندی لگ رہی ہے۔ ناگ بیڑیاں مقبول ہوتی جارہی ہیں۔ کروڑوں کا فوان ایکسچینج FOREIGN EXCHANGE کماتی ہیں میری بیڑیاں۔'

'مگر آدی واسی ایکسپورٹ کو نہیں سمجھتے۔ وہ تو بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ جنگل اُن کا ہے۔'

'تو آپ میرا کام نہیں کریں گے؟' موہن نے ایک خفیف سا اشارہ اپنے ہاتھ سے کیا۔

'آپ کو باتھ روم جانا ہے کیا؟' کلکٹر نے پوچھا اور اُس کے اثبات میں سر ہلانے پر کلکٹر نے باتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ موہن دوڑ کر باتھ روم کے اندر چلا گیا۔

'اپنے پرانے دوست سے مل کر تم بہت خوش نظر آتی ہو۔' موہن کے جانے کے بعد سریش نے سویتا سے پوچھا۔

'ہاں۔ اور کیا؟ اُس کا سفاری سوٹ دیکھو۔ کتنا اسمارٹ لگتا ہے! اُس کی اُنگلیوں میں پہنی.....'

ابھی سویتا اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے موہن نمودار ہوا۔ اب اُس کی انگلیوں میں انگوٹھیاں اور ہیرے نہیں تھے۔

'آپ کچھ باتھ روم میں تو بھول نہیں آئے؟' سویتا نے پوچھا۔

موہن نے جواب دیا 'میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ میں کبھی کوئی چیز نہیں بھولتا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی چیز پہلے میرے ہاتھ میں ہو اور اب نہ ہو، مگر اسے بھول نہیں کہتے۔'

اب کلکٹر صاحب کو باتھ روم جانا یاد آیا اور وہ اندر چلے گئے۔ اُن کا اصول تھا کہ کہیں باہر جانے سے پہلے وہ ایک بار باتھ روم میں ضرور ہو آتے تھے۔

وہ اندر گئے تو موہن نے بھوکی نظریں سویتا پر جما کر بڑے اہتمام سے کہا 'سویتا جی، آپ بمبئی کبھی نہیں آئیں؟'

'میں تو بہت آنا چاہتی ہوں، مگر کلکٹر صاحب کو چھٹی ہی نہیں ملتی۔ میں تو سمجھی تھی کہ کلکٹر پورے ضلع کا حاکم ہوتا ہے۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ رائے پور کے آدی واسیوں کی سیوا میں لگے رہیں

گے۔ میں تو یہ شادی کر کے پچھتا رہی ہوں۔'

'تو چلیے میرے ساتھ آج پلین سے۔'

'اتنی جلدی سیٹ مل جائے گی؟' سویتا نے پوچھا۔

'کیوں نہیں مل جائے گی۔ میں ہمیشہ دو ٹکٹ خریدتا ہوں اور دو سیٹیں میرے لیے ریزرو رہتی ہیں۔ چلنا ہے تو چلیے۔ ابھی، ان ہی کپڑں میں۔'

'چلیے۔' سویتا نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ایک منٹ بعد وہ موہن کی بڑی گاڑی میں سوار تھے۔ ڈرائیور اُن کے انتظار میں ہی تھا۔ اُس نے گیرس چینج کر کے موٹر دوڑا دی۔

'فوراً ایئرپورٹ۔' موہن نے ڈرائیور سے کہا۔

'انگوٹھیاں کہاں ہیں؟' سویتا نے موہن سے پوچھا۔

'وہ رشوت میں کلکٹر صاحب کے باتھ روم میں رکھ دی گئی ہیں۔ دیکھتے ہیں کلکٹر صاحب کا جگر کتنے میں بکتا ہے؟'

'بہت مشکل ہے اِس آدمی کو خریدنا' سویتا نے سچ بولا، جس کی اُس کو عادت نہیں تھی۔

'دیکھتے ہیں۔ یا تو میں بُدھو ہوں یا تمھارے کلکٹر صاحب۔' موہن نے کہا۔ 'ساڑھے تین لاکھ کے ہیرے اُن میں لگے ہوئے ہیں۔'

اُس وقت وہ چار ہیروں کی انگوٹھیاں ایک رومال میں رکھی تھیں اور کلکٹر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہاں ٹیلی فون کر رہا تھا۔

'سری واستو!' کلکٹر نے کہا۔ 'بیس جوان لے کر فوراً ایئرپورٹ آ جاؤ۔ ایک آدمی نے مجھے رشوت دینے کی کوشش کی ہے۔ بمبئی کا ایک ڈون ہے ناگ ارجن۔'

ایئرپورٹ پر بمبئی جانے والا پلین تیار کھڑا تھا جب نیلی کار زنا ۔جیک ایروپلین کے پاس آ کر رُکی۔

'معاف کیجیے گا!' موہن نے سویتا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایئرپورٹ انجینئر سے کہا۔

'موٹر اندر لانے کے لیے جتنا چاہیں جرمانہ کر دیجئے۔ ایروپلین چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ باہر اترتے تو اس پلین میں سیری دو سیٹیں خالی جاتیں۔ باقی باتیں اندر ہوں گی۔'

یہ کہہ کر موہن اور سویتا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اندر گئے اور پلین کا دروازہ فوراً بند ہو گیا۔

باہر پولیس کی گاڑی آ گئی تھی۔

'پلین تو اب جا رہا ہے۔' ایئرپورٹ آفیسر نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اپنا سروس ریوالور نکال لیا اور زور سے کہا۔ 'پلین کہیں نہیں جائے گا جب تک کلکٹر صاحب کا حکم نہ ہو۔'

پائیلٹ نے ایک بار انجنوں کو اسٹارٹ کر کے پھر آف کر دیا۔ اُس نے کنٹرول روم سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی آواز سن لی تھی۔

بیس بندوقیں پلین کی طرف نشانہ لگائے ہوئے تھیں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس اپنا ریوالور نکال کر پلین کی طرف نشانہ باندھے ہوئے تھا۔

اتنے میں کلکٹر کی موٹر پلین کے بالکل قریب آ کر رُکی۔ کلکٹر نے جیب سے ہیروں کی انگوٹھیاں نکال لیں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ہیروں کا رومال جیب میں ڈال لیا۔ پھر ایک ہاتھ میں سروس ریوالور لیے وہ پلین کا دروازہ کھلوا کر داخل ہوا۔

موہن اور سویتا بالکل آگے کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

'سویتا جی، آپ؟'

'جی ہاں، میں بمبئی جا رہی ہوں۔ مسٹر ناگ ارجن نے اپنی ایک سیٹ میرے لیے خالی کر دی ہے۔'

'آپ پر کلکٹر صاحب کو رشوت دینے کی کوشش کرنے کا الزام ہے؟' سپرنٹنڈنٹ نے ناگ ارجن سے کہا۔

'مجھ پر ایسا کوئی الزام نہیں۔ انگوٹھیاں تو میں کلکٹر صاحب کے باتھ روم میں غلطی سے بھول آیا تھا۔ آپ لائے ہیں کیا؟' موہن ناگ ارجن نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رومال نکالا اور چاروں انگوٹھیاں موہن کے ہاتھ میں اُلٹ دیں۔

جو اُس نے 'تھینک یو' کہہ کر لے لیں۔

'اور بھی کوئی الزام ہے؟' ناگ ارجن نے انگوٹھیاں اپنی انگلیوں میں پہن لیں۔ 'اب تو آپ کو یقین آ گیا؟' موہن نے انگوٹھیاں پہننے کے نشان دکھاتے ہوئے کہا۔

ایروپلین کی کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے سویتا نے ہاتھ ہلا کر رخصتی کا اشارہ کرتے ہوئے کلکٹر سے کہا:

'اچھا، بائی بائی ڈارلنگ! بمبئی سے خط لکھوں گی۔ تم فکر نہ کرنا۔ موہن میرا پرانا دوست ہے۔ اس کے پاس ہی ٹھہروں گی۔'

سپرنٹنڈنٹ پولیس کلکٹر کے پاس آیا اور کہنے لگا 'اس نے انگوٹھیاں تو فوراً یہ کہہ کر لے لیں کہ آپ کے باتھ روم میں 'بھول' آیا تھا۔ اُس کے ساتھ سویتا جی بیٹھی تھیں۔ اگر اُسے گرفتار کیا جاتا ہے تو سویتا کو بھی کورٹ کچہری میں گھسیٹنا پڑے گا۔ اس لیے میرے خیال میں کیوں نہ پلین کو جانے دیں؟'

'ہاں، کلکٹر صاحب نے مری ہوئی آواز میں کہا 'اپنے آدمیوں کو واپس بلا لو۔ یہ مقدمہ ہم ہار گئے ہیں۔ موہن ناگ ارجن کی چالاکی سے اور اپنی بیوی کی دغابازی سے۔'

سپرنٹنڈنٹ نے بیس کانسٹبلوں کو ایروپلین کے گھیرے سے ہٹا لیا۔ پلین پھر اسٹارٹ ہوا اور جلد ہی ہوا میں اُڑنے لگا۔

اُس رات کو کلکٹر اکیلا ہی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ کھا کیا رہا تھا، کھانے کی نقل کر رہا تھا۔ آخر اُس نے بیرے کو بُلا کر کھانا اُٹھانے کا حکم دیا۔

کھانے کی میز پر سے اُٹھ کر وہ ایک بند کھڑکی کے پاس گیا۔ اُس کے شیشے میں اُس نے اپنی گزری ہوئی زندگی کی جھلکیاں دیکھیں۔ پہلے بڑی بہن کا سراپا۔ گھوڑے پر سوار۔ آدی واسیوں کے گاؤں میں۔ پھر گھوڑے کا ایکسی ڈینٹ۔ پلنگ پر لیٹی ہوئی تکلیف کو مسکرا کر جھیلتی ہوئی سریتا۔ پھر چھوٹی بہن کی حرکتیں، جو کبھی دل فریب ہوتی تھیں، کبھی بچکانہ اور کبھی ایذا پسندی اُن سے جھلکتی تھی۔ آخر میں اُس کا ایک مجرم کے پہلو میں بیٹھ کر رومال ہلانا اور 'ٹاٹا' 'ڈارلنگ' کہنا۔ یہ آخری تصویر جو کھڑکی کے شیشے میں اُبھری تو رمیش سے نہ رہا گیا اور اُس نے اپنے دائیں

ہاتھ سے شیشے پر گھونسا مارا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنا لہولہان ہاتھ ایک ٹوٹے ہوئے شیشے کے سوراخ سے نکال رہا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا — نہ اُس کی سالی، نہ اُس کی بیوی۔

'طلاق!' اُس نے ہلکے سے کہا۔

'طلاق!!' اُس نے ذرا زور سے کہا۔

'طلاق!!!' اُس نے بہت زور سے کہا۔

اور اُس کے دل میں جو محبت سویتا کے لیے تھی، ایک عمیق نفرت میں بدل گئی۔

بمبئی میں ایک اور لمبی چوڑی کار ایئرپورٹ پر منتظر کھڑی تھی۔ اُس میں موہن ناگ ارجن اور سویتا سوار ہوئے۔

موہن نے سویتا سے کہا 'سب سے پہلے میں تمھیں اپنی سلطنت دکھانا چاہتا ہوں۔ تاکہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ اُس دن تمھارے پتا جی کے تھپڑ کھا کے میرا کیا حال ہوا۔ میں پہلے تو مدراس گیا، کیونکہ وہیں غیر برہمنوں کا ٹھکانا ہے۔ وہاں جا کر میں ایک آدمی سے ملا جو بمبئی میں دادا گنجا کے نام سے مشہور ہے۔ اُس سے میں نے بمبئی کے بارے میں ساری معلومات حاصل کیں۔ پھر میں نے ایک ناریل اور پانچ روپے کا نوٹ اُس کے چرنوں میں رکھے۔ وہ کہنے لگا:

جا بچّہ، بمبئی میں میرا محلّہ جو ہے۔ اُس پر تو قابض ہو جا۔ مگر ایک اور جنوبی ہندوستان کا رہنے والا وہاں موجود ہے۔ اُس کا خیال رکھنا۔ جب تک تمھاری طاقت اُس کی طاقت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جائے، تم اس سے منہ نہ لگنا، اُس کا علاقہ سیوری میں ہے۔ وہاں کی ساری جھونپڑپٹیاں میرے قبضے میں ہیں۔ اب وہاں تم حکومت کر سکتے ہو۔ جا بچّہ جا۔ بھگوان تیری سہایتا کرے گا۔

'دادا گنجا سے آشیرواد لے کر میں جب بمبئی آیا تو سب سے پہلے دادا گنجا کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔ گھر کھولا تو ہر طرف دھول ہی دھول تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے سارا مکان صاف کیا۔ دیکھا کہ نہ ٹیلی فون چل رہا ہے، نہ گیس بھرا ہوا سلنڈر موجود ہے۔ میں نے کہیں اور سے ٹیلی فون کمپنی کو فون کیا اور کہا کہ میں نے دادا گنجا کا گھر کرائے پر لے لیا ہے۔ کل سے ٹیلی فون

لگ جانا چاہیے۔ گیس میں نے بعد میں منگوالی۔

'پبلک ٹیلی فون سے میں نے دادا گنجا کے خاص خاص آدمیوں سے رابطہ قائم کیا۔ کوئی تین پٹوں کا دھندا کرتا تھا۔ اُس سے کہا کہ تمھارا کام کل سے شروع ہو جانا چاہیے۔

وہ بولا: تم کون ہو مجھ پر حکم چلانے والے۔

میں نے کہا: میں تمھارا نیا باس ہوں۔ دادا گنجا نے اپنا سارا کام مجھے سونپ دیا ہے۔ اب تم سب میرے ماتحت ہو۔'

'اُس رات کو چھ غنڈے میرے لیے اپنے گھر سے پکا ہوا کھانا لے کر آئے۔ سب نے ایک ایک ناریل اور پانچ روپے کا نوٹ میرے چرنوں میں رکھا اور کہا کہ ہمیں تار سے دادا گنجا نے ہدایت کی ہے کہ ایک نیا باس آرہا ہے۔ اُس کی سیوا میری طرح ہی کرنا۔ گیس اور فون بھی ٹھیک کرانے کو کہا ہے۔

'کھانا بہت اچھا تھا۔ پراٹھے اور چکن فرائی میں نے مزے لے لے کر کھایا۔ پھر دارو کی بوتلیں کھلیں مگر میں نے کہا میں اس معاملے میں پکا گاندھی وادی ہوں۔ نہ دارو پیتا ہوں، نہ سگریٹ بیڑی اور نہ مجھے لڑکیوں کا شوق ہے۔ اس لیے تم مجھے نئے قسم کا باس سمجھو۔ مگر تم اِس خوشی میں ضرور پیو۔ میں کوئی سادھو مہاتما نہیں ہوں۔ تمھارے جیسا ہی آدمی ہوں۔ مگر ٹیلی فون صبح کو سویرے ہی لگ جانا چاہیے، صبح سویرے لائنس مین آتے ہیں۔ اِن کی خاطر مدارات کر دینا۔ پھر وہ یہ غلطی نہ کریں گے۔ کہنا، ہمارا باس کہتا ہے کہ کبھی ٹیلی فون میں خرابی ہوئی تو تمھاری خیر نہیں ہے۔

'اگلے دن جب تین لائنس مین نظر آئے تو اُن کو مارا پیٹا گیا اور کہا گیا کہ سب سے پہلے ناگ ارجن صاحب کا فون ٹھیک کیا جائے گا۔ جب انھوں نے کہا کہ یہ فون بل ادا نہ کرنے پر کاٹا گیا ہے تو اُن کی اور پٹائی ہوئی۔ آخر میں اُن کی خاطر ہوئی۔ سب کو دودھ پلایا گیا۔ دودھ میں جلیبیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جلیبیوں کی تیاری میں تھوڑی سی افیم ڈالی گئی تھی۔ دودھ پینے کے بعد تینوں لائنس مین سو گئے۔ جب اُٹھے تو ان کا رویہ ہی بدلا ہوا تھا۔ میرے آدمیوں نے ان سے کہا کہ بارہ گھنٹے میں ناگ ارجن کا ٹیلی فون چالو ہو جائے گا تو تم کو ہمیشہ جلیبیاں کھانے کو ملیں گی،

ورنہ جوتے کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'

موہن ناگ ارجن سویتا کے سامنے اپنی زندگی کی کتاب کے ورق پلٹتا گیا۔

ایک دن ریلوے لائن کے کنارے ایک بڑھیا کا جھونپڑا میونسپلٹی کے آدمیوں نے گرا دیا۔ ناگ ارجن نے چلتی ہوئی موٹر سے یہ ماجرا دیکھا اور اپنے گرگوں کو ہدایت کی کہ جھونپڑا پھر کھڑا کر دیا جائے اور جب میونسپلٹی والے آئیں تو اُن کی مرمت کر دی جائے۔ وہ بڑھیا اگلے تین چار دن تک ناگ ارجن کی تعریف میں قصیدے گاتی رہی۔ اس کے بعد تو اُس کالونی کے جتنے لوگ بے گھر کیے گئے تھے، سب کے سب ناگ ارجن کے پاس آئے اور میونسپلٹی کے ظلم کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔ ناگ ارجن نے کہا کہ 'تم لوگ ووٹ تو کانگریس کو دیتے ہو اور جب وہ گورنمنٹ جو تمھارے ہی ووٹوں سے بنی ہے، تمھاری جھونپڑیاں توڑ ڈالتی ہے تو تم رونے پیٹنے کے لیے ہمارے پاس آتے ہو۔ خیر، اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ جس کو ہم کہیں گے اسی کو ووٹ دو گے تو ہم بھی وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمھارے جھونپڑے اپنے آدمیوں سے پھر بنوا دیں گے۔'

'ناگ ارجن صاحب کی جے!' ایک نعرہ بلند ہوا اور پھر سب یہی کورس گانے لگے۔ چند دن میں ہی ناگ ارجن اپنے علاقہ کا بادشاہ ہو گیا۔ ہر کام کے لیے لوگ اس کے پاس آنے لگے۔ سارے علاقے میں شہرت ہو گئی کہ ایک نیا دادا ناگ ارجن نام کا آیا ہے۔ سب بیوپاری اُس کو 'ہفتہ' دینے کو تیار ہو گئے۔ ہر دُکان سے پچیس روپے 'ہفتہ' اُس کو ملنے لگا۔ وہ اکثر لوگوں سے کہتا: 'یاد رکھو کہ میں ناگ بھی ہوں اور ارجن بھی۔ اگر ناگ کے کاٹنے سے تم ڈرتے ہو تو ارجن کی بہادری ہمیشہ یاد رکھو۔'

اگلے مہینے ناگ پنچمی آئی تو ناگ ارجن نے دکان داروں کو یہ پیغام بھجوایا کہ اگر باس کو خوش کرنا ہے تو ہر دکان سے کم سے کم سو روپے اس کے پاس پہنچ جائیں۔ اس طرح ناگ ارجن کو کوئی دس ہزار کی آمدنی ہو گئی۔ اُس دن ناگ ارجن نے پولیس کے سب افسروں کی دعوت کی۔ ایک سپیرا کہیں سے آ گیا تھا۔ اُس کے ناگوں کا تماشا ہوتا رہا۔ سپیرے کی بین کی سنگیت پر ناگ لہراتے رہے۔ بعد میں پینے پلانے کا دور چلا۔ یہ پارٹی یوں تو پرائیویٹ تھی، مگر اس کا پولیس حلقوں میں بہت نام ہوا اور علاقے کے سارے پولیس افسر ناگ ارجن کے یارِ غار بن گئے۔ یہ

بے لکھا فیصلہ بھی ہوگیا کہ اپنی آمدنی میں سے پچیس فی صد ناگ ارجن پولیس اسٹیشن پہنچایا کرے گا اور بدلے میں پولیس والے مار پیٹ کے سارے کیس پہلے ناگ ارجن کے پاس بھیجیں گے۔ جب وہ کسی کیس کے بارے میں پولیس سے کہے گا تو پولیس کچھ ایکشن لے گی، ورنہ نہیں۔ اس نئے معاہدے پر سو سو کے نوٹوں سے مہر لگ گئی، جو ہر پولیس والے کو ناگ ارجن نے 'ہماری نئی دوستی' پر مہر لگانے کے لیے دیے۔ پرجوش مصافحوں اور معانقوں کے بعد یہ محفل صبح کے تین بجے برخواست ہوئی۔

یہ پارٹی ایک سگنل تھا کہ ناگ ارجن کی بادشاہت اب پولیس کی محافظت میں شروع ہوگئی ہے اور سب لوگ اس کا لوہا مان لیں۔ ناگ ارجن نے اپنے گرو گنجا دادا کو ایک بار ترو پتی بھیجا، جہاں وہ بھگوان کے درشن کرنے گیا ہوا تھا۔ ساتھ میں اسے پانچ ہزار روپے بھی تار منی آرڈر کے ذریعہ بھیجے گئے۔ جواب میں وہاں سے بھی آشیرواد اور ترو پتی کا پرشاد وصول ہوا۔

اس کے بعد ایک دن جب ناگ ارجن لنگڑے لولوں کے اسپتال میں اپنے ایک اسسٹنٹ کو دیکھنے گیا تھا جو کسی اور گینگ کے علاقے میں چلا گیا تھا اور وہاں اُس کی ٹانگیں توڑ دی گئی تھیں۔ تو ناگ ارجن کی نظریں ویدی پر پڑی، جو وہیل چیئر پر بیٹھی جا رہی تھی۔ جب ناگ ارجن کو معلوم ہوا کہ اُس روز شام کو وہاں ایک ڈانس پروگرام ہے تو اُس نے پانچ سو روپیہ اسپتال کو دے کر ایک ٹکٹ حاصل کر لیا تھا۔

یہ تھا اتفاق یا قسمت کا وہ چکر جس نے موہن ناگ ارجن کو رائے پور سویتا سے ملنے بھیجا اور نتیجے کے طور پر سویتا، اب جوہو کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اس کی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ صرف ایک دفعہ رات کو کھانے پر اس سے ملنے کے لیے آتا تھا۔ ایک وکیل سے اس نے سویتا کی ملاقات کرا دی تھی، جس نے علاقہ کے بہت سے مقدمے جیت کر اعلیٰ سوسائٹی میں بہت شہرت حاصل کر لی تھی۔ وکیل نے سویتا کو یقین دلایا تھا کہ اُس کا مقدمہ پوری طرح سمجھنے کے بعد وہ سویتا کی طرف سے نوٹس تیار کرے گا اور وہ کلکٹر صاحب، رائے پور کے نام بھیجے گا۔

سویتا نے کلکٹر پر تین الزام لگائے تھے (1) وہ سرکاری کام میں ضرورت سے زیادہ دھاک دکھاتے ہیں اور بے چاری بیوی کو نظر انداز کرتے ہیں۔ (2) اکثر رات کے کھانے کے وقت بھی

دفتر کی باتیں کرتے ہیں، جس سے بیوی کو پریشانی ہوتی ہے۔(3) آدی واسیوں کے کاموں میں بھی ضرورت سے زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ کبھی کبھی رات بھی آدی واسیوں کے گاؤں میں گزارتے ہیں (چھپا ہوا اشارہ یہ تھا کہ آدی واسی لڑکیوں سے ان کے جنسی تعلقات ہیں)۔ ایک دفعہ ایک آدی واسی لڑکی کا آپریشن ہوا تھا۔ اس کے لیے گروپ بی خون کی ضرورت تھی، جو کلکٹر صاحب کے خون سے میچ کھاتا تھا۔ کلکٹر صاحب نے اُس لڑکی کے لیے اپنا خون دیا تھا۔ اس واقعہ کو بھی توڑ مروڑ کر وکیل نے کلکٹر کی 'جنسی تحریک' پر محمول کیا تھا۔

اب یہ کیس عدالت میں آنے ہی والا تھا۔ کلکٹر نے بدنامی کے خوف سے رائے پور ضلع چھوڑ دیا تھا۔ ایک جوائنٹ مجسٹریٹ فی الحال کلکٹر کا کام کر رہا تھا۔

کلکٹر اس مقدمے کی وجہ سے چھٹی لے کر بمبئی آیا ہوا تھا، کیونکہ وہ بار بار رائے پور سے نہیں آسکتا تھا۔ بمبئی آکر وہ دیدی کو دیکھنے کے لیے لنگڑے لوگوں کے اسپتال میں بھی گیا۔ اب اُسے احساس ہوا کہ سریتا کے مقابلے میں سویتا کچھ بھی نہیں تھی۔ دونوں کے مزاج اور رویہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

اُدھر ناگ ارجن کو ایک اور پریشانی کھائے جا رہی تھی۔

پولیس کا ایک ڈپٹی کمشنر نیا آیا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ناگ ارجن جیسے لوگ 'گاڈ فادر' بنے جھونپڑ پٹیوں پر راج کر رہے تھے۔ دھڑلے سے گینگ وار فیئر چل رہا تھا۔ ڈپٹی کمشنر پر بدمعاشوں کا راج ختم کرنے کی دُھن سوار ہوئی۔ ایک جھگڑے میں ایک گینگ کا لیڈر مارا گیا۔ قتل کے الزام میں جو شخص پکڑا گیا وہ ناگ ارجن کے گروہ کا آدمی تھا، جس نے اپنے پستول کی گولی سے گینگ لیڈر کا خاتمہ کر دیا تھا۔ پولیس نے اس کو گرفتار کر کے بہت مارا پیٹا۔ دراصل ڈپٹی کمشنر اس مقدمے میں ناگ ارجن کو بھی اُلجھانا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ گینگ لیڈر کے قاتل بھاسکر کو دھمکا بھی رہا تھا، لالچ بھی دے رہا تھا کہ وہ ناگ ارجن کی سرگرمیوں کے بارے میں سب کچھ اُگل دے۔ کیونکہ وہ ناگ ارجن کی خاطر اپنی جان دینے پر تُلا ہوا ہے؟

ڈپٹی کمشنر کو بھاسکر اور ارجن کی ایک تصویر ایک تمل فلم اسٹار کے ساتھ مل گئی۔ اُس نے اُس

کی کئی کاپیاں بنوائیں۔ ایک کاپی اس نے مس سویتا کو جوہو کے ہوٹل میں بھجوادی، ایک کاپی اپنے پاس رکھی اور ایک کاپی لے کر جیل میں گینگ لیڈر کے قاتل کے پاس گیا اور اس سے کہا 'دیکھو، تمھارا باس فلم اسٹاروں کے ساتھ عیش کر رہا ہے۔ اس لڑکی کو تو پہچانتے ہوگے؟ 'ریلوے والی' کہلاتی ہے۔ ساؤتھ میں ہر شخص اس کا دیوانہ ہے۔ مگر یہ خود روپے کی دیوانی ہے۔' اس لیے تو ناگ ارجن کے ساتھ گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر اس نے یہ تصویر کھنچوائی ہے۔ تمھارا باس تو لڑکیوں کے چکر میں ہی رہتا ہے۔ ایک اور لڑکی ہے جس کو وہ رائے پور سے بھگا کر لایا ہے اور یہاں بمبئی میں اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرایا ہے۔ یہ لڑکی رائے پور کے کلکٹر کی بیوی ہے۔ اُس کا طلاق کا مقدمہ اگلے ہفتے شروع ہونے والا ہے۔ کلکٹر صاحب تمھارے باس کو بھی بلانے والے ہیں۔ مقدمہ میں فائیو اسٹار ہوٹل کے سارے بل پیش ہوں گے جن کی ہفتہ وار ادائی تمھارا باس کرتا ہے اور اس حالت میں بھی تم اپنی جان اُس بے ایمان کے لیے دے رہے ہو؟'

'مجھے ڈر لگتا ہے۔ ایک بار میں باس کے چنگل میں پھنس گیا تو نکلنا ناممکن ہے۔'

'ہم تمھاری حفاظت کی گارنٹی دیتے ہیں۔ تمھیں کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ ہم صرف ایک کاغذ چاہتے ہیں جس پر تم لکھو گے کہ ہم نے یہ قتل ناگ ارجن کے کہنے پر کیا تھا۔'

'مگر باس بہت ہوشیار ہے۔ اپنی زبان سے کبھی کوئی آرڈر نہیں دیتا۔ صرف اتنا کہتا ہے کہ یہ آدمی خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی ہے جو اس کو ہمیشہ کے لیے چُپ کرادے۔ تو میں نے کہا، یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ باس نے الماری سے پانچ ہزار کے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اور میری طرف دیکھ کر کہا: 'شاباش! یہ کام کر دو اور پانچ ہزار کی رقم وصول کرلو۔'

کام تو ہوگیا، مگر قاتل پکڑا گیا اور قتل کا یہ کیس قتل کی سازش کا کیس بھی بن گیا، جس میں ناگ ارجن بھی پھنسا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے وکیل سے مل کر پیشگی ضمانت کا انتظام کرالیا تھا۔ اُس شام کو وہ سویتا کے ہوٹل گیا۔ سویتا کو وہاں اُس کا انتظار کرتے ہوئے دو ہفتے ہوگئے تھے۔ ہوٹل والے بھی اس کے انتظار میں تھے۔ اسے دیکھتے ہی بولے 'مسٹر ناگ ارجن، آپ دو ہفتے کا بل ادا کر دیجیے۔'

'کر دوں گا۔ کر دوں گا۔ آج نہیں تو کل ادا ہو جائے گا۔ آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے کوئی نیا گاہک آیا ہو!'

جب ناگ ارجن سویتا کے کمرے میں پہنچا تو وہ نائٹ ڈریس پہنے لیٹی تھی۔ اسے دیکھ کر کہنے لگی شکر ہے کہ دو ہفتے کے بعد تم نے آج صورت تو دکھائی۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم کہیں باہر چلے گئے ہو۔ اگر چہ ٹرنک کال تم وہاں سے بھی کر سکتے تھے یا اب تم اُس لڑکی کے چکّر میں تو نہیں؟'

'کون سی لڑکی؟'

سویتا نے دراز سے تصویر نکال کر ناگ ارجن کو دکھائی۔ ناگ ارجن نے فوراً کہا 'یہ تو پرانی تصویر ہے۔ اس لڑکی نے اپنی پبلسٹی کے لیے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیئے تھے۔ تمھارے طلاق کے مقدمے کا فیصلہ ہو جائے تو اس سے دس گنا زیادہ جذباتی تصویریں تمھارے ساتھ کھنچواؤں گا۔ میں تو بے تابی سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔'

'تو تم کیس میں میرے ساتھ چلو گے؟'

'اگر تم کہو گی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن سوچ لو، اگر میں اس مقدمے میں ملوث ہو گیا تو کیا ہوگا؟'

'مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ اب تو میں تمھارے بس میں ہوں۔'

'تم میرے لیے سب کچھ ہو ڈارلنگ۔ اس کالی کلوٹی ایکٹرس کا تم سے کیا مقابلہ؟ کہو تو میں بھری عدالت میں تم سے اپنے عشق کا اظہار کر دوں؟'

'ہاں، اگر ایسا ہو جائے تو بہتر ہوگا۔' سویتا نے کہا اور چپکے سے پستول کو پیچھے بستر کے نیچے سرکا دیا۔

اوپر کلاک ٹاور میں گیارہ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔

نیچے ہائی کورٹ کا ڈراما شروع ہونے والا تھا۔ وکیل اپنے کالے سوٹ پہنے ہوئے آخری بار آئینے میں اپنا جائزہ لے رہے تھے۔

ملزموں کی گاڑی جیل سے آ چکی تھی۔ وہ اپنے جھوٹ یا سچ کو جانچ رہے تھے۔ اور بار بار ہائی کورٹ کی اُن کرسیوں کو دیکھ رہے تھے جن پر جج آ کر بیٹھنے والے تھے۔ مغلیہ دربار کی یونیفارم پہنے، ہائی کورٹ کے چپراسی اپنے گلوں کو کھنکھار کر صاف کر رہے تھے۔ آخر انھوں نے گلے کی

گہرائی سے ایک آواز لگائی: 'سب لوگ کھڑے ہو جائیں۔

بالکل اسی طرح جیسے اُن کے مغلیہ پیش رو 'با ادب، با ملاحظہ ہوشیار' کی صدا لگایا کرتے تھے۔ یہ آواز انہوں نے سنی تو نہیں تھی، مگر کئی بار فلم 'مغلِ اعظم' دیکھ کر انھوں نے تلفظ نوٹ کر لیا تھا، اگر چہ وہ زبان دانوں کی رائے میں بہترین نہیں تھا، پھر بھی عام مہاراشٹریوں کی رائے میں بالکل شان و شوکت کی ایک نشانی ضرور تھا۔

چپراسیوں کی للکار کے بعد کس کی مجال تھی کہ بیٹھا رہ جاتا۔ مجرموں اور پولیس کے سپاہیوں سے لے کر اُن بیرسٹروں اور وکیلوں تک جن کی آمدنی کئی لاکھ روپے ماہوار تھی، یعنی ایک جج کی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ تھی، ہر شخص ادب سے کھڑا ہو گیا۔

چیف جسٹس نے ایک اشارہ کیا اور سب لوگ جلدی یا دیر سے اپنی اپنی کرسی یا بینچ پر بیٹھ گئے اور خواہ کسی مقدمے میں پھنسے ہوئے ہوں یا نہ ہوں، اپنے چہروں پر پھنسے ہونے کے آثار طاری کر لیے۔ ہائی کورٹ میں آکر ہر شخص چاہے وہ وکیل یا بیرسٹر ہی کیوں نہ ہو— اپنے آپ کو مجرم سمجھتا تھا، جب تک اس کو ہائی کورٹ سے بری نہ کیا جائے!

کورٹ میں سب سے زیادہ نروس آدمی تین تھے: سویتا، کلکٹر رائے پور اور موہن ناگ ارجن۔ تاہم یہ تینوں اپنے اپنے مقام پر بالکل ایسے پوز میں بیٹھے تھے جیسے دنیا اور اس کی فکریں اُن سے بہت دور ہیں۔ اس کے برعکس سرتا سرکاری کونسل اور ڈیفنس کونسل، تینوں اپنے اپنے موکلوں کی پریشانیوں کا بوجھ اپنے اپنے شانوں پر لیے نظر آتے تھے۔

جب جج صاحبان اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو چیف جسٹس نے کاغذات کو پلٹنا اور پڑھنا شروع کیا۔ ایک دفعہ کھنکھارا تو اُن کے خاص چپراسی نے آواز لگائی: 'سویتا دیوی بنام مسٹر سریش، کلکٹر ضلع رائے پور۔ طلاق کا مقدمہ ڈیفنس کے گواہ شری موہن ناگ ارجن حال مقیم بمبئی شہر بلائے جاتے ہیں۔ کیا یہ سب پارٹیاں حاضر ہیں؟'

جواب میں سب سے زیادہ چستی ناگ ارجن نے دکھائی اور اپنی سیٹ پر کھڑے ہو کر کہا:

'جی جناب، میں موہن ناگ ارجن حاضر ہوں۔'

اب اُس کے قاتل کو نشانہ لگانے کا پورا موقع مل گیا۔ اُس نے پستول پر سائیلینسر لگا رکھا

تھا۔ کورٹ میں سائیلینسر لگے ہوئے پستول کی دھیمی سی 'پھٹ' ہوئی اور ناگ ارجن یہ جانے بغیر کہ کس نے اور کس طرح اُس کو مارا ہے، ایک آہ کے ساتھ گر پڑا۔

سویتا، جواب تک اپنے پستول کی لبلبی دبا رہی تھی، سب سے زیادہ پریشان تھی کہ یہ کون تھا جس نے موہن ناگ ارجن کو قتل کرنے میں پہل کر دی۔ ابھی وہ اسی اُلجھن میں تھی کہ اوپر کی بالکنی پر کچھ گڑ بڑ کی آوازیں سنائی دیں، جیسے دو آدمیوں میں ہاتھا پائی ہو رہی ہو۔ ان آوازوں کو سن کر کورٹ میں سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض آدمی تو اپنی کرسیوں پر یا پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے کہ شاید کچھ نظر آ جائے۔ پھر بھی چند منٹ تک صرف آوازیں آتی رہیں اور کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ اس کے بعد ایک دم کورٹ کا اوپر والا حصّہ جگمگا اُٹھا۔ اب نیچے سے لوگوں نے دیکھا کہ دو خاکی وردی والے لڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک پولیس کی وردی میں تھا اور دوسرا ملٹری یونیفارم میں۔ پستول ملٹری والے کے ہاتھ میں تھا اور رائفل پولیس والے کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ دونوں اب کچھ فاصلے پر تھے۔ اس طرف سے پستول چلا۔ دوسری طرف سے رائفل کی گولی چلی۔ دونوں گولی کھا کر گر پڑے۔ مگر جان اب بھی باقی تھی۔ اس لیے اب تک نہ ملٹری والے نے پستول چھوڑا تھا نہ رائفل پولیس والے کے ہاتھ سے چھوٹی تھی۔ ایک بار پھر رائفل کا مقابلہ پستول سے ہوا اور پولیس والے کو بے ہوش کر دیا۔ مگر دونوں سخت جان تھے، اس لیے جب ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو دونوں کے جسموں میں جان باقی تھی۔

یہ کورٹ کا ڈرامہ رُکے بغیر چل رہا تھا۔ چپراسیوں کی 'خاموش! خاموش!' کی گونج گرج کا کوئی اثر تماشا دیکھنے والوں پر نہیں ہوا۔ یہ تو کورٹ مرڈر کا کلائیکس ہو گیا کہ ایک گواہ کے سینے میں گولی لگی اور دو سپاہی گھائل ہوئے۔ ایک پولیس کا سپاہی تھا اور دوسرا ملٹری کا جوان تھا۔

اتنے میں ملٹری پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ملٹری کا جوان 'نقلی' تھا، یعنی بہروپ بھرے ہوئے تھا۔ پتہ چلا کہ وہ شخص واقعی ملٹری کی کسی برانچ کا آدمی نہ تھا۔ صرف کسی فلم کمپنی سے فوج کے جوان کی یونیفارم پہن کر پستول لگائے ہائی کورٹ میں داخل ہو گیا تھا۔ کسی نے اس پر شبہ نہ کیا اور وہ آرام سے اوپر بالکنی تک پہنچ گیا۔ بالکنی کی کھڑکی کے عین نیچے ایک بڑی لمبی چوڑی موٹر کھڑی تھی جو ایک فلم اسٹوڈیو سے کرائے پر لی ہوئی تھی، تاکہ اس میں یہ

اسٹنٹ STUNT ایکٹر کی طرح کود جائے اور کار فوراً روانہ ہو جائے۔

اب دونوں بہنیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بات کرنے میں کلکٹر صاحب کی موجودگی رُکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ آخر سویتا نے سریش کو مخاطب کر کے کہا: 'کلکٹر صاحب، آپ کو پہلے سے مبارک باد دے دوں۔ آپ نے بہترین چناؤ کیا ہے۔ ڈیڈی کے ڈاکٹر سے میری کل فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ بس دو مہینے اور لگیں گے ڈیڈی کو اپنے پیروں سے چلنے میں۔'

'اور تم کیا کرو گی؟' سریتا نے اپنی چھوٹی بہن سے پوچھا۔

'معلوم نہیں تمھیں کہ میں ہمیشہ 'تم' بننا چاہتی ہوں۔' سویتا نے سریتا کے قریب ہو کر اس طرح سرگوشی میں کہا کہ رمیش کو سنائی نہ دے۔ 'مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اس بڈھے کھوسٹ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تمھیں تمھارا کلکٹر مبارک ہو۔ میں تو یوں بھی ایک وکیل کے جال میں پھنس چکی ہوں۔'

اسی لمحہ ڈیفنس وکیل نے حاضر ہو کر اپنا تعارف کرایا: 'میں ہی وہ وکیل ہوں، سریتا جی۔ اور سویتا، اب چلتی ہو یا کھانا ٹھنڈا کراؤ گی؟'

سویتا اپنی ڈیڈی سے لپٹ کر ہنستے ہنستے رو پڑی۔ پھر اس نے الگ ہو کر اپنی ساڑی کا پلّو ٹھیک کرتے ہوئے کہا 'مجھے تو یہ ہندوستانی فلموں کا کلائمیکس لگ رہا ہے!'

'ہاں، یہ تو ٹھیک کہا تم نے، اگرچہ تم سچ کم ہی بولتی ہو۔'

'ہو، نہیں ڈیڈی۔ 'تھی' کہیے۔ اب میں ہمیشہ سچ ہی بولتی ہوں — لو اب میں چلی کہیں میرا وکیل مجھے پھر نہ پھنسا دے!'

دونوں باہر گئے تو کلکٹر صاحب اور سریتا ایک دوسرے کی بانہوں میں تھے۔

'یاد ہے آدی واسیوں کا وہ گیت؟' رمیش نے سریتا کو چھیڑا۔

'بالکل یاد ہے۔ وہی 'جب تم کہیں اور پیدا ہو تو کسی کلکٹر سے شادی نہ کرنا۔' سریتا نے کہا۔

'ہاں — ' رمیش مسکرا دیا 'مگر اب اس گیت میں یہ بول بڑھانے پڑیں گے: 'یا کرنا تو اپنی چھوٹی بہن کے خاوند سے کرنا، کیونکہ اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔'

○

# بچپن، جوانی اور بڑھاپا

جب پنڈت کرپارام کا انتقال ہوا تو ان کی عمر 29 سال کی تھی۔ چھ ڈاکٹر اور ان کے پانچ پوتے ان کے بستر کے اردگرد موجود تھے۔ انھیں ایک چاندی کے کٹورے میں گنگا جل دیا گیا جس کے آخری قطرے ان کے مُردہ منہ سے باہر گرے۔

ان کا ’کریا کرم‘ بڑے ٹھاٹ سے ہوا۔ وہ کروڑپتی تھے۔ اس لیے ان کی لاش کو ایک لال شال میں لپیٹا گیا۔ جس کے اوپر پھولوں کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ شہر کے سبھی طبقوں کے لوگ ان کی ارتھی کے ساتھ ہو لیے۔ آگے آگے ایک بینڈ ’چل چل رے نوجوان‘ کی دُھن بجا رہا تھا۔

شمشان گھاٹ میں چندن کی لڑکیوں کے ڈھیر پر ان کی ارتھی کو رکھا گیا۔ جو تقریریں ان کی یاد میں کی گئیں ان میں ایک ستر سال کے ان کے ایک نوجوان ساتھی نے بھی کی۔ جس نے کہا کہ پنڈت کرپارام جیسے نیک آدمی کبھی نہیں مرتے۔ صرف اپنا چولا بدل لیتے ہیں۔ کوئی حیرانی نہیں کہ اس وقت پنڈت کرپارام کی روح ’آواگمن اور کرم‘ کے قانون کے مطابق کسی بچے کی شکل میں پھر جنم لے رہی ہو۔

تقریروں کے بعد ’پنڈت کرپارام امر رہیں‘ کے نعروں اور ویدک منتروں کے ساتھ ان کے بڑے پوتے نے آخری سنسکار کیے اور ’بلیک مارکیٹ سے خریدا ہوا اصلی گھی ان کے جسم کے اوپر ڈالا گیا اور ان کے فانی جسم کو آگ لگا دی گئی۔ چند ہی گھنٹوں میں وہ راکھ کے ڈھیر ہو گئے۔

اگلے دن ان کے پوتوں نے ایک چاندی کے برتن میں ان کی لاش کے ''پھولوں' کو سمیٹا اور ہوائی جہاز سے ان کو بنارس لے جایا گیا۔ جہاں ایک پھولوں کی کشتی میں سجا کر ان کو گنگا کی لہروں کی نذر کر دیا گیا، جو ان کو آخری گھاٹ تک لے جائیں گی مگر بڑی مچھلیوں اور مگرمچھوں کی انتڑیوں کے ذریعہ جو ایسے ہی ایک مزیدار لقمے کے انتظار میں تھے۔

پنڈت کرپارام کی آخری رسومات 'خراج' بھی بڑی دھوم سے ہوئیں۔ دو ہزار سے زیادہ برہمنوں کو کھانا کھلایا گیا جس میں اصلی گھی میں بنی ہوئی پوریاں، بھاجیاں، لڈّو اور رس گلّے تھے۔ بعد میں سب پنڈتوں نے مل کر ایک آواز ہو کر پنڈت کرپارام کی آتما کے لیے دعا کی اور پھر اپنی شالیں لپیٹتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ اگلے کسی بڑی آسامی کے موت کے انتظار میں۔

جب بھگوان کے دربار میں پنڈت کرپارام کی آتما پیش ہوئی تو بھگوان نے کہا، 'کرپارام' تم نے اپنے زندگی میں اپنے حساب سے ہماری بڑی سیوا کی ہے۔ اپنے پتا جی کے' آخری رسوم' میں تم نے ایک ہزار برہمنوں کو کھانا کھلایا تھا۔ اپنے کالے دھن سے ایک اسپتال بنوایا۔ دو اسکول قائم کیے اور ایک پنجرہ پول بنوایا بوڑھی گایوں کے لیے۔ تمھیں دوبارہ ایک موقع اور دیتے ہیں تاکہ تم دیکھ سکو کہ اب انسان کیا کر رہے ہیں۔ ان کی اچھائی برائی کو پہچان سکو۔ ہم تمھیں کسی عمر کا بھی بنا سکتے ہیں۔ بولو، کس عمر میں پیدا ہونا چاہتے ہو؟'

پنڈت کرپارام کی آتما نے جواب دیا،' سب سے زیادہ خوشی مجھے بچپن ہی میں ملی تھی۔ مجھے بالک کا ہی جنم دیجیے۔'

'لو تو پھر بالک ہی بنا کر ہم تمھیں جنم دیتے ہیں۔' بھگوان نے کہا۔ مگر بھگوان کے چہرے پر ایک انوکھی اور 'ان دیکھی' مسکراہٹ تھی۔

سو پنڈت کرپارام کی دوبارہ پیدائش ایک خوبصورت بچے ہی کی شکل میں ہوئی۔

بچہ سوامی چھوٹانند برہم چاری کے آشرم میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے وہاں کے سب نوکروں کو معلوم تھا کہ برہم چاری جی کے یوگا شرم میں ہی بچے نے جنم لیا تھا مگر کس کے بطن سے وہ پیدا ہوا تھا یہ نہ معلوم ہو سکا۔

بچہ ذرا بڑا ہوا تو لوگوں سے پوچھنے لگا۔' میرا باپ کون ہے؟ میری ماں کون ہے؟'

اسے بتایا گیا کہ اس آشرم میں ہر چیز برہم چاری جی کے دم سے ہے۔ اس لیے تم بھی اپنے آپ کو ان کا ہی سمجھو۔

اب بچے کو سب 'آشرم کا بچہ' ہی کہنے لگے۔

صبح سویرے جب برہم چاری جی اپنے سلک کے جوگیا کپڑوں میں نہا دھو کر باہر نکلتے اور بچہ کہیں راستے میں دکھائی دے جاتا تو وہ مسکرا کر کہتے، "کیوں بھئی، کیسے ہو میرے بالک؟" اور بچے کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔

مگر جب کبھی بچہ آشرم کے نوکروں سے پوچھتا کہ میری ماں کون ہے اور کہاں ہے تو جواب ملتا— 'کون جانتا ہے تمھاری ماں کون ہے اور کہاں ہے؟ ہو سکتا ہے تم ایک امریکن ہپّی لڑکی کی اولاد ہو جس کی آنکھیں بھی تمھاری طرح ہی نیلی تھیں۔'

ایک اور کہتا، 'مگر اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ اس بھوٹانی لڑکی کا بچہ ہو جو ایک برس تک برہم چاری جی کے پاؤں دبایا کرتی تھی۔'

'نہیں جی۔' ایک تیسرا کہتا— 'اس کا قد تو دیکھو۔ اس عمر میں کتنا لمبا ہے یہ۔ مجھے تو یہ مہارانی کا شانگر کے پیٹ سے لگتا ہے۔'

پہلا پھر کہتا، 'اس کی گندمی رنگت سے تو یہ اس جنوبی ہندوستانی دیوداسی کی اولاد دکھائی دیتا ہے جس کے فن میں برہم چاری جی بھگوان کی لیلا دیکھا کرتے تھے۔'

اس پر رسوئی مہاراج کہتے، 'ارے بیوقوفو، برہم چاری جی کو تم لوگ معمولی آدمی سمجھتے ہو؟ وہ چاہیں تو اپنی کلپنا سے اس بالک کو جنم دے سکتے ہیں اور اس میں ان سب لڑکیوں کی خوبیاں پیدا کر سکتے ہیں جو ان کے دل کو اچھی لگتی ہوں! کیا تم نے حضرت عیسیٰ کے جنم کی کہانی نہیں سنی؟ مجھے تو اس بچے کا جنم بھی ایک آتما کا کرشمہ لگتا ہے۔'

بچہ یہ سب سنتا اور اسے بڑی خوشی ہوتی کہ اس کے جنم کے بارے میں اتنی خوبصورت باتیں کہی جا رہی ہیں۔

پھر ملک کی سیاست نے ایک پلٹا کھایا۔

برہم چاری گرفتار ہو کر جیل چلے گئے۔ ان پر آبرو ریزی کا الزام تھا اور ہپّیوں کے ذریعہ

امریکن DRUGS کا سودا کرنا بھی۔

مقدمہ لمبا اور پیچیدہ تھا۔ برہم چاری جی کے وکیل بیرسٹر بھی ہوشیار تھے، اور مقدمہ طول کھینچتا جارہا تھا۔

مگر آہستہ آہستہ آشرم کا ڈھانچہ بکھرنے لگا۔ ایک ایک کر کے سب نوکر رخصت ہونے لگے۔ بہتی جو جیل میں نہیں تھے وہ پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ یہ سب بچّے نے دیکھا۔ رسوئی مہاراج بھی اپنا بستر گول کر رہے تھے۔

وہ کہنے لگا: ' مہاراج، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟'

انھوں نے کہا 'حرام زادے۔ میں تجھے کہاں لیے لیے پھروں گا'

رسوئی مہاراج تو چلے گئے۔ مگر بچّے کا ایک مسئلہ حل ہو گیا۔ اسے اس کا نام معلوم ہو گیا۔ حرام زادہ—اگر چہ اس کا مطلب اسے نہیں معلوم تھا۔

جب آشرم خالی اور سنسان ہو گیا تو بچّہ بھی باہر نکل آیا۔

فٹ پاتھ پر بہت سے بے گھر، بے سہارا بچّے رہتے تھے۔ وہ بھی ان میں ہی شامل ہو گیا۔ شام کو جب وہ لوگ بھیک کے ٹکڑے اکٹھے کر کے کھانے بیٹھے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

ایک نے پوچھا 'کیوں بے، کیا نام ہے تیرا؟'

بچّہ بولا 'حرام زادہ۔'

'تو پھر دور بیٹھ۔ حرام کی اولاد۔'

'اب بچّے کو معلوم ہوا کہ یہ بے گھر بچّے بھی اس کو نیچ اور گھناؤنی چیز سمجھتے ہیں۔'

اس کا اکیلے رہنا بہت برا معلوم ہوا کیوں کہ وہ تو ہمیشہ آشرم کی گہما گہمی میں پلا تھا۔

سو رات کو ایک مندر میں جا کر اس نے بھگوان سے دعا کی۔ 'یہ اکیلا پن مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ اے پرمیشور، بچپن مانگنا میری بھول تھی۔ اب میرا بچپن مجھ سے لے لو اور مجھے پچیس سال کا نوجوان بنا دو۔ تاکہ میں اپنی دیکھ بھال کر سکوں!'

بھگوان پھر مسکرا دیا اور کہا 'جا کر پا رام، تو اب پھر پچیس برس کا ہو گیا۔'

کرپارام اب پچیس سال کا جوان تھا۔ خوب صورت، امیر، بے پرواہ۔

وہ ایک لال رنگ کی ریسنگ موٹر میں سوار تھا۔ اس کے پہلو میں ایک خوب صورت لڑکی تھی جو اس سے عمر میں بڑی تھی۔ مگر تھی بڑی طرح دار۔۔۔ اس کے اندر شراب کا نشہ تھا۔ لڑکی شراب بھی پیے ہوئے تھی اور اول فول بکے جا رہی تھی۔

'ڈارلنگ، یہ لوگ کون ہیں؟'

'یہ لوگ کون؟'

'یہ جو فٹ پاتھ پر پڑے ہیں؟'

'یہ لوگ سو رہے ہیں۔'

'اپنے گھر میں کیوں نہیں سوتے؟'

'اس لیے کہ ان کے گھر میرے دوستوں نے بلڈوزر سے توڑ ڈالے۔ اس لیے یہ اب بے گھر ہیں اور فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔'

'مگر میں کہتی ہوں یہ سو نہیں رہے ہیں۔ یہ مُردہ ہیں، مُردہ۔'

'نہیں۔ یہ سو رہے ہیں؟'

'شرط ہو جائے۔'

'تو پھر دوڑاؤ اپنی موٹر ان کے اوپر سے!'

'یہ لو۔' یہ کہہ کر نوجوان کرپارام نے موٹر فٹ پاتھ پر چڑھا دی اور تیزی سے سوتے لوگوں کو کچلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کی موٹر کے پہیے لوگوں کے خون سے لت پت تھے۔

'میں نے کہا نہیں تھا کہ یہ مُردا ہیں! دیکھو ایک نے بھی چیخ نہیں ماری۔'

'ہاں۔ اب تو مُردہ ہی ہیں۔'

'اور میں کیا کہتی تھی؟'

اب سوٹر فٹ پاتھ سے سڑک پر اتر آئی تھی اور تیزی سے شہر کے باہر چلی جا رہی تھی۔

'کہاں جا رہے ہو؟'

'اپنی فیکٹری۔'

'تمھاری فیکٹری بھی ہے؟'

'ہاں۔'

'کیا بناتے ہو؟'

'موٹریں۔'

'کیسی موٹریں؟'

'کھلونے۔'

اب وہ فیکٹری کے پھاٹک پر پہنچ گئے تھے۔ دروازے پر دو سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ دونوں نے اسے سیلوٹ کیا اور ایک نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

فیکٹری کے اندر کتنی ہی چھوٹی چھوٹی موٹریں کھڑی تھیں۔ کم سے کم کئی درجن۔

'ان میں سے جو بھی پسند ہو وہ تم لے لو۔'

'میں تو وہ لال رنگ کی موٹر لوں گی۔'

کرپارام نے لال رنگ کی موٹر زمین سے اٹھائی اور لڑکی کو دے دی۔ جس نے اسے اپنے بٹوے میں رکھ لیا۔

'موٹریں ہی نہیں، ہم ہر طرح کے کھلونے بھی بناتے ہیں۔ کرین، بلڈوزر، ٹرکس، روڈ رولر۔ سب کھلونے۔'

لڑکی نے دیکھا یہ سب کھلونے بھی وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ ان سب کو اپنے بٹوے میں رکھ لے۔ مگر اس کے بٹوے میں اتنی جگہ کہاں تھی؟

پھر ان سے پوچھا، 'اس سپاہی نے تم سے کانا پھوسی میں کیا کہا تھا؟'

'کہا تھا کہ کام ہو گیا ہے!'

'کیا کام تھا؟'

'ایک فلم کو دھلوانا تھا۔ اس کی سلور نائٹریٹ سے چاندی نکالنا تھا۔'

'کیسی فلم تھی؟'

'بلیو فلم کہتے ہیں ایسی فلموں کو۔'

'ان کا تم کیا کرتے ہو؟'

'پہلے تو ہم نوجوان لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ یہ تعلیمی فلمیں ہوتی ہیں۔ ان سے ہی ہم نے یہ سب سیکھا ہے۔'

'کہاں سے یہ فلمیں آتی ہیں؟'

'میرے دوست جو کاناگر ریاست کے فلم منسٹر ہیں وہ منگواتے ہیں۔ بعد میں یہ فلمیں ضبط کر کے ہماری فیکٹری میں لائی جاتی ہیں۔ لیکن انھیں ایک اسپیشل تیزابی پانی میں ڈال کر ان کا سلور نائٹریٹ الگ کیا جاتا ہے۔ اس کی ہم چاندی بنانا جانتے ہیں۔'

'تم بہت ہوشیار ہو، ڈارلنگ پرنس۔'

'ڈارلنگ پرنس' ان کا کوڈ ورڈ تھا۔ جب لڑکی بہت گرم ہو جاتی تھی تو وہ 'ڈارلنگ پرنس' کہتی تھی۔

'ڈارلنگ، تم پھر گرم ہو رہی ہو۔ میں تو تمھیں ٹھنڈا کرنے کے لیے رات کو ڈرائیو کے لیے لایا تھا۔'

'میرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں!'

'کیوں؟'

'میرے پتا جی نے ایک بندوق خریدی ہے۔'

'بندوق خریدی ہے تو کیا ہوا؟ کس کا شکار کریں گے؟'

'تمھارا۔'

'میرا؟'

'اگر تم نے مجھ سے شادی نہیں کی!'

'کیا مذاق کر رہی ہو! اگر ہر عورت جس کو مجھ سے حمل ٹھہرا ہے۔ اس سے میں نے شادی کی ہوتی تو میرا تو ایک باقاعدہ حرم ہو جاتا!'

'دوستوں کے بیچ ایک آدھ شادی سے کیا ہوتا ہے؟'

'ہماری ریاست کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک شادی ہو چکی ہے۔ اگرچہ اب وہ میرے گھر میں نہیں رہتی۔'

'قانون معمولی لوگوں کے لیے ہوتے ہیں! ہمارے تمھارے جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہوتے۔'

'تم شراب کے نشے میں کہتی جا رہی ہو۔ یاد رکھو کہ میری ماں اب کانتا نگر کی مہارانی نہیں ہے۔ اب میں ایک معمولی آدمی ہی ہوں۔'

'تم کبھی معمولی آدمی نہیں ہو سکتے، میرے پرنس ڈارلنگ۔'

'اب میں تمھیں گھر ہی پہنچا دیتا ہوں۔ صبح کے تین بج گئے ہیں۔ میری ماں دیکھے گی تو چلائے گی۔'

'کیا تمھاری ماں تین بجے تک جاگتی ہے؟'

کیا کرے گی بے چاری؟ جب تک برہم چاری جی تھے تو وہ اسے یوگا کی ورزش کر کے بارہ بجے تک سلا دیتے تھے۔ لیکن جب سے وہ جیل گئے ہیں ماں کو نیند نہیں آتی اور وہ جاگتی رہتی ہیں۔'

کانتا نگر پیلیس میں مہارانی کی خواب گاہ میں روشنی ہو رہی تھی۔

جیسے ہی مہاراج کمار کرپارام نے اپنی LATCH KEY لگا کر دروازہ کھولا تو سامنے مہارانی کھڑی نظر آئیں۔

'کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟' اس نے سختی سے سوال کیا۔

مہاراج کمار نے جواب دیا، 'دوستوں کی ایک پارٹی تھی اس لیے آنے میں دیر ہو گئی۔'

'تو پھر ان شرابی غنڈوں کو اپنا دوست کہتا ہے؟'

'جن کو میں دوست کہتا ہوں وہ تمھارے دوستوں سے کہیں بہتر ہیں۔ کہو تو کچھ نام لے دوں؟'

جواب میں اس کی ماں کا ایک طمانچہ پڑا جس سے اس کا چہرہ جھنجھنا اٹھا۔

پھر کرپارام نے تو وہ کیا جو کوئی بیٹا اپنی ماں کے ساتھ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ نشے میں بالکل ہی دھت نہ ہو۔

اس نے اپنی ماں کو چانٹے مارے۔

ایک،

دو،

تین۔

مہارانی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔

اور مہاراج کمار سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا۔

مہارانی بہت دیر تک روتی رہی۔ کس نے اس سے پہلے اس کو تین چانٹے مارے تھے؟

ایک،

دو،

تین۔

وہ تھا اس کا مرحوم شوہر مہاراجہ۔ وہ بھی اس رات نشے میں دھت ایک اور عورت کے ساتھ بستر سے اٹھ کر آیا تھا اور مہارانی کے سوال کے جواب میں کہ 'کہاں سے آئے ہو؟' اس نے تین چانٹے رسید کر دیے تھے۔

مگر ان تین چانٹوں میں درد تو تھا ہی مگر ایک قسم کی راحت بھی مہارانی کو ملی تھی۔ کمال کی بات یہ تھی کہ اسی قسم کا ملا جلا احساس اپنے بیٹے سے چانٹے کھا کر اس کو آج بھی ہوا تھا۔ درد بھی اور لذت بھی۔

روتے روتے مہارانی سو گئی۔

مگر اس کا بیٹا اب بھی جاگ رہا تھا اور پلنگ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔

اصل میں اس وقت کرپارام کے وجود کو دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ پرانا کرپارام اور نیا کرپارام۔ پرانا کرپارام کبھی اپنی ماں کو چانٹے نہ مار سکتا تھا۔ نیا کرپارام ایک الگ خمیر سے بنا ہوا تھا۔ دونوں میں ایک اندرونی جنگ ہو رہی تھی۔ آخر میں پرانے کرپارام نے بھگوان سے دعا کی کہ 'پرمیشور! میں نے جھک ماری کہ جوان بن بیٹھا۔ آج کل کے جوان میری سمجھ کے باہر ہیں! مجھے تو ساٹھ برس کا بڈھا ہی بنا دے تو تیری بڑی کرپا ہو گی۔' یہ کہہ کر اسے تھوڑا سکون حاصل ہوا اور پھر وہ سو گیا۔

جب اٹھا تو کانشا نگر پیلیس کے ڈنلپ پلو پر نہیں سو رہا تھا بلکہ ایک بانوں کی بنی ہوئی کھر ہری چار پائی پر سو رہا تھا۔

کرپارام کو ٹھوڑی پر کھجلی محسوس ہوئی اور اس نے کھجایا تو معلوم ہوا کہ داڑھی بھی اگ آئی ہے اور اس کا ایک بال اکھاڑ کر دیکھا تو سفید تھا۔ وہ سچ مچ ساٹھ برس کا بڈھا تھا اور گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔

گلا اس کا رات کے نشے سے سوکھا ہوا تھا۔ سو اٹھ کر اپنے اس نئے گھر میں ادھر ادھر دیکھا تو کہیں پانی کا ایک بوند نظر نہیں آیا۔ ایک گنوار نے اسے بتایا کہ پانی اسے کنویں پر ضرور ملے گا۔

سو اس نے ایک خالی گھڑا اٹھایا اور اسے بھرنے کے لیے کنویں کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔

صبح کے دھندلکے میں کنواں خالی خالی اور سنسان تھا۔ چرخی پر رسّی کسی کے کھینچنے کا انتظار کر رہی تھی۔ شاید اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ سو اس نے کافی طاقت لگا کر بالٹی بھر کر نکالی اور اپنے گھڑے میں ڈالنے والا ہی تھا کہ ایک رعب دار آواز آئی۔

'کون ہے؟ اور یہاں کیا کر رہا ہے؟'

حضور پیاس لگی تھی۔ پانی نکال رہا تھا!' کرپارام نے گنوار چاپلوسی سے جواب دیا۔

اس کی گڑبڑاہٹ سے ہی نو وارد کو پتہ چل گیا کہ یہ کوئی اچھوت ہے۔ سو اس نے ایک ڈانٹ پلائی۔

'تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ برہموں کے کنویں کو ناپاک کرنے چلا آیا! رام رام! بالٹی بھی کنویں میں ڈال دی۔ اور اس چبوترے پر بھی چڑھ آیا۔ پورا کنواں اب پاک کرنا پڑے گا۔ اس کا خرچ تم اچھوتوں کی پنچایت کو دینا پڑے گا۔ سمجھا؟ کیا نام ہے تیرا؟'

'کرپارام!'

'نام تو دیکھو ایک ہریجن کا؟ اچھا کرپارام، اگر رام کی کرپا چاہتا ہے تو کہہ دے اپنی ذات برادری والوں سے کہ کنویں کو پاک کرانے کا خرچہ دینے کو تیار ہو جائیں۔ نہیں تو پھر تم جانتے ہو کہ کیا ہوگا؟'

کرپارام اپنا سوکھا گھڑا لے کر ویسا کا ویسا ہی پیاسا لوٹ آیا۔

مگر گھر پہنچا تو وہاں بہت سے نوجوان اچھوت کھڑے دیکھے۔

کرپارام ان کو اور ان کے تیوروں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

''دادا! تمھارا اس سے بڑا اپمان کیا ہوگا؟'

'غلطی میری ہی تھی۔ نہ جانے میری عقل کو کیا ہو گیا تھا۔ بے خیالی میں ان کے کنویں پر جا پہنچا اور اس میں ڈول ڈال کر لگا پانی بھرنے! سارا کنواں ناپاک ہو گیا ہے۔'

'دادا، تو تو اپنے بیٹے کی موت کے بعد بالکل ہی سٹھیا گیا ہے۔ دادا، کچھ ناپاک نہیں ہوا!'

'مگر وہ لوگ تو ہرجانہ مانگ رہے ہیں ہماری پنچایت سے!'

کون سی پنچایت سے؟ گاؤں میں تو ایک ہی پنچایت ہے۔'

'نہیں بھئی۔ برہمنوں ٹھاکروں کی الگ پنچایت ہے۔ ہم اچھوتوں کی الگ پنچایت ہے۔ براہمن اور اچھوت کا فرق تو بھگوان کا بنایا ہوا ہے!'

'مگر بھوان نے پانی تو سب کے لیے ہی بنایا ہے؟'

نہ جانے یہ نوجوان کون سی بھاشا بولتے تھے! ناستکوں کی بھاشا۔

ایک لڑکا جو ابھی بمبئی سے ہو کر آیا تھا وہ بولا، 'دادا، شہر میں سب ایک ہی نل کا پانی پیتے ہیں۔ براہمن بھی اچھوت بھی۔ ایک ہی ہوٹل میں چائے پانی پیتے ہیں!'

'رام رام!' کرپارام گھبرا کر بولا، 'یہ کیا اندھیر ہے!'

'اب سن لو۔' ایک لڑکے نے جو ان سب کا سردار لگتا تھا اپنا فیصلہ سنا دیا۔ 'کوئی ہرجانہ ورجانہ نہیں دیا جائے گا۔'

'اس کنویں پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا براہمنوں کا یا ٹھاکروں کا!'

کرپارام کو ایسا لگا کہ آ کاش کہیں پھٹ نہ پڑے۔ اس نے دل ہی دل میں 'رام رام' جپنا شروع کیا کہ ادھرم کی گرم ہوا کہیں ان کے گاؤں کو نہ جھلس ڈالے۔

رات کو کرپارام اپنے آنگن میں اکیلا ہی سو رہا تھا۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا اور بہو دونوں ہیضے میں مر چکے ہیں۔ اس کی بیوی تو کب کی مر چکی تھی۔ اب تو گھر میں وہی اکیلا تھا۔

سو پڑوسی اس کی روٹی پکا دیتے تھے اور وہ کھا لیتا تھا۔ پھر اپنی چارپائی پر پڑا رہتا۔

مگر رات کو گرمی بھی تھی اور مچھر بھی بہت کاٹ رہے تھے۔ کرپارام کی جھریاں پڑی

کھالیں مچھروں کی کاٹ کی عادی نہیں ہوئی تھیں۔ سو اس نے آدھی رات کو اپنی چارپائی آنگن سے نکال کر چوپال میں جا کر بچھائی جو اچھوتوں کی بستی سے ذرا دوری پر تھی۔ ساری بستی میں اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔

معلوم نہیں دو بجے تھے کہ تین کہ ہائے واویلا کی آوازوں نے کرپارام کو نیند سے اٹھادیا۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو چمارواڑے کی ساری جھونپڑیاں جہنم بنی ہوئی تھیں۔ شعلے آسمان سے بات کر رہے تھے۔ اچھوت مرد گالیاں دے رہے تھے۔ عورتیں اور بچے رو رہے تھے، سسک رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ آگ اس کی حرکت کی وجہ سے ہی لگی ہے۔ اس وقت اسے نہ جانے کیا ہو گیا کہ اس کا جی چاہا وہ بھی اسی آگ میں کود پڑے۔

بھاگا بھاگا وہاں پہنچا تو کسی انجانے آدمی نے اندھیرے میں برہمنوں یا ٹھاکروں کے دھوکے میں آکر اسے پکڑ لیا اور کہا، کہاں جارہے ہو، چودھری جی؟ وہاں آگ لگی ہے!'

کرپارام جلنے سے بچ گیا۔

وہ فقط ایک اچھوت تھا جو اگلے دن چمارواڑے کی راکھ میں اپنی ذات برادری والوں کی جلی ہوئی ہڈیاں کرید رہا تھا۔

اس حادثہ سے وہ پاگل سا ہو گیا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔

دن بھر یوں ہی بیٹھا رہتا۔

رات کو کوئی کچھ جھوٹا اسے ڈال دیتا تو وہ کھالیتا۔ ورنہ بھوکا ہی سو رہتا۔

ایک ٹھاکر زمین دار نے رحم کھا کر اس سے کہا کہ یوں کب تک رہے گا؟ کچھ کام کیا کر۔ ہل چلانے، فصل کاٹنے کی تو اب اس کی عمر نہیں رہی تھی۔ ڈھور ڈھنگروں کی رکھوالی اس کے سپرد کر دی۔ شام کو واپس آکر جانوروں کو باڑے میں بند کرنے کے بعد ٹھاکر کی رسوئی سے جھوٹا اسے مل جاتا، اس سے اپنا پیٹ بھر لیتا۔

اسی طرح کرپارام کے زندگی کے دن کٹ رہے تھے کہ ایک دن خبر آئی کہ سابق مہارانی کانتا نگر ہاتھی پر سوار ہو کر ہریجنوں کے جلنے کے واقعہ کی چھان بین کرنے آرہی ہے۔ کرپارام

نے جب سنا تو پہلے تو اس نے سوچا۔ 'اب آئی ہیں! جب راج کر رہی تھیں، جب سینکڑوں ہریجن جلائے گئے، ہزاروں غریب گھر سے بے گھر ہوگئے تب ہماری خبر پوچھنے نہیں آئیں!'

مگر اب براہمن اور ٹھاکر اس پر دیا کی بارش کر رہے تھے۔ ایک دن میں اس کا جلا ہوا جھونپڑا پھر کھڑا کر دیا اور اس سے کہا کہ یہ آگ اچھوت غنڈوں کے دو گروہوں کی آپس کی لڑائی کا نتیجہ تھی۔ اگر اس نے اس کے خلاف کورٹ میں بیان دیا تو دو بندوق کی گولیاں اس کی پیٹھ کے پار ہوں گی۔

کرپا رام ڈر گیا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا 'جو حکم ہو مہاراج کا۔ جو کہیں گے وہی میں کہوں گا۔'

'سچ ہی یہ ہے کہ اچھوت غنڈوں کی ہی لڑائی تھی۔' برہمنوں کے سرپنچ نے کہا۔ ہمارا اس سے کیا تعلق؟'

مہارانی ہاتھی پر سوار آئیں۔

ہاتھی کرپارام کے جھونپڑے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

'کرپارام جی! نمسکار۔ کیا ہوا، سچ سچ بتایے۔'

کرپارام نے مڑ کر دیکھتے ہی بندوقوں کو اپنی طرف نشانہ لگاتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے وہی سبق دہرا دیا جو اسے برہمنوں اور ٹھاکروں نے پڑھایا تھا۔

اسے یقین تھا کہ اس کا جھوٹ چل نہ سکے گا۔ مگر مہارانی بھی تو دل میں یہی سوچے بیٹھی تھیں کہ اچھوت غنڈوں کی کارستانی تھی یہ سب۔ وہ اچھوتوں کا دکھ درد کیا جانیں!

انہوں نے کہا، 'ہم نے ایک بوڑھے ہریجن کرپارام جی کی زبانی سن لیا ہے کہ ہریجنوں پر کوئی ظلم نہیں ہوا۔ تو ہم چلتے ہیں۔ رام رام کرپارام جی!'

مہارانی ہاتھی پر بیٹھ کر واپس اپنے کانا نگر پیلیس کی طرف چلی گئیں۔

کرپارام وہیں زمین پر بیٹھا رہا۔

یہاں تک کہ صبح سے شام ہوگئی۔

شام کے لمبے سائے جب اس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھے تو پیچھے مڑ کر دیکھا۔

پاس کے گاؤں سے ہریجنوں کی ایک ٹولی آئی تھی۔ سب لٹھ بند۔

'کیوں، دادا۔ تم نے کیوں بولا؟ رانی کے سامنے!'

'اس لیے کہ میں مرنے سے ڈرتا ہوں۔ دو بندوقیں میری طرف نشانہ کیے ہوئے تھیں۔'

'مرنا تو اب بھی ہے تمھیں!'

یہ کہہ کر انھوں نے مل کر کرپارام پر تھوکا اور کوسا، 'تم جیسے اچھوت کا تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ ہم تمھاری مشکل آسان کر دیتے ہیں۔'

یہ کہہ کر وہ لوگ لاٹھیاں لے کر اس کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ کرپارام نے دعا کی۔

'بھگوان! مجھے بانوے سال کا ہی کر دو۔'

کروڑپتی پنڈت کرپارام کا آخری دم تھا۔

چھ ڈاکٹر اور پانچ پوتے ان کے بستر کے گرد کھڑے ہوئے ان کی لاش کا انتظار کر رہے تھے۔ پنڈت کرپارام کا دم دھیرے دھیرے اکھڑ رہا تھا۔

آنکھوں کے اشارے سے انہوں نے اپنے بڑے پوتے کو کچھ کہا۔ اس نے فوراً گنگا جل ان کے گلے میں ڈال دیا۔

آدھا جل گلے سے نیچے اترا۔

آدھا جل پنڈت کرپارام کے مُردہ ہونٹوں سے باہر اُبل پڑا۔

○

# چار دانوں کی کہانی

(1) امریکی دانے کی کہانی (2) چینی دانے کی کہانی
(3) روسی دانے کی کہانی (4) پاکستانی دانے کی کہانی

بمبئی کی بندرگاہ پر چار غیر ملکی جہاز کھڑے تھے۔ ان سب میں دوسرے دیشوں سے اناج بھر کر لایا گیا تھا۔ اب یہ جہاز خالی تھے ان میں سے گیہوں کی بوریاں اتار کر ریل کے ذریعے بہار اور ملک کے دوسرے حصوں کو بھیجی جا چکی تھیں۔ پھر جہازوں کی سیٹیاں گونجیں، دھوئیں کے پھریرے ہوا میں اڑے اور ایک ایک کرکے یہ چاروں جہاز جہاں سے آئے تھے واپس چلے گئے۔ جس گودی پر ان جہازوں میں اناج اتارا گیا تھا وہاں سے بندرگاہ کے خلاصیوں نے جھاڑو دے ڈالی اور رہے سہے دانے دھکے تنکے سمیٹ کر سمندر میں پھینک دیے۔

مگر گودی کے پتھریلے فرش میں ایک درار تھی۔ اس میں اناج کے دو چار دانے پڑے رہ گئے۔ تین گیہوں کے اور ایک چاول کا۔ جھاڑوؤں اور پیروں کی زد سے بچے ہوئے یہ چار دانے اس درار میں ایسے دبکے رہے جیسے جنگی مورچے پر دشمنوں سے بچنے کے لیے سپاہی خندقوں میں چھپے رہتے ہیں۔ سارا دن تو یہ دانے اس درار میں چپ سادھے رہے جیسے ان کے منھ میں زبان

ہی نہ ہو۔ جیسے وہ صرف اناج کے دانے ہوں اور بس، مگر آدھی رات کو جب دنیا کی ہر چیز چاندنی کی طلسمی چادر اوڑھ کر سو جاتی ہے اور صرف محبت جاگتی رہ جاتی ہے، جب چاند کے فراق میں سمندر کروٹیں لیتا ہے، ہوا ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے، جب انسانی زبانیں خاموش ہو جاتی ہیں اور کائنات بول اٹھتی ہے۔ جب لہریں سُر چھیڑتی ہیں، پتے تال دیتے ہیں، چشمے گنگناتے ہیں اور دھرتی ایک انوکھا ان سنا خاموش راگ الاپتی ہے.... اس طلسمی پَل میں چاروں دانے بول پڑے۔

پہلا دانہ جواروں سے بڑا اور مضبوط تھا اور ناک میں سے بولتا تھا۔ بڑی جلدی جلدی گٹھے ہوئے ترشے ہوئے چھوٹے چھوٹے جملوں میں جیسے اس کی زبان بڑی تیز رفتار موٹر میں سوار ہو اور اس کو جانے کی جلدی ہو۔ نہ جانے کہاں اور کیوں.... اس نے کہا 'بھائیو یہ گھڑی شاید پھر نہ آئے گی.... کیوں نہ اپنی اپنی رام کہانی سنا کر یہ رات کاٹی جائے۔ قسمت نے ہمیں آج اکٹھا کر دیا ہے' کل نہ جانے ہوا اڑا کر ہم میں سے ہر ایک کو کہاں سے کہاں لے جائے گی'۔

دوسرا دانہ جو پہلے کی طرح ہی بڑا مضبوط تھا مگر جس کا رنگ پہلے کی بہ نسبت گہرا سرخی مائل تھا اور جو ایسی دھڑاکے دار آواز میں بولتا تھا جیسے کوئی انقلابی نعرہ لگا رہا ہو.... یا زور زور سے کوئی کتاب پڑھ رہا ہو.... اس نے کہا 'یہ ٹھیک ہے رفیقو کل سویرے ہمیں بچھڑنا ہے۔ مگر میں اپنے ساتھی کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ قسمت یا اتفاق نے ہمیں اکٹھا کیا ہے.... گیہوں اور چاول کے دانے ہوں یا انسان۔ تاریخ کی ہوا انھیں دھول اور مٹی کی طرح یوں ہی کسی طرف اڑا کر نہیں لے جاتی۔ ہم اور ہمارے جیسے انسان اسی طرف جاتے ہیں جدھر سارے تاریخی، سماجی، اقتصادی حالات اور رجحانات ہمیں جانے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ اگر میرے ساتھی نے مارکس کے فلسفے کا غور سے مطالعہ کیا ہوتا تو وہ ایسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے.... بہر حال میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں کہ اپنی اپنی آپ بیتی سنا کر رات کاٹی جائے'۔

تیسرا دانہ جو تھا تو چھوٹا مگر جس کا بدن بڑا گٹھا ہوا اور جو بولتا تھا ایسے جیسے ہزاروں برس کی نیند سے ابھی جاگا ہو.... وہ بولا یہ تجویز بہت معقول ہے، ہمارے دیش کے ایک بڑے فلسفی نے ہزاروں برس ہوئے کہا تھا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں... میں کہتا ہوں اناج کے سب دانے بھی بھائی بھائی ہیں ورنہ دنیا کے چار کونوں سے چل کر ہم آج کیسے اس اجنبی دیش میں پہنچ کر اس

پتھر کی درار میں اکٹھے ہوتے۔

چوتھا دانہ جو سب سے چھوٹا تھا اور جس کے بھورے بدن پر ہلکا ہلکا سبز رنگ جھلک رہا تھا اور جس کے بولنے کے انداز میں جوانی کا جوش بھی تھا اور لڑکپن کی ضد بھی.... وہ بولا ’بھائیو کم سے کم میرے لیے یہ دیش اجنبی نہیں ہے۔ میرا باپ اسی زمین سے پیدا ہوا تھا۔ کن حالات میں اسے یہاں سے نکالا گیا اور کیوں آج میں واپس آیا ہوں یہ بھی ایک انوکھی داستان ہے جو وقت آنے پر میں آپ سب کو سناؤں گا مگر میں تجویز کرتا ہوں، کہ جس سلسلے میں ہم نے اس وقت زبان کھولی ہے اسی سلسلے سے ہم اپنی آپ بیتی سنانا شروع کریں....‘

اور اب باقی تینوں دانوں کی نگاہیں پہلے دانے پر جم گئیں۔ وہ دانہ جو اوروں سے ذرا بڑا اور مضبوط تھا اور ناک میں سے بولتا تھا۔ بڑی جلدی جلدی گٹھے ہوئے ترشے ہوئے جملوں میں جیسے اس کی زبان ایک تیز رفتار موٹر میں سوار ہو اور اسے جانے کی جلدی ہو۔ نہ جانے کہاں اور کیوں..... اس نے کہنا شروع کیا۔

## امریکی دانے کی کہانی

بھائیو! آپ سب نے میرے ملک امریکہ کا نام تو سنا ہوگا... ہم اپنے دیش کو GODS OWN COUNTRY یا ’بھگوان بھومی‘ کہتے ہیں اور ہے بھی ایسا۔ بھوان کی کرپا سے کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جو ہمیں میسر نہ ہو۔ ہمارے شہروں کی عمارتیں اتنی اونچی ہیں کہ ان کی چوٹیاں بادلوں میں دکھائی دیتی ہیں اور ہمارے ہاں اتنے لمبے چوڑے گیہوں کے کھیت ہیں کہ ان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ریل یا موٹر میں جانا پڑتا ہے ایسے ہی ایک کھیت میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ اس کھیت میں مشینوں سے ہل چلایا جاتا تھا۔ مشینوں سے کھاد ڈالی جاتی تھی، مشینوں سے بیج ڈالا جاتا تھا، مشینوں سے پانی دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر برسات میں دیر ہو جاتی تو ہوائی جہاز اڑ کر بادلوں پر ایک ایسی گیس کا حملہ کرتے کہ فوراً بارش شروع ہو جاتی۔ جب مجھے اور میرے بھائی بہنوں کو کیڑے ستاتے تو ایک ہوائی جہاز نیچے نیچے اڑ کر ہم پر ایسی زہریلی گیس چھڑکتا کہ کیڑے فوراً مر جاتے مگر ہمیں چھینک بھی نہ آتی اور پھر جب فصل پک

کر تیار ہو جاتی تو مشینوں ہی کے ذریعے چھان پھٹک کر ہمیں لوہے کے اونچے اونچے کھوکھلے میناروں میں بند کر دیا جاتا۔

ہاں تو بھائیو! اس مشینی ماحول میں میری پیدائش ضرور ہوئی۔ یقین مانئے میں آپ سے کوئی بہت مختلف نہیں ہوں۔ میرے چینی بھائی نے واضح کیا ہے کہ دنیا بھر کے انسان ہی نہیں دنیا بھر کے اناج کے دانے بھی بھائی بھائی ہیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ جب ہم پروان چڑھ کر جوان ہو گئے اور کئی میل لمبا کھیت ہماری بالیوں سے لہلہا اٹھا.... ایسا لگتا تھا جیسے وہ کھیت نہ ہو بلکہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہو جس کی لہروں کا سلسلہ ساری دنیا کے گرد پھیلا ہوا ہے اور اس وقت نہ جانے کیوں میرا جی چاہا کہ ان لہروں کے اوپر سے ہوتا ہوا میں ساری دنیا گھوم آؤں۔ میں نے سوچا میں ہندوستان ضرور جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا.... مگر میرے دل میں اس دیش میں آنے کی خواہش کیوں اور کیسے پیدا ہوئی یہ بتانے کے لیے مجھے اپنے دوست برٹ کا تعارف کرانا پڑے گا۔

برٹ کا پورا نام رابرٹ ہے۔ رابرٹ اسمتھ۔ مگر اس کے گھر والے اور دوست سب اسے برٹ ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ آپ لوگ اسے دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔ بڑا خوبصورت لمبا تڑنگا نوجوان ہے۔ سنہری بال ہیں جیسے گیہوں کی بالیں۔ سنہری چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ اس سے میری بڑی دوستی تھی۔ اس لیے کہ کھیت پر کام کرنے والوں میں وہی ایک تھا جو ہم سے محبت کرتا تھا۔ شام کو جب کام ختم ہو جاتا اور دوسرے کھیت کے مزدور قریب کے گاؤں میں بیئر پینے اور لڑکیوں سے معاشقے لڑانے چلے جاتے.... برٹ ہمارے پاس کھیت کی منڈیر پر آکر بیٹھ جاتا یا آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتا.... وہ سگریٹ پیتا رہتا۔ کبھی قریب سے گزرتا ہوا اس کا کوئی ساتھی پوچھتا بھی کہ رابرٹ تمھیں کیا ہو گیا جو یوں دھول میں پڑے ہوئے اپنے کپڑوں کا ستیاناس کر رہے ہو تو رابرٹ جواب دیتا۔ مجھے مٹی کی خوشبو اچھی لگتی ہے اور پھر وہ ہنس دیتا مگر اس کی نیلی آنکھوں میں ہنسی نہیں تھی وہ نہ جانے کس گہری سوچ، کس پرانی یاد میں کھوئی رہتی تھی.... اور سگریٹ کے دھوئیں کے بادلوں میں اس کے خیالات نہ جانے کہاں اور کتنی دور اڑتے ہوئے چلے جاتے تھے۔

برٹ کی ایک اور عادت تھی جس سے مجھے بڑا اچنبھا ہوتا تھا۔ جب وہ آسمان کو تکتے تکتے

تھک جاتے تو ہماری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا اور اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ایک عجیب چمک پیدا ہو جاتی جیسے اپنی معشوقہ کے دیدار سے کسی عاشق کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک دن وہ اسی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا کہ مجھ سے نہ رہا گیا.... اور میں نے ہنس کر کہا ''برٹ تم تو مجھے ایسے گھورتے ہو جیسے کوئی عاشق اپنی معشوقہ کو!''

ممکن ہے آپ کہیں کہ بھلا انسان اناج کے دانوں سے کیسے بات کر سکتا ہے۔ اور کرتا ہے تو کس زبان میں۔ انسان ہوں، جانور ہوں یا ہم بے جان اناج کے دانے، محبت کرنے والے ایک دوسرے سے اپنا مطلب بیان کر ہی دیتے ہیں۔

ہاں تو میں نے کہا 'برٹ تم میری طرف اس طرح کیوں گھورتے ہو؟'

اس نے ایک بڑا گہرا ٹھنڈا سانس لے کر کہا 'تمھیں دیکھ کر مجھے کسی کی یاد آتی ہے۔'

''کون تھی وہ؟'' میں نے پوچھا یہ تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ کوئی لڑکی ہی ہوگی۔

'سوشا'

''سوشا؟ مگر یہ تو عجیب نام ہے۔ لڑکیوں کے نام تو میں نے بہت سنے ہیں۔ میری، ماریا، اسٹیلا، سلویا، مارگریٹ، مگر سوشا..... یہ کیسا عجیب نام ہے؟''

''یہ ہندوستانی نام ہے دوست''

اس سے پہلے میں نے تو کبھی ہندوستان کا نام بھی نہ سنا تھا۔ سو میں نے برٹ سے پوچھا 'مگر مجھے دیکھ کر تمھیں اس ہندوستانی لڑکی کی کیوں یاد آتی ہے؟ کیا گیہوں کی بالیوں کی طرح اس کے بال سنہرے تھے؟''

'نہیں' برٹ آہستہ آہستہ بولا۔ جیسے الفاظ اس کی زبان سے نہیں بلکہ اس کی یاد کی گہرائی سے نکل رہے ہوں۔ اس کے بال کالے تھے..... چمکیلے سیاہ بال، گہری کالی آنکھیں، ہاں۔ اس کی رنگت ضرور گندمی تھی، تمھاری جیسی۔ مگر تمھیں دیکھ کر اس کی یاد اس لیے آتی ہے کہ وہ بھوکی ہے اور میں اسے گیہوں کے چند دانے بھیجنا چاہتا ہوں مگر نہیں بھیج سکتا.....''

اور پھر دھیرے دھیرے سگریٹ سے سگریٹ جلاتے ہوئے اس نے سوشا سے اپنی ملاقات اور محبت کی ساری کہانی سنا ڈالی... دوسری بڑی لڑائی میں جب جاپانی فوجیں ہندوستان

کی سرحد تک آ پہنچی تھیں، برٹ امریکن ہوائی بیڑے میں فلائٹ لفٹننٹ تھا۔ دوسرے امریکن ہوا بازوں کے ساتھ اسے بھی آسام کے ایک ہوائی اڈے پر بھیجا گیا۔ جہاں سے اڑ کر وہ جاپانی بمباروں اور 'فائٹر' ہوائی جہازوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ایک دن برٹ ایک جاپانی ہوائی جہاز کا پیچھا کرتے ہوئے دور تک نکل گیا۔ دشمن کے دو ہوائی جہازوں نے موقع پا کر اس پر گولیوں کی بوچھار کر دی۔ وہ ہوائی جہاز کو تو کسی طرح بچالایا مگر ریڈیو اور کمپاس پاش پاش ہو گئے اور گہرے بادلوں میں وہ راستہ کھو بیٹھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ برما اور آسام کی سرحد پر منڈلاتا رہا پھر پہاڑیوں کو چھوڑ کر میدانوں کا رخ کیا۔ مگر دور دور تک اسے نیچے اترنے کے لیے کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ برسات کا موسم تھا اور ہر جگہ پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ جب اس کے ہوائی جہاز کا پٹرول ختم ہو گیا تو اس نے ہوائی جہاز کو خیر باد کہا اور پیراشوٹ باندھ کر کود پڑا.... چھتری کھلنے کے جھٹکے سے وہ بے ہوش ہو گیا.... مگر گرتے رہنے کا احساس باقی رہا.... یہاں تک کہ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اسے دھیرے سے ماں کی نرم آغوش میں لادھرا ہو..... جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک دھان کے پانی بھرے کھیت کی کیچڑ میں لت پت پڑا تھا اس کی ٹانگ میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

اور دو چمکیلی سیاہ آنکھیں اپنی گھنی پلکوں میں سے اسے گھور رہی تھیں۔ وہ سوشا کی آنکھیں تھیں اور برٹ نے دیکھا کہ ان آنکھوں میں مسکراہٹ بھی ہے اور سنجیدگی بھی، تعجب بھی اور اطمینان بھی۔ سوال بھی ہے اور جواب بھی اور ایک حریفانہ انداز بھی۔

سوشا اپنے ساتھیوں کی مدد سے برٹ کو اٹھا کر اپنے گھر لے آئی۔ اس کا باپ ڈاکٹر تھا اس کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ برٹ کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اس کے علاج اور سوشا کی تیمارداری سے برٹ چند ہی روز میں اچھا ہو گیا مگر ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوا تھا۔ اس عرصے میں لیٹے لیٹے وہ دیکھتا رہتا کہ ہر رات کو اس گھر میں کچھ نوجوان آتے ہیں کچھ کانا پھوسی ہوتی ہے، کسی خفیہ مقام سے ہتھیار اور گولی بارود نکالے جاتے ہیں اور سویرا ہوتے ہی وہ نوجوان غائب ہو جاتے ہیں۔ پہلی رات کو جب اس نے یہ دیکھا تو سوچا شاید بخار کی حالت میں میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ صبح کو جب سوشا اس کے لیے چائے لے کر آئی تو برٹ نے رات کے عجیب واقعات کے بارے میں پوچھا۔ سوشا نے اپنی گھبراہٹ کو قابو میں کرتے ہوئے کہا' آپ اس

بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کریں، نہ کسی جواب کی امید کریں، مگر برٹ سمجھ گیا کہ سوشا کا گھر کسی انقلابی گروہ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ برٹ کو اس کے انگریز ساتھیوں نے بتایا تھا کہ ہندوستانی جو جنگ کے دوران میں 'QUIT INDIA' کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اصل میں جاپان کے فاشسٹ گرگے ہیں، غدار ہیں، جمہوری محاذ کے دشمن ہیں۔ اس لحاظ سے سوشا برٹ کی... ہر انگریز اور امریکن سپاہی کی ـــ دشمن تھی۔ مگر نہ جانے کیوں برٹ کو وہ دشمن نہیں دوست معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بولنے کے انداز میں اتنی نرمی تھی۔ اس کے ہاتھ اتنے ملائم تھے، اس کی آنکھوں میں اتنی معصومیت اور مامتا تھی کہ وہ کسی کی دشمن ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

سوشا انگریزی اچھی طرح بول سکتی تھی۔ جب بھی موقع ملتا برٹ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرتا مگر سوشا اپنے انقلابی ساتھیوں کے بارے میں کسی سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ نہ وہ برٹ سے کسی سیاسی مسئلہ پر بات کرنا چاہتی تھی۔ جب وہ ایسا ذکر چھیڑتا بھی تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی۔ 'آپ ہمارے مہمان اور بیمار ہیں اس لیے میں آپ سے بحث نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ ہمیں جاپانی فاشسٹوں کے ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ میں کوئی صفائی دینا نہیں چاہتی۔ آپ جو چاہے سمجھئے۔ صرف یہ یاد رکھیے کہ آپ انگریزوں کی مدد کرنے آئے ہیں اس لیے ہمارے آدمی بھی آپ کو دشمن سمجھتے ہیں۔'

برٹ کہتا: 'سوشا میں ہندوستان کی آزادی کا مخالف نہیں ہوں۔ میرے پڑ دادا نے ان ہی انگریزوں کے خلاف لڑ کر ہماری جنگ آزادی میں جان دی تھی۔ مگر آج جب جمہوریت اور فاشزم کی بھیانک ٹکر ہو رہی ہے...."

'اس لیے ہندوستانیوں کو انگریز فاشسٹوں کی غلامی قبول کر لینی چاہیے۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا؟' سوشا چمک کر جواب دیتی اور برٹ لاجواب ہو جاتا پھر وہ کہتا۔ 'سوشا خفا مت ہو، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم لوگوں کا دشمن نہیں ہوں دوست ہوں۔'

"تو پھر یہ بحث چھوڑ دو۔ کوئی اور بات کرو۔"

"کیا بات کروں؟"

"کوئی بھی"

''تمھیں ناچنا آتا ہے؟''

''ہاں''

''تو جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا تو پھر میرے ساتھ ناچو گی؟''

''اوں ہوں۔ ہمارے ہاں اس طرح مرد عورت مل کر نہیں ناچتے۔ میں تو منی پور طرز کا ناچ ناچتی ہوں'' اور پھر سوشا نے اسے اپنی ناچنے کی پوشاک لا کر دکھائی۔ کتنا خوبصورت کام بنا ہوا تھا اس پر!

''یہ تو بڑی شاندار پوشاک ہے''۔ برٹ نے کہا ''بالکل شہزادیوں جیسی۔ اسے پہن کر تم بالکل شہزادی لگتی ہوگی۔ اور پھر نہ جانے کس جذبے سے مجبور ہو کر اس نے بک دیا تھا۔ ''سوشا میرے ساتھ امریکہ چلوگی؟''

''کیا مطلب؟'' اور غصے سے سوشا کی آنکھوں میں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ ''آپ میری توہین کر رہے ہیں مسٹر رابرٹ۔ آپ ہم ہندوستانی لڑکیوں کو کیا سمجھتے ہیں؟''

برٹ نے معافی مانگ لی تھی۔ اور جب سوشا نے کوئی جواب نہ دیا منہ، پھیرے کھڑکی کے باہر دیکھتی رہی تو اس نے کہا تھا، اب میں بیساکھیوں کے سہارے تھوڑا بہت چل لیتا ہوں۔ کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ پھر تمھیں میری بدتمیزی کی باتیں نہ سننا پڑیں گی''۔

سوشا کا جواب سن کر برٹ حیران رہ گیا۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے ہی کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہاں سے جانے نہیں دیا جا سکتا۔ آپ کو ہمارے انقلابی گروہ کا بھید معلوم ہو گیا ہے۔ اب ہم آپ کو یہاں قید رکھنے پر مجبور ہیں''۔

''اور اگر میں پھر بھی بھاگ جانے کی کوشش کروں تو؟''

اس کے جواب میں سوشا نے منہ پھیر کر برٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''میں نے ذمہ لیا ہے آپ یہاں سے نہ بھاگ پائیں گے۔ اگر پھر بھی آپ نے کوشش کی تو مجھے اپنا فرض نبھانا پڑے گا۔ یہ کہہ کر اس نے پھرتی سے برٹ کا ریوالر نکال لیا جو کھونٹی پر لٹکی ہوئی پیٹی میں لگا ہوا تھا اور برٹ حیرانی سے اس نازک بدن ملائم لہجے والی لڑکی کو دیکھتا رہ گیا اور سوچتا رہا کہ کیا سچ مچ وقت پڑنے پر وہ اس پر گولی چلانے کی جرأت کر سکے گی۔ مگر جب سوشا کی آنکھوں میں دیکھا

تو وہاں ایک خطرناک جھلک نظر آئی۔ اس نے کہا ''تم بے فکر رہو سوشا، میں بھاگنے کی کوشش کر کے تمھیں اس خوفناک آزمائش میں نہ ڈالوں گا'' اور اس دن سے برٹ سوشا کا قیدی ہو گیا۔

محبت کب ہوتی ہے؟ کیسے ہوتی ہے؟ کیوں ہوتی ہے؟ میں تو گیہوں کا ایک حقیر دانہ ہوں۔ بڑے بڑے قابل انسان بھی ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکے۔ مگر خدا کا حکم کہیے، قسمت کا کھیل کہیے یا بقول میرے دوست کے قدرتی انسانی خواہشات کو ذمہ دار ٹھہرائیے۔ واقعہ یہ ہے کہ محبت کو جب ہونا ہوتا ہے، وہ ہوتی ہے اور پھر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتی کہ اس کے راستہ میں پہاڑ ہیں یا سمندر یا نسلی تعصب یا قومی اختلافات یا زبان اور رنگ اور مذہب کا فرق۔ سو برٹ اور سوشا ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ برٹ نے مجھے بتایا کہ وہ اس عجیب ہندوستانی لڑکی کو پہلے ہی دن سے دل دے بیٹھا تھا۔ اس کی آواز میں اسے دنیا کی سب سے میٹھے سنگیت کا مزا آتا تھا۔ وہ خاموش بھی قریب بیٹھی رہتی تو برٹ کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی مگر اس بے چینی میں بھی ایک عجیب سکون ایک عجیب آنند ملتا۔

میں نے برٹ سے کہا ''تم سپاہی لوگ تو ویسے ہی دل پھینک ہوتے ہو۔ کہتے ہیں ہر شہر اور ہر بندرگاہ میں تمھاری ایک معشوقہ ہوتی ہے۔ اس بے چاری سے بھی محبت کرنے لگے ہو گے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن سوشا؟ — کیا اس نے بھی اپنی محبت کا اقرار کیا تھا؟''

برٹ نے کہا ''نہیں یہ ہندوستانی لڑکیاں اس معاملے میں ہمارے ہاں کی لڑکیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ محبت کا اقرار زبان سے نہیں کرتیں اور نہ سوشا نے مجھ سے کبھی یہ کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں میں، اس کے بولنے کے لہجے میں اس کے ہر انداز میں مجھے اس کی محبت کا پتہ چلتا تھا۔ مگر اس کا قطعی ثبوت صرف اس دن ملا جب اس نے مجھ سے چلے جانے کو کہا''۔

''یہ تو الٹی بات ہوئی۔ اس نے تمھیں چلے جانے کو کہا اور تم سمجھے اسے تم سے محبت ہے۔ بھلا چاہنے والی بھی کبھی اپنے محبوب سے دور ہونا چاہتی ہے؟''

''تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ مگر جن حالات میں اس نے مجھے چلے جانے کو کہا وہ بالکل انوکھے اور عجیب تھے۔ وہاں رہتے ہوئے کئی ہفتے ہو چکے تھے۔ میری ٹانگ کی چوٹ تقریباً اچھی ہو گئی

تھی۔ اب میں چل پھر سکتا تھا۔ پہلے میں لیٹا لیٹا سوچا کرتا تھا کہ جب میری ٹانگ اچھی ہو جائے گی میں ایک رات چپکے سے بھاگ جاؤں گا۔ دس پندرہ بیس میل پیدل چل کر ضرور کسی شہر یا فوجی چھاؤنی تک پہونچ جاؤں گا مگر اس کے گھر میں قیدی کی طرح رہتے ہوئے بھی دھیرے دھیرے مجھے ان ہندوستانی انقلابیوں کے خلوص و ایثار کا یقین ہونے لگا۔ وہ تو سب کے سب نوجوان تھے اور اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہر وقت خطرے کا سامنا کر رہے تھے کسی ذاتی فائدے کے لیے نہیں۔ صرف اپنے وطن کی آزادی کی خاطر۔ یہ سچ ہے کہ ان کے اور ہمارے راستے الگ الگ تھے مگر وہ بھی اسی آزادی اور جمہوریت کے لیے لڑ رہے تھے جس کے لیے ہم اتحادی فوجوں کے سپاہی۔ اور اگر ان کی تحریک سے جاپانی اور جرمن اور اٹالین فاشسٹوں کو تقویت پہنچ رہی تھی تو یہ بھی سچ تھا کہ میرے جیسے امریکن سپاہیوں کی قربانیوں سے چرچل جیسے عوام دشمن سامراجیوں کے غیر جمہوری نظام کو تقویت پہونچ رہی تھی۔ چند ہفتے بعد تو میں نے دل میں طے کر لیا کہ اگر مجھے موقع ملا بھی تو میں وہاں سے نہ بھاگوں گا۔ اس گھر میں نہ موٹر تھی نہ ریڈیو نہ ریفریجریٹر۔ غرض امریکی سامان آسائش میں سے کچھ بھی نہیں تھا۔ کھانا پرانی دھات کی تھالیوں میں ملتا تھا اور سب مٹی سے لپی ہوئی زمین پر سوتے تھے مگر نہ جانے کیوں مجھے وہاں رہ کر بڑا آنند ملنے لگا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سوشما کی وجہ سے ہو۔ دن بہ دن اس سے میرا دلی لگاؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ بھی اب مجھ سے نفرت نہ کرتی تھی۔ اس نے مجھ پر شبہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا اکثر میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہی رہتا اور کبھی کبھی جب وہ لوگ کسی کام کے لیے باہر چلے جاتے۔ میں سارے گھر میں اکیلا رہتا یا صرف سوشما کا باپ ڈاکٹر باسو وہاں ہوتا جس کو بڑھاپے کے کارن بہت ہی کم بھائی دیتا تھا اور جو اتنا کمزور تھا کہ اگر میں بھاگنا چاہتا تو وہ مجھے ہرگز نہ روک سکتا۔ گھنٹوں وہ میرے کمرے میں بیٹھا ہندوستانی فلسفے اور بین الاقوامی سیاست اور ڈاکٹری کے مسائل پر بات چیت کرتا رہتا۔

ایک دن جب سوشما دن بھر دوسرے گاؤں کا دورہ کر کے لوٹی تو میں نے اس سے مذاق میں پوچھا ''کیوں سوشما اگر آج میں یہاں سے ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر بھاگ جاتا اور جو بھی پہلی فوج یا پولیس کی چوکی ملتی وہاں پر تمہارے اس انقلابی اڈے کا پتہ دے دیتا تب کیا ہوتا؟'' سوشما نے بالکل اطمینان سے جواب دیا ''کچھ نہیں مجھے غداری کے شبہ میں گولی مار دی جاتی'' مگر پھر وہ

مسکرادی۔ اف کتنی خوبصورت تھی اس کی مسکراہٹ اور بولی ''تم تو جب ہی جاؤ گے جب ہم تمھیں زبردستی نکالیں گے''۔

میں، سوشا اور ڈاکٹر باسو اکٹھا کھانا کھایا کرتے تھے۔ بڑا سیدھا سادا کھانا ہوتا تھا پانی میں ابلا ہوا بھات۔ کبھی کبھی مچھلی اور دال سے شروع شروع میں تو یہ کھانا مجھے کافی بدمزا لگا۔ آہستہ آہستہ عادت پڑ گئی بلکہ مزا آنے لگا۔ دن بھر سوشا اتنی مصروف رہتی تھی کہ یہی ایک وقت ایسا تھا جب اس سے میری ملاقات یقینی ہوتی تھی۔ اس لیے میں بڑی بے چینی سے کھانے کے وقت کا انتظار کیا کرتا تھا۔ مگر پھر ایک دن وہ کھانے پر نہ آئی۔ کہہ دیا آج مجھے بھوک نہیں ہے۔ اور میں نے، ڈاکٹر باسو نے خاموش بیٹھ کر کھانا کھالیا۔ اگلے دن بھی وہ کھانے پر نہیں آئی۔ بولی آج میں کھانا نہ کھاؤں گی میں نے برت رکھا ہے.... اس کے دو تین دن بعد ڈاکٹر باسو نے بھی میرے ساتھ کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ صرف میرا کھانا تھالی میں رکھ کر مجھے پہنچا دیا جاتا۔ میں سوچتا شاید دوسرے گاؤں والوں کے کہنے سننے سے یہ لوگ پھر میرے ساتھ چھوت چھات برتنے لگے ہیں.... سوشا کے بغیر مجھے کھانے میں بالکل مزا نہ آتا جیسے بھی ہوتا دو چار نوالے حلق میں ٹھونس لیتا۔ مگر ایک دن تھالی جب سوشا لے کر آئی تو دیکھا کہ بہت ہی تھوڑا بھات رکھا ہوا ہے۔ ساتھ میں نہ دال ہے نہ اچار۔ بس ذرا سا نمک ہے۔ سوشا بولی ''معاف کرنا برٹ، آج میں نے زیادہ کھالیا ہے۔ اس لیے تمھارے لیے بہت کم بچا ہے''۔ میں نے ہنس کر کہا ''تم کھاؤ یا میں۔ بات ایک ہی ہے۔ میرا تو دیسے بھی آج کل کھانا کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ جب سے تم نے میرے ساتھ کھانا کھانا چھوڑ دیا ہے۔ مگر کیوں؟ کیا میں بدیشی ہوں دوسرے مذہب کا ہوں اس لیے چھوت چھات کرنے لگی ہو؟''

سوشا نے نظریں جھکا کر جواب دیا ''نہیں یہ بات نہیں ہے برٹ''۔

''پھر کیا بات ہے؟'' میں نے کسی قدر سختی سے سوال کیا۔

''یہ میں نہیں بتا سکتی۔'' اس نے کہا اور باہر چلی گئی۔

اس دن میں نے وہ بھات بھی نہیں کھایا۔ تھالی واپس کرنے رسوئی میں گیا تو دیکھا چولھے پر ایک مٹی کی ہانڈی چڑھی ہوئی ہے اور اس میں سے اتنے زور کی بھاپ نکل رہی ہے کہ مٹی کے

ڈھکن کے نیچے گرنے کا ڈر ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا سوشا وہاں نہیں تھی۔ میں نے سوچا لاؤ ہانڈی اتار کر نیچے رکھ دوں۔ نہیں تو جو کچھ پکا ہے وہ جل جائے گا۔ جب ہانڈی اتارنے لگا تو ایک پل کے لیے صرف ایک پل کے لیے میرے من میں اپنے میز بانوں کے بارے میں ایک شبہ گزرا۔ میں نے سوچا، لگتا ہے یہ لوگ خود تو اچھے اچھے کھانے پکا کر کھاتے ہیں اور مجھے ابلا ہوا بھات اور نمک کی چٹنی کھانے کو دیتے ہیں۔ لاؤ ہانڈی کھول کر تو دیکھوں یہ لوگ کیا پکا کر کھا رہے ہیں..... میں نے جلتا ہوا ڈھکن اٹھالیا مگر ہانڈی میں جو کھانا پک رہا تھا وہ دیکھ کر میرے ہاتھ سے ڈھکن گر کر ٹوٹ گیا۔ ہانڈی میں پتے اور گھاس ابالے جا رہے تھے۔ بس اتنی ہی دیر میں سوشا وہاں آگئی اور اس کے سامنے شرم کے مارے میری نگاہیں جھک گئیں مگر وہ مسکرا کر بولی ''کیوں برٹ اور بھوک لگی ہے کیا؟''

''سوشا! یہ کیا تم لوگ خود بھوکے رہ کر مجھے کھانا دیتے رہے ہو؟''

اس نے میرے ہی الفاظ دہرائے ''تم کھاؤ یا میں بات ایک ہی ہے'' اب میری سمجھ میں آیا کہ اس کے گالوں پر پڑے ہوئے تین گڑھے جو مجھے اتنے خوبصورت دکھائی دیتے تھے کیوں دن بہ دن اور گہرے ہوتے جا رہے تھے، کیوں اس کی آنکھوں کے گرد حلقے اور کالے ہو رہے تھے۔ کیوں وہ اتنی پیلی اور دبلی ہوتی جا رہی تھی، کیوں ڈاکٹر باسو کمزوری کے مارے دو دن پلنگ سے نہ اٹھتے تھے، کیوں سوشا کے انقلابی ساتھی اتنے کمزور اور بیمار نظر آتے تھے اور کیوں سوشا کی گائے لکشمی جسے وہ اتنا پیار کرتی تھی تین دن ہوئے مرگئی تھی۔ سوشا اور ڈاکٹر باسو اور ان کے گاؤں پر ہی نہیں سارے بنگال پر اکال کا بھیانک سایہ پڑا ہوا تھا۔

اگلے دن سویرے جس وقت وہ مجھے ناشتے کے لیے بھات اور دودھ دیا کرتی تھی سوشا حسب معمول ایک تھالی لیے ہوئی آئی اور بولی برٹ ''اب تمھیں یہاں سے جانا ہی پڑے گا''۔

''کیوں؟'' میرے اس سوال کے جواب میں اس نے تھالی میرے سامنے رکھ دی۔ تھالی خالی تھی میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

''سوشا اگر تم بھوکی رکھ سکتی ہو تو میں بھی فاقہ کر سکتا ہوں''۔

''نہیں رابرٹ تم امریکن ہو۔ دن میں پانچ مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے عادی ہو۔ ہم

ہندوستانی ہیں سینکڑوں برس سے بھوکے رہتے چلے آرہے ہیں۔ تم جلدی تیار ہو جاؤ میں تمھیں سڑک تک پہنچا آؤں گی۔"

"مگر سوشما اگر میں نے تمھارے ساتھ غداری کی اور تمھاری اس جگہ کا پتہ پولیس کو دے دیا تب؟"

"تب کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمارے دو ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں، ایک پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا ہے اور ایک بھوک سے مجبور ہو کر پولیس کا مخبر بن گیا ہے۔ ہم بھی یہ گھر چھوڑ رہے ہیں کیونکہ چند گھنٹوں میں پولیس والے یہاں آرہے ہیں اس گھر کو جلانے...."

"نہیں نہیں سوشما وہ ایسا نہیں کر سکتے...."

"وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ اب تم تیار ہو جاؤ"

جب ہم چپ چاپ کھیتوں کی پگڈنڈیوں کو پار کرتے ہوئے سڑک تک پہنچے تو سوشما نے کہا "اچھا برٹ میں اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ مجھے واپس جا کر پتا جی کو کہیں اور پہنچانا ہے۔ بھگوان تمھاری سہایتا کرے"۔

میں نے سوچا مجھے جلدی یہاں سے چلا جانا چاہیے کبھی پولیس کا کوئی گشتی دستہ ادھر آنکلے اور میری وجہ سے وہ پکڑی جائے۔ میں وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ سوشما نے کہا "ٹھہرو یہ لو" یہ کہہ کر اس نے اپنے تھیلے میں سے میرا ریوالور نکالا اور مجھے دیتے ہوئے کہا "اسے سچ مچ جمہوریت کی آزادی کی حفاظت کے لیے استعمال کرنا برٹ"۔

پھر اس نے لکڑی کی ایک ڈبیہ نکالی اور اسے کھول کر اس میں اپنی انگلی ڈبائی "ہمارے ہاں رسم ہے کہ جب سپاہی میدان جنگ کو جاتا ہے اس کے ماتھے پر تلک لگایا جاتا ہے" یہ کہہ کر میرے اونچے قد تک پہونچنے کے لیے وہ پنجوں کے بل کھڑی ہوگئی اور میرے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگا دیا۔ جس وقت وہ ٹیکہ لگا رہی تھی میں اس کا گرم سانس اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے جسم کی مہک سونگھ سکتا تھا۔ اس کے بالوں کی ایک آوارہ لٹ میری ناک کو چھو رہی تھی۔

ایک پل کے لیے میرا جی چاہا کہ رخصت ہوتے ہوئے اسے اپنی آغوش میں لے لوں۔ پہلی اور آخری بار اس کے اودے ہونٹوں کو، اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو، اس کی گردن کے خوبصورت خم کو چوم لوں۔ مگر اس ہندوستانی آسمان تلے ایسا کرنا مجھے نا روا ہی نہیں غیر ضروری بھی

معلوم ہوا۔ سوشا نے مجھے ایسی محبت دی تھی جو اپنے اظہار کے لیے بوسوں کیا، الفاظ کی بھی محتاج نہیں ہوتی۔

ماتھے پر تلک لگانے کے بعد سوشا نے ایک کاغذ کی پڑیا نکالی اور مجھے دیتے ہوئے کہا ''ہمارے ہاں یہ بھی رسم ہے کہ جب کوئی اپنا گھر والا.... سفر کو جاتا ہے تو کھانے کی کوئی چیز اس کے ساتھ کی جاتی ہے''۔ میں نے پڑیا کھول کر دیکھا۔ اس میں سوکھے چاول کے چند دانے تھے.... ''

میں نے کہا 'خدا حافظ سوشا مگر ایک دن ضرور لوٹ کر آؤں گا' اور وہاں سے چلا آیا سڑک کے موڑ سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سوشا اب تک کھیتوں کے کنارے کھڑی تھی اور میں نے سوچا کتنی عجیب اور ہولناک بات ہے کہ ان کھیتوں میں فصل کٹنے کے لیے تیار ہے اور پھر بھی سوشا بھوکی ہے۔

اور آگے جانے پر مجھے پولیس کی ایک لاری مخالف سمت سے آتی ہوئی ملی۔ کوئی دس بارہ ہندوستانی سپاہی تھے اور ایک گورا افسر ان سب کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ایک مشین گن بھی تھی۔ گورے افسر کی پیٹی میں دو پستول لگے ہوئے تھے۔ ایک امریکن سپاہی کو دیکھ کر وہ ٹھہر گئے۔ انگریز افسر نے مجھ سے کہا، کیا تم راستہ بھول کر ادھر آ نکلے ہو؟ یہ تو بڑا خطرناک علاقہ ہے۔ یہاں تو باغیوں کا اتنا زور ہے کہ کوئی گورا آدمی ادھر SAFE نہیں ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ہوائی جہاز سے چھتری کے ذریعہ کودا تھا اور قریب کے ایک گاؤں والوں نے مجھے بچالیا تھا۔ پھر وہ بولا، بڑے تعجب کی بات ہے جو تم بچ گئے۔ خیر سیدھے چلے جاؤ، کوئی دس میل کے فاصلے پر فوج کی چوکی ملے گی۔ وہاں سے تمھیں جیپ یا ٹرک کی سواری مل جائے گی۔ میں نے اس سے پوچھا تم لوگ کس کام پر جارہے ہو تو گورا افسر بولا 'انقلابیوں کے ایک اڈے کا پتہ چلا ہے، وہاں چھاپہ مارنے جارہے ہیں' اور پھر میری طرف آنکھ مار کر ''یار بڑے مزے کی بات بتاؤں اس انقلابی ٹولی کی سردار ایک لڑکی ہے سنتے ہیں بڑی خوبصورت ہے۔ پٹاخہ ہے پٹاخہ۔ بس ایک بار مل جائے.....'' سوشا کے بارے میں ایسے گندے الفاظ سن کر مجھے متلی ہونے لگی۔ میرا جی چاہا فوراً وہاں سے چل پڑوں۔ پھر میں نے سوچا جتنی دیر بھی ان لوگوں کو باتوں میں لگائے رکھوں، سوشا کو گھر چھوڑنے کا زیادہ وقت ملے گا۔ سو میں نے گورے افسر کو چڑانے کے لیے کہا 'ایک لڑکی گرفتار کرنے کے لیے بارہ بندوقیں ایک گن مشین اور پستول۔ بڑے بہادر ہو تم لوگ'۔

وہ بولا: ’’ارے تم امریکن کیا جانو کیا ہو رہا ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ اس کا اپنا ہی گاؤں نہیں سارا علاقہ ہے۔ جب ہی تو اب تک پولیس اس کا پتہ نہیں چلا سکی۔ مگر اب ان سب گاؤں والوں کو سزا دی جائے گی‘‘۔

میں نے بھولا بن کر پوچھا ’’اور وہ لڑکی وہاں سے بھاگ گئی تو کیا کرو گے؟‘‘۔

جواب ملا ’’کم سے کم اس کے گھر کو جلا دیں گے۔ دیکھتے ہیں پھر کیسے وہاں انقلابیوں کا اڈہ بناتی ہے‘‘۔

’’اور گاؤں والوں کو کیا سزا دو گے؟ کیا ان سب ہزاروں کو پکڑ کر جیل میں ٹھونس دو گے؟‘‘

’’نہیں جی! ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ ان اکال کے دنوں میں ان کو جیل میں مفت روٹیاں کھلائیں۔ مگر انھیں سزا ضرور ملے گی رات ہونے تک تم اس پہاڑی کی چوٹی پر پہنچو گے جہاں فوجی چوکی ہے۔ وہاں سے یہ سب گاؤں نظر آتے ہیں خود ہی دیکھ لینا.... ‘‘اور یہ کہہ کر اس نے لاری آگے بڑھا دی اور میں دھول کے بادل میں لپٹا وہیں کھڑا رہ گیا۔

رات ہوتے جب میں اس فوجی چوکی پر پہنچا اور پہاڑی پر سے پیچھے دیکھا تو دور نیچے میدان میں آگ کا ایک نقطہ نظر آیا جو ہر پل بڑھتا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا ’’تو یہ سوشا کا گھر ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کے سب سے میٹھے لمحے گزارے ہیں۔ جہاں بیٹھ کر بوڑھا ڈاکٹر باسو غریب کسانوں کا علاج کیا کرتا تھا، جہاں سوشا اور اس کے ساتھی راتوں کو جاگ کر اپنے ملک کی آزادی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ مگر تھوڑی دیر میں آگ پھیلتے پھیلتے ایک آتشیں سمندر بن گئی اور وہاں پہاڑی پر سے ایسا لگتا تھا جیسے ایک گاؤں ہی نہیں ایک پورا ملک جل رہا ہو۔ میں نے ایک فوجی افسر سے پوچھا ’’یہ کیسی آگ ہے؟ ایسا لگتا ہے پورا جنگل کا جنگل جل رہا ہو؟‘‘ اس نے اپنی بھوری موٹی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا ’’یہ تو روز کا تماشہ ہے۔ ان باغی کسانوں کی کھیتیاں جلائی جا رہی ہیں جو انقلابیوں کی مدد کرتے ہیں۔

اگلے دن میں ایک جیپ پر سوار ہو کر امریکن ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوا۔ مگر سڑک پر اتنی بھیڑ تھی کہ برابر ہارن بجاتے رہنے پر بھی جیپ کو راستہ نہ ملتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سارے ہندوستان کی آبادی نکل پڑی ہے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی انسانوں کا یہ دریا بہتا چلا جا رہا تھا۔

مرد عورتیں بچے بوڑھے پریشان حال۔ دھول میں دبے ہوئے۔ اپنی تھکی ہوئی ٹانگوں کو گھسیٹتے چلے جارہے تھے۔ میں نے جیپ کے ڈرائیور سے پوچھا ''کیا کہیں بم باری ہوئی ہے؟'' میں سمجھا تھا کہ جاپانی بمباروں نے ان بے چاروں کو بے گھر بے در کر دیا ہے اور یہ شرنارتھی بموں سے بچنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں مگر ڈرائیور نے کہا ''بم وم کوئی نہیں پڑے، یہ تو اکال کے مارے ہوئے کسان ہیں جو بھیک مانگنے کے لیے شہر جارہے ہیں''۔

اب میں نے سڑک کے دونوں طرف چلتے ہوئے انسانوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ سوکھے ہوئے جسم کے بچے ادھ موئے بوڑھے نوجوان عورتیں جن کی چھاتیاں سوکھ گئی تھیں اور ان میں سوشا ایک پھٹی ہوئی ساڑی میں اپنے جسم کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی نظریں جھکائے چلی جارہی تھی۔

''سوشا!'' میں چلایا اور ڈرائیور نے ایک جھٹکے کے ساتھ جیپ ایک دم روک دی۔ لڑکی نے غیر متعلق نگاہوں سے میری طرف دیکھا.... نہیں وہ سوشا نہیں تھی کوئی اور تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا ''جیپ چلاؤ''۔

اس دن اور اس کے بعد کتنی ہی بار۔ جب تک ہندوستان میں رہا۔ میں نے اکال کے مارے ہوئے کسانوں کے قافلوں میں کتنی ہی بار سوشا کو دیکھا۔ بھوکی، ادھ ننگی، ادھ موئی سوشا کو۔ ہر راستہ چلتی لڑکی مجھے سوشا ہی نظر آتی تھی۔ موت کی اس سڑک پر سینکڑوں ہزاروں سوشائیں چل رہی تھیں۔ مگر ان میں سے میری سوشا کون سی تھی؟ کہاں تھی؟ کس حال میں تھی؟ کیا وہ اپنے مکان میں جل کر مر گئی تھی؟ کیا وہ اپنے گاؤں والوں کے کھیتوں کے ساتھ زندہ بھون دی گئی تھی؟ کیا وہ اس گورے افسر کی ہوسنا کی کا شکار ہو گئی تھی؟ کیا وہ پولیس کا مقابلہ کرتی ہوئی ماری گئی تھی؟ کیا وہ اور کئی انقلابیوں کی طرح پہاڑی راستوں سے آسام اور آسام سے برما کی سرحد تک پہنچ کر سبھاش بوس کی آزاد ہند فوج میں جا ملی تھی؟ یا وہ بھوک سے مجبور ہو کر اور سینکڑوں بنگالی لڑکیوں کی طرح اپنی آبرو بیچ رہی تھی۔ وہ شرمیلی لڑکیاں جن کو چھونے کی بھی کوئی ہمت نہ کرسکتا تھا؟ وہ 'سوشائیں' جو کبھی کسی اجنبی سے آنکھیں چار نہ کرسکتی تھیں۔ جو بات بھی کرتی تھیں تو نگاہیں جھکا کر؟

''یہ سوال، یہ خطرے، یہ شبہے مجھے پریشان کیے رہتے میرے دماغ میں ہر وقت آگ کے شعلے بھڑ کتے.... اس آگ کے شعلے جس نے سوشا کے گاؤں والوں کی کھیتیوں کو جلا کر خاک کر ڈالا تھا.... اور پھر بھوکی سوشاؤں کا کارواں کیڑوں کی طرح رینگتا ہوا میرے شعور پر چھا جاتا اور جب کبھی میں اپنے ہوائی جہاز پر، دشمن کے فوجی اڈوں پر، بمباری کرنے کے لیے روانہ ہوتا تو میرے کان میں سوشا کے الفاظ گونجتے رہتے جو اس نے میرا پستول واپس دیتے ہوئے کہے تھے۔ ''اسے سچ مچ جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے لیے استعمال کرانا، برٹ'' میں اپنے بموں کا بوجھ ہلکا کر کے واپس آ جاتا مگر میرے دل میں ہر وقت یہی شبہ رینگتا رہتا کہ کیا یہ جنگ سچ مچ آزادی اور جمہوریت کے لیے لڑی جا رہی ہے؟ اور پھر ایک دن مجھے حکم دیا گیا کہ کوہیما کے پاس برما۔ آسام کی سرحد پر آزاد ہند فوج کے ایک دستہ پر بم برساؤں۔ میرے بمبار میں پانچ بم لگا دیے گئے مگر جب میں مقررہ جگہ پر پہنچا اور میرے ساتھ والے فلائٹ لفٹنٹ نے نیچے اشارہ کیا۔ جہاں ایک وادی میں آزاد ہند فوج کا ایک مورچہ تھا۔ اور میں بٹن دبا کر بم چھوڑنے ہی والا تھا کہ میرے کان میں ایک بار پھر سوشا کے الفاظ گونجے، اسے سچ مچ آزادی اور جمہوریت کی حفاظت کے لیے استعمال کرنا، اور میں نے سوچا یہ لوگ بھی تو آزادی کے لیے ہی لڑ رہے ہیں۔ یہ بھی سوشا ہی کی طرح ہیں۔ اور کون جانتا ہے سوشا بھی ان میں ہو۔ تو کیا ان پانچ چاول کے دانوں کے بدلے میں جو سوشا نے رخصت ہوتے وقت مجھے دیے تھے۔ یہ پانچ بم اس پر برسا دوں؟ یہی سوچتے ہوئے بمبار نشانے پر سے اڑتا ہوا گزر گیا۔ اور اس دن پہلی بار میں نے فوجی احکام کی خلاف ورزی کی تھی۔ بغیر بم برسائے واپس آ گیا۔ اس جرم کی سزا میں کورٹ مارشل ہی ہونا چاہیے تھا مگر فوجی ڈاکٹر نے معائنے کے بعد فیصلہ سنایا کہ شاید چوٹ لگنے کی وجہ سے میری دماغی حالت ٹھیک نہیں رہی۔ اس لیے مجھے امریکی ہوائی فوج سے نکال دیا گیا۔ میں واپس امریکہ آ گیا۔ مگر اب میرے لیے پرائیویٹ ہوائی جہاز چلانے کی نوکری ملنا بھی مشکل ہو گیا۔ جہاں جاتا میرا فوج کا ڈسچارج سرٹی فکیٹ'' پڑھ کر مجھے جواب دے دیا جاتا۔ بے کار گھومتے گھومتے میں ادھر اس علاقے میں آن نکلا۔ سنا کھیت کے مزدوروں کی ضرورت ہے سو میں یہاں اس فارم پر کام کرنے لگا ہوں۔ یہ کام میرے لیے نیا ضرور تھا مگر اب مجھے یہی پسند

ہے۔ نہ جانے کیوں نیویارک اور شکاگو کے بازاروں میں مجھے سوشا بہت دور معلوم ہوتی ہے مگر اس کھیت کی مٹی سے بہت نزدیک معلوم ہوتی ہے اور پھر جب کبھی میں تمھیں یا گیہوں کے کسی بھی دانے کو دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار سوشا کی یاد آجاتی ہے، کیونکہ آٹھ برس بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج وہ پھر بھوکی ہے۔ وہ جس نے خود بھوکی رہ کر مجھے کھانا کھلایا تھا۔ اور جس نے اپنے چاول کے آخری پانچ دانے میری نذر کر دیئے تھے اور میں اسے گیہوں کے چند دانے بھی نہیں بھیج سکتا..... برٹ نے یہ کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

برٹ کی کہانی یہاں تک سنا کر امریکی دانہ بھی رُک گیا۔ کچھ دیر تک دوسرے دانے بھی خاموش رہے۔ پھر چینی دانے نے پوچھا "پھر تم نے کیا کہا بھائی؟"

امریکی دانے کی زبان پھر چل پڑی "بھائیو میں نے وہی کہا جو تم میں سے کوئی بھائی کہتا میں نے کہا "برٹ گھبراتے کیوں ہو۔ مجھے اپنی سوشا کے پاس بھیج دو۔ میں نہ صرف اس کی بھوک دور کر دوں گا بلکہ اسے تمھارا پیغامِ محبت بھی پہنچا دوں گا"۔

برٹ ٹھنڈی سانس لے کر بولا یہ تو ٹھیک ہے دوست مگر سوشا کا پتہ ہی نہیں معلوم۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی"

اس پر میں نے کہا "ہوسکتا ہے کہ ایک سوشا کا پتہ تمھیں نہیں معلوم لیکن تم نے تو ہندوستان میں ہزاروں لاکھوں بھوکی سوشاؤں کو دیکھا ہے اگر ان کی جان بچانے کے لیے میرے جیسے کروڑوں اربوں گیہوں کے دانوں کو بھیج دیا جائے تو کیسا ہے؟"

اور برٹ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ سوشا ضرور یہی پسند کرتی۔ وہ اپنے لیے نہیں، اوروں کے لیے جیتی تھی۔ اس لیے میں یہی کروں گا۔ میں آج ہی اپنے ساتھیوں سے اس بات کا ذکر کرتا ہوں۔ ہمارے دیش میں لاکھوں ٹن اناج زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اناج کی قیمتیں گرنے نہ پائیں اس لیے جلا دیا جاتا ہے۔ سمندر میں ڈبو دیا جاتا ہے..... کیوں نہ اس میں سے چند لاکھ ٹن ہندوستان بھیج دیا جائے"۔

اس رات کو جب برٹ نے دوسرے کھیت مزدوروں اور فارم کے منیجر وغیرہ سے اس تجویز کا ذکر کیا تو اس بات کو پسند کیا گیا۔ ایک نے کہا ہمیں ضرور بھوکے ہندوستانیوں کی مدد کرنی

چاہیے۔مگر یہ کام تو گورنمنٹ کا ہے ہم معمولی کھیت مزدور کیا کر سکتے ہیں؟''

برٹ نے جواب دیا''گورنمنٹ کیا ہے؟ کیا ہم لوگ ہی گورنمنٹ نہیں ہیں؟ اگر ہم سب معمولی امریکن کسان کھیت مزدور دوسرے مزدور مل کر ہندوستان کی امداد کا مطالبہ کریں تو کیا گورنمنٹ ہماری نہ سنے گی؟''

اس پر فارم کا منیجر جو بڑا اکھڑ اور برٹ سے اس کی آزاد طبیعت کی وجہ سے جلتا تھا بولا۔تم جاہل ان پڑھ لوگ دنیا کی سیاست کو سمجھتے ہی نہیں خواہ مخواہ ٹانگ اڑانا چاہتے ہو جانتے ہو کہ کانگریس کے سامنے ایک باقاعدہ بل ہے جو اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ کئی کروڑ ٹن اناج اکال کے مارے ہندوستانیوں کو قرض دیا جائے.....؟''

''وہ بل تو کئی مہینے سے کھٹائی میں پڑا ہے... آخر پاس کیوں نہیں ہوتا؟'' برٹ نے پوچھا۔

منیجر بولا''اس لیے کہ ہندوستانی ہماری شرائط کو نہیں مان رہے ہیں''۔

''کیسی شرائط؟''

''یہی کہ روس اور کیمونسٹ چین کے خلاف ہندوستان ہمارا ساتھ دے مونا سائٹ اور تھوریم جیسی دھاتیں ہندوستان میں پائی جاتی ہیں اور جن کی ہمیں سخت ضرورت ہے وہ ہمیں سپلائی کرتا رہے.....''۔

''مطلب یہ ہے کہ ہندوستان اپنی آزادی اور سوشا کی آبرو کو گیہوں کے چند دانوں کے بدلے میں ہمارے ہاتھ بیچ دے.... ہندوستان ایسا سودا نہیں کرے گا۔سوشا اپنی آبرو نہیں بیچے گی، چاہے بھوکی ہی کیوں نہ مر جائے؟''

''سوشا؟'' منیجر نے حیرت سے پوچھا''یہ سوشا کون بلا ہے؟''

برٹ نے کہا''یہ تم نہیں سمجھو گے۔سوشا ہندوستان ہے'' اور وہ وہاں سے چلا آیا۔

اگلے دن اسے معلوم ہوا کہ سارے فارم میں کٹائی شروع ہوگئی ہے مگر ایک تہائی فصل کو کاٹ کر جلا دیا جائے گا۔کیونکہ اس برس اناج زیادہ پیدا ہوا تھا۔اگر مارکیٹ میں ایک دم اناج زیادہ آ گیا تو قیمت کم ہو جائے گی۔یہ سن کر سرمایہ داری کے کارن وہی اناج جو بھوکے ہندوستان کو بھیجا جا سکتا تھا جلایا جا رہا ہے۔برٹ کو اپنے کام سے ہی نفرت ہوگئی۔اس نے سوچا تو کیا ہم

سال بھر اسی لیے محنت کرتے ہیں۔ ہل اور ٹریکٹر چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں، پانی دیتے ہیں، نلائی کرتے ہیں، فصل تیار ہوتی ہے تو اسے کاٹتے ہیں۔ کیا اتنی محنت سے پیدا کیے ہوئے اناج کو وال اسٹریٹ کے موٹے موٹے سرمایہ داروں کے منافع کی خاطر جلا دیا جائے؟ اس نے اسی وقت منیجر سے کہا کہ اس کا نام کاٹ دیا جائے اور اس کا حساب کر دیا جائے۔ وہ کہیں اور کام ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ منیجر تو چاہتا ہی تھا کہ کسی طرح برٹ سے پیچھا چھوٹے، کیونکہ برٹ نے اس فارم کے کھیت مزدوروں کی یونین بنائی تھی اور ایک بار اسٹرائیک کی دھمکی دے کر مزدوری بھی بڑھوالی تھی۔ اس نے فوراً حساب کر دیا اور جب اپنی ہفتہ بھر کی مزدوری لے کر برٹ وہاں سے آنے لگا تو منیجر بولا ''لگتا ہے جنگ کے زمانے میں تم ہندوستانی چھوکری کو دل دے آئے ہو۔ تو پھر ہندوستان ہی کیوں نہیں چلے جاتے۔ وہ بے چاری تمھارا انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید ایک چھوٹے سے برٹ کو بھی گود میں کھلا رہی ہو؟'' یہ گندہ جملہ سن کر برٹ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے ایک گھونسا منیجر کی کنپٹی پر لگا دیا۔ منیجر لڑکھڑا کر گرا مگر اتنے میں دفتر کے دوسرے لوگ آ گئے اور انھوں نے برٹ کو پکڑ کر منیجر کے کہنے پر پولیس کے حوالے کر دیا۔

برٹ کی گرفتاری کی خبر فارم کے سب کھیت مزدوروں میں تیزی سے پھیل گئی۔ ان میں سے کئی بھاگے بھاگے تھانے میں پہونچے اور اسے ضمانت پر چھڑا کر لے آئے۔ جب برٹ نے منیجر کی بدتمیزی کا سارا واقعہ سنایا تو کھیت مزدوروں نے کھیت کاٹنے سے انکار کر دیا، جب تک برٹ کے خلاف دائر کیا ہوا مقدمہ واپس نہ لیا جائے۔ برٹ نے کہا، نہیں یہ سوال نہیں ہے اگر مجھے دو چار مہینوں کی قید بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری محنت سے پیدا کیا ہوا اناج جلایا جا رہا ہے لیکن ہندوستان کے بھوکوں کے لیے نہیں بھیجا جاتا۔ تم لوگ منیجر کو اور فارم کے مالکوں کو مجبور کرو کہ وہ اناج کو جلانا بند کریں اور یہ سارا اناج ہندوستان بھیجیں۔

مزدور برٹ کی بات مان گئے اور یہ مطالبہ لے کر منیجر کے پاس پہنچے۔ منیجر نے ٹیلیفون پر فرم کے مالکوں سے بات کر لی تھی اور انھوں نے حکم دیا تھا کہ جہاں تک ہو اسٹرائیک کو روکا جائے۔ ورنہ فصل کی کٹائی کے وقت اسٹرائیک ہوگئی تو بڑا نقصان ہوگا۔

''کیوں بھئی بات کیا ہے؟'' منیجر نے بڑا غیر معمولی اخلاق برتتے ہوئے مزدور یونین

کے نمائندوں سے پوچھا۔

انھوں نے کہا بات یہ ہے کہ اس فصل میں سے تیسرا حصہ آپ جلانا چاہتے ہیں مگر ہم ایک دانہ بھی ہاتھ لگانے نہ دیں گے"۔

منیجر نے مسکرا کر کہا "اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ اناج کو نہ جلایا جائے تو ایسا ہی ہوگا.... مگر...." یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ جان بوجھ کر ڈرامائی انداز میں پھر بولا "مگر یہ سوچ لو کہ اگر یہ فالتو اناج جلایا نہ گیا تو مارکیٹ میں اتنی ریل پیل ہوگی کہ فوراً اناج کی قیمتیں کم ہو جائیں گی"۔

"ہونے دو" ایک مزدور نے چلا کر کہا "قیمت ہم مزدوروں کی جیب میں تھوڑا ہی آتی ہے"۔

منیجر نے سگریٹ جلاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا "مگر مزدوری جو تمھیں ملتی ہے وہ اسی قیمت میں سے ادا کی جاتی ہے۔ قیمتیں کم ہوئیں تو ساتھ ساتھ مزدوری کا نرخ بھی کم کرنا پڑے گا سوچ لو"۔

یہ سن کر کئی نمائندوں کا جوش تو ٹھنڈا پڑ گیا مگر ایک سمجھدار مزدور بولا "لیکن اسی فالتو اناج کو اگر ہندوستان بھیج دیا جائے تو کیسا ہے۔ نہ مارکیٹ میں ریل پیل ہوگی نہ قیمتیں گریں گی نہ ہماری مزدوری کم کرنے کی ضرورت ہوگی....اور ساتھ ہی ہندوستان کے لاکھوں بھوکوں کی جان بچ جائے گی"۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے" منیجر نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "مگر یہ فارم تجارتی اصولوں پر چلایا جاتا ہے۔ اس کی پیداوار کو خیرات میں نہیں بانٹا جا سکتا.....ہاں تم لوگ چاہتے ہو تو کل تک فالتو فصل کا جلانا روک دیا جائے گا۔ اس عرصے میں اس میں سے جو کوئی جتنا اناج چاہے خرید کر ہندوستان یا جاپان جہاں چاہے بھیج سکتا ہے کمپنی کو کوئی اعتراض نہیں ہے"۔

اب مزدوروں کو منیجر کی چالبازی سمجھ میں آئی لیکن اب وہ لاجواب ہو گئے تھے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا.... دو چار نمائندے تو الٹے پیروں لوٹنے والے ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور برٹ داخل ہوا اس نے منیجر کی آخری گفتگو سن لی تھی۔ کیونکہ آتے ہی اس نے جیب سے بٹوہ نکالا اور میز پر دو سو پچپن ڈالر کی رقم رکھ دی جو اس نے آج تک اپنی مزدوری سے بچائی تھی اور جو ابھی ابھی وہ بینک سے نکال کر لایا تھا۔

''برٹ کیا کر رہے ہو؟'' اس کا ایک ساتھی مزدور چلایا۔

''سوشا کے لیے اناج خرید رہا ہوں'' برٹ نے جواب دیا۔

''لیکن تمھاری ساری عمر کی پونجی....''

''اس لڑکی کے لیے اناج خرید رہا ہوں جو خود بھوکی رہ کر مجھے کھانا کھلایا کرتی تھی۔ اس ملک کے لیے جو ہمیشہ دنیا کے دکھ درد میں شریک رہا ہے''۔

برٹ کے ان الفاظ کا یہ اثر ہوا کہ ایک ایک کر کے ہر نمائندے نے اپنی جیب خالی کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر سارے فارم میں پھیل گئی اور پھر کیا تھا، ہر کھیت مزدور اور ہر ٹریکٹر ڈرائیور ہر کسان اپنی اپنی پونجی لیے بھاگا چلا آرہا تھا۔ شام ہوتے ہوتے منیجر کی میز پر کئی ہزار ڈالر کی رقم جمع ہوگئی۔

اور اس شام کو برٹ میرے کھیت کے پاس آیا اور مجھے سارا واقعہ سنایا میں نے کہا ''تو تم نے ہم بے چاروں کو زندہ جلائے جانے سے بچا ہی لیا''

''یہی نہیں'' اس نے کہا ''کل تم ہندوستان جا رہے ہو دوست، تم کتنے خوش قسمت ہو کہ سوشا کا دیدار کرو گے''

''سوشا؟'' میں نے پوچھا مگر اس کا کوئی اتا پتہ تو بتاؤ۔ اتنے بڑے ملک میں کہاں کہاں اور کیسے اس کو ڈھونڈتا پھروں گا''

اور برٹ نے کہا ''تمھیں ڈھونڈنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ دوست وہ تمھیں ہر طرف اور ہر جگہ ملے گی۔ وہاں کی ہوا میں بھی، تم اس کے جسم کی مہک پاؤ گے۔ سوشا ہی ہندوستان ہے دوست''۔

اور اگلے دن ایک ٹرک میں سوار کر کے برٹ مجھے اور میرے کروڑوں اربوں ساتھیوں کو واشنگٹن میں ہندوستانی سفارت خانے میں چھوڑنے آیا۔ ٹرک ٹھہرا کر دروازے کی گھنٹی بجائی تو اندر سے ایک خوبصورت ہندوستانی لڑکی ساڑی پہنے ہوئے آئی اور پوچھا ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

تھوڑی دیر تک تو برٹ اس خوبصورت کالی آنکھوں کو تکتا رہا۔ پھر بولا ''یہ اناج لایا ہوں میں۔ میرے دوسرے ساتھی بھی اناج لا رہے ہیں۔ آپ کے ملک ہندوستان بھیجنے کے لیے

ہماری دوستانہ بھینٹ''۔

یہ سن کر ان خوبصورت کالی آنکھوں میں خوشی کے آنسو امڈ آئے۔ اس نے کہا ''شکریہ ہم آپ کا احسان کبھی نہ بھولیں گے''۔

اور مجھے وہاں چھوڑ کر برٹ سیٹی بجاتا ہوا واپس چلا گیا۔ جب وہ مجھ سے رخصت ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک عجیب سا سکون، عجیب سی خوشی کی چمک تھی جیسے اس نے آخر کار اپنی سوشما کا دیدار کر ہی لیا ہوا۔

اگلے دن ہمیں ہندوستان کے لیے اس سفر پر روانہ ہونا تھا۔ اس لیے وہ رات میں نے ہندوستانی سفارت خانہ کے ایک گودام میں گذاری۔ رات کا ایسا ہی وقت ہوگا جب دنیا سوتی ہوتی ہے اور محبت جاگتی ہے کہ دروازہ کھلا اور وہی لڑکی ہاتھ میں ایک شمع دان لیے داخل ہوئی۔ اس کے کالے لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ شمع کی لَو اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی.... وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی ہمارے پاس آئی اور بڑی محبت سے گیہوں کے چند دانوں کو مٹھی میں اٹھا کر دیکھتی رہی.... بڑی پیار بھری نظر سے...بالکل میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر.... یہاں تک کہ الٹا میں شرما گیا اور میں نے کہا ہندی حسینہ تم تو مجھے ایسے گھور رہی ہو جیسے کوئی محبوب اپنے محبوب کو دیکھتا ہے'' اور لڑکی کے دل نے جواب دیا ''تمھیں دیکھ کر مجھے کسی کی یاد آتی ہے''۔

میں پوچھنا ہی چاہتا تھا ''کس کی یاد آتی ہے؟'' کہ دوسرے قدموں کی آہٹ ہوئی اور ایک آواز آئی ''اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو سوشما؟''

''سوشما؟'' چینی دانے نے تعجب سے چونک کر پوچھا۔ ''کیا یہ وہی برٹ والی سوشما تھی؟''۔

''یہ میں نہیں جانتا دوست.... اور نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے۔ یاد نہیں برٹ نے کہا تھا سوشما ہندوستان ہے.... بس ساتھیو، میری کہانی ختم ہوئی۔ اب ہمارے چینی دوست کی باری ہے''۔

## چینی دانے کی کہانی

اب سب کی نگاہیں چینی دانے پر جم گئیں... چاول کا دانہ، جو تھا تو چھوٹا مگر جس کا بدن بڑا

گٹھا ہوا تھا اور جو ایسے بولتا تھا جیسے ہزاروں برس کی نیند سے ابھی جاگا ہو اور اس نے کہنا شروع کیا:

ساتھیو! ہمارے امریکی دوست کی رام کہانی بلکہ کہنا چاہیے کہ پریم کہانی، آپ نے سنی۔ میں یہاں کیسے اور کیوں آیا ہوں یہ بھی ایک پریم کہانی ہے۔ برٹ اور سشما کی طرح چار برس پرانی نہیں بلکہ سینکڑوں برس پرانی ہے۔ میری کہانی پندرہ سو سال پہلے شروع ہوئی تھی اور ابھی تک چل رہی ہے اور شاید ہمیشہ چلتی رہے گی ہو سکتا ہے کہ کوئی پوچھے کہ اتنی پرانی کہانی مجھے۔ ایک چاول کے دانے کو کیسے معلوم ہو گئی جب کہ میری عمر ابھی ایک برس کی بھی نہیں ہے؟ مگر آپ سب ساتھیوں کو تو اچھی طرح معلوم ہے کہ اناج کے ہر دانہ میں ہزاروں برس کی انسانی زندگی کٹی ہوئی ہوتی ہے۔ انسانی ترقی اور جدو جہد، مسرتیں اور غم، آنسو اور قہقہے، محبت کے گیت اور جنگی ترانے..... دیکھنے والی آنکھوں اور سننے والے کانوں کو اناج کے ایک دانے میں کیا کچھ نہیں ملتا۔

ہاں تو ساتھیو! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ میں چین سے آیا ہوں۔ اپنے ملک کی تعریف میں میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ ہمارے امریکی دوست نے بتایا ہے کہ ان کے ملک کے باشندے امریکہ کو فخر سے خدا کی زمین کہتے ہیں لیکن ہمارے بڑے بوڑھوں نے بتایا ہے کہ بڑا بول نہ بولنا چاہیے۔ اپنے بارے میں اور نہ ہی اپنے ملک کے بارے میں۔ ہزاروں برس سے ہم تو اپنے چین کو صرف 'درمیانی ملک' کہتے آئے ہیں۔ چاہے مشرق اور مغرب کے درمیان کا اور چاہے شمال اور جنوب کے درمیان کا ملک سمجھ لیجیے یا ایسا ملک جہاں کے لوگ محنتی ہوں درمیان کا راستہ چلنا پسند کرتے ہوں۔ نہ اتنے گرم ہوں کہ بات بات میں اُبل پڑیں اور نہ اتنے ٹھنڈے ہوں کہ گھر میں آگ لگ جائے اور تب بھی نہ پگھلیں۔ نہ دماغ اتنے اونچے ہوں کہ کبھی زمین کی اصلیت کی طرف نگاہ ہی نہ کریں اور نہ اتنے اونچے کہ کبھی بھولے سے بھی آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر نہ دیکھیں۔ نہ اکھڑ اور بدتمیز ہوں اور نہ چاپلوس اور خوشامدی.....

ہزاروں برس سے ہم زندگی کے اسی درمیانی راستے پر چل رہے تھے۔ اتنے عرصہ میں کتنے ہی جُگ بدلے۔ کتنے ہی پرانے راج مٹ گئے اور کئی نئی حکومتیں قائم ہوئیں۔ کتنے ہی بادشاہ، فاتح اور سپاہی آئے اور گئے لیکن ہمارے ملک کے معمولی انسان کھیتی باڑی کرتے اپنے پرانے ڈھرے پر چلتے رہے۔ ہمارے سماج میں سب سے بڑا درجہ پڑھے لکھے لوگوں اور عالموں کا تھا۔

سپاہیوں اور سور ماؤں سے سب ڈرتے تھے مگر ان کی کوئی خاص عزت نہ کرتا تھا۔ ہاں شاعروں، فنکاروں اور کہانی کہنے والوں کی بہت آؤ بھگت کی جاتی تھی اور ہمارے مصور اور کاریگر تو ساری دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ کاغذ کا استعمال دنیا نے ہم سے سیکھا۔ کتابیں چھاپنا ہم نے شروع کیا۔ ریشم کے کیڑوں سے مہین کپڑا ہم نے حاصل کیا۔ سکوں کے بجائے کاغذ کے کرنسی نوٹ سب سے پہلے ہمارے ہاں چلائے گئے اور تو اور بارود بھی ہماری ہی ایجاد ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم بارود کو خوشی کے موقع پر آتش بازی کے کام میں لاتے تھے اور یہی بارود مغربی ممالک میں پہنچ کر انسانوں اور انسان کی بستیوں کو تباہ کرنے کے لیے گولیاں اور بم بنانے کے لیے استعمال میں لایا گیا.....

اُن دنوں سفر کرنا کتنا مشکل تھا یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ پھر اپنا ملک اتنا بڑا تھا۔ اپنی زمین جسے ہم پیار سے 'اچھی دھرتی' کہتے تھے، اتنی زرخیز تھی۔ اپنے دانشور اور کاریگر ساری دنیا سے اتنے اونچے اور آگے تھے کہ چینیوں کو کسی دوسرے ملک میں جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پھر بھی دو ملکوں سے ہمارا ناطہ ضرور تھا۔ ایک تو جاپان سے جہاں کے رہنے والے ہماری زبان ہماری لکھائی کے ڈھنگ اور ہمارے تمدّن کی نقل کیا کرتے تھے.... دوسرا ہندوستان جہاں کے رشیوں، منیوں، دانشوروں اور کاریگروں کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا تھا۔ چین اور اس میں بدھ دھرم کے ذریعہ بڑا گہرا تعلق ہو چکا تھا۔ ہمارے کتنے ہی بھکشو اور وِدوان برفیلے پہاڑوں کو پار کرتے ہوئے ہندوستان جاتے اور وہاں کے شہروں میں وہاں کے دھرم، ادب، تہذیب و تمدن کا مطالعہ کرتے اور پھر کئی کئی برسوں بعد وہاں سے لوٹتے۔

ساڑھے چودہ سو برس ہوئے، جب چانگ چن ہندوستان آیا تو وہ وِدوان تو نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ ابھی نوجوان ہی تھا۔ اصل میں وہ ایک مصوّر تھا۔ اس کا رنگین برش نازک نازک لکیروں سے ایسی خوبصورت تصویریں بناتا تھا کہ دیکھنے والے واہ واہ کر اٹھتے تھے۔ لوگ کہتے چانگ کے برش میں جادو ہے۔ بڑے بڑے زمین دار جاگیر دار چانگ چن سے اپنی اور اپنی عورتوں کی تصویریں بنانے کو کہتے۔ اسے سونے کی تھیلیاں پیش کرتے مگر وہ آوارا اور سیلانی اپنا تھیلہ اٹھائے گاؤں گاؤں گھومتا پھرتا اور بانس کے جھکے ہوئے جھنڈوں، لہراتی ہوئی دھان کی

بالیوں، گاتی ہوئی رنگین چڑیوں اور گہری نیند میں ڈوبی ہوئی جھیلوں کی تصویریں بناتا رہتا۔ نہ جانے اسے انسانی تصویر بنانے سے کیوں چڑ سی تھی۔ کوئی کہتا چانگ پیکنگ کی مشہور گانے والی گل لالہ سے محبت کرتا تھا اور اس نے اس کے کئی لاجواب تصویریں بھی بنائی تھیں، جن میں اس نے گل لالہ کے کالے چکنے بالوں، پیلے گلاب جیسی رنگت اور بادامی آنکھوں کو اپنے فن سے جاوداں کر دیا تھا لیکن چانگ چن غریب تھا اور گل لالہ کو صرف جنگلی پھولوں کے گچھے ہی بھینٹ کر سکتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں زمین دار ٹین کا بڑا بیٹا، بھینگا ٹین چیاؤ آئے دن سونے کے زیورات اور ریشم کی پوشاکیں نذر کرتا رہتا تھا۔ اس لیے گل لالہ نے مصور کی محبت کو ٹھکرا کر اس زمین دار کے بیٹے کی مستقل داشتہ بننا قبول کر لیا۔ یہ سن کر چانگ چن نے گل لالہ کی جتنی تصویریں بنائی تھیں ان سب کو جلا دیا تھا اور اس دن سے اس نے انسانی چہروں کی تصویریں بنانا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ وہ حسین لڑکیوں کے بجائے رنگین تتلیوں کی تصویریں کیوں بناتا ہے تو چیانگ چن نے جواب دیا ''دونوں خوبصورت اور بے وفا ہیں۔ دونوں کبھی اس پھول کو چوستی ہیں کبھی دوسرے پھول کو۔ لیکن تتلی صرف رس چوستی ہے کبھی پھولوں کو اپنے زہریلی ڈنک سے ڈستی نہیں'' اور یہی جملہ جو کسی منچلے نے گل لالہ کے سامنے جا کر دہرا دیا تو اس نے ہنس کر کہا ''اس پگلے سے کہنا انگور کھٹے بھی ہیں اور مہنگے بھی''۔

جب چیانگ اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو لیے ہزاروں میل کا سفر کر کے گھومتا ہوا پیکنگ سے کینٹن پہنچ گیا اور پھر بھی اسے اطمینان قلب محسوس نہ ہوا تو اس کی زندگی نے ایک نیا پلٹا کھایا۔ کینٹن میں اس کی ملاقات ایک بدھ بھکشو سے ہوئی جو ہندوستان کے سفر کی تیاری کر رہا تھا۔ چیانگ چن نے کہا چلو میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں، شاید تمھارے مہاتما بدھ کی جنم بھوی بھارت میں مجھے اطمینان قلب میسر آجائے۔

بھکشو پہلے تو حیران ہوا کیونکہ ہندوستان کا راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کو پیدل پار کرنا پڑتا تھا۔ رات میں کئی کئی سو میل تک کوئی سرائے تو کیا پانی کا کنواں تک بھی نہیں تھا۔ برف کے ٹکڑوں کو ساتھ رکھنا پڑتا اور جب پیاس لگتی تو برف کو پگھلا کر پانی پیتے، اگر کوئی برفیلا طوفان آجاتا تو سب پہاڑی پگڈنڈیاں برف سے ڈھک جاتیں اور راستہ

کھوجتے کھوجتے کتنے ہی مسافر جان دے دیتے۔ اس لیے کہاوت مشہور تھی کہ ہندوستان جانا تو آسان ہے لیکن وہاں پہنچنا مشکل ہے۔ پھر بھی وہ، جن کو دھرم کی لگن اور دنیا کو کھوجنے کی سچی لگن تھی، وہ ان تمام مصیبتوں کا سامنا کرتے ہوئے اس راستے پر چلتے ہی جاتے..... یہاں تک کہ اگر زندہ بچتے تو سنہری کلسوں والے ہندوستانی شہروں تک پہنچ جاتے۔

ہاں، تو پہلے چیانگ چن کا ارادہ سن کر بھکشو حیران ہوا لیکن پھر یہ سوچ کر خوش ہوا کہ چلو راستہ کا ساتھی تو ملا۔ یہ اس بھکشو کی خوش قسمتی تھی کہ چیانگ چن اس کے ساتھ تھا۔ تین چوتھائی راستہ تو خیر سے کٹ گیا لیکن تبت اور ہندوستان کی سرحد کے پاس ہی وہ ایک بڑے طوفان میں بری طرح گھر گئے۔ آسمان اور زمین سب برف سے سفید ہو گئے۔ سردی اتنی تھی کہ بے چارے بھکشو کے پاؤں ٹھٹھر کر رہ گئے تھے اور اس کے لیے دو قدم چلنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ اس نے چیانگ چن سے کہا 'دوست میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ مجھے یہیں چھوڑ دو اور تم یہاں سے آگے بڑھ جاؤ' لیکن نوجوان مصوّر نہ مانا۔ اس نے بھکشو کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور گرتا پڑتا اسے لے چلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھکشو کی جان تو بچ گئی لیکن چیانگ چن مرتے مرتے بچا۔

اور جب وہ ہندوستان کی سرحد کو پار کر کے ایک گاؤں پہونچے تو چانگ چن کو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس گاؤں کے پاس ہی بھگوان بدھ کا ایک مٹھ تھا، وہاں ان دونوں کو سہارا مل گیا مگر چانگ چن کے بخار نے اور بھی بھیانک صورت اختیار کر لی اور اسے اپنے ہندوستانی دوستوں کے سپرد کر کے بھکشو آگے بڑھ گیا لیکن جانے سے پہلے اس نے تمام مشہور شہروں اور متبرک مقامات، شمال میں پاٹلی پتر سے لے کر جنوب میں مہابلی پرم تک کی فہرست لکھوا دی اور چانگ چن سے کہا ''تم اچھے ہوتے ہی چل پڑنا۔ یقین ہے کہیں نہ کہیں ضرور ہماری ملاقات ہو گی اور پھر ہندوستان کے تمام قابل دید مقامات کو دیکھ کر ہم ایک ساتھ لوٹ چلیں گے''۔

لیکن اس سرحدی گاؤں کے علاوہ چانگ چن ہندوستان کا کوئی اور علاقہ نہ دیکھ سکا۔ جب اس کا بخار اترا تو مٹھ کے بھکشوؤں نے زور دیا کہ دو چار ہفتہ اور رک جاؤ۔ جب پوری طاقت آ جائے تب چلے جانا۔ بڑا بھکشو اس تاک میں تھا کہ اس چینی مصوّر کو بھی بدھ دھرم کا پیرو بنا لیا جائے اور اگر ہو سکے تو اسے برہمچاری بھکشو بھی بنا لیا جائے۔ چانگ چن تو شروع ہی سے مہاتما

بدھ کی عظیم شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ اس مَٹھ کے پُر سکون اور پاک ماحول میں اس کی روح نے برسوں کے بعد اطمینان محسوس کیا تھا۔ اس نے بھی سوچا شاید میرے دل کے روگ کا یہی علاج ہے کہ اپنے آپ کو بدھ کی عظیم روح میں مدغم کردوں اور بھکشو بن جاؤں۔ مَٹھ کے بھکشوؤں نے اس کے لیے گیروے رنگ کا لباس بھی تیار کرالیا اور اس کی نئی زندگی کے آغاز کے لیے ایک دن مقرر بھی کردیا۔

اس سے پچھلی شام کو یہ ہوا کہ چانگ چن، ٹہلتا ٹہلتا گاؤں کی طرف نکل گیا۔ گاؤں کے باہر ہی ایک کنواں تھا جہاں گاؤں کی لڑکیاں پانی بھرنے آتی تھیں۔ اس وقت بھی وہاں بڑی چہل پہل تھی لڑکیاں ہنس کھیل رہی تھیں، ایک دوسری پر پانی کے چھینٹے اڑا رہی تھیں لیکن ایک اجنبی وہ بھی پردیسی کو آتے دیکھ کر ان کا رنگین گروہ تتر بتر ہوگیا، جیسے کسی پھول کی پتیاں ٹوٹ کر بکھر جائیں۔ صرف ایک لڑکی جو اپنی گاگر نہ بھر پائی تھی رہ گئی چانگ چن جب پاس پہنچا تو اس نے دیکھا بڑی ہی بھدی اور بدصورت لڑکی ہے اتنی ہی بدصورت جتنی گل لالہ خوبصورت تھی۔ پیکنگ کی حسینہ کی رنگت پیلے گلاب جیسی تھی اور یہ ہندوستانی دیہاتن سانولی تھی گل لالہ اتنی نازک تھی کہ ایسا لگتا تھا کہ اگر پھولوں کا ایک گچھا بھی اٹھالے تو شاید اس کی کمر بل کھا جائے اور یہ پنہارن ہٹّی کٹّی لمبی چوڑی تھی اور اتنی بڑی گاگر اٹھانے پر بھی اس کی کمر میں خم تک نہیں آتا تھا۔ چانگ چن نے سوچا اس دیش میں خوبصورت عورتیں تو ہیں ہی نہیں یہ بڑی بڑی آنکھیں، یہ بڑے بڑے کولھے، بے شرمی کی حد تک ابھرے ہوئے سینے اور یہ بڑے بڑے پاؤں، جیسے مردوں کے۔ پھر بھی یہاں کے شاعر انھیں عورتوں کے حسن کے گیت گاتے ہیں۔

''رادھا اری او رادھا'' دور سے اس کی سہیلیوں کی آواز ہوا کے ساتھ اڑتی ہوئی آئی۔

رادھا! تو اس بھدی بدصورت لڑکی کا نام رادھا ہے۔ چانگ چن نے سوچا، رادھا! مگر نام تو خوبصورت ہے۔

اور اتنی دیر میں رادھا نے وہ بھاری گاگر سر پر اٹھائی اور چانگ کی طرف ایک اچٹتی نگاہ ڈالتی ہوئی اپنے راستہ پر ہولی۔ سورج ڈوبنے والا ہی تھا اور آسمان پر ہلکے ہلکے رنگوں کے بادل تیر رہے تھے۔ دور تک دھان کے کھیتوں کی ہریالی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے پہاڑوں کا سلسلہ

تھا جو بھارت سے تبت اور تبت سے چین تک پھیلا ہوا تھا۔ اس سرحد پر گاگر اٹھائے چلتی ہوئی بڑے بڑے کولھوں اور مردوں جیسے پاؤں والی رادھا بھی چانگ چن کو بھلی لگی۔ یہ خوبصورت منظر فن کار کی روح کو جگانے کے لیے کافی تھا مگر اس میں رادھا کی ہلکے ہلکے جھومتی ہوئی چال، اس کے بھرے ہوئے جسم کے سڈول خطوط، اس کی گردن کا خم اور سر پر رکھی ہوئی تانبے کی گاگر کی سنہری چمک، یہ سب مل کر ایک پرکشش تصویر بن گئے تھے کہ چانگ چن کو ایسا محسوس ہوا کہ پچھلے کئی برس سے درختوں اور جھیلوں اور پرندوں کی جو تصویریں وہ بناتا آیا تھا، وہ سب بے کار تھیں اور جھوٹی تھیں اور اس کے دماغ میں ایک نئی حقیقت بجلی کی طرح کوندگئی کہ دنیا کا کوئی خوبصورت منظر بھی انسان کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس نے سوچا، اس وقت کی تصویر سے اگر رادھا کی اٹھلاتی ہوئی چال کو نکال دیا جائے تو یہ پہاڑ، یہ بادل، یہ کھیت، یہ قدرت کا حسن ماند پڑ جائے گا۔ یہ تصویر بے جان ہو جائے گی۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے تھیلے سے کاغذ اور برش اور رنگوں کی ڈبیاں نکالیں اور کتنے ہی مہینوں کے بعد اس کی لمبی پتلی فنکارانہ انگلیاں تیزی سے اپنا کام کرنے لگیں۔ ادھر رادھا نے پگڈنڈی کے موڑ سے پیچھے گھوم کر دیکھا تو پردیسی کو تصویر بناتے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ اس کی سہیلیاں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر سب اسے چھیڑنے لگیں۔

''کون تھا وہ پردیسی جو تجھے اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا''۔ ایک نے پوچھا۔

اور رادھا نے ناک سکوڑ کر جواب دیا ''چپٹی ناک، پگلی ہے۔ کوئی تصویریں بناتا ہے''۔

اور یہ سن کر وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ان کی ہنسی کی لہریں دھان کی بالیوں کو گدگداتی ہوئی چانگ چن تک پہنچیں تو کئی برس کے بعد وہ پہلی بار ازخود مسکرا دیا اور اس کے زرد رنگ کے برش کی مار سے اس کی تصویر میں سنہری گاگریں چمک کر مسکرادیں اور پھر اس نے ہرے رنگ کا برش اٹھایا اور لمحہ بھر میں دھان کی بالیاں خوشی سے جھوم اٹھیں اور اس رات مٹھ میں واپس جا کر چانگ چن نے گیرو کپڑے واپس کر دیئے اور مٹھ کے بڑے بھکشو سے کہا:

''باباجی! دنیا کو تیاگ کر آپ بے شک سچائی کی تلاش کر رہے ہیں مگر میں فنکار ہوں مجھے تو اسی دنیا میں سچائی کو ڈھونڈنا ہے''

اور پندرہ مہینے کے بعد جب اس کا بھکشو دوست سارا ہندوستان گھوم آیا تو اس نے چانگ چن کو اسی گاؤں میں پایا جہاں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔

بھکشو نے حیرانی سے پوچھا "چانگ چن تم یہیں ہو میں تو سارا بھارت گھوم آیا"۔

چانگ چن نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "میں نے تو اسی گاؤں میں ہندوستان بھر کو دیکھ لیا بھکشو بھائی"۔

بھکشو نے کہا "یہ بڑا عجیب ملک ہے بھائی۔ یہاں کے لوگ اتنے ایماندار ہیں کہ اپنے گھروں میں تالا نہیں لگاتے"۔

اور چانگ چن نے ایک انوکھی گہری مسکراہٹ سے کہا "اس سے بھی عجیب اور اچھی بات یہ ہے کہ اپنے دل کے کواڑ بھی کھلے رکھتے ہیں"۔

بھکشو نے کہا "جہاں کہیں میں گیا اور میں نے پانی مانگا مجھے پینے کے لیے دودھ ملا"۔

چانگ چن نے مڑ کر رادھا کی طرف دیکھا جو اس کے جھونپڑے سے ایک کلسا اور پیالے لیے چلی آ رہی تھی اور کہا "رادھا بھکشو بھائی کے لیے دودھ لے آئی" اور بھکشو کے چہرے پر حیرانی دیکھتے ہوئے کہا "یہ تمھاری بھابی ہے بھکشو بھائی"۔

بھکشو نے ہندوستانی انداز سے رادھا کو نمسکار کرتے ہوئے کہا "مبارک ہو یہ چین اور بھارت کی شادی" اور پھر اپنی یاترا کا حال بیان کرتے ہوئے اس نے کہا "بھائی، پاٹلی پترا اور کنوج اور کاشی کے مندروں کے کلس اصلی سونے کے ہیں اور سورج کی روشنی میں ایسے چمکتے ہیں..... "

"..... جیسے میری رادھا کی گاگر"؟ چانگ نے ہنستے ہوئے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا جو کنوئیں پر پانی بھرنے جا رہی تھی۔

'اور' بھکشو بولتا گیا "جھیل مانسروور اتنی گہری ہے اتنی گہری ہے.... "

"..... جتنی میری چنگو کی آنکھیں؟" چانگ چن نے اپنے ننھے بچے کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

چنگو کی آنکھیں اپنے باپ کی طرح پتلی اور چھوٹی تھیں لیکن اپنی ماں کی طرح گہری اور چمکیلی تھیں۔

بھکشو نے کپڑے میں بندھی ہوئی پوتر پوتھیوں کو کھولتے ہوئے کہا ''بھارت والوں نے سچ مچ اٹل سچائی کو تلاش کر لیا ہے''۔

'ٹھیک ہے' چانگ چن بولا ''مگر صحیح سچائی پالی اور سنسکرت کی ان پرانی کتابوں میں ہی نہیں ہے۔ سچائی اس پرانے برگد کے پیڑ میں بھی ہے جس کے سائے میں اس قوم کے بچے نہ جانے کتنے وقت سے کھیلتے چلے آ رہے ہیں۔ سچائی اس سامنے والی چوپال میں بھی ہے جہاں اس گاؤں کے بڑے بوڑھے آپس میں بات چیت کر کے اپنے گاؤں کے سب بڑے اور چھوٹے فیصلے کرتے آئے ہیں'' اور پھر پاس پڑے ہوئے ڈھیر میں سے ایک مٹھی بھر کر کہا: سچائی دھان کے ان دانوں میں بھی ہے جو میرے اور رادھا کی اکٹھی محنت سے ہمارے کھیت میں پیدا ہوئے ہیں، جہاں سچی محنت ہے، سچی خوشی ہے، سچی محبت ہے''۔

مگر رادھا کی سچی محبت بہت دنوں پروان نہ چڑھ سکی۔ ایک دن چانگ چن کھیت سے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں اسے زہریلے سانپ نے ڈس لیا۔ رادھا روتی چیختی اپنے پتی کے پاس پہنچی اور زخم پر ہونٹ رکھ کر زہر چوس کر نکالنے کی کوشش میں لگ گئی مگر کافی زہر سارے بدن میں سرایت کر چکا تھا۔ رادھا کو جب یہ معلوم ہوا کہ اب چانگ کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اس کی آنکھوں کے آنسو ایک دم سوکھ گئے اور اس کے چہرے پر ایک عجیب خاموشی چھا گئی اور اس نے ایک بار پھر زہریلے زخم کو منہ لگا دیا اور اس بار جتنا زہریلا خون چوس سکی، اس نے اسے باہر تھوکا نہیں، شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئی۔ شام ہوتے ہوتے دونوں نے جان دے دی۔ مگر مرنے سے پہلے چانگ چن نے بھکشو کو بلا کر کہا ''بھائی میں تو اب چین کبھی واپس نہ جاؤں گا تم چنگو کو ساتھ لیتے جانا اور اسے اپنے بیٹے کی طرح پالنا اور.....اور..... '' مرتے ہوئے ہاتھوں سے ٹٹول کر اس نے پاس کے ڈھیر سے ایک مٹھی دھان اٹھا لیے اور کہا اور یہ دھان لے جانا اور میرے کھیت میں بونا۔ ان دانوں میں میرا اور رادھا کا خون اور پسینہ ہے۔ یہ ہماری محبت کی نشانی ہے''۔

اور اس طرح چنگو اور ہندوستانی دھان کے وہ مٹھی بھر دانے اس بھکشو کے ساتھ چین پہنچے۔ چنگو بڑا ہوا تو خود کھیتی کرنے لگا لیکن اپنے ماں باپ کی یاد اس کے دل میں برابر قائم رہی اور جو دھان وہ بوتا تھا وہ انھیں مٹھی بھر دانوں کی اپج تھے جو چانگ چن نے ہندوستان سے بھیجے تھے اور

اس لیے چنکو کو گاؤں والے بھارتی چنکو کہتے تھے اور سینکڑوں برس تک اس کے کھیت کے دھان 'بھارتی دھان' کہلاتے رہے۔ میں بھی اسی بھارتی دھان کا ایک دانہ ہوں۔ چنکو کی عمر کوئی نوے برس کی ہوئی اور جب وہ مرا تو اس کے نو بیٹے، پانچ بیٹیاں اور ان گنت پوتے پوتیاں۔ دو بیتے دو بیتیاں تھے۔ اگلے زمانہ میں اس خاندان کی نسلیں خوب پھلی پھولیں مگر انیسویں صدی میں ایسا بھیانک قحط پڑا کہ بھارتی چنکو کی اولاد کو اپنی زمین زمیندار 'لوفان' کے ہاتھ بیچنا پڑی جو بھینگے پکین چیاؤ اور گل لالہ کی اولاد میں سے تھا۔ اس کے بعد بھارتی چنکو کا خاندان، پیکنگ سے لے کر کینٹن اور شنگھائی اور ہانگ کانگ تک تتر بتر ہو گیا اور ان کے کھیتوں کے 'بھارتی دھان' لوفان کے ہاتھوں بک کر اب دوسرے ملکوں میں بھیجے جانے لگے۔

بھارتی چنکو کی تیئسویں پیڑھی میں ڈاکٹر چنگ ماؤ تھا جو انگریزی اسکولوں میں پڑھا تھا اور یورپ کی یونی ورسٹیوں میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ جب ڈاکٹر چنگ پڑھ لکھ کر کینٹن واپس آیا تھا، اس نے اپنے ملک کو بڑی بری حالت میں پایا۔ مانچو بادشاہ پیکنگ میں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کروڑوں کسان زمین داروں اور ساہوکاروں کے فولادی شکنجے میں پھنسے ہوئے تھے اور سارے ملک کے شہروں اور ان کے بیوپار پر غیر ملکی سامراجیوں کا قبضہ تھا۔ مانچو برائے نام ہی بادشاہ رہ گئے تھے۔ دراصل ان دنوں چین پر غیر ملکی حکومت تھی اور جب کبھی بھی جنتا اپنے حقوق کے لیے سر اٹھاتی اور آواز بلند کرتی۔ مانچو راجے غیر ملکی بندوقوں کی مدد سے ان کو کچل دیتے۔ ان دنوں ڈاکٹر سن یات سین جنھیں ملک بدر کیا ہوا تھا، اپنے ساتھیوں کی مدد سے چپکے چپکے انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر چنگ، سن یات سین کے خاص ساتھیوں میں سے تھا۔ وہ اور اس کی بیوی چین سنگ انقلابی پارٹی کے سب سے جوشیلے کارکنوں میں سے تھے۔ ان کا مکان انقلابی پارٹی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ہر رات باہر کے کمروں کی بتیاں بجھا کر تہہ خانے میں ان کی میٹنگ ہوتی تھی۔ باہر سے ان کے انقلابی ساتھی جب پولیس سے چھپتے چھپاتے کینٹن آتے تو ڈاکٹر چنگ ان کا کوئی فرضی نام اپنے رجسٹر میں لکھ کر انھیں اپنے اسپتال میں داخل کر لیتا، جن کی تصویریں پولیس کے اشتہاروں میں نکل چکی تھیں، ان کے چہروں پر پٹیاں باندھ دی جاتیں جیسے کوئی بڑا گہرا زخم آیا ہے یا وہ دن بھر کمبل میں منہ لپیٹے لیٹے رہتے جیسے بڑا سخت بخار ہو۔

ڈاکٹر چنگ اور ان کی بیوی چین سنگ کو دنیا میں صرف دو چیزوں سے پیار تھا۔ ایک انقلاب سے جس کے لیے وہ اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار تھے دوسرے اپنی چار برس کی بچی چنگ لان سے۔ جب کبھی بھی انھیں اپنے ڈاکٹری اور سیاسی کاموں سے فرصت ملتی وہ چنگ لان کے ساتھ نت نئے کھیل کھیلتے۔ اس کا بہلانے کے لیے رنگین کاغذوں کی لالٹینیں بناتے۔ اسے تصویروں کی کتابیں دکھاتے اور جب موسم اچھا ہوتا تو اسے کٹھ پتلیوں کا تماشا دکھانے لے جاتے۔ ابھی سے انھوں نے طے کرلیا تھا کہ بڑی ہو کر ان کی بیٹی لیڈی ڈاکٹر بنے گی۔ چن لان بچپن میں بڑی نٹ کھٹ تھی آنکھ بچا کر گھر سے اسپتال میں پہنچ جاتی اور وہاں اپنی حرکتوں سے مریض کو ہنساتی رہتی اور جب رات کو انقلابی پارٹی کی چھپی بیٹھک ہوتی تو ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی، اپنے ماں باپ اور ان کے ساتھیوں کی باتیں سنتی رہتی۔ ابھی وہ لفظ 'انقلاب' کا مطلب تک نہ سمجھ سکتی تھی لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ اس کے ملک کی غریب جنتا کے دوست ہیں۔ انقلاب اور ڈاکٹر سن یات سین۔

شاہی پولیس کے جاسوس پتہ لگاتے لگاتے ایک دن ڈاکٹر چنگ کے گھر پہنچ ہی گئے۔ اس انقلابی اڈے پر ہتھیار بند سپاہیوں نے چھاپہ مارا لیکن خوش قسمتی سے اس وقت گھر میں نہ ڈاکٹر چنگ تھا اور نہ ان کے انقلابی ساتھی۔ صرف چین سنگ تھی اور ننھی چنگ لان جو بیٹھی اپنی گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ چین سنگ نے جیسے ہی پولیس اور موٹروں کو آتے دیکھا۔ وہ سیدھی تہہ خانے کی طرف بھاگی جہاں انقلابی کتابیں ہی نہیں بلکہ انقلابیوں اور انقلابی اڈوں کے نام اور پتوں کی فہرست بھی تھیں۔ چین سنگ نیچے خطرناک کاغذات کو جلدی جلدی پھاڑ اور جلا رہی تھی۔ جب پولیس والے اوپر کمرے میں آ گھسے۔ چنگ لان کو کیا معلوم یہ لوگ یہاں کس لیے آئے ہیں؟ وہ ان کی وردیاں اور ان پر لگے ہوئے تمغوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگی جیسے وہ سب کسی ڈرامے کے ایکٹر ہوں.... لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ڈرامہ کیسا بھیانک ہوگا پولیس انسپکٹر نے اپنی افیمی آنکھوں کو دھیرے دھیرے کھولتے ہوئے کہا۔

''ننھی خوبصورت بچی! تمھارے پتا جی کہاں ہیں؟''

چنگ لان نے بھولے پن سے کہا ''وہ تو کل رات سے باہر گئے ہوئے ہیں''۔

انسپکٹر نے اپنے زرد اور غلیظ دانت دکھاتے ہوئے پوچھا ''بھلا کہاں گئے ہیں تمھارے پتا جی؟ ہمیں تو ان سے بڑا ضروری کام تھا''۔

اور چنگ لان نے اپنی گڑیوں کو الگ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ''یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن انقلاب آنے والے ہیں ناضرور ان کو لینے گئے ہوں گے''۔

انسپکٹر کی مسکراہٹ میں زہر گھلا ہوا تھا۔ اپنے سپاہیوں کی طرف آنکھ مارتے ہوئے اس نے کہا ''شاباش بچی شاباش! تم بڑی ہوشیار ہو۔ بھلا یہ تو بتاؤ تمھاری ماں کہاں ہے؟''

چنگ لان گڑیوں کو ان کے گھر میں بند کر کے کھڑی ہوگئی ''وہ تو ابھی نیچے تہہ خانے میں گئی ہے''۔

''تہہ خانہ'' انسپکٹر نے حیرانی سے الفاظ دہرائے۔

''ہاں ہاں تہہ خانے میں۔ وہیں تو پتا جی اور چاچا چانگ اور ماما ماؤ اور ماں سب انقلاب صاحب کی باتیں کرتے ہیں''۔

اس نے سوچا یہ لوگ بھی کتنے گھبرائے ہوئے اور جلد باز ہیں کہ پوری بات سنی بھی نہیں اور نیچے تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگے۔ شاید یہ بھی انقلاب صاحب کے ساتھی ہوں گے ممکن ہے ان کے آنے کی خبر پا کر آئے ہوں اور اس لیے انھیں ماں سے ملنے کی جلدی ہو۔ یہ سوچ کر وہ مسکرادی آج انقلاب صاحب کے اتنے سارے ساتھی اکٹھے آگئے ہیں۔ ماں کو ان سب کے لیے کھانا بنانا پڑے گا۔

اگلے لمحے اسے اپنی ماں کی ایسی بھیانک چیخ سنائی دی کہ اس کا ننھا سا دل دہل گیا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ اب بھی جمی رہی جیسے غروب آفتاب کے بعد تھوڑی دیر تک دھوپ باقی رہتی ہے.... لیکن جیسے وہ جھوٹی اور دھوکے باز ہوتی ہے، ویسے ہی یہ مسکراہٹ بھی ایک دھوکا تھی۔ جیسے کسی مُردے کے چہرے پر ایک ہنستی ہوئی نقاب چڑھا دی جائے.... اس لمحے میں ننھی چنگ لان کا دل بھی مر چکا تھا۔ اس کی ماں کی چیخ میں غم بھی تھا اور غصہ بھی۔ حیرانی بھی تھی اور نفرت بھی۔ خوف بھی اور دلیری بھی، پکار بھی اور فریاد بھی لیکن چنگ لان کے لیے اس چیخ میں اس کی مات کی موت کا اعلان تھا۔ نہ جانے کیوں اسے ایک دم یقین ہوگیا کہ اس کی ماں مرگئی

ہے اور اس افیمی آنکھوں والے اور زرد اور غلیظ دانتوں والے انسپکٹر نے اسے مار ڈالا ہے اور موت کے خوف اور تنہائی کے احساس نے بچّی کا گلا اس طرح دبایا کہ اس کے منہ سے چیخ نہ نکل سکی اور نہ وہ سسکی لے سکی۔ اس کے پاؤں جیسے پتھر کے ہو گئے اور وہ نہ تو ماں کی مدد کے لیے تہہ خانے کی طرف بھاگ سکی اور نہ کپاؤنڈروں وغیرہ کو آواز دینے کے لیے اسپتال کی طرف.....۔

کچھ دیر بعد پولیس والے کاغذوں کے پلندے چھاپنے کی مشین اور کتنی ہی کتابیں لیے تہہ خانے سے باہر نکلے تو چنگ لان اب بھی اسی طرح کھڑی تھی۔ غیر فطری بھیانک مسکراہٹ اب تک اس کے ہونٹوں پر ایک مُردہ جونک کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ انسپکٹر بڑے اطمینان سے اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوا اوپر آرہا ہے اور اس کی افیمی آنکھوں میں ایک عجیب اور زہریلی چمک ہے جیسی چنگ لان نے صرف ایک بار ایک ہجوم میں شیطان کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

اس بار انسپکٹر اور سارے سپاہی چنگ لان سے کوئی بات کیے بغیر باہر نکل گئے اور سارے گھر پر سناٹا چھا گیا۔ اب چنگ لان دھیرے دھیرے ڈرتے ہوئے قدموں سے تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے گئی۔ کمرے میں ایک ننگا بلب زرد روشنی بکھیر رہا تھا اور اس روشنی میں چنگ لان کو زمین پر پڑی ہوئی اپنی ماں کا مردہ چہرہ ایسا لگا جیسے وہ ابھی زندہ ہی ہو، جیسے وہ ابھی بول اٹھے گی۔ اس کی آنکھیں حیرانی سے کھلی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹ نفرت سے بھنچے ہوئے تھے اور اس کی مٹھیاں بند تھیں اور اس کے پھٹے ہوئے سفید کپڑوں پر تازہ خون کی لالی کے دھبے تھے۔

چنگ لان کو معلوم تھا کہ جب رشتہ دار مر جاتے ہیں تو سب روتے ہیں، پیٹتے ہیں، ہائے ہائے کرتے ہیں، پچھلے برس جب اس کے بوڑھے دادا وفات پا گئے تھے تو گھر میں کتنا رونا پٹنا ہوا تھا مگر کوشش کرنے پر بھی چنگ لان اپنی آنکھوں میں آنسو نہ لا سکی۔ اس بھیانک مسکراہٹ کی مردہ جونک اب تک اس کے ہونٹوں پر چمٹی ہوئی تھی لیکن اس کے دل میں کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی خوشی اور اس کی معصومیت۔ ایک پل میں اس کا بچپن بچھڑ گیا تھا۔

چین سنگ جیسے کتنے ہی شہیدوں کی قربانیاں آخر رنگ لائیں۔ انقلاب کامیاب ہوا۔ مانچو بادشاہوں کی بادشاہت ختم ہوئی اور چین میں لوک راج قائم ہو گیا۔ ڈاکٹر سن یات سین پہلے

پریسیڈنٹ چنے گئے اور ایک دن جب وہ اپنے دوست ڈاکٹر چنگ کے یہاں کھانا کھانے آئے تو انھوں نے بڑے پیار سے ننھی چنگ لان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جب ڈاکٹر سن یات سین نے چنگ سے کہا کہ اپنی سرکار کے محکمۂ صحت کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تو چنگ لان نے دیکھا کہ اس کے پتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ان کی آنکھیں دیوار پر لٹکی ہوئی اپنی بیوی کی تصویر کی طرف گھوم گئیں اور انھوں نے کہا چین سنگ ہمیشہ یہی خواب دیکھا کرتی تھی۔ کہتی تھی انقلاب کے بعد تم ڈاکٹر سن کی سرکار میں محکمۂ صحت کے انچارج ہو گے۔ تب ہی تم اپنی ڈاکٹری سے اپنے ملک کی خدمت کر سکو گے' ڈاکٹر سن نے بات بدلتے ہوئے کہا ''دیکھو چنگ اپنی بیٹی کو ضرور ڈاکٹری کی تعلیم دینا۔ کیوں بیٹی تم لیڈی ڈاکٹر بنو گی نا؟''

اور ایک دن ڈاکٹر سن بھی چل بسے۔ انقلاب کے بعد ردِ عمل کا دور آیا۔ کسان مزدوروں کی طرف داری کرنے والے چُن چُن کر حکومت کے محکموں سے نکال دیئے گئے اور ایک بار پھر ڈاکٹر چنگ ماؤ کا نام خفیہ پولیس کے دفتر میں مشتبہ لوگوں کی فہرست میں لکھ دیا گیا۔ چنگ لان جو اب پیکنگ کے میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی۔ چھٹیوں میں گھر آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے پتا کے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ چہرے پر جھرّیاں بھی آ گئی ہیں مگر ان کا انقلابی جوش اب تک کم نہیں ہوا۔ اب بھی ان کے گھر کے تہہ خانے میں انقلابی جمع ہوتے تھے۔ اب بھی پولیس سے بچنے کے لیے انقلابی نوجوان ڈاکٹر چنگ کے اسپتال میں مریض بن کر رہتے تھے۔ چنگ لان نے سوچا کہ انقلاب بھی ہوا لیکن ہم وہیں کے وہیں ہیں۔ اگر جلد اس حکومت کا تختہ نہ پلٹا گیا تو مانچو حکومت کی طرح زمین داروں، ساہوکاروں اور غیر ملکی سامراجیوں، پٹھوؤں کی حکومت کسانوں، مزدوروں کا خون چوستی رہے گی۔ اب وہ نہ صرف سیاسی باتوں کو سمجھنے لگی تھی بلکہ ان میں حصہ بھی لیتی تھی۔ اس کے پتا نے ایک دن اس سے کہا ''چنگ لان میں سوچ رہا ہوں، ہم لوگ یہاں سے نکل کر شمال کی طرف چلے جائیں۔ وہاں کئی صوبوں میں کسانوں اور مزدوروں نے اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ اپنی فوج بنالی ہے اور وہ اس رجعت پسند مرکزی سرکار کی فوجوں کا سامنا کر رہے ہیں۔

لیکن ابھی وہ کینٹن چھوڑنے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ ایک دن پولیس نے چھاپا مارا

اب وردیاں بدل گئی تھیں۔ وارنٹ مانچو مہاراج کی طرف سے نہیں حکومت کے صدر کی طرف سے جاری کیے گئے لیکن جیسے ہی پولیس کے سپاہیوں کا گروہ ان کے گھر میں داخل ہوا چنگ لان نے انسپکٹر کو پہچان لیا۔ یہ وہی افیمی آنکھوں والا اور زرد دانتوں والا تھا، جس نے چودہ برس پہلے بھی ایک دن اسی طرح اسی جگہ پر چھاپا مارا تھا۔ ڈاکٹر چنگ کو قید کرلیا گیا اور جب اسے باہر لے جایا جا رہا تھا تو اس نے صرف ایک نظر اپنی بیٹی کی طرف ڈالی اور کہا "چنگ لان گھبرانا مت" چنگ لان اس کا مطلب سمجھ گئی اس کا پتا اس کو حکم دے رہا تھا کہ وہ شمال کے انقلابی ساتھیوں سے جا ملے اور اسی رات کو اس سے پہلے کہ پولیس والے دوبارہ اس کے مکان پر چھاپہ ماریں، وہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ دوسرے دن ڈاکٹر چنگ کو غداری کے جرم میں پچیس دوسرے انقلابی ساتھیوں کے ساتھ گولی ماردی گئی۔

ماں کی موت، پتا کا قتل، گھر کا چھننا، کالج کی پڑھائی کا بند ہونا، چنگ لان کے دل پر کتنے پرانے اور نئے گھاؤ تھے۔ اس کا خیال تھا کہ شمال میں پہنچ کر وہ کچھ دن اطمینان کا سانس لے سکے گی مگر ابھی اس نے ایک فوجی اسپتال میں نرس کا کام کرنا شروع کیا تھا کہ مرکزی حکومت کی فوجوں نے زبردست ہلّہ بول دیا۔ انقلابی چاروں طرف سے گھر گئے۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو ہار مان لیں یا رات ہی رات اونچی پہاڑیوں کو پار کرتے ہوئے اس علاقہ سے شمال کی طرف بڑھ جائیں اور کہیں دور پہاڑوں میں نئے سرے سے اپنے کسان مزدور راج قائم کریں۔ ان کی فوج کے کمانڈروں نے کوچ کا حکم دیا اور رات کے اندھیرے میں یہ انوکھا کارواں چل پڑا۔ یہ لوگ خانہ بدوش ہی نہیں تھے اور نہ صرف اپنا گھر بار کندھے پر اٹھا کر چل رہے تھے بلکہ یہ ایک نئی طرز حکومت، ایک نیا نقطۂ نظر، ایک نئی دنیا کو ساتھ لے کر پہاڑوں، ندیوں، ریگستانوں، جنگلوں اور میدانوں کو عبور کرتے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ان پر کیا کچھ نہ گزری۔ بھوک، پیاس، بیماریاں، دشمن کی فوجوں کے حملے پر حملے، ہوائی جہازوں کی بمباری، ہزاروں نے راستے میں جان دے دی۔ باقی سب اتنی تکلیفوں کو جھیلتے جھیلتے کانٹا ہو گئے۔ اب نرس کی حیثیت سے چنگ لان کو اپنی ڈاکٹری کا تھیلا لیے ہر وقت ڈیوٹی پر رہنا پڑتا تھا۔ اس کی آنکھوں نے اتنا دکھ درد اور بیماری اور لاچاری دیکھی کہ اس کے چہرے سے ہی نہیں آنکھوں سے

بھی مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے غائب ہوگئی۔ جوؤں سے تنگ آ کر اس نے اپنے کالے چمکیلے بال، لڑکوں کی طرح چھوٹے کر ڈالے۔ جب اس کے سب گاؤن پھٹ گئے تو اس نے بھی انقلابی فوج کے سپاہیوں کی وردی پہن لی۔ جاڑوں بھر ایک ہی روئی بھرا کوٹ پہنے رہی۔ اسی کو پہن کر سوتی، اسی میں کام کرتی۔ کوچ کے دن تک نہانے کا موقع نہ ملا۔ آخر ایک دن وہ ینان پہنچ گئے۔ یہ جگہ اتنی دور اور پہاڑوں کے گھرے ہونے کی وجہ سے دشمن کے حملوں سے بچی ہوئی تھی اور آس پاس کے گاؤں والے بھی انقلابیوں کے ساتھ تھے۔ انقلابی فوجوں نے یہیں ڈیرا ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں رہنے کو مکان نہیں تھے۔ اس لیے دفتر اسپتال اور سونے کے کمرے، سب پہاڑوں میں غاریں کھود کر بنائے گئے اور کئی ماہ کے بعد چنگ لان نے آئینہ دیکھا تو ایک لمحہ کے لیے تو اسے خود اپنا جھلسا ہوا چہرہ پہچاننا مشکل ہو گیا۔

چنگ لان اب کام کرنے کی ایک مشین بن گئی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اس دکھ اور بے انصافی کی دنیا میں محبت، نزاکت، سنگھار، سیر کا نہ وقت رہا ہے، نہ جگہ۔ دن، ہفتے، مہینے، برس گزر گئے قحط پڑا اور باڑوں میں سیلاب آئے۔ جاپانی حملہ ہوا۔ نصف سے زیادہ ملک پر جاپانی سامراج کا قبضہ ہو گیا۔ مرکزی سرکار کو مجبور ہو کر انقلابیوں سے سمجھوتہ کرنا پڑا، تا کہ سارا ملک اکٹھا ہو کر غیر ملکی حملہ آوروں کا سامنا کر سکے۔ گھمسان کی جنگ ہوئی، انقلابی گوریلا دستوں نے کتنے ہی دشمن مارے۔ جاپانیوں سے کتنا ہی جنگ کا سامان چھین کر اسے انھیں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ لوک راج کا اکٹھا مورچہ قائم ہو گیا اور ساری دنیا چینی کارناموں سے گونج اٹھی۔ چنگ لان اپنے اسپتال میں ان بہادروں کی مرہم پٹی کرتی رہی لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک نہ آئی۔

بوڑھا ڈاکٹر فاہین کبھی کبھی اس سے ہنس کر کہتا، چنگ لان تم تو جوانی میں ہی بوڑھی ہوگئی ہو، تو وہ چپ رہتی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ماتا پتا اور کتنے ہی ساتھیوں کے مردہ چہرے گھومتے رہتے۔

اور پھر ایک دن وہ کام پر گئی تو دیکھا کہ بوڑھے ڈاکٹر فاہین کی جگہ ایک سانولا اجنبی ڈاکٹر بیٹھا ہوا ہے۔

''ڈاکٹر فاہین کہاں ہیں؟'' چنگ لان نے چینی زبان میں کہا۔
اجنبی نے انگریزی میں جواب دیا ''معاف کرنا میں ابھی سمجھ نہیں سکا''۔
چنگ لان نے اپنا سوال انگریزی میں دہرایا۔
'اوہ ڈاکٹر فاہین' نوجوان نے جواب دیا۔'وہ بوڑھے ہو گئے ہیں اور تھک گئے ہیں۔ اکیلے دن رات کام کر رہے ہیں۔ انھیں کچھ دن آرام کرنا چاہیے۔ میں ان کی جگہ کام کروں گا اگر تمھیں کوئی اعتراض نہ ہو' یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور اس کے سانولے چہرے پر موتیوں جیسے سفید دانت کھل گئے۔
''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے'' چنگ لان نے کہا اور کام میں مصروف ہو گئی۔
سات برس لگا تار کام کرنے کے بعد چنگ لان نرسنگ میں طاق ہو چکی تھی۔ ایک آپریشن کے بعد ہاتھ دھوتے ہوئے نئے ڈاکٹر نے کہا ''شاباش لڑکے تم کافی ہوشیار معلوم ہوتے ہو۔ مگر کیا لڑکیاں نرسنگ کا کام کرنا پسند نہیں کرتیں''۔
''کرتی ہیں ایک میں ہی آپ کے سامنے موجود ہوں''۔
'تم ـــ تم تو لڑکے ہو' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔ ''بھئی تم لڑکی ہو تو میں الو ہوں، صبح سے تمھیں لڑکا سمجھ رہا ہوں مگر یہ بال، یہ کپڑے، چین میں لڑکیاں ایسے کپڑے تو نہیں پہنتیں''۔
''نہیں، ریشمی فراک بھی پہنتی ہیں۔ وہ لڑکیاں جن کے ماں باپ جاپانیوں کے پٹھو ہیں اور اب تک ہانگ کانگ اور شنگھائی میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں''۔
اجنبی نوجوان کو جواب نہ سوجھا۔ بولا ''معاف کرنا۔ بات یہ ہے کہ میں یہاں نیا ہوں۔ ابھی ہندوستان سے آیا ہوں۔ تم نے سنا ہوگا وہیں سے میڈیکل مشن آیا ہے نا''۔

ہندوستان!
دنیا کے نقشے میں ایک سرخ دھبہ!
جغرافیہ کی کتاب میں ایک سبق!

کینٹن اور ہانگ کانگ میں داڑھی والے سکھ پولیس کے سپاہی۔ اس زمانہ میں عام چینی ہندوستان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہ جانتے تھے اور نہ ہی جاننے میں کوئی دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر جب کبھی چنگ لان ہندوستان کا ذکر سنتی۔ اس کی یاد میں کہیں بہت دور گھنٹیاں سی بجتے

لگتیں۔ ریشمی سریلی چاندی کی گھنٹیاں جیسے وہ آوازیں نہ ہوں، آوازوں کی پرچھائیاں ہوں اور اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ایک ریشمی تار اس کے اور ہندوستان کے بیچ میں بندھی ہوئی ہے جو مکڑی کے جالے کے تاروں سے بھی باریک اور نازک ہے لیکن جسے وہ کوشش کرنے پر بھی توڑ نہیں سکتی۔

اس نے اپنے پتا سے سنا تھا کہ سیکڑوں برس پہلے ان کے بزرگوں میں سے ایک ہندوستان گیا تھا اور وہاں اس نے ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کی تھی اور یہ کہ وہ سب اسی شادی کی پیداوار ہیں۔ اس نے 'بھارتی چنگو' کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ کبھی انقلاب ہوا تو 'بھارتی دھان' کی زمین کو اب بھی زمین دار کے چنگل سے چھڑایا جا سکتا ہے۔ تیرہ سو برس میں محبت کا تار کھنچتا کھنچتا اتنا مہین ہو گیا تھا کہ اب دکھائی نہ دیتا تھا۔ چنگ لان کے چینی خون میں شاید ایک بوند سے بھی کم ہندوستانی خون ہوگا لیکن ہندوستان کا نام سن کر یہ بوند اب بھی اس کے خون میں ایک عجیب ہیجان پیدا کر سکتی تھی۔ اور جب اس اجنبی ڈاکٹر نے کہا کہ وہ ہندوستان سے آیا ہے تو چنگ لان کے خون میں اس ہندوستانی خون کی بوند نے جوش کھایا اور اس کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔

"کیوں کیا تمھیں حیرانی ہوئی ہے کہ میں ہندوستان سے آیا ہوں؟"

"نہیں نہیں میں سوچ رہی تھی کہ میں بھی ہندوستان ہی سے آئی ہوں"۔

"تم؟" وہ سمجھا یہ عجیب چینی لڑکی مذاق کر رہی ہے۔

'ہاں میں' اور نہ جانے کتنے برسوں کے بعد چنگ لان کا جی چاہا کہ وہ کسی سے بات چیت کرے۔ اسے اپنے خاندان کی عجیب کہانی سنائے اور اس نے اجنبی ڈاکٹر کو اپنے پتا، اپنی ماں، ڈاکٹر سن یات سین اور ان کے انقلابی ساتھیوں کے بارے میں جو کچھ یاد تھا، سب کچھ سنا دیا پھر اپنے بزرگ 'بھارتی چنگو' کے بارے میں 'بھارتی دھان' والی زمین کے بارے میں۔

ہندوستانی ڈاکٹر نے کہا "تب تو ہمارا تمھارا پرانا تعلق نکل آیا۔ ملاؤ ہاتھ میرا نام دوارکا ہے"۔

"اور میرا نام چنگ لان ہے"

اور جب ان کے ہاتھ ملے تو چنگ لان کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ دو ہاتھوں کا ملنا نہیں ہے۔ دو بچھڑے ہوئے ملکوں کا ملاپ ہے جو ایک دوسرے کے دکھ درد میں حصہ لینے کا اعلان کر رہے ہیں۔ دو پرانی تہذیبیں گلے مل رہی ہیں۔ خون خون کو پہچان کر محبت کی آواز میں پکار رہا ہے۔

''دوارکا کی مسکراہٹ میں وہ روشنی اور گرمی تھی جس نے کچھ مہینے میں ہی چنگ لان کے پتھرائے ہوئے دل کو پگھلا دیا۔ اس نے سوچا اگر ہندوستانی ڈاکٹر دس ہزار میل کا سفر کر کے اپنے چینی ساتھیوں کی مدد کے لیے اتنی دور آسکتے ہیں تو آزادی اور انقلاب کے سپنے جھوٹے نہیں ہو سکتے۔ تو انسانیت مری نہیں۔ اس کا دل اب بھی دھڑک رہا ہے۔ اسے ایسا لگا جیسے برسوں بعد اس کے دل اور دماغ پر سے ناامیدی اور لاچاری کے گہرے کالے بادل چھٹ رہے ہوں اور وہ مسکراہٹ جو چار برس کی عمر میں اپنی ماں کی بھیانک موت پر اس کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی دھیرے دھیرے چنگ لان کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

جنگ کے دوران (میں) ہی دوارکا اور چنگ لان کی شادی ہو گئی۔ نہ ہندوستانی شہنائیاں بجیں نہ چینی باجے۔ نہ دولہا کو سہرا پہنایا جا سکا نہ دلہن ڈولے میں سوار ہوئی۔ جاپانی بمباروں کا شیطانی گیت تھا، رات کے اندھیرے میں پھٹتے ہوئے گولوں کی بھیانک آتش بازی، پھٹی میلی فوجی وردی کا سہاگ جوڑا..... اور اپنے ساتھیوں کی نیک تمناؤں کے پھول.... اور چنگ لان اور دوارکا ایک دوسرے کے ہو گئے۔

سال بھر بعد جب ان کا بچہ پیدا ہوا تو چنگ لان نے دوارکا سے کہا۔ اس کا نام ''بھارتی چنگو'' رکھوں گی۔ اپنے اس بزرگ کی یاد میں جو پندرہ سو سال پہلے تمھارے ملک میں پیدا ہوا تھا''۔

''بھارتی چنگو'' بڑا خوبصورت بچہ تھا۔ اس نے رنگت ماں سے لی تھی اور آنکھیں باپ سے اس میں ہندوستان کی شوخی تھی اور چین کی گمبھیرتا بھی۔ وہ ماتا پتا کی آنکھوں کا تارا نہ تھا ساری انقلابی فوج کا لاڈلا تھا۔ جب کبھی دشمن کا حملہ ہوتا ہر افسر اور سپاہی کو سب سے پہلے ''بھارتی چنگو'' کو بچانے کی فکر ہوتی۔ کچھ مہینے کا ہونے پر بھی وہ اتنا عقلمند تھا کہ وہ روتا ہوتا اور کوئی کہتا چنگو چپ چاپ ہو جاؤ، دشمن کے ہوائی جہاز آ رہے ہیں تو وہ فوراً رونا بند کر دیتا۔

جس دن چنگو سال بھر کا ہوا اس دن بڑا زبردست ہوائی حملہ ہو رہا تھا۔ چنگ لان اور دوارکا نے چنگو کو پیار کر کے ڈاکٹر فاہین کی بیوہ کے سپرد کیا اور خود دونوں کام پر چلے گئے۔ اس دن سینکڑوں زخمی اسپتال میں جا رہے تھے۔ رات بھر میں دوارکا نے درجنوں آپریشن کیے اور چنگو لان اس کے ساتھ نرس کا کام کرتی رہی۔ صبح ہوتے ہوتے کام ختم کر کے وہ اپنی غار کو واپس

آ رہے تھے کہ دوارکا نے کہا" چنگ لان اب سونے کو جی نہیں چاہتا۔ آ ؤاس پہاڑی کی چوٹی سے سورج نکلتا ہوا دیکھیں۔ چنگ لان نے آسمان کی طرف دیکھا جس پر سے آہستہ آہستہ تاریکی دور ہوتی جارہی تھی اور کہا، ہاں چلو اب تو حملہ ہونے کا کوئی ڈرنہیں ہے"۔

پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ کر وہ گھاس پر لیٹ گئے۔ نیچے گھاٹی میں ایک پہاڑی جھرنا بہنے کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ وہاں جنگلی پھولوں کے گھاس کی گیلی مٹی کی خوشبو سے پھیلی ہوئی تھی۔ نیلی نیلی پہاڑیوں کے پیچھے بڑھتا ہوا اجالا، سورج کے طلوع ہونے کی خبر دے رہا تھا۔ گھاٹی میں کسانوں کے جھونپڑوں میں چولہوں کا دھواں اٹھنے لگا تھا۔

دوارکا نے چنگ لان کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا" زندگی کتنی خوبصورت ہے چنگ لان اگر کوئی جنگ نہ ہو....."

اور چنگ لان نے کہا۔ ایک گہری ٹھنڈی سانس بھر کر، جس میں حال کے سکھ کے ساتھ ساتھ ماضی کے دکھوں کی اداسی بھی شامل تھی۔

'ہاں دوارکا زندگی بہت خوبصورت ہے اگر جنگ نہ ہو اور بے انصافی نہ ہو....."

اور دوارکا نے چنگ لان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا" تم کتنی اچھی ہو چنگ لان۔ جانتی ہو اس وقت اس خوبصورت منظر میں تم کتنی خوبصورت دکھائی دیتی ہو؟ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمھارے بغیر قدرت کی یہ خوبصورتی بھی ادھوری ہوتی۔ نہ پھولوں میں خوشبو ہوتی، نہ اس منظر میں یہ کشش! تم نہ ہوتیں تو اجالا نہ ہوتا چنگ لان سورج کبھی نہ نکلتا۔"

خوشامدی کہیں کے، چنگ لان نے دوارکا کے چہرے پر سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک طرح سے تم سچ کہتے ہو..... جس کی میں اولاد ہوں اور جو پندرہ سو برس پہلے تمھارے ملک میں گیا تھا۔ وہ بڑا مشہور مصوّر تھا۔ ایک بھکشو نے اس کی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ کبھی انھیں پڑھنا اس میں لکھا ہے کہ چانگ چن کا کہنا تھا کہ قدرت کی خوبصورتی انسان کے بغیر ادھوری ہی نہیں بے جان ہے۔ انسان ہی فطرت میں جان ڈالتا ہے اور اس کی خوبصورتی مکمل کرتا ہے۔

تم کتنی سمجھدار ہو چنگ لان۔ میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جانتی ہو جب میں

یہاں آیا تھا تو صرف ایک کھلاڑی تھا۔ جنگ، امن، آزادی انقلاب ان چیزوں کو اگر اب سمجھنے لگا ہوں تو صرف تمھاری وجہ سے"۔

اور جب تم آئے تھے تو میں ایک جذبات سے عاری مشین تھی جو کام کرسکتی تھی لیکن کچھ محسوس نہ کرسکتی تھی۔ تم نے ہی تو مجھے زندہ کیا ہے دوارکا...."

اور پھر کچھ دیر کے لیے وہ چپ چاپ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنتے رہے۔ کائنات ساکن تھی لیکن پہاڑی جھرنا گنگنا رہا تھا۔ سورج کی کرنیں اب پہاڑی کی چوٹیوں کو چوم رہی تھیں، پھول ہوا میں لہرا رہے تھے، نیچے وادی میں دھان کے کھیتوں میں بھرا ہوا پانی جھلملا رہا تھا۔ زندگی، جھونپڑوں میں سے چولہوں کا دھواں بن کر آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی.... دنیا خاموش تھی اور ان دو پریمیوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

لیکن جنگ کے دیوتا انھیں خوش دیکھ کر کب خوش رہ سکتے تھے دور سے ایک گھوں گھوں کی آواز آئی جیسے کوئی زہریلی مکھی ہو۔ دھیرے دھیرے آوازیں قریب آتی گئیں لیکن اس وقت دوارکا اور چنگ لان ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے مست تھے، جھرنے کی موسیقی میں مگن تھے اور موت سے بے خبر.... موت، جو ایک گرتے ہوئے بم کی شکل میں ان کی طرف بجلی کی تیزی کے ساتھ لپک رہی تھی....

لیکن موت کے دیوتا اس ننھے چراغ کو نہ بجھا سکے جو دوارکا اور چنگ لان کی محبت جلا گیا تھا۔ ان کا بچہ 'بھارتی چنگو' بچ گیا اور آج بھی زندہ ہے اور جب تک وہ زندہ ہے دوارکا اور چنگ لان زندہ ہیں، چانگ چن اور رادھا زندہ ہیں، ان کی محبت زندہ ہے، ہندوستان اور چین کا تعلق زندہ ہے۔

اور اب جب کہ چین کی جنتا نہ صرف سامراجیوں سے بلکہ ظالم زمین داروں اور ساہوکاروں اور افیمی آنکھوں اور زرد دانتوں والے بے رحم پولیس افسروں سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگئی ہے اور کسانوں کو ان کی زمینیں مل گئی ہیں۔ شمال مشرقی چین کے ایک گاؤں میں ایک لڑکا ایک مشترکہ کھیت میں کام کرتا ہے۔ اس کھیت کے دھان دور دور تک مشہور ہیں اور 'بھارتی دھان' کہلاتے ہیں۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ آج سے پندرہ سو برس پہلے.....

اور جب شام کو 'بھارتی چنگو دوم' اسکول میں پڑھنے جاتا ہے اور جغرافیے کے سبق میں بھارت کا ذکر آتا ہے تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتی ہیں اور وہ کہتا ہے ''میرے پتا کا ملک''!

مگر ایک دن اسکول کے ریڈیو پر جب 'بھارتی چنگو' نے سنا کہ بھارت میں قحط پڑ رہا ہے تو اس کی آنکھوں پر دکھ کے بادل چھا گئے۔ اس رات اس نے کھانا نہیں کھایا اور اگلے دن جب کھیت پر اس کے حصے کے دھان ملے تو اس نے انھیں الگ رکھ دیا اور شام کو اسکول کی چھٹی کے بعد اپنے ماسٹر کے پاس گیا اور بولا ''ماسٹر جی! ایک بات بتایئے۔ اگر کسی کا پتا بھوکا مر رہا ہو تو بیٹا کیسے پیٹ بھر کھانا کھا سکتا ہے؟'' اور ماسٹر نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ ''دوست کو بھوکا دیکھ کر دوست بھی چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اس لیے چین سے کئی جہاز چاول کے بھارت کو بھیجے جا رہے ہیں''۔

اگلے دن سویرے جب اس مشترکہ کھیت کے کسان ہل کندھوں پر دھرے کام پر جا رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ ''بھارتی چنگو دوم'' سر پر دھان کی ایک بوری اٹھائے قصبے کی طرف جا رہا ہے۔

''بھارتی چنگو دوم، تم کہاں جا رہے ہو؟''۔

اور اس لڑکے نے جس کی رنگت اپنی ماں کی طرح زرد اور آنکھیں باپ کی طرح بڑی بڑی ہیں کہا ''میں اپنے باپ کو کھانا کھلانے جا رہا ہوں''۔

چینی دانے نے کہا ''بس ساتھیو میری کہانی ختم ہوئی اب ہمارے روسی دوست کی باری ہے''۔

○

# بغیر عنوان کے

کملا کا نیکر نے جب بی۔اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تو گھر میں سب کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی لیکن کملا پر تو جرنلزم کا بھوت سوار تھا۔ بی۔اے کرنے سے پہلے ہی اس کے چند چھوٹے چھوٹے مضامین ''ایوننگ میل'' اور ایک عورتوں کے رسالے میں چھپ چکے تھے۔ دونوں کے ایڈیٹروں کی پیش کش تھی کہ بی۔اے کر کے وہ ان کے اسٹاف میں شامل ہو جائے۔ کملا نے ''ایوننگ میل'' کو ترجیح دی، کیونکہ عورتوں کے رسالے میں تو سب عورتیں ہی تھیں اور اس سے مقابلہ کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ وہ تو مرد رپورٹروں اور سب ایڈیٹروں سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔ اس میں اس کے لیے ایک چیلنج تھا۔ اس لیے اس نے شادی کی تجویز کو ٹھکرا دیا اور ''ایوننگ میل'' کے ایڈیٹر سے ملنے چلی گئی۔

ایڈیٹر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ نام تھا وسنت یادو پربھاکر۔

اس نے کہا ''مبارک ہو مس کا نیکر' آپ فرسٹ کلاس میں پاس ہو گئیں۔ کیا تھے آپ کے سبجیکٹس؟''

''ہسٹری، اکنامکس اور پولیٹکل سائنس۔'' کملا نے نروس ہوئے بغیر جواب دیا۔

یہ مضمون تو جرنلزم کے لیے بہت اچھے ہیں۔ میرے اپنے زمانے میں بھی جرنلزم کے

متوالے یہی مضمون تھے۔

''تو اب کیا کروں؟'' کملا نے معصومیت سے پوچھا۔

کل سے ہمارے یہاں کام شروع کر دیجئے۔ شروع میں ہم صرف چار سو آپ کو دے سکیں گے مگر جیسے جیسے آپ کام سیکھتی جائیں گی، ترقی ہوتی رہے گی۔ ایڈیٹر نے کہا اور ساتھ میں کملا کی طرف ایک چٹ بڑھادی۔ او پر لکھا تھا۔ کملا کانیکر کل سے کام کریں گی۔ تنخواہ چار سو روپے ماہوار

''یہ میرے سکریٹری کو دے دیجئے اور دو سو روپے ایڈوانس لے لیجیے۔''

کملا نے جاتے ہوئے چٹ سکریٹری کو دی۔ اس نے دو سو کے نوٹ نکال کر دے دیے اور ایک رسید دستخط کرنے کے لیے کملا کی طرف بڑھادی۔

اگلے دن سے کملا نے روز ''ایوننگ میل'' کے دفتر جانا شروع کر دیا۔ پہلے چیف رپورٹر سے اس کی ملاقات ہوئی، جس کا نام رام چندرن تھا۔

''نمستے، مسٹر رام چندرن۔''

''نمستے مس کانیکر۔ مجھے ایڈیٹر نے آپ کے کام کے بارے میں بتا دیا ہے۔ آپ فی الحال ہمارے عورتوں کے سیکشن کی انچارج ہوں گی۔''

پہلے اس سیکشن کا کون انچارج تھا؟'' کملا نے بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔

''مس سرسوتی مہتا تھیں۔ بہت اچھا لکھتی تھیں، مگر شادی کر کے جہیز کا شکار ہو گئیں۔

کیا ہوا ان کو؟''

''تفصیل تو معلوم نہیں، مگر جل گئیں یا جلا دی گئیں۔ بہت با سلیقہ لڑکی تھیں۔ اس کا اسٹوو ایکسی ڈینٹ نہیں ہو سکتا تھا۔'' رام چندرن نے اسے بتایا۔ خیر فی الحال تو آپ لیڈیز کے فنکشن اٹینڈ کیجیے۔ پھر ایک مضمون لکھئے ممبئی کے بارے میں مگر عورتوں کے نقطۂ نگاہ سے۔ یہ مضمون جمعہ تک مل جانا چاہیے، کیوں کے یہ ہمارے سنڈے ایڈیشن میں آپ کے نام سے چھپے گا۔ اس طرح ممبئی کی عورتوں سے یہ آپ کا انٹروڈکشن بھی ہوگا۔

بہت اچھا۔ میں کوشش کروں گی کہ مضمون ٹھیک ہی لکھ سکوں۔ مگر شروع میں آپ کو ضرور دکھاؤں گی۔ آپ ذرا درست کر دیجیے گا۔''

''ہاں ہاں۔ وہ سب دیکھ لیا جائے گا۔'' رام چندرن نے سرپرستانہ انداز میں کہا۔

مگر جب شکروار کی صبح کو کملا نے اپنا مضمون جو اس نے رات کو لکھا تھا اور صبح ہی اپنے باپ کے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا تھا' رام چندرن کو پیش کیا تو اس نے دس منٹ میں اسے پڑھنے کے بعد کہا ''اس میں تو ایک بھی جگہ غلطی نہیں ہے۔''

''تھینک یو' سر۔'' کملا نے کہا۔ ''مگر ہیڈ لائن آپ خود کچھ دے دیجئے۔ میری ہیڈ لائن ''ممبئی مائی ممبئی!'' شاید SUBJECTIVE (داخلیت کی غماز) ہوگئی ہے۔''

''یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں آپ نے بمبئی کا نیا نام ممبئی بھی استعمال کر لیا اور یہ بھی بتا دیا کہ آپ بمبئی ہی کی رہنے والی ہیں اور بمبئی سے پیار کرتی ہیں۔''

اگلے اتوار کو کملا کا نیکر کا مضمون اس نوٹ کے ساتھ چھپ گیا۔ ''ہماری نئی رپورٹر ممبئی سے محبت کرتی ہے، کیونکہ اس نے ساری عمر ممبئی ہی میں گزاری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے ممبئی میں کچھ خرابیاں اور سماجی برئیاں نظر نہیں آتیں۔ ہمیں امید ہے کہ کملا کا نیکر کے ذریعے ہم ممبئی کی تمام عورتوں کی نمائندگی کر سکیں گے۔''

کملا کا نیکر یہ پڑھ کر خوش ہوگئی۔ اب ہر روز وہ عورتوں کی مختلف تنظیموں کی رپورٹیں لاتی اور ان کو چھاپتی۔ مگر اتوار کو اس نے ایک اور مضمون عورتوں اور بچوں کے بارے میں لکھا' جس کے لیے اسے کئی لیڈی، ڈاکٹروں سے انٹرویو کرنا پڑا۔ یہ مضمون بھی بہت پسند کیا گیا ان کے بارے میں لکھا۔ دوسرے ہفتے اس نے کولی مچھیرنوں کے سنگٹھن، سے لے کر سوسائٹی لیڈیز کی کٹی پارٹیز، تک کے ہر طبقے کی نمائندگی کی۔

ایک روز کملا کا نیکر کو خیال آیا کہ وہ اپنی پیش رو کے بارے میں کیوں نہ لکھے جو جل گئی تھی یا جسے سسرال والوں نے جہیز کے لیے جلا دیا تھا۔ سرسوتی مہتا کے بارے میں اسے کافی ریسرچ کرنی پڑتی تھی؟ کیا کیا جہیز میں دیا گیا تھا؟ مرتے وقت وہ کون سی ساڑی پہنے ہوئے تھی؟ یہ سب جاننے کے لیے کملا کا نیکر سرسوتی کے باپ کے پاس گئی اور ان سے پوچھا کہ ان کے خیال میں ان کی بیاہتا لڑکی کی موت کیسے ہوئی؟ وہ بے چارہ ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھا جو اپنی بیوی

کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری دن کاٹ رہا تھا۔ اس نے تفصیلات بتائیں۔ جہیز کی رقم پہلے سے مقرر ہوگئی تھی۔ پچاس ہزار روپے شادی کی رات کو ہی دے دیے گئے تھے مگر لالچی سسر نے آخری وقت پر اپنی مانگ بڑھادی تھی۔ اب اسے ڈیڑھ لاکھ درکار تھے تاکہ اس کا امریکہ میں پڑھا ہوا انجینئر بیٹا اپنی ذاتی فیکٹری قائم کر سکے غریب باپ جس نے بیٹی کی شادی کے لیے قرض لے کر پچاس ہزار دیے تھے، ڈیڑھ لاکھ کہاں سے لاتا، اس کے علاوہ کلر ٹیلی ویژن کا بھی مطالبہ تھا جہیز میں ایک بلیک اینڈ وہائٹ ٹی۔وی کا بھی مطالبہ تھا جب کہ دولہا اور اس کے باپ کی مانگ کلر ٹی۔وی کی تھی۔ چنانچہ شادی سے اگلے دن ہی سرسوتی پر مار پڑی۔ بی۔اے پاس لڑکی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی مگر بے چاری اکیلی کیا کرتی؟ دفتر جانا تو شوہر نے پہلے ہی بند کرادیا تھا۔ اب گھر سے نکلنے کی اجازت بھی نہ ملتی۔ بات بات پر شوہر، ساس اور سسر کی گالیاں سننی پڑتیں اور جوتے کھانے پڑتے۔ ایک مہینے کے بعد لڑکی کے باپ کو سمدھی نے فون پر اطلاع دی کہ اس کی بیٹی فلاں اسپتال میں ہے۔

ہسپتال پہنچنے پر باپ نے دیکھا کہ اس کی دھان پان لڑکی کی حالت خراب ہے وہ جگہ جگہ سے جلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ جب لڑکی کو داخل کرنے کے لیے شوہر اور باپ ساتھ آئے تھے تو انھوں نے کہا تھا کہ اسٹروو ٹریجڈی، ہوگئی ہے، جو گجراتی خاندانوں میں اکثر ہوتی رہتی ہے۔ لڑکی نے، جو اس وقت ہوش میں تھی، اپنے باپ کو بتایا کہ اسے جلایا گیا ہے۔ اس کی ساڑی پر پٹرول چھڑک کر اس کو جلتی ہوئی ماچس دکھادی گئی تھی۔ جب تک وہ جلتی رہی، شوہر کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ فلیٹ کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں، تاکہ سرسوتی کی چیخ وپکار پڑوسیوں کو سنائی نہ دے۔ پھر بھی دودھ والا جب وہاں آیا اور اس نے بار بار دروازے کی گھنٹی بجائی تو ذرا سا دروازہ کھولنا پڑا اور اس وقت لڑکی کی چیخیں سن کر دو تین پڑوسی اور آگئے مگر شوہر کھڑا دیکھتا رہا۔ اس نے کہا کہ اس کا باپ ڈاکٹر کو بلانے گیا ہے۔ اسپتال میں اپنے باپ کو اصلیت بتانے کے چند سنٹ بعد سرسوتی بے ہوش گئی اور چار پانچ گھنٹے بعد لڑکی نے آخری ہچکی لی۔

مگر آپ نے پولیس کو کیوں نہیں بلایا؟'' کملا کانیکر نے جرح کرنے کے انداز میں سرسوتی کے باپ سے پوچھا۔

''اگر میں بھی پولیس اسٹیشن چلا جاتا تو لڑکی کے پاس کون رہتا؟''

سرسوتی کے مرنے کے بعد اس کا باپ تھانے گیا بھی تھا، مگر روپیوں سے پولیس کا منہہ بند کر دیا تھا۔ پولیس نے کہا ''اگر آپ کی لڑکی ابھی زندہ ہے تو ہم چل کر اس کا DYING DECLARATION (آخری بیان) لکھ لیتے ہیں؟''

''میں اپنی جلی ہوئی لڑکی کو کیسے زندہ کرتا DYING DECLARATION لکھوانے کے لیے؟'' سرسوتی کے باپ نے جیسے کملا کانیکر سے فریاد کی۔

''تو آپ نے اور کچھ نہ کیا؟'' کملا کانیکر نے پوچھا۔

اور کرنے کو تھا بھی کیا؟ ''بس کسی نہ کسی طرح لڑکی کے کریا کرم کا بندوبست کیا۔''

''اور پولیس؟ پوسٹ مارٹم؟''

''اس کا انتظام انھوں نے پہلے سے کر رکھا تھا وہ کہتے تھے DYING DECLARATION کہاں ہے؟ اس وقت آپ کو ہمیں بلانا چاہیے تھا۔''

''اور جہیز میں سے کچھ آپ کو واپس ملا؟''

''نہیں بیٹی، اب وہ دینے والے تھوڑے ہی تھے۔ ہر بات پر کہتے ہیں، کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

جس طرح سرسوتی کے باپ نے اسے 'بیٹی' کہا تھا، وہ ایک انتقام کا جذبہ کملا کے دل میں جگا گیا۔

''کیا کیا قیمتی چیزیں تھیں جہیز میں؟''

''پچاس ہزار تو نقد تھے، بیس ساڑیاں تھیں۔ سونے کے زیور تھے جو اس کی ماں نے اپنے گہنوں کو تڑوا کر بنوائے تھے۔ ایک ٹیلی ویژن سیٹ تھا مگر بلیک اینڈ وہائٹ تھا، جس پر جھگڑا بھی ہوا، کیونکہ ان کو کلر سیٹ چاہیے تھا۔''

اگر آپ کو یہ سب چیزیں واپس مل جائیں تو آپ کیا کریں گے؟''

''وہ کہاں واپس کریں گے؟ ویسے اگر مل گئیں تو میں چھوٹی بیٹی کے جہیز میں دے دوں گا۔''

کملا سوچنے لگی کہ سرسوتی کے سابق سسر اور ساس اور اس کے شوہر سے بدلہ لینے کی کیا

ترکیب ہوسکتی ہے۔ یہی سوچتے سوچتے وہاں سے واپس آگئی اور یہی سوچتے سوچتے وہ سوگئی۔

خواب میں اسے سرسوتی نظر آئی۔ اس کا فوٹو اس نے اسی دن اس کے باپ کے ہاں دیکھا تھا۔ دبلی پتلی نازک سی لڑکی تھی۔ خواب میں اس سے کہنے لگی ''دیدی'' کیا تم ان لوگوں سے بدلہ لے سکتی ہو؟''

ابھی وہ کچھ خواب میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

سرسوتی کے باپ نے کملا نیکر کو بتایا تھا کہ سرسوتی کا شوہر سدھیر ہر شام کو پرمٹ روم، چھوٹا پیگ، میں موجود رہتا تھا، کیونکہ شراب کی لت جو اسے یورپ اور امریکہ میں لگی تھی، اب بھی اس کی جان کو لپٹی ہوئی تھی۔

اس دن اتوار تھا۔ سرسوتی کے باپ سے اس کی جو بات ہوئی تھی، اس کی بنیاد پر مضمون بنا کر وہ دفتر پہلے ہی دے آئی تھی۔ مضمون کی سرخی اس نے یہ دی تھی: ''سرسوتی کا خون آج بھی بدلہ لینے کے لیے پکار رہا ہے۔'' یہ مضمون اس کی برسی کے موقع پر چھپ رہا تھا۔

اس روز کملا ایک مشہور بیوٹی سیلون گئی جو ایک سابق فلم اسٹار چلاتی تھی۔ اس کے پاس کئی اسسٹنٹ تھے جو پہلے فلم انڈسٹری میں میک اپ آرٹسٹ رہ چکے تھے۔

کملا کا بیوٹی سیلون میں جانے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہاں کی بڑی بڑی سنگھار کرنے کی مشین دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرائی پھر اس کی قوت ارادی نے اس سے کہا: اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ یہ مشین تو تمھاری ساتھی ہیں جو تمھیں خوب صورت بنانے میں تمھاری مدد کریں گی۔ یہ سوچ کر وہ سابق فلم اسٹار سے ملی۔

''آپ مس رادھیکا ہیں؟''

''جی ہاں۔ مجھے چالیس برس تک لوگ اسی نام سے پکارتے تھے۔''

کملا نے رادھیکا کی کئی پکچروں کے نام لئے۔ اب تو ان کی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔'' رادھیکا نے کہا۔ ''آپ کی کیا سیوا کرسکتی ہوں؟''

آپ نے کبھی کسی گجراتی لڑکی کا کام کیا تھا؟''

''میں تو خود گجراتی ہوں۔ ویسے ایک پکچر میں گجراتی لڑکی کا کام بھی کیا تھا۔ آپ کو کیا چاہیے؟''

''مجھے بھی آج کے لیے ایک بال کٹی گجراتن بنادیجئے۔بس یہی کام ہے۔

''مگر گجراتی لڑکیاں عام طور سے بال نہیں کٹواتیں۔''

''مردولا سارا بھائی بھی تو گجراتی ہی تھیں۔میری بھی ایک دوست گجراتن ہی تھی،مگر اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔''اس نے اپنے بیگ سے سرسوتی کی ایک شادی کی تصویر نکال کر مس رادھیکا کو دکھائی۔

یہ تو بہت مشکل کام نہیں ہوگا۔''رادھیکا نے کہا''آپ دونوں کی صورتیں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی ہیں۔''

رادھیکا نے اپنی تیز ،بڑی قینچی سے کملا کے لمبے بال کوئی آدھے کردیئے۔مختلف قسم کی کریمیں اس کے چہرے پر ملیں۔پھر پٹی کی تہیں بنا کر اس کا گالوں پر لگا دیا گیا۔اس کے گالوں کی ہڈیاں اونچی ہوگئیں۔پھر اس کا سر ایک مشین میں دیا گیا اوپر سے بھاری ڈھکنا بند کرنے کی آواز آئی۔کملا کانیکر نے دل میں سوچا یہ سب تکلیف تو سہنی ہی ہوگی۔اس نے بھی تو پٹرول سے جلنے کے دکھ اٹھائے تھے۔

جب مشین کا ڈھکنا آدھے گھنٹے کے بعد کھلا اور آئینہ کملا کے سامنے کیا گیا تو کملا اپنے آپ کو پہچان نہ سکی۔

''یہ تو کوئی اور ہی ہے۔''اس نے سوچا''اچھا ہی ہے۔میں کوئی اور ہی تو آج شام کو نظر آنا چاہتی ہوں۔''

اس نے بل ادا کرنے کے بعد رادھیکا سے پوچھا۔''کیا میں آپ کے ہاں کپڑے بدل سکتی ہوں؟''

''ضرور۔''رادھیکا بولی۔''ڈریسنگ روم میں چلی جائیے اور اندر سے بند کرلیجیے۔گجراتی اسٹائل میں ساڑی باندھنی ہو تو مجھے بلا لیجیے گا۔''

کملا نے دل ہی میں سوچا،یہ گجراتن تو لکھنؤ کی بیگمات کی طرح بات کرتی ہے۔اس کی نقل کرنا تو بالکل آسان ہے۔پھر اس نے خود کو یاد دلایا کہ آج اسے سابق فلم اسٹار رادھیکا کی نقل نہیں کرنی ہے،بلکہ سابق جہیز کی شہید سرسوتی کی مردہ روح کو زندہ کرنا ہے۔اس لیے اس نے

پوری گجراتی طرز کی ساڑی نہیں باندھی بلکہ جس وضع کی بمبئی کی فیشن ایبل گجراتنیں ساڑی باندھتی ہیں ویسی ہی ایک بھڑک دار ساڑی لپیٹی۔ ایک بہت چھوٹی چولی پہنی، جس کی پکڑ سے پیٹ اور کمر بالکل آزاد تھے یہ ہپسٹر (HIPSTER) ساڑی کہلاتی تھی۔ اب کملا ایک نوجوان اور فیشن ایبل امیر اور بے فکر گجراتن ہی نظر آتی تھی۔ اس پر رادھیکا کے فنشنگ ٹچز نے تو غضب ہی ڈھا دیا تھا۔ دکان میں آنے جانے والے اسے بار بار مڑ کر دیکھ رہے تھے بلکہ گھور رہے تھے۔ یہی وہ چاہتی تھی۔

ٹھیک چھ بجے کملا پرمٹ روم، چھوٹا پیگ، میں پہنچی۔ اس کے ساتھ ایک بہت بڑا چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا جس پر لندن، پیرس اور نیروبی (کینیا) کے لیبل لگے ہوئے تھے۔

چند لمحے بعد خاکی گیبرڈین جیکٹ اور نیلی جینز پہنے سدھیر سیٹی بجاتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس وقت کملا زندگی میں پہلی بار پنک جن پی رہی تھی اور اس کو پسند کرنے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے سدھیر کو آتے ہوئے دیکھا، جس کا فوٹو سرسوتی کا باپ اسے دکھا چکا تھا۔ بار میں اس وقت بھیڑ نہیں تھی۔ ہولی کا دن تھا اس لیے اکثر آنے والے اب تک نہیں آئے تھے۔ اپنی مخصوص ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے سدھیر نے نظر جو گھمائی تو کملا پر رکی کی رکی رہ گئی۔

اس نے ویٹر کو بلا کر اپنی برانڈ کا آڈر دیتے ہوئے اس سے پوچھا ''وہ میم صاحب کون ہیں؟''

''نئی آئی ہیں۔ شاید کہیں باہر سے'' ہینڈ بیگ پر بہت سے لیبل لگے ہوئے ہیں'' ویٹر نے اسے بتایا۔

''کیا آڈر کیا ہے انھوں نے؟'' سدھیر نے پوچھا۔

پنک جن کا آرڈر دیا ہے۔ وہ بھی ختم کے قریب ہے۔''

''پنک جن؟'' سدھیر نے زیر لب کہا اور پھر ویٹر سے کہا ''ہمارے لیے بھی وہی لاؤ۔''

کملا نے ادھر مڑ کر ہی نہیں دیکھا دراصل وہ اس لیے بھی نہیں دیکھ رہی تھی کہ ''پنک جن'' کے پیگ کا کافی حصہ وہ گہری ایش ٹرے میں انڈیلتی جا رہی تھی۔

جب پنک جن کا ایک پیگ ختم ہو گیا تو اس نے چلا کر ویٹر کو بلایا اور ایک اور پیگ کا آرڈر دیا۔

دوسرا گلاس جب ویٹر نے کملا کو دیا تو ساتھ میں ایک کارڈ بھی تھا۔ اس پر چھپا ہوا تھا:
''سدھیر شاہ، الیکٹریکل انجینئر (یو۔ ایس امریکہ)''

''یہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟''

''میم صاب، یہ ہمارے بڑے پرانے کسٹمر ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''بلاؤ۔ ہم تو یہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے۔''

ویٹر نے جا کر سدھیر سے کہا اور وہ اپنا پہلا گلاس ہاتھ میں لیے کملا کی میز پر آ گیا۔

''مے آئی سٹ ڈاؤن پلیز؟'' سدھیر نے بیٹھنے سے پہلے پوچھا۔

کملا نے ایک بناوٹی افریقی بولی میں کہا! ''مکامبو! مکامبو!'' اور بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

''مکامبو؟ کیا مطلب؟''

''آپ نہیں جانتے؟ معلوم ہوتا ہے آپ امریکہ تو گئے ہیں مگر افریقہ کبھی نہیں گئے۔ یہ ہمارے 'لانگ سفاری بار' کا خاص لفظ ہے جس کا مطلب ہے کہ بیٹھ جایئے خوشی سے۔ دراصل میں آج ہی کینیا سے آئی ہوں۔''

''آپ کا شبھ نام؟''

''سیتا شاہ نام تو ہے مگر میں ڈزن پنک جن سیتا کہلاتی ہوں۔ جب پنک جن پینے پر آتی ہوں تو دس بارہ پیگ سے کم نہیں پیتی۔''

''کیا آج بھی آپ بارہ پنک جن پئیں گی؟''

''اگر کمپنی اچھی مل گئی تو درجن بھر سے زیادہ بھی پی سکتی ہوں۔ سفاری، جس کو آپ لوگ شکار بولتے ہیں، کے موقع پر تو اس سے بھی زیادہ پی جاتی ہوں، خصوصاً اگر شیر یا گینڈے کا شکار ہو۔''

''آپ گینڈے کا شکار بھی کرتی ہیں؟''

''ہاں۔ مگر گینڈا جب پاگل ہو جاتا ہے تو اس کو گولی مارنے میں اور بھی مزہ آتا ہے۔ ایک دفعہ تو ایک زخمی گینڈا ایک میل تک میرے پیچھے پیچھے بھاگا، مگر میں ایک پیڑ پر چڑھ گئی اور میں نے زور سے کہا: ''مکامبو فرینڈ گینڈے۔ اب ہم دونوں برابر ہیں۔ تم بھی پاگل ہو اور میں نے بھی پنک جن کی پوری بوتل چڑھالی ہے۔ یہ کہہ کر گینڈے کی آنکھوں کے بیچ میں جو جگہ ہوتی

ہے، اس کا نشانہ لے کر میں نے رائفل داغ دی اور بے چارہ گینڈا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ آپ کبھی نیروبی آئے تو اس گینڈے کا سر میرے ڈرائنگ روم میں لگا دیکھ سکیں گے۔ تب آپ کو یقین آئے گا۔ آپ آئیں گے نا نیروبی میرے پاس۔ میں آپ کو اپنے ساتھ شکار کھیلنے کی دعوت دیتی ہوں۔

''نیروبی تو بہت دور ہے۔''

کیا دور ہے؟ بس ہوائی جہاز میں بیٹھے اور اگلے اسٹاپ پر آپ نیروبی پہنچ گئے۔ آئی۔ ایم اِنوائٹنگ یو، کیونکہ میرے پاپا نے میری اکیسویں سال گرہ پر ایک بڑے سفاری کا انتظام کیا ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے مہمان آئیں گے۔ ایک قسم کا انٹرنیشنل سوئمبر ہوگا۔ مگر میں تو ہندوستانی ہی کو ترجیح دوں گی، کیونکہ میری رگوں میں ہندوستانی خون ہے۔ ویسے بھی میں ماں باپ کی مرضی کی شادی کے خلاف ہوں۔ پیار کے بغیر شادی کس کام کی؟

آپ کام کیا کرتے ہیں؟''

سدھیر نے کہا ''میں الیکٹریکل انجینئر ہوں۔ امریکن ٹرینڈ ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا' کیونکہ میرے پاپا کو بھی اپنی فیکٹری کے لیے ایک منیجر چاہیے۔ ابھی تو وہ تھری تھاؤزنڈ ماہوار ہی دیں گے۔''

''تھری تھاؤزنڈ روپیز؟''

نہیں نہیں۔ تھری تاؤزنڈ پاؤنڈ ماہوار اور اگر انھیں بھی تم پسند آ گئے۔ جیسا کہ مجھے پسند آ گئے ہو تو وہ زیادہ بھی دے سکتے ہیں۔ کیوں نہ ایک پنک جن اور ہو جائے؟ کیا خیال ہے؟''

''ضرور۔'' سدھیر نے کہا اور بیرے کو بلا کر آرڈر دیا پنک جن!''

اب وہ اور قریب آ گئے تھے۔ کملا نے گویا بے ارادہ سدھیر کے ہاتھ پر اپنا گورا ملائم ہاتھ رکھ دیا، جس سے اس کے سارے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔

''تم کہاں رہتے ہو؟'' دفعتاً کملا نے سوال کیا۔

''میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا ہوں۔''

''اوہ! WHAT A PITY نہیں تو میں آج کی رات تمھارے ساتھ ہی رہتی۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے، پرکھنے کے لیے۔''

یہ گویا سدھیر کی مردانگی کو چیلنج تھا جس کا جواب دینا اس کے لیے ضروری تھا اس نے کہا ''ماں باپ کو کچھ دن کے لیے باہر بھی بھیجا جا سکتا ہے۔''

''تمھیں یقین ہے کہ میرے لیے تم اتنی بڑی قربانی کر سکو گے؟''

''کیوں نہیں؟'' یہ کہہ کر وہ ٹیلی فون کے پاس گیا اور ایک نمبر گھما کر کہا کہ برابر کے فلیٹ سے مسٹر سولنکی کو بلا دیں۔''

جب اس کے باپ آ گئے تو اس نے اس سے صاف صاف کہہ دیا ''یہ میرے لیے زندگی کا سوال ہے۔ ایک گجراتی لڑکی کینیا سے آئی ہے۔ وہ بر کی تلاش میں ہے مگر پہلے وہ میرا گھر دیکھنا چاہتی ہے۔ رات کو بھی میرے گھر رہنا چاہتی ہے۔ اس لیے آپ یا تو احمد آباد چلے جائیے یا کسی دوست کے گھر۔ بس ایک رات کے لیے وہ ایک ٹی پلانٹر کی لڑکی ہے۔ بہت آزاد خیال ہے اچھا باہر تالا نہ ڈال دیجیے گا۔''

''سب انتظام ہو گیا ہے'' سدھیر نے واپس آ کر کملا کو خوش خبری سنائی۔'' کیوں نہ اس خوشی میں ایک پیگ اور ہو جائے؟'' کملا نے بیرے کو بلا کر آرڈر دیا ''ٹو مور پنک جنس۔''

ویٹر بھاگ کر دو پیگ لے آیا۔ اگر چہ وہ دیکھ چکا تھا کہ میم صاحب پینے کا صرف ناٹک کر رہی ہیں اور صاحب نے اب اتنی پی لی تھی کہ ان کو کچھ خبر ہی نہیں تھی۔

سدھیر کے بٹوے میں پچاس روپے کا ایک نوٹ تھا۔ اس لیے اس نے غنیمت جانا جب کینیا والی حسینہ نے بل کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی۔ ایک سو اسّی روپے کا بل ادا کرتے ہوئے دو سو کے نوٹ دے کر کملا نے بڑی بے پروائی سے بیرے سے کہا ''کیپ دی چینج'' (ریزگاری تم رکھ لو) اور سدھیر کے ساتھ باہر نکل آئی، سدھیر ٹیکسی کے لیے ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک سفید وردی پہنے ہوئے ڈرائیور نے بڑھ کر سلام کیا اور ایک امپورٹڈ شیورلیٹ کا دروازہ کھولا۔

یہ ٹورسٹ ٹیکسی ہے۔ میں ہمیشہ جب ہندوستان آتی ہوں، یہی ٹیکسی استعمال کرتی ہوں! IT,S SO CONVENIENT (یہ آرام دہ بھی تو ہے۔) دونوں شیورلیٹ کی نرم سیٹ میں دھنس گئے۔ سدھیر کا ہاتھ کملا کے ہاتھ میں آ گیا۔ مگر چند لمحے بعد جب اس نے کملا کو چومنے کی کوشش کی تو ایک ہیرے کی انگوٹھی پہنے ہوئے انگلی نے ہونٹوں کا راستہ بند کر دیا اور کملا نے کہا۔

DON,T BE NAUGHTY (شریر نہ بنو) ابھی تو پوری رات پڑی ہے ان کاموں کے لیے۔"
سدھیر یہ سن کار سنبھل کر بیٹھ گیا۔

لفٹ سے نکل کر تنگ سی گیلری سے گزر کر دونوں فلیٹ تک پہنچے۔ دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ تھا، مگر ماں باپ اسے ٹھیک ٹھاک کر گئے تھے۔ بیڈ روم میں سرسوتی کے جہیز کا ایک مخملی بیڈ کور پڑا تھا، جس کو پہچان کر ٹی پلانٹر کی لڑکی نے ناک بھوں چڑھائی۔ GET RID OF THIS (اسے دفعہ کرو یہاں سے)

بعد میں لوہے کی الماری میں ساڑیوں کا ایک انبار دیکھ کر اس نے کہا WHOSE DIRTY SARIES ARE THESE (یہ کس کی غلیظ ساڑیاں ہیں؟)

سدھیر بے سوچے سمجھے کہہ گیا۔

THEY WERE MY WIFE'S (یہ میری بیوی کی تھی) میرا مطلب ہے کہ میری ہونے والی بیوی کے لیے میری ممی نے خریدی ہیں۔"

"تمھاری ہونی والی بیوی میں ہوں ڈارلنگ، اور میں تم سے کہتی ہوں کہ میں اس گندگی کو خود پر نہیں لیٹوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے سب ساڑیاں نکال پھینکیں۔ ساتھ میں زیورات کا صندوقچہ بھی تھا۔ اس کو بھی اٹھا کر پھینک دیا۔

"شوفر!" کینیا کے ٹی پلانٹر کی لڑکی نے آواز دی اور جب شوفر نے آکر سلام کیا تو اس نے کہا TAKE ALL THIS AWAY ,SEE IF THEY WILL SUIT YOUR WIFE .TAKE THESE FALSE GOLD TRINKLETS -YOU CAN TELL YOUR WIFE THEY ARE REAL (یہ سب لے جاؤ۔ ممکن ہے تمھاری بیوی کے کام آسکیں۔ یہ نقلی سونے کے زیور بھی لے جاؤ۔ بیوی سے کہہ دینا کہ اصلی ہیں۔)

اس کے بعد ٹی پلانٹر کی بیٹی نے کسی قدر شانت ہو کر کہا "برا نہ ماننا ڈارلنگ میں پرسوں ہی تمھارے گھر کو اپنی پسند کی ساڑیوں اور گہنوں سے بھر دوں گی مگر کل تو گڈ فرائی ڈے کی چھٹی ہے میں اپنے ٹرویلرز چیکس کیسے کیش کراؤں گی؟"

''تم مجھ سے روپیہ لے سکتی ہو۔اب ہم میں تم میں کیا فرق ہے؟''

کوئی فرق نہیں ہے۔میرے پاس دولاکھ کے ٹرویلرز چیک ہیں،تم بھنادو گے انھیں؟''

''اتنا تو نہیں ہوگا اس وقت۔''

''کتنا ہوگا، ڈارلنگ؟''

''یہی کوئی پچیس تیس ہزار روپے ہوں گے اس وقت۔''

ٹھیک ہے۔مگر میں تم سے اتنا روپیہ بھی یوں ہی نہیں لوں گی۔پچاس ہزار کے چیک دیے دیتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے فاؤنٹین پین نکالا اور نقلی ٹرویلرز چیکس پر دستخط کرنے شروع کر دیے۔

سدھیر شرابی آواز میں کہتا رہا۔''ڈارلنگ'اتنی بھی جلدی کیا ہے یہ تکلف کرنے کی۔''اس نے ٹی پلانٹر کی لڑکی کو چومنے کی کوشش بھی کی۔

''نونو۔''وہ بھی شرابی آواز میں چلائی۔''میرے پاپا نے یہی سکھایا ہے کہ بزنس فرسٹ باقی مزہ بعد میں''یہ کہہ کر اس نے نقلی ٹرویلرز چیک سدھیر کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔''گن لو، پورے پچاس ہزار کے ہیں۔''

مجھے تم پر اعتبار ہے۔اب ہمیں ایک پیار تو مل ہی جانا چاہیے ایڈوانس کے طور پر۔''

''آج تو ہولی کا دن ہے؟''

''تو آؤ ہولی کھیلیں؟''

''ہولی آئی رے کنہا۔''سدھیر نے ایک فلمی گیت کا ٹکھڑا دہرایا اور اگلی لائن جب اسے یاد نہیں آئی تو بار بار چلّانے لگا''ہولی ہے''!

پھر اس نے میز پر سے گلال مٹھی میں بھر کر کملا کے منہ پر مل دیا۔کملا بھی شرابیوں کی طرح چلائی۔''ہولی ہے۔!ہم بھی انتقام لیں گے۔ہوشیار رہنا۔''

سدھیر نے مگن ہو کر کہا۔''لو انتقام جتنا جی چاہے''مزہ تو مجھے ہی آئے گا۔''

اس وقت جب سدھیر کا لالچی منہ کملا کو چومنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا، کملا کا ہاتھ سدھیر کی آنکھوں کی آنکھوں میں جھونک دیا۔

سدھیر کو فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ گلال نہیں، لال مرچوں کا پاؤڈر تھا وہ بلبلا اٹھا۔ اس کی آنکھیں کھل ہی نہیں رہی تھیں۔ تکلیف کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' سدھیر کی آواز فلیٹ میں گونجی۔

میں سرسوتی کی روح ہوں، جو آج تم سے ہولی مبارک کہنے کے لیے سورگ سے یہاں آئی ہے۔''

سدھیر سسکتا تڑپتا منہ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف گیا اور کملا نے لفٹ کا راستہ پکڑا۔ سامان تو پہلے ہی ڈرائیور نیچے لے جا چکا تھا۔ موٹر میں بیٹھتے ہی وہ چل پڑی۔

''کیوں کیسا رہا، کملا؟''

''پرفکٹ، سر''

ایوننگ میل کے چیف رپورٹر رام چندرن نے اپنی ٹوپی اتارتے ہوئے کہا ''میم صاحب کہاں جانا ہے؟''

بھانگرواڑی۔ پہلے یہ سامان سرسوتی کے باپ کو پہنچا دیں۔ پھر سیدھے دفتر چلیں گے۔''

''بہت اچھا میم صاحب!''

سرسوتی باپ کا سارا سامان اور تیس ہزار روپے پا کر رونے لگا۔ ''اگر اس کے بدلے میری بیٹی واپس آ جاتی....''

''ہم بھگوان نہیں ہیں۔'' کملا نے کہا۔

''ہم تو بھگوان کے دوت۔ یعنی جرنلسٹ ہیں۔'' رام چندرن نے اپنے گنجے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

سال نامہ ''بانو'' مئی 1968

O

# نیا طوفان

ایک بار پھر نئی دہلی میں طوفانی بارش ہو رہی تھی اور اوشا کے ذہن میں تیس برس پہلے کی برسات کی ایک شام دھیرے دھیرے ابھر رہی تھی۔

سات دن سے لگاتار پانی برس رہا تھا۔ دہلی کے پرانے رہنے والوں کا کہنا تھا کہ یہاں بیس برس میں اتنی بارش کبھی نہیں ہوئی! اس بار تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ نئی دہلی کے سبزہ زار پانی میں ڈوب گئے تھے۔ کناٹ پلیس ایک گول تالاب بن گیا تھا۔ انڈیا گیٹ کے سامنے جہاں کبھی بادشاہ جارج پنجم کا سفید بت ہوتا تھا، مرغابیاں سڑکوں پر تیر رہی تھیں۔ بادشاہ جارج پنجم کے بت کی چھتری بارش کی طرف سے بے پرواہ تھی۔ یہ سنگ مرمر کی چھتری جہاں کبھی بادشاہ کا بے جان بت ہوا کرتا تھا اب چند جانداروں کو پناہ دے رہی تھی۔ کئی چیلیں اور کوے گیلے پروں میں اپنے سر چھپائے سمٹے سکڑے وہاں بیٹھے تھے۔

بارش ہو رہی تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس اور سکریٹریٹ میں، کناٹ پلیس میں، نئی دہلی کی چکنی سپاٹ سڑکوں پر، پرانی دہلی کی تنگ و تاریک گلیوں میں، جامع مسجد اور لال قلعے میں، راج گھاٹ پر جہاں سے بپھری ہوئی جمنا کا پانی اب چند قدم ہی رہ گیا تھا اور شرنارتھی کیمپ کی نئی بنی ہوئی نیچی نیچی بارکوں پر جہاں مغربی پنجاب کے وہ شرنارتھی ٹھہرے ہوئے تھے جنھیں بسانے کا ابھی تک

کوئی انتظام نہ ہو سکا تھا۔

بارش ہو رہی تھی۔ آسمان پر، زمین پر اور ان کے درمیان فضا میں ہر جگہ پانی ہی پانی تھا۔ مگر یہ تالاب کے پانی کی طرح ساکن پانی نہ تھا۔ سمندر کی طرح اس میں طوفان تھا، جوش تھا۔ سمندر کے پانی میں صرف اندرونی ہیجان ہوتا ہے۔ جوار بھاٹا بھی بس ساحل ہی کو بھگو کر سمندر میں واپس چلا جاتا ہے مگر یہ برستا ہوا پانی تھا۔ گرجتا ہوا پانی، گولیوں کی طرح برستا ہوا پانی۔ توپوں کی طرح گرجتا ہوا۔ اس پانی میں حرکت تھی، زور تھا، شور تھا ہوا کے جھکڑ کے ساتھ بارش کا طمانچہ اچھوں اچھوں کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

اوشا اپنی کھڑکی میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ وہ کون سی قوت، کون سا معجزہ ہے جو پانی کی بوند جیسی حقیر، ملائم اور بے ضرر شے کو یہ طاقت، یہ زور، یہ ولولہ بخشتا ہے! اس کے لیے برسات کسی معجزے سے کم نہ تھی۔

اس کی پیدائش اور پرورش ملتان جیسے سوکھے، ریگستانی علاقے میں ہوئی تھی۔ جہاں اگر کبھی بھولا بھٹکا بادل آ بھی نکلتا تھا تو اس خوشی میں سب اسکولوں میں چھٹی ہو جاتی تھی۔ ملتان میں پانی کے بجائے ریت کی بارش ہوتی تھی۔ ملتان کی ریت کا خیال آتے ہی اوشا کو ایک جھرجھری سی آئی۔ جیسے کبھی ریت میں بھرے ہوئے پاؤں ایک دوسرے سے رگڑ کھا جائیں اور سارے بدن میں بجلی سی دوڑ جائے......ایک ایسی سنسنی جس میں جوان لڑکیاں مسرت اور اذیت دونوں محسوس کرتی ہیں۔

اور اس کے دانتوں میں کر کراہٹ محسوس ہونے لگی جیسے آندھی نے اسے ریت کا ایک پھنکا کھلا دیا ہو۔

ملتان کا ریتیلا سمندر......اور دہلی کی یہ برسات! چند سال میں وہ کہاں سے کہاں آ پہنچی تھی۔ وہ اور اس کے گھر والے اور ان جیسے لاکھوں شرنارتھی جن میں سے دو ڈھائی ہزار تو اسی کیمپ میں رہ رہے تھے۔ کوئی پشاور سے آیا تھا کوئی جھنگ سے، کوئی ملتان سے تو کوئی شیخوپورہ سے اور کتنے تو آئے ہی نہ تھے، راستے ہی میں ختم ہو گئے تھے۔ جیسے ان کا پڑوسی رام لال اور اس کی بیوی لاجو اور ان کا دودھ پیتا بچہ اور اوشا کا ماما جو شیخوپورہ میں مارا گیا تھا اور اس کی ماسی کی بیٹی جو راستے

میں اغوا کر لی گئی تھی...... اور...... اور...... فہرست بہت لمبی تھی اور اسے دہراتے دہراتے اوشا کا دماغ تھک گیا تھا اور اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، ہر طرف پانی ہی پانی! برسات کا معجزہ جو اس نے اپنی بائیس برس کی عمر میں ملتان میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ اوشا نے اپنی بانہہ باہر پھیلا دی۔ ہوا کے زور سے پانی کے قطرے اس کی نرم جلد پر ایسے لگے جیسے تیر۔ ایک عجیب چبھن سی محسوس ہوئی اور اوشا کو ایک جھرجھری سی آئی۔ ایک ایسی سنسنی جس میں اس کے جوان جسم نے بیک وقت عجیب مسرت اور عجیب اذیت محسوس کی۔

ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بارش کے چھینٹے اب اوشا کے چہرے پر پڑنے لگے اور اس کے بالوں میں موتی پرونے لگے۔ ننھی سی بوندیں سوئیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں پیوست ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ آنکھیں چرمرا اٹھیں اور اسے حفاظت کے لیے پلکوں کے پردوں کو گرانا پڑا لیکن وہ کھڑکی سے نہ ہٹی۔ چہرے اور بانھوں پر پانی پڑنے سے اس کے جسم نے جو جوان خون کی گرمی سے تمتمایا ہوا تھا، عجیب تسکین محسوس کی۔ گو یہ آگ پانی سے بجھنے والی نہ تھی۔

ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ!

موسلا دھار بارش اور ہوا کے مسلسل شور میں اور سب آوازیں کھوئی ہوئی تھیں۔ اوشا کو برابر کی کوٹھری سے اپنے باپ کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی نہ اپنی چھوٹی بہن کے گنگنانے کی! جو ایک کونے میں بیٹھی چیتھڑوں کی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ اور نہ اسی کمرے کے دوسرے کونے کی رسوئی سے، ماں کے ہانڈی چولھا کرنے کی آواز۔ لیکن چھت سے پانی ٹپکنے کی ٹپ ٹپ نہ جانے کیسے اس کے شعور تک پہنچ گئی۔

ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ!

اس نے مڑ کر دیکھا تو کچی مٹی کے فرش پر چھوٹا سا کیچڑ کا دائرہ نظر آیا جہاں قطرہ قطرہ کر کے چھت سے پانی گر رہا تھا۔ ٹپ ٹپ کے ساتھ ہی جتنی آوازیں بارش کے شور میں کھوئی ہوئی تھیں، چھوٹی بہن کا گنگنانا، ماں کا ہانڈی میں ڈوئی چلانا بارش کا شور اب ان آوازوں کے پس منظر میں چلا گیا اور ٹپ ٹپ کی آواز اس کے شعور پر چھا گئی۔

چھت ٹپک رہی تھی۔ اس نے اوپر دیکھا تو کڑیوں پر پانی کی سیل کا دھبہ بڑا ہوتا ہوا پایا۔

دیواروں کے اوپر کے کونوں سے بھی پانی رس رہا تھا اور سیل آہستہ آہستہ نیچے کی طرف رینگ رہی تھی۔ اس کا تو کوئی علاج ہی نہ تھا۔ ہاں ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے اس نے دوڑ کر مٹی کا کونڈا رکھ دیا تا کہ پانی کی بوندیں اس میں گریں اور سارا فرش کیچڑ نہ بن جائے لیکن ابھی اس نے کونڈا رکھا ہی تھا کہ چھت ایک اور جگہ سے بھی ٹپکنے لگی اور اسے دوسری جگہ ٹین کا ایک خالی ڈبہ رکھنا پڑا جو اس کا باپ کہیں سے اٹھا لایا تھا۔

اوشا پھر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوگئی۔ اور بچپن کی سنی ہوئی ایک کہانی یاد کر کے مسکرا دی۔ ایک بڑھیا جنگل میں اکیلی اپنے جھونپڑے میں رہتی تھی۔ برسات کے دن تھے۔ ایک شیر بھیگتا ہوا آیا اور جھونپڑے کی دیوار کی آڑ میں کھڑا ہوگیا اندر بڑھیا سے کوئی مسافر پوچھ رہا تھا: بڑی بی! تم اس جنگل میں اکیلی رہتی ہو۔ تمھیں شیر سے ڈر نہیں لگتا؟''

بڑھیا بولی ''نہیں بیٹا! میں شیر دیر سے نہیں ڈرتی۔ ہاں ٹپکے سے ضرور ڈرتی ہوں۔'' یہ سن کر شیر وہاں سے بھاگا کہ نہ جانے یہ ٹپکا کون سی خوفناک بلا ہے۔ شیر بھاگا جا رہا تھا کہ ایک گیدڑ نے روکا اور پوچھا'' کیوں بھاگے جا رہے ہو؟ تم جنگل کے بادشاہ ہو۔ تمھیں کس کا ڈر؟'' شیر نے جلدی سے جواب دیا'' ٹپکے کا!'' اور بھاگتا چلا گیا۔

اوشا نے سوچا یہی حال ہم سب شرنارتھیوں کا ہے۔ دنیا کے کتنے خطروں اور کتنی مصیبتوں کا سامنا کر کے ہم یہاں آئے ہیں۔ انسانی بھیڑیوں اور شیروں سے بچ گئے۔ پر اب اس ٹپکے نے آن پکڑا۔ اس سے بھلا کون چھٹکارا پا سکتا ہے؟''

بارش کے پردے میں سے باقی سب بارکیں دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ میدان میں ٹخنوں ٹخنوں پانی کھڑا تھا۔ اس لیے ایک دوسرے کی خیر خبر لینے تو کوئی آ جا نہ سکتا تھا۔ پر اتنا اوشا یہاں سے بھی دیکھ رہی تھی کہ سب شرنارتھی اس ٹپکے کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ کوئی بالٹی رکھ رہا ہے، کوئی کونڈا، کوئی کنستر۔ دو چار ہمت والے لنگوٹ باندھ کر چھت پر چڑھے ہوئے تھے اور مٹی ڈال کر سوراخوں کو بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سب بارکوں میں سب کمروں کی چھتیں ٹپک رہی تھیں۔ مگر ان کے سر پر چھتیں تھیں ورنہ پچھلے سال یہی زمانہ انھوں نے خیموں میں گذارا تھا اور اس سے پچھلے سال ان ہی دنوں میں وہ

اور ان جیسے لاکھوں سڑک پر گھسٹتے آ رہے تھے یا میدانوں میں پڑے ہوئے تھے۔ ملتان سے نکل کر اوشا اور اس کے گھر والوں نے پہلی برسات کھلے آسمان کے تلے گذاری تھی۔ دوسری کپڑے کی چھت کے نیچے اور اب تیسرے سال میں انھیں یہ لکڑی اور مٹی کی چھت نصیب ہوئی تھی۔ اس کے لیے انھیں بھگوان، سرکار اور ان بارکوں کے بنانے والے ٹھیکیدار سندر لال کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

سندر لال کا خیال آتے ہی اوشا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ سارے بدن میں ایک سنسنی سے دوڑ گئی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی بانھوں کو بارش میں پھیلا دیا اور نوکیلی بوندوں کے لمس سے ایک بار پھر وہ اس لذت سے آشنا ہوئی جو بیک وقت لذّت بھی تھی اور اذیت بھی۔

سندر لال!

کیا اوشا کو اس سے اب تک محبت تھی؟

سندر لال! جس نے یہ بارکیں بنوائی تھیں، یہ کمرے، یہ چھت، یہ دیواریں، یہ فرش...... یہ سب کچھ اسی کا بنوایا ہوا تھا، اسی لیے تو ہر در و دیوار میں اوشا کو اس کی یاد دُبکی ہوئی نظر آتی تھی۔ سندر لال نے شرنارتھیوں کے لیے یہ بستی ہی نہیں بنوائی تھی، ایک شرنارتھی یعنی اوشا کی زندگی اور روح کے کھنڈروں کو بھی از سر نو تعمیر کیا تھا۔

اس سے پہلی ملاقات! کیا اوشا کبھی اسے بھلا سکے گی؟ وہ دن، وہ گھڑی، وہ لمحہ، آج تک ایک چراغ کی طرح اس کے دل میں روشن تھا۔ اوشا کو اکثر ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی زندگی اس لمحے سے شروع ہوئی تھی جب وہ سندر لال سے پہلی بار ملی۔

کتنی دل برداشتہ تھی ان دنوں وہ! زندگی سے کتنی مایوس اور بے زار؟ شرنارتھی جیون کے دکھ اٹھاتے اٹھاتے وہ اپنے آپ ہی سے اکتا گئی تھی۔ چاروں طرف اسے کہیں بھی تو سکھ یا امید کی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ اور پھر ایک دن اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کی چند لڑکیاں بہت چمکیلی بڑی بڑی موٹروں میں بیٹھ کر ان کے کیمپ میں آئیں اور کہا کہ وہ شرنارتھیوں کے لیے چندہ جمع کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے کہا ''ہم اپنے شرنارتھی بھائی بہنوں کے لیے بھیک مانگنے نکل رہے ہیں۔ ہم گھر گھر جائیں گے اور چندے کے لیے دامن پھیلائیں گے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک شرنارتھی بہن بھی ہمارے ساتھ ہوتا کہ وہ اپنی دکھی برادری کی مصیبتوں کو اچھی طرح بیان کر سکے،

ہمیں یقین ہے کہ اس طرح ہم زیادہ سے زیادہ چندہ وصول کرسکیں گے۔''

سب کی نظریں گھوم کر اوشا پر جم گئیں کیونکہ اس کیمپ میں اوشا ہی سب سے زیادہ پڑھی لکھی، سمجھدار اور خوبصورت تھی اور وہ سب جانتے تھے کہ اوشا جیسی خوبصورت شرنارتھی لڑکی کو دیکھ کر پتھر دل والے بھی موم ہو جائیں گے۔ اس کے باپ نے بھی کہا'' جا اوشی! تو ہی جا۔ جب یہ بیچاری ہماری سیوا کرنے نکلی ہیں تو ہمیں بھی ان کا ہاتھ ضرور بٹانا چاہیے۔''

اوشا لڑکیوں کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر نئی دہلی کی کتنی ہی شاندار سڑکوں پر گھومی تھی، محل، بنگلے، دوکانیں، کارخانے...... سب کہ یہاں تو وہ گئیں۔ کسی نے کہلا دیا'' گھر پر نہیں ہیں'' کسی نے کہا ''اس وقت اکاؤنٹینٹ نہیں ہے'' ہم بعد میں چیک بھجوادیں گے۔ آپ پتہ چھوڑ جائیے۔'' کسی نے پانچ دس روپے دے کر ٹال دیا۔ ایک لکھ پتی نے اپنے پانچ سو روپے کے صوفہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنی سونے کی انگوٹھیوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔'' صاحب میرا خود پاکستان میں اتنا نقصان ہوا ہے کہ اوروں کو چندہ دینے کی جگہ مجھے خود اپنے لیے چندہ جمع کرنا چاہیے!''...... پر ان سب کی نگاہوں نے اوشا کو اس طرح گھورا جیسے اس کا مول تول کر رہی ہوں کہ یہ شرنارتھی لڑکی کس قیمت پر مل سکتی ہے؟ اور ان میں سے کئی نے اس سے پوچھا کہ وہ کس شرنارتھی کیمپ میں رہتی ہے، اکیلی یا اپنے ماں باپ کے ساتھ؟ اپنے چہرے اور بدن پر ان کی ہوس ناک نگاہوں کی چبھن محسوس کرتے ہوئے اوشا کی مایوسی بڑھتی گئی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا میں انسانوں کی نسل ہی ختم ہو چکی ہے اور اب صرف بھوکے بھیڑیے رہ گئے ہیں۔

اور پھر وہ سندر لال کے دفتر میں پہنچیں۔ اندر جانے سے پہلے سندر لال کنٹریکٹر امپورٹر ایکسپورٹر کا بورڈ دیکھ کر وہ سب سمجھی تھیں کہ وہ کوئی موٹا گنجا، بوڑھا سیٹھ ہوگا مگر سفید قمیض، سفید پتلون میں ملبوس ایک گورے چٹے خوب صورت نوجوان کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ سیٹھ یا ٹھیکیدار کے بجائے وہ کالج کا اسٹوڈنٹ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ان کو بہت ادب سے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور اوشا نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ بہت ملائم اور نازک ہیں۔ پتلی پتلی مخروطی انگلیاں جیسی آرٹسٹوں کی ہوتی ہیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اوشا کو یا اس کے ساتھ کی لڑکیوں کو گھورا نہیں۔ نہایت شرافت سے آنکھیں نیچی کیے ان کی باتیں سنتا رہا۔ اوشا نے چند الفاظ میں شرنارتھیوں کا

حال سنایا۔ کیمپ کی مشکلات کا ذکر کیا اور بتایا کہ سرکاری مدد ان کی حالت سدھارنے کے لیے کافی نہیں اور انھوں نے دیکھا کہ جب سندر لال نے نگاہیں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

''معاف کیجیے گا'' اس نے جیب سے ایک سفید براق رومال نکال کر اس سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا'' آپ کو شاید معلوم نہیں میرے پتا جی بھی لائل پور میں مارے گئے تھے۔'' رومال میں ہلکا ہلکا سینٹ لگا ہوا تھا، جس کی خوشبو ہوا میں پھیل گئی۔

''تو... تو آپ بھی مغربی پنجاب کے رہنے والے ہیں؟'' اوشا نے متاثر ہو کر پوچھا۔

''جی نہیں۔ ہم رہنے والے تو یہیں دہلی کے ہیں لیکن ہمارا کافی کاروبار تھا ادھر۔ پتا جی لائل پور اسی لیے گئے ہوئے تھے۔''

پھر اس نے ان کے کہے بغیر پانچ سو روپے کا چیک لکھ کر دے دیا۔ ساتھ ہی انکساری سے کہا'' آپ دیویوں کو میری سیوا کی پھر بھی ضرورت ہو تو یاد کیجیے گا۔'' اور پھر ہاتھ جوڑ کر انھیں رخصت کیا۔

اوشا واپس آ گئی لیکن سندر لال کی شخصیت کا نقش اس کے دل اور دماغ پر ثبت ہو چکا تھا۔ اس دن سے اس نے اپنی زندگی میں ایک نئی شگفتگی، ایک نئی توانائی محسوس کی اب وہ اپنے گرد و پیش میں دلچسپی لینے لگی۔ اب اسے جینا دوبھر نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سوچا بیکار بیٹھنے سے کیا فائدہ اور اپنے کیمپ کے شرنارتھی بچوں کے لیے وہیں ایک شامیانے میں اسکول کھول دیا۔

چالیس پچاس لڑکے لڑکیوں نے اپنے نام لکھا لیے۔ مگر اسکول چلانے کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ بچوں کے بیٹھنے کے لیے بینچ اور ڈیسک نہیں تو چٹائیاں تو ضرور درکار تھیں۔ ان کے لیے کتابوں تختیوں، سلیٹوں اور قلم دوات کی ضرورت تھی۔ غریب شرنارتھیوں کے پاس پیسے کہاں تھے کہ اپنے بچوں کے لیے پڑھنے لکھنے کا سامان خرید سکیں۔ بغیر سرمائے کے اوشا بیچاری کا اسکول چلے کیسے چلے اور یہ سرمایہ وہ لائے تو کہاں سے لائے؟ کئی دن وہ اس ادھیڑ بن میں پریشان رہی اور پھر ایک دن دل کی گہرائی میں سے کسی نے آہستہ سے کہا'' آپ دیویوں کو میری سیوا کی پھر ضرورت ہو تو یاد کیجیے گا'' اور اگلے دن اوشا سندر لال کے دفتر جا پہنچی۔ مگر آج تک وہ خود یہ طے

نہ کر پائی تھی کہ وہ وہاں اپنے اسکول کی غرض سے گئی تھی یا سندر لال کی مقناطیسی شخصیت کی کشش اسے وہاں لے گئی تھی۔

سندر لال اسے دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔ کتنی دل کش تھی اس کی مسکراہٹ اور اس کی آنکھیں کتنی خوب صورت اور زندگی سے بھر پور تھیں۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں، مسکراتے ہوئے ہونٹ، مگر اس کی ٹھوڑی سے عزم کا پتہ چلتا تھا اور جس مضبوطی سے اس کے نازک ہاتھوں کی پتلی پتلی انگلیاں شیشے کے پیپر ویٹ کو دبوچے ہوئے تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کی گرفت سے کسی چیز یا کسی وجود کا نکلنا بہت مشکل ہوگا۔

سندر لال مسکرایا اور کہا تو آپ آ ہی گئیں؟'' اور نہ جانے کیوں اوشا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کا انتظار کرتا رہا ہو۔ اس نے کچھ ہکلاتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ اور ابھی اسکول چلانے میں جتنی مشکلات تھیں، ان کی فہرست وہ پوری نہ کر پائی تھی کہ سندر لال نے بٹوے سے سو سو روپے کے دو نئے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

''معاف کیجیے گا۔ اس مہینے میں اس سے زیادہ نہ دے سکوں گا۔''

''جی......اس مہینے......یعنی؟''

''یعنی یہ کہ اگلے مہینے آپ کو پھر تکلیف دینی پڑے گی......ہاں......آپ کا شبھ نام کیا ہے؟''

''اوشا۔ اوشا بھلّہ......''

''اچھا تو نمستے......نرم اور نازک ہاتھ نمسکار کر رہے تھے۔

''نمستے'' کہہ کر وہ چلی آئی اور گھبراہٹ میں شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئی۔ لیکن راستے بھر وہ سوچتی رہی۔ کتنا اچھا ہے وہ! کتنا خوب صورت، کتنا شریف؛ اور کوئی ہوتا تو اکیلی لڑکی کو دیکھ کر نہ جانے کیا کیا الٹی سیدھی باتیں کرتا۔ اور اس نے تو ایک غیر ضروری لفظ بھی منہ سے نہ نکالا اور پھر ایک پریشان کن شک نے اس کے دل میں سر اٹھایا۔ شاید وہ مجھے بالکل ناپسند کرتا ہے۔ جبھی تو جلدی سے چندہ دے کر ٹال دیا اور مجھے ٹھہرانے کے لیے ایک بات بھی نہ کی۔ کیا میں اتنی بدصورت ہوں؟

چلتے چلتے وہ کناٹ پلیس کی دواؤں کی ایک دکان کے سامنے رک گئی جہاں وزن کرنے کی

مشین رکھی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے کے لیے بلا ضرورت اپنا وزن بھی کر ڈالا۔ اکنی ڈالی تو کارڈ نکلا جس پر وزن ایک من دس سیر لکھا ہوا تھا۔ ساتھ میں قسمت کی پیشن گوئی بھی چھپی ہوئی تھی۔ ''تمھاری زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آنے ولی ہے!'' اوشا نے مسکرا کر اپنے آپ کو شیشے میں دیکھا۔ اس کے گالوں پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

ایک مہینے کے بعد وہ پھر سندر لال کے دفتر پہنچ گئی۔ دوپہر کے کھانے کی چھٹی ہونے والی تھی اور سندر لال باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

''معاف کیجیے گا۔ میں غلط وقت پر پہنچی۔ راستے میں بس میں بہت دیر لگ گئی۔'' جواب میں وہ مسکرا دیا۔ ایسی مسکراہٹ! جس میں تسکین اور ہمدردی کے علاوہ مذاق کی ہلکی سی چاشنی بھی تھی۔ جیسے کوئی کسی بچے کو الٹی سیدھی باتیں کرتے دیکھ کر مسکرا دے۔

''آپ بالکل ٹھیک وقت پر آئی ہیں۔...... مس...... مس......''

''بھلّہ ......اوشا بھلّہ'' اس نے جلدی سے کہا اور دل میں سوچا۔ اسے تو میرا نام بھی یاد نہیں۔ امیر آدمی ہے۔ بھلا اسے میری کیا پروا؟

''اوشا مجھے یاد تھا...... صرف بھلّہ بول گیا تھا۔ بیٹھیے بیٹھیے۔ کہیے آپ کا اسکول کیسا چل رہا ہے۔؟''

اوشا نے مختصر سی رپورٹ سنا ڈالی۔ سندر لال کے روپوں سے چٹائیاں آ گئی تھیں۔ اس کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ میز اور کرسی بھی آ گئی تھی۔ بچوں کی کتابیں، سلیٹیں، قلم دوات، پنسلیں بھی مل گئی تھیں۔ پڑھائی باقاعدہ ہو رہی تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ دو تنخواہ دار استانیوں کو رکھ لے تاکہ درجوں کی پڑھائی الگ ہو سکے۔

اور پھر ایک بار سو سو کے دو نئے نوٹ سندر لال کے بٹوے سے اوشا کے بٹوے میں پہنچ گئے۔

''اچھا تو میں چلتی ہوں'' کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی ''آپ کی امداد کا بہت بہت شکریہ! نمستے۔''

''اتنی جلدی کیا ہے؟''

''کھانا کھائے بغیر ہی چل پڑی تھی۔ بس میں اتنی دیر لگ گئی......''

''یوں کہیے بھوک لگی ہے۔ میں بھی کھانا کھانے ہی جا رہا تھا کہ آپ آ گئیں۔ اگر کوئی

اعتراض نہ ہو تو اکٹھے کھانا کھالیں۔''
ایک لمحے کے لیے اوشا گھبرائی کہ شاید وہ اسے کھانا کھلانے کے لیے اپنے گھر لے جائے گا۔ مگر سندرلال نے جلدی ہی اس کا شک دور کر دیا ''صرف سامنے والے ریستوران تک جانا ہوگا۔ یہاں کھانا اچھا ملتا ہے۔''

اوشا نے اتنا شاندار ریستوران پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ ملتان چھوڑنے کے بعد کبھی اتنا اچھا کھانا کھایا تھا۔ مگر کھانے سے زیادہ پرلطف سندرلال کی باتیں تھیں۔ اور اب بھی وہ کالج کا اسٹوڈنٹ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنی کالج کی زندگی کے کتنے ہی لطیفے سنا ڈالے۔ اوشا کو خوب ہنسایا۔ چودہ مہینے کے شرنارتھی جیون میں آج وہ پہلی بار اس طرح دل کھول کر ہنسی تھی۔
کتنا بھولا تھا سندرلال کا انداز! باتیں کرتے کرتے اس نے میز پر رکھے ہوئے گلدان سے ایک گلاب کا پھول اٹھالیا اور دیکھتے دیکھتے غیر ارادی طور پر اسے مسل ڈالا۔ پھر جب اس نے محسوس کیا کہ اس نے کیا کیا ہے تو مسلی ہوئی پتیوں کو اوشا کی پلیٹ کے سامنے ڈھیر کر دیا اور آپ ہی آپ ہنس پڑا۔
اوشا نے ضرورت سے زیادہ کھانا کھالیا......اس لیے نہیں کہ اسے بہت بھوک لگی تھی، وہ خوشی کے ان لمحوں کو طول دینا چاہتی تھی۔ ریستوران سے اور سب لوگ کھانا کھا کر ایک ایک کر کے جارہے تھے اور جب اوشا نے آئس کریم کی دوسری پلیٹ ختم کر کے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا تو ڈھائی بجے تھے۔ اتنی دیر ہو جانے کے خیال سے وہ گھبرا گئی۔
''مجھے فوراً جانا چاہیے۔ بس میں جاتے جاتے چار بج جائیں گے۔ ماتا جی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''
''گھبرائیے نہیں۔ آپ پونے تین بجے پہنچ جائیں گی۔''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ایک گھنٹے کا تو راستہ ہی ہے اور پھر نہ جانے کتنی دیر کیو میں کھڑی رہنا پڑے گا۔؟''
''آپ میرے ساتھ آیئے۔ میں بتاتا ہوں کیسے ہوسکتا ہے۔''

دفتر کے سامنے ایک چھوٹی سی بھوری کار کھڑی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر اوشا سے کہا "آیئے" وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اوباش رئیس راستہ چلتی لڑکیوں کو اس طرح موٹر میں بیٹھا کر بھگا لے جاتے ہیں۔ مگر سندر لال جیسے معصوم چہرے والا نوجوان کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ پھر اس کے ساتھ جانے میں کیا ڈر؟ وہ موٹر میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور کی جگہ سندر لال خود بیٹھا اور موٹر چل پڑی۔

کتنی سہمی ہوئی نظروں سے اوشا دیکھتی رہی کہ موٹر کون سا راستہ اختیار کرتی ہے اور یہ دیکھ کر اس نے اطمینا کی سانس لی کہ وہ سیدھی شرنارتھی کیمپ ہی کی طرف جا رہی تھی۔ تب اس کے دل نے سندر لال پر شک کرنے کے الزام میں اپنے آپ پر لعنت ملامت کی تھی۔ کتنا شریف تھا وہ! راستے بھر اس نے سڑک سے اپنی نگاہ نہ اٹھائی۔ برابر بیٹھی ہوئی اوشا کو چھونا تو در کنار، اس کی طرف نظر گھما کر دیکھا بھی نہیں۔ نہ کوئی ایسی بات کی جس سے معلوم ہو کہ وہ ایک شرنارتھی لڑکی کی غربت سے فائدہ اٹھا کر اس سے رومان لڑانا چاہتا ہے۔ صرف شرنارتھی کیمپ، اوشا کے اسکول اور ایسے ہی عام مسائل پر باتیں کرتا رہا۔

"لیجیے آپ کا کیمپ آ گیا!" سڑک کے کنارے اس نے گاڑی روک لی اور کلائی کی گھڑی دکھاتے ہوئے کہا، "دیکھ لیجیے پونے تین بجنے میں تین منٹ باقی ہیں! اس لیے مجھے آپ سے اور تین منٹ تک باتیں کرنے کا حق ہے!"

کتنا سادہ، دوستانہ اور پرخلوص انداز تھا اس کے مذاقیہ جملوں کا بھی۔ اوشا ہنس کر بولی "کہیے کیا بات کرنی ہے؟"

وہ دور تک خیموں کی قطاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اوشا کو ایسے محسوس ہوا جیسے سندر لال کے بشاش چہرے پر سوچ اور فکر اور شاید رنج کا ہلکا سا بادل چھا گیا ہو۔ وہ بولا "کتنے آدمی ہیں آپ کے کیمپ میں؟"

"عورتیں بچے ملا کر سب ڈھائی تین ہزار ہوں گے۔"

"خیموں میں رہنا کافی تکلیف دہ ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

''میں سوچ رہا ہوں ہم میں شرنارتھیوں کے ساتھ ہمدردی جتانے والے تو بہت سے ہیں۔مگر بہت کم کو احساس ہے کہ ان بیچاروں کی کتنے دکھ اور تکلیف سے زندگی بسر ہوتی ہے۔''اور پھر ایک اور لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔''میں سوچ رہا ہوں گورنمنٹ کب تک شرنارتھیوں کو ان خیموں میں رکھے گی؟ان کے لیے پکّے مکان کیوں نہیں بنوائے جاتے؟''

تیسرے یا شاید چوتھے دن اوشا نے اخبار میں پڑھا،گورنمنٹ شرنارتھی کیمپ میں پکّی بارکیں بنوانے کی تجویز کر رہی ہے،تو اس نے سوچا،ان کے منہ میں گھی شکر۔اس دن کی بات کتنی مبارک ثابت ہوئی!

اس کے چند روز بعد سرکاری انجینئر اور اُورسیئر آئے اور زمین کی پیائش شروع ہوئی۔پھر اخباروں میں اشتہار نکلے کہ شرنارتھی کیمپ کی بارکوں کے لیے ٹینڈر مطلوب ہیں۔

اگلا مہینہ آن پہنچا اور اوشا اپنے اسکول کے لیے چندہ لینے پھر سندر لال کے دفتر پہنچ گئی۔اس بار اسے ملنے کے لیے چند منٹ باہر کے کمرے میں انتظار کرنا پڑا کیونکہ چپراسی نے بتایا کہ صاحب کام میں مصروف ہیں۔دفتر میں کافی رونق اور گہما گہمی تھی۔سندر لال کے کمرے سے کلرک،چپراسی فائلیں اور نقشے وغیرہ لے کر اندر باہر آ جا رہے تھے۔ٹائپسٹ کھٹا کھٹ لیٹر ٹائپ کر رہے تھے۔ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔سندر لال کی شخصیت کی طرح،اس کے دفتر میں بھی کتنی نفاست،کتنی زندگی تھی۔اوشا کو اس دفتر کی ہر چیز بے حد پسند تھی جس سلیقے سے میزیں،کرسیاں سجائی گئی تھیں،جس منظم طریقے سے یہاں کا کام ہوتا تھا،دیواروں پر لگی ہوئی خوبصورت عمارتوں کی رنگین تصویریں اور مکانوں کے نیلے نیلے نقشے،ٹائپ رائٹر،ٹیلی فون،چپراسیوں کی صاف ستھری سفید کھادی کی وردیاں،سفید کوٹ،سفید پتلون اور سفید گاندھی ٹوپی اور سینے پر پیتل کا چمکتا ہوا بلا جس پر سندر لال کی کمپنی کا نام کھدا ہوتا تھا۔ہر چیز میں اس کی پروقار شخصیت جھلکتی تھی۔

ایک کلرک فائلوں کا انبار لیے ہوئے نکلا تو بیچ کے دروازے کو بند کرنا بھول گیا۔اور اندر کے دفتر میں جو باتیں ہو رہی تھیں ان کی بھنک اوشا کے کانوں میں پڑنے لگی۔

کوئی آدمی کہہ رہا تھا''سندر لال جی سوچ لیجیے۔آپ ٹھیکہ لینے کے لیے اتنا نیچا ٹینڈر دے

رہے ہیں کہ آپ اس قیمت میں ہرگز یہ عمارتیں نہ بنا پائیں گے!''

اور سندرلال کہہ رہا تھا ''انجینئر صاحب آپ اس کی پرواہ نہ کیجیے۔ یہ سب میں سمجھ لوں گا۔ مگر میں نے طے کرلیا ہے کہ اس شرنارتھی کیمپ کا ٹھیکہ میں ہی لوں گا اور اسے میں ہی بنواؤں گا؟''

''کیوں؟...... کیا کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں۔ یہی سمجھ لیجیے۔''

نہ جانے کیسے اوشا کو یقین ہوگیا کہ اندر جس ٹھیکے کی باتیں ہورہی ہیں وہ ان کے کیمپ کے لیے ہی ہے اور اس خیال سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا کہ شاید......شاید......''وہ خاص وجہ'' وہ خود ہے جس کے لیے سندرلال اس کیمپ کا ٹھیکہ لینے کے لیے اتنا مصر ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انھیں میرا اتنا خیال ہے کہ نقصان اٹھا کر بھی وہ ہمارا کیمپ بنوانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟......کیا یہ ممکن ہے؟

یہ سوال اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور انجینئر، کلرک وغیرہ اندر کے کمرے سے نکلے۔ سندرلال ان سب کو چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئے۔ انجینئر سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی نظر اوشا پر پڑی اور وہ ان سب کو چھوڑ کر اس کی طرف مخاطب ہوگیا ''اوہ...... ہیلو......ہیلو......مس بھلّہ۔ کیسی ہیں آپ؟ آیئے اندر تشریف لایئے!'' اور اوشا کو اندر ساتھ لے جاتے ہوئے بولا ''معاف کیجیے گا۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میں ان لوگوں سے ایک ضروری بات کررہا تھا۔''

اوشا سے نہ رہا گیا ''دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ اس لیے دو چار باتیں میرے کان میں بھی پڑگئیں۔ کیا یہ سچ ہے کہ ہمارے شرنارتھی کیمپ کی بارکیں بنوانے کا ٹھیکہ آپ لے رہے ہیں؟''

اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سر ہلا کر کہا ''دیکھئے کوشش تو کررہے ہیں۔ آپ ہمارے لیے دعا کریں تو شاید کام بن جائے۔''

اور اوشا نے اسے یقین دلایا۔ ''میں کیا ہم سب یہی دعا مانگیں گے کہ یہ ٹھیکہ آپ ہی کو ملے کیونکہ آپ کے علاوہ کسی اور ٹھیکیدار کو ہم سے ہمدردی ہو ہی نہیں سکتی مگر آپ اتنا نیچا ٹینڈر کیوں دے رہے ہیں؟ کیا آپ کو نقصان نہ ہوگا؟''

''نفع نقصان تو بزنس میں ہوتا ہی رہتا ہے۔'' اس نے ایک معنی خیز انداز میں مسکراتے

ہوئے جواب دیا۔" اور کبھی کبھی ایک ہی سودے میں اگر ایک طرف نقصان ہوتا ہے تو دوسری طرف فائدہ بھی ہو جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اوشا کی طرف اس طرح دیکھا کہ وہ سمجھ گئی، اس کا اشارہ کس "فائدے" کی طرف ہے اور وہ شرما گئی۔

"یہ لیجیے اس مہینے کا چندہ! اگر ٹھیکہ مل گیا تو پھر آپ کو یہاں آنے کی تکلیف نہ کرنی پڑے گی۔ میں خود ہی وہاں دے دیا کروں گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آئندہ چند مہینوں میں مجھے آپ کے کیمپ کے کتنے ہی چکر لگانے پڑیں گے۔"

یہی ہوا۔ تیسرے دن سندرلال اپنے انجینئروں کو لے کر وہاں کی زمین کی پیمائش کی غرض سے آیا۔ اوشا نے اسے اپنا اسکول دکھایا جو اس کے چندے سے چل رہا تھا۔ سندرلال نے کہا "اب بہت جلد اس اسکول کے لیے پکی عمارت بن جائے گی۔ ہم نے گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ اگر ہمیں ٹھیکہ دیا گیا تو ہم اسکول کے لیے ایک ہال اپنے خرچ سے بنوا دیں گے۔" یہ سن کر اوشا کا دل تشکر سے بھر گیا۔

چند ہفتے بعد سندرلال پھر آیا اور اوشا کو خوشخبری سنائی کہ اس کی کمپنی کو ٹھیکہ مل گیا ہے اور چند روز میں بنیادیں کھودنے کا کام شروع ہو جائے گا۔ اوشا ابھی اسکول نہیں گئی تھی۔ اس نے سندرلال کا تعارف اپنے باپ اور ماں سے کرایا۔ وہ پہلے ہی اس دریا دل نوجوان کا دم بھرتے تھے۔ مل کر اور بھی گرویدہ ہو گئے۔ سندرلال نے اوشا کے باپ سے کہا۔" آپ کوئی چنتا نہ کیجیے۔ میں یہ عمارتیں نئے ڈھنگ سے بنوا رہا ہوں۔ آپ دیکھئے گا میں کتنی جلدی یہ ساری بارکیں کھڑی کرا دیتا ہوں! میری تو یہی خواہش ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے آپ سب ان خیموں سے نکل کر پکے مکانوں میں رہنے سہنے لگیں۔"

اوشا کی ماں نے کہا" جیتے رہو بیٹا! ہم غریبوں کا تمھیں کتنا خیال ہے! بھگوان تمھیں سکھی رکھے۔"

اوشا کی چھوٹی بہن اوما ایک کونے میں شرمائی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سندرلال نے جیب سے چمکیلے کاغذ میں لپٹا ہوا چاکلیٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔" یہ لو اوما! یہ چاکلیٹ میں

تمھارے لیے لایا ہوں۔'' دیکھتے دیکھتے کاغذ کی چمک نے شرمیلی ادا کو لبھالیا اور اس نے بڑھ کر چاکلیٹ لے لیا۔

اس دن سارے کیمپ میں سندرلال اور اس کے ہنس مکھ سبھاؤ اور اس کی دریا دلی کے چرچے ہونے لگے۔ انھیں سن سن کر اوشا آپ ہی آپ شرماتی رہی اور اس کا دل گاتا رہا..... ''وہ میرا ہے...... وہ میرا ہے!۔''

ایک دن رات کو اس نے اپنے ماں باپ کو بھی اس کی باتیں کرتے سنا۔ ماں کہہ رہی تھی'' کیوں جی! لگتا ہے یہ سندرلال ہماری اوشی کو کافی پسند کرتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کیسا ہے؟''

اس رات خوشی کے مارے اوشا کو نیند نہ آئی اور سویرا ہوتے آنکھ لگی بھی تو سپنے میں ایک ہنس مکھ چہرہ شرارت بھری نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ دو گوری گوری بانہیں اسے اپنے آغوش میں لیے رہیں۔ پتلے پتلے ہونٹ اس کے لبوں کو چومتے رہے اور خوبصورت ہاتھوں کی انگلیاں اپنے لمس سے تن بدن میں بجلی دوڑاتی رہیں۔

چند دن میں بنیادیں کھودی جانے لگیں۔ پہلے ہی دن سے سندرلال کو کام ختم کروانے کی جلدی تھی۔ وہ ہر کام اپنی نگرانی میں کرواتا۔ ہر وقت معماروں اور مزدوروں کے سر پر کھڑا رہتا۔ انھیں دم بھر کام رکنے کا موقع نہ دیتا۔ ابھی بنیادیں دو ہی فٹ گہری کھدی تھیں کہ اس نے حکم دیا بس کافی ہے۔ اب دیواروں کی چنائی شروع کرو۔ اوشا کا باپ جو ملتان میں اپنی کئی عمارتیں بنوا چکا تھا بولا'' سندرلال دو فٹ گہری بنیادیں تو کافی نہیں ہوتیں۔''

سندرلال نے ہنس کر جواب دیا'' آپ تو پرانے زمانے کی باتیں کر رہے ہیں بھلے صاحب! آج سیمنٹ کی عمارتیں نئے ڈھنگ سے بنتی ہیں۔ ان کے لیے دو فٹ کی بنیادیں بھی کافی ہیں۔''

جوں جوں بارکوں کی دیواریں بلند ہوتی گئیں اوشا اور سندرلال کی محبت بھی پروان چڑھتی گئی۔ مگر اس محبت کا اظہار صرف نگاہوں تک محدود تھا۔ جب تک سندرلال کام کی نگرانی کے لیے کیمپ میں موجود رہتا۔ اوشا کی نگاہیں اس پر لگی رہتیں۔ سندر کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ سیدھا اوشا کے پاس پہنچ جاتا۔ انھوں نے فلمی ہیرو ہیروئین کی طرح گیت نہ گائے۔ نہ ٹھنڈی

آہیں بھریں، نہ آنسو بہائے۔ کبھی ایک دوسرے سے اظہارِ محبت نہ کیا مگر اوشا جانتی تھی کہ سندر اس سے پریم کرتا ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس سے پریم کرتی ہے۔

دیواریں کافی بلند ہو گئیں۔ گرمی کا موسم اور دوپہر کا وقت تھا۔ اوشا اسکول ختم کر کے خیمے کی طرف واپس آرہی تھی۔ راستے میں دیکھا زیرِ تعمیر بارکوں کے پاس سندر کھڑا مزدوروں پر چیخ پکار کر رہا ہے۔ ''بس بس کھانے کی چھٹی ختم ہو گئی۔ کام شروع کرو! اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعی مزدوروں سے بہت سختی سے کام لیتا تھا لیکن اوشا نے سوچا وہ خود بھی تو کبھی آرام نہیں کرتا۔ اسی وقت دیکھ لو، دوپہر کے ایک بجے دھوپ میں یہاں کھڑا کام کی نگرانی کر رہا ہے۔ سر پر ہیٹ بھی نہیں پہنتا۔ دھوپ اور گرمی سے اِن چند مہینوں میں رنگ بھی سانولا پڑ گیا ہے مگر خالی نیکر پہنے کالا دھوپ کا چشمہ لگائے اور کھلے گلے کی قمیض پہنے کتنا اچھا لگتا ہے۔

قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے کہا'' آپ کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں؟ بارکیں بنتے بنتے بن جائیں گی۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے؟''

وہ چشمہ اتار کر مسکرایا۔ کتنی محبت بھری تھی اس کی مسکراہٹ میں۔ رومال سے پیشانی کا پسینہ پونچھ کر بولا'' تم نہیں جانتیں اوشا!'' اب وہ مس بھلّہ سے اوشا ہو گئی تھی۔ '' مجھے بہت جلدی ہے'' اور پھر تانبے کی طرح تپتے آسمان کو دیکھ کر کہا:'' جانتی ہو مہینے ڈیڑھ مہینے میں برسات آنے والی ہے۔ اس وقت تک اگر بارکیں تیار نہ ہوئیں تو تم لوگوں کا ان خیموں میں کیا حال ہوگا؟ میں چاہتا ہوں یہ سب شرنارتھی۔ تمھارے گھر والے۔ اور تم۔ جلد سے جلد خیموں کو چھوڑ کر بارکوں میں آجاؤ میں جانتا ہوں، میں ان مزدوروں پر سختی کر رہا ہوں۔ تمھاری خاطر!''

اوشا کا دل گنگنا رہا تھا۔'' کتنا اچھا! کتنا پیارا!'' اس نے کہا'' اچھا اب ہمارے یہاں چل کر منہ ہاتھ دھو کر ٹھنڈے ہو جایئے۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو دال روٹی کھا لیجیے۔''

سندر نے کہا'' مجھے تمھارے یہاں کی دال روٹی ہوٹل کے پراٹھے اور کباب سے زیادہ پیاری معلوم ہوگی!''

بارکیں مکمل ہو گئیں۔ سارے کیمپ میں وہ دن بہت خوشی کا دن تھا جب سب شرنارتھی

خیموں کو چھوڑ کر پکّے کمروں میں آ گئے کتنے تو ایسے تھے جنھوں نے پندرہ سولہ مہینوں بعد پہلی بار اینٹ پتھر کے مکان میں قدم رکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ بچّے برآمدوں میں بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ عورتیں اپنے اپنے کمروں میں رسوئی کی جگہ کو ٹھیک ٹھاک کر رہی تھیں۔

اوشا اپنے نئے کمروں میں چیزیں رکھ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور سندر لال داخل ہوا۔

''کہو اوشا۔ یہ مکان پسند آئے؟''

''بہت اچھے ہیں!'' اوشا کے باپ نے جلدی سے جواب دیا اور ماں نے لقمہ دیا ''بیٹا۔ یہ سب تمھاری مہربانی ہے! نہیں تو یہ برسات بھی ڈیروں خیموں میں گزرتی۔''

''چلو اوشا۔ اپنا اسکول تو دیکھ لو!''

اوشا نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے باپ کی طرف۔ باپ نے کہا ''ہاں ہاں۔ کیا حرج ہے۔ ضرور دیکھ آؤ۔ ہم اتنی دیر میں چیزیں ٹھیک ٹھاک کر لیتے ہیں۔''

پھر سندر لال جی آج آپ ضرور ہمارے یہاں چائے پی کر جائیں۔''

اسکول واقعی بہت خوبصورت بنا تھا۔ خیمے کے مقابلے میں تو محل ہی معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بینچ اور ڈیسک بھی لگے ہوئے تھے۔ اوشا کے لیے ایک پالش کی ہوئی میز اور کرسی بھی تھی۔

''یہ سب تمھاری بھینٹ ہے!''

خوشی کے مارے اوشا کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''آؤ۔ ایک اور چیز دکھاؤں!''

سڑک کے کنارے ایک موٹر کھڑی تھی۔ لمبی، کالی، چکنی، شاندار موٹر......

''یہ کس کی ہے؟......آپ کی؟......

''تم اپنی ہی سمجھو۔ اس ٹھیکے کے منافع سے آج ہی خریدی ہے۔''

ایک ہلکا سا شک اوشا کے دماغ میں کلبلایا۔ ''پر آپ نے تو بہت نیچا ٹینڈر دیا تھا۔ میں تو سمجھی تھی نقصان ہوگا......اور پھر یہ اسکول......؟''

''جب کوئی کام نیک نیت سے کیا جائے تو بھگوان اس میں ضرور برکت دیتا ہے اور پھر محنت بھی تو کتنی کی ہے میں نے؟،،

اوشا کو گرمی کی وہ دوپہر یاد آ گئی جب وہ دھوپ میں کھڑا مزدوروں کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے سنولائے ہوئے چہرے پر پسینہ بہہ رہا تھا۔ جب اوشا نے اپنے خیمے کے باہر پانی ڈال کر اس کا منہ دھلوایا تھا تو اس کے تمتماتے ہوئے جسم سے گرم گرم خوشبو کا ایک بھبکا اٹھا تھا جو آج تک اوشا کے شعور میں چھایا ہوا تھا۔

اوشا موٹر میں بیٹھ گئی۔ کتنی آرام دہ اور خوش خرام تھی وہ موٹر! نزاکت اور طاقت کا عجیب مجموعہ! جیسا سندر لال کی اپنی ذات میں تھا۔ سندر لال حسب معمول موٹر چلاتے ہوئے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پر اوشا اسے دیکھ رہی تھی۔ آج وہ خوش تھی، کیونکہ شرنارتھیوں کو رہنے کے لیے پکے مکان مل گئے تھے۔ اسکول کے بچوں کو نیا اسکول۔ سندر لال کو نئی موٹر اور اسے اس کا سندر لال مل گیا تھا!

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں شام کی خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ سڑک ہموار تھی اور موٹر کے گدے نرم اور لچکدار۔ اس وقت دنیا میں سکھ ہی سکھ، آنند ہی آنند تھا۔ اوشا نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو مسرت کے دھارے میں بہنے کے لیے چھوڑ دیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور موٹر سڑک کے کنارے رکی کھڑی تھی، درختوں اور کھنڈروں سے گھری ہوئی۔ شاید ایک دو فرلانگ پر قطب مینار دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اوشا نے جوانی کے نشے سے سرشار آنکھیں کھولیں تو سندر کے مسکراتے ہوئے چہرے کو اپنے اتنا قریب پایا کہ وہ اس کے گرم گرم سانس کا لمس اپنے گالوں پر محسوس کر سکتی تھی۔ ''اوشا! تم جانتی ہو میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں؟''

اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''ہاں۔''

''تو پھر کہو کہ مجھے تم سے......؟''

مگر اس نے آگے کچھ کہنے سے روک دیا ''تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''

''تو تم جانتی ہو؟''

اس نے سر کے اشارے سے اقرار کیا ''ہاں۔''

''اور تم بھی؟''

اور اوشا نے شرما کر گردن جھکالی۔

اور پھر اگلے لمحے سندر کی آتشیں سانس کا لمس اوشا کے اپنے گالوں پر سے ہوتا ہوا ہونٹوں تک آتا ہوا محسوس ہوا۔

اس لمحے میں اوشا نے اپنے حسین اور رنگین خوابوں کی تعبیر پالی۔ اس لمحے میں اس نے آسمان تک پرواز کی اور وہاں سے اپنے بالوں میں لگانے کے لیے تارے توڑ لائی۔

اس لمحے دنیا کے تمام ساز بیک وقت جھنجھنا اٹھے۔ اس لمحے سندر اور اوشا دو ہستیوں سے ایک ہو گئے۔ اوشا کا خیال اب یقین بن گیا کہ وہ سندر کے بغیر نہیں جی سکتی اور اس کے دل کی دھڑکن میں ایک ہی صدا گونجتی رہی ''وہ میرا ہے!''

جب وہ کیمپ واپس لوٹے تو چراغ روشن ہو چکے تھے۔ موٹر رکی تو دیکھا ایک آدمی خاکی برجس اور اوور کوٹ ہیٹ پہنے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''ہیلو سندر صاحب!'' وہ وہیں سے چلّایا۔ ایک کرخت بھدی سی آواز میں۔ اوشا نے محسوس کیا کہ سندر کو اس شخص سے اس وقت ملنا ناگوار سا ہوا۔ بے حد کوفت ہوئی اور ہونی بھی چاہیے تھی۔ ابھی ابھی راستے میں دونوں نے طے کیا تھا کہ سندر فوراً اوشا کے ماں باپ سے بات کرے گا اور جتنی جلدی ممکن ہوا ان کی شادی ہو جائے گی۔ لیکن یہ کمبخت نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔ شیریں خیالوں میں تلخی گھولنے۔

''کیوں انسپکٹر کیا بات ہے؟'' سندر نے موٹر سے اترتے ہوئے پوچھا۔

''بات کیا ہوتی۔ آپ ہی کے کام سے آیا تھا مگر موٹر سائیکل بگڑ گئی۔ خیر اب آپ ہی کے ساتھ لوٹ چلتا ہوں۔ راستے میں کام کی بات بھی ہو جائے گی۔''

ویسے سب کچھ دیکھ لینا؟ سب ٹھیک ٹھاک ہے؟''

''اجی سیر ے ہوتے ہوئے کیا خرابی آسکتی ہے؟ آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔''

اوشا کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس معاملے پر بات کر رہے ہیں۔ وہ انسپکٹر پولیس والا تو نظر نہ آتا تھا۔ سندر کا کوئی دوست بھی ہرگز نہ تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں سندر اس سے ایسے بات

کر رہا تھا جیسے اس سے ڈرتا ہو۔ یا شاید اس کا واہمہ ہی ہو۔

''تو پھر چلیے سندر صاحب!'' اور یہ کہہ کر وہ انسپکٹر... جو پولیس کا انسپکٹر نہ تھا... موٹر میں بیٹھ گیا۔

''اچھا اوشا، تو اب میں جاتا ہوں۔ تمھارے پتاجی سے کل ملوں گا۔ ان سے آج نہ آنے کی معافی مانگنا اور کہنا کل کی چائے ضرور ان کے یہاں پیوں گا اور ہاں تم کل دوپہر کو ضرور آنا لنچ ساتھ کھائیں گے۔ اسی ریستوران میں... بھولنا مت!''

موٹر روانہ ہوگئی اور جلد ہی دھول کے بادل میں کھوگئی۔ اوشا کیمپ کی طرف چل پڑی۔ ہر طرف ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ خوش تھی۔ آج اس کی زندگی کا سب سے حسین، سب سے سکھ بھرا دن تھا۔ پر اس کے دل میں ایک عجیب اور نامعلوم شک کا ننھا کیڑا کیوں کلبلا رہا تھا۔

اگلے دن وہ ایک بجے سے کچھ پہلے ہی سندر لال کے دفتر میں پہنچ گئی۔ چپراسی نے معمول سے زیادہ تپاک سے اس کا استقبال کیا اور کہا ''صاحب کوئی ضروری بات کر رہے ہیں پر آپ کو بیٹھنے کو کہا ہے'' اور اوشا باہر کے کمرے میں صوفے پر بیٹھ کر ایک رسالے کے اوراق الٹنے لگی۔

اندر کے کمرے کا دروازہ کسی قدر کھلا رہ گیا تھا اور دو آدمیوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک آواز تو سندر کی تھی۔ پر دوسری آواز؟ وہ بھی جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ کہاں سنی تھی اس نے وہ آواز؟

سندر غصّے میں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اونچا بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا---

بیس ہزار! دماغ خراب ہوگیا ہے تمھارا؟ پانچ ہزار دوں گا۔ لینا ہے لو ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ!''

اوشا نے سوچا ضرور کسی بدمعاش نے بے چارے سندر کو دھوکا دیا ہے۔ کام کیا ہوگا پانچ ہزار کا، اسے سیدھا اور شریف سمجھ کر اب بیس ہزار وصول کرنے کی فکر میں ہے۔ شاید کوئی اینٹوں کے بھٹے والا یا کوئی لکڑی کا سوداگر ہوگا۔ مگر اگلے لمحے اسے معلوم ہوگیا کہ وہ دوسری آواز والا کون تھا اور سندر سے بیس ہزار کاہے کا مانگ رہا تھا۔

اندر سے آواز آئی ''سندر صاحب تمھارا پورے ایک لاکھ کا منافع ہوا ہے ان بارکوں کے ٹھیکے میں اگر میں انھیں پاس نہ کرتا تو تمھیں کوڑی نہ ملتی۔ اب بیس ہزار دیتے تمھاری جان نکلتی ہے!''

اوشا کے من نے دعا کی کاش! میرے کان جو سن رہے ہیں وہ جھوٹ ہو۔ میرے کانوں کا قصور ہو۔ مگر اندر سے اس موٹر سائیکل والے بلڈنگ انسپکٹر کی آواز برابر آرہی تھی اور اوشا کے شک کو یقین میں تبدیل کر رہی تھی۔ اس کے بھروسے، اس کے من کے سکھ کو خاک میں ملا رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا،، دو دو فٹ گہری بنیادیں، سیمنٹ کے بجائے ریتا، چھتوں کے لیے دیمک لگی کڑیاں ......تم نے جیسا کام کیا ہے، میں جانتا ہوں...... بولو کروں رپورٹ؟''

اور سندر کی آواز خلاف معمول بوکھلائی ہوئی تھی ''نہیں نہیں پاگل ہو گئے ہو۔ مگر ذرا یہ تو سوچو میں ایسا نہ کرتا تو یہ کام پورا کیسے ہوتا؟ ٹینڈر اتنا نیچا دیا تھا کہ اور کسی طرح منافع کی صورت ہی نہ تھی......''

اوشا نے ان کی باتیں ختم ہونے کا انتظار نہ کیا اور وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ چپراسی نے گھبرا کر پوچھا'' آپ کہاں جا رہی ہیں۔ صاحب پوچھیں گے تو میں کیا کہوں؟''

اوشا نے کہا'' کہہ دینا ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس لیے چلی گئیں۔''

اس کی طبیعت دفعتاً ہو بھی گئی تھی خراب۔ سر چکرا رہا تھا اور نہ جانے کیوں اس کا دل متلا رہا تھا۔

اس شام بارش شروع ہو گئی۔

موسلا دھار بارش ہی میں سندر اوشا سے ملنے آیا۔ مگر اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور دردسر کا بہانہ کیے پلنگ پر پڑی رہی۔

دوسرے دن وہ پھر آیا۔ مگر اس وقت وہ اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ باہر موٹر میں بیٹھا ہوا وہ اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب اسکول ختم ہونے کی گھنٹی ہوئی تو اس وقت تھوڑی دیر کے لیے بارش تھمی ہوئی تھی۔ صرف بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سندر نے راستہ روک کر اسے بات کرنے پر مجبور کر دیا۔'' آؤ اوشا ایک منٹ کے لیے موٹر میں بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

دوسروں کے سامنے تلخ باتیں کرنے سے بچنے کے لیے وہ موٹر تک آنے پر راضی ہو گئی۔

''اوشا تمھیں کل سے کیا ہو گیا ہے؟ دفتر سے یکایک چلی آئیں۔ رات مجھ سے بات بھی نہ کی میں تو تمھارے پتاجی سے شادی کی بات کرنے آیا تھا۔''

''کل آپ جو باتیں بلڈنگ انسپکٹر سے کر رہے تھے۔ وہ میں نے سن لیں۔''

''بس اتنی سی بات؟'' اور یہ کہہ کر وہ اپنے معصوم انداز میں ہنس پڑا۔ ''پر اوشا میں کسی سے رشوت نہیں لے رہا تھا۔ وہ بدمعاش الٹا مجھ سے رشوت طلب کر رہا تھا۔''

مگر کس لیے؟ اس لیے تاکہ آپ نے اس بلڈنگ میں گھٹیا مال استعمال کر کے منافع کمایا ہے۔''

''ٹھیک ہے مگر......؟'' اس کے چہرے پر نقلی نہیں اصلی استعجاب تھا ''مگر......اس میں تمھارے خفا ہونے کی کیا بات ہے؟ تم کس بات پر بگڑی ہوئی ہو؟''

''میں آپ کو کیا سمجھتی تھی اور آپ کیا نکلے؟ میں ایک بے ایمان آدمی سے شادی نہیں کر سکتی!''

''بے ایمان!'' اور ایک بار وہ پھر ہنسا۔ مگر اس بار اس کی ہنسی میں معصومیت نہ تھی۔ ایک نئی کرختگی اور نئی تلخی تھی'' یہ بے ایمانی نہیں اوشا یہ بزنس ہے۔ کاروبار اور تجارت کا یہی ڈھنگ ہے۔ منافع کی خاطر ہر کوئی یہی کرتا ہے۔''

''مگر میں آپ کو ''ہر کوئی'' نہیں سمجھتی تھی۔ میں آپ کو اوروں سے اونچا اور اچھا سمجھتی تھیں۔''

''اب میں تمھیں روپے کمانے کے ڈھنگ کیا سکھاؤں......مگر چھوڑو اس جھگڑے کو۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں اوشا! تمھارے بغیر جی نہیں سکتا۔ یہ دھن دولت جو کچھ کمایا ہے یا کما رہا ہوں، سب تمھارے لیے ہے۔ تم بھی دل پر ہاتھ رکھ کر سچ سچ بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں!''

اس وقت بادل زور سے گرجے اور اوشا خوف سے اچھل پڑی۔ مگر اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ بارش پھر شروع ہو گئی۔

''اوشا! بولو......جواب کیوں نہیں دیتیں۔؟......اوشا......اوشا؟''

اوشا موٹر سے اتر کر چلی آئی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ یہ جھوٹ ہے۔ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی۔

سات دن سے بارش ہو رہی تھی۔ مگر اوشا کے من کی آگ اسی طرح سلگ رہی تھی۔ موت اور زندگی کا سوال اب بھی اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ '' کیا وہ ایسے آدمی سے پریم کر سکتی ہے؟ جس کی عزت اس کے دل میں نہ ہو؟ اور کیا وہ ایسے آدمی کو ٹھکرا سکتی ہے جس سے اسے محبت ہو!''
محبت، عزت، نفرت، ایمان، بے ایمان، بزنس، منافع، ان تمام قدروں کے گورکھ دھندے میں

وہ ایسی پھنسی کہ اب نکلتے بن نہ پڑتا تھا۔

پر اتنے دن تک سندر سے نہ ملنے کے بعد بھی وہ اس خوفناک حقیقت سے انکار نہ کر سکتی تھی کہ وہ اب بھی سندر سے پریم کرتی ہے۔ خوفناک حد تک اسے چاہتی ہے... اسے، اس کے خوبصورت چہرے کو، اس کے جوان جسم کو، اس کی سانس کے لمس کو، اس کے لبوں کو اور اس کے بوسوں کو۔ اس کے دماغ کے فیصلے کے باوجود کہ وہ کسی ایسے آدمی سے پریم نہیں کر سکتی جس کی وہ عزت نہ کر سکتی ہو۔ جو بے ایمان اور پیسے کا لوبھی ہو۔۔۔ اوشا کا دل پھر بھی سندر کی چاہت سے بھرپور تھا۔

بارش اور تیز ہوگئی اور کھڑکی میں آتی ہوئی بوچھار نے اوشا کے چہرے کو ہی نہیں اس کے جسم کو بھی بھگو دیا۔ اسے سردی سے ہلکی سی جھرجھری آئی اور وہ کھڑکی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی مگر اس بار بارش نے اس پر اوپر سے حملہ کیا۔ ایک کے بعد ایک میلے پانی کے کتنے ہی قطرے اس پر چھت سے ٹپکے۔ اس نے اوپر نظر کی تو دیکھا چھت چھلنی بن گئی ہے اور دس بارہ جگہ سے ٹپک رہی ہے۔ دیواروں پر سیل کے دھبے بھی اب کوڑھ کے ناسوروں کی طرح بڑھتے جا رہے ہیں۔

اس کی ماں گھبرا کر کبھی دیواروں کو دیکھتی کبھی چھت کو "ہے بھگوان اب کیا ہوگا؟"

اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا اور اوشا نے مڑ کر دیکھا، پانی میں نہایا ہوا سندر وہاں کھڑا تھا۔ بھیگے کپڑوں میں وہ کتنا اچھا لگتا تھا! اس کے گیلے بال اس کی پیشانی پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت تھی۔ "اوشا! جلدی کرو! تم سب موٹر میں میرے گھر چلو" اور پھر اوشا کے ماں باپ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "سب چیزیں چھوڑ کر آ جائیے۔ وقت بالکل نہیں ہے!"

اور اس افراتفری میں کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ ہوا کیا؟ آخر اتنی جلدی کا ہے کی ہے؟ خطرہ کیا ہے؟ اوشا کے ماں باپ اور بہن کو اس ٹپکتی ہوئی چھت سے چھٹکارا پانے کا یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اور اوشا؟ اس کے لیے تو یہی کافی تھا کہ سندر کہہ رہا تھا میرے گھر چلو!

بھیگتے، گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتے وہ سڑک پر موٹر تک آئے اور اب پہلی بار انھیں معلوم ہوا کہ سندر اتنی جلدی کیوں کر رہا تھا۔ خوف زدہ نگاہوں سے ان سب نے ادھر دیکھا کہ جنوب مشرق کی جانب آخری بارک تھی مگر وہ بارک اب وہاں نہیں تھی۔ صرف ملبے کا ایک ڈھیر تھا۔

رات کے دھندلکے میں چند بدنصیب مٹی اور اینٹوں کو کرید رہے تھے اور کچھ عورتوں اور بچّوں کے رونے کی آوازیں بارش کے شور کو چیرتی ہوئی آرہی تھیں۔

''اوشا۔اوشا! جلدی کرو۔ بارش میں کیوں بھیگ رہی ہو؟'' سندر کی آواز گونجی مگر اوشا نے نہیں سنا۔ وہ بے تحاشا گرتی ہوئی بارک کی طرف بھاگی جارہی تھی۔ سندر اس کے پیچھے پیچھے دوڑا اور چند قدم پر پکڑ لیا ''کیا پاگل ہوگئی ہو؟ اوشا! یہ عمارتیں خطرناک ہیں۔ اب تمھارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے!''

اور اوشا نے مڑ کر سندر کی طرف دیکھا مگر جیسے اسے پہچانا نہیں۔ اندھیری رات اور بارش میں اس کے خدوخال کا دھندلا خاکہ ہی نظر آرہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس اندھیرے میں اوشا کو ایسا محسوس ہوا جیسے پہلی بار اندھیرا دور ہوکر اسے صاف نظر آرہا ہو۔ یہ وہ سندر نہیں تھا۔ جسے وہ جانتی تھی جسے وہ چاہتی تھی۔

اپنا بازو چھڑاتی ہوئی وہ چیخی مجھے چھوڑ قاتل! اور اس ایک لفظ قاتل میں سندر پر ہی نہیں، اس کی بزنس پر اس کی زندگی اور اس کی سماج پر سزائے موت کا حکم تھا۔ اس لمحے میں اوشا نے اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس کی۔ مگر یہ اس کا دل نہیں صرف وہ دھوکے کی محبت کا بندھن تھا جس میں اب تک اس کا دل بندھا ہوا تھا اور اب وہ آزاد تھی۔ سندر نے ہمدردی جتانے کی کوشش کی۔ ''مجھے افسوس ہے تمھارا اسکول......''

وہ اپنا جملہ پورا نہ کرسکا۔ اوشا نے اسے اس طرح گھور کر دیکھا کہ اس کی آواز جم کر رہ گئی۔ اس نے اپنی زبان سے کچھ نہ کہا مگر اس کی خاموش نگاہ کہہ رہی تھی ''یہ میرا اسکول نہیں سندر، یہ تمھارا سماج ہے، یہ تمھاری بزنس ہے۔ اس کی بنیادیں کھوکھلی ہیں۔ اس کی دیواریں کچی ہیں اور اس کی چھت کی کڑیوں میں دیمک لگی ہوئی ہیں ......وہ دیکھو......تمھارے سماج کے گھروندے گر رہے ہیں ......بچاؤ انھیں ......سندر بچاؤ ......!'' دھماکے کے ساتھ ایک اور بارک کے کئی کمروں کی چھت گر پڑی۔ عورتوں اور بچّوں کے رونے کی آوازیں اور بلند ہوگئیں۔ ایک عجیب جوشیلا شور جو موسلا دھار بارش کے شور سے بھی زیادہ اونچا تھا!

شرنارتھیوں کا گروہ اپنی بارکوں سے نکل کر بھیگتا ہوا آرہا تھا۔ وہ جلوس بنا کر چل رہے

تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ ایک عورت اپنے ننھے بچّے کی لاش بازوؤں پر اٹھائے چل رہی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ گورنمنٹ کے وزیروں کے دروازے کھٹکھٹانے جا رہے تھے۔ وہ انصاف طلب کرنے جا رہے تھے۔ ان کی آوازوں میں ایک غصہ تھا اور ایک نیا عزم بھی!

اوشا نے سندر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی جیسے بڑے راز کی بات کہہ رہی ہو۔ ''دیکھا تم نے؟ کس طرح برسات میں پانی کے قطرے مل کر طوفان بن جاتے ہیں اور بڑی بڑی عمارتوں کو اکھاڑ پھینکتے ہیں!'' اور یہ کہہ کر وہ بھی اس جلوس میں شامل ہو گئی جو طوفان میں سے گزرتا ہوا ایک نئے طوفان کی طرف جا رہا تھا۔

تیس برس بعد آج بھی ویسی ہی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہی طوفان تھا۔ اوشا دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی طرف سے الاٹ کیے گئے اپنے فلیٹ کی کھڑکی کے قریب کھڑی تیس برس پہلے کی برسات کی رات کو یاد کر رہی تھی جب وہ سندر! جس سے وہ پیار بھی کرتی تھی اور نفرت بھی! سندر جو اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ایک بلڈنگ کا معائنہ کرتے ہوئے، اس بلڈنگ کی چھت گر جانے سے ملبے میں دب کر مر گیا تھا۔

آج اوشا ایک اسکول کی پرنسپل تھی۔ اپنے حلقوں کی ممتاز خاتون تھی۔ آج اس طوفانی رات میں تیس برس پہلے کی برسات کی رات کو یاد کرتے ہوئے من ہی من میں کہہ رہی تھی۔ ''سندر! کاش تم ویسے ہی ہوتے جیسا میں تمھیں سمجھتی تھی! کاش تم نے اپنے ٹھیکے کی بلڈنگوں میں سیمنٹ کے بجائے ریت نہ لگایا ہوتا تو تم اپنی بے وقت کی موت تو نہ مرتے۔ مجھ کنواری کو ودھوا تو نہ بناتے۔ تمھیں کیا معلوم تمھاری یاد کو سینے سے لگائے میں تیس برسوں سے کیسے مر مر کر جی رہی ہوں۔ کیسے جی جی کر مر رہی ہوں!''

(بیسویں صدی، دہلی جنوری 1982)

○

خواجہ احمد عباس (جون 1914 - یکم جون 1987) ارد
انھوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے و مضامین بھی لکھے
لکھے اور ہدایت بھی دی، سفرنامے و سوانح بھی تحریر کیے اور اخبار
اور تصنیف و تالیف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم
دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دی ہے۔ 8 جلدوں پر مشتمل اس
اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علا
بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا، ایک ساتھ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔
ان کے شائع شدہ مضامین کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ یعنی پروفیسر
خواجہ احمد عباس کے جملہ کام کو یکجا کرنے کا نہایت معرکۃ الآرا فر
والی نسل یہ جان سکے کہ ہمارے اکابرین نے سرمایۂ ادب اردو
ہمارے لیے خلق کیا ہے تاکہ ہم اس تخلیقی میراث سے نہ یہ کہ
بیش بہا بنانے کی سعی بھی کریں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو دنیائے ادب میں فکشن کے ناقد
کلاسیکی ادب سے خاص شغف ہے۔ کمیاب و نایاب متون کو
دستاویز بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اردو دنیا موصوف کے ج
اور وہ داد و تحسین سے بھی نوازے جاتے رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

و کے متنوع منفرد ادیب ودانشور تھے۔
ے اور فلم بھی، فلموں کے لیے مکالمے بھی
ت کے کالم بھی۔ وہ ایک نابغہ ادیب تھے
نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر
ہ کلیات میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو
. وہ ایک ڈرامہ ''لال گلاب کی واپسی'' جو
. لمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی شخصیات پر
ارتضیٰ کریم نے نہایت عرق ریزی سے
بنہ انجام دے دیا ہے تاکہ موجودہ اور آنے
ے بیش بہا خزانوں کو کتنی عرق ریزی سے
رف اخذ واستفادہ کریں بلکہ اس کو اور

ی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے انھیں
ا تلاش اور اسے اہتمام کے ساتھ ادبی
ہ مقالات وکتب سے بخوبی واقف ہے

قیمت -/295 ₹
قیمت سیٹ -/1935 ₹

خواجہ احمد عباس (جون1914 - یکم جون1987) اردو کے متنوع منفرد ادیب ودانشور تھے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے ومضامین بھی لکھے اور فلم بھی، فلموں کے لیے مکالمے بھی لکھے اور ہدایت بھی دی، سفرنامے وسوانح بھی تحریر کیے اور اخبارات کے کالم بھی۔ وہ ایک نابغہ ادیب تھے اور تصنیف وتالیف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پروفیسر ارتضٰی کریم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دی ہے۔ 8 جلدوں پر مشتمل اس کلیات میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈرامہ ''لال گلاب کی واپسی'' جو بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا، ایک ساتھ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ فلمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی شخصیات پر ان کے شائع شدہ مضامین کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ یعنی پروفیسر ارتضٰی کریم نے نہایت عرق ریزی سے خواجہ احمد عباس کے جملہ کام کو یکجا کرنے کا نہایت معرکۃ الآرا فریضہ انجام دے دیا ہے تاکہ موجودہ اور آنے والی نسل یہ جان سکے کہ ہمارے اکابرین نے سرمایۂ ادب اردو کے بیش بہا خزانوں کو کتنی عرق ریزی سے ہمارے لیے خلق کیا ہے تاکہ ہم اس تخلیقی میراث سے نہ یہ کہ صرف اخذ واستفادہ کریں بلکہ اس کو اور بیش بہا بنانے کی سعی بھی کریں۔

پروفیسر ارتضٰی کریم کو دنیائے ادب میں فکشن کے ناقد کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے انھیں کلاسیکی ادب سے خاص شغف ہے۔ کمیاب ونایاب متون کی تلاش اور اسے اہتمام کے ساتھ ادبی دستاویز بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اردو دنیا موصوف کے جملہ مقالات وکتب سے بخوبی واقف ہے اور وہ داد وتحسین سے بھی نوازے جاتے رہے ہیں۔


قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

ISBN 978-93-87510-26-5
NCPUL
New Delhi

قیمت -/295 ₹
قیمت سیٹ -/1935 ₹